مارچ ۲۰۰۷ء میں جامعہ اسلامیہ میں منعقد ہونے والے
"دو روزہ عالمی مذاکرہ علمی" کے لئے لکھے گئے مقالات کا مجموعہ

ہندوستان اور علم حدیث

تیرہویں و چودہویں صدی ہجری میں



مرتب
مولانا فیروز اختر ندوی

ناشر
مرکز الشیخ أبی الحسن الندوی
جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ

ہندوستان اور علم حدیث

تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں

مرتب

مولانا فیروز اختر ندوی

ناشر

مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی
جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ، یوپی

نام کتاب : "ہندوستان اور علم حدیث تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں"

مرتب مولانا فیروز اختر ندوی

صفحات : ۷۶۲

ناشر مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ

کمپوزنگ : عبدالہادی ولید پوری

سن طباعت: ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۲ء

قیمت

ملنے کے پتے

جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ

مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مکتبہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور

مکتبہ الفرقان، لکھنؤ

فہرست مضامین

ابتدائیہ

ہندوستان اور علم حدیث

تیرہویں و چودہویں صدی ہجری کے چند ممتاز محدثین عظام اور جلیل القدر اساتذۂ حدیث

مشاہیر علمائے کرام کے تاثرات



ابتدائیہ

مقدمہ

از: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى ، أما بعد

اس ناچیز نے پچھلے چند سالوں میں محض اللہ کے فضل وکرم سے جامعہ اسلامیہ ومرکز الشیخ ابی الحسن الندوی مظفر پور اعظم گڑھ میں دو اہم سمینار کے انعقاد کرنے کا انتظام کیا تھا، پہلا سمینار جو درحقیقت ہمارے شیخ واستاذ حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مدنی نوراللہ مرقدہ کے علمی فیوض وکارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا، اس کے لئے سب سے بڑی مناسبت یہ تھی کہ ان کی عظیم الشان تالیف موطا امام مالک کی شرح ''اوجز المسالک الی موطا مالک'' کی خدمت کرنے کی اللہ تعالی نے اس ناچیز کو توفیق عطا فرمائی، جیسا کہ حضرت شیخ الحدیثؒ نے اپنے بعض مکاتیب میں تحریر فرمایا کہ ''ان شاء اللہ مولوی تقی سے جس طرح اوجز طبع ہوکر مشتہر ہوئی اسی طریقے سے بذل المجہود بھی ہوگی'' اگر چہ دونوں کتابوں کی خدمت میں یہ ناچیز شریک رہا ہے، لیکن اوجز المسالک کی جو طباعت مصر و بیروت سے طبع ہوکر دنیا کے سامنے پیش کی گئی تھی، اس پر بہت سے علماء و باحثین کے اعتراضات وانتقادات بھی سامنے آئے، اس کی سب سے بڑی وجہ طباعت کی بے پناہ اغلاط تھیں، جن کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے، اس لئے حضرت مولانا علی

میاں ندویؒ اور ابوظبی کے بڑے عالم شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک جو مالکی مذہب کے اپنے زمانے کے امام تھے، جن کے مستشار کی حیثیت سے ابوظبی میں میرا قیام رہا ہے، دونوں بزرگوں کا یہ اصرار شدید تھا کہ اس عظیم الشان کتاب کی خدمت کرنا اور ان تحریفات کی تصویبات اور نصوص کے اصول سے مراجعت واحادیث کے مختلف نسخ سے مقارنہ کرنا آپ پر فرض ہے، اس میں سب سے زیادہ ہمارے دوست مولانا اسماعیل بدات نے رورو کر اس ناچیز سے التجا کی جس کی بنا پر اتنے بڑے کام کے لئے توکلا علی اللہ یہ ناچیز کمربستہ ہوا، کئی سالوں کی محنت وکاوش کے بعد یہ کتاب پایہ تکمیل تک پہونچی، بہت سی تقریبات اور مناسبات کو اس کے لئے ترک کرنا پڑا، اور اللہ کے فضل وکرم اور اپنے بزرگوں کی دعا کی برکت سے ۱۸ جلدوں میں مع الفہارس بیروت سے اعلی طباعت کے ساتھ منصۂ شہود پر آئی، جس کو علماء عرب نے خصوصا پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، علماء مدینہ سے لے کر شیخ الازہر نے تحسینی کلمات تحریر فرمائے، اس لئے اس کی ضرورت محسوس کی کہ اس کتاب کا اپنے جامعہ اسلامیہ میں اجرا کرایا جائے اور اسی مناسبت سے ایک عالمی پیمانے پر سیمینار منعقد کیا جائے اور الحمد للہ سیمینار میں بہت سے علماء وباحثین نے شرکت کی اور بہت فاضلانہ مقالات پیش کئے، ان مقالات کے مجموعے کو "ذکر زکریا" کے نام سے شائع کیا گیا، مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ بہت سے رسالوں نے ان مقالات کو لے کر اپنے مجلات میں شائع کیا اور اس کی طرف اشارہ تک نہ کیا، غیروں سے زیادہ اپنوں سے اس معاملے پر شکایت ہے، واللہ یهدی من یشاء إلی صراط مستقیم.

اس کے بعد دوسرا سیمینار جو" تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں علم حدیث" کے نام سے یہاں منعقد کیا گیا، اس مناسبت سے بھی "بذل المجهود فی حل أبی داود" جو تحقیق وتعلیق وتخریج روایات وغیرہ سے مزین ہو کر ۱۴ جلدوں میں عالم عربی میں پھیل رہی تھی اس کا اجرا مقصود تھا، اور ان دونوں صدیوں میں ہندوستانی علماء حدیث کی حدیثی خدمات اور ان کی کتابوں کا تعارف مقصود تھا، اس میں بھی بہت سے عالمانہ فاضلانہ مقالے پیش کئے گئے

اگر چہ اکثر مقالات میں مؤلفین کی کتابوں کا ذکر نہیں آسکا ہے جو سمینار کے اہم مقاصد میں تھا، بہر حال جو مقالات موجود تھے ان کا انتخاب اس مجموعۂ مقالات میں پیش کیا جارہا ہے، اس کی ترتیب کے لئے اس جامعہ کے استاذ مولانا فیروز اختر ندوی کو ذمہ دار بنایا تھا، الحمد للہ انہوں نے اس کام کو بخوبی انجام دیا، تیرہویں صدی ہجری کی سب سے عظیم شخصیت حضرت شاہ عبدالعزیزؒ پر مستقل مقالہ نہیں آسکا تھا اس لیے شروع میں سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی پر مولانا عبدالحلیم چشتی کے مقالے کے اضافہ کا مشورہ دیا جو الشارق میں شائع ہو چکا ہے تاکہ تسلسل قائم رہ سکے، اب یہ کتاب ناظرین کے سامنے پیش کی جارہی ہے، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کو قبول فرمائے اس کے مقالہ نگاروں کو، مرتب کو، دنیا وآخرت میں بہترین جزاء خیر عطا فرمائے۔

وما ذلک علی اللہ بعزیز

والسلام

(حضرت مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی مظاہری (دامت برکاتہم)

جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ

۲۷ر شوال ۱۴۳۳ھ

حرفے چند

از: فیروز اختر ندوی

''ہندوستان میں علم حدیث - تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں'' کے عنوان پر جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ میں ایک کامیاب دوروزہ سمینار ۱، ۲ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۱/۲۲ مارچ ۲۰۰۷ء میں منعقد ہوا تھا، موضوع کی اہمیت اور داعی سمینار حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری بانی وسرپرست جامعہ اسلامیہ ومرکز الشیخ ابی الحسن الندوی کی شخصیت کے زیر اثر سمینار میں ہندوستان کے جلیل القدر اور ممتاز علماء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، دوروز تک جامعہ اسلامیہ کی فضا حدیث اور خدمت حدیث کے مشک بار تذکروں سے معطر رہی، شرکاء سمینار نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے مقالے تیار کیے تھے لیکن وقت کی تنگی کے پیش نظر ان مقالات کی تلخیص ہی پیش کرنے کا موقع مل سکا تھا، سمینار کے بعد ہی سے مقالات کو زیور طبع سے آراستہ کرکے منظر عام پر لانے کے مطالبے شروع ہوگئے تھے، لیکن بانی جامعہ کی خواہش تھی کہ مقالات کا مجموعہ شائع کیا جائے تو اس میں تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری کی تمام جلیل القدر شخصیات کی حدیثی خدمات کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ابتدائے اسلام سے بارہویں صدی ہجری تک ہندوستان میں علم حدیث پر جو عظیم الشان کام انجام پایا تھا اس کا بھی تذکرہ شامل اشاعت ہو، تاکہ مجموعہ مقالات اپنے موضوع پر جامع ہوسکے۔

اس مقصد کے پیش نظر کوشش کی گئی کہ تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری کی جن اہم شخصیات پر سمینار میں مقالات پیش نہیں کیے جا سکے تھے (یاد رہے کہ شرکا سمینار کی خدمت میں عناوین متعین کر کے تمام ہی اہم شخصیات پر علاحدہ علاحدہ مقالہ لکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن بعض حضرات کی بروقت معذرت کی وجہ سے چند اہم عناوین پر مقالات نہیں آ سکے تھے) ان پر از سرِنو مقالات لکھوائے جائیں نیز ابتدائے اسلام سے بارہویں صدی ہجری تک کی حدیثی خدمات پر بھی روشنی ڈالی جائے، اسی خیال کی وجہ سے مجموعہ مقالات کی اشاعت میں تاخیر ہوتی گئی، ادھر شرکا سمینار اور فنِ حدیث سے شغف رکھنے والوں کا اصرار و تقاضہ بھی بڑھتا گیا، مجبوراً جو مقالات سمینار کے لیے لکھے گئے تھے اور شرکا سمینار نے مجلس منتظمہ کے پاس جمع کرایا تھا انہیں کا مجموعہ منظر عام پر لانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

اس مجموعہ میں تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری کی بیشتر اہم شخصیات کی حدیثی خدمات کا تذکرہ موجود ہے، البتہ میر کارواں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی شخصیت اور حدیثی خدمات پر مستقل مقالہ نہیں تھا جس سے تیرہویں صدی ہجری میں خدمت حدیث کے اہم تذکرہ سے یہ مجموعہ خالی ہو رہا تھا، اس کے لیے مخدوم محترم حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری دامت برکاتہم نے مولانا عبدالحلیم چشتی کے مقالہ بعنوان: ''سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی'' کے اضافہ کا مشورہ دیا تاکہ حدیثی خدمات کا تسلسل باقی رہے، اسی کے پیش نظر یہ مقالہ شامل اشاعت کیا جا رہا ہے، نیز اس مجموعہ کے دو اہم مقالے ''ہندوستان میں علم حدیث از مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی'' اور'' ہندوستان اور علم حدیث از مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی'' بہت بیش قیمت اور جامع ہیں، جن میں ابتدائے اسلام سے موجودہ دور تک کی حدیثی خدمات پر اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اس لحاظ سے اس مجموعہ کو اپنے موضوع پر ایک مکمل اور جامع مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے، جس کے مطالعہ سے ہندوستان میں ابتدائے اسلام سے آج تک کی حدیثی خدمات کا تذکرہ قارئین کے سامنے آ جاتا ہے۔

ہندوستان میں خدمت حدیث کی نوعیت کثیر جہتی ہے،تصنیف وتالیف،تحقیق وتعلیق، استدراک وتصحیح،درس وتدریس،تدوین وتشریح،انتخاب وترتیب،ترجمہ وتحشیہ،طباعت واشاعت غرضیکہ ہرمیدان میں علمائے ہند کی حدیثی خدمات ناقابل فراموش ہیں،الحمدللہ سمینار میں ان سب موضوعات پر مقالات پیش کیے گئے،اس لیے ہم نے اس مجموعہ کی ترتیب میں اس کا خیال رکھا کہ جن مقالات میں خدمت حدیث کی کسی خاص نوعیت اور جہت کو نمایاں کیا گیا ہے ان کو''ہندوستان اور علم حدیث'' کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے اور جن مقالات میں ہندوستانی محدثین کی شخصی حدیثی خدمات کا تفصیلی تذکرہ وتعارف کرایا گیا ہے ان کو''ممتاز محدثین عظام اور جلیل القدر اساتذۂ حدیث'' کے زمرہ میں شامل کیا ہے،مجموعۂ مقالات کی تیاری میں جن حضرات کا تعاون حاصل رہا میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں خصوصاً اپنے مخدوم ومحترم حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری بانی وسرپرست جامعہ اسلامیہ ومرکز الشیخ ابی الحسن الندوی اور ان کے فرزند ارجمند مولانا ڈاکٹر ولی الدین صاحب ندوی(ناظم جامعہ اسلامیہ) کا تہ دل سے شکرگذار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کو مقالات مرتب کرنے کی سعادت بخشی اور ہرگام پر اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

خدا کرے یہ مجموعہ قارئین کے لیے مفید اور اللہ کے یہاں مقبول ہو۔

وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ أجمعین.



ہندوستان اور علم حدیث

ہندوستان میں علم حدیث

از: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلما لکھنو

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد قائد الغر المحجلين، وعلى آله وأصحابه حفظة الكتاب والسنة، وحملة لواء الدين، ومن تبعهم بإحسان من العلماء الراسخين الذين ينفون عن الإسلام تحريف الغالين، وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين، وبعد!

دین اسلام کا مصدر اول اللہ رب العالمین کی آخری کتاب قرآن مجید ہے، پھر اس کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن پر دین اسلام مکمل ہوا، کی حیات طیبہ اور ہدایات وتعلیمات جن کو وحی الٰہی کی مدد اور پشت پناہی حاصل تھی، قیامت تک انسانوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے، اللہ رب العالمین نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ کیا، اس کے ذریعہ اور اس کے علاوہ وحی کے دیگر پہلوؤں کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دین اسلام کے لئے نمونہ ومرجع بنایا، اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور ہدایات دین کا مصدر ومرجع بن گئیں، جو حدیث شریف کے ذریعہ ہمارے سامنے ہیں، اور حدیث شریف اپنے آغاز کے وقت سے برابر ہدایت الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنی رہی، اس کی حفاظت اور خدمت کو اپنا بنیادی فرض سمجھتے ہوئے امت کے علماء نے برابر اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، اور اس کو ایسی امانت و دیانت سے

قائم رکھا، کہ اس کی مثال تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی، اس سلسلہ میں دنیائے اسلام میں ہر جگہ توجہ کی گئی اور ذخیرۂ حدیث کی حفاظت وخدمت کا کام ہوا، ہمارے برصغیر میں بھی جب سے مسلمانوں کے یہاں قدم پڑے حدیث شریف کی خدمت ہوئی، اس کے اس سلسلہ میں کئی دور آئے۔

پہلا دور جو کئی سو سال کا تھا، اس میں اہمیت کے ساتھ حدیث کی خدمت ہوئی، دوسرا دور خدمت حدیث سے زیادہ دیگر علوم دینیہ کی خدمت کا رہا، پھر تیسرا دور دوبارہ حدیث شریف کے اہتمام کا آیا، جو برابر جاری ہے، اس دور کی آخری دو صدیوں میں برصغیر کے مراکز علوم دینیہ میں جو کام انجام دیا گیا، تدریسی سطح پر ہو، یا تصنیفی وتحقیقی سطح پر ہو، وہ خاصا وقیع کام ہے جس کا اعتراف عرب علماء نے بھی کیا، علامہ سید رشید رضا مصری مدیر "المنار" نے "مفتاح کنوز السنة" کے مقدمہ میں علماء ہند کی ان خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"لولا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من أمصار الشرق، فقد ضعفت في مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة"
(اگر ہندوستانی علماء اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو یہ فن مشرقی دنیا سے رخصت ہو جاتا، کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری ہی سے علم حدیث زوال پذیر ہو گیا تھا)۔

برصغیر میں حدیث شریف کے ساتھ اعتناء کا آغاز یوں تو شروع سے جب کہ محمد بن قاسم ثقفی کا فاتحانہ داخلہ ہندوستان میں ہوا، ہو گیا تھا، اور حدیث شریف سے اشتغال اور خدمت کا سلسلہ جاری رہا، حتی کہ عرب حکام کا دور ختم ہوا، اور ترکستانی اور خراسانی فاتحین کا دور شروع ہوا، اس دوسرے دور میں علم حدیث سے اشتغال کم ہو گیا، اور دیگر علوم سے اشتغال زیادہ رہا۔

محمد بن قاسم ثقفی کی فتح کے بعد کے عہد میں تابعین وتبع تابعین کے افراد کا ہندوستان آنا ہوا، ان میں حدیث شریف کی خدمت کرنے والے بھی تھے، پھر چار صدی تک علماء کے خدمت حدیث اور علوم اسلامیہ کا سلسلہ رہا، کتابیں بھی تصنیف کیں، ان میں مشہور حضرات مندرجہ ذیل ہیں:

اسرائیل بن موسیٰ بصری، منصور بن حاتم نحوی، ابراہیم بن محمد دیبلی، احمد بن عبداللہ دیبلی، احمد بن

محمد منصوری ابوالعباس، خلف بن محمد دہلی، شعیب بن محمد دہلی، ابو محمد عبد اللہ منصوری، علی بن موسیٰ دہلی، فتح بن عبد اللہ سندھی، محمد بن ابراہیم دہلی، وغیرہ۔

عربوں کی سلطنت ختم ہونے اور غزنیوں اور غوریوں کی حکومت آجانے سے خراسان و ماوراء النہر کے علماء کی آمد زیادہ ہوئی، ان کے ذریعہ علم حدیث سے اعتناء بہت کم رہا، دیگر علوم پر توجہ زیادہ ہونے لگی، شعر و ادب، فنون ریاضیہ، فقہ و اصول فقہ اور یونانی علوم کے ساتھ اشتغال زیادہ رہا، حدیث و تفسیر کی طرف توجہ کم رہی، حدیث شریف میں توجہ "مشارق الأنوار للصغاني" اور زیادہ سے زیادہ "مصابیح السنة للبغوي" یا "مشكاة المصابیح" تک منحصر ہو کر رہ گئی، علماء اسی کو حدیث کے علوم کا منتہیٰ سمجھا جانے لگا، علوم دینیہ فقہ تقلید تک محدود ہو کر رہ گئے۔

پھر دسویں صدی ہجری کا زمانہ آیا، اس دور میں حدیث شریف کے ساتھ اشتغال بڑھا، اور اس کی طرف توجہ کرنے والے علماء بڑھے، اس صدی کے دوران متعدد عظیم شخصیتوں نے علوم حدیث سے اشتغال اختیار کیا، اور اس کو رواج دیا، ان میں قابل ذکر شیخ عبد المعطی بن حسن بن عبد اللہ باکثیر مکی (م ۹۸۹ھ)، شہاب احمد بن بدر الدین مصری (م ۹۹۲ھ) شیخ محمد بن احمد بن علی فاکہی حنبلی (م ۹۹۲ھ)، شیخ محمد بن محمد عبد الرحمٰن مالکی مصری (م ۹۱۹ھ)، شیخ رفیع الدین چشتی شیرازی (م ۹۵۴ھ) شیخ ابراہیم بن احمد بن حسن بغدادی، شیخ ضیاء الدین مدنی مدفون کاکوری، شیخ بہلول بدخشی، خواجہ میر کلاں ہروی (م ۹۸۱ھ)، وغیرہم۔

پھر متعدد علماء نے حرمین شریفین جا کر وہاں کے علماء سے فیض حاصل کیا، اور واپس آکر حدیث کی خدمت خاص طور پر اختیار کی، ان سے بہت سے لوگوں کو فیض پہنچا، ان میں قابل ذکر شیخ عبد اللہ بن سعد اللہ سندھی، شیخ رحمۃ اللہ بن عبد اللہ بن ابراہیم سندھی المہاجر الی الحجاز، شیخ یعقوب بن حسن کشمیری (۱۰۰۳ھ)، شیخ جوہر کشمیری (م ۱۰۲۶ھ)، شیخ عبد النبی بن احمد گنگوہی، شیخ عبد اللہ بن شمس الدین سلطانپوری، شیخ قطب الدین عباسی گجراتی، شیخ احمد بن اسماعیل مانڈوی، شیخ راجح بن داود گجراتی، شیخ علیم الدین مانڈوی، شیخ معمر ابراہیم بن داود مانک پوری، شیخ حسام الدین علی المتقی صاحب "کنز العمال"، شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی گجراتی صاحب "مجمع بحار الأنوار"، سید عبد الاول بن علی بن علاء حسینی، وغیرہ۔

مذکورہ بالا علماء کرام میں سب سے زیادہ مشہور شیخ محمد بن طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) ہیں، اور وہ علم حدیث

کی اشاعت کے سلسلہ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں، ان کی مشہور زمانہ کتاب "مجمع بحار الأنوار في غرائب التنزيل ولطائف الأخبار" کے علاوہ "المغني في أسماء الرجال" اور "التذكرة في الموضوعات" موضوع احادیث کے موضوع پر متداول و مشہور کتاب ہے، علم حدیث میں ان کو بہت دخل و توغل تھا، انہوں نے بہت کام کیا، اور شہرت پائی، وسعت معلومات میں اور علمی بالغ نظری میں ہندوستان میں ان کے جیسا کوئی محدث نہیں گذرا۔

پھر شیخ عبدالحق بن سیف الدین بخاری دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) نے بڑا کام انجام دیا، دہلی میں درس وافادہ کا کام کیا، اور ایسی مقبولیت ہوئی کہ یہ کہا جانے لگا کہ وہ پہلے آدمی ہیں جو حدیث کو ہندوستان لائے، پھر ان کے بیٹے شیخ نورالحق (م ۱۰۷۳ھ) نے خدمت حدیث کا کام کیا، پھر مجدد الف ثانی حضرت احمد بن عبدالاحد سرہندی نے اپنے دیگر علمی کارناموں کے ساتھ حدیث شریف کی بھی خصوصی خدمت کی اور رواج دیا، اور ان کے بیٹے محمد سعید شارح مشکاۃ، اور سراج احمد سرہندی ثم رامپوری شارح جامع ترمذی، محمد اعظم بن سیف الدین معصومی سرہندی شارح صحیح بخاری اور دیگر علماء عظام نے حدیث کا کام کیا۔

پھر مجدد وقت حضرت احمد بن عبدالرحیم شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) جو غیر معمولی علمی وفکری خصوصیات کے حامل تھے، پیدا ہوئے اور انہوں نے علم حدیث میں خصوصی امتیاز پیدا کیا، اور حجاز جاکر وہاں سے بھی فیض حاصل کیا، اور واپس آکر حدیث کی تعلیم اور اشتغال کا ایک سلسلہ چلایا، جس کا اثر موجودہ عہد تک جاری ہے، اور علوم دینیہ عالیہ کے سلسلہ کی جو خدمات ان دو آخری صدیوں میں انجام پائیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے شروع ہوکر اور پھر ان کے شاگردوں کی کوششوں کا ثمرہ ہیں، اس سلسلہ کے تحت بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، خاص طور پر شاہ ولی اللہ کے صاحبزادگان شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، اور پوتے شاہ اسماعیل بن عبدالغنی اور شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحئی بڈھانوی، وہ حضرات ہیں جنہوں نے حدیث کے علم کی تعلیم وخدمت کو دیگر علوم کی خدمت پر غالب کردیا، اور آج تک ان کا چلایا ہوا خدمت حدیث کا سلسلہ جاری ہے، ان میں خاص طور پر شیخ محمد اسحاق بن محمد افضل عمری، جو شیخ عبدالعزیز کے نواسہ تھے، خصوصی مقام رکھتے ہیں، انہوں نے

اپنے نانا سے استفادہ کر کے ہندوستانی طلبہ میں اس سلسلہ کو چلایا، اور ہندوستان سے حجاز گئے اور درس حدیث کو عام کیا، ان کے علاوہ مولانا عبدالغنی بن ابوسعید مجددی (م ۱۲۹۶ھ) نے بھی امتیازی طور پر اس سلسلہ کو چلایا، ان کے علاوہ مفتی عبدالقیوم بن عبدالحی بڈھانوی، مولانا احمد علی بن لطف اللہ سہارن پوری، قاری عبدالرحمٰن بن محمد انصاری پانی پتی، سید عالم علی نگینوی (م ۱۲۹۵ھ)، سید نذیر حسین حسینی دہلوی (م ۱۳۲۰ھ)، سید حسن شاہ رامپوری (م ۱۳۱۲ھ)، مولانا ولایت علی صادق پوری (م ۱۲۶۹ھ)، مولانا قاضی محمد بن عبدالعزیز جعفری مچھلی شہری (م ۱۳۲۰)، مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیو بند ہوئے، ان حضرات کی کوششوں سے خدمت حدیث کا ایک وسیع سلسلہ قائم ہوگیا، جس کے نمایاں اثرات ان آخری دوصدیوں تیرہویں اور چودہویں صدیوں میں ظاہر ہوئے، اس دور میں خاص طور پر مولانا رشید احمد گنگوہی کا فیض زیادہ وسیع رہا، انہوں نے حضرت شیخ عبدالغنی بن ابوسعید دہلوی مہاجر سے فیض حاصل کیا تھا، اور پھر حدیث شریف کا حلقۂ درس قائم کیا، اور اس کا سلسلہ ۳۰ سال تک رہا، اور یہ درس ایک ہی سال میں صحاح ستہ کی تدریس پر مشتمل ہوتا تھا، اور آپ کا درس ضبط و تحقیق اور تدبر واتقان کے ساتھ ہوا کرتا تھا، ان کے اس طرز میں ان کے معاصرین میں سے کوئی ان کا مساوی نہ تھا، ان کے مشہور شاگردوں میں بطور مثال مولانا محمد یحیٰی کاندھلوی جو ہمارے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کے والد ہیں قابل ذکر ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کے علاوہ ان کے معاصرین میں جو دیگر حضرات اشتغال بالحدیث میں نمایاں رہے، ان میں خاص طور پر قابل ذکر مولانا عبدالحی بن عبدالحلیم انصاری لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) ہوئے، جنہوں نے اپنے والد سے پھر علماء حرمین شریفین سے کسب فیض کیا، اور اس موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں، اسی طرح سید صدیق حسن حسینی بخاری قنوجی نے قاضی زین العابدین اور ان کے بھائی شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی سے فیض حاصل کیا، اور کتابیں تصنیف کیں، شیخ حسین بن محسن یمانی کے شاگردوں میں شیخ شمس الحق بن امیر علی دیانوی ہیں، اور ان کے علاوہ قابل ذکر شخصیتوں میں عبدالمنان نابینا وزیر آبادی (م ۱۳۳۴ھ)، سید امیر حسن سہسوانی (م ۱۲۹۱ھ)، اور ان کے صاحبزادہ امیر احمد

(م ۱۳۰۶ھ)، شیخ محمد بشیر بن بدرالدین عمری (م ۱۳۲۳ھ)، حافظ عبداللہ غازیپوری (م ۱۳۳۷ھ) ہوئے، اس طریقہ سے آخری دو صدیوں میں علم حدیث سے اشتغال وخدمت کا اس برصغیر میں ایسا عظیم کام انجام پایا کہ علماء عرب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

اس عہد میں ہندوستانی علماء کی حدیث نبوی کی طرف توجہ اور علم حدیث سے شغف عالم اسلام کے دیگر ممالک سے زیادہ رہا، اور برابر جاری ہے، اور اس باب میں ہندوستان کا نام زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، ہندوستان کے مسلم علماء نے فن حدیث کی جو خدمت کی ہے اور برصغیر ہند وپاک و بنگلہ دیش کے فضلاء نے فن حدیث کی کتابوں کی تحقیق اور شروحات کے ذریعہ سے جس دلچسپی اور وابستگی کا ثبوت دیا ہے، اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے، ہندوستانی فضلاء کی تصنیف کردہ شروحات سے مدارس اسلامیہ دینیہ کے ذخیرۂ کتب میں خاصا اضافہ ہوا ہے، یہاں نابغۂ روزگار علماء اور ائمہ حدیث پیدا ہوئے، جنہوں نے برصغیر کے مختلف حصوں خصوصاً مغربی اور شمالی حصہ میں علم حدیث کے بڑے بڑے مراکز اور ادارے قائم کئے، جہاں ملک اور بیرون ملک کے طلبہ آ آ کر کسب فیض کرتے ہیں، ہندوستان کے بڑے اور عظیم الشان تعلیمی مراکز میں دارالعلوم دیوبند، مظاہرالعلوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور ان کے علاوہ دیگر مدارس ہیں، جنہوں نے علم وفن حدیث کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں حالانکہ چار صدی پہلے فن حدیث سے اس قدر شغف نہیں تھا، اس عہد میں یہاں کے اکثر علماء کی توجہ کا مرکز فقہ اسلامی، اصول فقہ اور دیگر فنون اور علوم عقلیہ تھے، جس کی وجہ سے اسلام کے دونوں بنیادی سرچشموں سے توجہ کم ہو گئی تھی، جس کے نتیجہ میں مسلم معاشرے میں بدعات وخرافات عام ہو رہی تھیں، نبی کریم ﷺ کی حقیقی اور صحیح اتباع کرنے میں لوگوں سے غفلت اور سستی ہو رہی تھی، اللہ تعالیٰ کا نہایت فضل وکرم ہوا کہ اس نے اس سرزمین میں دو جلیل القدر عالم اور علم حدیث کے امام پیدا کئے، جیسا کہ میں نے ذکر کیا، ان دونوں حضرات کی کوششوں سے علم حدیث سے خصوصی اشتغال کا نیا عہد شروع ہوا، انہوں نے اور پھر ان کے شاگردوں نے علم حدیث کی طرف خصوصی توجہ دی، اور درسگاہوں میں اس کی مقدار اور توجہ میں وسعت عام کردی، شاہ ولی اللہ دہلوی کی دینی واصلاحی وتجدیدی خدمات اور علمی جد وجہد کا اعتراف تمام سوانح

نگاروں اور مؤرخین نے کیا ہے، علامہ عبدالحی حسنی اپنی کتاب "الثقافة الإسلامية في الهند" میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی میدان فن حدیث میں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"محض اللہ کا فضل ہے کہ ایسے وقت میں ہندوستان کی سرزمین میں دانائے اسرار شریعت، واقف کار رموز حدیث، بے نظیر عالم، علماء کے سرخیل شاہ ولی اللہ دہلوی پیدا ہوئے، جنہوں نے ہندوستان میں درس حدیث کی مسند بچھائی، اس فن پر آپ نے کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، آپ کے علم سے بے شمار لوگوں کو فائدہ پہونچا، آپ ہی کی سعی وکوشش کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان سے بہت سی بدعات اور خرافات کا خاتمہ ہوا، مسائل فقہیہ کی صحت کا فیصلہ کتاب وسنت کی روشنی میں فرماتے تھے، اور فقہائے کرام کے اقوال کی تطبیق کتاب وسنت سے کرتے تھے اور صرف ان ہی اقوال کو قبول فرماتے تھے جن کو کتاب وسنت سے موافق پاتے تھے، اور ان کے صاحبزادگان اور شاگردوں نے اپنے اپنے وقت میں علم حدیث کی نشر واشاعت میں پورا پورا حصہ لیا، انہوں نے فن حدیث کو واضح طور پر فوقیت وفضیلت دی، جب تک ہندوستان میں مسلمان موجود ہیں اس وقت تک ان بزرگان کرام کا شکر مسلمانوں پر واجب ہے، اور انہوں نے فن حدیث کی خدمت واشاعت کر کے امت مسلمہ پر جو احسان کیا ہے وہ نا قابل فراموش ہے"۔

گذشتہ دوصدیوں کے دوران ہندوستان کے جن فضلاء نے علم حدیث کی طرف توجہ دی اور درس و تدریس اور شرح وتحقیق کے ذریعہ خدمات انجام دی یہاں ان میں چند خصوصی نام ترتیب کے بغیر بطور مثال یہاں ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱) فتح الملہم شرح صحیح مسلم، از علامہ شبیر احمد عثانی۔

(۲) إعلاء السنن، از مولانا ظفر احمد تھانوی۔

(۳) بذل المجہود فی حل سنن أبي داود، از مولانا خلیل احمد سہارنپوری، تحقیق وتعلیق: مولانا تقی الدین ندوی مظاہری۔

(۴) تحفة الأحوذي شرح جامع ترمذی، از مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری۔

(۵) التعلیق الصبیح علی مشکاۃ المصابیح، از مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔

(۶) العرف الشذی شرح جامع ترمذی، از علامہ انور شاہ کشمیری۔
(۷) فیض الباری شرح صحیح بخاری، از علامہ انور شاہ کشمیری۔
(۸) الکوکب الدری، از علامہ رشید احمد گنگوہی۔
(۹) لامع الدراری شرح صحیح بخاری، مولانا رشید احمد گنگوہی۔
(۱۰) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، از مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری۔
(۱۱) معارف السنن شرح جامع ترمذی، از مولانا محمد یوسف بنوری۔
(۱۲) اوجز المسالک شرح موطأ امام مالک، از مولانا محمد زکریا کاندھلوی، تحقیق وتعلیق: مولانا تقی الدین ندوی مظاہری۔
(۱۳) التعلیق الممجد علی موطأ للإمام محمد، از مولانا عبدالحی فرنگی محلی، تحقیق وتعلیق: مولانا تقی الدین ندوی مظاہری۔
(۱۴) کتاب الزھد والرقاق لعبداللہ بن المبارک، تحقیق وتعلیق مولانا حبیب الرحمن اعظمی۔
(۱۵) آثار السنن، از علامہ ظہیر احسن نیموی۔
(۱۶) أشعۃ اللمعات، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔
(۱۷) الحل المفہم شرح صحیح مسلم، از مولانا رشید احمد گنگوہی۔
(۱۸) أمانی الاحبار شرح معانی الآثار، از مولانا محمد یوسف کاندھلوی۔
(۱۹) ترجمان السنۃ، از مولانا بدر عالم میرٹھی۔
(۲۰) عون المعبود شرح سنن ابی داود، از مولانا محمد اشرف دیانوی۔
(۲۱) فتح العلام لشرح بلوغ المرام، از نواب صدیق حسن خاں قنوجی۔
(۲۲) معارف الحدیث، از مولانا محمد منظور نعمانی۔
(۲۳) ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ، از مولانا عبدالرشید نعمانی ندوی۔
(۲۴) تہذیب الاخلاق، از مولانا عبدالحی حسنی، اور اس کی شرح ''روائع الاعلاق''،

از مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی۔

(۲۵) کتاب الزھد الکبیر، تحقیق و تعلیق: مولانا تقی الدین ندوی مظاہری۔

یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے حدیث شریف کی کتابوں پر تحقیق و تعلیق وشرح جیسے کاموں میں خصوصی حصہ لیا، اسی کے ساتھ ساتھ ان حضرات کا امتیاز کتب حدیث شریف کی تدریس میں بھی رہا، ان حضرات کے علاوہ بھی متعدد نام اسی درجہ کے ہیں، ان میں بڑی تعداد ان حضرات کی ہے جن کا خصوصی امتیاز تدریس حدیث میں رہا، ان میں خاص طور پر مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا حیدر حسن خان ٹونکی شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء اور پاکستان کی کئی جامعات کے شیخ الحدیث، مولانا شاہ حلیم عطا سلونی شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء، گذشتہ صدی تک کے یہ نام ہیں، موجودہ صدی کے ممتاز ناموں کا تذکرہ باعث طوالت ہے۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ جس کو حدیث شریف سے خصوصی اشتغال رکھنے والے عالم دین مولانا تقی الدین ندوی مظاہری نے قائم کیا، انہوں نے اس کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ایماء سے قائم کیا، جن سے انہوں نے حدیث شریف میں خصوصی فیض حاصل کیا، اور ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں حدیث شریف کی کتابوں کی تحقیق و تعلیق ونشر کے اہتمام پر بڑا وقت صرف کر رہے ہیں، ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے بھی خصوصی تعلق رہا ہے، اور ان کی نسبت سے معلومات کی تحقیق ومطالعہ کا ایک شعبہ "مركز الشيخ أبي الحسن الندوي للبحوث و الدراسات الإسلامية" قائم کیا، آج اسی ادارہ کے تحت وہ حدیث شریف پر یہ اہم سیمینار منعقد کر رہے ہیں، اس سے ان شاء اللہ علمائے برصغیر کی گذشتہ دو صدیوں میں حدیث شریف کی جو خدمات ہیں، وہ سامنے آئیں گی، اور اس اہم موضوع کے سلسلہ میں ایک اہم خدمت انجام پائے گی، اللہ قبول فرمائے اور مفید بنائے۔



ہندوستان اورعلم حدیث

از: مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد الأنبياء و المرسلين محمد و على آله و أصحابه و من تبعهم و دعابدعوتهم اجمعين ، اما بعد :

بارگاہ رب العزت میں سراپا سپاس ہوں کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم اور بے پایاں عنایات سے توفیق بخشی کہ آج جامعہ اسلامیہ مظفر پور میں ان تمام ذی قدر روزی مرتبت ضیوف کوخوش آمدید کہہ سکوں جو''تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں ہندوستان اورعلم حدیث'' کے موضوع کی مناسبت سے دور دراز سے تشریف لائے اور جامعہ اسلامیہ کے احاطہ اوراس کے ماحول کو مبارک، مقدس اور معطر بنادیا۔

ہندوستان میں علم حدیث سے تعلق اور اشتغال کی تاریخ مسلمانوں کی آمد کی تاریخ سے جدا نہیں ہے، سندھ اور گجرات کی اسلامی تاریخ اس علم شریف کی ابتداء اور عروج کی داستانوں سے مزین ہے، دوسری صدی ہجری میں ربیع بن صبیح السعدی کے قدوم میمنت لزوم نے گجرات کی خاک کو ہندوستان کے لیے سرمۂ بصیرت بنایا، وہ تبع تابعی تھے اوراس سے بڑھ کران بزرگوں میں تھے جنہوں نے احادیث کے منتشر اوراق کو یکجا کرنے میں اول اول حصہ لیا تھا، بعد کے ادوار میں ابو معشر نجیح

سندھی، امام حسن بن محمد صغانی، شیخ علی متقی برہانپوری، علامہ محمد طاہر پٹنی کی کوششوں اور حدیثی خدمات کا اثر تھا کہ ان کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی شکل میں علم حدیث کے برگ و بار ظاہر ہوئے، خصوصاً شاہ ولی اللہ دہلوی کے فیوض و برکات کے پُر فیض سحاب نے پورے ہندوستان کو علم حدیث کے چمنستان میں بدل دیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد شاہ عبدالعزیز متوفی ۱۲۳۹ھ اور ان کے بے شمار تلامذہ اور پھر ان کے ذریعہ لکھنؤ، لاہور، بھوپال، عظیم آباد، مدراس، غرض ہندوستان کے ہر گوشے میں جس طرح حدیث کی مجلسیں آراستہ ہوئیں اور کتابت حدیث سے اشتغال عام ہوا اس کی ایک جھلک حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات میں دیکھی جاسکتی ہے، صرف غازیپور کے شرفاء کے ایک قصبہ کے ایک علمی خاندان کی فہرست سید صاحب کو ملی، کتابیں سب کی سب قلمی تھیں اور ان میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، شمائل ترمذی، مشکوۃ المصابیح، شرح بخاری، جمع بین الصحیحین للحمیدی، حاشیہ مشکوۃ شریف للعلامۃ سید شریف جرجانی، شرح حصن حصین لملا علی قاری، تیسیر الوصول فی احادیث الرسول اور موطا امام مالک جیسی کتابیں بھی تھیں، علم حدیث سے اسی اشتغال کا اثر تھا کہ چودھویں صدی آتے آتے بڑے بڑے شہروں اور بڑے اداروں کے ساتھ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں علم حدیث کے بڑے بڑے ایوان آراستہ نظر آنے لگے، عربی زبان میں تشریح وتعلیق کے ساتھ خود اردو زبان میں کثرت سے کتابیں سامنے آنے لگیں، چہل حدیث یا اربعین کے مجموعوں کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے، یہی حال ترجموں کا ہے، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداود، دارمی، مشکوۃ کے متعدد ترجمے ہوئے، موضوعات کبیر کا بھی ترجمہ ہوا، احادیث کا انتخاب بھی کثرت سے ہوا، معارف الحدیث، صیانۃ الحدیث، ترجمان الحدیث، ترجمان السنۃ، غرض حدیث شریف کے موضوع پر متنوع کاوشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا اور اس کے ضمن میں ایک بڑی خدمت یہ بھی ہوتی گئی کہ مستشرقین کے زیر اثر منکرین حدیث کے علمی رد وابطال میں بھی تفہیم حدیث کی راہیں ہموار ہوئیں، حجیت حدیث پر اس سے پہلے شاید ہی اس قدر وسیع کام ہوا ہو۔

عربی زبان میں قدر نسبتاً زیادہ وقیع کام ہوا، طباعت واشاعت کے لحاظ سے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے نایاب اور مشکل الحصول کتابوں کے احیاء میں جو خدمات انجام دی اس نے بے شبہ اسلامیان ہند کا سر فخر سے اونچا کر دیا، دہلی، کانپور، میرٹھ، کلکتہ، لاہور، ملتان، لکھنؤ، آگرہ، بھوپال، بمبئی، پٹنہ، سہارنپور، تھانہ بھون، امرتسر، الہ آباد کے مطابع نے جس شوق اور محنت سے امہات کتب حدیث کو شائع کیا، اس زمانے کے دمشق، بیروت اور قاہرہ نے بھی اس پر رشک کیا، دائرۃ المعارف پر حیرت نہیں ہونی چاہئے لیکن لکھنؤ کے منشی نول کشور پریس نے تیسیر الوصول إلی جامع الاصول للقسطلانی کے علاوہ ارشاد الساری اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی شرح مشکوۃ المصابیح کی طباعت کا جو اہتمام کیا وہ واقعی حیرت کے لائق ہے۔

مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا ظہیر احسن شوق نیموی، مولانا عبدالرحمن مبارکپوری، نواب نورالحسن خاں، مولانا شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا احمد علی سہارنپوری، میاں نذیر حسین دہلوی، مولانا نورالحق، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، نواب صدیق حسن خاں، سبحان بخش شکارپوری، مولانا سخاوت علی جونپوری، مولوی قطب الدین خاں دہلوی، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اصغر حسین بہاری یہ چند بے ترتیب نام ہیں، علمائے فرنگی محل و دیوبند و سہارنپور کی خدمات کے لیے تو ایک سفینہ چاہیے۔

گذشتہ صدی میں تو شاید علم حدیث سے ربط و تعلق و اعتناء اپنی معراج کو پہنچ گیا، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا عبیداللہ مبارکپوری، ڈاکٹر حمید اللہ نے تدوین، تعلیق اور شروح و حواشی سے اور سب سے بڑھ کر میرے مربی و مرشد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی تالیفات نے جس طرح سارے عالم میں غلغلہ پیدا کیا، اس کی شرح و بسط کے لیے تو ایک زندگی چاہئے، ہمارے شیخ نے فہم حدیث کے نئے نئے دروا کر دیئے، اٹھارہ جلدوں میں اوجز المسالک اور چودہ جلدوں میں بذل المجہود میں تعلیق و تشریح کی جو خدمت انجام دی اس سے ہندوستان، عالم اسلام میں سرخ رو ہوا۔

اوجز المسالک اور بذل المجہود کے ذکر میں یہ ناچیز اگر اپنی کاوشوں کا ذکر کرے جو سراسر فیض

ہے ہمارے حضرت شیخ کا تو یہ شاید بے محل نہ ہو، اس خاکسار کو علم حدیث کا شوق بلکہ اسی کو سرمایہ حیات بنانے کا جو جذبہ ملا وہ ہمارے حضرت کاندھلوی کی دعاؤں اور توجہات کا نتیجہ ہے، ندوۃ العلماء نے حدیث شریف کی تدریس کی سعادت بخشی، ''محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے'' کتاب کو بزرگوں نے تحسین کی نظر سے دیکھا، الحمد للہ تب سے علامہ عبدالحیٔ لکھنوی کی التعلیق الممجد کی تحقیق و تعلیق تین جلدوں میں اور علامہ لکھنوی کی ظفر الامانی فی شرح مختصر الجرجانی اور کتاب الزہد الکبیر للامام البیہقی کی تحقیق وتعلیق کی فرصت بھی اللہ تعالیٰ نے بخشی، امام بخاری، امام ابوداود اور امام مالک کی سوانح اور علم رجال الحدیث پر عربی تصنیفات پیش کرنے کا موقع بھی ملا، لیکن زندگی کی سب سے بڑی خوش نصیبی چودہ جلدوں میں بذل المجہود کے حواشی کی تحقیق اور اٹھارہ جلدوں میں اوجز المسالک اور التعلیق الممجد کی تحقیق وتعلیق کو مانتا ہوں، ان کتابوں کو عالم عرب میں جس قدر پذیرائی ملی وہ بھی محض اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے، امارات کی حکومت نے ان کتابوں کی طباعت واشاعت کا اہتمام کیا، رئیس الازہر نے اوجز المسالک کے بارے میں فرمایا:

''شیخ الحدیث والمحدثین علامہ محمد زکریا کاندھلویؒ کی یہ تالیف درحقیقت موطأ امام مالک کی نہایت جامع شرح ہے اور یہ کتاب ان طلباء و باحثین کے لئے جو جامعہ ازہر سے منسلک ہیں بہت بڑی خدمت ہے، نیز یہ عالم عربی اور اسلامی کے درمیان علمی وثقافتی رابطہ کا بہترین ذریعہ ہے''۔

عالم عرب کے حکومتی اور علمی وتحقیقی حلقوں میں اس قدر مقبولیت، درحقیقت علمائے ہند کی مساعی کی قدر ہے، ان کی کتابوں نے عالم اسلام میں ہندوستان کی تصویر کو آب ورنگ عطا کیا ہے، یہ کہنا شاید بے جانہ ہو اور شاید یہ احساس بھی غلط نہ ہو کہ عالم عرب بلکہ عالم اسلام سے ہندوستان کے تعلقات کو پاکیزہ اور مستحکم بنانے میں ان کتابوں کی اشاعت بھی ایک موثر ترین عنصر ہے، جو عمل سفارتی سطح پر مشکل ہے، ان کتابوں کے ذریعہ آسان ہوتا نظر آتا ہے، بہرحال ہماری اصل نیت اور مقصد تو یہی ہے کہ وہ شمع جو دوسری صدی ہجری میں ہندوستان میں روشن ہوئی تھی اور جو صدیوں اور قرنوں تک روشن رہی اور تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری میں تو یہ جشن چراغاں کی شکل اختیار کر گئی

آئندہ اس کی لویں، تابندہ تر ہوں، آج اس سیمنار کے انعقاد میں صرف یہی تمنا موجزن ہے۔

اس وقت جو اہم تحقیقی کام مرکز میں ہماری نگرانی میں ہو رہا ہے وہ ہے بخاری شریف کا کام، اللہ کے فضل سے یہ ہمارے بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ بخاری کا وہ نسخہ جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے استاذ حضرت ابو طاہر کردی کے استاذ شیخ عبداللہ سالم بصری محدث حجاز کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ہمیں دستیاب ہوا، جس کی عرصہ سے علماء کو تلاش تھی اس پر تحقیق کا کام شروع ہو چکا ہے اللہ کرے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچے اور دنیا کے سامنے اچھی شکل میں آئے[1]۔

آخر میں ایک بار پھر جامعہ اسلامیہ کی سرزمین پر آپ تمام حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اس مذاکرہ علمی کو اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے اور ہم سب کی خواہشوں اور کاوشوں کو اپنی بارگاہ میں قبولیت سے نوازے۔



---

[1] الحمدللہ یہ کتاب "الجامع الصحيح للبخاري بحاشية المحدث السهارنفوري" کے نام سے دیدہ زیب طباعت کے ساتھ پندرہ جلدوں میں بیروت سے شائع ہو کر عالم اسلام میں پھیل رہی ہے اور مقبول ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں علم حدیث

اور

خانوادۂ شاہ ولی اللہؒ

از: مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

سرزمین ہند تقریباً آغاز اسلام ہی سے آفتاب نبوت کی کرنوں سے منور رہی، اور ہر عصر وعہد میں علماء، صوفیہ اور بزرگانِ دین کی ایک کثیر تعداد کی آماجگاہ بنی رہی، تاریخ سے بہت ہی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے عہد فاروقی ہی میں سرزمین سندھ پر قدم رکھ لیا تھا اور تیسری صدی تک انہوں نے وہاں جہاں بانی اور سیاست رانی کے جوہر دکھائے تھے، اس بت کدۂ آذری میں مسلمانوں کے جس پہلے قافلہ نے صدائے حق بلند کی تھی اس میں ایک محدث اور تبع تابعی کے وجود کا بھی پتہ ملتا ہے، جن کا نام ربیع تھا (معارف ج ۲۲ ص ۲۵۱) اور جن کے بارے میں شیخ سبحان علی نے لکھا ہے کہ وہ اسلام کی پہلی صاحب تصنیف شخصیت ہیں۔ (تذکرۂ علمائے ہند ص ۳)

عرب وہند کے تعلقات جو تیسری صدی میں قائم ہوئے تھے وہ بتدریج پروان چڑھ کر ایک تنومند درخت کی شکل اختیار کر گئے، اس کے نتیجہ میں سرزمین سندھ، جو کہ وارد ین کی منزل اولین تھی، علماء وفضلاء کی سرگرمیوں کی جولان گاہ بنی ہوئی تھی، چنانچہ بشاری مقدی جب چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان آیا تو اس نے محدثین کی ایک بڑی جماعت اس ملک میں دیکھی، (احسن التقاسیم ص ۴۸۱)

علاوہ ازیں اس نے قاضی ابو محمد منصوری سے ملاقات بھی کی، اس نے لکھا ہے کہ" قاضی صاحبؒ نے اچھی اچھی کتابیں تالیف کی ہیں، (معصر سابق) لیکن سندھ میں علوم اسلامیہ کی اس ترقی کے باوجود اس کے اثرات دور رس نتائج کے حامل نہ ہو سکے اور اسلامی علوم کے قافلے ملک کے دوسرے حصوں میں نہ پہونچ سکے۔

یہ صحیح ہے کہ غزنوی فتوحات سے پہلے ہی سندھی فضلاء کی جدو جہد سے علوم اسلامیہ نشوونما پا چکے تھے، لیکن سلطان محمود غزنوی کے حملۂ ہندوستان کے بعد ایک باقاعدہ اور منظم شکل میں علمی وتمدنی ترقیات کا آغاز ہوا اور پھر غوریوں، بلبنیوں، تغلقوں اور لودیوں کے عہد سلطنت میں تو اسلامی علوم وفنون کے ہر گوشہ کو وہ ترقی ہوئی اور ماہرین فن کی ایک کثیر جمعیت نے ملک کے کونے کونے کو اپنی علمی جدوجہد سے ایسا رشکِ فلک بنا دیا کہ اس کی نظیر دیگر ممالک میں بھی خال خال ہی ملتی ہے، چنانچہ بقول ضیاء الدین برنی اس وقت صرف دہلی میں ایسے علماء اور ماہرین فن موجود تھے جن کی مثال بخارا، سمرقند اور بغداد میں بھی نہیں مل سکتی۔ (تاریخ فیروز شاہی ج اص ۳۵۲)

متذکرۃ الصدر ادوار میں علوم وفنون کی ترقی کے اعتبار سے سب سے زیادہ تابناک دور خلجیوں کا ہے اس میں اکابر علماء اور یگانۂ روزگار فضلاء نے ملک کے طول وعرض کو اپنی شعلہ نفسیوں سے سرگرم اور نوانجیوں سے پُر شور کر رکھا تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب" حیات شیخ عبدالحق" میں اس عہد زریں کے فضلاء کی ایک طویل فہرست درج کی ہے۔

(تفصیلی مطالعہ کے لیے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں)

غرض اسلامی ہند نے اپنے ابتدائی دور ہی سے محدثین عظام کی ایک بڑی تعداد پیدا کی اور علوم اسلامیہ بالخصوص حدیث وتفسیر کی متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں، اس تحقیق جدید کے منصۂ شہود پر آ جانے کے بعد اب اس سابق رائے کی اہمیت نہیں رہ گئی ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ رحمہما اللہ سے پہلے ہندوستان میں علم حدیث کا وجود نہ تھا اور دراصل شیخ محدث دہلوی ہی:

"اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود"

تاہم اس حقیقت سے مجال انکار نہیں کہ گیارھویں صدی میں جب علم حدیث عام بے اعتنائی کا شکار ہو کر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا تو شیخ محدثؒ ہی کی جدو جہد سے اس کو نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی، اور اگر فی الواقع انہوں نے اس طرف توجہ نہ کی ہوتی تو سرزمین ہند حدثنا واخبرنا کے دلنواز زمزموں سے محروم ہو جاتی۔

شیخ عبدالحق محدثؒ: بلاشبہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ہندوستان میں علم حدیث کے سر بمہر خزانہ کو وقف عام کیا اور اپنی مقبول محققانہ تالیفات کے ذریعہ سے علمائے ظاہر و باطن دونوں حلقوں سے تحسین حاصل کی۔ (معارف ج ۲۲ ص ۲۶۷) ہندوستان میں علم حدیث کے سلسلہ کی بیشتر روایات شیخ محدثؒ ہی نے قائم کیں، ان روایات پر شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خانوادۂ عالیہ نے نہ صرف پوری طرح عمل کیا بلکہ پایۂ تکمیل کو پہونچایا، (حیات شیخ عبدالحق ص ۲۸۵) چنانچہ پروفیسر نظامی رقمطراز ہیں:

"اسلامی ہند کی فضائے علم و ادب جن روشن و تابناک ستاروں سے مزین ہے، ان میں شیخ عبدالحق کو ایک امتیازی شان حاصل ہے، انہوں نے نصف صدی سے زیادہ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین کا ہنگامہ گرم رکھا، ان کا قلم عمر بھر قرآن و حدیث کے اسرار و حکم کے کشف و تحقیق میں گہر افشانی کرتا رہا"۔ (مصدر سابق)

داراشکوہ نے ان کو "امام محدثان وقت" کے الفاظ سے خراج تحسین پیش کیا ہے، (مصدر سابق بحوالۂ سفینۃ الاولیاء) شیخ سبحان علی نے لکھا ہے کہ: "علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از وشیوع یافتہ"۔ (تذکرۂ علمائے ہند ص ۶)

مولانا ابوالکلام آزاد خامہ ریز ہیں:

"شیخ عبدالحق جس دور علم و تعلم کے بانی ہوئے اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو کہ ملک کی عام زبان تھی تصنیف و تالیف کی بنیاد ڈالی گئی"۔ (تذکرۂ آزاد ص ۶۵)

شیخ عبدالحق محدثؒ کو جس چیز نے تاریخ میں بقائے دوام عطا کیا وہ ان کا یہی عظیم کارنامہ ہے جو انہوں نے علم حدیث کی ترویج واشاعت کی راہ میں انجام دیا، انہوں نے کتب حدیث کو اپنے زمانہ کے نصاب تعلیم کا لازمی جزو بنا کر اپنے مدرسہ میں اس کے درس کی ابتدا کی جس کو ان کی اولاد واحفاد نے بھی مدتوں تک جاری رکھا، شیخ محدثؒ نے فارسی زبان میں مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھی، ان کی تصانیف کی تعداد سو تک پہونچتی ہے۔ (ابجد العلوم ص ۹۰۱)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے نامور خانوادہ کے ذکر جمیل سے قبل شیخ عبدالحق محدثؒ کا اجمالی تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر شاہ صاحبؒ کا تذکرہ ناقص رہتا ہے کیونکہ علم حدیث کے جس تاج محل کی شاہ ولی اللہ نے تعمیر کی اس کی بنیاد شیخ محدثؒ ہی نے رکھی تھی۔

خانوادۂ ولی اللّٰہی:

گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری میں علمائے ہند کی بیشتر توجہ فلسفہ اور علم کلام کی جانب مبذول ہونے لگی تھی اور انہوں نے قرآن وحدیث کو نصاب درس میں ایک ثانوی حیثیت دے رکھی تھی، ملا بدایونی نے بھی لکھا ہے کہ "فقہ وتفسیر اور ان کے پڑھنے والے نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اس کے برخلاف نجوم وحکمت اور افسانہ وتاریخ وغیرہ علوم عام طور پر رائج تھے اور ان کی تحصیل ہر شخص لازم خیال کرتا تھا"۔ (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۰۶)

سلطنت مغلیہ کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں تو اسلامی ہند سیاسی حیثیت کے ساتھ مذہبی وتمدنی حیثیت سے بھی تباہ وبرباد ہو رہا تھا، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں رسوم وبدعات کا بہت زور تھا، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق وحکمت کے ہنگاموں سے پُر شور تھا، عوام تو عوام، خواص تک قرآن پاک کے معانی ومطالب اور احادیث کے احکام وارشادات سے بے خبر تھے۔ (معارف ج ۲۲ ص ۳۴۱)

ایسے پُر آشوب اور نازک وقت میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا وجود مسعود اہل ہند کے لیے بلاشبہ ایک موہبت عظمیٰ اور عطیۂ کبریٰ سے کم نہ تھا، دیگر کمالات کے علاوہ ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ

انہوں نے پیہم جدو جہد اور جانکاہ محنت سے دین مبین کے ہر شعبہ میں مصلحانہ خدمات انجام دیں اور اپنے بعد ایسی اولاد چھوڑ گئے جنہوں نے ولی اللّٰہی مشن کو عروج و کمال تک پہونچا کر چھوڑا، آج ہندوستان میں درس حدیث کے جتنے بھی سلاسل قائم ہیں سب بالواسطہ اسی خانوادۂ عالیہ کے خوشہ چیں ہیں، شاہ صاحبؒ تقریباً بچیس سال مسند علم وارشاد کی زینت رہے، پھر ان کی رحلت اخروی کے بعد چاروں مایۂ فخر صاحبزادگان نے اس محفل علم وعمل کو مزین کیے رکھا۔

نواب صدیق حسن خانؒ اس خاندان عالی نسب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''ابجد العلوم'' میں رقم طراز ہیں:

> ''اس خاندان کا ہر فرد اپنے اسلاف اور اعمام کی طرح عالم دین، صاحب مرتبت اور حکیم وفقیہ تھا، اور ہونا بھی چاہئے تھا، کیونکہ یہ حضرات علم وعمل میں یکتائے زمانہ ہونے کے ساتھ نسب عالی فاروقی کے بھی حامل تھے، اس بیت العلم کے تمام افراد جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل ہونے کے ساتھ مشائخ وقت بھی تھے، یہاں تک کہ ہندوستان بھر میں کوئی ایک گھرانہ بھی اس کا مثیل اور ہم پلہ نہ ہوسکا''۔
>
> (ابجد العلوم: ص ۹۱۴)

اسی طرح موصوف اپنی ایک دوسری تالیف ''اتحاف النبلاء'' میں بڑے سرشارانہ انداز میں خامہ ریز ہیں:

> ''اولاد و احفاد او (یعنی شاہ ولی اللہ ''ن'') کہ ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت وفرید دہر ووحید عصر در علم وعمل وعقل وفہم وقوت تقریر وفصاحت تحریر وتقوی ودیانت و امانت ومراتب ولایت بود، وہم چنیں اولاد اولاد''۔ (اتحاف النبلاء، ص ۴۳۰)

(شاہ ولی اللہ کی اولاد واحفاد میں سے ہر ایک علم وعمل، عقل وفہم، زور بیان، فصاحت تحریر، تقویٰ و دیانت داری، امانت اور مراتب ولایت میں یکتائے زمن اور بے نظیر وقت تھا اور اسی طرح ان کے پوتے بھی)۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ہند کی اتنی طویل تاریخ میں کوئی ایک نظیر اور مثال بھی ایسی پیش نہیں

کی جاسکتی کہ کسی خانوادہ نے مسند تدریس کو تقریباً دو صدیوں تک آراستہ کیے رکھا ہو، اور حدیث نبوی کا چشمہ رواں کر کے نہ صرف سرزمین ہند کو سیراب کیا ہو بلکہ اطراف عالم کے تشنگان علم بھی اس سے مستفید ہوئے ہوں، یہ فضل وتقدم نصیبہ وسعادت ہے صرف ولی اللّٰہی خانوادۂ عالیہ کا، جس کا ہر فرد نیر تاباں اور خورشید درخشاں تھا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ:

حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ کے حالات زندگی بہت تفصیل کے ساتھ کتب تذکرہ وتراجم میں مذکور ہیں، راقم سطور نہ اس میں کچھ اضافہ کر سکتا ہے اور کوئی جدت وندرت پیدا کر سکتا ہے، اس لیے غیر ضروری امور سے صرف نظر کر کے علم حدیث کی راہ میں ان کی گراں قدر خدمات کا اجمالی جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ایک مشہور ومعروف سوانح نگار کے درج ذیل الفاظ گونہایت مبالغہ آمیز ہیں تاہم حقیقت واقعہ سے یکسر خالی بھی نہیں ہیں۔

> ''انصاف یہ ہے کہ علم حدیث میں جس اولیت کا تمغہ اس زمانے کے مؤرخوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے لیے تجویز کیا ہے اس کے مستحق جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ ہیں، چونکہ علم حدیث کی عمارت کے بانی اگر جناب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تھے، لیکن جنھوں نے اس عمارت کا نقشہ تیار کیا اور پھر اشاعت ورواج کے مرقعوں سے اس کے در و دیوار کو سجایا وہ بلاشبہ شاہ ولی اللہ ہیں''۔ (حیات ولی ص۳۸۴)

اس حیثیت سے یقیناً شاہ صاحبؒ کو فضیلت حاصل ہے کہ ان کا کام بہ نسبت شاہ عبدالحق کے زیادہ کامل اور مکمل شکل میں نمودار ہوا لیکن گیارھویں صدی میں علم حدیث کی تقریباً مٹی ہوئی شکل کو سنبھالا دینا اور پھر اس کو حیات نو سے ہم کنار کرنا یہ وہ کارنامہ ہے جو شیخ عبدالحق کو مرتبۂ اولیت پر فائز کرتا ہے، شاہ صاحبؒ نے صرف شیخ محدثؒ کی مساعی کی تکمیل کی، تالیف وتحریر کے ذریعہ کتب حدیث کو عام کیا، حدیث کی اولین اور صحیح ترین کتاب موطأ امام مالک کی عربی اور فارسی میں دو مجتہدانہ شروح لکھیں،

(معارف ن ۲۴ص ۳۴۳) عربی شرح کا نام "مسوّیٰ" اور فارسی کا "مصفّیٰ" ہے، علاوہ ازیں صحیح بخاری کے تراجم کی "رسالة فی شرح تراجم أبواب البخاري" کے نام سے مشہور شرح لکھی، اس کے علاوہ "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الأمین" کے نام سے ایک رسالہ تالیف کیا اور حدیث کے اسرار و معارف میں شہرۂ آفاق کتاب "حجة الله البالغة" لکھی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم دہلویؒ نے دہلی میں ایک مدرسہ حدیث نبویؐ کی تعلیم کے لیے قائم کیا تھا جو "مدرسہ رحیمیہ" کے نام سے معروف ہوا، وہ تاحیات اس میں درس دیتے رہے، ان کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجاز مقدس سے واپسی پر اس مدرسہ کی مسند تدریس کو زینت دی اور مکمل بارہ سال تک غایت انہماک کے ساتھ اس خدمت میں مصروف رہے، ان کے شہرۂ تدریس کے باعث دور دراز ملکوں کے طلبہ دشوار گزار سفر طے کر کے وہاں حاضر ہوتے اور اس درس گاہ میں داخلہ لے کر شاہ صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے۔

معروف تذکرہ نویس شیخ رحیم بخشؒ، شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

"جب ہندوستان کے اقبال و یاوری کا ستارہ چمکا تو فطرت نے جولانگاہ حدیث کے شہسوار کو پیدا کیا، یعنی شاہ ولی اللہ صاحب اس سرزمین میں ظاہر ہوئے، جن کے علم و فضل کی صدائیں ہندوستانی حدود سے نکل کر عرب و عجم میں پہونچیں اور جن کی ربانی مقبولیت تمام بلاد اسلامیہ میں پھیل گئی، چونکہ آپ علم و عمل دونوں میں خاص طور سے مشہور تھے اور آپ کا علمی کمال اعلیٰ درجہ کی وقعت کے ساتھ لوگوں کے کانوں میں گونج رہا تھا، اس لیے اطراف عالم کے لوگ بے اختیارانہ جوش کے ساتھ آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور آپ کے درس و تدریس کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا، آپ نے بڑی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ علم نبوی کی اشاعت میں کوشش کی اور اپنی انتھک کوششوں سے علم نبوی کو اس قدر

رواج دیا کہ اب شیخ محدث دہلویؒ کی ڈالی ہوئی بنیادیں آسمان سے
باتیں کرنے لگ گئیں۔ (حیات ولی: ص ۶۵)

یوں تو شاہ صاحبؒ کو تمام ہی علوم اسلامیہ میں مہارت تامہ اور ید طولی حاصل تھا لیکن علم حدیث وتفسیر میں وہ خصوصی درک رکھتے تھے، بلاشبہ ان کی مساعی وجد وجہد سے ہندوستان کی فضائیں قال اللہ و قال الرسول کے نغموں سے معمور ہوگئی تھیں اور یہی علوم جو کبھی پستی وتاریکی میں گم تھے ان کا چرچا اتنا عام ہوا کہ علماء کے ہر حلقہ اور طلبہ کے ہر استدلال میں حدیث کے مقدس الفاظ کی گونج سنائی دینے لگی اور حقیقت تو یہ ہے کہ سرزمین ہند شاہ صاحب کی خدمات حدیث کے لیے ہمیشہ گرانبار احسان رہے گی، بقول نواب صدیق حسن خاں "اگر شاہ صاحب کا وجود مسعود گذشتہ عہد میں ہوتا تو ان کا شمار ائمہ اعلام میں ہوتا"۔ (اتحاف النبلاء: ص ۴۳۰)

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ البالغۃ" کے متعلق نواب صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ "وہ اگرچہ علم حدیث میں نہیں ہے، لیکن احادیث کی شرح اور ان کے اسرار وحکم اس کتاب میں بکثرت موجود ہیں اور یہ کتاب اس پایہ کی ہے کہ عرب وعجم کے علماء نے اس کے مثل اب تک کوئی کتاب تصنیف نہیں کی"۔ (مصدر سابق)

علامہ سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں:

> "اللہ تعالی نے شاہ صاحبؒ کے حسن نیت کا ثمرہ یہ دیا کہ ان کو ایسی لائق اولادیں عطا فرمائیں جنہوں نے اپنے والد بزرگوار کے ناتمام کاموں کی پوری تکمیل کی اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو پیغام نبویؐ کے آوازہ سے معمور کردیا"۔ (معارف: ج ۲۲ ص ۳۳۳)

بارھویں صدی کی ساتویں دہائی میں شمع حدیث کے اس پروانہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، انہوں نے چار اولاد امجاد یادگار چھوڑیں، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی رحمہم اللہ اجمعین، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ماہ کامل تھا۔

شاہ عبد العزیز دہلویؒ:

شاہ عبد العزیزؒ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) کی تعلیم وتربیت کے تمام مدارج ان کے نامور والد کی زیر نگرانی انجام پذیر ہوئے، وہ صرف پندرہ سال کی کم عمری میں علوم اسلامیہ، حدیث وفقہ سے فارغ التحصیل ہو گئے تھے، سترہ سال کی عمر میں والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے، چونکہ وہ اپنے تمام برادران میں سب سے بڑے اور علم میں فائق تھے اس لیے وہی ولی اللّٰہی مسند حدیث اور خلافت کے جانشین ہوئے، ہندوستان کے تمام سلاسل محدثین شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے واسطہ سے شاہ ولی اللہؒ پر منتہی ہوتے ہیں۔ (حیات ولی: ص ۵۸۶)

شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ نے اپنے پدر بزرگوار کے شروع کیے ہوئے کاموں کو آگے بڑھایا، درس و تدریس کا چرچا عام کیا اور علم حدیث کو فروغ دیا، احیائے شریعت اور تجدید دین کی راہ میں بڑے کارنامے انجام دیئے، ان کی درسگاہ سے فارغ ہو کر جو تلامذہ علم وفن میں ممتاز ومعروف ہوئے ان کی تعداد حد شمار سے باہر ہے، اس دور میں جتنے نمایاں محدثین اور اساتذۂ حدیث تیار ہوئے وہ سب دراصل حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے فیض یافتہ تھے، انہوں نے اطراف ملک میں منتشر ہو کر "حدثنا" اور "اخبرنا" کا غلغلہ بلند کیا۔

شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی اہم تصانیف میں ان کی تفسیر "فتح العزیز" ہے جو فارسی زبان میں ہے، فن حدیث میں ان کی تالیف "بستان المحدثین" حدیث میں ان کی وسعت نظر کی دلیل ہے، اصول حدیث میں "عجالۂ نافعہ" مختصر ہونے کے باوجود بے نظیر تالیف ہے، اہل تشیع کے رد میں ان کی کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" اپنے موضوع پر حرف آخر کہی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کی بہت سی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تالیفات یادگار ہیں۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ:

یہ عمر میں شاہ عبد العزیزؒ سے چھوٹے تھے، علم حدیث وتفسیر کی سند اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے حاصل کی، تمام علوم عقلیہ وشرعیہ میں اجتہادی شان و درجۂ کمال رکھتے تھے، اگرچہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فیض کو سب سے زیادہ ان کے فرزند اکبر شاہ عبد العزیزؒ نے عام کیا، لیکن جب وہ

مکفوف البصر اور ضعیف المزاج ہو گئے تو شاہ رفیع الدین علیہ الرحمہ ہی نے ولی اللہی چشمۂ فیض کی زمام سنبھالی، ان کے درس حدیث کا شہرہ سن کر دور دراز مقامات سے نہ صرف طلبۂ علم بلکہ نامور فضلائے عصر بھی وہاں مجتمع ہو گئے تھے۔ (مصدر سابق ص ۶۲۹)

شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسے وقت میں قرآن پاک کا ملکی زبان اردو میں تحت اللفظ ترجمہ کیا کہ اگر اس وقت یہ اہم کام انجام پذیر نہ ہوتا تو پھر آئندہ کوئی اس کی ہمت نہ کرسکتا تھا، اس ترجمہ کا حسن یہ ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے بہتر اور صحیح تر ترجمہ مشکل ہے، کوئی قرآنیات کا طالب علم تا این دم اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا ہے، بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ "شاہ رفیع الدین کے اس شہرۂ آفاق ترجمہ نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کو دین وایمان کی راہ بتائی"، (معارف ج ۲۲ ص ۳۴۴) ان کی تالیفات میں کتاب التکمیل، رسالہ دمغ الباطل، اور اسرار الحجۃ یادگار ہیں۔ (ابجد العلوم ص ۹۱۵)

شاہ عبدالقادر دہلویؒ:

انہوں نے بھی علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل اپنے والد علام رحمہ اللہ سے کی تھی، ان کو فقہ، حدیث اور تفسیر میں یدطولیٰ حاصل تھا، علم حدیث کی مجلس درس بھی آراستہ کی لیکن ان پر استغناء کا غلبہ تھا، اہل دنیا اور ان کے اختلافات سے ہمیشہ کنارہ کش رہے، اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ مسجد اکبرآبادی میں بسر کیا، تحدیث وتدریس کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے، باقی وقت ذکر وفکر الٰہی میں گزارتے، یہی وجہ ہے کہ ان کو تصنیف وتالیف کی طرف توجہ کرنے کی فرصت کم ملی، لیکن جس چیز نے ان کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کیا وہ ان کا ترجمۂ قرآن ہے، جو سلاست وروانی کا شاہکار ہے، اس ترجمۂ قرآن کے بارے میں اہل علم محققین نے لکھا ہے کہ:

> "اگر اردو زبان میں قرآن پاک نازل ہوتا تو ان ہی محاورات کے لباس سے آراستہ ہوتا جن کی رعایت جناب شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس ترجمہ میں پیش نظر رکھی ہے"۔ (حیات ولی: ص ۶۴۱)

شاہ عبدالقادرؒ بھی اپنے دوسرے برادران کرام کی طرح علم و عمل کا نمونۂ کامل تھے، مشاہیر عصر فضلا مثلاً علامہ فضل حق خیرآبادی اور شاہ محمد اسحاق وغیرہ ان ہی کے فیض یافتہ ہیں۔

شاہ عبدالغنی دہلویؒ:

یہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے، لیکن مشیت الٰہی کے بموجب ان فرزندان ولی اللٰہی میں وفات کی ترتیب الٹی چلی، یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زندگی ہی میں ان کے تینوں برادران خورد سفرِ آخرت کر چکے تھے، چنانچہ سب سے پہلے شاہ عبدالغنیؒ کی وفات ہوئی۔

انہوں نے علوم متداولہ کی تحصیل کچھ تو اپنے والد علامؒ سے کی اور کچھ اپنے برادر اکبر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے، وہ علم و فضل اور فیض باطنی میں شہرت عام رکھتے تھے، تاحیات درس حدیث میں مشغول رہے، ظاہری وضع قطع میں وہ اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہؒ سے اس حد تک تشابہ رکھتے تھے کہ ان کو دیکھ کر ہر شخص مرحوم شاہ صاحبؒ کی یاد تازہ کرتا تھا، انہوں نے اولاد میں شاہ محمد اسماعیل کو یادگار چھوڑا جنہوں نے خود بھی اپنے علم و عمل سے خانوادۂ ولی اللٰہی کا نام روشن کیا۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ:

ان کی ذات دودمانِ عالی ولی اللٰہی کا تتمہ و تکملہ تھی، ان کے جد امجد حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جو چشمۂ فیض جاری کیا تھا اس میں انہوں نے اپنے خون کی آمیزش کر کے اسے مزید اثر انگیز بنا دیا تھا۔

شاہ شہیدؒ نے علوم کی تحصیل اپنے والد اور تایا شاہ عبدالعزیز سے کی، علم حدیث میں ان کو خصوصی درک حاصل تھا، اس میں انہوں نے اتنا کمال پیدا کر لیا تھا کہ کبار علمائے فن ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے، ان کے کارنامے مسند درس سے زیادہ میدان تجدید واحیائے شریعت میں انجام پذیر ہوئے، انہوں نے بدعت، شرک و کفر اور ضلال و عصیان کی تاریکیوں کو اپنی اولوالعزمی اور ولی اللٰہی شان عزیمت سے چھانٹنے کا بیڑہ اٹھایا اور بالآخر اس کو اپنے خون سے لالہ گوں کر کے چھوڑا۔

مولانا ابوالکلام آزاد رقم طراز ہیں:

"شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ) نے اپنے جامع و کامل ہونے کے ساتھ جو کچھ کیا وہ تجدید، تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا، اس سے آگے نہ بڑھ سکا"۔

"فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا، اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ مجدد شہیدؒ کے لیے مخصوص کر دیا تھا، خود حضرت شاہ صاحبؒ کا بھی اس میں حصہ نہ تھا، خود شاہ صاحبؒ بھی اگر اس وقت ہوتے تو ان ہی (شاہ اسماعیل شہیدؒ) کے جھنڈے تلے نظر آتے"۔ (تذکرۂ آزاد ص ۲۳۵)

شاہ شہیدؒ کی دعوت عمل اور احیائے سنن کی جد و جہد سے ملک کی ساری فضا اسلامیت سے معمور ہوگئی تھی، ان کی مشہور تصنیف "تقویۃ الایمان" نے ہزاروں تاریک دلوں میں رشد و ہدایت کی قندیلیں فروزاں کیں، لاکھوں گم کردہ راہ مسافروں کو منزل مقصود کا پتہ دیا اور بے شمار پرستار حق سنت کے متبع ہو گئے، اس کے علاوہ عبقات، صراط مستقیم، ایضاح الحق، رسالہ اصول فقہ، منصب امامت اور تنویر العینین وغیرہ تصنیفات یادگار ہیں۔

آخری بات: ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج و اشاعت میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کی خدمت اور کارناموں کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آج ہندوستان میں جہاں کہیں بھی قال رسول اللہ ﷺ کا کوئی زمزمہ سنائی دیتا ہے وہ اس خانوادۂ فضل و کمال کی صدائے بازگشت ہے، اور اشاعت توحید اور تبلیغ سنت کے جتنے سلاسل نظر آتے ہیں ؎

یہ سب پودا انہیں کی لگائی ہوئی ہے۔



صحاح ستہ سے متعلق

علماء ہند کی شروح وتعلیقات اور حواشی

از: مولانا منور سلطان ندوی

تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری علم وفن کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے منفرد وممتاز ہے، اس دور میں علم حدیث سے متعلق جو علمی وتحقیقی سرمایہ اور قیمتی اثاثہ تیار ہوا ہے اور جس طرح علمی طبقہ میں حدیث سے تعلق وشغف اور اس کے لئے شوق وجستجو میں اضافہ ہوا ہے وہ اس مبارک فن کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا، اسی علمی شغف اور تحقیقی رجحان کا نتیجہ ہے کہ حدیث کی خدمت کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئے اور بطور خاص حدیث کی اہم کتابوں کی شروح، ان پر تعلیقات وحواشی کا اضافہ اور اس فن کی اہم ونادر مخطوطات کی جدید تحقیق وایڈیٹنگ سے متعلق عظیم الشان خدمات وجود میں آئی ہیں۔

اس دور کے علمی سرمایہ میں ہندوستانی علماء اور اہل تحقیق کا بڑا حصہ ہے، بلکہ کئی حیثیتوں سے انہیں یک گونہ تفوق وامتیاز بھی حاصل ہے، متعدد چوٹی کے علماء اور بلند پایہ محققین نے اس کا اعتراف کیا ہے اور علماء ہند کی خدمات کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے، عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت مفکر ومحقق علامہ سید رشید رضا ہندوستانی علماء کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لو لا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من

أمصار الشرق (مقدمه مفتاح كنوز السنه) کہ اس زمانہ میں اگر ہمارے ہندوستانی بھائیوں کی توجہ حدیث کی طرف نہ ہوتی تو مشرقی ممالک میں اس کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

مشہور مصری عالم علامہ عبدالعزیز الخولی تحریر کرتے ہیں: ممالک اسلامیہ کی کثرت اور ان کی اجناس مختلف ہونے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس نے اس زمانے میں ہمارے ہندوستانی مسلمانوں کی مانند حدیث کے تقاضہ کو پورا کیا ہو، ان میں حدیث کے ایسے حفاظ ہیں جو تیسری صدی ہجری کی طرح حریت فکر اور اسناد پر توجہ کے ساتھ درس حدیث دیتے ہیں۔

(مفتاح کنوز السنہ ص: ۱۶۹، بحوالہ تحریک اہل حدیث ص: ۲۰۰)

اسی طرح علامہ محمد منیر دمشقی، فضیلۃ الاستاد عبدالمنعم نمر، شیخ عبدالفتاح ابو غدہ اور کلیۃ الشریعہ جامع ازہر کے استاذ شیخ محمد ابو زہو جیسے محققین نے ہندوستانی علماء کی کاوشوں کو بڑے شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

(دیکھئے: انموذج من أعمال الخیریہ ص: ۳۶۸، علماء مظاہر علوم سہارنپور ص: ۱۵۹، الحدیث والمحد ثون ص: ۴۳۳)

ہندوستان میں تیرہویں صدی ہجری حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کی اولاد سے شروع ہوتی ہے، آپ کے چاروں صاحبزادے آسمان علم وفن کے درخشاں ستارے تھے شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد آپ کی علمی خلافت آپ کے بڑے صاحبزادے اور لائق جانشین شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۱۵۹- ۱۲۳۹ھ) کے حصہ میں آئی۔ آپ نے ۶۳ برس تک مسند رحیمی کو رونق بخشی، اس دور میں ہندو بیرون ہند کی ہزاروں نابغہ روزگار شخصیات نے آپ سے اکتساب فیض کیا، آپ کے بعد آپ کے تلامذہ میں آپ کے نواسے شاہ محمد اسحاق مہاجر مکی (م ۱۲۶۲ھ) کے حصہ میں مسند نشینی آئی، مولانا عبدالحئی حسنی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں فن حدیث کی امامت آپ پر ختم ہوتی ہے۔ (اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص: ۲۰۲)

شاہ محمد اسحٰق صاحب کے تلامذہ میں بڑے نامور حضرات پیدا ہوئے جن میں سید نذیر حسین دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) مولانا شاہ عبدالغنی مجددی (م ۱۲۹۶ھ) شاہ قطب الدین دہلوی (م ۱۲۷۹ھ) اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (م ۱۲۹۷ھ) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

۱۲۵۸ھ میں جب آپ مکہ معظمہ ہجرت کرنے لگے تو آپ نے سید نذیر حسین دہلوی کو اپنا علمی جانشیں مقرر کیا، اور مسند رحیمی کی خلافت عطا کی، سید نذیر حسین دہلوی نے اپنی تدریسی خدمات کے ذریعہ اس مسند کو تاریخی عظمت کو چار چاند لگایا اور آپ کی کوششوں سے پورا ہندوستان حدیث کی ضیاء پاشیوں سے بقعہ نور بن گیا، مولانا عبدالحی حسنی صاحبؒ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں فن حدیث کی ریاست ان پر ختم ہوتی ہے۔ (اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص:۲۰۲)

اس کے بعد فن حدیث میں جو کچھ پیش رفت ہوئی ہے وہ دراصل انہی دو شاگردوں مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی کے تلامذہ اور ان کے فیض یافتہ علماء اور اہل فن کی کاوشیں ہیں، اس طور پر کہ طبقہ احناف میں جن حضرات کے ذریعہ حدیث کی خدمت ہوئی ہے، وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگرد ہیں، جبکہ مکتبہ اہل حدیث مکتبۂ فکر کے جن علماء کے ذریعہ اس فن کو فروغ حاصل ہوا اور جن کی اس باب میں خدمات ہیں وہ سب بھی کسی نہ کسی طرح سید نذیر حسین دہلوی سے رشتہ تلمذ رکھتے ہیں۔

اس طرح شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے بعد شارحین حدیث احناف اور اہل حدیث کے دو الگ الگ مکتبہ فکر میں بنے نظر آتے ہیں، جن کا منہج الگ اور تحقیق وتشریح کا انداز بھی جدا ہے، ان دونوں دبستان فکر کی کتابوں میں مسلکی چھاپ بلکہ مسلک ومشرب کی ترجمانی، ایک دوسرے کے خلاف علمی نوک جھونک اور فکری اختلاف کا عکس واضح طور پر دکھائی دیتا ہے، بس چند ہی مصنفین ہیں جن کی تحریریں ان مسلکی اثرات سے پاک ہیں اور جو غیر جانبداری کا دامن تھامے ہوئے ہیں، اس عمومی رجحان سے قطع نظر اس دور کی بہت سی کتابیں خالص علمی اور تحقیقی رنگ لیے ہوئے ہیں، ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعتاً ان مؤلفین کو قدرت کے فیاض ہاتھوں نے علم حدیث کی خدمت کے لئے ہی پیدا فرمایا تھا، اور انہیں نہ صرف حدیث میں کمال حاصل تھا بلکہ حدیث کا فنی ذوق، قوت حافظہ اور استدلال واستخراج کی دولت سے بھی بہرہ مند تھے، جس کے نمونے تیسری صدی ہجری کے ائمہ حدیث میں نظر آتے ہیں۔

اس دور میں ہندوستان میں حدیث کی جن کتابوں پر اہل علم کی زیادہ توجہ رہی ہے اور جوان

کی بحث وتحقیق اور تدریس کا محور بنی رہیں ان میں سرفہرست صحاح ستہ، مشکوۃ المصابیح اور مشارق الانوار ہیں، اوران سب میں صحاح ستہ کو فوقیت حاصل ہے، اس کی بڑی وجہ ان کتابوں کا استناد، جمع وترتیب کا کمال اور عنداللہ وعندالناس مقبولیت ہے، تدریس میں یہ کتابیں ہمیشہ اس فن کی آخری کتاب اور منتہائے کمال سمجھی گئی ہیں، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صحیح بخاری کی طرف علماء کے اعتناء سے متعلق لکھا ہے کہ اس زمانہ میں یہ کتاب استاذ کے کمال علم حدیث میں رسوخ اور مسند درس کی لیاقت کی دلیل بن چکی تھی، اور اس کتاب کو پوری باریک بینی اور گہرائی سے پڑھے بغیر کوئی عالم نہیں سمجھا جاتا۔ (تقدیم مقدمہ لامع الدراری ص: ۸) یہی حالت کم وبیش صحاح کے دیگر کتابوں کی بھی تھی اور بڑی حد تک آج بھی یہی رجحان باقی ہے، صحاح کی متعدد شرحیں خصوصاً صحاح اربعہ کی مختلف جہات پر علمی وتحقیقی کتابیں اور پھر ان کتابوں کا فروغ دراصل اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔

بہرحال صحاح سے متعلق مختلف جہتوں سے جو علمی اور تحقیقی کام انجام پایا ہے اس کا تعارف مختصر تبصرہ کے ساتھ ذیل کی سطروں میں پیش کیا جارہا ہے، کتابوں کی ترتیب میں مصنف کی سن وفات کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے، کتابی سرمایہ کے لئے فی الحال کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء پر اعتماد کیا ہے، جو کتابیں یہاں نہیں ملیں مگر دیگر کتابوں میں ان کا تذکرہ ہے ان کا نام با مختصر تعارف مذکورہ حوالہ سے پیش کیا ہے۔

صحیح بخاری

الأبواب والتراجم سے متعلق کتابیں:

الأبواب والتراجم: مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۲۶۸-۱۳۳۰ھ)

یہ تحریر مولانا محمود حسن دیوبندی کی آخری تحریر سمجھی جاتی ہے۔ مالٹا میں آپ نے بخاری کے ابواب وتراجم پر لکھنا شروع کیا مگر اسے مکمل نہ کر سکے، آپ کے شاگرد مولوی عزیز گل محمد پشاوری نے تصحیح واہتمام کے ساتھ اسے مطبع دار الامان اخبار مدینہ سے شائع کیا ہے۔ یہ ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے، ابتداء میں مولانا سید حسین احمد مدنی کی تقریظ بھی ہے، اس میں پندرہ ایسے اصول بتائے گئے ہیں جن

کی رعایت امام بخاری نے تراجم ابواب میں کی ہے۔ان اصول کو سامنے رکھنے سے تراجم ابواب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کتاب العلم تک کے تراجم ابواب بیان ہوئے ہیں۔ان میں بعض اختصار کے ساتھ ہیں اور بعض قدرے تفصیل کے ساتھ، اخیر میں ایک فہرست بھی دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کن کن ابواب میں امام بخاری نے صرف آیات کا ذکر کیا ہے اور کون سے ابواب احادیث وآیات سے خالی ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

الأبواب والتراجم للبخاري: شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

اس کتاب کا تعارف مولانا تقی الدین ندوی مظاہری مدظلہ نے بڑے اچھے انداز میں کرایا ہے، یہاں پر ہم ان کے الفاظ مستعار لیتے ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں: ''علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بخاری کی شرح اس امت پر قرض تھی، مگر بقول حافظ سخاویؒ: حافظ ابن حجر نے فتح الباری لکھ کر امت کی طرف سے اس قرض کو ادا کر دیا، لیکن حضرت شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ ابھی بخاری کے تراجم ابواب کا قرض امت کے ذمہ باقی ہے۔ چنانچہ تراجم ابواب پر ایک مختصر رسالہ لکھا اور اس طرح حضرت شیخ الحدیث کی تالیف الأبواب والتراجم کے ذریعہ صحیح بخاری کی شرح کا قرض امت کی طرف سے ادا ہو گیا''۔ (مقدمہ تقریر بخاری، ص:۲۲)

یہ کتاب پہلی بار ۱۳۹۱ھ میں مکتبہ یحیوی سہارنپور سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ (فہرست تالیفات شیخ ص:۹۶) اس کی پہلی جلد ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع ندوۃ العلماء سے شائع ہوا ہے۔اس پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا قیمتی مقدمہ ہے، جس میں آپ نے اس کتاب کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب صحیح بخاری کے ابواب وتراجم سے متعلق مباحث کیلئے انسائیکلوپیڈیا ہے" واصبح الكتاب موسوعة او دائرة معارف بالتعبير الحديث في كل ما يتصل بالأبواب والتراجم في الجامع الصحيح للبخاري مغنيا عن غيره" (مقدمہ ص: ۷) حضرت شیخ الحدیث نے اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور مولانا محمود حسن دیوبندی کی کتابوں اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے درسی افادات کو جمع کیا ہے، اس کے علاوہ حافظ ابن

حجر، قسطلانی اور حافظ عینی نے تراجم الأبواب سے متعلق جو کچھ لکھا ہے سب کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں تراجم ابواب سے متعلق لکھی جانے والی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ستر اصول وقواعد ذکر کئے گئے ہیں، جن کی رعایت بخاری کے تراجم میں نظر آتی ہے، اور تیسرے باب میں ان اقوال وآراء کا جواب دیا ہے جو ابواب وتراجم کی عدم مناسبت سے متعلق بیان کئے جاتے ہیں۔ (فہرست تالیفات شیخ الحدیث ص:۹۹)

تراجم ابواب بخاری: مولانا انعام الحسن کاندھلوی۔ (بحوالہ علماء مظاہر علوم اول ص:۲۷۸)

الأبواب والتراجم للبخاری (اردو):

مولانا ادریس کاندھلوی (۱۳۱۷-۱۳۹۴) نے یہ کتاب تدریس کے زمانے میں تیار کی تھی، اس میں ابواب وتراجم سے متعلق مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں، پہلی کتاب الطہارۃ کے ابواب پر مشتمل ہے اور دوسری میں کتاب الصلاۃ ہے۔

(تذکرہ علماء مظاہر علوم۔ ص:۳۲۶، دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص:۸۰)

تعلیق وتحشیہ علی الابواب والتراجم للإمام الشیخ محمد زکریا: مولانا امیر احمد کاندھلوی۔

(بحوالہ علماء مظاہر علوم ص:۳۶۰)

ثلاثیات بخاری سے متعلق شروح:

معلم القاری شرح ثلاثیات البخاری: عبد المجید خان ٹونکی۔ یہ ۱۲۵۱ھ میں شائع ہوئی ہے۔

(بحوالہ اتحاف القاری ص:۱۸۸)

فضل الباری شرح ثلاثیات البخاری (عربی): مولانا شمس الحق عظیم آبادی (م:۱۳۲۹)۔

(جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص:۵۲)

الحرز المکنون من لفظ المعصوم المامون (عربی): نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷)

مطبع سکندری بھوپال سے ۱۲۹۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں فتح الباری اور بعض دیگر شروح کی روشنی میں اس کی شرح کی ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات۔ ص:۳۹)

غنية القاري ترجمة ثلاثيات البخاري (اردو):

ثلاثیات بخاری کی تشریح پر مشتمل یہ رسالہ ۲۱ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۲۹۱ ہجری میں مطبع شاہجہانی بھوپال سے طبع ہوا ہے۔ اس میں رواۃ کے تراجم بھی ہیں، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریؒ نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (دیکھئے: مقدمہ لامع الدراری ص: ۳۶۰)

الدراری الناشرات فی ترجمة مافی البخاری من الثلاثیات: مولانا محمد مچھلی شہری (۱۲۵۲-۱۳۲۰ ہجری)۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۳۶)

نظم اللآلی فی شرح ثلاثیات بخاری: شیخ عبدالباسط صدیقی قنوجی۔

إنعام المنعم الباری بشرح ثلاثیات البخاری: شیخ عبدالصبور بن عبدالتواب ملتانی (۱۳۲۰-۱۳۷۹ھ)

۱۴۰۰ھ میں اس کا دوسرا ایڈیشن ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والارشاد بنارس سے طبع ہوا ہے، مختلف شروح کو سامنے رکھ کر ثلاثیات بخاری کی شرح تیار کی ہے اور رواۃ کا تعارف کرایا ہے، کل صفحات ۸۷ ہیں۔

لامع الدراری علی جامع البخاری:

یہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کے درسی تقاریر کا مجموعہ ہے، جسے مولانا محمد یحیی بن اسمٰعیل کاندھلوی (م ۱۳۳۴ھ) نے مرتب کیا تھا، آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ الحدیث نے اپنی تعلیقات و حواشی کے اضافہ کے ساتھ اسے طبع کرایا ہے۔ ۱۳۷۹ھ میں کتب خانہ یحیوی سہارنپور سے اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ ۱۳۹۱ھ میں اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع ندوۃ العلماء سے شائع ہوا ہے، اس ایڈیشن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا مقدمہ بھی شامل ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں: ''لامع الدراری (جو اصلاً حضرت گنگوہی کی تقریرات بخاری اور مولانا یحیی صاحب کے حواشی کا مجموعہ ہے) شیخ کے اضافوں اور تشریحات کی وجہ سے طالبعلموں اور مدرسین کیلئے ایک بیش بہا خزانہ بن گیا ہے، اس میں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی قدر اہل درس ہی کر سکتے ہیں، اس

میں شیخ کی بعض ذاتی تحقیقات اور ان کے طویل درس حدیث کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ بھی آ گیا ہے،
مولانا رشید احمد گنگوہی کے درس میں اختصار کا پہلو غالب رہتا، آپ ترمذی کے درس میں فقہی مسائل پر
خاص توجہ دیتے، جبکہ بخاری کے درس میں مسائل سے اعتنا نہیں کرتے، ایسے ہی بعض مشکلات جن کو
صحاح کی دوسری کتابوں میں حل کر چکے ہوں، بخاری میں ان مباحث کو نہیں چھیڑتے، حضرت شیخ
الحدیث نے اپنے تعلیقات کے ذریعہ نہ صرف ان کمیوں کی تلافی کر دی ہے بلکہ مزید اضافوں کے
ذریعہ اسے صحیح بخاری کی ایک جامع و مبسوط شرح بنادی ہے۔

تقریر الجنجوهي على صحيح البخاري:

یہ مولانا رشید احمد گنگوہی کی درسی تقریر ہے، جسے مولانا حسین علی پنجابی (۱۲۸۳ـ۱۳۶۳ھ)
نے دوران درس نقل کیا تھا۔ یہ مختصر رسالہ چھوٹے سائز میں ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے اور دین محمدی
پریس لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ آپ کی مکمل تقریر نہیں ہے بلکہ بخاری کے بعض مقامات سے متعلق
مشکلات کا حل اور مغلق عبارت کی وضاحت پر مشتمل ہے۔

النور الساری علی صحیح البخاری:

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبند (۱۲۶۸ـ۱۳۳۹) کے درسی افادات کو مولانا خیر محمد
صاحب مظفر گڑھی مقیم مکہ مکرمہ نے اپنے زمانہ تدریس میں نوٹ کیا تھا۔ جسے نظر ثانی اور حواشی کے
اضافے کے بعد ۱۳۸۲ھ میں طبع کرایا ہے۔ اس کے مسودہ کو مشہور تاشقندی عالم شیخ نعمان محمد نے بھی
دیکھا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے۔ (دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص: ۸)

تقریر بخاری:

یہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی تقاریر درس بخاری کا مجموعہ ہے، جسے مولانا کفیل
احمد کیرانوی نے مرتب کیا ہے۔ دارالعلوم کے طریقہ درس کے مطابق اس میں احادیث کی تشریح اور
حدیث سے متعلق دیگر مباحث تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اس کی پہلی جلد ۱۹۵۷ء میں مکتبہ
اسلامیہ دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ (دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص: ۸۵)

فیض الباری علی صحیح البخاری:

علامہ انور شاہ کشمیری (م: ۱۳۵۲ھ) کی تقریرات بخاری کو آپ کے لائق شاگرد مولانا بدر عالم میرٹھی م ۱۹۶۵ء نے اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے، مجلس علمی ڈابھیل کے زیر اہتمام مطبع حجازی قاہرہ سے چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ علامہ کے درس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ آپ تمام شروح کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد اپنی تحقیقات پیش کرتے تھے، نیز مراجعت کے لئے اپنے سامنے مختلف کتابیں رکھتے اور درس میں ہی ہر طرح کے مشکلات مثلا حدیث کے علاوہ علم کلام وغیرہ سے متعلق بھی سیر حاصل بحث کرتے، یہ خصوصیت پوری طرح کتاب میں نمایاں ہے، اس کے علاوہ مذکورہ شرح کی چند امتیازی خصوصیات اس طرح ہیں:

۱۔ مختلف فیہ مسائل میں شارع کا مقصد پیش نظر رکھتے۔

۲۔ مختلف روایتوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کرتے، ورنہ جو شارع کے مقصد سے اقرب نظر آتا اس کو اختیار کرتے۔

۳۔ امام بخاری نے جن گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی طرف خاص توجہ دیتے۔

۴۔ حافظ ابن حجر کے اعتراضات کا محقق جواب دیتے، پھر حافظ ابن حجر اور حافظ عینی کے درمیان محاکمہ کرتے۔

۵۔ شرح حدیث میں ان اقوال کو ترجیح دیتے جو حدیث سے قریبی مطابقت رکھتے ہوں۔

ابتداء میں مولانا یوسف بنوری کا مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت، امام بخاری کا تعارف، حدیث کی بعض اصطلاحات، علامہ انور شاہ کشمیری اور فیض الباری کی خصوصیات جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا مقدمہ مولانا بدر عالم صاحب کے قلم سے ہے، اس کے علاوہ مرتب کا رسالہ "البدر الساری الی فیض الباری" بھی شامل ہے، جس میں تقریر کی بعض مبہم مقامات کی وضاحت کی گئی ہے، مرتب خود پانچ بار علامہ کے درس میں شریک ہوئے ہیں، ان ساری تقریروں کے ساتھ آپ نے علامہ کے دیگر شاگردوں کی تقریروں کو بھی ترتیب کے وقت

سامنے رکھا ہے، اس کا دوسرا ایڈیشن مصر سے شائع ہوا ہے، اس میں مرتب کے حواشی کا اضافہ ہے، مولانا یوسف بنوری نے نفحۃ العنبر میں اور مولانا انظر شاہ مسعودی نے نقش دوام میں آپ کے درس کے امتیازات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ارشاد القاری الی نقد فیض الباری کے نام سے مولانا محمد گوندلوی (م ۱۹۸۵ء) نے اس کا جواب لکھا ہے۔

(برصغیر میں علماء اہل حدیث کے علمی کارنامے ص: ۸۲)

ایضاح البخاری: افادات مولانا سید فخر الدین احمد۔

آپ حضرت شیخ الہند اور علامہ انور شاہ کشمیری کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، اس لئے آپ کے درس میں ان دونوں اساتذہ کی جھلک پائی جاتی ہے، آپ کا درس بہت مبسوط ہوتا تھا، حدیث کے تمام پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے فقہاء کے مذاہب بیان کرتے، پھر احناف کی تائید میں دلائل بیان کرتے۔ (تاریخ دیوبند ص: ۲/۱۰۷) آپ کے درسی افادات کو مولانا ریاست علی بجنوری نے مرتب کیا ہے جو ۱۳۸۰ھ میں مکتبہ مجلس قاسم المعارف دیوبند سے مختلف اجزاء کی شکل میں شائع ہوئے ہیں، اس شرح میں حدیث کی تشریح میں تفصیلی کلام کے ساتھ ترجمۃ الباب پر گفتگو اور فقہی مسالک کا مفصل بیان موجود ہے۔

انوار الباری شرح اردو بخاری: مرتب مولانا سید احمد رضا بجنوری۔

یہ شرح اصلاً علامہ انظر شاہ کشمیری کے افادات کا مجموعہ ہے، مرتب نے علامہ کی تقریر قلمبند کی پھر اس کی ترتیب میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے اکابر علم حدیث کے افادات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کتاب میں ان حضرات کے حوالے بھی دئے گئے ہیں، لیکن اصل بنیاد علامہ کی تقریر کو بنایا ہے، اس لئے تقریر میں آپ کے درس کا انداز نظر آتا ہے، مرتب نے مذکورہ حضرات کے حوالہ سے علامہ شوکانی، حافظ ابن حجر وغیرہ پر جا بجا نقد بھی کیا ہے، اس سلسلہ میں مرتب کا قلم جادہ اعتدال سے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے، مجموعی طور پر یہ اچھی شرح ہے، اس میں بیک وقت متقدمین و متاخرین کی تحقیقات مل جاتی ہیں۔ شروع کی دو جلدیں مقدمہ انوار الباری کے

نام ہے جسے مرتب نے تذکرۃ المحدثین کے نام سے موسوم کیا ہے، اس میں محدثین کا تعارف اور بطور خاص امام ابوحنیفہؒ کی محدثانہ حیثیت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو اجزاء کی شکل میں مکتبہ ناشران کتب بجنور سے شائع ہوئی ہے، ۱۹۴۰ء میں اس کی اشاعت شروع ہوئی اور اب تک اس کے پندرہ اجزا طبع ہو چکے ہیں۔ (دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص: ۸۰) ابتداء میں مفتی شفیع صاحب، مولانا ابوالوفا افغانی، مولانا سعید اکبرآبادی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریریں ہیں۔ مولانا محمد رئیس ندوی استاد حدیث جامعہ سلفیہ بنارس نے اس کا جواب ''اللمعات الی مافی انوار الباری من الظلمات'' کے نام سے لکھا ہے، یہ پانچ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

درس بخاری:

یہ مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۳۲۵۔۱۳۶۹ھ) کے افادات پر مشتمل ہے، مولانا عبدالوحید صدیقی نے آپ کے درس بخاری کو ڈابھیل میں قلم بند کیا تھا، مولانا عثمانی نے اس پر نظر ثانی بھی کی ہے، اس کے بعد یہ تقریر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے ۱۴۰۰ ہجری میں شائع ہوئی ہے۔ ابتداء میں مولانا منظور نعمانی کا پیش لفظ ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ حتی الامکان مولانا کے الفاظ و انداز کو باقی رہنے دیا گیا ہے، آپ کا درس جس طرح عالمانہ اور محققانہ ہوتا تھا اس کی جھلک اس مطبوعہ درس میں پوری طرح نظر آتی ہے۔ مرتب نے مولانا حبیب الرحمن اعظمی سے بھی اس مسودہ کی نظر ثانی کرائی ہے۔ اس سے اس کے استناد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کی پہلی جلد جو ۴۴۳ صفحات پر آتی ہے کتاب العلم پر مشتمل ہے، ابتداء میں امام بخاری کا تعارف اور پھر مولانا شبیر احمد عثمانی کا تعارف کرایا گیا ہے۔ (دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص: ۸۲)

فضل الباری شرح اردو بخاری: افادات مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۳۲۵ھ-۱۳۶۹ھ)۔

یہ بخاری کی شرح کی حیثیت سے کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ جبکہ یہ آپ کی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ مولانا کی تقریر بخاری ہے، جسے آپ کے شاگرد مولانا عبدالوحید فتحپوری نے ڈابھیل میں قلم بند کیا تھا، اس تقریر کو نقل کرا کے مولانا نے اپنے پاس رکھا، پھر اس کی اپنے قلم سے اصلاح

فرمائی، یہ"تقریر درس بخاری" کے نام سے ۱۴۰۳ھ میں ڈابھیل سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ یہی تقریر پاکستان سے شرح کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ بہتر یہ تھا کہ شرح کے بجائے اس کو تقریر یا درس لکھا جاتا، اس کی صرف پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔

(دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص:۸۸)

تقریر بخاری شریف:

یہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے درس بخاری کے افادات کا مجموعہ ہے، مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری نے آپ کی متفرق سالوں کی درسی تقاریر کو سامنے رکھ کر اسے مرتب کیا ہے، ۱۳۹۲ھ میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، اب تک اس کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ (دانشوران سہارنپور، ص ۳۶۶) اس تقریر پر مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کا مقدمہ ہے، آپ نے حضرت شیخ کے درس کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو اس مطبوعہ تحریر میں پوری طرح نمایاں ہے، آپ کے الفاظ میں اس کے امتیازات اس طرح ہیں:

ا۔ آپ کے درس میں جملہ ائمہ سلف اور ائمہ محدثین و مجتہدین کے ساتھ انتہائی ادب وعظمت کا معاملہ رہتا، یہاں تک کہ جن کی رائے سے اختلاف کرتے ان کا نام بھی بڑے احترام سے لیتے۔

۲۔ مشکل الفاظ کا بھی اچھی اردو میں ترجمہ کرتے۔

۳۔ کسی راوی پر کلام کرتے تو اس کی حیثیت بھی بیان فرمادیتے۔

۴۔ تراجم ابواب پر خاص توجہ دیتے۔

۵۔ ائمہ کے مذاہب کیساتھ ان کے دلائل بھی بیان کرتے، پھر حنفی مذہب کی ترجیح اس طرح بیان کرتے کہ وہ حدیث سے اقرب نظر آنے لگتا۔ (مقدمہ تقریر ص:۲۱)

کتاب سے درس کا انداز جھلکتا ہے، مسائل کے بیان یا حدیث کی تشریح میں ایجاز کے بجائے اطناب نظر آتا ہے، ابتداء میں مرتب کے قلم سے تفصیلی مقدمہ بھی ہے، جس میں فن حدیث اور صحیح بخاری سے متعلق اہم مباحث ذکر کئے گئے ہیں۔

امدادالباری تقریر درس بخاری: مولانا عبدالجبار اعظمی۔

اس میں منکرین حدیث کی خوب خبر لی ہے، امام صاحب پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے، اور فقہی مسائل بھی بیان ہوئے ہیں، اس کی پہلی جلد ۱۴۰۱ھ میں شائع ہوئی ہے۔

(علماء مظاہر علوم دوم ص:۲۳۶)

امالی علی صحیح البخاری: مولانا محمد گوندلوی۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات۔ ص:۴۷)

دروس البخاری: مولانا محمد گوندلوی (م ۱۹۸۵ء) (برصغیر میں علماء اہلحدیث کے علمی کارنامے ص:۸۲)

شروح بخاری:

مختصر تیسیر القاری شرح صحیح البخاری: فخرالدین محب اللہ دہلوی۔

مولانا نورالحق محدث دہلوی (م ۱۰۷۳ھ) نے والی ریاست ٹونک کے حکم پر بخاری کی شرح تیسیر القاری لکھی جو فارسی زبان میں ہے، آپ کے صاحبزادے مولوی فخرالدین دہلوی نے اس کو مختصر کیا ہے۔ جو اسی تیسیر کے حاشیہ پر شائع ہوئی ہے۔ (اتحاف القاری ص:۳۵۷)

نورالقاری شرح بخاری: شیخ نورالدین گجراتی (اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص:۲۱۵)

الفیض الطاری شرح بخاری عربی: شیخ جعفر بخاری گجراتی بن محمد حسینی (حوالہ سابق)

عون الباری لحل أدلة صحيح البخاري: مولانا سید نواب صدیق حسن خاں قنوجی (۱۲۴۸ـ۱۳۰۷ھ)۔

شہاب الدین ابوالعباس احمد الشرجی الزبیدی (م ۸۹۳ھ) نے صحیح بخاری سے زوائد ومکررات کو حذف کر کے صرف مرفوع روایات پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا تھا، جو التجرید الصریح لاحادیث الجامع الصحیح کے نام سے طبع ہوا ہے، عون الباری اس التجرید الصریح کی شرح ہے، نواب صاحب اسے اپنی چند بہترین کتابوں میں شمار کرتے تھے، (خودنوشت سوانح ص ۱۸۴) اس میں معانی کی وضاحت اور مشکل مقامات کو حل کیا ہے، کتاب سے متعلق آپ خود لکھتے ہیں: "**وقد سلكت في هذا الشرح طريق الإنصاف، وتجنبت مسلك الاعتساف عند تزاحم الاختلاف، فلدونت شرحا**

بشرح الصدور ويمشي على سنن الدليل وإن خالف الجمهور" (عون الباری ص:۵)
شارح نے فتح الباری سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، اس کے اور شوکانی کے حوالے بھی کثرت سے آئے ہیں: "قلت" کہہ کر آپ نے دونوں کی رائے سے اکثر مقامات پر اختلاف بھی کیا ہے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نے اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے: وكان من أكابر علماء منكري التقليد، ومع ذلك كان حسن التادب بالأئمة المجتهدين والفقهاء المقلدين ومشائخ السلوك۔ (مقدمہ لامع الدراری ص:۳۵۹) مطبع صدیقی بھوپال سے دو جلدوں میں ۱۳۰۶ھ میں طبع ہوئی ہے، ۱۴۰۱ھ میں عبداللہ بن ابراہیم انصاری کے اعتناء کے ساتھ قطر سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اسی طرح نیل الاوطار کے حاشیہ پر بھی یہ شرح طبع ہو چکی ہے۔

شرح صحیح البخاری اردو: مولانا امیر علی لکھنوی (۱۲۷۴ھ۔۱۳۳۷ھ)۔

(جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص:۷۰)

ضوء الدراری شرح بخاری: سید غلام علی آزاد بلگرامی۔ یہ کتاب الزکاۃ تک ہے اور زیادہ تر قسطلانی سے مستفاد ہے۔ (اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص:۲۱۶)

نصرۃ الباری شرح صحیح البخاری (اردو): مولانا عبدالستار صدری (۱۳۲۳ھ-۱۳۸۶ھ)۔

(جماعت اہل سنت کی تصنیفی خدمات ص:۶۸ یہ (۱۹۵۶ء) میں مکتبہ سعودیہ سے شائع ہوئی ہے۔)

(جهود مخلصة في خدمة السنة المطهرة ص:۱۰۵)

فیض الباری شرح اردو بخاری: شیخ فضل احمد انصاری (اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص:۲۱۶)

منح الباری شرح بخاری: شیخ محمد احسن پشاوری بن محمد صدیق، یہ فارسی زبان میں ہے۔ (حوالہ سابق)

البدر الساری الی فیض الباری شرح بخاری: مولانا بدر عالم میرٹھی۔ یہ مختصر رسالہ فیض الباری کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں مولانا نے فیض الباری کے بعض مشکل مقامات کی وضاحت کی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث سے متعلق بعض اصطلاحات اور دیگر مباحث بھی بیان ہوئے ہیں۔

تحفۃ الباری بحل مشکلات البخاری: مولانا ادریس کاندھلوی (۱۳۱۷ھ-۱۳۹۴ھ)۔

اس میں بخاری کے ابواب وتراجم اور اس کے مشکل مقامات کو حل کرنے پر اصل توجہ دی گئی ہے، اسی طرح کلامی مسائل میں عقلی ونقلی دلائل پر زور دیا ہے، یہ اصلا بخاری کی تعلیق ہے۔ مگر بقول مولانا شاہد سہارنپوری مولانا کے سیال قلم نے اس کو شرح بنادیا، اس میں علم کلام کے مسائل سے بھی اعتناء کیا ہے۔ ۱۳۷۵ھ میں اس کتاب کی تکمیل ہوئی ہے۔ بعد میں مولانا نے اس کے حواشی میں اضافے بھی کئے ہیں۔ بیس جلدوں میں یہ شائع ہوئی ہے۔ (علماء مظاہر علوم ص:۳۱۴)

الخیر الجاری علی صحیح البخاری: مولانا خیر محمد صاحب مظفر گڑھی۔

آپ شیخ الہند کے تلامذہ میں سے تھے۔ یہ صحیح بخاری کے ابتدائی پندرہ پاروں کی عربی شرح ہے، جسے مولانا نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور بقول مولانا اسیر ادروی اس کا انداز محدثانہ ہے۔ یہ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے، اس کا مخطوطہ مکہ مکرمہ میں آپ کے صاحبزادے کے پاس موجود ہے۔ (دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص:۸۳)

فیض الباری شرح صحیح بخاری: مولانا ابوالحسن محمد سیالکوٹی (م ۱۳۲۵ھ)۔ (برصغیر میں علماء اہلحدیث کے علمی کارنامے ص:۹)

عون الباری لحل عویصات البخاری: مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی (م ۱۳۷۰ھ)۔ (برصغیر میں علماء اہل حدیث کے علمی کارنامے ص:۸۲)

الاسوہ ترجمہ وشرح صحیح بخاری: مولانا حنیف ندوی (م ۱۹۸۷ء) (برصغیر میں علماء اہلحدیث کے علمی کارنامے ص:۸۲)

ترجمہ وشرح صحیح بخاری: مولانا محمد داؤد راز دہلوی (م ۱۴۰۲ھ)۔ (برصغیر میں علماء اہل حدیث کے علمی کارنامے ص:۷۹)

شرح وترجمہ صحیح بخاری: شیخ محمد داؤد دھلوی۔ (جھود مخلصۃ فی خدمۃ السنۃ المطہرۃ:۱۱۸)

نعیم الباری فی شرح البخاری: مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی (م ۱۳۹۱ھ) یہ غیر مطبوع ہے۔ (تذکرہ علماء پنجاب ص:۱۰۸)

حواشی علی البخاری:

حواشی علی صحیح بخاری: مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (۱۲۲۵-۱۲۹۷ھ)۔

تقریباً دس سال آپ نے بخاری کی تصحیح میں خرچ کئے اور پھر چودہ سال میں اس پر حواشی تحریر کئے۔ یہ نہایت عمدہ اور مفید حاشیہ ہے، اس میں اختصار کے ساتھ احادیث کی توضیح، مشکل و مغلق الفاظ کا حل اور رواۃ کا تعارف کرایا ہے۔ مولانا خود اس حاشیہ کے اختتام پر لکھتے ہیں کہ اس کیلئے میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا، دنوں کو بے آرام کیا اور راتوں کو جاگ کر کاٹا، بخاری کے متن کی تصحیح و توضیح، مطالب کی تنقیح، اسماء الرجال پر حرکات اور ان سب کے انساب اور کنیتوں اور القاب و حالات کو جمع کرنے میں رات دن ایک کر دیئے"۔ (علماء مظاہر العلوم ص: ۱۵۵)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے اس کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ "ان حواشی کو غور سے پڑھنے کے بعد بخاری کے حل کے لئے مزید کسی شرح و حواشی کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی"۔ (مقدمہ لامع الدراری ص: ۲۵۳) مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۲۲ھ میں صحیح بخاری کے ساتھ یہ حاشیہ طبع ہوا ہے۔ اخیر میں مفتی صدرالدین آزردہ (م ۱۲۸۵ھ) کی تقریظ بھی ہے۔

(ان ہی حواشی کے ساتھ بخاری شریف کی پندرہ جلدیں میں مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ بیروت سے دیدہ و زیب طباعت کے ساتھ چھپ کر عالم میں مقبول ہو رہی ہیں۔ (از: مرتب))

حواشی صحیح بخاری: مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ) مولانا احمد علی سہارنپوری کے حاشیہ بخاری کے ساتھ کے آخری پانچ پارے آپ کے قلم سے ہیں۔

حاشیہ بخاری: قاضی عبدالرحمٰن (۱۲۸۵-۱۳۷۲ھ) یہ فیض الصمد کے افادات پر مشتمل ہے۔ (تذکرہ علماء پنجاب ص: ۱۹۰)

حاشیہ صحیح البخاری: مولانا عزیز زبیدی۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی نگرانی میں یہ کام ہوا ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۷۵)

بخاری سے متعلق متفرق علمی کام:

رفع الالتباس عن بعض الناس: مولانا شمس الحق عظیم آبادی

امام بخاری کے ''قال بعض الناس'' کے جواب میں ایک کتاب ''بعض الناس فی رفع الوسواس'' کے نام سے شائع ہوئی تھی، مذکورہ کتاب اسی کے جواب میں ہے، اس کی تحقیق مولانا محمد عزیز شمس الحق نے کی ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص:۵۱)

کتاب تشکیل اسانید البخاری: مولانا فاروق احمد ابو البی انبیٹھوی سہارنپوری شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بھاولپور۔

صحیح بخاری کے اسناد پر آپ کی یہ مشہور کتاب ہے، اس میں آپ نے ہندوستان کے مشہور محدثین واساتذہ حدیث مثلا مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، علامہ انور شاہ کشمیری اور حکیم الامت حضرت تھانوی وغیرہ کے اسانید کس طرح امام بخاری تک پہونچتے ہیں ان کی تفصیل بتائی ہے، یہ چارٹ کی شکل میں ہے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نے لامع الدراری کے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (مقدمہ لامع الدراری ص:۳۶۶)

تخریج آیات الجامع الصحیح للبخاری: مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی (م ۱۳۸۱ھ)۔ (برصغیر میں علماء اہل حدیث کے علمی کارنامے ص:۷۵)

عون الباری فی تخریج آیات البخاری: محشی مولانا تمیز الدین مالدھی۔

صحیح بخاری کی کتاب التفسیر کے آیات کی تخریج کی ہے، ۳۲ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ جے این سنز پریس دہلی سے شائع ہوا ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص:۷۱)

انعام الباری فی شرح اشعار البخاری: مولانا محمد عاشق الٰہی بلندشہری۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے ایماء پر آپ نے یہ شرح لکھی ہے، حضرت شیخ الحدیث نے اس کو ملاحظہ فرما کر بعض جگہوں پر ترمیم بھی کی ہے۔ صحیح بخاری میں مذکور جملہ اشعار کا ترجمہ وتشریح، اور جن واقعات سے متعلق اشعار ہیں ان کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ نیز یہ اشعار کس نے پڑھے اور کس موقع پر

پڑھے، اس کی وضاحت بھی کی ہے۔ اشعار سے متعلق بعض نسخوں میں املاء کا جو فرق ہے حاشیہ میں اس کو بھی بیان کر دیا ہے۔ اشعار کی تشریح میں جن شروح سے استفادہ کیا ہے اس کا تذکرہ ابتداء میں موجود ہے، ۱۳۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۳۹۸ھ میں کتب خانہ یحیوی سہانپور سے شائع ہوئی ہے۔

تجرید بخاری: مرتب مولانا محمد حیات سنبھلی۔

مولانا نے اردو میں بخاری کی تجرید کی ہے، سند اور مکررات کو حذف کر کے صرف متصل روایتوں کا ترجمہ جمع کیا ہے۔ دو جلدوں میں یہ کتب خانہ الٰہی بخش لاہور سے ۱۳۴۲ھ میں طبع ہوئی ہے، مرتب نے اسے اپنے زمانہ قیام میرٹھ میں ہی تیار کیا تھا۔ ابتداء میں ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں رواۃ کے حالات حروف تہجی کے اعتبار سے بیان ہوئے ہیں، پھر امام بخاری کے حالات اور صحیح بخاری سے متعلق بعض اہم تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔ (دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص: ۸۳)

سبحۃ الباری من درر صحیح البخاری (مخطوطہ) مولانا اقبال احمد عمری۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۷۶)

منح الباری فی ترجمۃ صحیح البخاری: مولانا محمد حسین بٹالوی۔ (۱۲۵۶ھ - ۱۳۳۸ھ) (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۷۱)

نبراس الساری علی اطراف البخاری: مولانا عبدالعزیز گوجرنوالہ پنجاب۔

''نبراس الساری'' ان کی مشہور کتاب ہے، علامہ انور شاہ کشمیری ان کے علم وفضل کے مداح تھے۔ اور ان کی تصنیف ''نبراس الساری'' کو پسند کرتے تھے۔ (تاریخ دیوبند ص: ۲۸۷) اس کتاب میں ہر حدیث کے تحت بتایا گیا ہے کہ یہ حدیث کس کس باب میں آئی ہے، اس کے راوی کون کون ہیں اور یہ کتنے اسناد کے ساتھ مروی ہے۔ نیز فتح الباری اور عمدۃ القاری میں یہ کہاں کہاں مذکور ہے، اور اس کی مؤید روایات یا آثار کس کس باب میں ہیں۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۷۷)

رواۃ البخاری المجروحون: مولانا عبدالعلیم رسول پوری (م ۱۳۶۱ھ) کتاب عربی زبان میں ہے اور صحیح بخاری کے بعض رواۃ پر دارقطنی کے انداز پر نقد کیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی قاسمی نے اس

کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔ (دیکھئے: تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص: ۱۷)

صمصام الباری علی عنق جارح البخاری: مولانا محمد دیکاوی (۱۲۷۷-۱۳۵۰ھ) (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۴۸)

حل مشکلات البخاری المسمی به الکوثر الجاری فی جواب الجرح علی البخاری: مولانا محمد ابوالقاسم سیف بنارسی (۱۳۰۷-۱۳۶۷ھ) اس کتاب کی تین جلدیں مطبع سعید المطابع بنارس سے شائع ہوئی ہیں۔ جب کہ چوتھی جلد اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ (تذکرہ علماء بنارس ص: ۲۳۷)

الهام الباری جواب تنقید بخاری (اردو) نواب ضمیر الدین لوحارو۔ "تنقید بخاری" جو ایک شیعہ عالم کی کتاب ہے، اس کی تردید میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۴۹)

تقدیم لامع الداری علی جامع البخاری: شیخ یوسف بنوری۔ لامع الداری پر آپ نے جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے، وہ الگ سے رسالہ کی شکل میں المکتبہ الامدادیہ مکہ مکرمہ سے شائع ہوا ہے۔ اس میں بخاری کے بعض شروط کا تذکرہ، فن حدیث میں علماء ہند کی خدمات، مولانا رشید احمد گنگوہی کا طریقہ درس، لامع الداری کی خصوصیات اور لامع کے مقدمہ کے امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مفتاح صحیح بخاری: مولانا فضل الہی۔ (برصغیر میں علماء اہل حدیث کے علمی کارنامے ص: ۸۳)

مفتاح صحیح بخاری: مولانا خالد بن نور حسین۔ (برصغیر میں علماء اہل حدیث کے علمی کارنامے ص: ۸۳)

کتاب سے درس کا انداز جھلکتا ہے، مسائل کے بیان یا حدیث کی تشریح میں ایجاز کے بجائے اطناب نظر آتا ہے، ابتداء میں مرتب کے قلم سے تفصیلی مقدمہ بھی ہے، جس میں فن حدیث اور صحیح بخاری سے متعلق اہم مباحث ذکر کئے گئے ہیں۔

مقدمه لامع الداری علی صحیح البخاری: شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

لامع الداری کو جب حضرت شیخ الحدیثؒ نے اپنی تعلیق کے ساتھ طبع کرایا تو اس پر ایک فاضلانہ مقدمہ بھی تحریر فرمایا جو پہلے ایڈیشن میں بڑے سائز کے ایک سو پچاس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

۱۳۹۱ھ میں جب اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع ندوۃ العلماء سے شائع ہونے لگا تو مقدمہ کی افادیت کے پیش نظر اسے الگ سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ اب یہ ۲۷۶صفحات پر مشتمل ہے، اس مقدمہ پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ ہے، آپ نے اس مقدمہ کے متعلق جس طرح بلند کلمات کہے ہیں اس کو نقل کئے بغیر قلم آگے نہیں بڑھتا، صرف ایک جملہ دیکھئے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں" فقد أصبحت مقدمة ضافية في علوم الحديث وأنواع المؤلفات فيها ومراتبها وطبقاتها وخصائصها ودائرة معارف فيما يتصل بالإمام البخاري وسيرته وأخباره ودقائق حياته وجلائلها وخفيات أموره وظواهرها (مقدمہ)۔ یہ کتاب چار فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں امام بخاری کا مکمل تعارف کرایا ہے۔ دوسری فصل میں صحیح بخاری سے متعلق اہم مباحث بیان کئے ہیں، تیسری فصل تراجم ابواب سے متعلق ہے۔ اس میں ۱۶۹ اصول وقواعد بیان ہوئے ہیں۔ چوتھی فصل میں صحیح بخاری کی شروحات وحواشی کا جائزہ لیا ہے۔ ان سب کے علاوہ امام بخاری کے رموز واصطلاحات اور اصول حدیث واسماء الرجال سے متعلق بڑے اہم مباحث بیان ہوئے ہیں، اخیر میں مراجع کی فہرست بھی ہے جو مولانا تقی الدین ندوی کے قلم سے ہے۔

مقدمہ صحیح الامام البخاری: مولانا ادریس کاندھلوی۔

امام بخاری کے حالات اور بخاری ومسلم کے شرائط وغیرہ بیان کئے گئے ہیں، یہ ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ (علماء مظاہر علوم ص: ۳۶۸)

ارشاد القاصد الی ما تکرر فی البخاری باسناد واحد: مولانا محمد یونس صاحب جونپوری (۱۳۵۵ھ۔)

صحیح مسلم

شروح مقدمہ مسلم:

البحر الموّاج فی شرح مقدمۃ الصحیح لمسلم بن الحجاج (عربی) مولانا عبداللہ غازیپوری (۱۲۶۱۔ ۱۳۳۷ھ)۔

اس میں مقدمہ کے مشکل الفاظ کی تشریح اور راویوں کے متعلق امام مسلم کے خیالات کی

وضاحت کی گئی ہے۔ یہ کتاب فل اسکیپ سائز میں ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا مخطوطہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ (مجموعۂ خلاصہ ص:۹۶، تصنیفی خدمات ص:۵۴)

النجم الوهاج في شرح مقدمة مسلم بن الحجاج: مولانا شمس الحق ڈیانوی۔

(مجموعۂ خلاصہ ص:۹۳)

فيض الملهم مقدمه صحيح مسلم: مولانا اسلام الحق کوپاگنجی (۱۳۲۲-۱۳۹۲ھ) یہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ (تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص:۵۹)

مقدمہ صحیح مسلم: مولانا حافظ عبداللہ مئوی (م:۱۳۳۷ھ) غیر مطبوع ہے۔

کشف الملہم عمانی مقدمہ مسلم اردو: مولانا عبدالسلام بستوی (م۱۳۹۴ھ)

مقدمہ کا ترجمہ اور مشکل الفاظ کی وضاحت پر مشتمل ہے، محبوب المطابع دہلی سے ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوئی ہے، بعد میں کتب خانہ مسعود یہ اردو بازار دہلی سے بھی چھپی ہے، یہ طلبہ کیلئے مفید ہے، عبارت کی وضاحت کے ساتھ تراکیب بھی بتائے ہیں نیز حدیث سے متعلق بعض اصطلاحات کی تعریف بھی کی ہے۔

شروح مسلم:

السراج الوهاج من كشف مطالب صحيح مسلم بن الحجاج: نواب صدیق حسن خاں قنوجی (م ۱۳۰۷ھ) حافظ منذری نے صحیح مسلم کی تلخیص کی ہے، یہ اسی مختصر کی شرح ہے۔ اس میں امام نووی کی شرح سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ امام نووی اپنی شرح میں اکثر مسائل میں اجماع نقل کیا کرتے ہیں، اس پر نواب صاحب نے اکثر نقد کیا ہے، شارح نے اطناب اور اختصار دونوں کے درمیان متوسط شرح تیار کی ہے، اس میں الفاظ کی وضاحت پر خاص توجہ ہے۔ بعض روایات کی تشریح میں گفتگو لمبی ہوگئی ہے، ۱۳۰۲ھ میں مطبع صدیقی بھوپال سے پہلی بار طبع ہوئی ہے، پھر عبداللہ بن ابراھیم انصاری کی تحقیق کے ساتھ قطر سے اور ۱۹۹۷ء میں عبدالتواب ہیکل کی تحقیق کے ساتھ وزارت اوقاف قطر سے گیارہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

الحل المفهم لصحیح مسلم: مولانا محمد عاقل صاحب نے حضرت گنگوہی کی دو دری تقریروں کو سامنے رکھ کر اسے مرتب کیا ہے، پہلی تقریر کو مولانا محمد یحیٰ کاندھلوی نے قلمبند کیا تھا، جب کہ دوسری تقریر شیخ محمد حسن پشاوری کی نقل کردہ ہے، اس پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور مرتب کے قلم سے حواشی بھی ہیں، انداز تحریر اس طرح ہے کہ ہر صفحہ کے اوپر اصل مسلم کا صفحہ نمبر، سطر نمبر پھر حدیث کا ٹکڑا جس سے متعلق حواشی میں لکھا ہے، یہ دو جلدوں میں مکتبہ خلیلیہ مظاہر علوم سہارنپور سے شائع ہوئی ہے۔

تقریر الجنجوهی علی صحیح مسلم: مولوی حسین علی پنجابی (۱۲۸۳-۱۳۶۳ھ) نے حضرت کی درسی تقریر کے افادات کو مرتب کیا ہے۔ یہ چھوٹے سائز میں ۶۸ صفحات پر مشتمل دین محمدی پریس لاہور سے طبع ہوئی ہے۔ صفحہ اور سطر کی تعیین کے ساتھ بعض مشکل مقامات کی وضاحت ہے، پوری تقریر نہیں ہے۔

شرح کتاب الإیمان لصحیح مسلم: مولانا علی احمد (۱۳۱۳-۱۳۷۹ھ)

کتاب الایمان سے متعلق مسلم کی یہ شرح چار سو صفحات پر مشتمل ہے، شارح نے اس کے اہم اور مشکل مباحث پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور مشکلات کو حل کیا ہے۔ یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ (تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص: ۲۱۹)

تقریر صحیح مسلم: علامہ انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) کی درسی تقریر کو آپ کے شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانی نے ضبط کیا تھا، یہ تقریر یقیناً علامہ کے علمی تبحر کا آئینہ دار ہوتی، مگر افسوس کہ یہ ضائع ہوگئی۔ (نقش دوام ص: ۳۰۷)

أمالي علی مسلم: علامہ انور شاہ کشمیری کے درس مسلم کے افادات ہیں۔ ڈکٹر ولی الدین ندوی نے اس امالی کا تذکرہ کیا ہے۔ (دیکھئے: الحدیث و تجدیات العصر ص: ۱۰۰۲)

فتح الملہم: علامہ شبیر احمد عثمانی بجنوری (۱۳۲۵-۱۳۶۹ھ) صحیح مسلم کی یہ مبسوط شرح ہے جو حنفی نقطۂ نظر سے باضابطہ لکھی جانے والی شرحوں میں سب سے مقدم اور علمی وفنی حیثیت سے گرانقدر علمی سرمایہ

ہے۔ علامہ کا یہ عظیم علمی کارنامہ ہے، وہ ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔ علامہ اپنی مختلف دینی و سیاسی مصروفیات کی بناء پر اس کو مکمل نہ کرسکے، کتاب الرضاع تک پہونچے تھے کہ خود آپ کی کتاب زندگی کا ورق پلٹ گیا، اس کی تکمیل آپ ہی کے خانوادہ کے ایک چشم و چراغ مشہور محقق عالم مولانا تقی عثانی کے قلم سے ہوئی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوا تھا، دوسرا ایڈیشن مکتبہ رشیدیہ کراچی سے چھپا ہے، اس کی تین جلدیں فتح الملہم کے نام سے ہے، بقیہ چھ جلدیں تکملہ فتح الملہم کے نام سے۔ اس شرح کی چند خصوصیات اس طرح ہیں:

۱۔ ایمانیات کے باب میں اختلافی مسائل کی تحقیق اور حتی الامکان اختلاف کو کم کرنے کی کوشش۔

۲۔ رواۃ کے تراجم کے ساتھ کہیں کہیں نقد بھی۔

۳۔ ہر موضوع سے متعلق اہم کتابوں کا خلاصہ۔

۴۔ اسرار شریعت کے بیان پر خاص توجہ، اور اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ، امام غزالی، اور شیخ اکبر وغیرہ کی تصانیف سے اقتباسات۔

ابتداء میں ۱۰۸ صفحات پر مشتمل مفصل مقدمہ ہے، جس میں امام مسلم اور ان کی صحیح کا تعارف، امام بخاری و مسلم کے شرائط اور دونوں کے امتیازی پہلو نیز دونوں کے درمیان ترجیح پر روشنی ڈالی ہے۔ علامہ زاہد الکوثری نے اس شرح کی بڑی تعریف کی ہے، آپ کے الفاظ پڑھنے کے قابل ہیں، آپ ایک جگہ لکھتے ہیں "کـلـمـا درسـنـه ازددت إعـجـابا بالكتاب، فانتم يا مولانا فخر الحنفية في هذا العصر حقا، أبديتم بشـرح صحيح مسلم هذا عن علـم غـزيـر وفضل فياض في هدوء تام وسكينة في كل اخذ ورد كما هو شان أربـاب الـقـلـوب من السلف الصالح (فتح الملہم ۳/۵۱۹ مدینہ پریس بجنور) پھر علامہ نے اپنے رسالہ الاسلام میں اس کا تعارف کرایا ہے اور اس کے لئے بڑے اچھے کلمات استعمال کئے ہیں، آپ نے اس شرح کو صحیح مسلم سے متعلق ایک علمی خلا کی تکمیل سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مقدمہ

''مبادی علم الحدیث واُصولہ'' کے نام سے شیخ ابوغدہ کی تحقیق کے ساتھ مستقل کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوا ہے۔

تفہیم المسلم: یہ کتاب مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم، علامہ ابراہیم بلیاوی اور مولانا سید حسین احمد مدنی کی درسی تقاریر اور مولانا بدر عالم میرٹھی کے افادات پر مشتمل ہے۔ مرتب نے ان چاروں حضرات کے افادات کو اس شرح میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے ٹائٹل پر افادات کہہ کر ان حضرات کے نام بھی لکھے ہیں، فتح الملہم سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے اور اس کے حوالے بھی دیئے ہیں، پہلے حدیث کا متن ذکر کیا ہے، پھر ترجمہ اور شرح پیش کی ہے۔ اجزاء کی شکل میں اس کی طباعت ہوئی ہے، شروع کے تین اجزاء مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کے قلم سے ہیں، بقیہ اجزاء مولانا کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی کے ترتیب کردہ ہیں، یہ سارے اجزاء کتب خانہ محمد یہ دیوبند سے چار جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔

حواشی مسلم:

حواشی صحیح مسلم مع الشرح للنووی: سید امیر علی ملیح آبادی (م: ۱۳۳۷ھ)۔
یہ مختصر حاشیہ ہے جو ۱۳۲۲ھ میں منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے، اس کا ایک نسخہ علامہ شبلی نعمانی کتب خانہ میں موجود ہے۔

حاشیہ شرح مسلم: مولانا شاہ ابوالحسن فرد قادری مجیبی پھلواری (م ۱۸۴۹ء)۔
(تذکرہ علماء بہار ص: ۳۱)

التعلیق علی الصحیح لمسلم: مولانا عبدالجلیل سامرودی (م ۱۳۹۲ھ) صحیح مسلم کی دونوں جلدوں کا یہ مکمل حاشیہ ہے، جو ابھی تک غیر مطبوع ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۶۳)

حاشیہ صحیح مسلم: مولانا عبدالسلام مدنی۔ یہ صحیح مسلم کی کتاب الصیام تک کا حاشیہ ہے جو مختلف شروح کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ یہ ابھی قلمی ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۷۸)

تعلیق حاشیہ صحیح مسلم للسندی: عبدالتواب ملتانی (۱۲۸۰-۱۳۶۶ھ)۔ (تذکرہ علماء پنجاب ص: ۲۸۰)

سنن الترمذی

شروح

مجموعہ شروح اربعہ ترمذی شریف: مولوی محمد عبدالوہاب خاں خلف الرشید نواب محمد علی خاں والی ریاست محمد آباد ٹونک کی فرمائش پر یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے، جو مطبع نظامی کانپور سے ۱۳۰۶ھ میں شائع ہوا ہے۔ یہ شرح دو جلدوں میں ہے، پہلی ابواب السفر تک اور دوسری ابواب الطلاق واللعان تک۔ اس میں چار شرحیں ایک ساتھ چھپی ہیں، پہلے سراج احمد سرہندی (م ۱۲۳۰ھ) کی فارسی شرح ہے، اس کے بعد ابوطیب سندی کی عربی شرح، پھر قوت المغتذی اور حاشیہ میں عارضۃ الاحوذی ہے، سراج احمد سرہندی کی شرح بڑی مختصر ہے، اکثر جگہوں پر صرف ترجمہ پر اکتفاء کیا ہے، کہیں کہیں حواشی بھی ہیں۔

تحفۃ الاحوذی لشرح جامع الترمذی: مولانا عبدالرحمن مبارکپوری (م ۱۲۳۸-۱۳۵۳ھ) یہ ترمذی کی مبسوط شرح ہے، ہند و بیرون ہند سے اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس شرح کے امتیازات درج ذیل ہیں:

۱۔ حدیث کی مکمل تشریح وتوضیح۔

۲۔ فقہی مسائل میں مختلف مسالک کا تذکرہ اور پھر دلائل کی روشنی میں اپنی رائے کی ترجیح۔

۳۔ احادیث کی تصحیح کے سلسلہ میں امام ترمذی کے تساہل کی نشاندہی اور اس کا استدراک۔

۴۔ وفی الباب عن فلان وفلان کی تخریج اور جن ابواب میں یہ اشارہ موجود نہیں ہے وہاں اپنی طرف سے باب سے متعلق روایات کا اضافہ۔

۵۔ ترمذی کے بیان کردہ مسالک کے دلائل کا بیان اور پھر ترجیح کا عمل۔

شارح نے مختلف فیہ مسائل میں حنفی مسلک کی خوب خبر لی ہے۔ اور جہاں دلائل بظاہر کمزور ہیں وہاں مکمل کر احناف کے خلاف نقد کیا ہے، اسی طرح علامہ انور شاہ کشمیری کے افادات ترمذی کا مجموعہ العرف الشذی پر بھی نقد کیا ہے۔ دار الفکر بیروت سے شائع نسخہ کے مطابق شروع کی دو جلدیں

مقدمہ پر مشتمل ہیں۔ یہ بڑا ہی فاضلانہ مقدمہ ہے جو علوم ومعارف کا گنجینہ ہے، اس میں علم حدیث اور جامع الترمذی سے متعلق بڑے اہم مباحث بیان کئے گئے ہیں، اس ذیل میں فن حدیث کی اہم کتابوں کا تعارف، رجال کا تعارف، حدیث کی اصطلاحات وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

یہ شرح مختلف حلقوں سے داد تحسین وصول کر چکی ہے، اور نہ صرف شروح ترمذی بلکہ کتب حدیث میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں: وهو شرح ذو قيمة علمية كبيرة ۔ (المدخل الی دراسات الحدیث ص:۵) مولانا تقی عثمانی نے بھی اس شرح کی تعریف کی ہے مگر اس کے ساتھ انہوں نے مولانا مبارکپوری کی زیادتی کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں: اس شرح میں انہوں نے حنفیہ کی خوب تردید کی ہے، اور بسا اوقات حدود انصاف سے تجاوز کیا ہے، اس کا ماخذ زیادہ تر شوکانی کی نیل الاوطار ہے، اگر اس شرح میں حنفیہ کے خلاف تعصب کو نکال دیا جائے تو حل کتاب کے نقطہ نظر سے یہ بہت اچھی شرح ہے۔ (مقدمہ درس ترمذی ص: ۱۴۰؍۱) دارالفکر بیروت او دارالکتب العلمیہ بیروت سے دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ دارالفکر والے نسخہ کی تحقیق ومراجعت عبدالرحمٰن محمد عثمان اور عبدالوہاب وعبداللطیف استاد کلیۃ الشریعہ جامع ازہر نے کیا ہے۔

الکوکب الدری علی جامع الترمذی: مولانا رشید احمد گنگوہی م۱۳۲۳ھ کے درس ترمذی کے افادات کو مولانا یحییٰ کاندھلوی نے جمع کیا تھا، آپ کے صاحبزادے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے اس پر تحقیق وحواشی کا اضافہ کیا ہے، اس طرح یہ مستقل شرح کی شکل میں ۱۳۵۳ھ میں پہلی بار شائع ہوئی ہے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۳۹۵ھ میں مطبع ندوۃ العلماء سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد یہ کتاب مولانا تقی الدین ندوی صاحب کی محنت سے لجنۃ التراث والتاریخ ابوظبی اور ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ پاکستان سے بھی شائع ہوئی ہے۔

حضرت مولانا نے اپنے مقدمہ میں امام ترمذی اور جامع ترمذی کا بڑے اچھے انداز میں تعارف کرایا ہے، پھر اس کے مختلف شروح کا تذکرہ کرتے ہوئے الکوکب کی خصوصیات پر روشنی ڈالی

ہے، آپ نے اس میں لکھا ہے کہ یہ کتاب بڑے علمی فوائد پر مشتمل ہے، اسے وہ شخص ہی سمجھ سکتا ہے جو طویل عرصہ سے درس وتدریس سے جڑا اور اس کے مشکل مقامات سے واقف ہو، اسی طرح اس میں لغت کے فوائد بھی ہیں، غریب الحدیث، رواۃ کے تراجم اور مقاصد شریعت کے بیان کا التزام کیا ہے، اس میں ایسے علمی نکتے بھی ہیں جن سے دل کی صفائی ہوتی ہے اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے، اقوال کے درمیان ترجیح قائم کرنے میں صحیح رخ اختیار کیا ہے، اس میں اپنے حدیثی ذوق اور تجربہ کی بناء پر معانی کی تعیین اور احناف کے خلاف دئے جانے والے دلائل کے جواب میں مناسب موقف اختیار کیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا نے شرح کی زبان وعربیت کی بھی تعریف کی ہے۔ مولانا گنگوہی ترمذی کے درس میں مسالک کے بیان اور دلائل کی تنقیح میں سیر حاصل بحث کرتے تھے، ان کا یہ انداز اس مجموعہ سے نمایاں ہے، حضرت شیخ الحدیث کے حواشی بڑے قیمتی اور مختلف شروح کا خلاصہ ہیں، دوسرے ایڈیشن میں مولانا محمد عاقل صاحب کے قلم سے مفصل مقدمہ بھی ہے جو ترمذی اور الکوکب سے متعلق اہم مباحث پر مشتمل ہے۔

اللآلی المنثورۃ: یہ حضرت شیخ الہند محمود حسن دیوبندی کے ترمذی اور ابوداؤد کے درسی افادات کا مجموعہ ہے، جسے آپ کے شاگرد مولانا عبدالحفیظ بلیاوی نے مرتب کیا ہے، جو ۱۳۹۲ھ میں کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں اختصار کے ساتھ حدیث کی تشریح اور مسائل کی وضاحت ہے، ترمذی سے متعلق تقریر ابتداء سے ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

الورد الشذی: یہ بھی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تقریر ترمذی ہے، جو کتبہ اصغریہ دیوبند سے ۱۹۰ صفحات پر مشتمل شائع ہوئی ہے۔ احادیث سے متعلق جو وضیح وتفصیل حضرت شیخ الہند نے بیان فرمائی تھی اس کو اختصار کے ساتھ مولانا سید اصغر حسین نے مرتب کیا ہے۔ ہر باب سے متعلق مختصر تقریر ہے، اخیر میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی اور مولانا ابراہیم بلیاوی کی تقاریظ ہیں، تاریخ طباعت درج نہیں ہے، البتہ تقریر پر ۱۳۶۶ھ درج ہے۔

المسک الذکی یعنی تقریر ترمذی: یہ حضرت تھانوی کی ترمذی کی تقریر ہے، جسے آپ کے شاگرد مولانا

احمد حسن سنبھلی نے جمع کیا تھا، اس کا مسودہ دارالعلوم کراچی میں موجود تھا، مولانا تقی عثمانی صاحب کے ایماء پر مفتی عبدالقادر صاحب نے اس کو ترتیب دی ہے۔ کہیں کہیں مولانا تقی عثمانی صاحب کے حواشی بھی ہیں، اصل جامع نے بھی بعض جگہوں پر حواشی لکھے تھے، وہ حواشی بھی شامل ہیں، اس طرح دو حواشی موجود ہیں، اصل جامع نے بعض جگہوں پر حکیم الامت کی رائے سے اور کہیں کہیں احناف کے مسلک سے بھی تفرد اختیار کیا ہے۔ دوسری جلد کی ترتیب کا کام قاری محمد طاہر رحیمی نے کیا ہے، اس پر بھی دو حواشی ہیں، اخیر میں الثواب الجلی تتمہ المسلک الذکی کے نام سے حکیم الامت کے افادات پر مشتمل ایک رسالہ بھی ہے۔ یہ شرح ادارہ اشرفیہ ملتان سے چھپی ہے، بعد میں ۱۹۹۹ء میں ادارہ اشرفیہ تھانہ بھون سے بھی شائع ہوئی ہے۔ ابتداء میں مولانا تقی عثمانی کا مقدمہ ہے، اس میں انہوں نے حضرت تھانوی کے درس کے امتیازات پر روشنی ڈالی ہے۔

العرف الشذی من جامع الترمذی: یہ علامہ انور شاہ کشمیری کی درسی تقاریر کا مجموعہ ہے، جسے آپ کے شاگرد مولانا چراغ علی نے دوران درس قلمبند کیا ہے، یہ ترمذی کے ساتھ حاشیہ پر مختار اینڈ کمپنی دیو بند سے شائع ہوا ہے۔ علامہ کا درس علوم و معارف کا خزانہ ہوتا تھا، اس کو درس کے درمیان ضبط کرنا نہایت مشکل کام ہے، اس وجہ سے آپ کا یہ درس مکمل طریقہ سے ضبط نہیں ہوسکا اور بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں، مرتب نے اسکا خود ہی اعتراف کیا ہے اور ساری غلطیاں اپنے ذمہ لی ہیں، تحفۃ الاحوذی کے مؤلف نے اپنی شرح میں اس کتاب پر جا بجا جانفقد کیا ہے، اس سلسلہ میں مولانا انظر شاہ مسعودی صاحب کا بیان بڑا منصفانہ ہے کہ ''اگر وہ مرحوم کی خود اپنے قلم سے لکھی ہوئی چیزیں اور نوادرات کا مطالعہ کرتے تو غالباً اس طعن و تشنیع بلکہ ناروا و نا ملائم تنقید کا ان کو موقع نہ ملتا، بلکہ دیانتاً اگر اس پر بھی نظر رہتی کہ یہ ایک طالب علم کا طالب عالمانہ کارنامہ ہے جس نے خود اس کتاب کے دیباچہ و آغاز میں حضرت شاہ کی براءت کرتے ہوئے اس تصنیف کی پوری ذمہ داری اپنے سر لی تو بھی مولانا عبدالرحمٰن کا قلم محتاط رہتا۔ (نقش دوام ص: ۳۰۵) یہ مستقل کتاب کی صورت میں بھی دیو بند سے شائع ہوئی ہے، صفحات ۵۴۳ ہیں، سن طبع مذکور نہیں ہے۔

معارف السنن: مولانا محمد یوسف بن سید محمد زکریا حسینی بنوری (م ۱۳۹۷ھ)۔ علامہ انور شاہ کشمیری کے درس ترمذی کا مجموعہ جو العرف الشذی کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس میں جو خامیاں رہ گئی تھیں ان کی تصحیح آپ نے شروع کی جو مستقل کتاب بن گئی، اس میں اصل توجہ علامہ کے افادات کی تشریح وتوضیح پر ہے۔ اس کے علاوہ مختلف شروح کا خلاصہ بھی آپ نے جمع کردیا ہے، اس طرح یہ ایک مکمل شرح بن گئی ہے۔ مولانا انظر شاہ مسعودی اس شرح سے متعلق لکھتے ہیں "معارف السنن اپنی طوالت کے باجود نہ صرف ترمذی کی متداول شروحات بلکہ بہت سی مستند کتابوں سے بے نیاز کردینے والی کتاب ہے...... مؤلف نے حضرت شاہ کے پیش کردہ حوالوں کو اصل ماخذ سے نکالا اور مفصل انہیں ذکر کیا ہے، ترمذی کے دوسرے شارحین کے اقوال کا تذکرہ بلکہ محدثین کی نادر تحقیقات کا یہ قیمتی مجموعہ ہے" (نقش دوام ص:۳۰۶)۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی میں العرف الشذی پر جو نقد کیا ہے اس کا خاص طور پر شارح نے جائزہ لیا ہے، پھر جہاں انہیں مرتب کے الفاظ سے غلط فہمی ہوئی ہے اس کی وضاحت کی ہے اور جہاں شاہ صاحب کی اصل رائے پر تنقید ہے اس کا مدلل جواب دیا ہے۔ علامہ بنوری کے تعاقب سے اندازہ ہوتا ہے کہ العرف الشذی میں الفاظ کے انتخاب میں مرتب سے غلطی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے وہ تنقید کا نشانہ بنی ہے، ورنہ علامہ بنوری کی وضاحت کے بعد اکثر جگہوں پر اعتراض خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔ یہ ایک مفصل شرح ہے، اس میں شاہ صاحب کے افادات کے ساتھ بیشتر شروح کا خلاصہ آگیا ہے، اسی طرح علامہ بنوریؒ نے امام ترمذی کی تصحیح وتضعیف پر بھی مفصل گفتگو کی ہے۔ ۱۳۸۳ھ میں المجلس العلمی کراچی سے یہ شائع ہوئی ہے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۳۹۸ھ میں ایم ایم سعید کمپنی کراچی سے مطبوع ہے۔ مولانا محمد عاقل صاحب نے اس شرح کی تعریف کی ہے اور اسے طلبہ واساتذہ حدیث کے لئے بہت مفید قرار دیا ہے۔ (مقدمہ الکوکب الدری ص:۳۸)

طیب الشذی شرح جامع الترمذی: مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی (م:۱۹۵۷ء)۔

۱۳۶ صفحات پر مشتمل اس کی پہلی جلد مطبع خیریہ مصریہ میرٹھ سے شائع ہوئی ہے، راوی کی

جرح وتعدیل سے متعلق تحقیق، فقہی مسائل کی تفصیل اور احناف کی ترجیح، ترمذی کا مشہور مسئلہ فی الباب عن فلاں کی تخریج اور حل لغات اس کے خاص امتیازات ہیں، ابتداء میں حضرت تھانوی اور علامہ انور شاہ کشمیری کی تقاریظ ہیں، اس کے علاوہ شارح کا مقدمہ بھی ہے، جس میں حدیث، تدوین حدیث اور اس کے مبادی سے متعلق اچھی گفتگو کی ہے۔ اس کی دوسری جلد بقول مولانا سید شاہد صاحب شائع ہورہی تھی مگر معلوم نہیں طبع ہوئی یا نہیں۔ (علماء مظاہر علوم جلد اول ص:۳۹۱)

معارف مدینہ: مولانا طاہر حسن امروہوی نے مولانا حسین احمد مدنی کے درس ترمذی کے افادات کو مرتب کیا ہے، اس میں مولانا کے افادات کے علاوہ دیگر اساتذہ حدیث کی تحقیقات کو بھی اختصار سے جمع کیا ہے، ترتیب کا انداز اس طرح ہے کہ حدیث نقل کرنے کے بعد ترجمہ پھر مولانا مدنی کے افادات بیان کرتے ہیں۔ مولانا مدنی کے درس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ ائمہ اربعہ کے مسالک اور دلائل ان کے اصل مراجع کے حوالے سے بیان کرتے، پھر دلائل کی روشنی میں مسلک احناف کو ترجیح دیتے، یہ امتیاز اس تقریر میں بھی باقی ہے، یہ کتاب اجزاء کی شکل میں معارف مدنیہ امروہہ سے شائع ہوئی ہے، اس کے بارہ اجزاء شائع ہو چکے ہیں۔

توضیح الترمذی: یہ بھی مولانا حسین احمد مدنی کے افادات پر مشتمل ہے، جسے آپ کے شاگرد مولانا محمد قاسم صاحب نے مرتب کیا ہے، ترتیب کے بعد مولانا مدنی نے اس پر نظر ثانی فرمائی ہے، اسی طرح مرتب نے بھی اس پر حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ (اردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ ص۱۴۱)

شرح ترمذی مولانا سید برکات احمد (م ۱۹۲۸ء)۔ (تذکرہ علماء بہار ص:۶۶/۱)

ترمذی شریف کامل اردو مع مکمل و مستند شرح: مولانا سید نذیر الحق قادری۔ مکتبہ دار الفرقان جامع مسجد دہلی سے شائع ہوئی ہے، اس میں مکمل ترمذی کا ترجمہ ہے اور فائدہ کے عنوان سے احادیث کی تشریح ہے۔ (اردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ ص:۱۴۰)

العنوم الملامع علی السنن والجامع: مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی۔ ترمذی کا مکمل ترجمہ۔

(علماء مظاہر علوم جلد دوم ص:۲۶۷)

تقریر ترمذی شریف (اردو):

مولانا عبدالرحمٰن کانپوری کی درس ترمذی کی مختلف تقاریر کو سامنے رکھ کر اسے مولانا سعید الرحمٰن صاحب نے مرتب کیا ہے، جو جامعہ اسلامیہ دیوبندی سے شائع ہوئی ہے۔اس میں دقیق فنی مباحث، احادیث سے مستنبط ہونے والے مسائل اور مسلک حنفی کی تائید پر توجہ ہے۔ (دبستان دیوبند کی علمی خدمات ص ■)

ترجمہ وشرح جامع الترمذی: نواب بدیع الزماں حیدرآبادی۔

شرح ترمذی: مولانا محمد صبغۃ اللہ بن محمد غوث شافعی مدراسی (م ۱۲۸۰ھ)۔ (مقدمہ الکوکب الدری)

جائز الشعوذی شرح ترمذی: نواب بدیع الزماں لکھنوی۔

یہ اصل میں ترجمہ ہے، کہیں کہیں مختصر شرح یا فوائد بھی ذکر کئے ہیں۔

شرح ترمذی اردو: مولوی فضل اللہ انصاری۔ (اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص:۲۱۷)

الخیر الجلی فی شرح الترمذی (غیر مطبوعہ): مولانا خیر محمد مظفر گڑھی (۱۳۰۵۔۱۳۹۴ھ)

یہ عربی کی مکمل شرح ہے۔ (علماء مظاہر علوم جلد دوم ص:۸۱)

تلخیص الترمذی: مولانا عبداللہ بلیاوی، اس میں ترمذی کی تلخیص کے ساتھ علمائے احناف پر ہونے والے اعتراضات کی وضاحت بھی ہے۔ (علماء مظاہر علوم جلد دوم ص:۲۳۹)

تلخیص الترمذی: مولانا حبیب الرحمان خیرآبادی (م:۱۳۵۶ھ)۔ یہ مکمل شرح ہے، مگر ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ (علماء مظاہر علوم جلد دوم ص:۶۵)

شرح ترمذی: مولانا ابوالعطاء عبدالغنی رسول پوری نے مولانا گنگوہی کی تقریر، مولانا یحییٰ کاندھلوی کے درسی افادات اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی تحقیقات جمع کی تھیں جواب محفوظ نہیں ہے۔

(علماء مظاہر علوم ج: دوم ص:۲۲۱)

لب الالباب فی شرح قول الترمذی وفی الباب: مولانا عبداللہ طارق دہلوی۔

جامع ترمذی کے وفی الباب عن فلاں والی روایات کے طرق والفاظ کو جمع کیا ہے، جو نامکمل ہے۔

(علماء مظاہر علوم ج دوم ص:۲۹۷)

شمائل ترمذی

تعلیقات شمائل: مولانا وحید الحق محدث پھلواری (۱۱۲۴-۱۲۰۰ھ)۔ (تذکرہ علماء بہار ص: ۳۱۳)

انوار محمدی شرح شمائل ترمذی: مولانا کرامت علی جونپوری۔ یہ کتاب شوکت المطابع میرٹھ سے شائع ہوئی ہے۔ ترجمہ کے ساتھ مختصر حواشی بھی ہیں۔

شرح شمائل ترمذی: مولانا اشفاق الرحمن کاندھلوی (م ۱۳۷۷ھ)۔

عربی میں مفصل اور جامع شرح ہے مگر ابھی تک غیر مطبوع ہے۔

(تذکرہ علماء مظاہر علوم ص: ۳۹۵)

خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی: شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی۔

۲۲۸ صفحات پر مشتمل یہ شرح ۱۳۴۶ھ میں کتب خانہ یحیوی سے شائع ہوئی ہے، اس میں ترجمہ اور مختصر تشریح ہے۔ ۱۳۶۰ھ میں حضرت شیخ نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور الفاظ کی تحقیق، حل لغات اور رواۃ کے اسماء کی تعیین وضبط کا اضافہ کیا ہے۔ فائدہ کے عنوان سے حدیث کی شرح کی ہے۔ اس میں مذاہب کے اختلاف اور کہیں کہیں احناف کے دلائل کو بیان کیا ہے، بعض جگہوں پر الفاظ کی تشریح یا رواۃ کا ترجمہ عربی میں بھی ہے، ابتداء میں مولانا عبداللطیف صاحب اور مولانا ظفر احمد تھانوی کی تقاریظ ہیں، مولانا ظفر احمد تھانوی نے اس شرح میں اسماء الرجال سے متعلق بحث کو سراہا ہے (تقریظ ص: ۲)۔ یہ کتاب عوام وخواص میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے اور مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

خصائل نبوی: مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ یہ کتاب شمائل کی اردو تلخیص ہے، جو ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۲۲ء میں اس کا ساتواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۶۰)

حواشی

حاشیہ ترمذی: مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (۱۲۲۵-۱۲۹۷ھ)۔ یہ حاشیہ جامع ترمذی کے ساتھ مطبع مجتبائی پریس دہلی سے شائع ہوا ہے۔ آپ نے ترمذی کے نسخوں کی تحقیق بھی کی ہے۔ یہ بہت

مفید او رمتداول حاشیہ ہے۔

المسک الزکی: حاشیہ ترمذی مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) (مقدمہ الکوکب الدری)

حاشیہ جامع ترمذی: نصیر الدین غور غشتوی (۱۲۹۵۔۱۳۸۸ھ)۔

(تذکرہ علماء پنجاب جلد دوم ص: ۶۷۷)

النزل الثوی: مولانا اصغر حسین بنولوی نے اس نام سے ترمذی کی تعلیق کی ہے، جو تقسیم ہند سے قبل متداول تھی۔ مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (دیکھئے مقدمہ، روائع الاعلاق شرح تہذیب الاخلاق ص: ۴۳)

تعلیقات علی الترمذی (نامکمل): مولانا سید عبد الحی حسنی رائے بریلوی۔

تعلیقات ترمذی (نامکمل): مولانا عبد الجبار صاحب۔ (علماء مظاہر علوم جلد دوم ص: ۲۴۰)

حواشی الکوکب الدری علی جامع الترمذی: الکوکب پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کا قیمتی حاشیہ ہے، اس حاشیہ میں مولانا نے مختلف شروح سے خاصا مواد جمع کر دیا ہے، مشکل عبارت کی تنقیح، تحقیقات کا اضافہ، اور مذاہب کی تفصیلات پر خاص توجہ ہے، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے اس مقدمہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی ان حواشی سے متعلق تحریر فرماتے ہیں "مولانا زکریا کے حیرت انگیز تفحص وتلاش واستقصاء کا کسی قدر اندازہ ان کے حواشی پر ایک نظر کرنے سے ہو جاتا ہے۔ کتاب کی ضخامت زیادہ تر حواشی کے باعث ہوئی ہے۔ اور اکثر حواشی ایسے ہیں کہ اس میں سے ایک ایک کیلئے خدا ہی بہتر جانتا ہے مولانا کا کتنا کتنا وقت صرف ہوا ہوگا"۔ (اخبار صدق بحوالہ فہرست تالیفات شیخ دوم ص: ۲۸۱)

دیگر علمی کام:

ہدیۃ اللوذعی بنکات الترمذی: مولانا شمس الحق عظیم آبادی۔

یہ ۱۲ صفحات پر مشتمل مختصر رسالہ ہے، اس میں امام ترمذی اور جامع ترمذی کا تعارف کراتے ہوئے امام ترمذی کے اساتذہ اور شارحین ومحشین کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔

(جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۵۲)

تکملہ مقدمہ تحفۃ الاحوذی: مولانا عبدالصمد حسین آبادی (۱۳۲۲-۱۳۶۷ھ)۔
مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کی تحفۃ الاحوذی کا مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں تھا، اور اس کے ابواب وفصول بھی ناقص تھے، اس کی تکمیل مولانا نے کی ہے۔ (تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص: ۱۶۳)

مقدمہ الکوکب الدری: مولانا محمد عاقل سہارنپوری۔
ترمذی کی شرح الکوکب الدری کا یہ مفصل مقدمہ مولانا محمد عاقل صاحب کے قلم سے ہے، جو تین فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں امام ترمذی کے حالات، دوسری میں جامع ترمذی کے امتیازات وخصائص، کتب ستہ میں اسکی حیثیت اور تیسری فصل میں مظاہر علوم کے تین اساتذۂ حدیث مولانا گنگوہی، مولانا یحییٰ کاندھلوی اور مولانا محمد زکریاؒ کے درس کے امتیازات بیان کئے ہیں، ۱۳۹۴ھ میں حضرت شیخ الحدیث کے ایماء پر یہ مفصل مقدمہ آپ نے تحریر کیا ہے، جو مقدمہ الکوکب الدری کے ساتھ مطبوع ہے۔

سنن ابی داؤد

شروح

غایۃ المقصود فی حل سنن ابی داؤد: مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی (۱۲۷۳-۱۳۲۹ھ)
ابوداؤد کی یہ ایک مبسوط شرح ہے جو نہایت ہی عمدہ ہے۔ مگر شارح اسکو مکمل نہ کر سکے۔ اسکی پہلی جلد مکتبہ انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، یہ باب ترک الوضوء مما مست النار تک کی شرح پر مشتمل ہے، اس کی دوسری جلد کتاب الصلوۃ پر مکمل ہوئی ہے۔ لیکن یہ غیر مطبوع ہے، اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی علمی خدمات ص: ۵۰) اس شرح کے حاشیہ پر تلخیص المنذری اور ابن قیم کی تہذیب سنن ابی داؤد بھی چھپی ہوئی ہے۔ شروع میں ایک مفصل مقدمہ ہے، شارح نے جن نسخوں کو سامنے رکھ کر متن کی تصحیح کی ہے ان کو بیان کیا ہے۔ پھر محدثین کا تعارف کرایا ہے۔ حقدمین کے ساتھ مولانا سید نذیر حسین کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا ہے۔
اس شرح کی اہل علم نے بڑی ستائش کی ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں: وقــد

احتوی علی بحوث مفیدۃ و فوائد کثیرۃ ...لوتم لکان عملاً جلیلا من شروح الحدیث الکبیرۃ ۔ (مقدمہ بذل المجہود ص ۷) مولانا یوسف بنوری نے تعریف کے ساتھ اس پر نقد بھی کیا ہے، آپ لکھتے ہیں: ولوتم لکان شرحاً جیداً لو لا فیہ اساءۃ الادب بائمۃ الدین ۔ (حوالہ سابق) مولانا عاشق الٰہی نے بھی اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (دیکھئے تذکرۃ الخلیل ص ۲۶۷) جب کہ مولانا عاقل صاحب نے اس کے دوسرے پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: اس شرح میں فوائد حدیثیہ کافی ہیں لیکن شارح سے حل کتاب اور قال ابو داؤد کے بیان مراد میں بہت سی جگہ تسامح ہوا ہے، جس کی ہمارے حضرت سہارنپوری نے متعدد مقامات پر تنبیہ اور نشاندہی فرمائی ہے۔ (الدر المنضود علی ابی داؤد ص ۵۹) احادیث کی توضیح وتشریح کے ساتھ ائمہ کے مسالک بیان کئے ہیں۔ پھر شارح نے کسی ایک رائے کو ترجیح دی ہے۔

عون المعبود شرح سنن ابی داؤد: مولانا ابو الطیب شمس الحق عظیم آبادی۔ یہ اصل میں ابو داؤد کا حاشیہ ہے، ۱۳۱۸ھ میں مطبع انصاری دہلی سے چار جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن میں با ضابطہ عون المعبود حاشیہ سنن ابی داؤد اور بعض میں سنن ابی داؤد مع حاشیہ عون المعبود تحریر ہے۔ بعد میں اس کا جو ایڈیشن دار الفکر بیروت اور دار الکتاب العربی بیروت سے شائع ہوا ہے اس میں بھی اندر پہلے ایڈیشن کے پہلے صفحہ کا عکس دیا ہے۔ جس میں حاشیہ کی صراحت موجود ہے مگر کتاب کے ٹائٹل پر عون المعبود شرح سنن ابی داؤد چھپا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن جو حاشیہ کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں محشی کا نام محمد اشرف لکھا ہے۔ اس کا مقدمہ بھی محشی کے قلم سے ہے۔ اور اس میں نام ابو عبد الرحمن شرف الحق الشہیر محمد اشرف بن امیر الصدیق العظیم آبادی لکھا ہے۔ اور اس کی بھی وضاحت ہے کہ یہ حواشی میں اپنے بھائی مولانا شمس الحق کے اصرار پر لکھ رہا ہوں جو کہ غایۃ المقصود کے نام سے ایک مفصل شرح لکھ رہے ہیں۔ بہر حال اب یہ شرح کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اور ٹائٹل پر شارح کی حیثیت سے مولانا شمس الحق عظیم آبادی کا نام تحریر ہے، مولانا مستقیم سلفی اور مولانا عبد الرشید عراقی نے بھی اسے مولانا کی شرح قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: جماعت اہل حدیث کی تصنیفی

خدمات ص: ۵۰) مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے اس کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے کہ مولانا شمس الحق صاحب کو اندازہ ہوا کہ وہ مفصل شرح مکمل نہیں کر سکیں گے تو انہوں نے حواشی کو مکمل کیا اور پہلی جلد کو اپنے بھائی کے نام سے موسوم کیا، (نزہۃ الخواطر: ج ۸ ص: ۱۷۹)۔ اس میں حدیث کی وضاحت پر خاص توجہ ہے۔ فقہاء کے مسالک بھی مختصر بیان کئے ہیں، ابتداء میں عبدالمنان وزیر آبادی اور مولانا عبدالحفیظ دہلوی کے توصیفی کلمات موجود ہیں۔

بذل المجہود فی حل سنن ابی داؤد: مولانا خلیل احمد سہارنپوری (م ۱۳۴۶ھ)۔

۱۳۳۵ھ میں اس تالیف کا آغاز ہوا اور ۱۳۴۵ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس طرح دس سال اس شرح کی تالیف میں صرف ہوئے ہیں۔ (فہرست ص ۳۲۰) کتابوں کی مراجعت اور تسوید و تحریر شیخ الحدیث کے ذمہ تھی، مقدمہ میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب مظاہر علوم سہارنپور سے پانچ جلدوں میں شائع ہوئی، اس کے بعد ہندوستان و بیرون ہند کے مختلف مکتبات سے بار بار شائع ہوئی ہے۔ ابتداء میں مولانا یوسف بنوری، علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی قیمتی تحریر ہے۔ مولانا یوسف بنوریؒ نے اس شرح کے امتیازات کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جبکہ حضرت مولاناؒ نے اپنے مقدمہ میں سنن ابی داؤد اور ان کے شروح کا تعارف کرایا ہے، پھر بذل المجہود کے امتیازات وخصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس شرح کے چند امتیازات اس طرح ہیں:

(۱) اسماء کی تحقیق کی ہے اور اسماء الرجال کی مختلف کتابوں سے رجال کا تعارف لکھا ہے۔

(۲) متن حدیث کی تسلی بخش تشریح کی ہے۔ اگر کوئی روایت صحاح کی دیگر کتابوں میں زیادہ واضح نظر آئی ہے تو اس کو بھی نقل کیا ہے۔

(۳) فقہاء کے مذاہب کو نقل کرنے کے ساتھ صحابہ وتابعین کے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔

(۴) مسائل کی توضیح میں امام ابوداؤد کے اقوال نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

(۵) ابوداؤد کی تعلیقات کی تخریج کی ہے۔

(۶) روایات اور تراجم ابواب کے درمیان تطبیق دی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان کے علاوہ دو مزید امتیازی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے: پہلی یہ کہ احادیث کی شروح اور فقہی مسائل کے اثبات میں عموماً کلامی اسلوب اور عقلی انداز نظر آتا ہے، یہ شرح اس سے مستثنیٰ ہے، اور دوسری خصوصیت یہ کہ شارح نے فتن اور ملاحم کے باب میں احادیث کی تطبیق اور واقعات کی تعیین کی کوشش کی ہے۔ (مقدمہ ص:۱۴) ابتداء میں حضرت شیخ الحدیث کے قلم سے علم حدیث کے اہم مباحث پر مشتمل مفصل مقدمہ ہے۔ اور مختلف اکابر علم وفن کی تقاریظ ہیں۔ ان حضرات نے اس شرح کی ستائش کی ہے۔ بعد کے ایڈیشن میں حضرت شیخ الحدیث کے حواشی بھی شامل ہیں۔ اس کا چوتھا ایڈیشن مطبع ندوۃ العلماء سے شائع ہوا ہے۔ اس کی تصحیح کے لئے مولانا تقی الدین ندوی نے ایک سال شیخ الحدیث کے ساتھ گزارا۔ ابھی حال میں اس کا سب سے عمدہ ایڈیشن مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کی تحقیق وتعلیق سے ۱۴ رجلدوں میں بیروت سے طبع ہوا ہے۔ (فہرست تالیفات شیخ اول ص:۳۲۰)

اللآلی المنثورۃ: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے ترمذی اور ابوداؤد کے درسی افادات کا مجموعہ ہے، جسے آپ کے شاگرد مولانا عبدالحفیظ بلیاوی نے مرتب کیا ہے، جو ۱۳۹۲ھ میں کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اختصار کے ساتھ حدیث کی تشریح اور مسائل کی وضاحت ہے، ابوداؤد سے متعلق تقریر ۳۲ صفحہ سے اخیر کتاب تک مشتمل ہے۔

عون الودود فی شرح سنن ابی داؤد: مولانا محمد بن نورالدین ہزاروی (م ۱۳۶۶ھ)، یہ اصح المطابع لکھنؤ سے ۱۳۱۸ھ میں شائع ہوئی ہے۔

فلاح وبہبود شرح اردو قال ابوداؤد: مولانا حنیف گنگوہی۔ حل لغات کو ذکر کیا ہے۔ شرح کے ساتھ اصل توجہ قال ابوداؤد پر ہے، امام داؤد نے حدیث کے بعد جو کلام کیا ہے، اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

انوار المحمود علی سنن ابی داؤد: یہ اصلاً علامہ انور شاہ کشمیری کی درسی تقاریر کا مجموعہ ہے، مرتب ابوالعتیق عبدالہادی محمد صدیق نجیب آبادی نے اس کے ساتھ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، علامہ شبیر احمد

عثانی کی درسی تقاریراور بذل المجہود کے خلاصہ کا اضافہ کیا ہے۔مرتب علامہ کے شاگرد ہیں،انہوں نے اس شرح کو مرتب کرنے کے بعد علامہ کے پاس بھیجا،آپ نے مطالعہ کے بعد اس کی توثیق فرمائی ہے۔(نقش دوام ص:۳۰۷) یہ شرح تجلی پریس دہلی سے ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ابتدا میں ایک تفصیلی مقدمہ ہے۔اس میں علم حدیث کی کتابت،حدیث کی اشاعت اور ائمہ حدیث سے متعلق مباحث ہیں۔مولانا اصغر حسین شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے اس کی تعریف کی ہے اور اسے علم حدیث کے فوائد و دقائق اور مباحث علمیہ کا ایک قابل قدر ذخیرہ قرار دیا ہے۔خود علامہ کے دو خطوط بھی مرتب کے نام سے کتاب میں شائع ہوئے ہیں۔جبکہ شیخ یوسف بنوری نے اس پر زبردست ریمارکس کیا ہے۔آپ تحریر فرماتے ہیں: وأنور المحمود بما ليست لولم ينسبه إلى الاستفادة من الأكابر فقيه من المعاظر وقد أساء بنسبه إلى إمام العصر الشيخ محمد أنور شاه.

(مقدمہ بذل المجہود ص:۷)

الدر المنضود علی سنن ابی داؤد یعنی تقریر ابوداؤد شریف:

یہ مولانا سید محمد عاقل صاحب کے درسی تقاریر کا مجموعہ ہے جسے آپ کے شاگرد مولانا شاہد اللہ ہزاری باغ نے دوران درس قلمبند کیا تھا۔مولانا عاقل صاحب کی نظر ثانی کے بعد ۱۴۱۳ھ میں مکتبہ خلیلیہ محلہ مفتی سہارنپور سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔شروع میں مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب کے نام سے دو مقدمہ ہیں۔پہلے میں فن حدیث کا تعارف کرایا ہے۔جبکہ دوسرے میں امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد اور اس کے شروح و متعلقات کو بیان کیا ہے۔اس تقریر میں بذل المجہود سے کافی استفادہ نظر آتا ہے۔حضرت شیخ الحدیث کے حوالے بھی آئے ہیں۔یہ شرح طلبہ کے لئے مفید ہے۔اور مولانا تقی الدین ندوی کے بقول بذل المجہود کی اردو تلخیص ہے۔ (مقدمہ الدر المنضود ص:۲)

عون الودود شرح ابی داؤد: محمد بن عبداللہ پنجابی۔مطبع اصح المطابع سے شائع ہوئی ہے۔شرح حاشیہ پر ہے۔شارح نے اختصار کے ساتھ حدیث کی شرح کی ہے،مسالک کا بیان،احادیث کی تخریج نیز روایات پر حکم اور اس سے متعلق دیگر کتابوں سے تائیدی کلمات بھی نقل ہوئے ہیں،تاریخ طبع درج نہیں ہے۔

حواشی

تعلیقات مولانا بارک اللہ لکھنوی (م ۱۳۱۱ھ) بحوالہ رسالہ فکر ونظر پاکستان

تعلیق المحمود حاشیہ سنن ابی داؤد: مولانا فخر الحسن گنگوہی (۱۸۳۶ء۔۱۸۹۷ء)۔

ابوداؤد کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر آپ نے اس کی تصحیح کی ہے، اس کے بعد اس پر جامع ومبسوط حواشی تحریر فرمایا، جو حل کتاب، رواۃ کے تراجم اور معنی کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے۔ مولانا عاشق الٰہی بلند شہری نے لکھا ہے کہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری بذل المجہود کی تالیف کے وقت ابوداؤد کے جو نسخے رکھتے ان میں ایک مذکورہ حاشیہ مطبوع اصح المطابع والانسخہ بھی تھا۔ (تذکرۃ الخلیل) مولانا ادریس کا ندھلوی جو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے شاگرد اور بذل المجہود کی تصنیف کے وقت سہارنپور میں تھے، نقل کرتے ہیں کہ حضرت سہارنپوری حضرت فخر العلماء کے حاشیہ کی بڑی تعریف فرماتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس حاشیہ نے ان کی بہت سی مشکلات کو رفع کیا ہے (سوانح علماء دیو بند ص: ۳۶۳) لیکن اس میں بہت سے اوہام واغلاط بھی ہیں، ہمارے سامنے نامی پریس کانپور کا نسخہ ہے۔

تعلیقات سنن ابی داؤد ناتکمل: قاضی حسین بن محسن یمانی (م: ۱۳۲۷ھ) (نزہۃ الخواطر ج ۸، ص: ۱۱۴)

تعلیقات سنن ابی داؤد ناتکمل: مولانا عبد الحی حسنی (م ۱۳۴۱ھ) (الامام ابوداؤد السجستانی ص: ۷۰)

تعلیقات: مولانا عبد الوہاب ملتانی ۱۳۶۶ھ

التعلیق علی سنن ابی داؤد: مولانا عبد الجلیل سامرودی۔ سنن ابی داؤد کا مکمل حاشیہ جو قلمی نسخہ کی شکل میں ہے۔ (تصنیفی خدمات ص: ۶۳)

تعلیقات مولانا محمد حیات السنبھلی (م: ۱۴۰۹ھ) (حوالہ سابق)

فیض الودود تعلیق سنن ابی داؤد: مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔ یہ غیر مطبوع ہے۔

(مقدمہ مرعاۃ المفاتیح ص: ۷)

حاشیہ ابوداؤد (غیر مطبوع) نصیر الدین غورغشتوی (۱۲۹۰۔۱۳۸۸)

(تذکرہ علماء پنجاب جلد دوم ص: ۶۷۷)

مقدمہ ابوداؤد: مولانا محمد یوسف صاحب جونپوری۔ (علماء مظاہر علوم جلد دوم ص:۳۹۷)

فتح الودود شرح ابوداؤد: ابوالحسن سندھی۔ (اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص: ۲۱۶)

تعلیقات علی ابی داؤد: حافظ محمد بن بارک اللہ لکھنوی۔ ابوداؤد کے بعض مقامات کی تعلیق ہے۔

(مجموعۃ الخلاصہ ص: ۴۸)

تعلیقات علی عون المعبود: شیخ عبدالوہاب ملتانی دہلوی (۱۲۸۰۔۱۳۱۵ھ) ابوداؤد کی شرح عون المعبود پر تعلیقات وحواشی ہیں۔ (مجموعۃ الخلاصہ فی خدمۃ السنۃ المطہرۃ ص:۸۵)

حواشی بذل المجہود: شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ۔

بذل المجہود کا چوتھا ایڈیشن ۱۳۹۲ھ میں مطبع ندوۃ العلماء سے شائع ہوا ہے۔ اس پر حضرت شیخ الحدیث کی تعلیقات بھی ہیں جو بقول مولانا شاہد صاحب حضرت شیخ الحدیث کی چالیس سالہ علمی عرق ریزی اور فنی کاوشوں کا اعلیٰ شاہکار ہیں (فہرست تالیفات شیخ الحدیث ص:۳۳۳) اس حاشیہ کے متعلق آپ خود تحریر فرماتے ہیں "بذل المجہود کی طباعت کے بعد اس پر حواشی کا سلسلہ اس ناکارہ کی طرف سے شروع ہوا، اور اخیر زمانہ ۱۳۸۸ھ تک ابوداؤد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں جو نئی بات نظر پڑتی رہی وہ بذل کے حاشیہ پر لکھتا رہا، وہ ایک مستقل ذخیرہ بنتا گیا" (آپ بیتی ص:۱۴۳، بحوالہ فہرست تالیفات شیخ) اہل علم اور خصوصاً اساتذۂ حدیث کے لئے یہ بڑے قیمتی حواشی ہیں، اس کی تصحیح میں مولانا تقی الدین ندوی صاحب نے حضرت شیخ الحدیث کی معاونت کی تھی اور اس سلسلہ میں آپ کے ساتھ ایک سال قیام بھی کیا، آپ نے اپنے ایک خط میں اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ بذل کے حاشیہ کی تصحیح ان سے اچھی کوئی نہیں کر سکتا۔ (بحوالہ فہرست تالیفات شیخ ص:۳۳۳) بذل المجہود کے مصری طباعت کے اختتام پر ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے مشہور محدث شیخ محمد حافظ تیجانی نے کہا تھا کہ شیخ نے حقیقت میں ان حواشی میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، بحوالہ فہرست تالیفات شیخ ص:۳۲۷)

تعلیقات علی بذل المجہود: مولانا تقی الدین ندوی۔ اس شرح کی جدید تحقیق وایڈیٹنگ کی خدمت آپ نے کی ہے، آپ کی اس تحقیق وتعلیق کے ساتھ ۱۴ جلدوں میں بیروت سے طبع ہوئی ہے۔

سنن أبی داؤد سے متعلق دیگر علمی کام

رحمۃ الودود علی رجال سنن ابی داؤد: مولوی محمد شفیع شکرانوی (م: ۱۳۳۷) (دربھنگہ نامہ ص: ۷۲)
الھدی المحمود ترجمہ سنن ابی داؤد: نواب وحید الزماں حیدر آبادی (۱۲۶۷۔۱۳۳۸ھ) مطبع لاہور سے شائع ہوا ہے۔ مختلف شروح کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا ہے، کہیں کہیں الفاظ کی تشریح بھی کی ہے۔
(جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص ۵۵)

سنن نسائی

شروح

الفیض السمائی علی سنن نسائی: یہ مشہور محدث وفقیہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے درسی افادات اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے افادات جو انہوں نے اپنے استاد مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے حاصل کی تھی، ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ حضرت شیخ الحدیث نے ان دونوں کو تقریباً پانچ سو صفحات میں جمع کیا تھا، آپ اپنی مصروفیات کی بناء پر اس کو مرتب و محقق نہ کر سکے، چنانچہ مولانا محمد عاقل صاحب نے اپنی تحقیق وحواشی کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے۔ جو ۱۴۰۵ھ میں مکتبہ خلیلیہ محلہ مفتی سہارنپور سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ حضرت گنگوہی کے افادات کو متن کی شکل میں پیش کیا ہے، پھر شیخ الحدیث کے افادات ہیں، اس کے بعد ان دونوں عبارتوں پر مرتب کے حواشی ہیں، اس طرح ان دونوں تقریروں میں جو جگہیں خالی تھیں یا جو ابواب باقی تھے ان کو بھی مرتب نے مکمل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت گنگوہی کی تقریر پر تائیدی عبارتوں کا اضافہ بھی کیا ہے، اس طرح یہ نسائی کی مکمل شرح بن گئی ہے۔ اس مجموعہ میں الفاظ کی تشریح اور حل عبارت پر خاص توجہ ہے، نسخوں کے اختلاف کو بھی ذکر کیا ہے۔ حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت اور فقہی مسالک کی تفصیل کے ساتھ بعض راویوں پر کلام بھی کیا ہے۔ ابتداء میں مرتب مولانا سید محمد عاقل صاحب کے قلم سے تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں دونوں اساتذہ حدیث کا تعارف، کتب حدیث کی مختلف قسموں کا تعارف، کتاب کی حیثیت، امام نسائی کے شرائط اور تراجم کی حیثیت پر سیر

حاصل بحث کی ہے، اس ضمن میں اس موضوع کو بھی واضح کیا ہے کہ صحاح ستہ کے ائمہ نے ائمہ فقہ کی کتنی روایتیں نقل کی ہیں، بالخصوص امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی روایتیں کم کیوں ہیں، پھر اپنی بحث کو محققین کی عبارتوں سے مزین کیا ہے۔

روض الربی من ترجمۃ المجتبی المعی سنن النسائی: نواب وحید الزماں حیدر آبادی۔

یہ ۱۲۹۹ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۰۲ھ میں طبع ہوا ہے، اس میں ترجمہ کے ساتھ تشریح بھی ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۱۵۵)

تقریر نسائی: (غیر مطبوع) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ صاحب۔ (علماء مظاہر علوم جلد دوم ص: ۱۱۷)

حواشی

تعلیقات علی سنن النسائی (غیر مطبوع): مولانا شمس الحق عظیم آبادی (۱۲۷۳-۱۳۲۹ھ)۔

(جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۵۱)

حاشیہ مولانا وصی احمد سورتی: مطبع نظامیہ سے ۱۲۹۹ھ میں مطبوعہ کتاب پر یہ حواشی ہیں، محشی مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے تلامذہ میں سے ہیں۔ (مقدمہ الفیض السمائی ص: ۵۴)

تعلیقات وحواشی: شیخ محمد محدث تھانوی۔ مطبع مجتبائی سے ۱۳۱۵ھ میں نسائی کا جو نسخہ شائع ہوا ہے اس کی پہلی جلد کے آخر میں تعلیقات ہیں، ناشر نے اسے التعلیقات المفیدۃ الرائعۃ علی النسائی سے تعبیر کیا ہے۔ محشی مولانا محمد دھلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ (مقدمہ الفیض السمائی ص: ۵۳)

حواشی مولانا نذیر احمد دہلوی (م: ۱۳۲۰ھ)۔

مطبع انصاری دہلی سے مطبوعہ کتاب پر یہ حواشی ''الحواشی الجدیدۃ'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں، محشی مشہور محدث سید محمد نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ میں سے ہیں۔ سن طباعت ۱۳۱۵ھ درج ہے۔ (مقدمہ الفیض السمائی ص: ۵۴)۔

تعلیقات سنن نسائی: مولانا ابویحیٰ شاہجہاں پوری (م ۱۳۳۸ھ)۔ یہ التعلیقات السلفیہ میں حواشی

جدیدہ کے نام سے شامل ہے۔

حاشیہ سنن نسائی: مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی (م: ۱۳۷۷ھ)۔

مفتی کفایت اللہ دہلوی کے مشورہ پر آپ نے یہ حواشی تیار کئے ہیں، اس کیلئے متعدد کتب حدیث اور بطور خاص سیوطی وسندی سے استفادہ کیا ہے اور اس کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید اضافے بھی کئے ہیں۔ مفتی کفایت اللہ اور مولانا محمد حیات سنبھلی نے اسماء الرجال اور رواۃ کے احوال پر اضافہ کیا ہے۔ ۱۳۵۰ھ میں یہ حاشیہ دو جلدوں میں مکتبہ رحیمیہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔ (تذکرہ علماء مظاہر علوم ص: ۲۹۳) ابتداء میں مقدمہ ہے جو علم حدیث اور نسائی سے متعلق ابحاث پر مشتمل ہے۔ مولانا عاقل صاحب نے اس حاشیہ کی تعریف کی ہے۔ (مقدمہ الفیض السمائی ص: ۵۳)

التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی: محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (۱۹۰۹-۱۹۸۷ء)۔

۱۳۷۵ھ میں یہ تعلیقات سنن نسائی کے ساتھ المکتبۃ السلفیۃ لاہور سے طبع ہوئے ہیں، یہ تعلیقات اصلاً مختلف حواشی کا مجموعہ ہیں، یعنی محشی نے اس میں سیوطی کی زہرالربی، سندی کی تعلیق، حواشی جدیدہ کے نام سے دوسلفی عالم ابوعبدالرحمٰن محمد پنجابی دہلوی (م: ۱۳۱۵ھ) اور ابویحییٰ محمد بن کفایت اللہ شاہجہاں پوری (م: ۱۳۳۸ھ) کے اضافے اور شیخ حسن بن محسن یمانی (م: ۱۳۲۷ھ) کی تعلیقات بھی شامل ہیں، حاشیہ میں ان سب کے لئے رموز کا استعمال ہوا ہے، محشی نے کہیں کہیں مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی کے حواشی پر اعتراض بھی کیا ہے۔ یہ حاشیہ مسائل کی تنقیح، حل عبارت اور رواۃ کے مختصر تراجم پر مشتمل ہے۔ روایتوں کے درمیان تعارض ہونے پر تطبیق بھی دی ہے۔ اور ضعیف ومدلس راوی کی نشاندہی کی ہے۔ مولانا محمد عاقل صاحب نے اس کی تعریف کی ہے مگر رد حنفیہ کا شکوہ بھی کیا ہے۔ (مقدمہ الفیض السمائی ص: ۵۴)

التعلیق علی سنن النسائی: (قلمی) مولانا عبدالجلیل سامرودی۔ یہ صرف دوسری جلد کا حاشیہ ہے جو فل اسکیپ سائز میں ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص: ۶۳)

حاشیہ سنن نسائی: مولانا عبدالسلام مدنی۔ یہ صرف دوسری جلد کا حاشیہ ہے جو قلمی ہے اور ۱۳۴ صفحات

پر مشتمل ہے۔ (جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات:۷۸)

حقائق الدانی شرح خصائص النسائی: مولانا سید ابوالقاسم (م:۱۳۴۴ھ)۔ (تذکرہ علماء پنجاب ص:۵۶)

سنن ابن ماجه

شروح:

انجاح الحاجة بشرح سنن ابن ماجه: شیخ عبدالغنی بن ابی سعید مجددی دہلوی (م:۱۲۹۵ھ) یہ مختصر مگر جامع اور عمدہ شرح ہے۔ (امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص:۲۳۶)

شرح سنن ابن ماجہ: مولانا محمد بن یوسف سورتی۔ (۱۳۰۷-۱۳۶۱ھ)۔ (نزہۃ الخواطر ج:۸)

شرح سنن ابن ماجہ (ناقص) مولانا عبدالصمد حسین آبادی اعظمی (م:۱۳۲۲-۱۳۶۷ھ)۔

(جماعت اہل حدیث کی علمی خدمات ص:۵۳)

مفتاح الحاجة بشرح سنن ابن ماجه: شیخ محمد علوی، اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

(امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص:۲۳۶)

شرح سنن ابن ماجہ: (قلمی نامکمل) مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی۔

(جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص:۴۸)

رفع العجاجة شرح ابن ماجه (اردو): نواب وحید الزماں حیدرآبادی۔

(جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص:۵۶)

شرح ابن ماجہ: مولانا عبدالسلام بن یار بخش بستوی (م:۱۹۸۴ھ)۔ (مجموعہ خلاصہ ص:۱۱۴)

حواشی ابن ماجہ: علامہ انور شاہ کشمیری (م:۱۳۵۲ھ)۔

مولانا انظر شاہ مسعودی نے اس سے متعلق لکھا ہے کہ یہ ضائع ہوگئی، جبکہ سید محبوب رضوی صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا محمد بن موسیٰ افریقی نے اس کے نسخے شائع کئے ہیں۔

(دیکھئے نقش دوام ص:۳۰۷۔ تاریخ دیوبند ص:۱۵۳/۱)

حاشیہ سنن ابن ماجہ: مولانا فخرالحسن گنگوہی (م:۱۳۱۵ھ)۔

یہ مقبول ومتداول حاشیہ ہے جو بار بار طبع ہو چکا ہے، محشی نے علامی سیوطی، شیخ عبدالغنی مجددی کی انجاح الحاجۃ اور سنن ابن ماجہ کی دیگر شروح کا خلاصہ جمع کر دیا ہے، مزید اپنی طرف سے اضافے بھی کئے ہیں۔ مولانا عبدالرشید نعمانی نے اس کی تعریف کی ہے۔

(امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص: ۲۴۳، حواشی علی ابن ماجہ شیخ احمد تھانوی۔ مجموعۃ خلاصہ ص: ۱۳٦)۔

ماتمس الیہ الحاجۃ: مولانا عبدالرشید نعمانی۔

ابن ماجہ کے ساتھ یہ رسالہ شائع ہوا ہے، اس میں تدوین حدیث کی مکمل تاریخ اور صحاح ستہ کا تعارف اور پھر امام ابن ماجہ اوران کی سنن کا جامع ومکمل تعارف کرایا ہے۔ اس کا ترجمہ "امام ابن ماجہ اور علم حدیث" کے نام سے مختلف مکتبوں سے شائع ہو چکا ہے۔

☆☆☆

فهرست مراجع ومصادر:

(۱) مقدمہ لامع الدراری: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی ومولانا سید ابوالحسن علی ندوی مطبع ندوۃ العلماء ۱۹۷۱ء۔

(۲) مقدمہ الکوکب الدری ازمولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(۳) مقدمہ بذل المجہود فی حل سنن ابی داؤد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(۴) مقدمہ الدر المنضود علی سنن ابی داؤد: مولانا محمد عاقل صاحب مکتبہ خلیلیہ سہارنپور

(۵) امام ابن ماجہ اور علم حدیث: مولانا عبدالرشید نعمانی

(٦) مقدمہ مرعاۃ المفاتیح: مولانا عبدالسلام مبارکپوری، ادارۃ البحوث الاسلامیہ بنارس طبع دوم ۱۹۸۵

(۷) مقدمہ روائع الاعلاق شرح تہذیب الاخلاق ازابومحفوظ الکریم معصومی ۱۹۹۸

(۸) المدخل إلى دراسات الحديث: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی المجمع العلمی الاسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۹) إتحاف القاري بسمر فة جهود أعمال العلماء على الصحيح للبخاري: محمد عصام

عرار الحسنی بیروت ۔۱۹۸۷ء۔

(۱۰) جهود مخلصة فی خدمة السنة المطهرة : عبدالجبار فریوائی ادارۃ البحوث الاسلامیہ بنارس ۱۹۸۰

(۱۱) اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں: مولانا سید عبدالحی حسنی مترجم: مولانا ابوالعرفان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۹ء۔

(۱۲) اردو زبان میں علوم اسلامیہ کا سرمایہ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد ۲۰۰۰ء

(۱۳) دبستان دیوبند کی علمی خدمات: مولانا اسیر ادروی ، دارالمصنفین دیوبند

(۱۴) جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات: محمد مستقیم سلفی ادارۃ البحوث الاسلامیہ بنارس جلد دوم ۱۹۹۲

(۱۵) برصغیر میں علماء اہل حدیث کے علمی کارنامے: عبدالرشید عراقی علم و عرفان پبلیشرز لاہور ۔۲۰۰۱ء

(۱۶) علماء مظاہر علوم سہارنپور اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات۔ مولانا سید شاہد سہارنپوری: کتب خانہ شاہد العلوم سہارنپور ۔۱۹۸۰

(۱۷) فہرست تالیفات شیخ مکتبہ یادگار شیخ سہارنپور

(۱۸) تذکرہ علماء اعظم گڑھ: مولانا حبیب الرحمان اعظمی قاسمی جامعہ اسلامیہ بنارس ۔۱۹۷۲

(۱۹) تذکرہ علماء بنارس: مولانا وسیم احمد قاسمی جامعہ اسلامیہ بنارس ۔۱۹۹۰

(۲۰) تاریخ دیوبند: سید محبوب رضوی

(۲۱) نقش دوام: مولانا انظر شاہ مسعودی شاہ اکیڈمی دیوبند طبع دوم ۔۱۹۸۸

(۲۲) وادی بالان المعروف بہ دربھنگہ نامہ: ڈاکٹر آغا عماد الدین احمد دربھنگہ ایسوسی ایشن کراچی ۔۱۹۹۲ء

(۲۳) تذکرہ علماء پنجاب: اختر راہی مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور طبع دوم ۔۱۹۹۸

(۲۴) نزہۃ الخواطر: علامہ سید عبدالحی دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۔۱۹۲۶

(۲۵) تذکرہ دانشوران سہارنپور: مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری مکتبہ یادگار شیخ سہارنپور طبع دوم

(۲۶) تذکرہ علماء بہار: مولانا ابوالکلام قاسمی

(۲۷) سوانح علماء دیوبند: مرتب ڈاکٹر نواز دیوبندی



ہندوستان میں کتب حدیث کے اردو تراجم کا جائزہ

تاریخ، اسباب ومحرکات، تراجم پر مختصر تبصرہ

از: مولانا سلمان نسیم ندوی

رسول اللہ ﷺ نے انسانی دنیا کی رہنمائی کے لیے امت کو دوسرا چشمہ عطا کیا ہے، قرآن اور سنت، ہر دور میں اللہ تعالی نے ہر طرح سے اس کی حفاظت کے مختلف انتظامات بھی فرمائے ہیں، انھی انتظامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس دور میں کتاب وسنت کی جس قسم کی خدمت کی ضرورت ہوئی اللہ تعالی نے اپنے بندوں سے یہ خدمت لی ہے، آغاز تاریخ اسلامی سے آج تک قرآن وحدیث کی خدمت جہاں جہاں جس جس طریقے سے ہوئی ہے، اگر اس کی حکمت ومصالح اور اس کے نتائج پر نظر ڈالی جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ خدمات دراصل قرآن وسنت کی حفاظت کے خدائی انتظامات تھے۔

ہندوستان میں اسلام دو راستوں سے آیا: خشکی اور تری سے، غالب امکان ہے کہ اس سرزمین پر صحابہ کرام بھی آئے[1]، تابعی اور تبع تابعین کی آمد کے تو قطعی الثبوت دلائل ہیں، ہندوستان کو

[1] ”تحریک اہل حدیث“ کے مصنف رقم طراز ہیں: ”چنانچہ ۲۵ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہندوستان تشریف لائے، ۱۲ صحابہ حضرت عمر کی خلافت میں پانچ حضرت عثمان کے دور خلافت میں اور تین حضرت علی کے دور امارت میں اور چار حضرت امیر معاویہ کے دور حکومت میں، ایک یزید بن معاویہ کے دور حکمرانی میں “(ص: ۱۲۸)۔

سب سے پہلا محدث ۱۵۹ھ میں ربیع بن صبیح السعدی البصری (م ۱۶۰ھ) کی صورت میں ملا، لیکن اس سے پہلے جو بھی آئے وہ اپنے ساتھ دین، تبلیغ دین کے جذبات، قرآن اور حدیث لے کر آئے، جس امت کے افراد کی خیر دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتربیت سے انھی ہو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس ملک ہندوستان میں اپنی بنیادی مہم سے غافل ہوتے، انہوں نے ہندوستانی نفوس میں اسلامی تعلیمات کے ذریعہ سے دینی دعوت اور تعلیم کی روح پھونک دی جس کے مظاہر ہر دور میں سامنے آتے رہے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، اس دعوت وتبلیغ کے لیے ان مبارک نفوس نے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مختلف وسائل اور طریقہائے عمل کو اختیار کیا، کبھی درس وتدریس کی مسندیں بچھیں تو کبھی بحث ومناظرہ کی محفلیں گرم ہوئیں، منبر ومحراب سے قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں لگیں تو خانقاہوں سے حکمت ومعارف کے چشمے پھوٹے اور مخلوق نے ان چشموں سے خوب خوب پیاس بجھائی، ایک طرف تلاش وتحقیق، نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی، علوم ومعارف کے ایسے نادر نمونے سامنے آئے کہ بغداد وقرطبہ کی علمی مجلسوں کا گمان ہوا تو دوسری طرف دعوت وعزیمت کی ایسی باد بہاری چلی کہ عہد صحابہ کی یاد تازہ ہوگئی، یہ سب فیضان تھا اس نبی امی کا جو اپنی قوم کو قرآن وحدیث کا بیش بہا تحفہ عطا کر گئے۔ (فداہ ابی وامی)

ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی انہی خدمات میں ایک زریں باب ''کتب احادیث کے اردو تراجم'' کا بھی ہے۔

اردو کے آغاز سے قبل ہندوستانی زبانوں میں علوم اسلامیہ کا جائزہ:

ہندوستان کے تمام علمی ادوار میں مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہوتا رہا، البتہ سیاسی انقلابات نے جہاں علوم کے دوسرے شعبوں پر اثر ڈالا ہے وہیں ترجمہ کا کام بھی ان عوامل ومحرکات کے دست برد سے محفوظ نہیں رہا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے دو صدی کے بعد قرآن کا ترجمہ سندھی زبان میں ہو جاتا ہے، یہ ترجمہ ۲۷۰ھ میں اروررابعہ کے لیے کیا گیا تھا، اسی کو ہندوستان میں قرآن کا پہلا ترجمہ قرار دیا گیا ہے، اور یہی ہندوستان میں ترجمہ کا سن آغاز ہے۔ (حیات عبدالحق ص:۳۴)

علامہ سید سلیمان ندویؒ (صفر ۱۳۰۲ھ رنومبر ۱۸۸۴ء۔ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ ر۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء) نے غالباً اسی ترجمہ کی زبان کو "ہندی" لکھا ہے، علامہ کے اس ترجمہ کی زبان کو ہندی قرار دینے کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ اس عہد میں ہندوستان میں جس زبان میں بھی کام ہوا ہے عرب مورخین نے اس کے لیے ہندی کا لفظ ہی استعمال کیا ہے، خود اس کا تذکرہ علامہ نے بھی کیا ہے۔

(نقوش سلیمانی: ص ۶۰۔۵۹)

ہندوستان میں اسلام کے طلوع کے بعد جتنی تیزی سے یہ پہلا ترجمہ منصۂ شہود پر آیا تھا اس کا تقاضہ یہ تھا کہ ہندوستانی زبان میں اسلامی علوم وفنون اور تراجم کا ایک عظیم الشان کتب خانہ تیار ہو جاتا لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا، ایک ندوی فرزند (مولانا مسعود عالم ندویؒ) نے اس صورتحال سے متاثر ہوکر حضرت مجدد الف ثانی (۱۷۱ء۔۱۰۳۴ھ) سے قبل کے زمانہ کو ظلمت کا دور قرار دیا ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی ان کی اس رائے پر استعجاب کا اظہار فرماتے ہیں، لیکن اس رائے کی تغلیط کی شدید خواہش کے باوجود وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (محرم ۹۵۸ھ۔۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ) سے قبل کی قرآنی خدمات کی فہرست میں چھ کتابوں سے زیادہ کا اضافہ نہیں کر سکے، حدیثی خدمات اس تعداد سے بھی خالی نظر آتی ہے، صرف چار کتابوں کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے، (۱) فیض الباری شرح صحیح البخاری بقلم میر سید عبدالاول (۹۶۸ گجرات) (۲) مجمع البحار (۳) رسالہ فی لغۃ المشکوۃ بقلم شیخ محمد بن طاہر (۴) رسالہ سود، (موضوع اقسام احادیث) بقلم سید ہبۃ اللہ المعروف بہ شاہ میر شیرازی گجراتی (المتوفی ۱۰۰۵) یہ ہے کل سرمایہ، اس میں بھی ہندوستانی زبان کی کوئی شرکت نہیں ہے، ہاں! محدثین اور علماء اسلام کا تذکرہ اور ان کے درسی مجالس کا غلغلہ اس عرصہ میں ضرور بلند رہا ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ہندوستانی زبان میں صوفیاء کی تحریروں میں حدیث سے استفادہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کو حدیث کا باقاعدہ ترجمہ نہیں قرار دیا جا سکتا، ہندوستان میں حدیث کے اولین شارح ومترجم شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ قرار دیے جا سکتے ہیں، اشعۃ اللمعات (فارسی) ترجمہ وتشریح مشکوۃ المصابیح تکمیل (۱۰۲۵ھ) ان کی حدیثی خدمات کا شاہکار ہے، علمی میزان میں ان کی یہ شرح

عربی شرح لمعات التنقیح (تکمیل ۲۴ رجب ۱۰۲۵ھ) پر فوقیت رکھتی ہے، پھر بھی اشعۃ اللمعات کو تراجم کی فہرست میں اولیت اس لیے حاصل نہیں ہوگی کہ اس کی شہرت ترجمہ سے زیادہ شرح سے ہے، البتہ خالص ترجمہ کی خدمت شیخ دہلوی نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مکتوب جو معاذ بن جبل کے نام لکھا گیا تھا، اس کا فارسی ترجمہ کر کے کیا ہے اور اس طرح ہندوستان میں حدیث کے مترجمین کی فہرست میں سرفہرست ان کا نام آتا ہے۔

محدث دہلوی کے بعد اس خاندان ہمہ آفتاب نے اس روایت کو قائم رکھا تا آنکہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۴ شوال ۱۱۱۴ھ/ ۱۱۷۶ھ) نے قرآن شریف کا فارسی میں ترجمہ کیا، کتب احادیث کی عربی و فارسی میں شرحیں لکھیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب کا ترجمۂ قرآن کا کارنامہ ایسے ہی تھا جیسے کسی بندہ کو توڑ دیا گیا ہو، اس کے بعد تو تراجم کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔

اردو سے قبل ہندوستانی زبان میں قرآن وحدیث کے تراجم کی قلت کے اسباب:

بدقسمتی سے اردو سے قبل کا جو زمانہ ہے جس کو قرون وسطی بھی کہتے ہیں وہ ہندوستان میں قرآن اور حدیث سے عمومی غفلت اور کوتاہی کا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ''واقعہ یہ ہے کہ درۂ خیبر سے جو مسلمان قومیں وارد ہوئیں وہ ترکستان، خراسان اور افغانستان سے آئی تھیں، گو کہ ترکستان وخراسان تیسری صدی میں علم حدیث کا گہوارہ تھے، اور امام بخاری، امام مسلم نیشاپوری، امام ترمذی، امام نسائی، ابوداؤد سجستانی، ابن ماجہ قزوینی، انہی اطراف و دیار کی سرزمین کی خاک سے پیدا ہوئے تھے، مگر عباسی سلطنت کی کمزوری کے بعد جب ان ممالک میں خودمختار غیر عربی حکومتیں قائم ہوئیں، تو یہ ذوق گھٹتا گیا اور آخر تاتاریوں کے سیلاب بلا کے بعد ہر جگہ سناٹا چھا گیا، مذہبی علوم کی ضرورت تو صرف اس لیے پیش آئی تھی کہ عہدۂ قضا کے ممتاز منصب کو حاصل کیا جائے، اور اس کے لیے

صرف فقہ دانی کی ضرورت تھی، فقہ کو فارسی میں دانش کہہ سکتے ہیں، اس لیے علم فقہ کا نام علم دانائی اور دانشمندی قرار پایا، چنانچہ اس عہد سے لے کر آج تک ان اطراف میں حدیث وتفسیر کا نہیں، بلکہ علم دانائی کا رواج ہے، چنانچہ آج بھی ترکستان وخراسان وسرحد سے جو طلبہ علم دین کی طلب کے لیے ہندوستان آتے ہیں، وہ صرف ونحو کے بعد فقہ کے بھوکے ہوتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ان ممالک میں فقہ اور فتاویٰ کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں، اور حدیث کی طرف اعتناء اور التفات نہ ہوا''۔ (مقالات سلیمانی: ص ٦)

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس زمانہ میں ہندوستان کا یہ قلب وجگر (یعنی شمالی علاقہ) علم حدیث اور محدثین سے کیوں اس قدر خالی تھا، جب کے ساحلی علاقوں میں حدیث کی کتابیں اس تیزی سے تصنیف ہو رہی تھیں، اس کے اسباب یہ ہیں:

محمد بن تغلق نے جب علماء ومشائخ کو ملک کے دور دراز حصوں میں بھیج دیا تو شمالی ہندوستان میں علم کی محفلیں سرد پڑ گئیں، فیروز تغلق نے اس بکھری ہوئی مجلس کو سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد جو سیاسی ابتری پیدا ہوئی اس سے تنگ آ کر علماء صوبوں میں چلے گئے اور یہ علاقہ علماء سے یکسر خالی ہو گیا، تیمور کے حملے نے تباہی کو مکمل کر دیا، سکندر لودھی نے اس بزم کو رونق بخشنا چاہی لیکن سیاسی انتشار اور غیر یقینی حالات کے باعث زیادہ کامیابی نہ ہوئی، پھر اکبر کی بے راہ روی سے متاثر ہو کر اکثر علماء ومشائخ اس علاقہ سے ہٹ گئے، انہوں نے یا تو حرمین شریفین کی راہ لی یا پھر دار السلطنت سے دور ساحلی علاقوں میں اقامت اختیار کر لی ..... ''۔ (حیات عبد الحق۔ ص: ٤٢-٤٣)

پروفیسر صاحب نے اگر چہ ان اسباب کو شمالی ہندوستان میں علم حدیث کے ناپید ہونے کی وجہ قرار دیا ہے، لیکن یہ بات کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے کہ اس سے دوسرے علاقے اور صوبے متاثر نہیں ہوئے ہوں گے، اس لیے کہ یہ شورش اور فتنہ وفساد کسی خاص صوبہ اور خطہ میں نہیں بلکہ اس کی آماجگاہ ہندوستان کا قلب اور مرکز تھا اور مرکز سے پورے ملک کا متاثر ہونا فطری بات ہے۔

پروفیسر صاحب نے شمالی ہند کا موازنہ کرتے ہوئے دوسرے صوبوں میں حدیث پر تیزی سے تصنیف وتالیف کا تذکرہ کیا ہے، ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان تصنیفات وتالیفات کی تعداد جن کو پروفیسر صاحب نے اس دور کی علمی حیثیت متعین کرنے کے لیے پیش کیا ہے اس میں حدیث کی کتاب چھ سے زیادہ نہیں ہے، ظاہر ہے اس تعداد کی بنیاد پر تصنیف وتالیف میں تیزی کا دعوی نہیں کیا جاسکتا۔

اس قلت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو کے ایک مستقل زبان کی حیثیت سے رواج گیارہویں صدی ہجری سے ہونا شروع ہوا، اس سے پہلے ہندوستان کی اپنی کوئی ایک مستقل زبان نہیں تھی، صوبائی زبان کا رواج تھا، چنانچہ اکبری عہد میں ابوالفضل نے ہندوستان کی مستقل زبانوں کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''۱۔ دہلوی ۲۔ بنگالی ۳۔ ملتانی ۴۔ مارواڑی ۵۔ گجراتی ۶۔ تلنگی ۷۔ مرہٹی ۸۔ کرناٹکی ۹۔ سندھی ۱۰۔ افغانی ۱۱۔ شال (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے) ۱۲۔ بلوچستانی ۱۳۔ کشمیری۔'' (آئین اکبری جلد سوم ''زبانہا'' ص: ۴۵ نولکشور۔ بحوالۂ نقوش سلیمانی ص: ۲۵۰)

جس طرح ایک موضوع پر کتابوں کی کثرت تعلیم میں مانع ہوتی ہے اسی طرح زبانوں کی کثرت اور کسی مرکزی زبان کا فقدان بھی تحریر میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

اردو کا آغاز:

پروفیسر خلیق احمد نظامی اردو کے ارتقاء کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''اردو نے جس کو ابتدائی دور کی کتابوں میں ''ہندی'' لکھا گیا ہے، صوفیہ ہی کے دامن میں پرورش پائی تھی''۔

(اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر۔ مؤلفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص: ۶۳۔۶۳)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے تحقیق کے بعد اردو کے زمانۂ آغاز کی تحدید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''۶۲ ۷ھ میں عربی، فارسی اور ہندوستانی بولیوں کا مجموعہ جس کو آج آپ اردو کہتے ہیں پیدا ہو چکا تھا''۔ (نقوش سلیمانی ص: ۲۵۱)

مزید لکھتے ہیں:

مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا شاعرانہ تسلط بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا، اور اس نئی زبان کی طاقت روز بروز ابھر رہی تھی، عام بازاروں، گلیوں اور معمولی گھروں سے نکل کر شاہی دربار تک اس کا اثر پھیل رہا تھا، اس لیے شروع شروع میں اس کو لوگوں نے اردوئے معلی کا خطاب دیا، چنانچہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیفات تذکرہ نکات الشعراء میر (صفحہ۱) اور ذکر میر (صفحہ ۶۷)...... میں یہ نام یعنی زبان اردوئے معلی کی لغوی اضافت کے ساتھ استعمال پایا جاتا ہے''۔

تیرہویں صدی کے اوائل سے کثرت استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہتی ہے، اور خود زبان کا نام اردو ہو جاتا ہے......'' (نقوش سلیمانی ص: ۵۷۔۵۸)

اردو میں مذہبی کتابوں کے ترجمہ کا آغاز:

چودہویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں اردو نثر کا آغاز دینی کتابوں سے ہوا، خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (م ۱۴۰۵ء) کا رسالہ ''اخلاق وتصوف'' با قاعدہ تصنیف کہلاتی ہے۔

۱؎ معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے: ''اسی زبان (اردو) کو ''ہندی'' ''دہلوی'' ''گجروی'' ''دکنی'' اور پھر ''ریختہ'' کہا گیا'' (اردو کا ابتدائی زمانہ ص: ۱۲)

اردو میں مکمل پہلا ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادر صاحب (تکمیل ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء) کا ہے لیکن جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے بھی اردو میں ترجموں کی کئی کوشش کی جاچکی تھی، ڈاکٹر سید شاہد علی لکھتے ہیں:

''گرچہ اردو زبان میں تراجم وتفاسیر قرآنی کی ابتدا سولہویں صدی عیسوی کی آخری دہائی (دسویں صدی ہجری) سے شروع ہوتی ہے جو کچھ سورتوں یا پاروں پر مشتمل ہیں، دراصل دسویں وگیارہویں صدی ہجری میں تراجم پر تفسیری حاشیے چڑھا کر ان کو تفسیر کہا گیا جو مختلف مخطوطوں کی شکل میں مختلف لائبریریوں میں آج بھی موجود ہیں، یہ زیادہ تر دکن میں لکھے گئے ہیں حالاں کہ ان میں سے اکثر مصنفین کے نام بھی معلوم نہیں ہوتے، ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اردوئے قدیم'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

ابتدائی تراجم میں قاضی محمد معظم سنبھلی کا ترجمہ (غیر مطبوعہ) جو انہوں نے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں لکھا تھا طبع نہ ہوسکا مگر خطی نسخہ موجود ہے کو پہلا اردو ترجمہ کہہ سکتے ہیں جو خالص اردو تو نہیں بلکہ عربی وفارسی کے میل جول سے پیدا ہونے والی زبان میں تھا۔

بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں شمالی ہند میں پہلی مرتبہ باقاعدہ تفسیر نگاری کی بنیاد پڑی جب شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی پارہ عم کی تفسیر ''خدائی نعمت'' معروف بہ ''تفسیر مرادی'' جو ۲۴ محرم بروز جمعہ ۸۵-۱۱۸۴ھ میں مکمل ہوئی، یہ تفسیر پہلی مرتبہ ۱۲۴۷ھ میں ہوگلی میں طبع ہوئی مگر وہابی لٹریچر سمجھ کر حکومت بنگال نے اسے ضبط کرلیا پھر دوسری مرتبہ ۱۲۶۰ھ اور پھر تیسری بار ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوئی۔

تفسیر مرادی کے بیس سال بعد ۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ میں شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ دہلوی کا ترجمہ وحواشی ''موضح قرآن'' وجود میں آیا جو اردو زبان میں پہلی مکمل تفسیر ہے، اس طرح تیرہویں صدی ہجری سے ہندوستان میں اردو تراجم وتفاسیر کا ایک شاندار عہد شروع ہوتا ہے جو آج تک جاری ہے، اللھم زدفزد۔'' (اردو تفاسیر بیسویں صدی میں: ص:۱۰-۹ مؤلفہ: ڈاکٹر سید شاہد علی)

ان کے بعد انہیں کے برادر بزرگ شاہ رفیع الدین (م ۱۲۳۳ھ) نے قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا، علامہ سید سلیمان ندویؒ شاہ رفیع الدینؒ (م ۱۲۴۹ھ) کے ترجمہ قرآن کے متعلق لکھتے ہیں: اس کارنامہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اگر شاہ صاحب جیسے مقدس عالم اس کام کو اپنے وقت میں نہ کر گئے ہوتے تو آج ہندوستان کے علماء ترکی و مصر کے علماء کی طرح وہم کی اس قید و بند میں گرفتار ہوتے کہ آیا قرآن پاک کا دوسری زبان میں ترجمہ جائز بھی ہے یا نہیں۔ ۱ (مقالات سلیمانی ص: ۴۸)

علوم اسلامیہ کے دونوں مخلص خادموں کے اس بیان سے ایسا احساس ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے بعد سے تراجم اور اردو میں علوم اسلامیہ کی ایک بہار آگئی ہو لیکن اعداد و شمار اس رائے کی تائید نہیں کرتے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کتاب "جائزہ تراجم قرآنی" شائع کردہ خدا بخش پٹنہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان دونوں ترجموں کے بعد تقریباً ۵۵ تراجم سامنے آچکے ہیں، (تاریخ دعوت وعزیمت۔ ج ۵/۱۳۹) جبکہ ۱۹۲۳ء میں پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی نے المسیر ست کے نام سے اردو کتابوں کی جو فہرست حیدرآباد دکن سے شائع کی تھی اس میں ۳۲ تراجم کا تذکرہ ہے، (نقوش سلیمانی ص: ۱۵۵-۱۳۹) یہ تعداد پہلے کے مقابلہ میں یقیناً مثبت پیش رفت ہے لیکن حدیث کے تراجم کے سلسلہ میں تو

۱ شیخ اکرام نے "موج کوثر" میں، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے کہ ترجمہ کی مخالفت کے باوجود ان حضرات نے ترجمہ کیا، لیکن کسی نے اسباب کا تذکرہ نہیں کیا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے فاضل رفیق جناب مولانا اویس صاحب ندوی کے نام مختلف مکاتیب میں اس پر زور دیا ہے کہ اس کے اسباب کی تلاش کی جائے اور قرآن کے تراجم کے محرکات پر کچھ تیار کروایئے، بابائے اردو مولوی عبدالحق ایک جگہ لکھتے ہیں: "شاہ برہان نے بھی اپنے پیر و مرشد اور والد شمس العشاق کی میراں جی کی ہندی (اردو کی ابتدائی شکل) میں لکھنے کی معذرت کی ہے، اس سے ظاہر ہے ان کے زمانہ میں عالم اور ثقہ لوگ ہندی میں لکھنے سے احتراز کرتے تھے" (اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ مولوی عبدالحق ص: ۵۰)

تراجم میراں جی کی وفات ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء یعنی دسویں صدی کا آغاز ہے، اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مطلق ترجمہ کی مخالفت نہیں بلکہ اس وقت "ہندی" زبان میں لکھنا خلاف ثقاہت شمار کیا جارہا تھا۔

ہمیں بالکل ہی مایوسی ہوتی ہے،اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر محمد سجاد بیگ دہلوی نے کتابوں کی جو فہرست شائع کی تھی اس میں (۶۸۹۲) مطبوعہ کتابوں کا اندراج ہے، ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی کے ایماسے پروفیسر ضامن علی صاحب (الٰہ آباد) نے اردو کتابوں کی پیمائش کی مختصر روداد شائع کی ہے،اس میں باجمال بلا نام (۱۷۹۹۷) کتابوں کا شمار ظاہر کیا ہے،اس وقت یہ جائزہ لینا مقصود ہے کہ ان اعداد وشمار میں مذہبی کتابوں اور خصوصاً حدیثی خدمات کا کیا مقام ہے؟

ہندوستانی اکیڈمی کے اعداد وشمار کے اجمالی ہونے کی وجہ سے اس سے کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے،لیکن پہلی فہرست میں مذہبیات سے متعلق کتابوں کی تعداد (۸۹۱) ہے،اس میں حدیث کے صرف (۵۹) کتابوں کا نام ہے،اس ترجمہ کا کوئی ذکر نہیں ہے،حالاں کہ قرآن کے تراجم کے علاوہ دوسرے موضوعات کے تراجم کی ایک طویل فہرست ہے،مذہبیات میں جودوسری کتابیں ہیں ان میں علم اخلاق پر (۱۸۸) کتابیں،فلسفہ وکلام کی (۱۳۶) کتابیں،اخلاق ہنود پر (۱۲۲) کتابیں، مذہب ہنود پر (۹۸) کتابیں،فقہ اہل سنت پر (۹۹) کتابیں مذہب نصاریٰ پر (۳۶) کتابیں شامل ہیں،سوال صرف ترجمہ کا نہیں ہے بلکہ مذہبیات کی تقریباً سات ہزار کتابوں میں حدیث کے صرف (۵۹) کتابیں حیرت انگیز طور پر کمی کا احساس دلاتی ہیں۔ (نقوش سلیمانی:۲۱۰-۲۰۳)

ہندوستان میں اکبر (المتوفی ۱۰۱۴ھ) نے اپنے زمانہ سلطنت (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) میں باقاعدہ ترجمہ کے کام کو فروغ دیا،۱۷۹۱ء میں حیدرآباد میں دارالترجمہ قائم ہوا تھا جو برابر علمی کاموں میں مشغول رہا،۱۹۳۹ء میں اس کی خدمات کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس میں کل ۲۳۶ کتابیں اس نے ترجمہ کرکے شائع کی ہے،لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ علوم وفنون کی فہرست میں حدیث کا نام ڈھونڈ ھنے سے بھی نہیں ملتا۔ (تاریخ ہند۔تالیف:مفتی محمد ذبیح رلوی(پالن پور)-ص:۱۲۸)

یہ بھی ملحوظ رہے کہ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں حدیث کی تقریباً سب کتابیں ممالک اسلامی میں رائج ہوچکی تھیں،ان ملکوں سے جو علماء ہجرت کرکے ہندوستان آئے ہوں گے وہ احادیث کے ان مجموعوں کو ساتھ لائے ہوں گے پھر بھی اس کی اردو میں ترجمہ کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔

ہندوستان جیسے ملک میں دینی اور دعوتی سرگرمیوں میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں اس میں اس کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔

حدیث کی جو کتابیں اردو زبان میں موجود تھیں اس کو خود ہندوستان میں عام قبولیت اور رواج حاصل نہیں تھا، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بمبئی میں ایک کتب خانہ بنام ''رزاقیہ'' کی زیارت کی، علامہ نے اس کتب خانہ کی اردو کتابوں کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں حدیث کی کسی کتاب کا تذکرہ نہیں ہے۔ (نقوش سلیمانی ص:۱۳۹)

اردو میں کتب حدیث کے ترجمے کا آغاز:

مؤرخین نے اردو میں سب سے پہلا ترجمہ تحفۃ الاخیار ترجمۃ مشارق الانوار (للامام حسن الصغانی المتوفی ۶۵۰/۱۲۵۲ء) بقلم مولانا خرم علی بلہوری (المتوفی ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء) قرار دیا ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اپنی کتاب تذکرۃ المحدثین میں ''اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اس ترجمہ کی خاص اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ ہے، مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی لکھتے ہیں:

''کتب حدیث کا سب سے پہلا اردو ترجمہ یہی تحفۃ الاخیار ہے''

مولوی عبدالحلیم چشتی بھی اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ اسی کو بتاتے ہیں۔

''ہندوستان میں اس سے پہلے نہ اردو میں کوئی کتاب چھپی تھی اور نہ عوام میں حدیث کا کچھ چرچا تھا، موصوف نے سب سے پہلے مسلمانوں کو تعلیمات نبویؐ سے باخبر کرنے کے لیے اس کتاب کا ترجمہ کیا۔ (تذکرۃ المحدثین ۳/۶۷)۔

یہ ترجمہ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں مکمل ہوا، تکمیل کے تین سال بعد ۱۲۵۲ھ میں مطبع محمدی لکھنؤ سے آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا۔

محققین کی رائے کی قدر دانی اور احترام کے باوجود یہ لکھنے کی ضرورت پیش آرہی ہے کہ

طباعت اور ترجمہ دونوں لحاظ سے تحفۃ الاخیار کو حدیث کا پہلا ترجمہ قرار دینا تاریخی نقطۂ نظر سے قابل غور ہے۔

کیا "تحفۃ الاخیار" حدیث کا پہلا ترجمہ ہے؟:

طباعت کے لحاظ سے حدیث کی ایک دوسری کتاب کا اردو ترجمہ تحفۃ الاخیار سے مقدم ہے، امام نووی (۶۳۱ھ۔۶۷۶ھ) کی اربعین کا ترجمہ بنام "شرح چہل حدیث" میر علی رضوی بن حافظ محمد علی نے کیا ہے، یہ ترجمہ ماہ ربیع الثانی ۱۲۵۰ھ میں مکمل ہوکر اسی سال طبع ہوا ہے۔ (طبع سوم: ماہ اگست ۱۹۸۶، مطبع: منشی نول کشور)

اس ترجمہ میں حدیث کا لفظی لیکن سلیس ترجمہ مع فوائد ہے، اس ترجمہ کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں حدیث کے ایک ایک ٹکڑے کا الگ الگ ترجمہ دیا گیا ہے اس سے عوام کے لیے استفادہ آسان ہو جاتا ہے۔

تحفۃ الاخیار کی اشاعت کے دوسال بعد ۱۲۵۴ھ میں حدیث کی ایک دوسری عظیم الشان کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" کا مقبول و معروف اردو ترجمہ منظر عام پر آیا، یہ ترجمہ مولانا نواب قطب الدین (۱۲۱۹ھ-۱۲۸۹ھ) کی طرف منسوب ہے۔

مؤرخین نے اس ترجمہ کو دوسرا ترجمہ لکھا ہے، نواب قطب الدین دہلوی اپنی تصنیف انیق "مظاہر حق" کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"مسکین محمد قطب الدین شاہجہاں آبادی عرض کررہا ہے کہ کتاب مشکوٰۃ شریف علم حدیث میں عجیب نافع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں مندرج ہیں، اس کا ترجمہ عدیم المظیر میرے استاذ بزرگوار مولانا مخدومنا مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحٰق نواسہ حضرت شیخ عبدالعزیز رحمہما اللہ تعالیٰ نے بیچ زبان ہندی کی بین السطور میں لکھا تھا لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا، مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے (تو) بہتر ہے، اس لیے اس ہیچمدان نے ترجمہ اس کا، عبارت عربی سے علیحدہ کر کے لکھا اور فائدہ مختصر مناسب مقام کی شروح مشکوٰۃ وغیرہ سے مثل مرقاۃ شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق اور حاشیہ سید جمال رحمہم اللہ کی اور سوائے ان سے زیادہ کر کے خدمت

عالی میں عرض کی اور جناب ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے تبرکا اس میں درج کیا اور نام اس کا مظاہر حق رکھا ...' (مقدمہ مشکوٰۃ مترجم۔مطبع مجتبائی واقع میرٹھ)

''مظاہر حق'' میں مشکوٰۃ کا ترجمہ کس کا ہے؟

مذکورہ بالا اقتباس کا یہ ٹکڑا خاص طور پر قابل توجہ ہے: ''اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاذ بزرگوار مولانا مخدومنا مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحٰق نواسہ حضرت شیخ عبدالعزیز رحمہا اللہ تعالیٰ نے بیچ زبان ہندی کی بین السطور میں لکھا تھا لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا، مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے (تو) بہتر ہے، اس لیے اس ہیچمدان نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علاحدہ کر کے لکھا......''۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ''مظاہر حق'' میں جو ترجمہ ہے وہ نواب صاحب کا نہیں بلکہ شاہ محمد اسحٰق دہلوی (۱۱۹۷ھ-۱۲۶۲ھ) کا ہے، ترجمہ میں نواب صاحب کا کام صرف اتنا ہے کہ ترجمہ کو عبارت سے علاحدہ کر کے لکھا ہے، البتہ چونکہ استاذ کا حکم یہ تھا کہ یہ صرف ترجمہ نہ رہے بلکہ شرح بن جائے اس لیے انہوں نے اس میں فوائد کا بھی اضافہ کیا، نواب صاحب کا یہ بھی اعتراف ہے کہ اس شرح میں بعض فوائد بھی استاذ کے قلم سے شامل ہیں، گویا ترجمہ اور بعض فوائد شاہ صاحب کے قلم سے ہے اور صرف فوائد یا شرح نواب صاحب کے قلم سے ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ شاہ صاحب کی سوانح عمری پر جنہوں نے بھی لکھا ہے انہوں نے سرے سے اس کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریروں سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ یہ نواب صاحب کا ہی ترجمہ ہے، (مقالات سلیمانی ص:۲-۵۳) مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مصنف ''علمائے اہل حدیث'' میں شاہ صاحب کے ذکر میں ان کے اس ترجمہ کا نہ ذکر کیا ہے اور نہ ان کو مترجمین کی فہرست میں شامل کیا ہے، جبکہ معارف اعظم گڑھ (دسمبر ۱۹۴۷ء، ص:۴۴۷) میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''اس کے بعد (تحفۃ الاخیار) نواب قطب الدین خاں دہلوی نے مشکوٰۃ المصابیح کا اردو ترجمہ بنام مظاہر حق کیا (مظاہر حق اصلاً شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر کی (۶۲ ۱۲ھ/۱۸۴۵ء) کا تھا نواب صاحب

نے بادنی تغیر مہذب فرمایا اور اس کا اعتراف بھی کیا"۔ "معارف المشکوۃ" میں مولانا عبدالرؤف عالی اور "مظاہر حق جدید" کے مرتب عبداللہ جاوید غازی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ نواب صاحب کے ترجمہ کی اساس شاہ صاحب کا ترجمہ ہے۔

مولانا نوشہروی کا یہ فرمانا کہ نواب صاحب نے بادنی تغیر مہذب فرمایا اور اس کا اعتراف بھی کیا، اس اعتراف کا حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے، اور اگر اعتراف سے مراد وہ عبارت ہے جو پیچھے نقل کی جا چکی ہے تو اس میں نواب صاحب نے ترجمہ کی تہذیب کا کہیں اعتراف نہیں فرمایا ہے بلکہ صرف ترتیب کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے، اور جب کہ یہ کام انہوں نے مترجم کی زندگی میں مترجم کے ایما سے شروع کیا تھا تو اس کا غالب امکان ہے کہ یہ تبدیلی ان کی اپنی نہیں بلکہ استاذ کی حسب خواہش تھی، اس سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ نواب صاحب نے ترجمہ میں تہذیب کا کام کیا ہے، اس کا علم اسی وقت ممکن ہے جب شاہ صاحب کا اصل ترجمہ اور نواب صاحب کے "مظاہر حق" کو سامنے رکھ کر موازنہ کیا گیا ہو۔

نواب صاحب کے اس جملہ پر کہ یہ ترجمہ بین السطور تھا اور استاذ کی یہ رائے ہوئی کہ اس کو بطور شرح لکھا جائے اور ترجمہ پر غور کرنے سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں کہیں یعنی کے ذریعہ جو وضاحت کی گئی ہے وہ شاید نواب صاحب کا کام ہے اس لیے کہ بین السطور ترجموں میں عموماً ایسا کم ہوتا ہے، پھر بھی یہ کوئی یقینی رائے نہیں بلکہ ایک اندازہ ہے اور اسی بنیاد پر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نواب صاحب نے ادنی تغیر فرمایا جیسا کہ ان حضرات کی عبارتوں سے مترشح ہے تو بظاہر یہ تغیر استاذ کے ہدایت ومشورے ہی سے ہوا ہوگا، جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام استاذ کو دکھلایا بھی تھا اور ان کے فوائد کو بھی شامل کیا، اس طرح سے زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ شاگرد نے استاذ کے ترجمہ میں علمی معاونت کی لیکن اس کا صلہ یہ نہیں ہوسکتا کہ استاذ کے ترجمہ کو شاگرد کی طرف منسوب کردیا جائے، لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ "مظاہر حق" میں مشکوۃ المصابیح کا جو ترجمہ ہے وہ شاہ محمد اسحٰق صاحب کا ہے نہ کہ نواب قطب الدین دہلوی صاحب کا۔

مندرجہ بالا اقتباس پر دوبارہ غور کرنے سے مزید یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) ''مظاہر حق'' تاریخی نام ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۵۴ھ یعنی ''تحفۃ الاخیار'' کے چار سال بعد مکمل ہوئی۔

(۲) ۱۲۵۴ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی، عبارت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ''مظاہر حق'' کی تالیف سے کافی عرصہ قبل شاہ صاحب کا ترجمہ منظر عام پر آچکا تھا، جس کی طرف نواب صاحب نے اس جملہ کے ذریعہ اشارہ کیا ہے'' کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا''، یہ ترجمہ کس زمانہ میں ہوا تھا اس کا یقینی علم تو حاصل نہ ہوسکا، البتہ جملہ سے اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ بار بار نقل ہوتا رہا ہے، ایک دو بار کے نقل پر اس جملہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، پھر مترجم کو خیال آیا کہ اگر اس ترجمہ کے ساتھ ساتھ اس کی شرح ہوجائے تو نفع عام ہوگا، اس کے لیے انہوں نے اپنے ممتاز شاگرد کا انتخاب کیا، اور مظاہر حق وجود میں آیا، مظاہر حق کی تکمیل کی مدت اور اس سے پہلے شاہ اسحاق کے ترجمہ کے بار بار نقل کیے جانے کی مدت کا اگر سرسری اندازہ لگایا جائے تو بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہ اسحٰق صاحب کا ترجمہ ''مشکوٰۃ'' ''تحفۃ الاخیار'' سے پہلے کا ہے۔

اس رائے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نواب صاحب نے شاہ صاحب کے ترجمہ کے لیے ''ہندی'' کا لفظ استعمال کیا ہے، تحفۃ الاخیار کے مصنف نے اپنے ترجمہ کے لیے ''اردو'' کا لفظ استعمال کیا ہے، تیرہویں صدی سے قبل یہ لفظ ''اردوئے معلی'' اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا تھا لیکن تیرہویں صدی کے اوائل میں اس لفظ کا مفرد استعمال ملتا ہے اور یہی مفرد لفظ مولانا خرم علی بلہوری نے بھی استعمال کیا، مولانا خرم علی ترجمہ کی ضرورت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عام فہم اردو زبان میں کیجئے.....'' (تحفۃ الاخیار- دیباچہ)

دیکھیے مولانا کتنی وضاحت سے اردو کو ایک زبان کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، حالاں کہ شاہ محمد اسحٰق صاحب کا وطن دہلی تھا اور مولانا خرم علی بلہوری لکھنوی تھے، مغلیہ سلطنت میں دہلی اردوئے معلی کا مرکز رہی ہے، لیکن جب تباہی (مغلیہ سلطنت کا زوال) آئی تو دہلی کے ارباب کمال، اہل علم

وادب اور سخنوران پورے پورے ملک کے صوبوں میں بٹ گئے، اہل علم دہلی سے نکل نکل کر پہلی منزل لکھنؤ میں، دوسری عظیم آباد میں اور تیسری مرشد آباد بنگال میں کرتے تھے، ظاہر ہے ان علاقوں میں اردو کو پھیلنے میں وقت لگا ہوگا لیکن اس کے باوجود اول الذکر جس کا مولد ومنشاء ہی اردو کی جائے پیدائش ہے، کا اپنے ترجمہ کو "ہندی" اور موخر الذکر کا "اردو" استعمال کرنا کسی حد تک تقدیم وتاخیر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ "تنبیہ الغافلین":

"تحفۃ الاخیار" کی تکمیل سے تین سال پہلے ۱۲۴۶ھ میں "تنبیہ الغافلین" نامی کتاب کا ترجمہ چھپ کر منظر عام پر آچکا تھا، مترجم عبداللہ ولد سید بہادر علی مرحوم نے اس کتاب کا قصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ فارسی زبان میں احادیث اور آیات قرآنی اور اقوال کا مجموعہ تھا، کتاب اصلا فارسی سے ہندی میں ۱۴۰ ابواب میں منتقل کی گئی تھی (یہاں پر بھی "ہندی" کا لفظ قابل توجہ ہے، اس لیے کہ اس کا زمانہ ترجمہ (۱۲۴۶ھ) وہی ہے جو میرے اندازہ کے مطابق شاہ محمد اسحق صاحب کے ترجمہ کا ہے یعنی ۱۲۴۹ھ سے قبل) لیکن اس میں بکثرت الفاظ کی ناہمواری، محاورات کی غلطی موجود تھی، مترجم نے اس کی تصحیح کا بیڑا اٹھایا، اور اس میں حسب حال بہت سی آیتوں اور احادیث کا اضافہ اور سلیس ترجمہ کر کے ۱۲۴۶ھ میں دوبارہ ترجمہ کر کے مطبع: مطبع احمدی ہوگلی، سے شائع کرایا، یہ کتاب مترجم کی زندگی میں کم از کم دو بار شائع ہوئی جو اس کی مقبولیت کی علامت ہے۔

اس کتاب کے آخر میں لکھا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب حدیث کا مجموعہ ہے:

"اس کتاب کو پڑھنے والوں کو معلوم ہو کہ اکثر حدیثیں اس کتاب میں مشکوۃ شریف کی ہیں، بعض احیاء العلوم اور ذخیرۃ السلوک سے تصحیح کر کے لکھی گئی ہیں......"۔

اس کے بعد تاریخ درج ہے ۲۲ ر جمادی الاولی ۱۲۴۶ھ، یہاں ایک اشکال ہوسکتا ہے کہ براہ راست کسی عربی کتاب کا ترجمہ کیوں نہیں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں عربی دانی کا بحران تھا، اس کے مقابل میں فارسی زبان آسان تھی، اور ایران اور ہندوستان کے مابین اس وقت

تعلقات کی نوعیت ایسی تھی کہ ایران سے یہاں مطبوعات کے پہنچنے کا زیادہ امکان تھا۔

اس کتاب کے ابواب اور مشتملات کا جائزہ لینے سے اس کتاب کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کتاب کے آغاز میں تحریر ہے:

''اب جاننا چاہیے کہ سب سے زیادہ مسلمانوں کے حق میں ایمان کی دولت ہے، (جس شخص کا ایمان درست ہوا اور یقین کمال کو پہنچا اس کا ہرایک کام دین اور دنیا کا ٹھیک ہو گیا اور اچھا بنا) کیوں کہ یہ بڑی نعمت ہے اور دونوں جہاں کی دولت، پس سب لوگوں کو چاہیے کہ رات دن ایسی باتوں میں جس سے دین اور ایمان قوت پکڑے اور خوب مضبوط ہو جاوے، لگے رہیں، کہ آخرت میں اپنے خداوند کے پاس سرخروئی حاصل کریں اور بڑے درجوں کو پہنچیں، پھر جن باتوں سے اللہ اور رسول کی راہ سے دور ہو جاویں، بچتے رہیں کہ شیطان اور نفس آدمی کو ہمیشہ بری راہ میں لے جاتا ہے اور دینی راہ سے بدراہ کرتا ہے جس سے انسان بعد موت کے عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتا ہے اس وقت سوائے حسرت اور افسوس کے کچھ کام نہیں آتا ہے، اس کتاب میں چوبیس باب ہیں اور خاتمہ ☆ پہلے میں ایمان کا بیان، دوسرے باب میں نبی کی سنت پر چلنے اور بدعت کو چھوڑنے کا بیان، تیسرے باب میں علم کا بیان، چوتھے باب میں دنیا کی دوستی کا بیان، پانچویں باب میں قیامت کا بیان، چھٹے باب میں دوزخ کا بیان، ساتویں باب میں بہشت کا بیان، آٹھویں باب میں ماں اور باپ اور ہمسائے کے حق کا بیان، نویں باب میں سود کھانے والوں کا بیان، دسویں باب میں زکوۃ کا بیان، اگیارہویں باب میں نشا پینے والوں کا بیان، بارہویں میں نماز کی فضیلت کا بیان، تیرہویں باب میں قرآن پڑھنے کی فضیلت کا بیان، چودھویں باب میں ماہ رمضان المبارک کا بیان، پندرہویں باب میں حج کا بیان، سولھویں باب میں جورو اور خاوند کے حق کا بیان، سترہویں باب میں جھوٹ اور کذب کی برائی کا بیان، اٹھارہویں باب میں غیبت اور سخن چینی کے عیب کا بیان، انیسویں باب میں لوگوں کے دکھانے کو جو نماز ادا کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں اس کا بیان، بیسویں باب میں غرور اور تکبر کا بیان، اکیسویں باب میں خلق نیک اور غصہ کھانے کا بیان، بائیسویں باب میں نیک لوگوں کی باتوں کا بیان، تیئسویں باب میں ابو محمد کا بیان، چوبیسویں باب میں ماتم

کرنے کا بیان" (ص:۳-۴)

اس کتاب کے نمونہ کا ترجمہ ہم تراجم کے جائزہ میں پیش کریں گے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "تحفۃ الاخیار" سے پہلے بھی حدیث کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا تھا، مولانا عبدالحلیم چشتی کا یہ دعویٰ "ہندوستان میں اس سے (تحفۃ الاخیار - تاریخ تکمیل ترجمہ ۱۲۴۹) پہلے نہ اردو میں کوئی کتاب چھپی تھی اور نہ عوام میں حدیث کا کچھ چرچا تھا"، تاریخی لحاظ سے قابل غور ہے اور تنقیح کا محتاج ہے، اس لیے کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ دسویں صدی ہجری میں قرآن کا ترجمہ ہو چکا تھا اور دیگر پچاس کتابیں اردو میں طبع ہو چکی تھیں، اگر چشتی صاحب مرحوم کی مراد اردو میں حدیث کی کتابوں سے ہے تو مذکورہ تجزیہ سامنے آچکا ہے کہ تحفۃ الاخیار سے پہلے کئی ترجمے طبع ہو چکے تھے۔

اردو میں کتب احادیث کے ترجمہ کے اسباب و محرکات:

تیرہویں اور چودہویں صدی کے تراجم پر نظر ڈالنے اور ہندوستان میں علم حدیث پر لکھنے والوں کی آراء کے جائزہ سے برصغیر ہندو پاک میں کتب احادیث کے درج ذیل اسباب کی نشاندہی ہوتی ہے:

(۱) زبان کی تبدیلی: مغلیہ سلطنت کے زوال (۱۷۰۷ء) کے ساتھ ساتھ فارسی کا بھی زوال شروع ہوا اور اس کی جگہ نئی زبان اردو نے اپنے قدم جمانے شروع کیے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> "شاہ صاحب (ولی اللہ دہلوی) کے ترجمہ کے بعد بہت جلد اردو میں ترجمۂ قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بارہویں صدی کے آخری ہی حصہ میں اردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کر دی تھی اور اردو میں تحریر و تصنیف کا کام شروع ہو گیا تھا" (تاریخ دعوت وعزیمت: ۱۳۸/۵)

مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق گیارہویں صدی ہجری میں اردو کا چلن خوب ہو گیا تھا، اور صوفیائے کرام تو اس سے بھی پہلے سے اردو میں تبلیغ و تعلیم کا کام شروع کر چکے تھے، لیکن ابھی تک طبقۂ علماء کی زبان فارسی ہی تھی، (اردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام)

حالات بدل رہے تھے، علماء نے اس حقیقت کا ادراک کرلیا کہ اب فارسی کا سورج لب بام آ چکا ہے، اسی فراست نے شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ (۱۲۳۰ھ) کو مجبور کیا کہ وہ عام روایت سے ہٹ کر قرآن کا اردو میں ترجمہ کریں، اور یہی چیز حدیث کو بھی اردو میں منتقل کرنے کا محرک بنی۔

(۲) رد بدعت کی تحریک: اردو زبان میں تحریر و تصنیف کی ضرورت اور اس کا ایک بڑا محرک ہندوستان میں پھیلے ہوئے بدعات و خرافات تھے جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور صورتحال یہ پیدا ہوگئی تھی کہ علماء و زہاد، صلحاء و اتقیاء اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر ہجرت کرنے پر مجبور تھے، مترجم صحاح ستہ مولانا وحید الزماں لکھنوی ثم حیدر آبادی (۱۳۳۸ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''۱۲۹۴ھ میں جب ہندوستان بدعات سے بھر گیا اور کتاب و سنت سے لوگوں نے منھ موڑ لیا تو میں مع اہل و عیال شہر حیدر آباد دکن سے بارادۂ ہجرت حرمین شریفین نکلا، جس وقت شہر پونا میں وارد ہوا، تو جناب اخی مولانا بدیع الزماں صاحب کا ایک خط شہر دار الاقبال بھوپال سے آیا، خلاصہ اس کا یہ تھا کہ جناب...... نواب سید محمد صدیق حسن خاں بہادر ...... ہماری اور تمہاری قصدِ ہجرت سے مطلع ہوکر بہت خوش ہوئے اور خدمت ترجمہ صحاح ستہ...... مفوض فرمائی'' (دیباچہ کشف المغطا ترجمہ الموطا)۔

شاہ عبدالحق دہلویؒ اور شاہ محمد اسحٰق دہلوی جیسے امیان اور ان کی طرح بہت سے دیگر علماء کی ایک بڑی تعداد نے ہندوستان سے ہجرت کی اور اس ہجرت کے محرکات کو بیان کرتے ہوئے ہندوستان کی ناگفتہ بہ حالات کا شکوہ کیا ہے۔

لیکن علماء اسلام کا ہمیشہ سے یہ شیوہ رہا ہے کہ ناگفتہ بہ حالات ہی میں انہوں نے وہ خدمات انجام دی ہیں جو پُرسکون ماحول میں میسر نہ ہوسکیں، چنانچہ اسی دور میں مولانا وحید الزماں اور بدیع الزماں دونوں بھائیوں کے اشتراک سے، اس بے سروسامانی کے عالم میں صحاح ستہ کے ترجمہ کا بے نظیر کارنامہ وجود میں آیا، اس لیے بجا طور پران دونوں بھائیوں کو امام المترجمین کا خطاب دیا جاسکتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''رد بدعت کی جو تحریک شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان سے اٹھی تھی، اس نے رفتہ رفتہ

پورے ملک کو چھالیا، اسی کی خاطر قرآن وحدیث کے ترجمے ہوئے" (نقوش سلیمانی: ۱۱۵)۔

(۳) مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی: ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے بعد کے ہندوستان میں وہی صورتحال پیدا ہوگئی تھی جو کبھی ایران، خراسان، بغداد اور عالم عربی میں پیدا ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں ہندوستان علم وفضل کا گہوارہ بن گیا تھا، تعلیم کے میدان میں اسلام مخالف جماعتیں قدم جمارہی تھیں اور مسلمان اپنے خون پسینے سے سینچے ہوئے ملک میں گوناگوں مسائل سے دوچار تھے۔

تخلیص الصحاح کے مترجم محمد محی الدین خاں (تاریخ طباعت ترجمہ ۱۹۰۰ء) اس زبوں حالی کا رونا روتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"چونکہ اس زمانہ میں لوگوں کی ہمتیں دینی علوم حاصل کرنے میں قاصر ہیں اور علوم دینیہ کی طرف عام طور پر مسلمانوں کو جیسی چاہیے توجہ نہیں ہے گو ہندوستان میں قدیم زمانہ میں اہل اسلام کو دینی علوم پر بہت توجہ تھی، جس کی وجہ سے اکثر ہندوستان میں نامی گرامی علماء گذرے ہیں مگر اب خاص مشکلات کی وجہ سے بھی اور خاص مصائب کے سبب سے بھی لوگوں کو اس طرف توجہ نہیں رہی، خاص مشکلات تو یہ ہیں کہ اس ملک کی زبان اردو ہے اور عربی زبان کا حاصل کرنا ان لوگوں کے لیے مشکل ہے، پھر معمولی طور پر عربی پڑھ لینا ان کتابوں کے سمجھنے کے لیے بالکل مفید نہیں ہے بلکہ اس کی سخت ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کی عربیت حاصل ہو سکے اس کے لیے زیادہ وقت درکار ہے اور یہاں عموماً اہل اسلام سخت افلاس اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور سب سے زیادہ فکر معاش میں منہمک رہتے ہیں اسی وجہ سے انہیں بہت کم موقع تحصیل علم کا ملتا ہے، اس کے علاوہ جدید تعلیم اور جدید اخلاق انہیں اس طرف بہت کم مائل ہونے دیتا ہے، بیشتر وہ اسی قسم کے علوم کو انتہائی تعلیم خیال کرتے ہیں جو اکتساب معاش میں ان کے لیے معین ہے، حالاں کہ چندروزہ حیات کی حیات ابدی کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں ہے...... ان حالات نے اب اہل ہند کی یہ حالت کردی ہے کہ فیصدی

ایک شخص بھی عربی نہیں جانتا بلکہ فی ہزار ایک شخص بھی عربی دان ملنا مشکل ہے، لہٰذا اس کی سخت ضرورت ہے کہ کتب دینیہ کا اردو میں ترجمہ کیا جائے''۔(ص:۷)

(۴) مسلمانوں میں عربی و فارسی زبان دانی وشناسی کا فقدان: آخر کار جس کا کھٹکا تھا وہی پیش آیا، مسلمان عربی علوم کی تحصیل اور یکسوئی سے محروم تھے ہی جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوا ہوگا، چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں فارسی زبان بھی ملک میں اجنبی بن گئی تھی اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے، انتخاب صحاح ستہ کے اردو مترجم مولانا نیاز علی (اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس پنجاب پٹنہ) (۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ) اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اثنائے تحریر میں کہیں کہیں فارسی اشعار اور فقرے آگئے ہیں، ان سب کا اردو میں ترجمہ کردیا گیا ہے، ناظرین میں سے وہ اصحاب جنہیں اپنی تعلیم ختم کیے پندرہ بیس برس ہوچکے ہیں دیکھ کر متعجب ہوں گے کہ چھوٹے چھوٹے فقروں جیسے ناگفتہ بہ (ذکر نہ کرنا اچھا ہے) کا بھی ترجمہ کیا گیا ہے، اور وہ شاید اس طریق کو ناپسند کریں گے، مگر کیا کیا جائے؟ تعلیم کے نصاب آج کل کچھ اس قسم کے مقرر کیے گئے ہیں کہ اگر ایک طالب علم کوئی بھی مشرقی زبان نہ پڑھے تو وہ فضیلت کی پگڑی باندھ سکتا ہے، یعنی بی۔اے اور ایم اے ہوسکتا ہے۔

کبھی وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کا کل علم اس ہندوستان میں بھی عربی میں تھا، پھر دوسرا دور آیا کہ عربی کی جگہ پر فارسی قابض ہوگئی، مگر قرآن مجید کی آیتوں، حدیثوں اور عربی اشعار سے فارسی عبارت کی زیبائش ہوتی رہی، پھر تیسرا دور آیا کہ فارسی کی مسند پر اردو بیٹھ گئی، مگر عربی و فارسی اشعار سے اس کی زینت ہوتی رہی، اس کے بعد عربی کا ساتھ ساتھ قوسی خطوں میں ترجمہ ہونے لگا، اب عربی کو تو بالکل جواب مل گیا فارسی کا بھی کوئی شعر آجائے تو جب تک اس کا ترجمہ نہ کیا جائے اس کا لکھنا لاحاصل ہے، موجودہ صورت بھی اگر رہ جائے تو جانئے ع

ڈر ہے کہیں نام بھی مٹ جائے نہ آخر مدت سے اس دور زماں میٹ رہا ہے

(انتخاب صحاح ستہ۔ص:۶)

عربی وفارسی سے یہ ناواقفیت حد سے بڑھی تو اس وقت لوگوں نے محسوس کیا کہ اب مذہبی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا اشد ضروری ہے، اسی ضرورت کا ادراک کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی (صفر ۱۳۰۲ھ/ نومبر ۱۸۸۴ء۔ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ/۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء) نے زاد سفر ترجمہ ریاض الصالحین بقلم مخدومہ اَمۃ اللہ تسنیم مرحومہ کے پیش لفظ میں، (۱۳۵۶ھ) میں تحریر فرمایا تھا:

''اب جب کہ اس ملک میں مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے، ضرورت ہے کہ مذہبی کتابوں کو اس زبان میں منتقل کیا جائے تا کہ عربی سے محروم بھائی اور بہنوں کو دین کی باتیں معلوم ہوں اور ان مجرب اور خاص الخاص نسخوں سے آگاہی ہو جو ہمارے طبیب روحانی اور حاذق ربانی محمد رسول اللہ ﷺ نے ہم جیسے مریضوں کے لیے پہلے ہی محفوظ فرما دیے ہیں، ان نسخوں کے عطار علماء کرام اور مشائخ عظام رحمہم اللہ ہیں''۔

تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستان میں دو تحریکیں ایسی سرگرم ہوئیں جس نے ترجمہ کے کام کو مہمیز کیا۔

(۱) تحریک اہل حدیث: اس تحریک نے حدیث کی خدمت کی اور اس کا علم بلند کیا۔

(۲) تحریک اہل قرآن: اس کے برعکس اس تحریک نے حدیث کا انکار اور استخفاف کو اپنا وطیرہ بنایا اس کا مثبت پہلو یہ نکلا کہ اس فتنہ کے تعاقب میں خدمت حدیث کے بہت سے پہلو نکل آئے جن میں سے ایک پہلو ترجمہ کا بھی تھا۔

(۵) تحریک اہل حدیث:

ہندوستان میں اس تحریک کا سرا سید احمد شہیدؒ اور ان کے کاروان ایمان وعزیمت سے جاملتا ہے، تحریک جہاد پر دشمنوں کی ضرب لگنے کے بعد ان کے خلفاء ملک میں زمینی کام کے لیے پھیل گئے، شرک وبت پرستی اور باطل رسم ورواج کی بیخ کنی ہونے لگی، مقدمہ ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان مساعی جمیلہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے، ۱۹۰۶ء

میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے باقاعدہ اس تحریک کی تشکیل ہوئی۔ (تاریخ دعوت وجہاد۔ مؤلفہ عبیداللہ فلاحی ص:۱۹۷)

علامہ سید سلیمان ندویؒ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے بارہ میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف ملک میں ایک نئے مسلک عدم تقلید کا چرچا تھا، اور ملک میں جگہ جگہ علم حدیث کے حلقہ ہائے درس قائم تھے، بھوپال اور دہلی میں علمائے اہل حدیث کا مجمع تھا، رسالوں پر رسالے نکل رہے تھے، ادھر لکھنؤ میں ان کے مقابلے میں مولانا عبدالحیؒ کی ہستی تھی، نواب صدیق حسن خاں مرحوم اس زمانہ میں اہل حدیث کے امام اور مولانا عبدالحی احناف کے سرگروہ تھے، طرفین نے خوب خوب داد تحقیق دی" (مقالات سلیمانی، ج ۲:۶۳)

امام خاں نوشہروی کی کتاب "علمائے اہل حدیث" کے مقدمہ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے تحریک اہل حدیث پر عمومی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جماعت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ "قرآن پاک کی تعلیم وتفہیم کا آغاز ہوا، قرآن پاک سے براہ راست ہمارا رشتہ دوبارہ جوڑا گیا، حدیث نبوی کی تعلیم وتدریس اور تالیف واشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں......" (تراجم علمائے اہل حدیث۔ ج ۱/۳۵)

اس تحریک کا بنیادی منشور یہ تھا کہ مسلمانوں کو براہ راست کتاب وسنت سے جوڑا جائے، اس کے لیے مذہبی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا ناگزیر تھا، اس خدمت کو اس تحریک نے بخوبی انجام دیا اور اردو میں حدیث کی تالیف وترجمہ کا ایک سیلاب آ گیا، نامی گرامی مترجمین، مؤلفین، ناشرین اور علوم کی سرپرستی کرنے والے پیدا ہوئے، ان میں سرفہرست والا جاہ نواب صدیق حسن خاں (جمادی الاولی ۱۲۴۸ھ ۱۳۰۷ھ، فروری ۱۸۹۰) مولانا وحید الزماں حیدرآبادی (۱۳۳۸ھ) مولانا بدیع الزماں حیدرآبادی (۱۳۰۴ھ) مولانا عبدالاول (۱۳۱۳ھ) اور عبدالغفور غزنوی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

مولانا مستقیم سلفی نے جماعت اہل حدیث کی علمی خدمات پر ایک ضخیم کتاب تصنیف فرمائی ہے، یہ کتاب ۱۹۹۲ء میں بنارس میں طبع ہوئی، اس میں اردو میں حدیث پر جو کام (تالیف، شرح،

ترجمہ) ہوا ہے اس سے غیر معمولی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۲) انکارِ حدیث (اہلِ قرآن): ہندوستان میں اس نظریہ کو ہوا عبداللہ چکڑالوی کی تحریروں نے دی، پھر اس فرقہ کو دو مضبوط ترجمان اسلم جیراجپوری (پیدائش ۱۳۹۹ھ) اور چودھری غلام احمد پرویز (۱۹۳۰-۱۹۸۵ء) مل گئے، نیاز فتح پوری (۱۸۷۷ء-۱۹۶۶ء) نے بھی مضامین لکھے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ فتنۂ انکارِ حدیث کے ہمہ گیر منفی اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو کچھ پہلے ہوا وہ آج بھی ہو رہا ہے، سرسید کے زمانے سے احادیث کا فن نا آشنایانِ فن کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے، چونکہ ان کے خود ساختہ عقل کے معیار پر جو چیز پوری نہیں اترتی اگر وہ قرآن پاک کی کوئی آیت ہے تو اس کی دور از کار تاویل اور اگر حدیث ہے تو اس سے انکار کر کے اپنے زعم میں اسلام کے چہرہ سے خلافِ عقل ہونے کا داغ مٹانا چاہتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ داغ سمجھ سمجھ کر خدا جانے اسلام کی صحیح تصویر کے کتنے اجزا کو مٹا چکے ہیں۔

قرآن پاک کے فہم کے نئے دعویدار اس زمانے میں اور بھی پیدا ہو گئے ہیں جو قرآن پاک کو ہر ضرورت اور ہر حکم اور ہر مسئلہ کے لیے کافی اور اپنی عقل اور فہم کو اس کی تفسیر اور تشریح کے لیے کافی ترسمجھتے ہیں، اور اس طرح وہ یہ چاہتے ہیں کہ احادیث اور فقہ کا سارا دفتر مٹ جائے اور ان کی جگہ ان کے ''اجتہادات'' اور ''استنباطات'' قرآن پاک کا حقیقی اڈیشن اور اسلام کی صحیح تعلیمات کا مستند مخزن قرار پا جائے، ھیھات ھیھات ،ان بدعتیوں اور گمراہوں نے تو مستشرقین یورپ کے سلیمانہ اعتراضات کو جو فنِ حدیث پر انہوں نے کیے ہیں اپنا کر سرے سے اس فن کی بیخ کنی شروع کر دی، انہیں سے سن کر یہ کہا جاتا ہے کہ حدیثیں تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ڈھائی سو برس بعد قلمبند ہوئی ہیں ان کا کیا اعتبار اور کبھی حدیث کے فنِ رجال کی وثاقت پر اعتراضات کئے جاتے ہیں اور کبھی عقلی حیثیت سے ان پر ایرادات پیش کیے جاتے ہیں اور ان سب کے نتیجہ کے طور پر کوئی نماز کے اوقات کو، اور کوئی نماز کے ارکان کو، کوئی روزہ کی تعداد کو، کوئی حج کے ارکان کو، کوئی قربانی کو، کوئی سمتِ قبلہ کو، کوئی وضو کی ہیئت یا ضرورت کو، کوئی مسلمانوں کے اصولِ وراثت کو بدلنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو ایک نئے

اسلام کی دعوت دینا چاہتے ہیں، ان میں سے بعض آگے بڑھ کر عقائد میں بھی کتر بیونت کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ بعض تو حیات برزخ کا انکار، گنہگاروں کی شفاعت اور بخشش کا انکار، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عدم ایمان سے عدم نجات کے مسلمہ عقائد کا انکار کر رہے ہیں اور عدم حجیت حدیث کو اپنے مبتدع عقائد کے ثبوت کے لیے ضروری جانتے ہیں''۔

(مقدمہ تدوین حدیث مؤلفہ: مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۷)

اس فتنہ نے لوگوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، علماء نے سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا، اس کے رد کا دو طریقہ اختیار کیا گیا، ایک تو حجیت حدیث پر کتابیں لکھی گئیں، ''خطبات مدراس'' میں سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا استدلالی آہنگ میں اس فتنہ کے رد کی بازگشت محسوس کی جاسکتی ہے، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ/۲ اکتوبر ۱۸۹۲ء۔ ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ/۵ جون ۱۹۵۶ء) کی تصنیف ''تدوین حدیث''، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب کی کتاب ''نصرۃ الحدیث'' مولانا بدر عالم میرٹھی کا ''ترجمان السنۃ'' کی پہلی جلد میں انکار حدیث اور حجیت حدیث پر مفصل اور فاضلانہ تحریر اور فتنہ کا تعاقب، یہ سب اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ احادیث کے مجموعوں کو اردو میں منتقل کرنے کی لوگوں میں فکر ہوئی، اسی جذبہ نے مولانا شبیر احمد ازہر بن الحافظ الماجد بشیر احمد المیرٹھی کو مہمیز کیا کہ وہ مسند امام احمد بن حنبل کے ترجمہ کے عظیم الشان کام کا آغاز کریں، وہ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں اس دردناک حقیقت سے باخبر تھا کہ امت مسلمہ کی اکثریت عملاً ہی نہیں علماً بھی سنت نبویہ سے منقطع ہو کر ضلالت کی وادیوں میں بھٹک رہی ہے، اور ضلالت کی یہ ظلمت جو شب دیجور کی تاریکی سے بھی بڑھی ہوئی ہے، صدیوں سے امت مسلمہ پر مسلط چلی آتی ہے، میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اس عام گمراہی کا اہم ترین سبب دین حق کے مقدس پیکر کی تقسیم ہے ..... پس قرآن وحدیث صحیح کا مجموعہ ہی دین حق کا حسین وجمیل پیکر ہے، اگرچہ عقلاً یہ دونوں

چیزیں الگ الگ ہیں، قرآن اور چیز ہے اور احادیث صحیحہ اور چیز، مگر واقعۃ یہ مجموعہ نا قابل تقسیم ہے، مگر بدقسمتی سے کچھ غالیوں نے طرح طرح کی سازشیں کر کے مسلمانوں کو اس ظلم پر آمادہ کرنا چاہا تھا اور چاہ رہے ہیں، یہ کہہ کر کہ اسلام اور دین کے متقوم و تحقق ہونے میں سنت نبویہ اور احادیث کو کوئی دخل نہیں، اور یہ فی الواقع اسلام کا جز نہیں، آغاز امر میں یہ آواز صدا بصحر اثابت ہوئی اور ملت اسلام نے قطعا اس تقسیم کو واقعی صورت میں قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن مختلف وجوہ و بواعث اور وساوس کے تحت آہستہ آہستہ عملی طور پر دین کی اس تقسیم کو گوارہ کر کے احادیث سے صرف نظر کرنا اور اعراض برتنا شروع کر دیا گیا......

قرآن وسنت کی یہ عملی تقسیم اور سنت سے روگردانی کی وبا کچھ ایسی پھیلی کہ بدقسمتی سے تقریبا پوری امت مسلمہ اس کے لپیٹ میں آگئی حتی کہ یہ عملی تقسیم و روگردانی اب واقعی تقسیم کی شکل میں رونما ہونا چاہتی ہے ... بنابریں مجھے خیال ہوا کہ مسند امام احمد کو اگر عامۃ المسلمین کے لیے استفادہ کے قابل بنا دیا جائے تو یہ امت کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ (مقدمہ شرح مسند احمد ص:۸۔۹)

(۷) تہذیب جدید کی یلغار: جب ہندوستان میں انگریزوں نے بال و پر نکالے، مسلمان اگلی صف سے پچھلی صف میں آنے لگے، علمی اور دینی مجلسیں برہم ہونے لگیں، اس کی زلف گرہ گیر پریشاں ہوگئی، انگریزی فوج کے پیچھے عیسائی مشنریاں حسب معمول داخل ہوئیں اور تندہی سے اسلام و تعلیمات اسلام کے خلاف تعلیم و تبلیغ میں مصروف ہوگئیں، یورپ اور ہندوستان کے باہمی ربط سے افکار و نظریات کی درآمد و برآمد کا سلسلہ شروع ہوا، اور یورپین افکار کے بیتر ے نقیب یہیں اس ہندوستان میں کھڑے ہو گئے، تعلیم ہمیشہ برسراقتدار طاقت کے افکار کا ترجمان ہوتی ہے اور اسی تعلیم کا رواج ہمیشہ زور پکڑتا ہے جس کی سرپرستی حکومت اور برسر اقتدار طاقت کرتی ہو، چنانچہ انگریزی تعلیم کا رجحان بڑھا، طریقہ تعلیم کا انداز بدلا، فکر وفہم کے نئے نئے دروازے وا ہوئے، اب کل تک جو مسلمات اور

حقائق میں شمار ہوتے تھے وہ بھی بحث وتحقیق کی کسوٹی پر پر کھے جانے لگے، اور مسلمات پر شکوک وشبہات کا دائرہ تنگ ہونے لگا۔

انگریزوں نے تعلیم کے میدان میں اپنے زہریلے اثرات پھیلانے شروع کیے جن کو مسلمانوں کی فراست نے بھانپ لیا، سرسید''اسباب بغاوت ہند'' میں، اس سازش کے تئیں مسلمانوں کی حساسیت پر لکھتے ہیں:

''دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے لوگ یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں..... عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرستان بنانے کو بٹھاتے ہیں اور فہمیدہ آدمی اگر چہ یہ نہیں سمجھتے تھے مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو کی تعلیم ہوتی ہے، ہمارے لڑکے اس میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہوجائیں گے اور عیسائی بن جائیں گے، اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہی ارادہ ہے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کردے تا کہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل جائے.....'' (اسباب بغاوت ہند، انگریزی از جی۔ ایف۔ آئی گراہم ص:۳۱)

اقوام مغرب اوران کے نقیبوں نے دوسری طرف انکار حدیث کے فتنہ کوتقویت بہم پہنچائی، ۱۹۵۴/۱۳۳۷ھ میں مولانا منظور عالم نعمانی (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء۔ ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء) ''معارف الحدیث۔ ج۱۴/۱'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس فتنہ کو اپنی غیر معقولیت کی وجہ سے آپ اپنی موت مرجانا چاہیے تھا لیکن چوں کہ اقوام مغرب کی سیادت وقیادت کی وجہ سے ہمارے اس زمانہ کی ہوا آزاد پسندی اور آوارہ مزاجی کے لیے ہمیشہ سے سازگار بنی ہوئی ہے اس لیے یہ فتنہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ کسی نہ کسی رفتار سے بڑھ بھی رہا ہے''۔

مصطلحات، علمی طرز استدلال، الفاظ سب کچھ بدلنے لگے، اب ضرورت محسوس کی گئی کہ اس نسل کی ذہنی تسکین، قرآن وسنت پر اس کے اعتماد کو بحال کرنے، جدید چیلنجز اور اشکالات کا علمی جواب دینے کے لیے اپنے علمی سرمایہ کو دوبارہ کھنگالا جائے اور اس کو نئے قالب میں پیش کیا جائے، تفسیر میں مولانا ابوالکلام آزاد (۲۳ر فروری ۱۹۵۸ء) مولانا مودودی (۳ر رجب ۱۳۲۱ھ/۲۵ر ستمبر ۱۹۰۳ء۔۳ر ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ/ ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء) اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۶ر شعبان ۱۳۹۰ھ/۱۶ر مارچ ۱۸۹۲ء۔۱۶ محرم ۱۳۹۷ھ/۶ر جنوری ۱۹۷۷ء) کی خدمات اسی احساس کا نتیجہ ہیں، تاریخ وسیرت کا حصہ علامہ شبلی نعمانی (ولادت: ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء۔وفات: ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء/۲۸ر ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ) اور ان کی سجائی ہوئی بزم اور فرزندان ندوۃ العلماء کے حصہ میں اور حدیث کا بارگراں فاضلان دیوبند اور ابنائے ندوۃ العلماء نے اٹھایا۔

اس کے لیے قدیم مجموعہ احادیث کا ترجمہ کردینا کافی نہیں تھا، بلکہ اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایک الگ مجموعہ تیار کیا جائے، اردو میں اس سلسلہ کا سب سے پہلے آغاز مولانا بدر عالم میرٹھی نے بڑے آب وتاب سے کیا، وہ اپنے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر امام بخاریؒ اس زمانے میں موجود ہوتے تو اپنی مجتہدانہ شان، دقت رسی، دقیقہ نجی اور امت کی ضرورتوں کے متعلق صحیح نبض شناسی اور دردمندی کی وجہ سے اپنے بابوں، ترجموں اور عنوانوں کا رخ جہمیت واعتزال کی تردید کے بجائے یقیناً ان ہی مسائل کی طرف پھیر دیتے جو ہمارے وقت کے الجھے ہوئے مسائل ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی بخاری میں اجتماعیات واقتصادیات اور دیگر ضروری مسائل کی جانب ایسی اہم تمہیحات موجود ہیں کہ اگر کوئی ذی علم ان سے استفادہ کرنا چاہے تو بہت کچھ استفادہ کرسکتا ہے، اور انہیں جدید اخذ واستنباط کی بنیاد قرار دے سکتا ہے...... بہرحال سلف کی خدمات کے پورے اعتراف کے

ساتھ اگر صورتحال کو اس نظر سے دیکھا جائے تو خدمت حدیث کا یہ گوشہ مجموعی طور پر خالی نظر آتا ہے، اور بلا شبہ وقت کی شدید ترین ضروریات میں یہ اہم ترین ضرورت باقی ہے کہ اس وقت احادیث نبویہ پر اس نقطۂ نظر سے دوبارہ نظر ڈالی جائے کہ بین الاقوامی اور اجتماعی مسائل میں دین کامل کی ہدایات کیا ہیں اور فرمودات نبوی میں وقت کے نئے نئے تقاضوں اور الجھنوں کا کیا حل پیش کیا گیا ہے، کسی زمانہ میں عدم اہمیت کی وجہ سے اگر ترتیب و تدوین احادیث کا یہ طریقہ بروئے کار نہیں لایا گیا تو اس دور کی ضرورتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسے چھپے اور دبے ہوئے عنوانات ابھارے جائیں اور ان کو اسلوب جدید کے سانچے میں ڈھالا جائے......'' (دیباچہ''ترجمان السنہ ص: ج ۱/۱۱)

چوں کہ اس مجموعہ کی تیاری عام مسلمانوں اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت کے لیے ہوئی تھی اس لیے ترجمہ کا معیار بھی وہی رکھا گیا، نہ اتنا بامحاورہ اور تشریحی کہ مستقل تصنیف بن جائے اور نہ ایسا تحت اللفظ کے مطلب خبط ہو رہے۔

اس مجموعہ میں مولانا کا اجتہادی رنگ ترجمۃ الباب میں نظر آتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی تہ تک پہنچنے میں ترجمۃ الباب کا بڑا دخل ہوتا ہے جو ہمیں اس مجموعہ میں نظر آتا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ (۱۱ر رمضان ۱۳۱۵ھ ۲۵ مئی ۱۹۸۲ء/۲ر شعبان ۱۴۰۲ھ) نے امت کو سراپائے رسول سے قریب کرنے کے لیے ''شمائل الترمذی'' کا دلنشیں ترجمہ مع شرح قوم کے سامنے پیش کیا، اور ''فضائل'' پر امت اسلامیہ کو اپنا وہ زریں سلسلہ عطا کیا جس سے آج پوری دنیا میں استفادہ کیا جا رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں دوسری کڑی وہ ہے جس کو مولانا منظور عالم نعمانیؒ نے ''معارف الحدیث'' کے نام سے شروع کیا، وہ دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''قریباً بارہ برس پہلے (۱۳۶۱ھ) اس عاجز بندہ کے دل میں خیال آیا کہ

اس زمانہ کے خاص حالات وضروریات کو سامنے رکھ کر اردو میں حدیث نبوی کی بھی ایک خدمت کیا جائے اور اس کے لیے موجودہ کتب حدیث (صحاح یا مشکوٰۃ وغیرہ) میں سے کسی کی اردو شرح لکھنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ احادیث نبویہ کا ایک متوسط درجہ کا جدید مجموعہ خاص اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر خود ترتیب دیا جائے اور اپنے زمانے کے عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کی دینی، علمی اور ذہنی وفکری حالت اور عصر حاضر کے خاص علمی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر عام فہم اردو زبان میں حدیثوں کی تشریح کی جائے ...'' (معارف الحدیث۔ ج ۱۰/۱)

ترجمہ کے بابت لکھتے ہیں:

''چونکہ اس تالیف کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم وہدایت کو جو ذخیرہ حدیث میں محفوظ ہے اس زمانہ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو پہنچانا اور ان کے لیے اتباع نبوی کی راہ آسان کرنا ہے اس لیے متن حدیث کے ترجمہ میں نحوی ترکیب اور لفظی ترجمہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی ہے بلکہ حدیث کے مقصد ومفہوم کا واضح کرنا پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس واسطہ ترجمہ وتشریح میں زبان بھی حتی الوسع آسان استعمال کی گئی ہے''۔ (معارف الحدیث: ج ۱/ ۱۳)

اللہ تعالی نے ان کی اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازا، ماضی قریب اور ان کی معاصر کاوشوں میں شاید ہی کسی اور کتاب کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو مولانا منظور نعمانیؒ کے اس مجموعے نے حاصل کی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس تصنیف لطیف کی جلد دوم کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں، جس سے مولانا نعمانی اور ان کے معاصرین کی میدان حدیث میں خدمات پر روشنی پڑتی ہے:

''ہمارے زمانہ میں اردو میں حدیث کی خدمت کا ایک کام اعلیٰ معیار اور وسیع پیمانہ پر مولانا بدر عالم صاحب کر رہے ہیں، ان کی زیر تالیف ''کتاب

السنۃ'' کی تین جلدیں تیار ہو کر شائع ہو چکی ہیں، ہماری نظر میں اس سلسلہ کی یہ ایسی فاضلانہ کتاب ہے کہ علماء اور اصحاب درس بھی اس سے استفادہ کر سکیں، لیکن اردو میں حدیث کی قدیم وجدید ان سب خدمتوں کے بعد بھی ضرورت تھی کہ اس عہد انقلاب اور اس کی ضرورتوں اور ذہنی خصوصیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے متوسط درجہ کے لوگوں کے لیے (جن کے پاس وقت بھی کم ہے اور بڑی علمی استعداد بھی نہیں رکھتے) حدیث کا ایک متوسط مجموعہ تیار کیا جائے اور حدیث کے انتخاب وترتیب اور تشریح میں اس مقصد کو خاص طور سے ملحوظ رکھا جائے کہ ذہن کو اذعان اور قلب کو اطمینان حاصل ہو اور زندگی کے بگاڑ کی اصلاح ہو، نیز اس کی بھی ضرورت تھی کہ احادیث کے سلسلہ میں اس دور میں جو سوالات پیدا ہوتے ہوں اور بعض مرتبہ بعض طبیعتیں مزید کی تشفی کی طالب ہوتی ہیں ان کو بھی حل کیا جائے..... اللہ تعالیٰ کی توفیق تھی کہ انہوں نے اس اہم اور نازک کام کے لیے رفیق محترم مولانا منظور صاحب نعمانی کو منتخب فرمایا'' (معارف الحدیث ۲/۲۲)

ایک اور صاحب سید حامد علی نے دین کے مختلف عنوانات مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ اور توحید، آخرت اور رسالت جیسے حساس موضوع پر مختصر لیکن جامع مجموعے ترجمہ مع تشریح کے ۱۹۶۶ء میں شائع کرنا شروع کیا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی کی پانچویں جلد کو جس طرح آیات واحادیث کا بے نظیر ترجمان بنایا وہ بھی اسی کا حصہ ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی بہن مرحومہ امۃ اللہ تسنیم (۱۲؍جمادی الاولی ۱۳۲۶ھ/۸؍جون ۱۹۰۸ء ـ ۱۳۶۹ھ/۲۵؍جنوری ۱۹۷۶ء) نے ''ریاض الصالحین'' کا ترجمہ بنام زادِ سفر کیا، اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر محدث کبیر عبدالحلیم عطا نے نظر ثانی کی ہے، دوسرے عظیم محدث مولانا منظور نعمانیؒ نے تعارفی کلمات سے نوازا ہے، اور علوم

[1] کتاب کا نام ''کتاب السنۃ'' نہیں بلکہ ''ترجمان السنۃ'' ہے۔

اسلامیہ کے فرماد علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان الفاظ میں دادوی ہے جو سند کا درجہ رکھتی ہے:

> ''مترجم موصوف نے ترجمہ میں زبان کی سلاست اور روانی کا لحاظ رکھا ہے، جگہ جگہ حاشئے بڑھائے ہیں، ہر حدیث کا ایک عنوان قائم کیا ہے جن سے حدیث کے مغزِ سخن تک پہنچنے میں ناظر کتاب کو بڑی آسانی ہوجاتی ہے۔
> دعا ہے کہ یہ کتاب اسلامی گھروں میں گھر گھر پھیلے اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی اصلاح و تعلیم میں مؤثر اور بابرکت ثابت ہو'' (دیباچہ کتاب ۱۵رشعبان ۱۳۶۵ھ)

مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب ندویؒ نے ''الأدب المفرد'' کا ترجمہ ''کتاب زندگی'' کے نام سے ۱۹۵۸ء میں کیا، مولانا جلیل احسن ندوی (المتوفی ۱۹۸۳ء) نے منتخب احادیث کا مجموعہ ''زادِراہ'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں اور دوسرا مجموعہ ''راہِ عمل'' ۱۹۷۰ء میں اور ''سفینۂ نجات'' ۱۹۸۲ء میں تیار کیا، شاہ جعفر پھلواری ندوی (المتوفی ۱۹۸۳ء) نے مختلف ناموں سے ۶رمفید کتابیں مرتب کی، مولانا شمس الحق ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ''دراسات في الحديث النبوي'' کا ترجمہ و تلخیص ''تدبر حدیث'' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں اور ''تہذیب الاخلاق'' کا ترجمہ بھی کیا، مولانا زکریا سنبھلی ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ''معارف الحدیث'' کا تکملہ تیار کیا، اخیر میں مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے یورپ کی مادی یلغار سے جو عالم اسلام میں روحانی افلاس پیدا ہورہا تھا اس کو محسوس کرکے ''الأدب المفرد'' کی جدید شرح و ترجمانی کا بیڑا اٹھایا جو الحمدللہ دو ضخیم جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ترجموں پر مختصر تبصرہ: تراجم کا تفصیلی جائزہ اس وقت مقصود نہیں ہے، سردست یہی مناسب ہے کہ مختلف ترجموں پر ایک اجمالی تبصرہ کردیا جائے، ترجموں کے جائزہ سے پہلے ترجمہ نگاری کے بارہ میں کچھ تحریر کردینا مناسب ہے۔

ہر دور میں ترجمہ کے دو طریقے رائج رہے ہیں، ایک تحت اللفظ جس کو ''لفظی'' سے تعبیر

کرتے ہیں اور دوسرا بامحاورہ جس کو ترجمانی بھی کہہ سکتے ہیں، مولانا مودودیؒ نے تفسیر قرآن کے مقدمہ میں ترجمانی اور لفظی ترجمہ کے فرق کو بیان کیا ہے اور لفظی ترجمہ کی خامیوں کو شمار کراتے ہوئے لکھا ہے کہ لفظی ترجمہ میں روانی عبارت، زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر کلام کا فقدان ہوتا ہے لفظی ترجمہ بالعموم بین السطور درج کیے جاتے ہیں، قاری متن اور ترجمہ کی مطابقت میں کھو جاتا ہے۔

(تفہیم القرآن، مقدمہ)

مولانا مودودیؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ حقیقت ہے لیکن ہر موقع پر ترجمانی ہی کا طریقہ درست نہیں ہوتا، لفظی ترجمہ کی بھی اپنی خصوصیات ہیں، ایک مبتدی جو یہ نہیں جانتا کہ یہ ترجمہ کس لفظ کا ہے، ان کے لیے تحت لفظی ترجمہ کا ہونا ضروری ہے، تاکہ جو تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہو وہ تھوڑی مدت میں معنوں کو لفظ سے ملا کر دوہرا فائدہ اٹھا سکتا ہے، شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ رفیع الدین صاحبان کے لفظی ترجمہ لکھنے کی یہی وجہ تھی۔

تیرہویں صدی ہجری تک عموماً ترجمہ لفظی ہی ہوا ہے، البتہ چودہویں صدی ہجری میں ترجمہ کے بجائے ترجمانی کا طریقہ آہستہ آہستہ رائج ہونے لگا، "الرحمة المهداة إلى من يريد ترجمة المشكوة" ۱۳۱۳ھ میں طبع ہوئی ہے، اس کے دیباچہ میں مترجم نے اس کی شکایت کی ہے کہ اب لوگ تحت لفظ ترجمہ پسند نہیں کرتے حالاں کہ مترجم کے خیال میں لفظی ترجمہ بامحاورہ ترجمہ سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، چنانچہ مترجم نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

۱۳۷۷ھ میں مولانا صبغة اللہ بختیاریؒ نے اسلامی کتب خانہ میں موجود اردو میں مذہبی سرمایہ، خصوصاً تراجم حدیث کا دوسرے فنون کی کتابوں سے موازنہ کرتے ہوئے ایک جامع تبصرہ میں لکھا ہے:

''اس وقت اسلامی نقطۂ نظر سے اردو کتابوں میں ہم کو دو اسلوب ملتے ہیں، عموماً مذہبی کتابیں ادب کی لطافتوں اور زبان و طرز بیان کی نزاکتوں سے یکسر خالی ہوگئی ہیں، طرز بیان میں خشکی ہوتی ہے، اور طرز استدلال کی فرسودگی، کہنگی، شکستگی، اغلاق کی مستزاد ہوتی ہے اور ادبی کتابوں کا یہ حال ہے کہ اس میں دین و دیانت کے ساتھ بے ادبیاں، اخلاقی نقطۂ نظر سے کمینگی، عریانی، فحاشی اور نہایت

پست درجہ کا معیار ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ اس وقت علمی معیار کی دینی کتابیں اردو ادبیات میں موجود ہیں، مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسا انسانیت نواز لٹریچر تیار کیا جائے جس میں زبان وادب کی ساری خوبیوں کے ساتھ اسلام کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر ایک صالح سوسائٹی کی تشکیل کرنے والا ادب لطیف پیدا کیا جائے۔ (تعارف ''تازیانے'' ترجمہ المنبہات۔ ۱۱۷)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چودہویں صدی کے نصف اوائل تک ترجمانی کا رواج اور مزاج کافی عام ہو چکا تھا، اور لوگ عموماً تحت اللفظ ترجمہ کو ناپسند کرنے لگے تھے، اور کتابوں کے بامحاورہ ترجمے کی آواز اٹھنے لگی تھی۔

ترجمہ کی خصوصیات اور شرائط: ذیل میں ترجمہ نگاری، خصوصاً قرآن وحدیث کے ترجمے کے بعض رہنما اصول پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں ہندوستانی تراجم کا جائزہ لیا جا سکے:

(۱) مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل اور ترجمہ دونوں زبانوں میں مہارت رکھتا ہو۔

(۲) ترجمہ جس زبان سے کیا جا رہا ہو، اس زبان کے الفاظ کے محل وقوع اور صنائع وبدائع سے اچھی طرح واقف ہو۔

(۳) ترجمہ کرتے وقت اصل الفاظ کے استعمال اور محل استعمال سے واقف ہونا ضروری ہے، صرف الفاظ کے معنی جان لینے اور لکھ دینے سے ترجمہ کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

(۴) ہر ملک کا ادب وہاں کے معاشرہ کا عکاس ہوا کرتا ہے، اور ہر معاشرہ اس ملک کے ذہنی رجحانات کے ماتحت بنتا ہے، اور معاشرہ کو عملی جامہ پہنانے والے شاعر اور ناقد ہوتے ہیں، جو اپنے ماحول اور سوسائٹی کے اعتبار سے، اپنے تخیلات اور تصورات کو الفاظ کے سانچہ میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں، مگر زبان اور اس ماحول کے سمجھنے والے ان الفاظ کو سن کر جتنا متاثر ہوتے ہیں اس کے مقابل میں دوسرے لوگ نہیں ہو سکتے، لہٰذا ہر زبان کے ترجمہ کے لیے بھی اتنی ہی وسعت نظر ہونا ضروری ہے، کہ اس زبان کے الفاظ کو اپنے ماحول کے مطابق، عوام اور قارئین کے اذہان میں اس طرح اتار دے کہ سننے پڑھنے اور دیکھنے والوں کو کچھ ایسا محسوس ہونے لگے کہ کسی کتاب کا ترجمہ نہیں

پڑھ رہے، بلکہ بنیادی طور پر ہماری ہی زبان کی کتاب ہے۔

یہ ہے کسی بھی زبان سے ترجمے کی اصل خصوصیات، لیکن عربی زبان کی کچھ نزاکتیں اور دشواریاں اور بھی ہیں، ان دشواریوں کو پہلی بار مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی تفسیر کے دیباچہ میں مفصل لکھا ہے، چوں کہ حدیث اور قرآن کی زبان میں اشتراک ہے اس لیے اس مفصل تحریر کی مختصراً چند چیزیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

(۱) عربی میں جو اسلوب بیان، فصاحت کے اعلیٰ معیار پر ہے، وہ اردو میں آکر کہیں کہیں غیر فصیح ہی نہیں، مہمل بن جاتا ہے، عربی میں زور و تاکید کے موقع پر ضمیر کو بے تکلف مکرر، بلکہ تین تین بار لے آتے ہیں، جیسے انہ ھو یبدیٔ ویعید...... اب اگر لفظی ترجمہ میں اس قسم کی ترکیبوں میں اردو میں بھی ضمیر غائب "وہ" ضمیر حاضر "تو" یا ضمیر متکلم "میں" یا "ہم" دہرا کر یا تہرا کر لائی جائے تو اردو عبارت تو غارت ہی ہو جائے، لا محالہ اردو میں اس مفہوم کو لانے کے لیے اردو ہی کے اسلوب سے کام لینا پڑے گا، اور ضمیر کی تکرار سے نہیں، بلکہ ضمیر کے ساتھ کہیں "ہی" سے کام لیا جائے گا کہیں "تو" (بہ واؤ مجہول) لگا دیا جائے گا، اور کہیں "ہی" اور "تو" دونوں کو ملا کر کام لیا جائے گا۔

(۲) اردو میں حال اور مستقبل کے دو صیغے مستقل اور الگ الگ ہیں، عربی میں دونوں کے لیے ایک ہی صیغہ مضارع کا ہے جسے بجنسہ اردو میں لے آنے کی کوئی شکل ہی نہیں۔

(۳) عربی کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ فقرے میں فعل کو مکرر لے آتے ہیں، اعذبہ عذاباً، فیملوا امیلا وغیرہ پچاسوں ترکیبیں اس قسم کی قرآن مجید میں آئی ہیں، لیکن اردو میں وہی لفظ دہرا دینے سے بات بالکل ہی نہ بن سکے گی، اور اردو میں اس موقع کے لیے کوئی دوسرا ہی لفظ لانا پڑے گا، کہیں "بہت" کہیں "بڑا" کہیں "خوب" کہیں "خوب ہی" کہیں "مارے" وقس علی ہذا۔

(۴) اسی طرح ایک خالص عربی ترکیب فزادھم اللہ مرضاً کی ہے، اب اگر اس کا تحت اللفظ ترجمہ "بس بڑھا دیا ان کو اللہ نے از روئے مرض" کر دیا، تو اس بیسویں صدی عیسوی والے عام اردو خواں کے پلے کیا پڑے گا؟ لا زم ہے کہ عربی ترکیب سے ہٹ کر سلیس اردو میں "بس اللہ نے ان کا

مرض بڑھادیا' لایا جائے، اور ایسی ترکیبیں قرآن مجید میں ایک دوجگہ نہیں، خاصی متعدد موجود ہیں۔ اور ایسی ہی ایک اور الجھن صیغہ مجہول کو ترجمہ میں مجہول رکھنے میں بھی کبھی کبھی پیش آجاتی ہے۔

(۵) ایک بڑا مرحلہ مترجم کے لیے لغات اضداد کا ہے، عربی میں متعدد لفظ ایسے ہیں جو متضاد مطلبوں کے لیے آتے ہیں۔

(۶) انتشار ضمائر کا مرحلہ بھی کچھ کم نازک و دشوار نہیں، ایک ہی آیت بلکہ جزو آیت کے اندر ایک ہی ضمیر کا مرجع ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ اور تھا، ایسے موقع پر اگر خود سیاق کلام کے بعد رہنمائی حدیث و آثار سے نہ مل جائے تو مترجم غریب کا تو کام ہی تمام ہو جائے۔

(۷) پھر ایک بڑی دقت ان الفاظ قرآنی سے پیدا ہوئی ہے جو اردو میں چل گئے ہیں، بلکہ ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں، یہ چیز تو بہ ظاہر بڑی آسانی پیدا کرنے والی ہے، اور نو آموز مترجم اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ ان کے ترجمہ کی ضرورت ہی کیا، یہ تو خود اردو بن گئے ہیں، لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ (مقدمہ تفسیر ماجدی۔ جلد اول)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے تجربات کی روشنی میں یہ چند رہنما اصول مرتب کیے ہیں، طالب حق کو اصل کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے، حدیث کے ترجمہ کی ایک خاص دشواری اختلاف روایات اور نسخوں کا اختلاف بھی ہے، اسی طرح کسی لفظ کی تعیین میں اگر علماء اسلام اور شارحین حدیث کے متعدد اقوال ہیں، اور ایسا اکثر ہوتا ہے تو اگر مترجم کو حدیث اور علوم اسلامی پر عبور نہ ہو تو وہ حیران و پریشان رہتا ہے۔

ان تمام صفات وشرائط پر ایک اور چیز مقدم ہے وہ یہ کہ حدیث کے الفاظ کی روح اور ترجمہ میں سرمو فرق نہ ہو، اس تفریق کا بندہ کو کسی طرح استحقاق نہیں ہے، صحابہ کرام اور راویان حدیث اتنی احتیاط برتتے ہیں کہ اگر ایک لفظ میں بھی کسی صحابی یا راوی کو شک ہوجاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا لفظ اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے روایت کرتے ہیں، یا دونوں لفظ روایت کرتے ہیں۔

ان رہنما اصول اور معیار پر اگر تراجم کا جائزہ لیا جائے تو ایک مستقل تالیف اور مدت مدید درکار

ہے، اس لیے کہ ان تراجم میں اس طرح کی سینکڑوں خامیاں مل جائیں گی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اصول وضوابط کی ترتیب کے ساتھ اس کی عملی تطبیق ذرا مشکل ہے، اس کی واضح مثال ابن خلدون کی تاریخ نویسی کے اصول اور ان کی تاریخ ہے، بعض لوگ علامہ شبلی کے متعلق بھی یہ بات نقل کرتے ہیں، بہرحال جنہوں نے بھی ترجمہ کیا اپنے وقت میں انہوں نے ایک قابل قدر خدمات انجام دی، یہاں ہم مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں برائے تطبیق چند نمونے نقل کرتے ہیں۔

یہ نمونے دوطرح کے ہیں، ترجمہ اور ترجمانی میں عہد بعہد جو تغیر وتبدل اور ترقی ہوئی اس کی وضاحت کے لیے، ان نمونوں میں ہم نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بعینہ ترجمہ نقل کردیا ہے تاکہ اس زمانہ کے تلفظ کا بھی اندازہ ہو سکے۔

دوسرے ایسے نمونہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کے ترجمہ کے لیے صرف عربی دانی کافی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی صفات درکار ہیں۔

سب سے پہلا نمونہ کتاب "تنبیہ الغافلین" سے پیش کیا جاتا ہے جو ۱۲۳۶ھ میں مطبع احمدی ہوگلی سے شائع ہوئی۔

عن معاذ قال: أوصاني رسول الله صلى الله عليه وسلم بعشر كلمات قال: لاتشرك بالله شيئا وإن قتلت وحرقت ولاتعقن والديك وإن امراك ان تخرج من أهلك ومالك، ولا تتركن صلوة مكتوبة متعمداً فإن من ترك صلوة مكتوبة متعمدا فقد برئت منه ذمة الله، ولا تشربن خمراً فإنه رأس كل فاحشة، وإياك والمعصية فإن بالمعصية حل سخط الله، فإياك والفرار من الزحف وإن هلك الناس، وإذا أصاب الناس موت وأنت فيهم فاثبت وانفق على عيالك من طولك ولا ترفع عنهم عصاك ادبا و أخفهم في الله (رواه احمد)

ترجمہ: روایت ہے معاذؓ سے کہا کہ نصیحت کی مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس باتوں کی فرمایا: شریک نہ کیجیو اللہ کے ساتھ کسی چیز کو اگر چہ قتل کیا جاوے تو اور جلایا جاوے تو، اور نافرمانی نہ کرنا اپنے ماں باپ کی دکھ نہ دے ان کو اگر چہ وہ کہے تمہیں کہ جدا ہو جاتو اپنے قبیلہ سے، اور اپنے مال

سے، اور دور رکھا اپنے تئیں گناہ سے پس بیشک گناہ کرنے سے اتر تا ہے غضب اللہ کا اور بچا رکھا اپنے کو بھاگنے سے کافروں کی لڑائی سے اگرچہ مارے جاویں لوگ، اور پہنچ جب جاوے آدمیوں کو موت اور تو اس میں ہو تو ٹھہرا رہ وہاں، اور زیادہ دے اپنے اہل وعیال کو حق واجبی پر، اور نہ اٹھالے اپنی لاٹھی ان پر سے ادب کے لیے، اور ڈرا ان کو اللہ کے حکموں سے (کہا احمد نے)

دوسرا نمونہ "مشکوٰۃ المصابیح" کے مختلف ترجموں کا پیش کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ایک ہی کتاب کے مختلف عہد کے تراجم میں زمانہ کا کیا اثر پڑا اور یہ کہ بعد والوں نے اسلاف سے کیا استفادہ کیا اور کس طرح ترجمہ کے اسلوب میں ترقی ہوئی۔

عن عبداللہ بن مسعودؓ قال لقد رأيتنا وما يتخلف عن الصلوة إلا منافق قد علم نفاقه أو مريض إن كان المريض ليمشي بين رجلين حتى يأتي الصلوة وقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم علمنا سنن الهدى وإن من سنن الهدى الصلوة في المسجد الذي يؤذن فيه وفي رواية قال: من سره أن يلقى الله غداً مسلماً فليحافظ على هذه الصلوات الخمس حيث ينادى بهن، فإن الله شرع لنبيكم سنن الهدى وإنهن من سنن الهدى ولو أنكم صليتم في بيوتكم كما يصلي هذا المتخلف في بيته، لتركتم سنة نبيكم ولو تركتم سنة نبيكم لضللتم ومامن رجل يتطهر فيحسن الطهور ثم يعمد إلى مسجد من هذه المساجد إلا كتب الله له بكل خطوة يخطوها حسنة ورفعه بها درجة وحط عنه بها سيئة ولقد رأيتنا وما يتخلف عنها إلا منافق معلوم النفاق ولقد كان الرجل يؤتى به يهادي بين الرجلين حتى يقام في الصف (رواہ مسلم)

ترجمہ: شاہ محمد اسحٰق دہلوی، یہ ترجمہ بصورت "مظاہر حق" ۱۲۵۴ھ میں منظر عام پر آیا جب کہ تحقیق یہ ہے کہ کم از کم "تحفۃ الاخیار" سے پہلے کا ترجمہ ہے:

"اور روایت ہے عبداللہ بن مسعود سے کہ تحقیق دیکھا میں نے اپنے تئیں اور صحابہؓ کو اس حالت میں کہ نہیں پیچھے رہتا تھا نماز باجماعت سے مگر منافق کہ معلوم اور ظاہر تھا نفاق اس کا یعنی جو کہ نفاق پوشیدہ رکھتا تھا وہ بھی نہیں باز رہتا تھا جماعت سے یا بیمار، یعنی جو کہ اصلا طاقت مسجد میں آنے کی

نہ رکھتا ہووہ بھی نہیں باز رہتا، تحقیق تھا بیمار کہ البتہ چلتا درمیان دو شخصوں کے یہاں تک کہ آتا نماز میں،
اور کہا ابن مسعود نے کہ تحقیق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے ہم کو طریقے ہدایت کے اور تحقیق
طریقوں ہدایت کے سے ہے نماز پڑھنی یعنی جماعت سے اس مسجد میں کہ اذان دی جاتی ہو اس میں
اور ایک روایت میں یوں ہے کہ کہا ابن مسعود نے جس شخص کو خوش آوے یہ کہ ملاقات کرے اللہ تعالیٰ
سے کل کو پورا مسلمان، چاہیے کہ محافظت کرے ان پانچوں نمازوں پر اس جگہ کہ اذان دی جائے
واسطے ان کے یعنی جماعت سے ادا کرے مسجد میں، پس تحقیق اللہ تعالیٰ نے مقرر کیے واسطے نبی
تمہارے طریقے ہدایت کے اور تحقیق یہ نمازیں پانچوں جماعت سے پڑھنی طریقوں ہدایت کے سے
ہیں، اگر تحقیق تم نماز پڑھو اپنے گھروں میں یعنی اگرچہ جماعت سے پڑھو جیسا کہ نماز پڑھتا ہے یہ
پیچھے رہنے والا اپنے گھر میں البتہ چھوڑ دو گے سنت نبیؐ اپنے کی، اور اگر چھوڑ دو گے تم سنت نبی اپنے کی
البتہ گمراہ ہو گے اور نہیں کوئی شخص کہ وضو کرے پس اچھا وضو کرے یعنی واجبات اور آداب اس کے
بجالاوے پھر قصد کرے مسجد کے ان مساجد میں سے مگر کہ لکھتا ہے اللہ تعالیٰ واسطے اس کے بدلے ہر
قدم کے کہ قدم رکھتا ہے ایک نیکی اور بلند کرتا ہے اس کو بسبب اس قدم کے ایک درجہ اور دور کرتا ہے
اس سے بسبب اس کے ایک برائی، اور البتہ تحقیق دیکھا میں نے اپنے تئیں اور صحابہؓ کو اس حالت
میں کہ نہیں پیچھے رہتا تھا جماعت سے مگر منافق ایسا کہ معلوم تھا نفاق اس کا اور تحقیق تھا آدمی بیمار کہ لایا
جاتا نماز میں اس حالت میں کہ تکیہ کرتا درمیان دو آدمیوں کے یعنی بسبب نہایت ضعف کے یہاں تک
کہ کھڑا کیا جاتا صف میں، روایت کی یہ مسلم نے''۔

۱۳۱۳ھ میں مولانا عبدالاول غزنوی اور عبدالغفور غزنوی کے اہتمام سے یہ ترجمہ شائع ہوا ہے:
ترجمہ: روایت ہے عبداللہ بن مسعود سے کہ کہا: تحقیق دیکھا میں نے اپنے تئیں اور صحابہ کو اس
حالت میں کہ نہیں پیچھے رہتا تھا نماز با جماعت سے مگر منافق کہ معلوم اور ظاہر تھا نفاق اس کا یا بیمار، تحقیق
تھا بیمار کہ البتہ چلتا درمیان دو شخصوں کی یہاں تک کہ آتا نماز میں، اور کہا ابن مسعود نے کہ تحقیق پیغمبر
خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے ہم کو طریقے ہدایت کے اور تحقیق طریقوں ہدایت کے سے ہے نماز

پڑھی اس مسجد میں کہ اذان دی جاتی ہو اس میں، اور ایک روایت میں یوں ہے کہ کہا ابن مسعود نے جس شخص کو خوش آوے یہ کہ ملاقات کرے اللہ تعالیٰ سے کل کو پورا مسلمان، پس چاہیے کہ محافظت کرے ان پانچوں نمازوں پر اس جگہ کہ اذان دی جاوے واسطے ان کی، پس تحقیق اللہ تعالیٰ نے مقرر کیے واسطے نبی تمہارے طریقے ہدایت کے، اور تحقیق یہ نمازیں پانچوں جماعت سے پڑھنی طریقوں ہدایت کے سے ہیں، اور اگر تحقیق تم نماز پڑھو اپنے گھروں میں جیسا کہ نماز پڑھتا ہے یہ پیچھے رہنے والا اپنے گھر میں البتہ چھوڑ دو گے سنت نبیؐ اپنے کی، اور اگر چھوڑ دو گے تم سنت نبی اپنے کی، البتہ گمراہ ہو گے، اور نہیں کوئی شخص کہ وضو کرے پس اچھا وضو کرے، پھر قصد کرے طرف مسجد کی ان مساجد میں سے مگر کہ لکھتا ہے اللہ تعالیٰ واسطے اس کی بدلے ہر قدم کے کہ مقدم رکھتا ہے ایک نیکی اور بلند کرتا ہے اس کو بسبب اس قدم کے ایک درجہ اور دور کرتا ہے اس سے بسبب اس کی ایک برائی اور البتہ تحقیق دیکھا میں نے اپنے تئیں اور صحابہ کو اس حالت میں کہ نہیں پیچھے رہتا تھا جماعت سے مگر منافق ایسا کہ معلوم تھا نفاق اس کا، اور تحقیق تھا آدمی بیمار کہ لایا جاتا تھا نماز میں اس حالت میں کہ تکیہ کرتا درمیان دو آدمیوں کی یہاں تک کہ کھڑا کیا جاتا صف میں، روایت کی یہ مسلم نے۔

مولانا عمر بستوی نے بھی ترجمہ کیا ہے ان کا نمونہ ملاحظہ ہو:

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہا تحقیق دیکھا میں نے خود کو اور صحابہ کو کہ نہ پیچھے رہتا نماز باجماعت سے مگر منافق کہ معلوم اور ظاہر تھا نفاق اس کا یا بیمار تحقیق تھا بیمار ہمارا البتہ چلتا درمیان اور دو شخصوں کے یہاں تک کہ آتا وہ نماز میں اور ابن مسعود نے کہا تحقیق پیغمبر خدا نے سکھائے ہم کو ہدایت کے طریقے اور تحقیق ہدایت کے طریقوں میں سے نماز ہے کہ ان مساجد میں ادا کی جائے، جن میں اذان پڑھی جاتی ہے، اور ایک روایت میں یوں ہے کہ کہا ابن مسعود نے جس شخص کو خوش لگے یہ بات کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے کل کو پورا مسلمان چاہیے کہ محافظ کرے ان پانچوں نمازوں پر اس جگہ کہ اذان دی جاوے واسطے ان کے تحقیق مقرر کیے ہے اللہ نے تمہارے نبی کے لیے طریقے ہدایت کے اور تحقیق یہ نمازیں پانچوں جماعت کے ساتھ پڑھنی ہدایت کے طریقوں سے ہے، اور اگر تم نماز پڑھو

اپنے گھروں میں جیسا کہ نماز پڑھتا ہے یہ پیچھے رہنے والا اپنے گھر میں البتہ چھوڑ دوگے نبی کی سنت کو اگر چھوڑ دوگے اپنے نبی کی یہ سنت، البتہ گمراہ ہو جاؤ گے اور نہیں کوئی شخص کہ وضو کرے اچھا کرے وضو کو پھر مسجد کی طرف قصد کرے ان مساجد میں سے مگر کہ لکھتا ہے اللہ تعالی ہر قدم کے بدلے کہ قدم رکھتا ہے واسطے اس کے ایک نیکی اور بلند کرتا ہے سبب اس قدم کے ایک درجہ اور دور کرتا ہے ایک برائی کو اور تحقیق دیکھا ہم نے اپنے آپ کو اور صحابہ کو اس حالت میں کہ نہ پیچھے رہتا جماعت سے مگر منافق ایسا کہ ان کا نفاق معلوم تھا تحقیق تھا آدمی بیمار کہ لایا جاتا نماز میں اس حالت میں کیوں کہ کرتا درمیان دو آدمیوں کے یہاں تک کہ کھڑا کیا جاتا وہ صف میں روایت کیا اس کو مسلم نے۔

عبداللہ جاوید غازی نے "مظاہرحق" کے ترجمہ وتشریح کو Uptodate کر کے "مظاہر حق جدید" کے نام سے ۱۳۸۰ھ میں شائع کیا ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا ہم نے اپنے کو اس حال میں دیکھا ہے کہ کوئی شخص نماز باجماعت سے غیر حاضر نہیں رہتا تھا سوائے منافق کے کہ جس کا نفاق معلوم اور ظاہر تھا یا سوائے مریض رہتا تھا اور جو مریض مسجد تک آنے کی ذرا بھی توانائی رکھتا تھا وہ بھی جماعت چھوڑنے کو گوارہ نہیں کرتا تھا، چنانچہ بعض مریض تو دو آدمیوں کے درمیان چلتا ہوا آتا اور جماعت میں شریک ہو جاتا، اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے ہم مسلمانوں کی سنن ہدی کی تعلیم دی ہے، اور انہی سنن ہدی میں اس مسجد میں جہاں اذان دی جاتی ہو جماعت سے نماز ادا کرنا بھی ہے، اور ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ جس شخص کے لیے یہ بات خوش کن ہے کہ وہ کل قیامت کے دن اللہ تعالی کے سامنے کامل مسلمان کے طور پر جائے تو ضروری ہے کہ وہ ان پانچوں نمازوں کی وہاں محافظت کرے جہاں اذان دی جاتی ہو، اور اے مسلمانو! اللہ تعالی نے تمہارے نبی کے لیے جو سنن ہدی مقرر فرمائی ہیں، انہی میں سے ایک یہ بھی ہے اگر اپنے گھروں میں ہی نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ جماعت سے غیر حاضر رہنے والا یہ آدمی اپنے گھر نماز پڑھتا ہے تو بلاشبہ تم اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دوگے اور اگر تم اپنے نبی کی سنت

چھوڑ دوگے تو یقین جانو گمراہ ہو جاؤ گے، اور جو شخص وضو کرے اور اچھا وضو کرے پھر مسجد کا قصد کرے تو اس کے ہر اس قدم کے عوض کہ جو وہ آگے رکھتا ہے اللہ تعالیٰ ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور ایک درجہ بلند کر دیتا ہے اور ساتھ میں ایک گناہ بھی کم کرتا ہے، اور ہم نے اپنے کو اس حال میں دیکھا ہے کہ کوئی شخص نماز باجماعت سے غیر حاضر نہیں رہتا تھا سوائے منافق کے کہ جس کا نفاق معلوم اور ظاہر تھا اور جو شخص بیمار ہوتا اس طرح اسے لے جاتا کہ وہ دوسروں پر ٹیکا دیئے ہوئے یہاں تک کہ اس کو صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔ (مسلم)

شاہ محمد اسحٰق کے بعد مشکوٰۃ کا دوسرا ترجمہ مولانا زین العابدین حیدر آبادی نے کیا جو ۱۲۵۷ھ میں مطبع رحمانی بندر ہوگلی سے شائع ہوا۔

نمونہ: وعن ابي موسىٰ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مثل المؤمن الذي يقرأ القرآن مثل الأترجة ريحها طيب وطعمها طيب ومثل المؤمن الذي لا يقرأ القرآن مثل التمرة لا ريح لها وطعمها حلو ومثل المنافق الذي لايقرأ القرآن كمثل الحنظلة ليس لها ريح وطعمها مر ومثل المنافق الذي يقرأ القرآن مثل الريحانة ريحها طيب وطعمها مر متفق عليه.

ترجمہ: اور روایت ہے ابی موسیٰ سے کہ کہا اس نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال اس ایمان دار کی کہ پڑھتا ہے قرآن جیسی مثال ترنج کی کہ بواس کی خوش ہے اور مزہ اس کا اچھا ہے، اور مثال اس ایماندار کی کہ نہ پڑھے قرآن یہ ہے کہ جیسے مثال خرمہ کی کہ اس کی بو نہیں اور مزہ اس کا میٹھا ہے اور مثال اس منافق کی کہ نہیں پڑھتا ہے قرآن جیسی مثال اندرائن کی کہ نہیں اس کی بو اور مزہ اس کا کڑوا ہے، اور مثال اس منافق کی جو پڑھے قرآن جیسی مثال ریحان کی کہ بُو اس کی خوش ہے اور مزہ اس کا کڑوا ہے۔

نمونہ ترجمہ کتاب "سواء الطريق" مرتب ومترجم مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (المتوفی ۱۳۳۶ھ) تاریخ طباعت: ماہ جنوری ۱۹۱۶ء)۔

زید بن خالد جہنیؓ کہتے ہیں کہ ایک رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو دیکھتا رہا

آپ نے پہلے دو رکعتیں ہلکی پڑھیں پھر لمبی سے لمبی دو رکعتیں پڑھیں، پھر اس سے ہلکی دو رکعتیں پڑھیں اس سے بھی دو رکعتیں ہلکی پڑھیں، پھر اس سے بھی دو رکعتیں ہلکی پڑھیں پھر اس سے اور بھی دو رکعتیں ہلکی پڑھیں، پھر ایک رکعت وتر پڑھی، اس طرح پر کل تیرہ رکعتیں پڑھیں (م)

ان نمونوں سے مختلف زمانوں میں ترجمہ کے اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص شاہ محمد اسحٰق محدث کا ترجمہ بغور پڑھے اور باقی ترجموں کا موازنہ کرے تو محسوس کر سکتا ہے کہ تمام تراجم میں کسی نہ کسی حیثیت سے اس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

حدیث کی ترجمانی کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ عربی دانی کے ساتھ ساتھ روح حدیث اور مطالب حدیث سے واقف ہو، روح حدیث اور مطالب حدیث کا ترجمہ پر کیا اثر پڑتا ہے اس کی اس وقت صرف دو مثال پیش کریں گے۔

اسماء حسنی کے سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن لله تسعا وتسعين اسماً مائة إلا واحدة، من أحصاها دخل الجنة" (رواه البخاري ومسلم)

اس روایت میں "من احصاها" کا لفظ قابل توجہ ہے، بعض شارحین نے اس کی تشریح "من عدها" سے کی ہے، جب کہ امام بخاری نے اس کی تشریح "من حفظها" سے کی ہے بلکہ بعض روایات میں "من حفظها" کے الفاظ ملتے ہیں، مولانا منظور عالم نعمانیؒ صاحب معارف الحدیث ایک متبحر عالم دین اور بلند پایہ محدث تھے انہوں نے اپنے وسیع معلومات اور روایات پر نظر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "من احصاها" کا ترجمہ "جس نے اس کو شمار کیا" کے بجائے "جس نے ان کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی" سے کیا ہے، اور انہوں نے اس ترجمہ کو ترجیح دینے کی وجہ بھی بیان کر دی ہے، (معارف الحدیث ۵/۶۰) ان کے اس ترجمہ سے بہت سے اشکالات اور الجھنیں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں۔

ایک دوسری حدیث فضائل قرآن کے سلسلے میں ہے جس میں ایک اعرابی نے حضور اکرم

ﷺ سے تعلیم قرآن کی گذارش کی، حضورؐ نے اس کو سورہ یونس، ھود، یوسف، ابراہیم اور حجر پڑھنے کا حکم فرمایا، اس نے کبرسنی کا عذر کیا تو آپ نے اس کو سورہ غافر، فصلت، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ اور احقاف کی تلاوت کا مشورہ دیا، اس نے پھر وہی عذر کیا اور کہا:

"اقرأني سورة جامعة فاقرأه رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا زلزلت الأرض حتى فرغ منها، فقال الرجل: والذي بعثك بالحق لا أزيد عليه أبداً" مولانا بدر عالم میرٹھی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو تو کوئی جامع اور مختصر سورت پڑھا دیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سورہ "إذا زلزلت" پڑھا دی، یہاں تک کہ آپ اسے پڑھا کر فارغ ہوگئے، اس شخص نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق دیکر بھیجا ہے میں کبھی اس پر کوئی اضافہ نہیں کروں گا... "

اس کے بعد راوی کا بیان ہے "ثم أدبر الرجل، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أفلح الرويجل مرتين" (رواہ احمد وابو داؤد) یہ کہہ کر وہ پشت پھیر کر چل دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا، یہ بے وقوف بیچارہ کامیاب ہوگیا۔

آخری جز کے ترجمہ میں خط کشیدہ الفاظ اور اس کا ترجمہ توجہ کا مستحق ہے: "مرتین" کا ترجمہ "دوبارہ" کسی طرح درست نہیں ہے، مولانا کی جلالت شان کے پیش نظر یہ ترجمہ ان کے قلم سے باعث استعجاب ہے، اسی طرح "الرویجل" کا ترجمہ مولانا نے عام عربی قاعدہ یعنی تصغیر برائے تحقیر کو سامنے رکھ کر دیا ہے، اور تشریح میں اپنے اس غلط ترجمہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایسی توجیہ کی جو شاید حد ادب سے متجاوز ہو، لکھتے ہیں:

"... اس روایت میں آپ نے اس کے اس شدید کلمہ کا عذر اس کی کم فہمی اور بے عقلی قرار دیا ہے، یہی کلمہ اگر کسی اور تربیت یافتہ صحابی کے منہ سے نکلتا ہے تو شاید قابل سرزنش ہو جاتا لیکن آپ کو ہر شخص کی مقدار صحبت اور علم وفہم کی رعایت بھی رہتی تھی، اس لیے اگر کسی ناواقف کے منہ سے محبت وعظمت کے انداز میں کوئی نامناسب کلمہ نکل گیا تو گو تو کے بغیر آپ نے اس کو بھی نہیں چھوڑا مگر اس

انداز کی سخت گیری بھی نہیں فرمائی۔۔۔۔۔۔‘‘ (ترجمان السنة ج ۱؍۱۳۰)

مولانا کو شرح میں اتنی محنت اس لیے کرنی پڑی کہ انھوں نے ’’الرویجل‘‘ کو اس کے متبادر معنیٰ پر محمول کیا ہے، حالاں کہ شارحین حدیث نے اس کے برخلاف معنیٰ مراد لیا ہے، امام طیبی لکھتے ہیں:

"أفلح الرويجل: على تصغير التعظيم لبعد غوره وقوة إدراكه، والرويجل تصغير شاذ، لأن القياس رجيل" (شرح الطیبی۔ج ۴؍۲۶۹) یہی رائے دیگر شارحین حدیث کی بھی ہے، ملاحظہ ہو’’مرقاۃ المفاتیح۔ج ۹؍۴۷‘‘ اور’’مرقاۃ المفاتیح: ج ۷؍۲۵۷‘‘۔

’’مظاہر حق جدید‘‘ میں اس کا ترجمہ یوں درج ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اس شخص نے مراد حاصل کرلی‘‘ یہ بات آپ نے دو مرتبہ فرمائی۔ (ج ۳؍۴۳)

شارحین حدیث نے جو مفہوم لیا ہے، احادیث میں اس کے نظائر بھی موجود ہیں، کتاب الدعوات میں ایک روایت نقل کی جاتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے ان کے عمرہ کے لیے جانے کے ارادہ پر ان سے فرمایا تھا: ’’أشركنا يا أخي في دعائك ....‘‘ (اے میرے چھوٹے بھائی اپنی دعا میں ہمیں بھی شریک کرلینا۔۔۔۔۔۔)۔

صاحب’’مرقاۃ المفاتیح‘‘ لکھتے ہیں: "بصيغة التصغير وهو تصغير تلطف وتعطف لا تحقير، ويروى بلفظ التكبير ...." (ج:۵؍۳۴)

اگر تراجم کا جائزہ لیا جائے تو جہاں خوبیاں ملتی ہیں وہاں اس طرح کی فروگذاشتیں بھی ہوئی ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حدیث وقرآن کے ترجمہ کی کیسی دشواریاں اور نزاکتیں ہیں۔

ایک کتاب کے کئی ترجمہ کے اسباب: ہر تصنیف مصنف کا آئینہ اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے بعض نقاشوں نے پرانے حکما، اور فلاسفہ کی تصویر محض ان کی تحریروں کی بنیاد پر بناڈالی ہے۔

ترجمہ بھی ایک تصنیف ہے، ایک کتاب کے اگر سو سے زاید بھی ترجمے ہوجائیں تب بھی باہم کلی مماثلت کا امکان نہیں، جزئیات کا انکار نہیں، اس کی سب سے بہترین مثال تراجم قرآن ہیں، ابھی تک ہندوستان میں تقریباً ۲۵۰ تراجم ہو چکے ہیں لیکن ہر ایک کے رنگ و بو دوسرے سے جدا

ہیں، مولانا عبدالقادر صاحب نے جس زمانہ میں ترجمہ لکھا اور جس ماحول (دہلی) میں ترجمہ لکھا وہ دربار اور سلطنت کے جاہ وجلال سے قربت رکھتا تھا جس کے اثرات الفاظ واصطلاحات اور محاورات پر بھی تھے ﴿قالوا بعزة فرعون......﴾ کا ترجمہ انہوں "فرعون کا اقبال سے......" سے کیا ہے، فرعون کا مکالمہ جن لوگوں سے ہوا، اور فرعون کا جو جاہ وجلال تھا اگر اس پر غور کیا جائے اور ترجمہ دیکھا جائے تو طبیعت میں ایک سرشاری پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے بہتر اس کا ترجمہ ہو نہیں سکتا تھا، ایک آیت ہے ﴿فلما توفیتنی کنت أنت الرقیب علیهم ......﴾ اس آیت میں لفظ "توفی" قادیانیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ سے متعلق عقیدہ کی بنیاد ہے، شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی اور شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کے زمانہ میں یہ فرقہ موجود نہیں تھا، ان دونوں کا بالترتیب ترجمہ یہ ہے "جب تو نے مجھے قبض کر لیا" اور "جب تو نے مجھے بھر لیا"، اس ترجمہ سے یہ نتیجہ تو ہرگز نہیں نکلتا کہ یہ حضرات رفع عیسیٰ کے قائل نہیں تھے، البتہ اسی آیت کا ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے یوں کیا ہے "پھر جب تو نے مجھے (دنیا سے) اٹھالیا" عربی لفظ "توفی" میں وفات اور رفع دونوں کی گنجائش ہے لیکن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے دوسرے مفہوم کی ترجمانی اس وضاحت سے کردی ہے کہ پہلا معنی انسان کے ذہن میں کھٹک بھی نہیں سکتا، یہ ماحول میں سرایت اس فساد کے رد کے محرک کا اثر ہے۔

اس طرح کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح مترجم جس فکری طریق اور ذوق سے ہم آہنگ ہوتا، اور جس طرح کا علمی استدلال اس کے نزدیک راجح ہوتا ہے اس کا بھی گہرا اثر ترجمہ پر پڑتا ہے جس کی واضح مثال مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا مودودی کے ترجمہ میں محسوس کیا جاتا ہے۔

اسی طرح بعض ترجمے مخصوص طبقے کو سامنے رکھ کر کیے جاتے ہیں، وہ ترجمہ اپنے اسلوب اور الفاظ واصطلاحات میں اس طبقہ کا ترجمان ہوتا ہے۔

لہٰذا کسی ترجمہ کے بارہ میں یہ فیصلہ کردینا کہ یہی بہتر اور دوسرا فروتر ہے، سراسر زیادتی ہوگی، ہاں البتہ ایک چیز مشترک ہے، وہ ہے مرحلہ وار زبان میں تبدیلی اور تغیر، خصوصاً اردو زبان نے اپنی

ابتداء سے لے کر آج تک ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی ہے، اس تناظر میں بہت سے ترجمے ایسے ہیں جو ایک زمانہ میں انتہائی مفید اور کارآمد تھے لیکن اب اس کا سمجھ لینا ہفت اقلیم طے کرنا ہے، حدیث میں اس کی واضح مثال "مظاہر حق" ہے، اس کا نقش اول اور بعد کے ترجموں کے موازنہ سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا عبدالرؤف علی زبان میں واقع تبدیلی سے ترجمہ میں تبدیلی کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

...اردو جو ابتدائے عہد سے اپنا قالب بدلتی چلی آرہی ہے، اور ہر دور میں ایک نیا لب ولہجہ اختیار کرتی رہی ہے آج اس دور سے بہت مختلف ہو چکی ہے، جو مظاہر حق میں استعمال کی گئی، ڈیڑھ سو برس قبل کے محاورے اور ترکیبیں، جملے اور بندشیں، آج لوگوں کے لیے ناقابل فہم ہیں اس لیے اس شرح کی زبان اپنی قدامت اور طرز ادا کی کہنگی کی بنا پر نظر ثانی کی شدید محتاج تھی، شرح قدیم اس عہد کے مزاج سے بالکل جدا ہے، اس دور میں اردو نومولود تھی اور نشو ونما کے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی لیکن اس ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں وہ بہت کچھ بدل گئی ہے، اور اب کہ اس زبان کا دور بلوغ شروع ہو چکا ہے، اس شرح کی نئی ترتیب وتسہیل ضروری ہوگئی کیوں کہ موجودہ نسل لفظی ترجموں کی پابندی اور طرز بیان کی پیچیدگی کی بالکل عادی نہیں رہی، اب ادائیگی مفہوم اور سلاست زبان کو بنیادی تصور کیا جاتا ہے اس لیے اس شرح سے اس درجہ کا استفادہ ممکن نہیں رہا جو اب سے ایک صدی قبل ممکن تھا، روز بروز زبان کی قدامت اس شرح کی افادیت کو کم کرتی چلی جارہی ہے"۔

یہ تحریر اگر چہ مظاہر حق کے اردگرد گھومتی ہے لیکن مذکورہ بالا علت اس زمانہ کے تمام تراجم میں مشترک ہے۔

ترجمہ کے مقبول یا رائج ہونے کے اسباب: (۱) ہندوستان میں کسی ترجمہ کی قبولیت یا عدم قبولیت یا دوسرے لفظوں میں رواج یا عدم رواج کی ایک اہم وجہ وہ کتاب ہے جس کا ترجمہ کیا گیا ہے، ایک زمانہ میں مشارق الانوار للامام حسن الصغانی (۱۹رشعبان ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) کا غلغلہ تھا، اس کا ترجمہ تحفۃ

الاخیار کے نام سے ہوا تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مصنف کی زندگی (یعنی صرف چھ سال) میں اس کے تین ایڈیشن منظر عام پر آئے اور ۱۳۳۸ھ تک اس کے پندرہ ایڈیشن طبع ہوئے، یہ اس کی غیر معمولی مقبولیت کی دلیل ہے، لیکن پھر اس کی جگہ مظاہر حق نے لینا شروع کیا اس لیے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور ولی اللہی مکتب فکر کے افراد نے حدیث کے اس مجموعہ کے ساتھ خصوصی اعتنا برتا، مدارس کے نصاب میں اس کو داخل کیا گیا، اس مجموعہ ہی سے منتخب کئی مجموعے اور اس کے ترجمے شائع ہوئے، یہاں تک کہ دورِ جدید میں جن علماء نے بھی حدیث پر کوئی مفید اور مقبول کام کیا انہوں نے اپنے کام کی بنیاد اسی مجموعۂ حدیث کو بنایا، مولانا منظور عالم نعمانی کی رائے یہاں تک ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ درحقیقت ''مشکوٰۃ المصابیح'' کی ترجمانی ہے، اس طرح ''مشارق الانوار'' اور ''تحفۃ الاخیار'' کا نام ذہن سے نکلتا گیا اور اس کی جگہ مشکوٰۃ المصابیح اور ''مظاہر حق'' نے لے لی۔

(۲) پیچھے ہم ہندوستان میں زبان کے مختلف مراحل کا ذکر کر آئے ہیں، ایک زمانہ میں یہاں عربی اور فارسی تصنیف وتالیف درس وتدریس کی زبان رہی ہے، دوسرے لفظوں میں علماء اور عوام دونوں حلقوں میں کسی نہ کسی حد تک یہ زبانیں معروف رہی ہیں، بعد میں ایک وقت وہ بھی آیا جب اس ملک میں عربی تو عربی فارسی بھی اجنبی ہوگئی، اس وقت اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ علمی کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کرنا چاہیے تاکہ اہل علم اس سے مستفید ہوسکیں، چنانچہ صحاح ستہ کے تراجم کے یہی محرکات تھے، اس وقت ان تراجم کی پذیرائی بھی ہوئی مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس ملک میں عربی کا فروغ ہوا، اور مدارس نے ممتاز عربی کے فضلاء تیار کیے، عالم عرب سے رابطہ بڑھا، علماء عرب یہاں آئے، ہندوستانی علماء باہر گئے اور استفادہ کیا اور ایک بار پھر ہندوستان میں اہل علم کی زبان عربی ہوگئی، انہوں نے عربی ہی کی طرف رجوع کو ترجیح دی اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا، عوام کو ان علمی مجموعوں کے ترجمے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، چنانچہ ان ترجموں سے دلچسپی بھی کم ہوگئی، اس کے برخلاف وہ موضوعات جن کا تعلق دقیق مسائل اور مباحث سے نہیں بلکہ فضائل، آداب اور طرز معاشرت سے

ہےان کے ترجمے باقی اور متداول رہے،اس میں سرفہرست''ریاض الصالحین'''''المنبہات'''''شمائل'' اوراسی طرح کے دوسرے ان مجموعوں کے ترجمے ہیں جن میں مذکورہ بالا امور کی رعایت کی گئی ہے۔

(۳) اگر ایک ہی کتاب کے کئی کئی ترجمے ہوئے ہیں تو اس میں عموماً اس کتاب کو رواج حاصل ہوا ہے جس کی زبان معیاری، تشریح دلنشیں، اسلوب میں عمومیت اور معاشرہ وماحول سے تعلیق ہو، اوراس ترجمہ کامحرک خالص دینی ودعوتی ہو۔

(۴) ان تمام عوامل میں بنیادی حیثیت مصنف اور مترجم کا اخلاص ہے، اسی اخلاص نے بہت سے کم علم رکھنے والوں کی کاوشوں کو زیادہ علم رکھنے والوں کے مقابلہ میں زندہ جاوید بنادیا ہے۔

فہرست مآخذ ومصادر:

(۱) نقوش سلیمانی۔مولف: علامہ سید سلیمان ندویؒ، معارف پریس اعظم گڑھ طبع سوم ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء۔

(۲) حیات عبدالحق۔مولف: پروفیسر خلیق احمد نظامی، خواجہ برقی پریس دہلی، محرم الحرام ۱۳۷۳ھ/ستمبر ۱۹۵۳ء۔

(۳) معارف الحدیث۔مولف: مولانا منظور نعمانی، الفرقان بکڈپو،ج ۱۹۸۲/۱،ج ۱۹۸۵/۲،ج ۱۹۸۳/۵ء۔

(۴) مقالات سلیمانی (حصہ اول)۔ علامہ سید سلیمان ندوی، معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء۔

(۵) تحریک اہل حدیث (تاریخ کے آئینے میں)۔مولف: مولانا قاضی محمد اسلم سیف۔ الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگرنئی دہلی۔۲۵/اپریل ۱۹۹۶ء۔

(۶) تاریخ دعوت وعزیمت۔مولف: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔جلد پنجم مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ طبع چہارم، (۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء)

(۷) تراجم علمائے اہل حدیث ہند (جلد اول) مولف: ابویحییٰ امام خاں نوشہروی، جید برقی پریس دہلی، ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء۔

(۸) تاریخ دعوت وجہاد (برصغیر کے تناظر میں) مولف: عبیداللہ فلاحی، مطبع: فائن آرٹ انجینیرس، دہلی ۶/جنوری ۱۹۸۴ء۔

(۹) جامع وہدلل تاریخ ہند، مولف: مفتی محمد ڈینڈ رلوی (پالن پور) فرید بکڈپو، ۲۰۰۶ء۔

(۱۰) اردو تفاسیر بیسویں صدی میں، مولف: ڈاکٹر شاہد علی، کتابی دنیا محل ۲۰۰۰ء۔

(۱۱) اردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو، مولف شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

(۱۲) اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، مولف: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (ہند) ۲۰۰۰ء۔

(۱۳) الرحمۃ المہداۃ الی من یرید ترجمۃ المشکوۃ۔ مولف: مولوی عبدالاول غزنوی ۱۳۱۳ھ مطبع القرآن والسنہ، امرتسر۔

(۱۴) تدوین حدیث، مولف: مولانا مناظر احسن گیلانی ۱۳۶۵ھ۔

(۱۵) سواء الطریق۔ مولف: مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی، جنوری ۱۹۱۶ء مطبع فاروقی دہلی۔

(۱۶) تنبیہ الغافلین۔ مولف: میر سید عبداللہ مرحوم، مطبع ہوگلی، ۱۳۳۶ھ۔

(۱۷) ترجمۃ المشکوۃ ... مولف: مولانا زین العابدین حیدرآبادی تاریخ طباعت: ۱۳۵۷ھ، مطبع: رحمانی بندر ہوگلی۔

(۱۸) ترجمان السنۃ۔ مولف: مولانا بدر عالم میرٹھی، ندوۃ المصنفین۔

(۱۹) مظاہر حق۔ مولف: نواب قطب الدین دہلوی مطبع مجتبائی واقع دہلی ۱۳۵۴ھ۔

(۲۰) مظاہر حق جدید۔ مرتب: عبداللہ جاوید غازی، ادارہ: اسلامیات، دیوبند، یوپی ۱۳۸۰ھ۔

(۲۱) ترجمہ مشکوۃ۔ مترجم: مولانا عمر بستوی ربانی بکڈپو، کٹرہ شیخ چاند لال کنواں۔

(۲۲) زادسفر۔ مترجم: امۃ اللہ تسنیم ۱۳۶۵ھ۔

(۲۳) تلخیص الصحاح۔ مترجم: محمد محی الدین خاں، (تاریخ طباعت ترجمہ ۱۹۰۰ء)

(۲۴) نہایۃ التحقیق شرح مسند ابی بکر الصدیق (شرح مسند امام احمد بن حنبل کا پہلا حصہ) شارح و مترجم: شبیر احمد از ہر میرٹھی، ناشر: مکتبہ از ہریہ، میرٹھ، یوپی۔ مطبع: جمال پریس دہلی و کوہ نور پریس دہلی۔

(۲۵) تازیانے: ترجمہ (المنبھات علی الاستعداد لیوم المعاد) (زین القضاۃ احمد بن محمد الحجی) مترجم: مولانا ابوالبیان حماد، تاریخ طباعت: ۱۳۷۳ھ۔

(۲۶) انتخاب صحاح ستہ، مرتب و مترجم: مولوی نیاز علی، تاریخ طبع دوم: ۱۹۲۵ء، مطبع: لاہور پرنٹنگ پریس۔

(۲۷) معارف المشکوۃ۔ مترجم: مولانا سید عبدالرؤف عالی مرتب مخطوطات دارالعلوم دیوبند۔ تاریخ طبع دوم: ۱۹۶۰ء، مطبع: اشاعت منزل دیوبند۔

(۲۸) تفسیر ماجدی۔ مفسر: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (جلد اول) مجلس تحقیقات...... ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء۔

(۲۹) تفہیم القرآن۔ مفسر مولانا مودودیؒ۔ مرکزی مکتبۂ اسلامی، ۱۹۵۸ء۔

(۳۰) شرح الطیبی۔ علامہ شرف الدین الطیبی ۱۴۱۳ھ۔ ادارۃ القرآن، کراچی، پاکستان۔

(۳۱) اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر۔ مولف: پروفیسر خلیق احمد نظامی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء۔

(۳۲) ہندوپاک کے فقہی مکاتب فکر اور اسلامی فرقے، سید محمد عبدالرشید ندوی، فروری ۲۰۰۰ء۔ ندوی منزل، ندوہ روڈ لکھنؤ۔



ہندوستان میں درس حدیث کے طریقے

از: مولانا نذرالحفیظ ندوی

ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے ہونہار فرزندوں کے ذریعہ حدیث نبوی کی جو ترویج و اشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی اس کی مثال دوسرے ملکوں میں مشکل سے ملے گی، حضرت شاہ ولی اللہ کے عالی مرتبت صاحبزادہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی تدریس حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کے درس حدیث کی مدت تقریباً چونسٹھ سال ہے، اس مدت میں آپ نے نہ صرف صحاح ستہ کا درس دیا اور ''بستان المحدثین'' اور ''العجالۃ النافعۃ'' جیسی مفید کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جو حدیث کا صحیح ذوق، طبقات حدیث سے واقفیت اور محدثین کا مرتبہ شناس بناتی اور اصول سے واقف کراتی ہیں اور جن میں سینکڑوں صفحات کا عطر آگیا ہے، آپ نے حدیث کے ایسے اساتذہ کاملین اور تلامذہ راشدین پیدا کئے جنہوں نے ہندوستان ہی میں نہیں حجاز میں بھی درس حدیث کا فیض عام کیا اور ایک عالم کو مستفید کیا، آپ کے ان باکمال تلامذہ کی تعداد جن کے تراجم مولانا عبدالحی حسنی نے نزھۃ الخواطر میں درج کئے ہیں، چالیس سے زائد ہیں ان میں سے وہ حضرات جن سے درس حدیث کے حلقے قائم ہوئے اور انہوں نے دوسرے شیوخ واساتذہ پیدا کیے حسب ذیل ہیں:

مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولانا

سید اولاد حسن قنوجی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی محدث، مولانا حیدر علی ٹونکی ،مولانا خرم علی بلہوری، مفتی صدر الدین دہلوی، مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہری، مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی رائے بریلوی۔

ان کے علاوہ جن لوگوں نے شاہ عبدالعزیز سے حدیث کی سند لی ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کا احاطہ مشکل ہے۔

یہاں ان چند حضرات کے نام ذکر کئے جاتے ہیں جو اپنے بعض دوسرے کمالات یا سلسلۂ طریقت یا شہرت کے لحاظ سے امتیاز خاص رکھتے ہیں۔

حضرت شاہ غلام علی دہلوی، حضرت شاہ ابوسعید دہلوی، حضرت شاہ احمد سعید دہلوی، حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا بزرگ علی مارہروی، شاہ بشارت اللہ بہرائچی، شاہ نیاز عطا سلونوی، شیخ ظہور الحق پھلواروی۔

ممتاز تلامذہ میں مولانا سید نذیر حسین میاں محدث دہلوی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا سید عالم علی مرادآبادی، مولانا مفتی عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی بڑھانوی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، نواب قطب الدین دہلوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مفتی عنایت اللہ احمد کاکوروی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی ہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب کے تلامذہ میں تنہا مولانا سید نذیر حسین (م ۱۳۲۰ھ) نے دہلی میں سالہا سال حدیث کا درس دیا، آپ کے درس سے متعدد جلیل القدر ناشرین وشارحین حدیث پیدا ہوئے جن میں مولانا عبدالمنان وزیرآبادی کے کثیر التعداد تلامذہ پنجاب میں مصروف درس وافادہ تھے، عارف باللہ مولانا سید عبداللہ غزنوی امرتسری، مولانا شمس الحق ڈیانوی مصنف غایۃ المقصود، مولانا حافظ عبداللہ غازیپوری، مولانا ابراہیم آروی، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی ہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے تلامذہ میں شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی (م ۱۲۹۶ھ) بھی شامل ہیں جن سے ہندوستان کے کبار علمائے حدیث کو شرف تلمذ حاصل ہے اور ان کے ذریعہ سارے

حلقات درس اور مدارس عربیہ انہیں سے شرف انتساب رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی ان کے نامور تلامذہ میں سے ہیں اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری صاحب بذل المجہود کا نام لینا کافی ہے، مولانا خلیل احمد صاحب کے تلامذہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کا نام لینا کافی ہے، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تلامذہ میں مولانا سید احمد حسن امروہوی اور شیخ الحدیث مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے تلامذہ میں مولانا سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں، شاہ صاحب کے علوے مرتبہ، فیض عام اور بلند مرتبہ کے لئے ان کے شاگرد شیخ محسن بن یحیٰی ترہتی کی مشہور کتاب الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی کا مطالعہ معلومات افزا و بصیرت افروز ہے۔

ہم نے یہاں اجمالی طور سے ہندوستان کے ان ممتاز محدثین کے نام کا ذکر کیا ہے جنہوں نے درس و تدریس اور بلند پایہ تصانیف کے ذریعہ پورے برصغیر میں حدیث کی خدمت انجام دی۔

جہاں تک ان حضرات محدثین کی خدمات حدیث کا تعلق ہے ان کی خاصی بڑی تعداد ایسی ہے جنہوں نے حدیث شریف کی خدمت تدریس اور تصنیف دونوں طریقے سے کی، ہمارا موضوع صرف یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد برصغیر کے محدثین نے حدیث کی تدریس میں کیا منہج اور طریقہ اختیار کیا نہ کہ ان کی تصنیفی خدمات اور ان کی عالمانہ تحقیقات کا جائزہ لینا، اگرچہ عمومی طور سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان حضرات محدثین نے جو طریقہ تدریس کا اختیار کیا اکثر و بیشتر ان کی تحقیقات اور شروح حدیث میں بھی ان کے درس حدیث کا منہج بھی ملتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب انفاس العارفین میں درس حدیث کے ان طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے جو حرمین شریفین میں مروج تھے لکھا ہے کہ وہاں حدیث کے پڑھانے کے تین طریقے تھے۔

ایک طریقے کا نام سرد (رواروی) ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ استاذ یا پڑھنے والا کتاب کو

پڑھتا چلا جائے، اس طور پر کہ لغوی مباحث اور فقہی جھگڑوں یا اسماء الرجال وغیرہ کی باتوں سے تعرض نہ کرے۔

دوسرے طریقہ کا نام بحث وحل کا طریقہ ہے، یعنی کسی حدیث کے پڑھنے کے بعد اس کے اجنبی اور نادر الفاظ یا کوئی ترکیبی دشواری ہو، اس پر یا ایسے اسماء سند کے جو غیر معروف ہوں اور ان کا ذکر کم آتا ہو، اسی طرح ایسے اعتراضات جو کھلے طریقے سے وارد ہوتے ہوں یا جن مسائل کا اس حدیث میں صراحتہً تذکرہ کیا گیا ہو ان پر استاذ ٹھہرے اور متوسط طریقے کی گفتگو ان پر کرے اور ان کو حل کرے اس کے بعد آگے بڑھتا جائے۔

تیسرا طریقہ درس کا وہ ہے جس کا نام امعان وتعمق کا طریقہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کے ہر ہر لفظ پر اس کے سارے متعلقات بما لها و ما عليها پر بحث کی جائے اور خوب خوب بحث کی جائے مثلاً جہاں کوئی ذرا اجنبی لفظ آ گیا یا کوئی مشکل ترکیب سامنے آ گئی تو اس کے حل میں شعراء کے کلام سے استشہاد پیش کرے اور اس کے مماثل کلمات ان کے مراد و اشتقاق اور استعمال کے مقامات کو واضح کیا جائے، اسی طرح رجال کے اسماء، جہاں جہاں آئیں ان پر بحث کرنا شروع کرے، ان کے حالات، ان کی سیرت بیان کی جائے اور جس سند کا اس حدیث میں صراحتہً ذکر آیا ہو اس پر گفتگو کرے، جو مسائل غیر منصوصہ پیدا ہوتے ہوں فقہ کی کتابوں کے ان مسائل کا تذکرہ کیا جائے، اسی طرح ذرا ذرا سی مناسبت اور حیلہ سے عجیب وغریب قصے اور نادر حکایات کا دریا بہا دیا جائے۔

اس موخر الذکر طریقہ تدریس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ واعظوں اور قصہ خوانوں کا طریقہ ہے اور مقصود اس سے پڑھانے والوں کا محض اپنی افضلیت کا اظہار ہوتا ہے یا اس سے سوا کوئی اور غرض، والله اعلم، پھر فرماتے ہیں کہ یہ نہ روایت حدیث کا طریقہ ہے اور نہ علم حاصل کرنے کا ذریعہ۔

حضرت شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں: معلوم ہونا چاہئے کہ محدث کا سند کے رجال سے ان لوگوں کے نام کی تصحیح کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ ان کا شمار ثقات میں ہے، خصوصاً صحیحین کے رجال

ہوں یا ان کے سوا صحاح کی کتابوں کے رجال، فقہی جزئیات کے ساتھ مشغول ہونا اور فقہاء کے مذاہب کو بیان کرنا اور ان روایتوں میں تطبیق دینا، روایتوں کے اختلاف کو بیان کرنا، ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دینا، یہ سب لا حاصل فکر وغور اور جزرسی ہے، امت کے ابتدائی طبقات کے لوگ ان امور میں مشغول نہ تھے۔

لیکن بقول مولانا مناظر احسن گیلانی عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کو شاہ صاحب اور ان کے طریقہ تعلیم کا وارث سمجھتے ہیں ان ہی حضرات نے اس طریقہ کو اختیار کیا جس پر شاہ صاحب نے تنقید کی اور اسے لا حاصل قرار دیا، حضرت شاہ صاحب کی رائے سرد والے طریقہ اور بحث وحل کے طریقہ کے بارے میں یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے جنہوں نے حدیث شروع کی ہو مثلاً مشکوٰۃ یا مشارق الانوار شروع کی ہو، یعنی مبتدیوں اور متوسط استعداد والوں کے لئے بحث وحل کا طریقہ مفید ہے۔

شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حرمین شریفین میں بعض چوٹی کے محدثین کا طریقہ یہی تھا کہ مبتدی اور متوسط لوگوں کو حدیث کی مندرجہ بالا کتابیں پڑھانے کے بعد صحاح ستہ ان کے سامنے سرد کے طریقہ سے گذاردی جاتی تھی، شاہ صاحب نے اس کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ تا کہ حدیث کے سننے کا قصہ جلد ختم ہو اور روایت کا مسئلہ لوگ درست کرلیں، باقی تفصیلی بحث کے لئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ باقی مباحث جو حدیث کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں ان کے استاذ ان سے کہہ دیتے تھے کہ حدیث کی شرحوں کی طرف رجوع کرو، کہ اس زمانہ میں اب حدیثوں کے معانی ومطالب کو ضبط وگرفت میں لانا اس کا دارومدار شروح ہی پر رہ گیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق کے تیار کئے ہوئے محدثین میں جن حضرات نے حدیث کی تدریس کا بازار گرم کیا ان میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا نذیر حسین دہلوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری سرفہرست ہیں، ان تین حضرات کے علاوہ بھوپال میں یمن کے ممتاز اور نادرۂ روزگار محدث شیخ حسین محسن یمانی خزرجی کا درس تھا جو اس وقت اپنے محدثانہ طرز خصوصیات اور

علوے اسناد کے لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے عہد میں ممتاز تھا، ان سے استفادہ کرنے والوں میں مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی اور مولانا حیدر حسن خاں تھے جن سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھرپور استفادہ کیا تھا۔

آفتاب رشد و ہدایت مولانا رشید احمد گنگوہی کی شخصیت سیرت و کردار کی پختگی اور اخلاق بلندی اور عوام وخواص دونوں طبقوں کے مرجع ہونے میں غیر معمولی شہرت رکھتی ہے، ہم یہاں صرف ان کے درس حدیث کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جن کے طرز تدریس کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''مولانا گنگوہی اسنادِ حدیث کے متعلق پوری تحقیق فرماتے، اختلافات احادیث اور تعارض کے متعلق مختصر مگر جامع تطبیق فرماتے کہ کوئی الجھن باقی نہ رہے''۔

وہ آگے لکھتے ہیں: ''حضرت امام ربانی صحاح میں سے پہلے عموماً ترمذی شریف شروع کراتے اور مالہ وماعلیہ کی تحقیق کے ساتھ واضح تقریر کر کے طلبہ کے ذہن نشین کرادیتے تھے، حدیث کا ترجمہ اور اس کے مطابق معنی کو سلیس اور عام فہم انداز میں بیان کردیتے، حدیث شریف کے درمیان اگر فی تعارض ہوتا یا کسی حدیث کا قرآن سے تعارض ہوتا تو اس کو رفع فرماتے، بقدر ضرورت اسماء الرجال کا ذکر فرماتے، اس کے بعد حدیث کے باب سے مناسبت بیان کرتے تھے، اسناد میں ضروری جرح وتعدیل فرماتے، باہم عبارت اور سیاق وسباق میں ارتباط مخفی ہوتی تو اس کو کھولتے اور ایک مضمون کا دوسرے مضمون سے ربط دیتے جاتے تھے۔

اصول حدیث اور اصول فقہ کے نکات اور عبارت کے اشارات بھی بیان فرماتے، مشکل مقامات کی طرف متنبہ کر کے کئی کئی بار بیان کرتے۔ (ص ۱۳۳، تذکرۃ الرشید)

ترمذی شریف کے ختم ہونے پر صحاح کی دوسری کتابیں ہوتی تھیں، ان کتابوں کے درس میں حدیث کا ترجمہ نہ ہوتا تھا، صرف جو حدیث نئی یا مصنف کی عبارت آتی تو اس کی توضیح پہلے کی طرح کرتے اور باقی حدیثوں کی قرأت پر اکتفا فرمایا کرتے تھے۔ (ص ۱۳۴)

مولانا عاشق الٰہی مولانا گنگوہی کے اسلوب درس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: امام ربانی ہمیشہ طلبہ کی استعداد کے موافق کلام کرتے، وہ طلبہ کی علمی استعداد اور قابلیت کو بنیادی اہمیت دیتے، مشکل اور پیچیدہ عبارتوں کو آسان الفاظ میں حل کرتے، حدیث سے مسائل کا استنباط واستخراج کرتے اور ائمہ اربعہ کے فقہی مذاہب کے دلائل دینے کے بعد امام ابوحنیفہؒ کے فقہی مسلک کی ترجیح کے دلائل دیتے لیکن یہ نہ تھا کہ کسی امام کے مسلک کے بارے میں کوئی معمولی لفظ بھی زبان سے نکل جائے، اگر کسی طالب کا میلان دیکھتے تو اس کی اصلاح کرتے، یہاں تک کہ نفس تقلید میں بھی تعصب کا حد سے بڑھنا آپ کو پسند نہ تھا، بعض طلبہ تشدد عصبیت میں محدثین سے بدظن ہوجاتے تو امام ربانی فوراً تقریر کا رخ بدل دیتے، جس وقت کسی طالب علم کی زبان سے کسی محدث پر اعتراض یا تنقیص شان کا کلمہ سنتے تو چہرہ پر کراہیت کا اثر پیدا ہوتا اور دوران سبق میں بجائے ترجیح مذہب حنفیہ کے مذاہب دیگر امام بخاری وغیرہ کی وجوہ ترجیح بیان فرمانے لگتے تاکہ طلبہ کو محدثین کے ساتھ حسن ظن پیدا ہوجائے اور جہاں یہ بات پیدا ہوگئی فوراً ترجیح مذہب حنفی کی طرف متوجہ ہوجاتے۔ (ص ۱۳۵، ۱۳۶)

مولانا گنگوہی چونکہ مربی ومرشد بھی تھے اس لئے طلبہ کے اخلاقی اصلاح کی بھی فکر فرماتے، طلبہ کے عقائد اور اعمال کی درستگی کا اہتمام کرتے، دورس حدیث کے وقت یہ پہلو بہت زیادہ قابل ترجیح ہوجاتا تھا، شرک وبدعات کے قلع قمع کرنے کے ساتھ توحید واتباع سنت کی موقع موقع سے ترغیب بھی دیتے، اکثر زبانی نصیحت بھی فرماتے، اس طرح مولانا گنگوہی کے درس سے طلبہ حدیث نبوی کے درس میں علمی اور عملی دونوں میدانوں میں فائدہ اٹھاتے تھے۔

مولانا گنگوہی کے بعد حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کے درس کی شہرت تھوڑی مدت میں بہت زیادہ پھیل گئی ۱۲۸۵ھ میں پہلی مرتبہ مدرسہ مظاہر علوم میں مشکوٰۃ داخل ہوئی ایک سال کے بعد ۱۲۸۶ھ میں بخاری شریف کا بھی افتتاح ہوگیا ۱۲۹۴ھ میں ۲۵ طلبہ نے، اگلے سال ۱۲۹۵ھ میں ۳۸ طلبہ نے حدیث مولانا خلیل احمد صاحب سے پڑھی، مظاہر علوم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۱۴ھ سے ۱۳۴۴ھ تک اکتیس سال کی مدت میں تین سو اکیانوے طلبہ نے صحاح ستہ کا درس لیا،

مولانا کے طرزِ تدریس کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے تلمیذ رشید مولانا محمد زکریا صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا کی تقریر مختصر اور جامع ہوتی تھی، صاف اور عام فہم لفظوں میں عبارت کا ترجمہ کرتے اور مطلب سمجھاتے، اس کے بعد طلبہ کو اعتراضات اور شبہ ظاہر کرنے کا موقع دیتے تھے، صحاح ستہ کے تمام ابواب کے ساتھ آپ کا معاملہ یکساں ہوتا تھا، اس کے برعکس مولانا حسین احمد مدنی کے درس حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک ایک مسئلہ پر بسا اوقات تین تین چار چار دن مسلسل (۶۰ منٹ کے گھنٹے ہوتے) تقریر جاری رہتی اور مسئلہ کا مالہ وما علیہ ائمہ کے اختلافات اوران کے دلائل وما خذ متن واسنادرجال کی بحثیں، برجستہ، اس سب پر مولانا کی قرأت، مخصوص دلکش لہجہ اور دارالحدیث کی روحانی و پرسکینت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے، اور اس وقت بھی گویا بالسند المتصل الی امیر المومنین فی الحدیث کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، درمیان میں طلبہ کے سوالات کا (جن میں غیر متعلق بھی ہوتے تھے) تحمل کے ساتھ جواب دیتے تھے، آخری سال میں مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ عصر کے بعد بھی درس، عشاء کے بعد دیر رات تک درس، صبح کی نماز کے بعد درس، اچھے اچھے مستعد طالب علموں کی ہمت جواب دے جاتی لیکن مولانا کی مستعدی، نشاط اور قوت میں فرق نہ آتا، یہ ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا۔

چوں کہ مدارس دینیہ کا تعلق معاشرہ سے ہے اس لیے باہر کے اثرات مدرسین پر بھی ہونے لازمی تھے۔

ہندوستان کے مشہور مورخ اور سوانح نگار مولانا سید عبدالحی حسنی نے دہلی اور اس کے اطراف کے سفر میں مدارس کا دورہ کرتے ہوئے جو حالات بچشم خود دیکھے ان میں انہوں نے لکھا ہے کہ دہلی اس زمانہ میں یعنی بیسوی صدی کے آغاز میں مختلف الخیال واعظین، مناظرین اور مدرسین کا اکھاڑا بنا ہوا تھا، فقہی مسائل اور عقائد کے مناظرہ کا بازار گرم تھا، ہر فرقہ والا دوسرے فرقہ والے کی شد ومد کے ساتھ تردید کرتا تھا، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک کے درمیان دہلی میں تھے، وہ فرماتے ہیں: ایک فریق کی بات سن کر معلوم ہوتا کہ اس کے علاوہ سب

مشرک ہیں، دوسرا فریق پہلے فریق کو کافر کہتا، مدرسہ امینیہ میں مولانا انور شاہ کشمیری کے درس میں حنفی مسلک کے طلبہ اور میاں نذیر حسین کا درس اہل حدیث طلبہ کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا، مسلکی اختلافات مدارس کی چہار دیواری میں محدود نہ رہ کر شارع عام پر آ گئے تھے، بعض مقامات پر تو عدالتوں تک میں مقدمات لڑے جا رہے تھے، انتشار کے اس دور میں ندوۃ العلماء کی دعوت سامنے آئی، اگر چہ اس کے منہج دعوت کو پھیلنے میں وقت لگا لیکن اس دعوت نے ملک گیر پیمانے پر علماء کو متوجہ کیا اور بڑی حد تک مسلکی حدت میں تخفیف ہونے لگی، اعتدال کی طرف لانے میں ندوۃ العلماء کو بہت کچھ سننا پڑا، اس پر الزامات بھی لگے لیکن یہ حقیقت تسلیم کرلی گئی کہ مسلکی تعصب سے بجز انتشار کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ندوۃ العلماء کے نامور فرزند اور سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی کی معتدل تحریروں اور ان کی مؤثر وطاقتور شخصیت نے برصغیر کی تمام دینی جماعتوں اور مسلکوں سے رابطہ رکھنے اور ہندوستان کے تمام مسلکوں کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا، ان کے نامور استاذ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر لکھ کر عملی طور پر اس کی مثال پیش کر دی کہ تعصب سے پاک ہو کر کس طرح غیر جانبداری اور انصاف سے تاریخ وتذکرہ اور سوانح نگاری کی جاسکتی ہے، ان کے قابل فخر فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تیرہ صدی پر محیط دعوت وعزیمت اور تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کو منصفانہ طریقہ سے غیر جانبدار ہو کر جس طرح پیش کیا ہے وہ اسلامی تاریخ نویسی کا کامیاب نمونہ ہے۔

ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حدیث کے نصاب اور اس کی تدریس کے بارے میں جو طریقہ اختیار کیا وہ دراصل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا منہج اور طریقہ کار ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے تحریر فرمایا کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اس کی تحقیقات سے اتنا متفق نہیں ہوا جتنا شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی کتابوں سے، اگر اپنے فکر ومسلک کے لئے کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے تو میں انہی کا نام لے سکتا ہوں کہ در حقیقت ہمارا تعلیمی وفکری نسب وشجرہ انہیں پر ختم ہوتا ہے، حضرت مولانا علی میاں کی ذہنی وفکری تربیت

اوران کی سیرت وشخصیت کی تشکیل میں ان کے خاندانی بزرگوں اور شخصیات کا اثر ہے، یہ گھرانہ شروع ہی سے اعتدال اور جامعیت کا حامل ہے۔

مولانا نے اپنے استاذ مولانا حیدر حسن خاں سے حدیث شریف بڑے اہتمام سے پڑھی، مولانا نے ان کے محدثانہ طرز تدریس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا درس عملی تھا، اور طلبہ اس میں صرف سامع یا مجلس وعظ کے حاضرین کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، فن حدیث کی بنیادی کتابیں، مراجع، رجال واصول حدیث اور متعلقہ فنون کی کتابیں پاس الماری میں ہوتیں، طلبہ کو حکم ہوتا کہ فلاں کتاب لاؤ، فلاں جگہ سے کھولو اور پڑھو، ایک حدیث یا ایک مسئلہ کے لیے دس دس کتابیں کھل جاتیں، جرح وتعدیل اور رجال کی کتابوں میں سے راویوں کا حال دیکھا جاتا، اپنے مذہب کی تائید کے لیے دوسری کتابوں سے دلائل اور نقول پیش کی جاتیں ان پر آزادانہ بحث ہوتی، طلبا آزادی و بے تکلفی کے ساتھ اس بحث و مذاکرہ میں حصہ لیتے (پرانے چراغ ص:۱۹۲) مولانا کے یہاں مستند کتابوں کا حوالہ، متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی مستند کتابوں کے حوالہ کا بڑا اہتمام تھا، اس درس کی برکت تھی کہ حدیث سے مناسبت اور اس کی بنیادی کتابوں سے ذاتی واقفیت اور ان کے طبقات اور درجات سے پوری آگاہی، اسماء الرجال اور اصول حدیث کی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی (ص ۱۹۲،۱۹۳، پرانے چراغ) اس کا تذکرہ ضروری ہے کہ ندوۃ العلماء نے اپنے یہاں حدیث کا جو نصاب رکھا ہے وہ بڑا جامع اور طالب علم کی عمر وصلاحیت اور اس کی سیرت و اخلاق کی تشکیل میں ممد ومعاون ہے، مثال کے طور پر عمر کے جس مرحلے میں طالب علم کی سیرت وکردار اور اخلاق کی تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے اس دور میں تہذیب الاخلاق جیسی کتاب کو درس میں رکھا گیا ہے تا کہ بنیادی عقائد اور اخلاق و معاملات کے بارے میں اس کی ذہن سازی ہو، پھر ریاض الصالحین پڑھائی جاتی ہے، جس میں کسی قدر وضاحت سے عقائد واخلاق، معاملات وعبادات کا ذکر تفصیل سے ہے، پھر مشکوۃ المصابیح اور ترمذی کی تدریس میں فقہی بحثیں انحصار وجامعیت سے کی جاتی ہیں، کتابوں کے حوالے دیئے جاتے ہیں، ائمہ اربعہ کے فقہی مسلک سے متعلق دلائل دیئے جاتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کے فضلاء نے نئے حالات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر حدیث کے موضوع پر جو کتابیں مرتب کی ہیں ان میں مولانا سید محمد لقمان اعظمی کی دراسات تربویۃ فی الاحادیث النبویۃ ہے جو سعودی عرب میں ثانویہ اور کلیات کے طلبہ کے لیے دوالگ الگ معیار کی ہیں، دونوں کتابوں میں مصنف پہلے حدیث درج کر کے اس کے مفہوم ومعنی کی وضاحت کرتے اور اس کی تائید میں قرآنی آیات پیش کرتے ہیں۔

ہمارے اسلاف نے ان آیات واحادیث کی جو شرح کی ہے اس میں سے منتخب اور راجح پہلو کو لیتے ہیں، پھر حدیث کے فقہی پہلو کا عنوان قائم کر کے حدیث کے اخلاقی پہلو اور عقائد سے متعلق اہم عناصر کو بیان کرتے ہیں، اس کے بعد موجودہ حالات میں اس حدیث سے ہم کو کیا رہنمائی ملتی ہے، معاشرہ کے امراض کو دور کرنے کی کیا تدبیر بتائی گئی ہے اس کو اختصار سے عام فہم اسلوب میں بتاتے ہیں۔

یہ دونوں کتاب ''تدبر حدیث'' اول ودوم کے نام سے ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں، دوسری کتاب ''روائع الاخلاق'' کے نام سے دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولوی ابوسحبان روح القدس نے ''تہذیب الأخلاق'' کی شرح کے طور پر لکھی ہے، لیکن اس کا منہج وہی ہے جو'' دراسات فی الاحادیث النبویۃ'' کا ہے۔



دینی مدارس میں تدریس حدیث

ایک تجزیاتی مطالعہ

از: مولانا اشہد رفیق ندوی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تیرہویں صدی ہجری ہندوستان میں علم حدیث کے باب میں انقلابی صدی کہلاتی ہے۔ کیونکہ اسی زمانہ میں باقاعدہ دینی اداروں کا قیام عمل میں آیا اور علم حدیث کی تعلیم و تدریس کا ایک مبسوط نظام برپا ہوا، مدارس کے قیام سے پہلے ائمہ و محدثین کے انفرادی حلقے تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) رحمہما اللہ نے امہات کتب حدیث کو ہندوستان میں متعارف کرانے کی جس مبارک کوشش کا آغاز کیا تھا، ان مدارس نے اس عظیم الشان مشن کو اپنے دوش ناتواں پر سجا کر کامیابی سے ہمکنار کیا۔ آج چہار سو علم حدیث کا جو غلغلہ سنائی دیتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انہی مدارس دینیہ کا مرہون منت ہے۔

علم حدیث کے باب میں دینی مدارس کی خدمات مختلف النوع ہیں، ملت کے نونہالوں کو علوم نبوت سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ تالیف، تصنیف، تحقیق، تبلیغ اور تدریس کے میدان میں بے شمار لائق وفائق افراد تیار کئے۔ اس مقالہ میں دیگر پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف تدریسی خدمات سے تعرض کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ تدریس کی تاریخ، مرحلہ وار تبدیلیاں، مروجہ نصاب اور طریقہ تدریس کا تجزیہ کیا جائے۔ نیز اسے مزید مفید اور مؤثر بنانے کے لئے آخر میں کچھ تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

ہندوستان میں مدارس کی تعداد ہزاروں میں ہے، سب کا جائزہ بیک وقت ممکن نہیں، اس لیے فکرو مزاج اور مسلک ومشرب کے لحاظ سے صرف چھ نمائندہ مدارس کو اس تجزیہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے اور انہی کے نصاب تعلیم اور دیگر مطبوعہ لٹریچر کی روشنی میں یہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ نمائندہ مدارس درج ذیل ہیں۔

(۱) دارالعلوم دیوبند (۲) ندوۃ العلماء، لکھنؤ (۳) مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (۴) جامعۃ الفلاح بلریا گنج (۵) جامعہ سلفیہ بنارس (۶) جامعہ اشرفیہ مبارک پور

مدارس میں تدریس حدیث:

مشہور بات ہے کہ نصابی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں علم حدیث بہت مقبول مضمون نہ تھا۔ اس وقت زیادہ تر مضامین انتظامی ضروریات کے تحت پڑھائے جاتے تھے۔ تعلیمی نصاب کے لئے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے صحاح ستہ کو متعارف کرانے کی کوشش کی۔ ایک صدی بعد یہ کوشش حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے زمانے میں بارآور ہونی شروع ہوئی۔ جب انہوں نے مروجہ علوم وفنون کا بے لاگ تجزیہ کر کے قومی وملی ضروریات کے تحت نیا نصاب مدون کیا اور اس میں قرآن وحدیث کی تدریس کو بنیادی اہمیت دی اور موطأ امام مالک کے ساتھ صحاح ستہ کے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، حضرت شاہ ولی اللہ کی نامور اولاد نے اسے مقبول عام بنانے کے لیے بڑے جتن کیے مگر بعد کے ادوار میں تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ وہی نصاب مقبول رہا جسے عرف عام میں "درس نظامی" کہا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند ومظاہر العلوم سہارنپور کے قیام کے ساتھ تاریخ مدارس میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ارباب دیوبند نے تدوین نصاب کے وقت درس نظامی کی مکمل پیروی کرنے کے بجائے نصاب ولی اللہی کو بھی پیش نظر رکھا اور اس کا قابل قدر حصہ اپنے نصاب میں مدغم کیا، خاص طور سے علم حدیث کی امہات کتب کو شامل نصاب کر کے درس نظامی کو متوازن بنانے کی سعادت حاصل کی۔ اس نصاب کا امتیاز یہ تھا کہ اس میں پہلی بار صحاح ستہ کو باقاعدہ جگہ ملی، اس کے علاوہ مشکوٰۃ کی تدریس کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی جو پہلے سے درس نظامی کا حصہ تھی۔

تحریک ندوہ نصاب تعلیم میں اصلاح اور "قدیم صالح وجدید نافع" کے امتزاج کے لیے

برپا ہوئی، اس نے تعلیم وتدریس کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کر کے ایک نیا نصاب مدون کیا، اس میں بھی امہات کتب حدیث کو مناسب جگہ دی گئی۔ البتہ تمام احادیث کو ایک ساتھ پڑھادینے کے بجائے طلبہ کی ضرورت ولیاقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مضمون کو پورے دورانیہ تعلیم میں پھیلا دیا گیا ہے۔ چنانچہ ثانویہ خامسہ سے شروع ہو کر ۹ برس کی مدت تعلیم میں ہر سال مادہ حدیث کو ایک لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ اس طرح ایک متوازی نصاب وجود میں آ گیا۔

مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح نے دیوبند اور ندوہ دونوں کے نصاب ہائے تعلیم کو چھوڑ کر ایک نئے نصاب تعلیم کی بنیاد ڈالی، جس کا امتیازی وصف قرآن مجید کی محققانہ تعلیم ہے۔ اس میں دیگر علوم وفنون کو قرآن مجید کی تشریح اور معاون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ ان اداروں میں بھی امہات کتب حدیث کی تعلیم کو اہمیت دی گئی اور ہر کتاب کے کچھ منتخب ابواب کو نصاب میں جگہ دی گئی۔ مدرسۃ الاصلاح میں موطا امام مالک اور جامعۃ الفلاح میں بلوغ المرام کے بالاستیعاب درس کا نظم رکھا گیا البتہ جامعۃ الفلاح نے اختصاص فی الحدیث کے طلبہ کے لئے ایک مبسوط نصاب مقرر کیا ہے جس میں متون امہات الکتب کے ساتھ تاریخ، تدوین، جرح وتعدیل، تخریج، نقد اور شبہات حول الحدیث جیسے موضوعات پر معاصر مصنفین کی کتابیں شامل ہیں۔

جامعہ سلفیہ بنارس اور اس کے زیر اثر مدارس تحریک اہل حدیث کی کوششوں کا ثمرہ ہیں، حدیث سے خصوصی لگاؤ کی وجہ سے ان اداروں میں متن حدیث کی تفہیم کے ساتھ تاریخ حدیث، علوم حدیث اور اصول حدیث پر بھی خصوصی توجہ دی گئی اور ندوۃ العلماء کے طرز پر امہات کتب حدیث کو تمام مراحل تعلیم میں تقسیم کرنے کے ساتھ علوم الحدیث کی مختلف جہات سے طلبہ کو روشناس کرانے کی نئی طرح ڈالی گئی ہے۔

جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا نصاب حدیث ندوۃ العلماء کے طرز پر ہے، یہاں بھی امہات کتب حدیث وعلوم حدیث کی مختلف مراحل میں تعلیم ہوتی ہے۔

نصاب تدریس حدیث ایک نظر میں:

ان مدارس نے کتب حدیث کو نصاب میں کس ترتیب سے رکھا ہے؟ کس کلاس میں کتنا حصہ رکھا ہے؟ اوران کے لیے کتنا وقت مخصوص کیا ہے، اس چارٹ میں یک نظر دیکھا جاسکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند

مراحل تعلیم	مدت تعلیم	ہفتہ میں گھنٹیاں	کلاس	متن حدیث	علوم حدیث
درجات عربیہ	۸سال	۳	سوم	مشکوۃ الآثار مکمل (ادب کے ساتھ)	
(فضیلت)		۳	چہارم	الفیۃ الحدیث از ابتداء تا کتاب العلم	
				کتاب النکاح تا ختم کتاب	
			پنجم	(بلاغت کے ساتھ)	
		x	ششم	کچھ نہیں	
		x	ہفتم	کچھ نہیں	
		۱۸		مشکوۃ المصابیح از ابتداء تا کتاب	مع شرح نخبۃ الفکر،
		تمام		الصلوۃ، کتاب الزکوۃ تا کتاب	مقدمہ شیخ عبدالحق
		اوقات		الاشربہ، کتاب اللباس تا ختم کتاب	دہلوی
			ہشتم	صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی،	
				موطاامام مالک، سنن ابی داؤد،	
				سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن طحاوی،	
				شمائل ترمذی، موطاامام محمد	
				(تمام کتابیں مکمل)	

ندوۃ العلماء لکھنؤ

مراحل تعلیم	مدت تعلیم	ہفتہ میں گھنٹیاں	کلاس	متن حدیث	علوم حدیث
درجات ثانوی درجات عالیہ درجات علیا مجموعی	۶ سال ۴ سال ۲ سال ۱۲ سال	۳ ۴=۳+۱	ثانویہ خامسہ ثانویہ سادسہ	تہذیب الاخلاق ریاض الصالحین	اصطلاحات حدیث
		۶=۵×۲	عالیہ اول	مشکوٰۃ المصابیح (اول): کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب فضائل القرآن، کتاب البیوع۔	مقدمہ شیخ عبدالحق دہلوی
		۹=۸+۱	عالیہ ثانیہ	مشکوٰۃ المصابیح (دوم) کتاب النکاح، کتاب العتق، کتاب القصاص، کتاب الحدود، کتاب الجہاد، کتاب الامارات والقضاء، کتاب الصید والذبائح، کتاب الاطعمہ، کتاب الطب والرقی، کتاب الفتن۔	نخبۃ الفکر
		۹=۳+۶	عالیہ ثالثہ	جامع ترمذی جلد دوم۔	
		۳۶	عالیہ رابعہ	بخاری جلد اول۔ کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب المناسک، مع ابواب العمرہ، فضائل المدینہ، کتاب بدء الخلق، کتاب الانبیاء۔ جلد ثانی: کتاب المغازی، کتاب الحیل، کتاب التعبیر، کتاب الفتن، کتاب الشہادات، کتاب الصلح۔ صحیح مسلم: المقدمہ، کتاب الایمان، کتاب الزکوٰۃ، کتاب اللباس والزینۃ، کتاب الجامع۔ سنن ابی داؤد: کتاب الادب، کتاب السنۃ، کتاب الجہاد۔ موطا امام مالک: کتاب الصوم۔	
		۸	علیا اولیٰ	صحیح مسلم جزء اول کامل سوائے مقدمہ اور کتاب الزکوٰۃ، جزء ثانی: کتاب الادب تا کتاب اللباس۔	
		۱۸	علیا ثانیہ	صحیح بخاری کامل	

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڑھ

مراحل تعلیم	مدت تعلیم	ہفتہ میں گھنٹیاں	کلاس	متن حدیث	علوم حدیث
فضیلت	۸ سال	۱×۵=۶	عربی چہارم	موطا امام مالک (منتخب ابواب)	تیسیر اصول الحدیث، تاریخ حدیث پر لیکچرز، ایضاً
		۱×۵=۶	عربی پنجم	موطا امام مالک (منتخب ابواب)	
		۱×۵=۶	عربی ششم	صحیح مسلم (منتخب ابواب)	
		۶	عربی ہفتم	جامع ترمذی (منتخب ابواب)	
		۴	عربی ہشتم	صحیح بخاری (منتخب ابواب)	

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

مراحل تعلیم	مدت تعلیم	ہفتہ میں گھنٹیاں	کلاس	متن حدیث	علوم حدیث
ثانوی	۳ سال	۶	عربی سوم	بلوغ المرام (نصف اول)	تیسیر مصطلح الحدیث
		۳×۶=۹	عربی چہارم	بلوغ المرام (نصف آخر)	
متوسط	۲ سال	۶	عربی پنجم	موطا امام مالک (منتخب ابواب)	
		۶	عربی ششم	سنن ابی داؤد (منتخب ابواب)	
عالمیت	۲ سال	۶	عربی ہفتم	صحیح مسلم (منتخب ابواب)	
		۶	عربی ہشتم	صحیح بخاری (منتخب ابواب)	
فضیلت	۲ سال			اختصاص فی الحدیث: مصطلح الحدیث، تدوین حدیث، فقہ الحدیث، جرح و تعدیل، شبہات حول الحدیث، تخریج الحدیث، نقد الحدیث وغیرہ پر اہم معیاری اور جدید کتابیں شامل نصاب ہیں۔	

جامعہ سلفیہ بنارس

مراحل تعلیم	مدت تعلیم	ہفتہ میں گھنٹیاں	کلاس	متن حدیث	علوم حدیث
متوسط	۳ سال	۱	متوسطہ سوم	چالیس احادیث کا ترجمہ حفظ	
ثانویہ	۲ سال	۱×۵=۵	ثانویہ اولیٰ	بلوغ المرام	نخبۃ الفکر
عالمیت	۲ سال	۱×۵=۵	ثانویہ دوم	مشکوٰۃ اول	توضیح الافکار من اطیب المنح، نزہۃ النظر، ارشاد، التکمیل فی الجرح والتعدیل، تدریب الراوی اول دوم
فضیلت	۲ سال	۱×۵=۶	عالمیہ اول	مشکوٰۃ دوم	
	۱۰ سال	۵	عالمیہ دوم	سنن ترمذی اول، سنن نسائی دوم	
			فضیلت اول	سنن ابی داؤد اول، سنن نسائی دوم، موطا امام مالک	
		۴	فضیلت دوم	بخاری اول، مسلم اول	
		۴	فضیلت سوم	بخاری دوم، مسلم دوم	

دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ

مراحل تعلیم	مدت تعلیم	ہفتہ میں گھنٹیاں	کلاس	متن حدیث	علوم حدیث
ثانویہ	۵ سال	۳	ثانویہ خامسہ	موطا امام محمد	
		۶	عالیہ اولیٰ	مشکوٰۃ: کتاب الآداب، کتاب الرقاق، کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الطہارۃ۔	
عالیہ	۳ سال				
		۷	عالیہ ثانیہ	مشکوٰۃ: کتاب المناسک، کتاب البیوع، کتاب النکاح، کتاب الزکوٰۃ: کتاب اللباس، کتاب الفتن تا آخر الکتاب۔	مقدمہ اصول حدیث
علیا	۲ سال ۵ سال	۱۲	عالیہ رابعہ	بخاری: کتاب الایمان، کتاب العلم، مسلم مقدمہ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصیام، سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، کتاب الخراج جامع ترمذی، جزء اول مکمل مع شمائل ترمذی	مقدمہ ابن صلاح او تقریب النواوی تاریخ الحدیث وسیر المحدثین
		۸	علیا اولیٰ	صحیح مسلم اول: باستثناء کتاب الزکوٰۃ و کتاب الصوم، صحیح مسلم جلد دوم کتاب الفتن سے آخر تک، سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ و کتاب الحدود۔	
			علیا ثانیہ	صحیح بخاری مکمل سوا کتاب الایمان و کتاب العلم، سنن نسائی کتاب الصید و الذبائح سے آخر تک، سنن ابن ماجہ باب اتباع سنۃ سے ابواب العلم تک اور ابواب الفتن سے آخر تک	

تجزیہ:

اس خاکے کا تقابلی تجزیہ کرنے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس میں کم از کم تین طرح کا نصاب اور طریقہ تدریس رائج ہے۔

دورۂ حدیث:

دارالعلوم دیوبند میں الفیۃ الحدیث اور مشکوٰۃ عالمیت کے ابتدائی درجات میں پڑھانے کے

بعد درمیانی دو برسوں میں حدیث کی بالکل تعلیم نہیں ہوتی، پھر آخری سال پوری طرح تدریس حدیث کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ جس میں صحاح ستہ کے ساتھ موطا امام مالک اور موطا امام محمد کا بالاستیعاب درس ہوتا ہے، ان کتابوں میں تقریباً چالیس ہزار احادیث ہیں جو پانچ ہزار سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ طلبہ واساتذہ شب و روز مشقت کر کے یہ نصاب مکمل کرتے ہیں۔

اس نصاب اور طریقہ تدریس کی افادیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس طرح طلبہ کی پورے ذخیرہ حدیث پر نظر ہو جاتی ہے، بنیادی مسائل واحکام سے طلبہ چوں کہ پہلے سے واقف ہوتے ہیں، اس لیے متون کا سرسری اعادہ ہی مسائل کو مستحضر کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

پریس کی ایجاد سے پہلے تدریس حدیث کے ضمن میں قرأت والقاء کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ معلم و متعلم دونوں پہلے سے پختہ علم و شعور رکھتے تھے۔ انھیں معانی و مطالب کی توضیح وتفصیل کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے لیے متون کی رواں خواندگی کافی ہوتی تھی۔ یہ نصاب شاید اسی عہد کا نمائندہ ہے۔

اس نصاب اور طریقہ تدریس پر ہر زمانہ میں شدید تنقیدیں ہوئی ہیں، علامہ رشید رضا مصری دیوبند کا دورہ کر کے لوٹے تو اس کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ دورہ حدیث کے بارے میں فرمایا:

پاکستان کے مشہور عالم دین مولانا ابو عمار زاہد الراشدی فرماتے ہیں ''دورہ حدیث کے طلبہ کی غالب اکثریت موجودہ طرز پر احادیث کے مضامین کا ادراک نہیں کر پاتی۔ وہ حدیث کے اتنے بڑے ذخیرہ سے یوں گزر جاتے ہیں جیسے کوئی شخص نیم خوابی کی حالت میں اونگھتے ہوئے ایک باغ سے گزر جائے'' حلقہ دیوبند کے ایک نامور عالم مولانا تقی عثمانی بھی اس سے مطمئن نہیں ہیں، وہ فرماتے ہیں ''دورہ حدیث کے لیے ایک سال کے مختصر وقت میں حدیث پڑھنے پڑھانے کا حق ادا نہیں ہوتا، عموماً یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے معدودے چند ابواب تحقیق وتفصیل کے ساتھ مکمل ہو پاتے ہیں کہ سال ختم ہونے لگتا ہے، اس کے بعد کے حصے تکمیل نصاب کی بھاگ دوڑ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ استاد و شاگرد آخر سال میں انتہائی بھاگ دوڑ پر مجبور ہو جاتے ہیں، حالانکہ صحیح بخاری کا کوئی حصہ

ایسا نہیں ہے جسے رواروی میں گزار دیا جائے۔'' (ہمارا تعلیمی نظام ص ۱۰۵)

دوسرا طریقہ تدریس مدرسۃ الاصلاح کا ہے، جو امہات کتب حدیث میں چند کتابوں کا انتخاب اور ان منتخب کتابوں کے کچھ منتخب ابواب کی تدریس کا نظم کرتے ہیں، تاریخ و تدوین کے موضوعات پر لکچرز کا اہتمام ہوتا ہے اور اصول حدیث کے موضوع پر ایک بہت مختصر رسالہ تیسیر اصول الحدیث مرتبہ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی شامل نصاب ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا اس مکتبہ فکر کا امتیازی وصف قرآن مجید سے شدت اعتناء ہے۔ نصاب تعلیم میں اسے مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ احادیث کی جانب اعتناء میں کمی کا ہمیشہ اس پر الزام عائد ہوتا رہا ہے۔ حدیث کے نصاب میں انتخاب در انتخاب کی پالیسی کی وجہ سے اسے وہ جگہ نہیں مل پائی جیسا کہ اس جلیل القدر علم کا حق ہے۔ جامعۃ الفلاح بلریا گنج کا اختصاص بھی قرآن مجید کی محققانہ تعلیم ہے مگر اس نے بالخصوص فضیلت کے درجات کے لیے بہت ہی جامع و متوازن نصاب تیار کیا ہے جس میں تدریس متون کے ساتھ حدیث کی تاریخ، تدوین، اصول، جرح و تعدیل، فقہ الحدیث، نقد الحدیث، شبہات حول الحدیث وغیرہ پر جتنا مواد شامل کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے مدرسہ نے شامل کیا ہے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ سلفیہ بنارس اور جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے نصابات میں ایک چیز مشترک ہے، یہ مدارس تقریباً تمام امہات کتب حدیث کی تدریس کا ہر تعلیمی مرحلہ میں اہتمام کرتے ہیں ان اداروں میں بخاری و مسلم مکمل پڑھائی جاتی ہیں۔ کچھ کتابوں کا زیادہ تر حصہ پڑھایا جاتا ہے اور کچھ کتابوں کے منتخب ابواب پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس تیسرے طبقہ میں علوم الحدیث پر سب سے زیادہ توجہ جامعہ سلفیہ کے نصاب میں دی گئی ہے۔ متن حدیث کے ساتھ ہر تعلیمی سال میں ان کے یہاں اصول حدیث و علوم حدیث پر بھی کوئی کتاب ضرور شامل ہے جو تاریخ حدیث، علوم حدیث اور اصول حدیث کی مختلف جہات پر محیط ہے۔

مروجہ نصاب تعلیم کی صورت حال یہ ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ صورت حال بالکل اطمینان بخش ہے یا اس میں مزید بہتری لانے کی گنجائش ہے۔ اگر علم حدیث کے قیمتی ذخیرہ، اس سے متعلق علوم و

فنون کی مختلف جہات اور تقاضوں نیز معاصر عہد میں تدریس وطریقہ میں جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کی روشنی میں ان کا تجزیہ کیا جائے تو ابھی بہتری لانے کی کافی گنجائش نظر آتی ہے۔

ماہرین تعلیمات کا کہنا ہے کہ ہر علم میں دس سال کے اندر دو گنا اضافہ ہو جاتا ہے، متون حدیث میں اضافہ کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں مگر حدیث کا علم یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، کئی نئے علم وفن حدیث کی وجہ سے وجود میں آئے۔ پچھلی چند دہائیوں میں اس موضوع پر غیر معمولی کام ہوا ہے۔ مروجہ نصاب تعلیم میں متون کی خواندگی، ان کی تفہیم وتوضیح اور کچھ اصولی مباحث کی تعلیم پر زیادہ زور ہے۔ ان تحقیقات ونگارشات سے واقفیت کا شوق وولولہ خال خال ہی پایا جاتا ہے۔ جبکہ علم حدیث کی تدریس کا حق ادا کرنے لیے ضروری ہے کہ طلبہ واساتذہ کو مدرساتی تعلیمی مرحلہ میں ان سے واقفیت ہو جائے۔

متون کی حفاظت اور ان کا استحضار تدریس حدیث کا محض ایک پہلو ہے، کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود نصاب تعلیم میں ان کو مناسب جگہ نہیں مل سکی، نصاب تعلیم وہی مکمل ومفید مانا جاتا ہے جس میں مضمون کا مقصد، افادیت، مطلوبہ مقدار، وقت اور طریقہ کار واضح طور پر متعین ہوں اور مشاورت کے ذریعہ یہ امور انجام دیئے گئے ہوں۔

علم حدیث کا نصاب مقرر کرتے وقت کم از کم جن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہو سکتی ہیں:

۱- مناسب مقدار میں متن کی خواندگی، صحیح عبارت اور صحیح ترجمہ کی مشق

۲- منتخب احادیث کا حفظ

۳- مفردات، تراکیب اور اشارات کی توضیح

۴- اوامر ونواہی کا استنباط وتشریح اس طرز پر کی جائے کہ تعلیمات رسول کا مدعا واضح طور پر طلبہ کو معلوم ہو جائے اور اس سے اسلام کے مکمل نظام حیات ہونے کا تصور سامنے آئے اور انسانی معاشرے کے ہر گوشے میں ان سے رہنمائی ملے۔

۵- عصری مسائل اور چیلنجز کا تعلیمات رسول ﷺ کی روشنی میں شافی ومسکت جواب دینے کی مشق

۶-مسائل کے استخراج واستنباط میں قرآن وسنت کی حقیقی روح پیش نظر ہو، اور جو فطری نتیجہ برآمد ہو وہی پیش کیا جائے، اس کی پوری احتیاط کی جائے کہ مسلکی تفوق ثابت کرنے کی کوشش میں روح حدیث مجروح نہ ہو۔

۷-امہات کتب حدیث اوران کے عالی مرتبت مصنفین کے تعارف وامتیازات پر گفتگو۔

۸-علم حدیث کی تاریخ، اصطلاحات اوراصول پر خاطر خواہ مواد شامل کیا جائے، اس ضمن میں اصول جرح وتعدیل کا بھرپور اہتمام ہونا چاہئے۔

۹-حدیث کے استناد کو منکرین ومستشرقین نے مشکوک بنانے کی ناکام کوشش کی ہے، طلبہ علوم نبوت کو اس کی بھرپور آگاہی دلائی جائے۔ اس کے تدارک کی تدابیر سمجھائی جائیں۔

ان نکات کی روشنی میں مذکورہ نصاب تعلیم کا تجزیہ کیا جائے تو خود بخود محسوس ہوگا کہ تدریس حدیث کے نصاب کو مزید بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے ابھی کافی گنجائش ہے۔ نصاب تعلیم پر تقریباً ایک صدی سے گفتگو ہورہی ہے، مگر اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہورہے ہیں، علوم وفنون میں روز افزوں اضافہ اور عصری ضروریات اور تقاضوں کے پیش نظر نصاب کو مزید بہتر بنانے کے لیے اگر کسی گوشے سے مشورہ آتا ہے تو اسے درخور اعتنا سمجھنے کے بجائے مدارس کا ایک مخصوص گروہ، تابناک ماضی اور برگزیدہ شخصیات کا حوالہ دے کر ان مخلصین کی نیتوں پر شبہ ظاہر کرکے قیمتی تجاویز کو مشکوک بنادیتا ہے۔ حالانکہ ماضی کی فتح مندیوں کا حوالہ دے کر مستقبل کو محفوظ سمجھ لینا مثبت اور تعمیری سوچ کی غمازی نہیں کرتا۔

نصاب سازی نظام تعلیم کا بنیادی عنصر ہے، جواب ایک مستقل علم بن گیا ہے۔ جس میں تعلیم وتدریس کی تمام ضروریات اور تقاضوں کو مدنظر رکھ کر مضامین کی تعیین اور طریقہ تدریس کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تدوین نصاب کے وقت ان ماہرین سے بھی استفادہ کیا جائے تاکہ ہمارا تعلیمی نظام مزید پختہ اور فعال بن سکے۔



حیدرآباد کے اہم حدیثی مراکز

از: مولانا ڈاکٹر شفیع احمد ہاشم ندوی

حیدرآباد ایک قدیم تہذیبی وثقافتی شہر ہے، صدیوں سے علم وفن کا مرکز رہا ہے اور اہل علم ودانش کی آماجگاہ ہے، یہاں کے امراء اور فرمانرواؤں کی علم دوستی اور علماء کی قدر دانی پوری دنیا میں معروف ہے بلکہ خلیجی ملکوں میں پٹرول کی دریافت سے پہلے ریاست حیدرآباد عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں ایک دولت مند مسلم ملک اور علم پرور حکومت کے طور پر جانی جاتی تھی، یہاں کے اہل علم اور باذوق حضرات اہم اور نادر مخطوطات کی تحصیل کے لیے سرگرداں رہتے تھے، اور خطیر رقم ادا کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، یہ شہر اپنی گوناگوں مصروفیات، علمی بحث وتحقیق اور علوم وفنون کے ترجمہ میں ہارون رشید کے عہد کی یاد دلاتا ہے، علم کلام، سیرت وسوانح اور تفسیر وفقہ کے موضوعات پر سیکڑوں تصانیف کی اشاعت حیدرآباد کی علم پروری کی منہ بولتی تصویر ہے۔

چودہویں صدی ہجری میں حیدرآباد نہ صرف جنوبی ہند بلکہ برصغیر ہند وپاک میں علم حدیث کے فروغ اور نشرواشاعت کا اہم مرکز رہا ہے۔ زیر مطالعہ موضوع کے تحت میں نے علم حدیث میں حیدرآباد کی خدمات کا تین پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔

۱۔ جامعہ نظامیہ جہاں محدثین عظام اور شیوخ نے تشنگان علم حدیث کو اپنے وقیع اور قیمتی فرمودات اور تشریحات سے سیراب کیا۔

۲۔ علم حدیث کی اہم تصنیفات وتعلیقات اور حواشی جو حیدرآباد میں سپرد قرطاس کی گئیں۔

۳۔ ان مراکز اور اداروں کا تذکرہ جہاں سے اہم کتب حدیث تحقیق اور تصحیح کے ساتھ پہلی بار شائع

ہوئیں اور اہم اور نادر مخطوطات حدیث کا جائزہ۔

جامعہ نظامیہ:

جامعہ نظامیہ ابتداء میں مدرسہ نظامیہ کے نام سے جانا جاتا تھا جس کو شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ نے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں قائم کیا[1]۔ اس زمانہ میں مولانا قاسم نانوتوی دیو بند میں دارالعلوم کی آبیاری کررہے تھے، دونوں حضرات حاجی امداد اللہؒ کے خلفاء تھے، جامعہ نظامیہ جنوبی ہند میں عرصہ دراز سے ایک دینی درسگاہ کی حیثیت سے معروف ہے، بڑے جلیل القدر علماء، محدثین اور فقہاء نے اس ادارہ کو اپنے ارشاد وگفتار سے آراستہ کیا۔ شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ادریس کاندھلوی اور شیخ ابوالحسن ندوی جیسی اہم شخصیات نے جامعہ نظامیہ کو آمد سے شرف بخشا اور اس کی رہنمائی فرمائی۔

جامعہ نظامیہ میں فقہ وحدیث کے اہم اساتذہ وہ حضرات ہوا کرتے تھے جو عام طور سے دارالعلوم دیو بند اور مظاہر العلوم سے وابستہ علماء وفضلاء تھے ان میں حکیم عبدالرحمٰن سہارنپوری، شیخ الحدیث مولانا محمد یعقوب، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، شیخ عبدالکریم افغانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور عرصہ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن چند سالوں سے سطحی علماء نے نزاعی مسائل کو ہوا دے کر اس ادارہ کے اعتدال وتوازن کو برباد کردیا ہے اور فتنہ کا رنگ تیز سے تیز تر ہوتا جارہا ہے۔

شیخ الاسلام محمد انوار اللہ فاروقی:

شیخ الاسلام محمد انوار اللہ فاروقی فضیلت جنگ (۱۲۶۴ھ۔۱۳۳۶ھ) تیرہویں صدی ہجری کی ایک ایسی نامور شخصیت رہی ہے جس نے خلوص وللہیت اور علم وعمل سے حیدرآباد کی آبیاری اس طرح کی کہ اس کا شجرۂ طیبہ نسلوں تک سایہ فگن ہے، وہ ایک مخلص رہبر، تجربہ کار مصلح، خیرخواہ استاذ و مربی حکیم و مدبر وزیر سلطنت کا بے نظیر نمونہ ہیں[2]۔

مولانا انوار اللہ نے سند حدیث مولانا عبداللہ الیمنی سے حاصل کی اور فقہ اور معقولات کی تکمیل مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی اور مولانا عبدالحئی لکھنوی سے تکمیل کی، حجاز مقدس تشریف لے گئے اور

حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بیعت اور اجازت حاصل کی اور مستقل حضرت شیخ مہاجر مکی سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔

مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران خصائص نبویہ کے موضوع پر "انوار احمدی" کے نام سے اردو زبان میں ایک کتاب تحریر کی۔اسی سفر کے دوران حرم نبوی میں مکتبہ محمدیہ اور کتب خانہ شیخ الاسلام میں موجود اہم اور نادر مخطوطات کو اپنے خرچے سے نقل کروایا،ان میں سے حدیث کی معروف ومشہور کتابیں کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال للشیخ علی متقی ہندی،جامع مسانید الامام ابی حنیفۃ النعمان،والجوہر النقی علی سنن البیہقی اور احادیث قدسیہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

شیخ الاسلام انوار اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جامعہ نظامیہ جیسے اہم علمی اور دینی ادارہ کی داغ بیل ڈالی، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ کے قیام کو عملی شکل دیا، مجلس اشاعت العلوم اور کتب خانہ آصفیہ کو قائم کر کے اہل علم کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ دے گئے۔

ان کی تصنیفات تقریباً پندرہ ہیں لیکن علم حدیث کے موضوع پر ان کی سب سے اہم تصنیف "منتخب الصحاح" ہے جو انھوں نے کتب صحاح سے ابواب فقہ کے تحت جمع کیا ہے، یہ کتاب تین سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے۔جامعہ نظامیہ کے شعبہ مخطوطات میں یہ کتاب موجود ہے۔اسی طرح "الکلام المرفوع فیما یتعلق بالحدیث الموضوع" بھی اہم اور مفید حدیث کی کتاب ہے۔یہ کتاب اصلاً اردو میں ہے لیکن بعد میں اس کا عربی ترجمہ شائع ہوا ہے۔اس کے علاوہ ان کی رسالہ چہل حدیث بھی معروف کتاب ہے۔

جامعہ نظامیہ کے اہم شیوخ میں شیخ الحدیث مولانا یعقوب متوفی ۱۳۵۴ھ کا آبائی وطن اعظم گڑھ تھا، شیخ رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند محمود حسن دیوبندی کے زیر سایہ علم حدیث میں کمال پیدا کیا، صاحب فضیلت استاد اور عظیم محدث کی حیثیت سے معروف ہوئے، جامعہ نظامیہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے، اور تشنگان علم حدیث کو خوب فیض پہونچایا۔مولانا نے اپنی پوری زندگی کو حدیث کے درس کے لئے وقف کر دیا تھا۔ان کے ذریعہ حیدرآباد میں علماء ومحدثین کی ایک بڑی جماعت

پیدا ہوگئی تھی ۔ان میں خاص طور سے شیخ ابو الوفاء افغانی، مولانا مفتی رکن الدین، مولانا مفتی سید محمود، مفتی رحیم الدین، مولانا طیب محمد حسین شیخ الحدیث اور مفتی عبد الحمید قابل ذکر ہیں۔

مولانا وحید الزماں وقار جنگ (۱۲۶۷ھ۔۱۳۳۸ھ) بھی ان بیرونی ارباب کمال میں ہیں جو حکومت آصفیہ کے اہم عہدوں پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنے علمی انوار اور برکات سے شہر حیدرآباد کو روشن کیا اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ۔اور علم حدیث میں ان مٹ نقوش ثبت کیے اور اپنی اہم تصنیفات کے ذریعہ علم حدیث کو فروغ دیا اور اردو داں طبقہ کو حدیث سے براہ راست استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ علم حدیث پر ان کی اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔ احسن الفوائد فی تخریج احادیث شرح العقائد۔

۲۔ اشراق الانصار فی تخریج احادیث نور الانوار۔

۳۔ اصلاح الہدایہ فی فقہ الحدیث۔

۴۔ وحید اللغات: یہ غریب احادیث اور اس کے مفردات کی ڈکشنری ہے جو بڑے سائز میں اٹھائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ وحید الزماںؒ نے احادیث نبویہ کو اردو قالب میں پیش کیا ہے ان کے اہم اردو ترجمہ شدہ کتابوں کے نام ہیں:

۱۔تسہیل القاری شرح صحیح البخاری۔

۲۔شرح صحیح مسلم۔

۳۔رفع العجاجہ شرح سنن ابن ماجہ۔

۴۔شرح سنن النسائی۔

محدث دکن سید عبداللہ شاہ (۱۲۹۲ھ۔۱۳۸۴ھ) حیدرآباد کی ایک ایسی باکمال قد آور شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی علمی وفکری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا علم حدیث میں ایسی گرانقدر خدمات پیش کیں جس کی بازگشت ہندوستان کے باہر بھی سنی گئی۔ محدث دکن نے مشکاۃ المصابیح کے

اسلوب پر حنفی حضرات کے لئے احادیث نبوی کا ایک جامع اور مستند ذخیرہ ''زجاجۃ المصابیح'' کے نام سے تالیف فرمایا، جو پانچ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی۔ عبد اللہ شاہ کو مشکاۃ کے بنظر غائر مطالعہ کے بعد اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ جس طرح مشکاۃ شریف مسائل کے لحاظ سے شافعی مسلک کے لیے احادیث نبوی کا ایک بہترین مجموعہ ہے بالکل اسی طرح ان احادیث کو بھی جمع کیا جائے جن پر فقہ حنفی کی بنیاد ہے۔

اس طرح محدث دکن نے احادیث اور اقوال صحابہ و تابعین کا ایسا ذخیرہ پیش کیا کہ امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرنے والوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ حنفی مسلک احادیث اور قول صحابہ و تابعین سے ہٹ کر کہیں اور سے ماخوذ نہیں ہے، بقول عبد الماجد دریابادی'' حضرت ابوالحسنات سید عبد اللہ شاہ نے اس کتاب کو تالیف کر کے مسلک احناف کے ماننے والوں کے سر سے صدیوں کا بوجھ اتار دیا۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے محدث دکن کو عرب و عجم میں متعارف کرایا اور اہل علم کے درمیان ان کی تصنیف کو قابل رشک بنا دیا۔

مولانا مفتی عبد اللطیف سنبھلی عثمانیہ یونیورسٹی کے اہم تدریسی منصب پر فائز رہے، انیس سال تک حیدرآباد میں ان کا قیام رہا، اس دوران انھوں نے شرح جامع ترمذی، شرح تراجم ابواب صحیح البخاری اور رسالہ اصول الحدیث کے نام سے کتابیں تحریر کیں۔ اسی طرح مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا حیدرآباد میں ایک طویل عرصہ تک قیام رہا، انھوں نے ''تدوین حدیث'' جیسی اہم اور وقیع کتاب تحریر فرمائی۔ شیخ حسن عطاء اللہ جن کا آبائی وطن ہر چند کہ مدراس تھا لیکن جب حیدرآباد پہنچے تو یہیں کی مٹی میں رچ بس گئے اور الجمل للصحیحین لکھی۔

حیدرآباد کے نامور عالم ڈاکٹر حمید اللہ (۱۳۲۶ھ-۱۴۲۳ھ) کا اگر یہاں تذکرہ نہ ہو تو ہماری یہ بحث نامکمل ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب علوم عربیہ اسلامیہ کے ماہر اور بین الاقوامی قانون کے ایک عظیم شارح تھے، انھوں نے علم حدیث پر بھی قلم اٹھایا اور ''صحیفہ ہمام بن منبہ و مکانتھا فی تاریخ علم الحدیث'' تحریر فرمائی۔ کتاب الانواء لابن قتیبہ کو تحقیق و تعلیق کے ساتھ پیش کیا، اسی طرح انساب

الاشراف للبلاذری اور کتاب المعتمد لابی الحسین المصری کی بھی تحقیق وتصحیح فرمائی۔

مجلس احیاء المعارف النعمانیہ:

شیخ مولانا ابوالوفاء افغانی (۱۳۱۰ھ۔۱۳۹۵ھ) ایک بلند پایہ محدث اور فقیہ تھے، وہ زہد وورع اور تقویٰ و پرہیزگاری میں سلف کا کامل نمونہ تھے، وہ ایک عظیم المرتبت عالم دین اور عظیم محقق تھے، علوم اسلامیہ بالخصوص فقہ اسلامی پر ان کی گہری نظر تھی، حدیث نبوی اور فقہ حنفی سے انھیں گہری دلچسپی تھی، وہ ایک عرصہ تک جامعہ نظامیہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ '' مجلس احیاء المعارف النعمانیہ'' کا قیام اور نادر مخطوطات کی تحقیق وطباعت ہے، اس اکیڈمی کا مقصد فقہ حنفی کی تائید میں احادیث کے مخطوطات ومطبوعات کو جمع کرنا اور ان کو شائع کرنا تھا۔ اس مجلس کے علمی اور تحقیقی کاموں میں مولانا کو جہاں علماء نظامیہ کا تعاون حاصل تھا وہیں علماء دیوبند بھی ان کے ساتھ تھے۔ پروفیسر سلطان محی الدین اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

'' مولانا نے دوسرے علماء سے بھی استفادہ کیا اور انہیں مجلس کا معاون رکن بنایا ان میں قابل ذکر علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی مہدی حسن اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ہیں''۔[۸]

مولانا ابوالوفاء افغانی نے مجلس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے دنیا بھر میں حنفی کتابوں اور مخطوطات کی تلاش شروع کی، علامہ زاہد الکوثری کا انھیں تعاون حاصل رہا، وہ ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۷۰ھ تک سرگرم علمی رکن رہے، شیخ کوثری نے مخطوطات کی فراہمی میں ان کا بھرپور ساتھ دیا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا یوسف بنوری اور مولانا عبدالرشید نعمانی جیسے نامور اساطین علم وتحقیق مجلس سے وابستہ تھے۔[۹] مجلس احیاء المعارف النعمانیہ نے احناف کی ان کتب حدیث کو جو اس وقت مخطوطہ کی شکل میں موجود تھیں بڑے اہتمام کے ساتھ پہلی بار زیور طباعت سے آراستہ کیا، قاہرہ سے مجلس کی بعض کتابیں شائع ہوئیں، مولانا یوسف بنوری، مولانا ابوالوفاء کی علمی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔ انھوں نے'' احیاء المعارف النعمانیہ'' کے ذریعہ ٹھوس علمی

خدمات پیش کیں اور قدماء ائمہ اربعہ اور فقہاء حنفیہ کی کتابیں عمدہ ترین ٹائپ میں اپنی تعلیقات اور مذکورہ کتابوں کے علاوہ جو اہم کتب حدیث دائرۃ المعارف سے پہلی بار شائع ہوئیں ان میں امام ابو جعفر طحاوی کی مشکل الآثار، علامہ سیوطی کی مسانید الصحابیات، شیخ طاہر پٹنی کی ''مجمع بحار الانوار'' اور ''قاموس غریب الحدیث والقرآن'' تاریخ بیہقی، امام محمد بن اسماعیل بخاری کی التاریخ الکبیر اور حافظ ابن حجر کی الثقات، حافظ ابن نقطہ کی التقلید لمعرفۃ رواۃ السنن والمسانید، اور شیخ مولانا یوسف دہلوی کی حیاۃ الصحابہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح مولانا عبداللہ عمادی (۱۲۹۵ھ۔۱۳۶۶ھ) عرصہ دراز تک دائرۃ المعارف عثمانیہ کے اہم رکن اور رفیق کار رہے، عربی اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے''علم حدیث'' کے عنوان سے ایک اہم تصنیف فرمائی، اس کے علاوہ متعدد اہم عربی کتب کو اردو زبان میں منتقل کیا، ان میں مروج الذہب للمسعودی، تاریخ الرسل والملوک للطبری، کتاب المعارف لابن قتیبہ، الطبقات لابن سعد اور کتاب التنبیہ والاشراف خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مجلس اشاعت العلوم:

شیخ الاسلام انوار اللہ فضیلت جنگ نے ملک میں حیدرآباد سے شائع شدہ کتابوں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۱۲ء میں مجلس اشاعت علوم قائم کیا۔ مولانا نے اپنے ذاتی صرفہ سے سو سے زائد کتابیں شائع کیں۔ علم حدیث کی چند اہم کتابیں اس مجلس کے ذریعہ زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں، ایسی کتابوں میں خاص طور سے شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصبیح علی مشکاۃ المصابیح، مولانا زمان خان شہید کی اہم کتاب ''خیر المواعظ فی الحدیث'' فارسی ترجمہ کے ساتھ پہلی بار شائع ہوئی، مولانا ابو بکر محمد بن موسیٰ کی ''شروط الائمۃ الستۃ فی بیان اصول الحدیث وشرائط ، اور ابوالفضل محمد بن طاہر کی تالیف ''شروط الائمۃ الخمسۃ فی بیان اصول الحدیث وشرائط اور مولانا محمود الحسن ٹونکی کی معجم المصنفین بھی مجلس اشاعت العلوم ہی سے چار جلدوں میں شائع ہوئیں، اس کے علاوہ اردو زبان میں بھی متعدد کتابیں اس مجلس کے ذریعہ شائع ہوئیں، جو قیامت تک ان کے لیے صدقہ

جاری رہے گا۔

مجلس نے جن نادر کتب حدیث کو تحقیق اور حواشی کے ساتھ شائع کیا ان میں قاضی امام ابو یوسف کی ''کتاب الآثار'' سرفہرست ہے۔امام محمد بن الحسن شیبانی کی ''الجامع الکبیر'' امام ابوجعفر طحاوی کی ''مختصر الطحاوی فی فقہ الحنفیہ'' کو تحقیق کے ساتھ اس مجلس نے شائع کیا۔اسی طرح یہاں کے محققین نے امام بخاری کی ''التاریخ الکبیر'' جلد سوم، امام محمد بن حسن شیبانی کی ''کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ'' مولانا مفتی مہدی حسن قادری کی تحقیق اور تعلیق کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کیا، مزید برآں قاضی محدث امام ابوعبداللہ صمیری متوفی ۴۳۶ھ کی کتاب ''اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ'' اور حافظ محدث محمد بن یوسف شاہ صالحی شامی شافعی متوفی ۹۴۲ھ کی کتاب ''عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان'' اس مجلس کے ذریعہ زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔

دائرۃ المعارف العثمانیہ (۱۳۰۸ھ/۱۸۸۸ء):

دائرۃ المعارف العثمانیہ جو عام طور سے مستشرقین کے حلقہ میں Osmania Oriental Publication Bureau کے نام سے معروف ہے، شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ اور ملا عبدالقیوم کی بے پناہ کوششوں سے ۱۸۸۸ء میں قائم ہوا۔لیکن با قاعدہ ۱۹۶۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے کیمپس میں اس اکیڈمی کے لیے مستقل عمارت تعمیر کی گئی جس کا سنگ بنیاد ہمایوں کبیر نے رکھا۔ دائرۃ المعارف نے علم حدیث کے فروغ میں عظیم خدمات پیش کیں، بحث وتحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور نویں صدی ہجری کے اہم مخطوطات کی تحقیق اور تصحیح کا اہم فریضہ انجام دیا اور اس طرح بہت جلد علماء ومحققین نیز مستشرقین کی توجہ کا مرکز بن گیا، عالم اسلام کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں اور حیدرآباد کا علمی وقار اس کی وجہ سے بلند ہو گیا۔

ابتداء میں اکیڈمی کی علمی قدر ومنزلت کو دیکھتے ہوئے علم وتحقیق کے جن مردان کار نے ہر اعتبار سے اس میں تعاون کیا ان میں علامہ عبدالحق خیرآبادی، علامہ شبلی نعمانی، سرسید احمد خاں، مفتی محمد سعید، مظفرالدین معلی، وقار الملک اور محسن الملک، اقبال یار جنگ اور فضیل یار جنگ کے نام سرفہرست

ہیں۔دائرۃ المعارف سے وابستہ ہوکر جن معروف ومشہور علماء محققین نے تحقیق وتصحیح کا کام انجام دیا۔ ان کی فہرست طویل ہے۔یہاں چند مشہور محققین علماء کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔معروف مستشرق فرنسی (سالم) کرنکوالالہاتی نے ابن قتیبہ دینوری کی تالیف "المعانی الکبیر" کی تصحیح اور حاشیہ نویسی، حافظ ابن حجر العسقلانی کی کتاب "الدرر الکامنۃ" اور کتاب "التیجان فی ملوک حمیر" کی تحقیق اور حاشیہ نویسی کا اہم کام انجام دیا اور دائرۃ المعارف سے مذکورہ کتابیں پہلی بار شائع ہوئیں۔

شیخ عبدالرحمٰن بن یحیٰ معلمی الیمانی کی تحقیق وتعلیق سے حافظ ابن حجر العسقلانی کی تذکرۃ الحفاظ، السمعانی کی کتاب الانساب اور امیر ابن ماکولا کی تالیف "الاکمال" کی چھ جلدیں شائع ہوئیں، شیخ عبداللہ بن محمد یمانی کی تحقیق حافظ ابن حجر العسقلانی کی تصنیف "ابناء الغمر بابناء العمر" اور نزہۃ الالباب فی الالقاب "پہلی بار دائرۃ المعارف سے شائع ہوئیں۔اس اکیڈمی کے طفیل میں مسند ابوداؤد طیالسی اور المستدرک علی الصحیحین مع "تعلیق الذہبی" جیسی اہم کتابیں اہل علم ودانش تک پہنچیں۔

مولانا سید ہاشم ندوی (۱۹۰۴-۱۹۷۲ء) حیدرآباد کے ان بیرونی ارباب کمال میں ہیں جو دائرۃ المعارف سے نہ صرف وابستہ رہے بلکہ اس کے ڈائرکٹر کے منصب پر ایک عرصہ تک فائز رہے، مولانا عربی زبان کے ماہر اور محقق عالم تھے،اللہ نے ان کے اندر تحقیق کا فطری ذوق عطا کیا تھا، بے نفسی اور اخلاص کے نمونہ تھے، انھوں نے "تذکرۃ النوادر" جیسی کتاب تصنیف فرمائی جو بعد میں مصنفین محققین علماء،اور مستشرقین کا مرجع بن گئی۔"کتاب الفلاحۃ" کا اردو ترجمہ کیا، جو ہرانگی کا حاشیہ بھی مولانا ہاشم کے تحقیقی اور علمی ذوق کا آئینہ دار ہے اس کے علاوہ انھوں نے متعدد کتابوں کی تصحیح وتعلیق فرمائی۔

ان کے علاوہ جن معروف علماء،محققین نے اس علمی اکیڈمی سے وابستگی حاصل کی اور احادیث کی تخریج اور کتب حدیث اور مسانید کی تحقیق میں اپنی گرانقدر خدمات پیش کیں،ان میں شیخ عبدالغنی موصلی،حسن جمال الجلیل مدنی،سید طہ اور شیخ شرف الدین بالموی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

کتب خانہ روضۃ الحدیث:

مولانا حسن زماں خاں ترکمانی (۱۲۱۹ھ۔۱۳۳۰ھ) ایک بلند پایہ عالم اور ذی وقار محقق تھے، اپنے علمی کمالات سے انھوں نے حیدرآباد کو خوب فیض پہنچایا۔ حرمین شریفین کے علماء سے تعلقات قائم کیے اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ ان کو اہم تالیفات اور مخطوطات جمع کرنے کا بے پناہ شوق تھا خاص طور سے حدیث کی نادر کتابیں اور مخطوطات کی تلاش میں وہ عمر بھر سرگرداں رہے تھے۔ اس غرض سے انھوں نے ''روضۃ الحدیث'' کے نام سے ایک کتب خانہ قائم کیا تھا۔

مسند ابی الیعلی الموصلی کا اصح نسخہ جو غیر منقوطہ ہے ''روضۃ الحدیث'' میں موجود ہے۔ اسی طرح علامہ سیوطی کی جمع الجوامع جو ''الجامع الکبیر'' کے نام سے معروف ہے اس کتب خانہ کا قلمی نسخہ اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ کتب خانہ عیدی بازار۔ حیدرآباد میں ہے میراث کے تنازعہ کی وجہ سے حکومت آندھراپردیش کی وزارت اوقاف نے فی زمانہ اسے مقفل کر دیا ہے۔ انجام کار یہ اہم کتب خانہ جو بیش قیمتی احادیث کے مخطوطات سے بھرا ہے برسوں سے بند ہے کسی اہل علم کی وہاں تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ مولانا حسن زمان خان کی علم حدیث میں اہم تصانیف میں نور العینین فی فضیلۃ الحمو ین اور التحقیق فی نسب السید الجیلی ہے۔

کتب خانہ سعیدیہ:

مولانا مفتی محمد سعید (۱۲۴۷ھ۔۱۳۱۲ھ) کا آبائی وطن ہر چند مدراس تھا لیکن حیدرآباد کو انھوں نے اپنی علمی وفکری جولانگاہ کا مرکز بنایا اور وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ان کی بے پناہ ملی اور علمی خدمات ہیں، جامعہ نظامیہ اور دائرۃ المعارف العثمانیہ کے اہم مشیر کار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی خدمات انجام دیں۔ اپنے حلقہ درس حدیث سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔

نادر مخطوطات اور اہم کتابوں کی تلاش میں وہ سرگرداں رہتے تھے انھوں نے مکتبہ سعیدیہ کے نام سے اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تیار کیا تھا۔ اس کے اندر کئی اہم قلمی نسخے جو حافظ ابن حجر عسقلانی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تحریر کردہ موجود ہیں۔ چنانچہ ''تجدید القوس فی تخریج احادیث مسند الفردوس''

کا حافظ ابن حجر عسقلانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ اس کتب خانہ میں آج تک دستیاب ہے۔ مولانا محمد سعیدؒ نے بھی علم حدیث کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔ جن میں تشید المبانی فی تخریج احادیث مکتوبات ربانی، تخریج احادیث الاطراف اور ثبت فی الحدیث المثنوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

لجنۃ انوار المعارف:

مولانا مفتی محمد عبد الحمید سابق شیخ الجامعہ النظامیہ نے لجنۃ انوار المعارف ۱۳۴۸ھ میں قائم کیا، اس کا مقصد اسلام کے ثقافتی ورثہ کا احیاء تھا۔ اس ادارہ نے حدیث کی کئی اہم کتابوں کو تصحیح و تعلیق کے ساتھ شائع کیا۔ ان میں خاص طور سے جو کتب حدیث زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں ان کے اسماء درج ذیل ہیں:

۱۔ کتاب المجروحین، للامام ابن حبان، تین جلدوں میں، ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ الجامع لشعب الایمان، للامام المحدث الفقیہ البیہقی، ۱۹۸۶ء، میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

۳۔ دلائل النبوۃ للامام بیہقی، دو جلدوں میں، ۱۹۸۶ء شائع ہوئی۔

۴۔ مسند علی بن ابی طالب للامام جلال الدین سیوطی، ۱۹۸۵ء، میں شائع ہوئی۔

۵۔ مسند سیدتنا فاطمہ الزہراء، للامام جلال الدین سیوطی، ۱۹۸۶ء، میں شائع ہوئی۔

۶۔ تاریخ علماء قزوین، دو جلدیں۔

۷۔ الطب النبوی للامام ابن قیم جوزی۔

علم حدیث کے میدان میں ریاست حیدرآباد کے علماء اور امراء کی خدمات کے اس سرسری جائزہ کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ حیدرآباد کی سرزمین علم وادب اور اسلامی علوم وفنون کے لیے انتہائی زرخیز ہے، علم حدیث کی خدمات کے تعلق سے اس کی ایک درخشاں اور تابندہ تاریخ ہے، آج بھی حیدرآباد کے اندرونی اور بیرونی ارباب کمال کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو اسلامی علوم وفنون کی تحقیق وتدوین میں ہمہ تن مصروف ہے، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد، اور جامعہ سبیل السلام علم حدیث کے فروغ میں فی زمانہ گرانقدر اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اللہ ان

کی کوششوں کو شرف قبولیت سے ہمکنار کرے۔

ماخذ و حواشی:

۱ علماء العربیہ ومساہماتہم فی الادب العربی فی العہد الآصفجاہی از پروفیسر محمد سلطان محی الدین، ص ۳۵۴۔

۲ علماء العربیہ ومساہماتہم فی الادب العربی فی العہد الآصفجاہی از پروفیسر محمد سلطان محی الدین، ص ۱۲۶، مطلع الانوار، ص ۷۰۔۷۱۔

۳ علماء العربیہ ومساہماتہم فی الادب العربی فی العہد الآصفجاہی از پروفیسر محمد سلطان محی الدین، ص ۱۳۰۔

۴ علماء العربیہ ومساہماتہم فی الادب العربی فی العہد الآصفجاہی از پروفیسر محمد سلطان محی الدین، ص ۱۷۸۔

۵ مقدمہ زجاجۃ المصابیح، ص ۸۔

۶ دکن کی علمی و دعوتی شخصیات، ص ۳۶، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد۔

۷ علماء العربیہ ومساہماتہم فی الادب العربی فی العہد الآصفجاہی از پروفیسر محمد سلطان محی الدین، ص ۳۷۳۔

۸ دکن کی علمی و دعوتی شخصیات، ص ۳۶، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد۔

۹ علماء العربیہ ومساہماتہم فی الادب العربی فی العہد الآصفجاہی از پروفیسر محمد سلطان محی الدین، ص ۳۷۸۔

۱۰ فرمودات مولانا اکبر ہاشمی، رئیس التحسین، دائرۃ المعارف العثمانیہ۔

۱۱ تاریخ دکن، ڈاکٹر یوسف حسین خان۔

۱۲ تاریخ دکن، اختر مینائی و جلیل مانک پوری۔

۱۳ مقالہ تاریخیہ علمیہ، دائرۃ المعارف العثمانیہ، ۱۳۵۴ھ۔

۱۴ نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحئی بریلوی، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد۔



صوبۂ بہار میں خدمت حدیث کے اہم مراکز

از: مولانا ڈاکٹر عتیق الرحمن

خدابخش لائبریری پٹنہ

صوبۂ بہار علوم دینیہ کی مرکزیت کے لیے پورے ہندوستان میں مشہور ہے، اور اسے ان علوم وفنون میں اہم مقام حاصل ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے علماء اور صوفیاء علوم دینیہ کی اشاعت وتبلیغ میں نہایت ہی مخلص تھے، ان علوم وفنون میں اعلیٰ لیاقت اور اونچی صلاحیت کے مالک تھے، ایثار وقربانی کے جذبات سے سرشار تھے، نہایت محنتی اور جفاکش تھے، امامت وقیادت کے مقام پر فائز تھے۔

جہاں تک علم حدیث کی خدمت ومرکزیت کی بات ہے تو یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ اس فن میں بھی اس کو مرکزیت حاصل رہی ہے اور یہاں کے علمائے کرام کی فیض رسانی سے پورا ملک معمور رہا ہے۔

بہار کی اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں کے علماء کرام نے علم حدیث کی خدمت دو طریقے سے انجام دی ہے، ایک طریقہ یہ تھا کہ انہوں نے درس وتدریس کے ذریعہ علم حدیث کی اشاعت کی اور نہایت مستعدی اور لگن کے ساتھ اس کو پروان چڑھایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے بہت سارے علاقوں کے طلباء حدیث یہاں آئے اور ان کی مہارت فن سے فیض یاب ہوئے، خدمت حدیث کا یہ طریقہ نہایت عام تھا اور شہر وقصبات میں زمانہ قدیم سے ہر جگہ رائج تھا، اس سلسلے میں ہم بطور خاص

در بھنگہ، بہارشریف، مونگیر، نیا بھوج پور، آرہ، عظیم آباد، پھلواری شریف، ہزاری باغ، گیا، چمپارن، سہسرام، مظفر پور، کا نام پیش کر سکتے ہیں جہاں علوم دینیہ اور بطور خاص علم حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ قائم تھا، اور اکثر مقامات پر یہ سلسلہ آج تک قائم ہے، دوسرا طریقہ تصنیف و تالیف کا تھا، علمائے بہار نے اس طریقے سے بھی علم حدیث کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں مخصوص جگہیں نظر آتی ہیں، جن میں بہارشریف، پھلواری شریف، آرہ، عظیم آباد، ڈیانواں، سہسرام سرفہرست ہیں۔

بہارشریف:

نالندہ ضلع میں معروف جگہ بہارشریف ہے جس کو علوم دینیہ کی خدمت و اشاعت کی اولیت کا شرف حاصل ہے، کیوں کہ آج سے سات سو سال قبل یہاں ایک شاندار خانقاہ تھی جہاں ہندوستان کے معروف بزرگ اور سلوک و تصوف کے امام حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری جلوہ افروز تھے اور یہیں سے انہوں نے خدا ترسی، انسان دوستی، معرفت الٰہی اور پیروی سنت کا پیغام دیا تھا۔

انہوں نے اپنی دعوت وارشاد کی بنیاد قرآن وسنت پر رکھی، اور لوگوں کو انہیں دونوں مقدس کتابوں کی اتباع کی دعوت دی، انہوں نے اپنے مریدین و پیروکاروں کے سامنے قرآن کی آیات کی توضیحات و تشریحات کے ساتھ احادیث نبویہ کے معنی و مفہوم کی پوری وضاحت فرمائی اور اس کی پیروی کی دعوت دی، انہوں نے کئی اہم کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں جن میں معدن المعانی، خوان پر نعمت، مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی، مخ المعانی، نہایت معروف ہیں، ان کتابوں میں جا بجا احادیث نبویہ کی توضیحات و تشریحات ملتی ہیں، کہیں کہیں احادیث نبویہ کی اقسام، ان کے مراتب اور فضائل نظر آتے ہیں، اور ان کی عالمانہ بحثیں دیکھنے کو ملتی ہیں، ان تصنیفات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری علم حدیث کے جید اور متبحر عالم تھے اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں ہمہ تن مصروف تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا بلکہ ان کے خلفاء اور جانشینوں

نے بھی اس نہج پر کام کیا اور انہوں نے بھی احادیث نبویہ کی تبلیغ واشاعت میں اہم رول ادا کیا، اس سلسلے میں ہم خاص طور پر حضرت مظفر شمس بلخی، حضرت نوشہ توحید، حضرت حسین بلخی اور حضرت شاہ شعیب منیری کا نام پیش کر سکتے ہیں، جن کی تصنیفات وتالیفات آج بھی موجود ہیں، اور وہ گواہی دیتی ہیں کہ انہوں نے احادیث نبویہ کی خدمت واشاعت کتنے لگن اور کتنے جوش وخروش سے کی تھی، ملفوظات مظفر شمس بلخی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

پھلواری شریف:

پھلواری شریف دوسرا اہم مرکز ہے جہاں احادیث نبویہ کا سلسلہ زمانہ قدیم سے باضابطہ طور پر شروع ہوا، اور ہنوز قائم ہے، اس سرزمین کی سب سے پہلی اہم ترین شخصیت حضرت سید منہاج الدین راستی کی ہے، جو آٹھویں صدی ہجری کے معروف بزرگ ہیں اور حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے خلفاء میں ہیں، حضرت مخدوم بہاری نے آپ کو اپنا خلیفۂ مجاز بنایا اور ساتھ ہی ساتھ سلسلۂ حدیث کی سند بھی عنایت کی (۱)۔

حضرت سید منہاج الدین راستی نے اپنے پیر ومرشد کے نہج پر پھلواری شریف میں رشد وہدایت کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ کی خدمت کا سلسلہ شروع کیا جس میں خاص طور پر احادیث نبویہ کی دعوت وتبلیغ شامل تھی، اس کے بعد حضرت سید یسین گجراتی کا نام لیا جاسکتا ہے جو اکبری دور کے معروف عالم ہیں اور شیخ المحدثین کے لقب سے مشہور ہیں، انہوں نے شیخ وجیہ الدین گجراتی سے درس حاصل کیا، ان سے مرید ہوئے اور پھر حرمین شریفین جاکر فن حدیث حاصل کیا اور وہاں سے اجازت حدیث لے کر واپس آئے، کچھ دنوں تک لاہور میں قیام پذیر رہے، اس کے بعد بنگال جاتے ہوئے بہار میں ایک طویل زمانے تک قیام کیا اور باضابطہ طور پر درس حدیث دیا، اور اپنے شاگردوں کو اجازت حدیث عنایت فرمائی، یہ پہلا موقع ہے کہ صوبہ بہار کی خانقاہ سے قال الرسول کا ترانہ سمع نواز ہوا۔

پھلواری شریف میں اب تک ایک سند حدیث محفوظ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درس سے حافظ الوقت مولانا عبدالرزاق نے فائدہ اٹھایا، اور ان سے مولانا عبدالنبی نے اور ان سے

ان کے صاحبزادہ مولانا منتقدر محدث نے اور ان سے ان کے بھتیجے اور شاگرد شیخ محمد عتیق بن عبد السمیع بہاری نے اور انہی کی دی ہوئی یہ سند ہے، جو پھلواری میں آج بھی موجود ہے (۲)۔

محمد عتیق محدث بہاری:

ملا محمد عتیق محدث بن عبد السمیع بہاری عالم گیری عہد کے معروف عالم اور محدث ہیں، ۱۰۷۵ھ میں بہار میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی، حدیث کی کتابیں شیخ عبد المنتقدر سے پڑھیں، اس کے علاوہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے صاحبزادے شیخ نور الحق محدث دہلوی اور ان کے شاگرد شیخ جمال الدین سے حدیث کی سند حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، خاص طور پر حدیث نبوی کی کتابیں پڑھائیں، ان کے تلامذہ میں شیخ محمد وجیہ الحق پھلواروی ایک جید عالم اور محدث ہیں، ان کی وفات ۱۱۳۹ھ میں ہوئی (۳)۔

ملا محمد وجیہ الحق پھلواروی:

ملا وجیہ الحق پھلواروی ۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے برادر بزرگوار سے حاصل کی، انہیں سے بیعت ہوئے، حدیث کی تعلیم ملا محمد عتیق محدث بہاری سے حاصل کی، اس کے بعد درس و تدریس میں مصروف ہو گئے، درس و تدریس کے علاوہ آپ نے قیمتی کتابیں لکھیں جن میں حدیث کے موضوع پر حاشیہ شمائل ترمذی نہایت اہم ہے، جس میں انہوں نے شمائل ترمذی کے مشکل الفاظ کی توضیح و تشریح کی ہے، ان کے تلامذہ میں ملا وحید الحق پھلواروی، مفتی غلام مخدوم اور شاہ آیت اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں (۴)۔

ملا وحید الحق محدث پھلواروی:

ملا وحید الحق محدث پھلواروی اپنے دور کے نامور عالم دین ہیں جو ۱۱۶۴ھ میں پھلواری شریف میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی، بعض درسی کتابیں اپنے والد محترم ملا وجیہ الحق پھلواروی سے پڑھیں، بقیہ کتابیں اپنے ماموں شیخ مبین جعفری سے پڑھیں، سند حدیث، اپنے والد محترم سے حاصل کیا، تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، انہوں نے کئی اہم

کتابیں لکھیں جن میں حدیث کے موضوع پر شمائل ترمذی کی تعلیقات ہیں، یہ تعلیقات دراصل حاشیہ شمائل ترمذی کے نام سے ہیں، شمائل ترمذی کی کتابت دراصل ملا وجیہ الحق نے کی تھی اور پھر اسی پر حواشی لکھے تھے اس کے بعد اس نسخے پر مزید حواشی ان کے صاحبزادے ملا وحید الحق پھلواروی نے لکھے جیسا کہ درج ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

کاتب هذه النسخة الشريفة ابي مولوي محمد وجه الحق وكاتب حواشيها انا واسمي محمد وحيدالحق إلابعض الحواشي فانه ايضا من مكتوبات ابي۔

یہ قلمی نسخہ آج بھی کتب خانہ مجیبیہ پھلواری شریف کی زینت ہے، ان کا انتقال ۱۲۰۱ھ میں ہوا(۵)۔

شاہ ظہور الحق پھلواروی:

ملا محمد شفیق محدث بہاری کے توسط سے پھلواری شریف میں خدمت حدیث کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اوپر مذکور ہوا، لیکن اس کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی یہاں فن حدیث آیا جن میں شاہ ظہور الحق پھلواروی کا سلسلۂ حدیث نہایت اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ انہوں نے شاہ عبدالعزیز دہلوی سے حدیث کا درس لیا، اور وہاں سے اجازت حدیث لے کر گھر واپس آئے، یہاں آکر درس وتدریس میں مصروف ہوگئے، حدیث نبوی کی تدریس کی طرف خصوصی توجہ دی، حافظہ غضب کا پایا تھا، اس کا استعمال انہوں نے فن حدیث جیسے مقدس موضوع کے لیے کیا، چنانچہ انہوں نے مسلم شریف، بخاری شریف اور حصن حصین کی ضخیم جلدیں حفظ کر ڈالیں، پھلواری شریف کی تاریخ میں غالبًا پہلا موقع تھا کہ وہاں کے ایک عالم نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ مسلم شریف، بخاری شریف اور حصن حصین جیسی ضخیم کتابیں حفظ کر ڈالیں(۶)، اس واقعہ سے یہاں کے علماء میں حدیث نبوی سے غیر معمولی عقیدت ومحبت کا علم ہوتا ہے، اس کے علاوہ اگر آپ پھلواری شریف کی تاریخ پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ ظہور الحق پھلواروی کے علاوہ مولانا شاہ خواجہ عماد الدین قلندر، مولانا آل احمد اور مولانا شاہ بدرالدین، شاہ مجیب اللہ پھلواروی قادری ایسے نامی گرامی علماء وصوفیاء ہیں، جنہوں نے درس حدیث کی اجازت دوسرے علمی مراکز سے

حاصل کی، اور پھر پھلواری شریف واپس آکر اس علم کی ترویج واشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ آج تک یہاں علم حدیث کی خصوصی تعلیم ہوتی ہے اور علماء اس کی تدریس وتصنیف میں مشغول نظر آتے ہیں۔

آرہ:

آرہ صوبۂ بہار کا ایک معروف تاریخی شہر ہے جہاں کے علماء علوم دینیہ کی اشاعت میں عرصۂ دراز سے مصروف ہیں، یہاں خاص طور پر دو علماء کا ذکر کیا جاتا ہے جو نہایت اہم ہیں اور ان کی خدمات حدیث ناقابل فراموش ہیں، ایک مولانا محمد اکرم محدث آروی دوسرے مولانا ابراہیم آروی ہیں۔

مولانا محمد اکرم آروی:

مولانا محمد اکرم آروی معروف عالم دین ہیں جنہوں نے تیرہویں صدی ہجری میں علوم دینیہ کی عام طور پر اور علم حدیث کی خاص طور پر اہم خدمات انجام دی ہیں، ان کا ذوق خالص دینی وعلمی تھا، قدرت نے انہیں تصنیف وتالیف کا اچھا ذوق دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دینی موضوعات پر اہم کتابیں لکھیں، اہم ترین بات یہ ہے کہ انہوں نے تقریباً چالیس کتابیں تصنیف کی ہیں جو بلا واسطہ یا بالواسطہ احادیث نبوی سے ماخوذ ہیں، اور مختلف عنوانات سے ہیں، چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) شرائط البخاری (۲) نزول السکینۃ فی ذکر المدینۃ (۳) رسالہ رحمۃ للعالمین (۴) صحاح الصوفیۃ (۵) حسن الحلیب فی محبۃ الحبیب (۶) معالی الاخلاق (۷) النہر الکوثر فی حلیۃ خیر البشر (۸) اللؤلؤ والمرجان فی اسماء نبی الانس والجان (۹) الیاقوت والمرجان فی صلوۃ النبی المختار (۱۰) جامع الجمعۃ فی استیعاب احادیث الجمعۃ (۱۱) خطبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۱۲) النعمۃ فی سنن العمامۃ (۱۳) خیر الدارین فی بر الوالدین (۱۴) السنۃ السنیۃ فی الخطب النبویۃ (۱۵) سفر المحدثین فی سنن المحدثین۔

ان تمام کتابوں میں احادیث نبوی کو پیش کیا گیا ہے اور بنیادی طور پر انہیں کی روشنی میں باتیں کی گئی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اکرم آروی علم حدیث کے بڑے عالم تھے، اور پوری دسترس رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے نام کے ساتھ ''المحدث'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

میں نے چالیس کی تعداد اوپر لکھی ہے، یہ تمام کتابیں مخطوطات کی صورت میں کتب خانہ مجیبیہ پھلواری شریف میں محفوظ ہیں، جنہیں میں نے خود دیکھی ہیں اور کچھ کے نام اوپر تحریر کیے ہیں، یہ تمام قلمی کتابیں ان کی خود نوشت ہیں، اس لحاظ سے ان کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

مولانا ابراہیم آروی:

مولانا ابراہیم آروی بہار کے مشہور عالم ہیں جنھوں نے علوم دینیہ اور خاص طور پر علم حدیث کی بڑی خدمت انجام دی ہے، وہ ۱۲۶۴ھ میں آرہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد دیوبند اور پھر علی گڑھ چلے گئے جہاں انہوں نے مولانا یعقوب بن مملوک نانوتوی اور مفتی لطف اللہ علی گڑھی سے استفادہ کیا، کچھ دنوں بعد سہارنپور چلے گئے، جہاں انہوں نے مولانا احمد علی سہارنپوری سے صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابیں پڑھیں، اس کے بعد حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں شیخ احمد بن زین دحلان اور شیخ عبدالغنی بن ابی سعید دہلوی سے حدیث نبوی کی سند حاصل کی، ہندوستان واپس آئے تو یہاں شیخ نذیر حسین بہاری ثم دہلوی اور شیخ غلام حسین بن محسن انصاری سے اجازت حدیث حاصل کی، انہوں نے آرہ شہر میں مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کیا، جہاں دوسرے اساتذہ کے ساتھ خود بھی حدیث وقرآن کی تعلیم دینے میں مصروف ہوگئے، انہوں نے دینی علوم وفنون پر چند اہم کتابیں لکھیں جن میں فقہ محمدی، ارکان اسلام، اورالقول المزید فی احکام التقلید خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اخیر عمر میں عرب ہجرت کر گئے تھے جہاں ۱۳۱۹ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۷)

عظیم آباد:

عظیم آباد صوبۂ بہار کا دارالحکومت ہے، یہ شہر اردو، فارسی وعربی کی مرکزیت کے لیے زمانۂ قدیم سے مشہور ہے، یہاں نامور علماء، صلحاء، ادباء وشعراء پیدا ہوئے، جنہوں نے دینی وادبی علوم وفنون کی نہایت گراں قدر خدمات انجام دیں، جہاں تک خدمات حدیث کی بات ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے بعض علماء نے حدیث نبوی کی شاندار خدمات انجام دی ہیں، اس وقت درج ذیل علماء کی خدمات حدیث پر اکتفا کرتا ہوں۔

مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی:

مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی ہندوستان کے معروف علماء میں شمار ہوتے ہیں، ۱۲۳۱ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے، والد کا نام مولوی واعظ علی تھا، جو عظیم آباد کے رئیس تھے، مولانا حسرت عظیم آبادی نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر کانپور چلے گئے، جہاں انہوں نے مولانا شاہ محمد سلامت اللہ کی خدمت میں رہ کر علوم دینیہ کی تکمیل کی، اور اس کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، وہ اردو و فارسی اور عربی میں شاعری کرتے اور زبان و بیان پر کامل قدرت رکھتے تھے، ان کی خدمت کا ایک خصوصی میدان حدیث تھا جس میں انہوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں، ۱۳۰۳ھ میں سرکار عالی نے انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا تھا، ان کی وفات ۱۳۰۴ھ میں ہوئی (۸)۔

مولانا ظفر الدین بہاری:

مولانا ظفر الدین بہاری علوم عقلیہ و نقلیہ کے معروف عالم تھے، ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، ۱۳۲۰ھ میں مدرسہ حنفیہ پٹنہ میں داخلہ لیا، اور شاہ وصی احمد محدث سے اکتساب فیض کیا، اس کے بعد بریلی گئے جہاں مولانا حامد حسن رام پوری اور مولانا شبیر احمد علی گڑھی اور مولانا احمد رضا بریلوی سے درسی کتابیں پڑھیں، جس میں منطق و فلسفہ اور علم نجوم کے علاوہ تفسیر و حدیث کی اہم کتابیں شامل تھیں، ۱۳۲۵ھ میں درسیات سے فارغ ہو کر تدریسی خدمات انجام دینے میں مصروف ہو گئے، کچھ دنوں مدرسہ منظر الاسلام بریلی میں پڑھایا، پھر مدرسہ حنفیہ پٹنہ میں بحیثیت مدرس بحال ہوئے، اخیر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں استاذ حدیث کی حیثیت سے کام کرنے لگے، انہوں نے علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ میں درجنوں کتابیں تصنیف کیں جن میں خاص طور پر صحیح البہاری المعروف بہ جامع الرضوی قابل ذکر ہے، کیوں کہ فن حدیث میں یہ ایک اہم مجموعہ حدیث ہے، جو چھ جلدوں میں ہے، اس کے ابواب حدیث کی ترتیب اس طرح ہے۔

جلد اول: عقائد، جلد دوم: طہارت، جلد سوم: زکوٰۃ۔ روزہ۔ حج، جلد چہارم: نکاح۔ طلاق۔ ایمان، جلد پنجم: بیوع۔ قضا۔ شہادت، جلد ششم: مزارعت۔ جنایات اور رہن۔

آپ کی علمی و دینی برتری اور فضل وکمال کی وجہ سے آپ کو ملک العلماء کا خطاب ملا، آپ کی وفات ۱۳۸۲ھ میں ہوئی۔

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی:

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی بہار کے ممتاز اردو شاعر اور لغت دان ہیں، اس کے علاوہ فن حدیث میں ان کی خدمات نہایت اہم اور شاندار ہیں، یہی وجہ ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری نے انہیں نجوبۂ روزگار شخصیت قرار دیا ہے، اوران کی شان میں دو عربی قصیدے کہہ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اظہار حیرت کیا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں ایسی نادر شخصیت کس طرح پیدا ہو گئی۔

علامہ شوق نیموی عظیم آباد کے قریب ایک گاؤں صالح پور میں اپنی خالہ کے یہاں ۱۲۷۸ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی، اس کے بعد پٹنہ اور پھر غازی پور چلے گئے، جہاں مزید تعلیم حاصل کی، پٹنہ میں مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی سے خصوصی درس حاصل کیا۔

غازی پور میں مولانا حافظ عبداللہ اور مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی سے اکتساب فیض کیا، جو ہندوستان میں معروف علماء میں شمار ہوتے تھے، قدرت نے مولانا شوق نیموی کو دینی مزاج اور طبیعت کے ساتھ شعری ذوق بھی عطا کیا تھا، اس لیے وہ درسیات سے فارغ ہوتے تو شعر گوئی کرتے اور اپنا کلام مولانا شمشاد لکھنوی کو دکھا کر اس کی اصلاح لیتے تھے، اسی زمانے میں انہوں نے شوق تخلص رکھ کر باضابطہ شاعری شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے چل کر وہ اردو زبان کے نامور شاعر اور ادیب ہوئے، ان کی شاعری کے نمونے ان کے مجموعۂ کلام دیوان شوق اور مثنوی نغمۂ راز، سوز وگداز وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں، اس کے علاوہ وہ اردو فارسی عربی زبان پہ گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے ازاحۃ الاغلاط، اصلاح، ایضاح جیسی اہم کتابیں تصنیف کیں جو اردو زبان کی لغات پر گراں قدر تصنیفات ہیں۔

ان تمام فنون کے علاوہ ان کا اصل فن، فن حدیث ہے، جس میں ان کی خدمات لازوال اور بے مثال ہیں، انہوں نے فن حدیث کا درس ہندوستان کے مشہور عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی

(م۱۳۰۴ھ) سے حاصل کیا،لکھنؤ میں تقریباً چار پانچ سال تک قیام پذیر رہے،اس مدت میں دینی علوم اور طبابت کے علاوہ خاص طور پر فن حدیث کی طرف متوجہ رہے اور اس میں تبحر پیدا کیا۔

درسیات سے فراغت کے بعد طبابت کو ذریعہ معاش بنایا، بقیہ اوقات میں کتب بینی کرتے اور اپنے علم کو پروان چڑھاتے، تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے دینی علوم اور خاص طور پر حدیث میں ایسی لیاقت پیدا کرلی کہ وہ بہار کے ممتاز علماء میں شمار ہونے لگے، انہوں نے دینی علوم میں اہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں اوشح الجید فی اثبات التقلید، حبل المتین، ردالسکین، جلاء العینین فی رفع الیدین، جامع الآثار فی صلوٰۃ الجمعۃ فی القری، لامع الانوار فی نظر الختار نہایت اہم اور معتبر ہیں، یہ تمام کتابیں فقہ کے مختلف اہم موضوعات پر ہیں جن میں جگہ جگہ احادیث نبویہ سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن ان تمام تصنیفات میں ان کی سب سے اہم تصنیف ''آثار السنن'' ہے جو فن حدیث میں ہے، یہ دراصل مجموعہ احادیث ہے، جس میں فقہ حنفی کی تائید وحمایت والی صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں، یہ دو جزء پر مشتمل ہے، پہلا جزء کتاب الطہارۃ سے شروع ہوکر''باب فی الصلوٰۃ بحضرۃ الطعام'' پر ختم ہوتا ہے، دوسرا جزء ''باب ما علی الامام'' سے شروع ہوتا ہے اور ''باب فی زیارۃ قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' پر ختم ہوتا ہے، یہ کتاب نامکمل رہ گئی لیکن اپنے علمی وفنی مقام ومرتبہ کے لحاظ سے شاہکار تصنیف ہے، کیوں کہ مولانا شوق نیموی نے اس کی تصنیف وتالیف کے وقت کتب احادیث کی فراہمی کا بڑا اہتمام کیا، دور دراز مقامات مثلاً حجاز مصر اور روم کا سفر کیا، نادر ونایاب قلمی کتابیں جمع کیں، اساتذہ فن کو خطوط لکھ کر گراں قدر معلومات فراہم کیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث، نقد حدیث، رجال اور تاریخ رجال پر ایسا گراں قدر مواد جمع کرلیا کہ اس کی مثال ہندوستان میں نہایت کم ملتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی اہم تحقیقات'' آثار السنن'' کی تعلیقات کے ذیل میں پیش کیں تو بعض ہندوستانی علماء کو حیرت تھی کہ ایسے نادر مصادر کے حوالے کہاں سے دئے گئے۔

اس کتاب کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ اس میں احادیث ورجال کے صحت وعدم صحت اور ضعف کے بارے میں مولانا نیموی کی بھی ایسی نادر ونایاب تحقیقات ملتی ہیں جو ان کی منفرد تحقیقات کہی

جاتی ہیں اور جن کی مثال کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو علمی دنیا میں دھوم مچ گئی، اور اس کتاب کے فضل وکمال کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا، سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ ہندوستان کے مقتدر اور نامور حنفی علماء اس کتاب کی تحقیقات پڑھ کر نہایت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی اپنی تصنیفات میں " قال العلامة النیموی" کہہ کر ان تحقیقات کو نقل کیا، اس سلسلے میں ہم علامہ انور شاہ کشمیری کی فیض الباری، مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی بذل المجہود، مولانا اشرف علی تھانوی کی اعلاء السنن اور مولانا زکریا کاندھلوی کی اوجز المسالک خاص طور پر پیش کر سکتے ہیں، جن میں جابجا مولانا شوق نیموی کی تحقیقات پیش کی گئی ہیں اور قال العلامة النیموی کہہ کر ان کا حوالہ دیا گیا ہے، (۱۰) آپ ہی بتائیے کہ اس شہر عظیم آباد کی مرکزیت حدیث کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔

ڈیانواں:

ڈیانواں عظیم آباد شہر سے ۴۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے، جو انتہائی مردم خیز ہے، یہاں کے ارباب دولت وثروت ہمیشہ علم پرور اور دیندار رہے، مثال کے طور پر مولانا حافظ نور اور مولانا محمد زبیر کا نام پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن ان سے بھی بڑھ کر یہاں ایک اور شخصیت گذری ہے، جس نے علوم دینیہ اور خاص طور پر حدیث میں ایسا کمال پیدا کیا کہ اس کی وجہ سے وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام میں معروف ہے، وہ ہے علامہ شیخ شمس الحق ڈیانوی کی ذات گرامی۔

علامہ شمس الحق ڈیانوی:

مولانا شمس الحق ڈیانوی ۱۲۷۳ھ میں امنہ محلہ (عظیم آباد) میں پیدا ہوئے، پانچ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ننہال ڈیانواں چلے گئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے، ابتدائی کتابیں وہیں پڑھیں، اس کے بعد لکھنؤ اور مراد آباد چلے گئے، جہاں درسیات کی تکمیل کی، ۱۲۹۵ھ میں دہلی گئے اور وہاں مولانا سید نذیر حسین محدث بہاری ثم دہلوی سے استفادہ کیا اور حدیث کی سند حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد گھر واپس ہوئے اور تاحیات درس وتدریس میں معروف رہے، درس

کتابیں نہایت محنت سے پڑھاتے تھے، جس کی وجہ سے دور دور سے طلباء ان کے حلقۂ درس میں شامل ہونے کے لیے آتے، ان کے درس حدیث کا اتنا شہرہ تھا کہ تحصیل حدیث کے لیے آپ کے یہاں مدنی، یمنی اور نجدی طلباء آتے اور فیض حاصل کر کے واپس جاتے تھے، آپ چونکہ ایک رئیس اور بڑے زمیندار تھے اس لیے تمام طلباء کی کفالت خود کرتے اور بڑے ناز و نعم سے انہیں اپنے مدرسہ میں رکھتے تھے اور نہایت قدر دانی سے پیش آتے تھے۔

انہوں نے تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق پایا تھا، یہی وجہ ہے کہ تدریسی خدمات کے بعد اس کام میں ہمیشہ لگے رہے، انہوں نے تقریباً تیس کتابیں لکھیں جو زیادہ تر فن حدیث اور فقہ پر ہیں۔

ان کی سب سے اہم تصنیف عون المعبود فی شرح ابی داؤد اور غایۃ المقصود فی حل سنن ابی داؤد ہیں، یہ دونوں کتابیں ان کی اعلیٰ تصنیفات میں شمار ہوتی ہیں جنھیں پڑھ کر نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب کے علماء بھی جھوم اٹھے اور فن حدیث میں ان کے تبحر علمی، اعلیٰ لیاقت اور اختصاص کے قائل ہو گئے۔

عون المعبود کی عالمی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ یہ کتاب چودہ جلدوں میں دار الفکر بیروت سے ۱۳۸۸ھ میں طبع ہوئی جس کی تدوین و تحقیق شیخ عبدالرحمن محمد عثمانی نے کی، ان کی دیگر تصنیفات میں التعلیق المغنی علی الدارقطنی، رسالہ عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابۃ للنسوان اور التحقیقات العلی باثبات فرضیۃ الجمعۃ فی القریٰ نہایت اہم ہیں جن میں دینی و فقہی مسائل قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔

یہاں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مولانا شمس الحق ڈیانوی نہ صرف دینی علوم میں مہارت رکھتے تھے بلکہ معقولات اور اقلیدس میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

بہر حال علوم دینیہ وعقلیہ کا یہ روشن چراغ ۱۳۲۹ھ میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا اور علمی دنیا اس کی بے لوث خدمات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ (۱۱)

سہسرام:

سہسرام صوبۂ بہار کا معروف، مردم خیز اور قدیم شہر ہے، شیر شاہ سوری جیسا نامور بادشاہ یہیں کا باشندہ تھا، یہاں ایک معروف خانقاہ "خانقاہ کبیریہ" کے نام سے ہے جو مرجع خلائق اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے، اس شہر میں متعدد علماء، صوفیاء، شعراء، اور ادباء پیدا ہوئے جنہوں نے علم وادب کی دنیا میں شاندار خدمات انجام دی ہیں، انہیں نامور علماء میں ایک نام شیخ محمد نور علی سہسرامی کا ملتا ہے جو اس شہر میں ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں، اس کے بعد باہر چلے گئے تا کہ مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں، بیس سال کی عمر میں دہلی پہنچے اور ہندوستان کے عالم دین شاہ محمد اسحٰق دہلوی کی صحبت میں رہ کر تحصیل علم میں معروف ہو گئے، احادیث میں صحاح ستہ کی تمام کتابیں ان سے پڑھیں اور اس اہتمام سے پڑھیں کہ جس قدر پڑھتے جاتے تھے اس قدر لکھتے جاتے تھے، شاہ محمد اسحٰق دہلوی کے افادات نہایت پابندی سے منضبط کرتے جاتے تھے، پورے چودہ سال اپنے استاذ گرامی کی صحبت میں رہے اور ظاہری و باطنی علوم وفنون سے آراستہ ہوئے، ۱۲۵۰ھ میں گھر واپس ہوئے، حضرت شاہ کبیر الدین احمد سجادہ نشیں خانقاہ سہسرام کے حکم سے خانقاہ کبیریہ کے مدرسے کی ذمہ داری قبول کر لی اور وہیں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، شیخ محمد نور علی کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور تک پہنچا تو بہار کے علاوہ بنگال اور بنارس کے طلبہ کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے تبحر علمی سے فیض یاب ہوئے، اسی کے ساتھ قدرت نے انہیں تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق بخشا تھا، اس لیے تدریسی خدمات کے بعد دوسرے اوقات میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے، انہوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں پر نہایت تحقیقی اور مفید حواشی لکھے چند کتابوں کے نام جن پر ان کا حاشیہ ہے مندرجہ ذیل ہیں:

شرح وقایہ، ہدایہ اخیرین، تفسیر جلالین، الفوز الکبیر، مشکوٰۃ شریف، شرح موطأ، اس کے علاوہ صحاح ستہ پر بھی ان کے حواشی ہیں جو سب کے سب خانقاہ کبیریہ میں محفوظ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد نور علی نے پوری زندگی دینی علوم وفنون کے درس و تدریس اور تصنیف میں گذاردی خاص طور پر ان کی خدمات

حدیث ناقابل فراموش ہیں کیوں کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ حدیث کی اشاعت اور تبلیغ میں گذرا، اسی بنا پر ان کے نام کے ساتھ "محدث" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔(۱۲)

مصادر ومراجع:

(۱) معارف جلد ۲۳ شمارہ ۴، علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۲۳

(۲) معارف جلد ۲۲ شمارہ ۶، تذکرہ علمائے ہند: ص ۵۵، نزہۃ الخواطر ۴/ ۳۹۳

(۳) معارف جلد ۲۲ شمارہ ۶، نزہۃ الخواطر ۶/ ۳۳۰، علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۲۵

(۴) اعیان وطن ص ۶۱، معارف جلد ۲۲ شمارہ ۶، علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۲۵

(۵) اعیان وطن ص: ۶۲، علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۲۶

(۶) اعیان وطن ص: ۳۰۰، علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۲۷

(۷) تراجم علمائے اہل حدیث ۱/ ۳۶، علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۳۰

(۸) علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۵۲، تاریخ شعرائے بہار ۱/ ۱۰۱، خمخانہ جاوید ۴/ ۲۶۵

(۹) علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۳۲، تذکرہ علمائے اہلسنت

(۱۰) پوری تفصیلات کے لیے دیکھئے میری تصنیف: علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات

(۱۱) علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۳۱، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ص ۴۷، مولانا شمس الحق عظیم آبادی: ص ۶۷

(۱۲) معارف جلد ۲۹ شمارہ ۲۵، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ص ۵۰، علامہ شوق نیموی - حیات وخدمات: ص ۲۸-۲۹



’’زجاجۃ المصابیح‘‘ ایک جائزہ وتعارف

از: مولانا ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی

حیدرآباد

ہندوستان میں حضرت احمد سرہندی مجدد الف ثانی کا روحانی سلسلہ بھی شجر طوبی کی مانند ہے، جس کی جڑیں عمل کی سرزمین میں مستحکم اور شاخیں آسمان علم ومعرفت پر پھیلی ہوئی ہیں، جس کے پھل وپھول ہی نہیں برگ وبار بھی انمول وقیمتی ہیں۔

چنانچہ اسی فیض رساں سلسلہ کے عالی مقام متعین نے جہاں دعوت وتجدید دین، احیاء سنت واصلاح قلوب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے وہیں تصنیف وتالیف کے شعبہ کو نظر انداز نہیں کیا، اسی ثمر آور درخت کی ایک اہم شاخ ارض دکن پر بھی سایہ فگن ہوئی، اور اس کے گل سرسبد کی حیثیت سے مولانا سید عبداللہ شاہ محدث دکن کی شخصیت نمایاں ہوئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم میں حضرت مجدد الف ثانی کے خلفاء ومسترشدین کے ذیل میں حضرت عبداللہ شاہ صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں’’حضرت شاہ غلام علیؒ کے بڑے بڑے جلیل القدر خلفاء ہوئے، ان میں سے حضرت شاہ سعد اللہ جن کے خلیفہ شاہ محمد نعیم معروف بہ مسکین شاہ صاحب تیرہویں صدی کے وسط میں حیدرآباد تشریف لائے اور طویل قیام فرمایا، آصف شاہ ششم اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں ان کے ارادت مند تھے، شاہ سعد اللہ صاحب کے دوسرے خلیفہ سید محمد بادشاہ صاحب معروف بہ بخاری شاہ صاحبؒ (م ۱۳۲۸ھ) تھے، جن کے خلیفہ مولانا سید

عبداللہ شاہ صاحب (م ۱۳۸۴ھ) مصنف زجاجۃ المصابیح مدت دراز تک حیدرآباد میں سرگرم تربیت و ارشاد رہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ج ۴ ص ۳۶۸ وحاشیہ)

محدث دکن کی شخصیت:

مولانا عبداللہ شاہ صاحب کا تعلق سادات حسینی سے ہے، آپ کا نسب پینتالیس واسطوں سے حضرت امام علیؓ سے جاملتا ہے آپ کے جد امجد حضرت سید علیؒ نے عادل شاہی دور میں مکہ مکرمہ سے نقل مکانی کرتے ہوئے بیجاپور میں بود وباش اختیار کی تھی، اس وقت کے فرمانروا عادل علی شاہ نے آپ کو ضلع عثمان آباد (یہ موجودہ مہاراشٹرا کا ایک ضلع ہے) کے ایک قلعہ نلدرگ کے امور مذہبی کا نگراں مقرر کیا، ان ہی بزرگ کی آل و احفاد میں ایک درویش صفت عالم مولانا مظفر حسین صاحبؒ ہوئے جو تحصیل علم کے لئے حیدرآباد وارد ہوئے، اور علوم ظاہری سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت مسکین شاہ صاحب نقشبندیؒ سے روحانی تربیت حاصل کی، اور اسی سلسلہ ارشاد و تربیت کے مجاز بھی ہوئے، مولانا مظفر حسین سے حضرت گل بادشاہ کی صاحبزادی منسوب ہوئیں، حضرت بادشاہ صاحب خود بھی صوفی منش بزرگ اور اہل اللہ میں سے تھے، اور آپ کی دختر نیک اختر صلاح و تقویٰ میں یکتائے روزگار تھیں، اس قران السعدین پر اللہ تعالی نے مولانا مظفر حسین صاحب کو ایک فرزند ارجمند سے نوازا، جن کی ولادت باسعادت ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء کو شہر حیدرآباد میں ہوئی اور وہ سید عبداللہ کے نام سے موسوم ہوئے، جن کو بعد میں تاریخ نے سید عبداللہ شاہ صاحب محدث دکن کے نام سے یاد رکھا۔

تعلیم و تربیت:

مولانا عبداللہ شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، فقہ و تفسیر میں کمال پیدا کرنے کے لئے حضرت مولانا انواراللہ صاحب فضیلت جنگ سے رجوع ہو کر شرف تلمذ حاصل کیا جو علوم فقہ میں مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے اور احسان و سلوک میں حضرت امداداللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ مجاز تھے اور آپ ہی نے حیدرآباد کی قدیم دینی درسگاہ جامعہ نظامیہ قائم کی (نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۸۷)، اس استاذ کامل سے اکتساب فیض کے بعد مولانا عبداللہ شاہ

صاحب نے علم حدیث میں کامل رسوخ حاصل کرنے کے لئے حیدرآباد دکن کے مشہور استاذ حدیث حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہوکر زانوئے تلمذتہ کیا، اور آپ ہی سے سند حدیث واجازت حاصل کی، مولانا عبدالرحمٰن سہارنپوری مولانا احمد علی سہارنپوری کے فرزند ارجمند تھے جو علامہ شبلی نعمانی کے علم حدیث میں استاذ تھے، مولانا عبدالرحمٰن سہارنپوری نے اپنے والد ماجد ہی سے علم حدیث حاصل کیا اور انہوں نے حضرت اسحاق دہلوی سے استفادہ کیا تھا جبکہ علوم ادب میں وہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد ہیں اور روحانی تربیت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے حاصل کی تھی، آپ کے فرزند رشید مولانا عبدالرحمٰن سہارنپوری (تفصیل کے لئے دیکھئے نزہۃ الخواطر ج۸ ص ۲۳۸) نواب محسن الملک سید مہدی علی کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لائے اور علوم دینیہ اور طب یونانی کی نقید المثال خدمت انجام دینے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اس دارفانی سے رخصت ہوکر سرزمین حیدرآباد میں آسودہ خاک ہوئے، مولانا مرحوم کے ایک شاگرد مولانا عبداللہ شاہ صاحب رہے، جنہوں نے دکن میں علم حدیث کی نہ صرف شمع روشن رکھی بلکہ اس کی لوکو خلوص ولگن سے تیز کردیا، مولانا عبداللہ شاہ نے علوم متداولہ میں کمال حاصل کرلیا اور ان علوم کے یکتائے روزگار اساتذہ سے استفادہ کے بعد مولانا کا سینہ علوم کا گنجینہ ہوگیا جس کے بعد مولانا نے سلوک ومعرفت کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی ٹھان لی، اور ان اقلیم روحانی کے بے تاج بادشاہ حضرت سید محمد بادشاہ صاحبؒ سے وابستہ دامن ہوگئے۔

پیرمغان:

حضرت سید محمد بادشاہ صاحب جو بخاری شاہ صاحب کے نام سے معروف ہیں وہ نسبی حیثیت سے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے سلسلہ میں ہیں، آپ کے جد امجد نے بخارا سے منتقل ہوکر شہر کرنول میں سکونت اختیار کی، یہیں پر حضرت بخاری شاہ صاحب کی ولادت باسعادت ہوئی، پہلے پہل آپ عدالت عالیہ میں منصف مقرر ہوئے پھر حضرت سعد اللہ خلیفہ حضرت شاہ غلام علی صاحب سے رجوع ہوکر بیعت کی، تزکیہ نفس وتجلیہ قلب کے بعد ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی اور مسجد بخاری گلشن میں تربیت نفوس وتصفیہ قلوب میں مصروف عمل رہ کر ۱۳۲۸ھ میں مالک حقیقی سے جا

ملے، شاہ صاحب زندگی بھر مرجع خلائق رہے، جن سعید روحوں نے آپ سے تعلق جوڑ کر اپنے قلوب کی آئینہ گری کرائی ہیں، انہیں میں مولانا عبداللہ شاہ بھی ہیں، مولانا نے حضرت بخاری شاہ سے تعلق بیعت و ارشاد قائم کر لیا اور جلد ہی مدارج کی وہ ترقی حاصل کی کہ بخاری شاہ صاحبؒ نے ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں خلافت کے سلسلہ سے سرفراز کیا۔

خدمات جلیلہ:

معرفت و احسان سے اپنے قلب و روح کو منور اور علوم و فنون سے فکر و ذہن کو معمور کر لینے کے بعد مولانا عبداللہ صاحب نے وعظ و ارشاد اور تدریس و تصنیف کے سلسلے کا آغاز کیا اور ہر میدان میں وہ انمٹ نقوش چھوڑے جو رہتی دنیا تک قائم رہیں گے، اصلاح و ارشاد کے میدان میں جلد ہی آپ کی شہرت چہار دانگ عالم تک پہونچ گئی، اور خواص و عوام کا وہ جم غفیر آپ سے رجوع ہوا جس کی مثال حیدرآباد میں کم ہی ملتی ہے، آپ کی تربیت اتباع سنت پر مرکوز رہتی، آپ خرافات سے بیزار اور سنتوں کے عاشق زار تھے، اس معاملے میں وہ حیدرآباد میں حضرت مجدد الف ثانی کے نقش ثانی تھے، اس زمانے میں حیدرآباد مشائخ کی تساہل پسندی، امراء کی تعیش پسندی اور مذہب اثنا عشری کی بالادستی کی وجہ سے بدعات و خرافات کا مرکز بنا ہوا تھا، مولانا نے اسی شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ہزار ہا نفوس کی تربیت و اصلاح میں کامیاب رہے، اس مہتم بالشان نبوی مشن کی تکمیل کے لئے جو چیز آپ کی زاد راہ رہی وہ وہی ہے جو ہمیشہ سے اہل اللہ نے اختیار کی، یعنی تعلق مع اللہ میں غیر معمولی اخلاص وللّٰہیت، تعلق مع الناس میں خلوص و خیر خواہی اور زہد و توکل، انہی صفات، اعلیٰ کیفیات کے ساتھ آپ نے عوام میں جذبہ احیاء کتاب وسنت اور جذبہ عبادت و اطاعت پیدا کر دیا۔

علمی مشاغل:

اس اصلاحی و تربیتی سرگرمی کے ساتھ ساتھ مولانا کا علمی سفر بھی جاری رہا، جو یکسوئی اور خلوت پسندی کا متقاضی ہوتا ہے، لیکن مولانا کی شخصیت ہر دو کاموں کا حسین امتزاج بنی رہی، نہ عوامی زندگی کی ہلچل پرسکون علمی اشتغال میں تلاطم پیدا کر سکی اور نہ علمی سفر عوامی سرگرمیوں میں فتور پیدا کر سکا۔

اردو میں جو مولانا کی تصانیف منصۂ شہود میں آ چکی ہیں ان میں سرفہرست مذکورہ ذیل ہیں:

(۱) تفسیر سورۂ یوسف	(۲) گلزار اولیاء
(۳) علاج السالکین	(۴) سلوک نقشبندی
(۵) کتاب محبت	(۶) فضائل رمضان وغیرہ

عربی میں مولانا کی تالیفی خدمات کا واحد نمونہ اور مولانا کے علم و معرفت کا عطر مجموعہ، فن حدیث میں گراں قدر اضافہ و بیش قیمت سرمایہ، مجموعہ احادیث "زجاجۃ المصابیح" ہے جس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا۔

سفر آخرت:

مولانا کی کتاب زندگی علم و عمل سے عبارت تھی، مولانا حیدرآباد میں شمع محفل محبت بنے رہے، اور محبت و عبادت سے معمور زندگی گذار کر سنہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۵ء نفس مطمئن لے کر کوئے یار کو کوچ کر گئے۔

تقویٰ وطہارت، زہد وقناعت، معرفت خداوندی، محبت نبوی، آخرت کا استحضار، نفس کا قرار، معمولات کی پابندی، حالات پر استقامت، مخلوق خداوندی سے بے نیازی لیکن خیر خواہی، ماسویٰ اللہ سے بیگانگی لیکن عیال اللہ کے ساتھ شفقت و ہمدردی، آہ سحرگاہی و فراست امروزی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مولانا کی حیات مستعار کو عالم خلود میں حیات جاودانی عطا کی۔

زجاجۃ المصابیح:

علم حدیث میں "مشکوۃ المصابیح" کو جو عمومی شہرت حاصل ہے، وہ اہل علم سے مخفی نہیں، اپنی درسی و منطقی ترتیب اور حسن پیشکش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو لازوال قبولیت عطا کی، امام بغوی اور امام خطیب تبریزی کی انتخاب و اختیار اور خلوص و اخلاص نے اس کتاب کو علماء و محدثین کا منظور نظر بنا دیا، چونکہ اس تصنیف لطیف کے ہر دو مؤلف امام شافعی کے مسلک و مشرب کے ہم خیال تھے، چنانچہ انتخاب حدیث میں یہ رجحان پوری طرح نمایاں ہے، مولانا عبداللہ شاہ صاحب کو یہ حقیقت کھٹکتی تھی، اور

یہ خیال دل میں جاگزیں ہوگیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے مستدلات و ترجیحات کو اسی انداز و ترتیب میں مدون کیا جائے جس انداز میں مشکوٰۃ تالیف کی گئی، مولانا نے اس عظیم الشان خدمت کے لئے کمر کس لی اور سنہ ۱۳۶۷ھ میں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جمع و تدوین کا آغاز فرمایا، اس وقت مولانا کی عمر پچیس سال تھی، یہ تالیف کا کام سنہ ۱۳۵۸ھ تک جاری رہا، یعنی چالیس قمری سالوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل پانچ جلدوں میں اس مجموعہ کو مرتب کیا، پھر اس کتاب کی طباعت کے لئے کسی امیر و رئیس کے دروازے کو کھٹکھٹانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے دربار میں دست سوال دراز کرتے ہوئے فرمایا "الٰہی کتاب کی تکمیل تو اس عاجز نے کردی، اشاعت کا انتظام اپنے غیب کے خزانے سے فرمادے، دعا مقبول ہوئی اور اس کتاب کی پانچوں جلدیں ۱۹۴۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آگئیں۔

اس سے پہلے کہ کتاب کے بارے میں کچھ گوش گذار کیا جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے بارے میں اہل علم اور اہل نظر کے چند تاثرات پیش کئے جائیں تاکہ اس تالیف لطیف کی اہمیت اجاگر ہوسکے۔

اہل علم کے تأثرات:

اس سلسلے میں سب سے اہم رائے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی ہے، جب شیخ تک پہلی جلد پہونچی تو مؤلف علام کو خط لکھتے ہوئے فرمایا" التقیت بالجزء الأول من کتابکم " زجاجة المصابیح" فاستنار به بصری و بصیرتی ، و شکرت الله تعالیٰ علی ما آتاکم و سدد کم ، فجزا کم الله عن الإسلام و السادة الحنفیة أفضل الجزاء ".

مولانا منظور احمد نعمانی مدیر "الفرقان" وصاحب معارف الحدیث فرماتے ہیں" حدیث نبوی ﷺ کے قصر عالی شان میں ایک اینٹ کی کمی تھی، الحمدللہ اس تصنیف نے اس کی تکمیل کردی"۔

(تذکرہ محدث دکن مصنفہ ڈاکٹر عبدالستار خاں ص ۷۹)

مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق نے اس تصنیف کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

''احناف پر صدیوں سے جو قرض تھا، مولانا نے چکا دیا''۔

محتویات:

ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل پانچ جلدوں میں جن عناوین پر احادیث منتخب کی گئی وہ حسب ذیل ہیں: کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الزکوۃ، کتاب الحج، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب البیوع، کتاب القصاص والحدود، کتاب الامارۃ، کتاب الجہاد، کتاب الصید و الاطعمۃ، کتاب اللباس، کتاب الطب والرؤیا، کتاب الآداب، کتاب الفتن، کتاب الفضائل و المناقب، ہر کتاب متعدد ابواب پر مشتمل ہے جو متعلقات کتاب کے گویا سرنامے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے چند خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں جن کا تذکرہ از حد ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) جامعیت: یہ کتاب جہاں اپنی محتویات اور موضوعات میں جامع ہے، وہیں انتخاب حدیث کے اعتبار سے بھی جامع ہے، مراجع میں صحاح ستہ کے علاوہ، بیہقی، دارمی، دارقطنی، امام محمدؒ، امام مالکؒ جیسے تمام ائمہ حدیث کی کتب شامل ہیں، نیز اس کتاب کی قیمت اس لئے بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ اکثر ابواب کی مناسبت سے آیات بھی ذکر کر دی گئیں۔

(۲) ترتیب: ترتیب اگرچہ مشکوٰۃ شریف کی ہے، لیکن تین فصلوں کی تقسیم کو اختیار نہیں کیا گیا۔

(۳) ہر باب میں انتخاب حدیث کا انداز استقرائی ہے، یعنی احادیث اس انداز میں مرتب کی گئیں کہ شمولیت و جامعیت موضوع کو نہ صرف نکھار دیتی ہے بلکہ حنفی مسلک کو استدلالی انداز میں تقویت عطا کرتی ہے، اس کے ثبوت کے لئے ہم اس کتاب کا ایک مختصر سا باب پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جس کا موضوع "قیام شهر رمضان" ہے:

باب قيام شهر رمضان

و قول الله عزوجل إنا أنزلناه في ليلة مباركة إنا كنا منذرين فيها يفرق كل أمر حكيم.

فصل: عن عائشة زوج النبي ﷺ أن رسول الله ﷺ كان يرغب الناس في قيام رمضان من

غیر أن یأمرهم بعزیمة أمر فیه فیقول من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه رواه النسائی.

و عن أبی هریرة أن رسول الله ﷺ قال: من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه رواه البخاری،

وعن عبدالرحمن قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم إن الله تبارک و تعالی فرض صیام رمضان علیکم و سننت لکم قیامه فمن صامه و قامه ایمانا و احتساباخرج من ذنوبه کیوم و لدته أمه رواه النسائی و البیهقی و ابن ماجة و ابن أبی شیبة.

و عنه قال قال رسول الله ﷺ من قام رمضان ایمانا و احتساباخرج من ذنوبه کیوم و لدته أمه رواه النسائی.

و عن عائشة قالت کان رسول الله ﷺ إذا دخل رمضان لم یأت فراشه حتی ینسلخ رواه البیهقی

فصل: عن أبی ذر قال صمت مع رسول الله ﷺ رمضان و لم یقم بنا حتی بقی سبع من الشهر فلما کانت اللیلة السابعة خرج فصلی بنا حتی مضی ثلث اللیل ثم لم یصل بنا السادسة حتی خرج لیلة الخامسة فصلی بنا حتی مضی شطر اللیل فقلنا یا رسول الله لو نفلتنا فقال إن القوم إذا صلوا مع الإمام حتی ینصرف کتب لهم قیام تلک اللیلة ثم لم یصل بنا الرابعة حتی إذا کانت لیلة الثالثة خرج و خرج بأهله فصلی بنا حتی خشینا أن یفوتنا الفلاح قلت و ما الفلاح قال السحور رواه الطحاوی و روی ابوداؤد و الترمذی و النسائی و ابن ماجه نحوه.

و عن أبی هریرة قال خرج رسول الله ﷺ فإذا أناس فی رمضان یصلون فی ناحیة المسجد فقال ماهؤلاء فقیل هؤلاء ناس لیس معهم قرآن و أبی بن کعب یصلی وهم یصلون بصلاته فقال النبی ﷺ أصابوا و نعم ما صنعوا رواه ابو داؤد.

لا يقال هذا الحديث ضعيف بمسلم بن خالد فانه ضعيف كما نص عليه ابوداؤد لانا نقول مسلم بن خالد ليس متفقا على تركه حتى يترك روايته و ثقه ابن معين في رواية عن و ابن حبان و اخرج له غير حديث في صحيحه و قال ابن عدى ارجو لا بأس به و هو حسن الحديث.

و عن عبدالله بن مسعود قال ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن رواه احمد و الطبراني و الطيالسي و البزاز وأبو نعيم موقوفا و ذكره الرازي و العيني مرفوعا.

و عن العرباض بن سارية قال قال رسول الله ﷺ من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافا كثيرا فعليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها و عضوا عليها بالنواجذ و اياكم و محدثات الأمور إن كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة رواه احمد و ابوداؤد و البيهقي و روى الترمذي و ابن ماجة نحوه و قال الترمذي هذا حديث حسن صحيح.

و عن حذيفة قال قال النبي ﷺ اقتدوا باللذين من بعدى أبي بكر و عمر رواه الترمذي و احمد و ابن ماجه و حسنه الترمذي و صححهٗ ابن حبان و الحاكم.

و عن ابي هريرة قال كان رسول الله ﷺ يرغب في قيام رمضان من غير أن يأمر هم فيه بعزيمة فيقول من قام رمضان إيمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه فتوفى رسول الله ﷺ و الأمر على ذلك ثم كان الأمر على ذلك في خلافة ابي بكر و صدراً من خلافة عمر على ذالك رواه مسلم.

و عن عبد الرحمن بن عبدالقارى قال خرجت مع عمر بن الخطاب ليلة إلى المسجد فإذا الناس أوزاع متفرقون يصلى الرجل لنفسه و يصلى الرجل فيصلى بصلاته الرهط فقال عمر إني لو جمعت هؤلاء على قارئ واحد لكان أمثل ثم عزم فجمعهم على أبي بن كعب قال ثم خرجت معه ليلة أخرى و الناس يصلون بصلاة قارئهم قال عمر نعمت البدعة هذه و التي تنامون

عنها أفضل من التي تقومون يريد آخر الليل و كان الناس يقومون أوله رواه البخاري.

و عن عبدالله بن أبي بكر قال سمعت أبي يقول كنا ننصرف في رمضان من القيام فنستعجل الخدم بالطعام مخافة فوت السحور و في أخرى مخافة الفجر رواه مالك.

فصل : عن ابن عباس أن النبي ﷺ كان يصلي في رمضان بعشرين ركعة في غير جماعة و الوتر رواه البيهقي و الطبراني و ابن أبي شيبة و البغوي و عبد بن حميد و فيه ضعف.

و عن يزيد بن رومان قال كان الناس يقومون في زمن عمر بن الخطاب بثلاث و عشرين ركعة رواه مالك و قال في آثار السنن إسناده مرسل قوي.

و عن عمر أنه جمع الناس على أبي بن كعب و كان يصلي بهم عشرين ركعة رواه البيهقي و ابن أبي شيبه.

و عن السائب بن يزيد قال كنا نقوم في عهد عمر بعشرين ركعة و الوتر رواه البيهقي و على عهد عثمان و عليّ مثله.

و عن شبرمة و كان من أصحاب علي أنه كان يؤمهم في رمضان فيصلي خمس ترويحات رواه البيهقي.

و عن أبي عبدالرحمن السلمي أن عليا دعا القراء في رمضان فأمر رجلا بأن يصلي بالناس عشرين ركعة و كان علي يوتر بهم رواه البيهقي.

اس باب میں مؤلف نے جس خوبی کے ساتھ قیام رمضان کی مشروعیت پر کلام کیا وہ توجہ کا طالب ہے، سب سے پہلے سورہ دخان کی آیت کریمہ بیان کی اور اس آیت کو رمضان المبارک سے متعلق قرار دیا نہ کہ نصف شعبان کی رات سے، جیسا کہ بعض مفسرین کا رجحان ہے، پھر بتدریج اس حقیقت کو ذہن نشین کیا کہ اجماع امت کی حیثیت آ گئی ہے، (ما رآه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن) پھر خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کا تعامل بیس رکعت کے قیام لیل کا تذکرہ کیا، جس سے حق کے متلاشی دل کو سامان تسلی میسر ہو جاتا ہے۔

ضروری تجاویز:

اس کتاب کی اشاعت، اس کی افادیت میں اضافے کے لئے چند اہم خدمات انجام دینی ہوں گی، جس کا اشارہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

(۱) کتاب میں شامل احادیث کی جامع تخریج کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے، کسی استاذ حدیث کی نگرانی میں اسکالرس کی ایک ٹیم یہ کام اپنے ذمہ لے تو یہ کام بہتر انداز میں انجام پاسکتا ہے۔

(۲) اس کتاب کے بعض مقامات تعلیقات وتشریحات کے متقاضی ہیں، اگر چہ کئی مقامات پر خود مؤلف علام نے خود بنفس نفیس مفید علمی تعلیقات کی ہیں، لیکن ان میں مزید اضافے کی ضرورت ہے۔

(۳) کتاب کی طباعت لیتھو پر ہوئی، اب کمپیوٹر کی کمپوزنگ کے ذریعہ معیاری انداز میں طباعت کی ضرورت ہے، اس نئی طباعت میں احادیث کی ترقیم بھی ضروری ہے، تا کہ مراجعت میں سہولت ہو۔

امید ہے کہ مذکورہ تجاویز کے ساتھ کتاب کی اشاعت ہو جائے تو ہندوستانی محدثین کی حدیث نبوی ﷺ کی خدمت کا عالم اسلام میں ایک اور نقش جمیل قائم کر دے گی۔



”فضل اللہ الصمد فی توضیح الأدب المفرد“
ایک جائزہ

از: جناب محمد سراج الدین
حیدرآباد

عروس البلاد شہر حیدرآباد دکن کے آسمان علم وفضل پر کئی ایک ستارے چمکے جن میں مولانا انوار اللہ فاروقی، مولانا عبداللہ شاہ، مولانا ابوالوفا الافغانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید ابراہیم ادیب مقرر بے نظیر بہادر یار جنگ اور ان کے ہم پایہ بڑی بڑی ہستیاں شامل ہیں، انہیں میں سے ایک بہت معروف خادم حدیث شریف مولانا فضل اللہ الجیلانی ہیں، جنھوں نے (اخلاق وآداب کی احادیث پر مشتمل) امام بخاریؒ کی کتاب ”الأدب المفرد“ کی توضیح میں دوضخیم جلدوں میں ایک شرح ”فضل اللہ الصمد“ لکھی ہے، یہ بلند پایہ شرح بلاد عرب وعجم کے علمی اور دینی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔

مولانا فضل اللہ صاحب اپریل ۱۹۰۲ء میں مونگیر (بہار) کے ایک علمی خانوادہ میں پیدا ہوئے جس کی ملی خدمات اظہر من الشمس ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کے اجداد بغداد سے ہندوستان آئے تھے اور اولاً کھتولی (یوپی) میں قیام پذیر ہوئے اور ان کے خدمات کے اعتراف میں شیخ پورہ نامی علاقہ انہیں دیا گیا تھا۔

خاندان:

مولانا کے خاندان کے بارے میں ”ہمہ خاندان آفتاب است“ کہنا پورے طور پر صادق

آتا ہے، آپ کے دادا مولانا محمد علی مونگیریؒ تھے، والد ماجد کا نام مولانا احمد علی صاحب تھا، چچا مولانا منت اللہ رحمانی تھے اور چچا زاد بھائی مولانا محمد ولی رحمانی صاحب اَطال اللہ عُمرہ ہیں، سبھی علم وفضل اور ملی خدمات میں ممتاز رہے ہیں۔

ماحول:

مولانا کے دادا مولانا محمد علی مونگیریؒ جیسا کہ سب کو معلوم ہے حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے تربیت یافتہ اور خلیفہ مجاز تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے امت کے نفع کے لیے بڑے بڑے کام لیے جن میں رد عیسائیت، رد قادیانیت اور دفاع اسلام شامل ہیں اور فی زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا محمد علی مونگیری کے فیض کی ایک جیتی جاگتی نشانی ہے جسکے وہ بانی اور ناظم اول تھے۔

مولانا کے والد مولانا احمد علی صاحب کے اندر غیرت ایمانی اور حمیت دینی کا غیر معمولی جذبہ تھا اور وہ باپ کے دوش بدوش دفاع اسلام کی مہم میں لگ گئے تھے، بعد ازاں وہ ندوۃ العلماء کی تحریک میں جٹ گئے اور اس زمانے کے مددگار ناظم مولانا حکیم عبدالحی الحسنی صاحبؒ کے دست راست مانے جاتے تھے، افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور مولانا احمد علی صاحب ۱۳۱۱ھ میں عنفوان شباب میں ہی انتقال فرما گئے، مولانا احمد علی صاحب، مولانا محمد علی مونگیریؒ کے سب سے بڑے فرزند تھے اور آپ کی پہلی حرم کے بطن سے تھے، مولانا فضل اللہ صاحب کے چچا مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار مولانا سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔

اپنے والد کے انتقال کے وقت مولانا بہت چھوٹے تھے، دادا مولانا محمد علی صاحب مونگیری نے انہیں اپنی آغوش تربیت میں لے لیا اور بڑی توجہ کے ساتھ ان کی تعلیم وتربیت کی کوشش کی ''وما اُحسن مربیا''، مولانا نے ایسی فضا میں پرورش پائی تھی جس میں مستشرقین علم وتحقیق کے نام پر اسلامی شریعت، سیرت نبوی اور تاریخ اسلام کو داغ دار کر رہے تھے، اور اس زمانے میں کچھ اللہ کے بندے اپنی عزت وناموس کو خطرے میں ڈال کر دفاع اسلام کا کام کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے مولانا فضل اللہ صاحب کو ذہن ثاقب، طبع ارجمند اور مزاج خیر پسند عطا فرمایا تھا۔

سونے پہ سہاگہ یہ کہ مولانا فضل اللہ صاحب کی اعلیٰ تعلیم محدث کبیر مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی کے ہاتھوں ہوئی، واضح رہے کہ مولانا عبداللطیف صاحب بعد میں صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے عہدے پر فائز ہوئے، آپ کی صاحبزادی سے مولانا فضل اللہ صاحب الجیلانی کا نکاح ۱۷سال کی عمر میں ہوا تھا۔

شرح ترمذی شریف مؤلفہ مولانا عبداللطیف:

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا محدث مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی نے سالہا سال کی محنت کے بعد بارہ جلدوں میں ترمذی شریف کی ایک نادر شرح لکھی، اس کام میں مولانا فضل اللہ صاحب معاون رہے اور بعدازاں اس پر نظر ثانی کی اور حواشی کا اضافہ کیا۔

مولانا فضل اللہ صاحب نے کئی اہل علم اور اہل ثروت کو اس شرح کی طباعت کی طرف متوجہ کیا لیکن اس ضخیم شرح کو طبع کرنے میں کوئی ناشر سرمایہ لگانے کو تیار نہیں ہوا اور مولانا کے دل کی تمنا دل ہی میں رہی، ممکن ہے بعد والوں نے سوچا ہو کہ ترمذی شریف کی اور بھی شروح ''تحفۃ الأحوذی'' وغیرہ منظر عام پر آچکی ہیں لیکن اہل علم یہ جانتے ہیں کہ ''ہر گلِ را بوئے دیگر است''۔

بندہ کا خیال ہے کہ اب بھی اگر مولانا محمد ولی رحمانی صاحب اور مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی مظاہری دامت برکاتہم اس طرف توجہ فرمائیں تو یہ عظیم اور بے مثال شرح منظر عام پر آئے اور اساتذہ حدیث اور طلبا کو بے حد نفع پہنچے، مولانا فضل اللہ صاحب کی صاحبزادی محترمہ ڈاکٹر حنیفہ رضی صاحبہ نے بتلایا کہ اب اس شرح کا مسودہ مولانا محمد ولی رحمانی مدظلہ العالی کے پاس ہے۔

روحانی تربیت:

مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ جیسے شیخ وقت کی صحبت نے مولانا فضل اللہ صاحب کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا، مولانا جلد ہی علم وسلوک کے مدارج عالیہ تک پہنچ گئے تھے۔

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی بیان کرتے ہیں کہ مولانا، مولانا محمد علی صاحبؒ کی شفقت اور حسن توجہ کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی راہ سلوک کے

واردات بھی بیان کرتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ:

مولانا عرصہ دراز تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے شعبہ دینیات میں نائب پروفیسر رہے اور تفسیر قرآن کریم کی تدریس آپ کے ذمہ تھی، زندگی بھر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ساتھ اذکار واشغال کا سلسلہ بھی جاری رہا، علوم اسلامیہ میں کتاب وسنت سے خاص تعلق تھا، قرآن مجید بڑی توجہ کے ساتھ پڑھتے تھے، اس کے رموز واسرار اور نکات واشارات پر ان کی گہری نظر تھی، قرآن کی توضیح اور تفسیر میں خاص طور پر احادیث پیش نظر رہتی تھیں، کتب حدیث میں یوں تو صحاح کی سبھی کتابیں مطالعہ میں رہتی تھیں لیکن امام بخاریؒ کی "الجامع الصحیح" سے خاص شغف تھا۔

شخصیت:

مولانا علم وفضل، تقویٰ اور طہارت، شرافت اور حسن اخلاق میں نمونہ سلف تھے، ان کی فہم وفراست، لیاقت وصلاحیت اور محنت اور کارگذاری کی بناء پر سب کے دلوں میں اللہ نے محبوبیت ڈال دی تھی، عام لوگوں سے بہت خندہ پیشانی، بہت اخلاق ومحبت سے ملتے۔

طبیعت میں بے انتہا سادگی تھی، طلبا مختلف اوقات میں آکر مستفید ہوتے، نہ وقت کی قید تھی نہ جگہ کی، گھر ہو کہ کوئی مجلس، مسجد ہو کہ بازار، ہر مقام پر، ہر وقت مولانا پڑھانے کے لیے بیٹھ جاتے، اس میں کوئی تکلف نہ فرماتے، سلام میں پہل کرتے ؎۔

ریٹائرمنٹ کے بعد شہر حیدر آباد کے ایک مرکزی علاقے میں لیدر گڈس کی دکان کر لی تھی، اس طرح علمائے سلف امام ابوحنیفہؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ کی طرح تجارت کو ذریعہ روزگار بنایا، مولانا لوگوں سے ملنے ملانے والے آدمی تھے، احباب سے ملنے گھروں پر از خود پہنچ جاتے، عام علماء کی طرح سے الگ تھلگ رہنے کا مزاج نہ تھا۔

حلیہ:

مولانا پر جس کی نظر پڑتی فوراً آپ کی وجاہت اور ثقاہت سے متاثر ہو جاتا، نورانی چہرہ،

باوقار ہیئت، چمکدار آنکھیں، جسمانی قد تو کم تھا مگر اللہ نے رفعتِ علم سے سرفراز کیا تھا، اہتمام سنت میں ہمیشہ عمامہ باندھا کرتے اور علماء کا جبّہ زیب تن کرتے۔

آخر زمانے میں راقم الحروف سے (جسے آپؒ سے آپ کی کتاب درساً درساً پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے) فرماتے میاں دعا کرو مرتے دم تک جماعت کی نماز چھوٹنے نہ پائے، میں طالب علمانہ شوخی سے عرض کرتا "مولانا یہ تو آپ اپنی صحت کے لیے دعا کروا رہے ہیں" تو سن کر مسکرا دیتے، ریاض سعودی عرب کے قیام کے دوران ایک کار کے حادثے کا شکار ہوئے، اور بالآخر علی گڑھ میں اپنی صاحبزادی ڈاکٹر رؤفہ اقبال کے مکان پر مختصر علالت کے بعد جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں انتقال فرمایا۔

الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے لکھا ہے "وقد لمست من الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ فی زیاراتی لہ اوزیاراتہ لی عالما عاقلا وفاضلاً جلیلا مع الخلق الحسن والأدب الرفیع والتواضع الجم"۔

کیا ہی پیارے انداز میں شیخ عبدالفتاح نے مولانا کی شخصیت کی تصویر کھینچی ہے۔

تصانیف:

مولانا کی شہرۂ آفاق تصنیف بزبانِ عربی "فضل اللہ الصمد فی توضیح الأدب المفرد" ہے، جس کا تفصیلی ذکر آرہا ہے، اس کے علاوہ مولانا نے "حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ" کی سوانح لکھی ہے جو اردو میں ہے، اس کتاب میں مولانا نے اسلامی تجارت کے اصول بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔

یہ آپ ہی کا علمی فیضان ہے کہ آپ کی صاحبزادی ڈاکٹر حنیفہ رضی نے "عبداللہ بن مسعودؓ اوران کی فقہ" پرڈاکٹریٹ کیا اوران کا مقالہ کتابی شکل میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہواہے۔

اسی طرح آپ کی بڑی صاحبزادی ڈاکٹر رؤفہ اقبال نے بھی "غزوات نبوی" پرایک کتاب لکھی جو علی گڑھ سے شائع ہوئی، دونوں بہنیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریس سے متعلق رہیں، مولانا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن تھے۔

فضل الله الصمد في توضيح الأدب المفرد:

شریعت مطہرہ کے عالی مقاصد اور مغز ولب لباب میں یہ بات داخل ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں انسان کے اخلاق سنور جائیں اور عمدہ آداب وجود میں آجائیں، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مکارم اخلاق کی تعلیم دی اور کامل آداب سکھلائے۔

اس سلسلے کی پہلی کتاب جس میں آداب اور اخلاق نبوی کے سلسلے کی احادیث جمع کی گئیں ہیں جوامت مسلمہ کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، وہ کتاب امیر المؤمنین فی الحدیث ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ کی کتاب "الادب المفرد" ہے، امام بخاریؒ کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی اور وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی، اللہ تعالیٰ امۃ مسلمۃ کی طرف سے ان کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔

حدیثوں کا درجہ فضائل اعمال میں: یہ بات تو سب اہل علم کے علم میں ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الجامع الصحیح کے لیے احادیث کو قبول کرنے کے لیے بڑی کڑی شرطیں رکھی تھیں، چنانچہ اپنی "الجامع الصحیح" میں آداب، اخلاق اور زہد وغیرہ کے بارے میں انہوں نے ان حدیثوں کو شامل نہیں کیا جو اُنکے مقرر کردہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔

مگر بہر حال اخلاق وآداب امت کی اہم ضرورت ہے اس لیے امام صاحبؒ نے ایک مستقل کتاب "الادب المفرد" کے نام سے مرتب فرمائی جس میں صحیح کے علاوہ حَسن اور بعض ضعیف حدیثیں بھی لے لیں، اور احادیث کی تخریج میں توسع سے کام لیا اور یہ بات تو علمائے حدیث کے نزدیک مسلم ہے کہ فضائل اعمال کی روایات میں قدرے ضعف قابل قبول ہے۔

چنانچہ خطیب بغدادی اپنی کتاب الکفایۃ (ص ۱۳۴) پر امام احمد بن حنبل کا قول نقل کرتے ہیں "إذا روينا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الحلال والحرام والسنن والأحكام، تشددنا في الأسانيد و إذا روينا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في فضائل الأعمال وما لا يضع حكما ولا يرفعه تساهلنا في الأسانيد".

بیہقی نے اپنی کتاب المدخل لدلائل النبوۃ (ص ۳۴) پر امام عبدالرحمٰن بن مہدی سے اور

الحافظ السخاوی نے فتح المغیث (ص ۲۸۸) پر ابن معین، ابن مبارک، ابن عیینہ، سفیان ثوری وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی یہی بات نقل کی ہے۔

چنانچہ المحدث الجلیل حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب رئیس قسم التخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند نے لکھا ہے" وإن كتاب الإمام الهمام محمد بن اسمعيل البخاري "الأدب المفرد" كتاب قيم، منقطع النظير، من خير الكتب، التي ألفت في هذا الموضوع وأنفعها وأجمعها، ولرتبته العالية وأهميته البالغة ظل مدة طويلة ضمن المقررات الدراسية، وفي أمس الحاجة إلى من يهتم بتصحيح أخطائه وغلطاته المطبعية ويعنى بتخريج أحاديثه وشرح معانيها وإخراج الكتاب في حلة قشيبة فاخرة تليق بمكانته السامية" ۸۔

الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے لکھا ہے "مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ کتاب اتنی اہم ہے اور ایسے ضروری موضوع کا احاطہ کرتی ہے تقریباً ایک ہزار سال کے طویل عرصہ میں علمائے سابقین نے اس کی شرح کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی، اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت اور سعادت حضرت علامہ المحقق المحدث الکبیر الشیخ فضل اللہ کے حصے میں رکھی تھی"۹۔

مولانا فضل اللہ صاحب کا تحقیقی کام:

چالیس سال سے زیادہ کی محنت شاقہ کے بعد مولانا نے یہ شرح لکھی، دنیا کے مختلف ملکوں سے "الادب المفرد" کے نسخوں کے فوٹو منگوائے جن میں قاہرہ، دمشق، استنبول شامل ہیں، بعض مستشرقین سے بھی مدد لی جن میں ڈاکٹر ف کرنکو اور پروفیسر بروکلمن شامل ہیں۔

بعض بڑے قدیم ہندوستانی کتب خانوں کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور مولانا صدیق حسن خاں صاحب کا کتب خانہ بھوپال، مولانا صبغت اللہ صاحب کے کتب خانہ مدراس اور بہار اور اعظم گڑھ کے کتب خانوں سے بھی قدیم نسخے جمع کیے، مقابلہ کیا، متن کی تصحیح فرمائی۔

(۲) بڑے محدثین کے اصول کے مطابق اسانید کی تصحیح فرمائی۔

(۳) سارے رواۃ کے تراجم لکھے، مولانا نے لکھا ہے" وقد قمت بتصحيح هذا الكتاب ما

استطعت فلم أدع سندا إلا أصلحته و لا متنا إلا نقحته ''۔

(۴) بہت ہی مفید حواشی لکھے، ان حواشی میں احادیث وآثار کی تخریجات، اسانید اور رجال کے احوال کی تحقیق، فوائد اور نکات کا استنباط کیا، متون کے معنی کی توضیح کی جن میں مشکل الحدیث شامل ہے۔

(۵) بیان کیے گئے ادب، اخلاق، حکمت کی تفصیل متعدد علماء، فقہاء، صوفیہ کے مشرب کی روشنی میں دی۔ (مولانا نے مقدمہ میں لکھا ہے" وقد جمعت فیہ کلام جھابذۃ العلماء'')

(۶) اس بات کی کوشش کی کہ حق بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے واضح طور پر سامنے آجائے، الفاظ غریبہ کی توضیح کی پھر مولانا نے فہرستیں بنائیں جن کی تعداد ۶۵ ہے، ان فہارس کی مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی بڑی تعریف فرمائی ہے۔

اس طرح کتاب" الأدب المفرد" کو اور آسانی سے قابل فہم و قابل استفادہ بنادیا ہے۔

جو علمائے کرام" الأدب المفرد" کے پڑھنے پڑھانے نیز تعلیق و تخریج وغیرہ سے متعلق ہیں، ان سب کے لیے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، اس شرح کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بار بار یہ کتاب بلاد عرب میں قاہرہ (مصر) حمص (سوریا) دمشق (سوریا) استنبول (ترکی) مکہ مکرمہ وغیرہ سے چھپی اور درسی نصاب میں شامل کی گئی، چنانچہ مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے لکھا ہے کہ جو کوئی بھی" الأدب المفرد" کے بارے میں کچھ لکھنا چاہے تو اسے اس بات سے مفر نہیں کہ پہلے" فضل اللہ الصمد" کا مطالعہ کرے الخ۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ فرماتے ہیں: اگر چہ مولانا کے حالات زندگی کما حقہ دستیاب نہیں ہوئے لیکن ان کی کتاب خود ان کا بہترین تعارف ہے۔

اس کتاب سے مولانا کے بے پناہ علم فہم کی باریک بینی اور سنت نبویؐ اور آداب اسلامی کے پھیلانے کے لیے اہتمام اور حرص کا پتہ چلتا ہے[1]۔ اس کے علاوہ مولانا نے اپنے مقدمہ میں کتب حدیث کی صحیح اور تحقیق کے بعض اہم اصول بیان فرمائے ہیں۔

بڑے بڑے علماء مثلاً مولانا یوسف بنوریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان

ندویؒ، علامہ عبدالعزیز میمنیؒ، مولانا حلیم عطاؒ اور مولانا ابوالحسن ندویؒ نے بڑے اونچے الفاظ میں کتاب کی تقریظ فرمائی ہے، جو کتاب میں شامل ہیں[۳]۔

علمی سرقہ:

آخر میں ایک افسوس ناک بات کا ذکر کرتا ہوں، مولانا نے جو محنت کی وہ کی، اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے لیکن چند سال پہلے بستی نظام الدین نئی دہلی کے ایک ''بزرگ'' جو مکتبۃ العلم کے نام سے ایک دکان بھی چلاتے ہیں ''فضل اللہ الصمد'' کو جوں کا توں اپنے نام سے چھاپ لیا اور دھڑا دھڑ کتاب کو بلاد عرب بھیج رہے ہیں، یہ انتحال یا علمی سرقہ نہیں تو اور کیا ہے، اصل کتاب تو دو جلدوں میں تھی، موصوف نے سارے تراجم رواۃ کو حذف کر دیا اور ایک جلد میں کتاب شائع کر دی اور ٹائٹل پر تعلیقات اور تحقیق اور شرح کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کر لیا، خیر سے یہ بزرگ ایک مدرسہ کے شیخ الحدیث بھی کہلاتے ہیں، مولانا کی کتاب میں انہوں نے کچھ نہ بڑھایا نہ گھٹایا اور کوئی خدمت کی، بلکہ مفت میں مالک بن بیٹھے[۳] فالی اللہ المشتکی۔

حتی کہ کتاب کے شروع میں مولانا فضل اللہ صاحب کے مقدمے کو بھی ہو بہو اپنی طرف منسوب کر لیا اور یہ بتایا کہ انہوں نے یوں یوں محنت کی۔

حالاں کہ ابھی مولانا کی صاحبزادیاں بقید حیات ہیں، مولانا کے چچازاد بھائی مولانا محمد ولی رحمانی صاحب اطال اللہ عمرہ موجود ہیں، پھر بھی دن دھاڑے یہ سرقہ ہوا ہے انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔

مصادر:

(۱) بقول ڈاکٹر حنیفہ رضی (صاحبزادی مولانا فضل اللہ صاحب) شخصی ملاقات سے حاصل کردہ معلومات (Private Communication)

(۲) مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی، معارف جون ۱۹۷۹ء، وفیات۔

(۳) ڈاکٹر حنیفہ رضی، شخصی معلومات (Private Communicatio)

(۴) ارشاد مولانا فضل اللہ صاحب، راقم الحروف سے شخصی طور پر فرمایا تھا۔

(۵) راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ۔

(۶) مقدمہ ''فضل اللہ الصمد'' الطبعۃ الخامسۃ، مکتبۃ دار الاستقامہ مکۃ المکرمۃ۔

(۷) ''حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ'' ڈاکٹر حنیفہ رضی مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

(۸) تقدیم الکتاب، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث دار العلوم دیو بند،
شرح الادب المفرد مطبوعہ، مکتبۃ العلم، نظام الدین دہلی

(۹) شیخ عبدالفتاح ابوغدہ - مقدمہ فضل اللہ الصمد، مطبوعہ مکہ مکرمہ۔

(۱۰) عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی الیمانی المصحح بدائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد فی کلمۃ تعریف وتقدیر
''فضل اللہ الصمد''

(۱۱) مولانا عبداللہ عباس ندوی - شرح اردو ''الادب المفرد'' مقدمہ

(۱۲) مقدمہ ''فضل اللہ الصمد'' - مطبوعہ دار الاستقامۃ مکۃ المکرمۃ۔

(۱۳) مولانا بدر الدین العلوی سابق استاذ شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۱۴) الادب المفرد الجامع لآداب النبویۃ مکتبۃ العلم نظام الدین نئی دہلی



عہد جدید میں متون موطا امام مالک کی تدوین

ایک تنقیدی مطالعہ

از: مولانا محمد یسین مظہر صدیقی ندوی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کتب حدیث کی تدوین وطباعت ایک خاص فن ہے۔ وہ صاحب تدوین سے فنی تبحر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اکابر تلامذۂ محدثین نے اپنے اپنے نسخے مختلف بنیادوں پر مرتب کئے تھے۔ وہ ان کی سماعت، قراءت اور مناولہ پر مبنی تھے۔ تمام صاحب تصنیف محدثینؒ نے اپنی اپنی کتب حدیث کو اپنے قلم سے بھی لکھا تھا۔ اور ان کے متعدد نسخے مختلف اوقات میں تیار کئے تھے۔ ان نسخوں میں اختلاف اس لئے در آیا تھا کہ وہ عظیم مؤلفین اپنے نسخوں میں برابر کانٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ تمام عظیم ترین کتب حدیث، موطأ امام مالکؒ، صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ وغیرہ، کے بارے میں کئی متفقہ علمی روایات ملتی ہیں۔

اول یہ کہ انہوں نے لاکھوں احادیث سے اپنے اولین نسخہ کے لئے منتخب احادیث جمع کی تھیں اور صرف انھیں کو درج کیا تھا۔

دوم یہ کہ وہ اولین نسخہ کی تدوین کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوئے اور اس میں برابر ترمیم وتنسیخ کرتے رہے اور ان کی تہذیب کرتے رہے۔

تیسرے یہ کہ اس مسلسل تدوین اور مستقل تہذیب کے نتیجہ میں احادیث کی تعداد کم ہی ہوتی

گئی، اضافہ مشکل سے ہوا۔

چوتھے یہ کہ آخری متداول نسخہ امام میں صرف ایک تہائی کے قریب یا اس سے بھی کم تعداد رہ گئی۔

(فواد سزگین ریاض ۱۹۸۳ء عربی ترجمہ محمود فہمی حجازی، جلد اول، جزو سوم، ۱۲۹، ۱۳۱ وما بعد: ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، ریاض ۱۹۹۷ء مقدمہ: محمد زکریا کاندھلوی، اوجز المسالک سہارنپور ۱۳۴۸ھ ۱/۱۶ وما بعد: تقی الدین ندوی مظاہری، محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے، مظفر پور ۱۹۹۵ء: خاکسار راقم شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث، کلکتہ ۲۰۰۲ء)

دوسری معتبر کتب حدیث سے قطع نظر صرف اس وقت موطأ امام مالکؒ کی تدوین وطباعت سے بحث ہے۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تیس معلوم نسخوں اور بقول دوسرے اکابر ۱۶/۱۴ معروف نسخے پائے جاتے ہیں۔ خادم راقم کا احساس ومطالعہ بتاتا ہے کہ حضرت امام مالکؒ کے ہزاروں تلامذہ میں سے ایک کثیر تعداد نے اپنے اپنے نسخے مرتب کئے تھے۔ ان تمام نسخ موطأ میں امام مالکؒ کے شاگرد عزیز امام یحیٰ بن یحیٰ بن کثیر مصمودیؒ (م ۲۳۴/۸۴۸ قرطبہ) کا نسخہ ہی اصل موطأ سمجھا جاتا ہے، لہٰذا اس مختصر مقالہ میں اسی کی تدوین وطباعت سے عہد حاضر کے حوالہ سے بحث کی جارہی ہے۔

فواد سزگیں کے مطابق موطأ امام مالکؒ بروایت مصمودی کی ''اخیر صورت'' میں حدیث وروایات کی تعداد یہ ہے۔

۱۰۰ حدیث مسند، ۲۲۲ حدیث مرسل، ۶۱۳ حدیث موقوف اور ۲۸۵ آرائے تابعین۔ کل تعداد ۱۲۲۰ ہے۔ (فواد سزگیں مذکورہ بالا بحوالہ تعلیق الاصول لکیا الہراسی، التعریف بکتاب الموطأ لعلی عبداللطیف قاہرہ ۱۳۸۲ھ، ۸۰-۱۶)

مولانا سعید احمد پالن پوری کا بیان اس سے کافی مختلف ہے'' کتاب میں مرفوع، موقوف، منقطع، معضل اور بلاغات سب ملا کر ۱۸۲۶ روایات ہیں۔ جن میں سے مرفوع روایات آدھی بھی نہیں ہیں۔ دوم ...... یحیٰ مصمودیؒ ...... نے کتاب میں مسائل مالک کا اضافہ کیا ہے۔ ..... خود شاہ

صاحبؒ نے جو دو شرحیں لکھی ہیں وہ تخلیص کے بعد لکھی ہیں یعنی مسائل مالک کو حذف کر دیا ہے (رحمۃ اللہ الواسعہ ۲/ ۴۹۹)۔

بعض دوسرے شارحین موطأ اور مرتبین کتاب نے نسخۂ مصمودی کی احادیث وروایات کی تعداد مختلف بتائی ہے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے مدارک کے حوالہ سے امام سلیمان بن بلال کا قول نقل کیا ہے کہ موطأ میں چار ہزار یا اس سے کچھ زیادہ احادیث تھیں جو بعد میں صرف ڈیڑھ ہزار کے قریب رہ گئیں۔ (اوجز المسالک ۱/ ۲۶)۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ان سب اکابر نے اپنے اپنے نسخے کے مطابق احادیث وروایات کی تعداد لکھی ہے، مولانا پالن پوری نے بھی عام متداول نسخوں کی ہی تعداد بتائی ہے۔ حضرت شاہ کے نسخۂ مصمودی کی نہیں، ان کا آخری بیان کہ حضرت شاہ نے ''مسائل مالک'' کو حذف کر دیا ہے قطعی طور پر غلط ہے، مصفی کا سرسری مطالعہ ہی اس کی تغلیط کیلئے کافی ہے۔

(''شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث'' میں مسائل مالک پر بحث ملاحظہ ہو)

بہر حال احادیث موطأ کی تعداد کا اختلاف ہی یہ بتاتا ہے کہ اصل نسخۂ امام ہی کی طرح نسخہ مصمودی کے کئی نسخے تھے اور ان میں تعداد احادیث مختلف تھی، لہٰذا عام روایت پرست مرتبین نے ان اختلاف نسخ کا لحاظ نہ کر کے مختلف تعداد بتادی ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ نسخۂ موطأ کے مختلف متون کی تعداد ہے۔ ان میں نسخۂ مصمودی کے مختلف مخطوطے وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اس سے بڑا مسئلہ اور اصل بحث یہ ہے کہ متداول مطبوعہ نسخوں کی اساس بہر حال بعض مخطوطات پر ہے، فواد سزکین اور بعض دوسرے اہل علم کے مطابق موطأ کی متعدد روایات میں فی الحال تین کامل روایات ملتی ہیں اور ایک غیر کامل یا ناقص۔ تمام مطبوعہ نسخ موطأ ان ہی پر مبنی ہیں، یوں تو مطبوعات موطأ یا طباعت موطأ کی تعداد کافی ہے لیکن اس میں سے چند خاص ہیں۔

ا۔ نسخہ رطباعت شیخ فواد محمد عبدالباقی (۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء۔ ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء)، مصر، ۱۹۵۱ء، نے اپنے مطبوعہ نسخۂ موطأ کی بنیاد چھ مطبوعہ نسخوں پر ہی رکھی ہے، جن کی تفصیل اپنی ضمنی سرخی ''تحقیق النص'' میں بیان کی ہے:

۱۔طباعت مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۳۴۸ھ؛ ۲۔طباعت عبد الحمید احمد حنفی، مصر ۱۳۵۳ھ؛ ۳۔طباعت مطبعۃ الحجر مصر ۱۲۸۰ھ؛ ۴۔طباعت مطبع فاروقی رمحمد معظم حسنی ہند ۲۱ رشوال ۱۲۹۱ھ: ۵۔طباعت مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۰۷، ۶: ۔شرح زرقانی بر موطاً، طباعت مطبعۃ الکستلیہ، بتصحیح نصر ابوالوفا الہورینی ۱۲۸۰ھ۔

شیخ فواد نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ ان تمام مطبوعہ نسخ موطاً کا مقارنہ وموازنہ کیا اور جس لفظ/روایت پر سب کا اتفاق ہوگیا اور اس کے صحیح ہونے کا یقین بھی ہوگیا تو اس کو اپنے مطبوعہ نسخہ میں درج کیا اور اسی کو اصل سمجھا جن حصوں پر اختلاف ہوا ان میں سے اس کو ترجیح دی جو شرح زرقانی اور ہندی مجتبائی ۱۳۰۷ھ: میں متفق علیہ تھا۔ نیز اس ترجیح متن میں کتب لغت وحدیث ورجال سے بھی پوری مدد لی۔ لہذا تمام نسخوں میں سے صحیح ترین متن کو مرتب کر دیا۔

اس میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تدوین متن موطاً کے ضمن میں شیخ فوادؒ نے کسی مخطوطہ کا ذکر نہیں فرمایا (مقدمہ، ز، ی،) شیخ فواد نے زرقانی (محمد بن عبد الباقی م ۱۱۲۲/۱۷۱۰) کی جس شرح موطاً کا حوالہ دیا وہ مختلف ناموں سے چھپی ہے "انوار کوکب انبیح المسالک بشرح موطاً الامام مالک" قاہرہ متعدد طباعتیں ہیں، ۱۹۳۶ء کی طباعت خاص ہے، ابوالفضل عبداللہ بن محمد بن صدیق کی مرتبہ شرح کا نام ہے "شرح الزرقانی علی موطا امام مالک" بیروت ۱۹۹۷ء۔

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری نے موطاً امامؒ کے مطبوعہ نسخوں کا تو ذکر نہیں کیا مگر ان کی کم از کم سترہ شروح وحواشی کا ذکر کیا ہے ان میں ابن عبد البر قرطبیؒ، ابوالولید الباجیؒ، ابوبکر ابن العربی، جلال الدین سیوطیؒ، (کئی شروح)، شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلویؒ وغیرہ کے علاوہ مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، اور مولانا اشفاق الرحمن کاندھلویؒ کی تعلیق وحاشیہ بھی چھپ چکے ہیں، اس سب میں ظاہر ہے کہ متن موطاً موجود ہے، ان کے علاوہ خالص متن موطاً پر مشتمل ایک طباعت احمد راتب عرموش کی ہے۔ (بیروت ۱۹۷۱ء)

جدید شروح موطاً میں شیخ شنقیطیؒ (محمد حبیب اللہ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء۔ ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء)

کی شرح بھی خاص اہم ہے جس کا ذکر شیخ فوادؒ نے کیا ہے، ان تمام متون، مطبوعات اور شروح میں خاصا اختلاف متن ملتا ہے اور تعداد احادیث کا بھی۔

آخر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دو متون و شروح موطأ امام مالکؒ کا ذکر خاص وجہ سے کیا جاتا ہے، عہد جدید میں حضرت شاہؒ کی یہ دونوں شروح ایک ساتھ مکتبہ رحیمیہ دہلی نے دو جلدوں میں بالترتیب ۱۳۴۶ھ اور ۱۳۴۷ھ میں شائع کیں۔ مرتب کتاب نے مصفی (فارسی) کو اصل بنایا اور اسی میں متن موطأ امام مالکؒ کا اس کی کتب اور ان کے ابواب کے ساتھ ذکر کیا ہے جبکہ مسوی کو مصفی کے اوپری حاشیہ میں بطور تعلیقات جمع کر دیا ہے اسمیں متن موطا نہیں ہے صرف تعلیقات شاہؒ ہی ہیں۔

مرتب مصفی، مسوی نے بھی یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ کس مطبوعہ یا مخطوطہ نسخہ پر مبنی ہے نہ ہی اس پر کوئی مقدمہ وغیرہ لکھا۔ اسی طرح دوسرے دستیاب مطبوعہ نسخوں میں طباعت عرموش اور نسخہ دیوبند (حاشیہ مفتی محمد شفیعؒ) وغیرہ کے بارے میں صراحت نہیں ملتی کہ وہ نسخہ کس مطبوعہ یا مخطوطہ متن پر مبنی ہیں، ہندستانی طباعتوں کے بارے میں بالعموم یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ مطبع مجتبائی کے مطبوعہ نسخہ متن پر استوار کئے گئے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تمام مطبوعہ متون موطأ اور شارحین کتاب نے موطأ امام مالکؒ (نسخہ مصمودی) کے متعدد دستیاب مخطوطات میں سے کسی کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، جن مخطوطات پر موجودہ متون و شروح رکھنے کے بارے میں عام دعوی کیا جاتا ہے وہ حیرت انگیز طور پر ناقص اور یکساں ہیں اس پر بحث آئی ہے اور نہ ہی تدوین متون کی ضرورت محسوس کی، حالانکہ یہ تحقیق متون میں اصل اصول ہے اور بنیادی قاعدہ بھی کہ دستیاب مخطوطات میں سے متعدد کے موازنے اور مقارنے پر محقق متن تیار کیا جاتا ہے، موطأ امام مالکؒ کے متن۔ مستند و اصل متن کو مرتب کرنے کیلئے اس علمی اور تحقیقی اصول سے کیوں صرف نظر کیا گیا، یہ ناقابل فہم ہے، بہر حال اس کا قوی امکان ہی نہیں واقعہ ہے کہ اولین مطبوعہ متن موطأ کو مرتب کرنے والے نے کسی نہ کسی مخطوطہ کو ضرور استعمال کیا تھا، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی تدوین متن میں متعدد مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہو۔

جدید خالص متونِ موطأ ہوں یا ان کی شروح میں موجود متون، ان میں مستند متن کی تدوین کی خالص تحقیقی اور تدوینی اصول پر استوار نہیں کہی جاسکتی، متعدد مطبوعہ متون کے موازنے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب ایک ہی طباعت پر مبنی ہیں، ان میں البتہ یہ ضرور وضاحت ملتی ہے کہ مرتبین و شارحین نے کبھی کبھی بعض ابواب یا ان کی احادیث کی ترتیب جدید کی ہے۔ ان میں حضرت شاہؒ کے متن موطأ مصمودی کے باب میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ انھوں نے اس کی "تنسیق جدید"، ضرور کی تھی مگر اس کے ساتھ یہ بھی بیان ملتا ہے کہ انھوں نے متن مصمودی میں نہ کمی کی نہ بیشی، بلکہ اس پر کامل اعتماد کیا اور اسی کو مرتب کردیا "وفــق مسوعت احادیث الموطا و آثار ہ فی ھذہ النسخۃ و ما کان قولہ من السنۃ کذا او کان استنباطاً ہو وبعۃ یحیی بن یحیی المصمودی الأندلسی" ...... یہی بات دوسرے انداز سے مصفّٰی میں فارسی میں لکھی ہے (سوی: ۱۹۸/ مصفی ۲۱) حضرت شاہؒ نے فضائلِ شیخین کے بعد فضائلِ طرفین کے ابواب نسخۂ مصمودی میں نہیں پائے تو صرف اس بنا پر کہ وہ اس میں اپنی طرف سے کچھ بھی اضافہ نہ کریں گے ان کو اس موقعہ پر نہیں بڑھایا اور صرف وہی رکھا جو نسخۂ مصمودی میں تھا۔ (مصفی: ۲/ ۳۰۸، شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث، ۱۰۹)

اختلافِ متون: موطأ امام مالکؒ کے نسخۂ مصمودی کے متون تمام متداول مطبوعہ نسخوں میں ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔

اس کی مذکورہ بالا شروح میں موجود متون بھی اختلافاتِ کثیرہ رکھتے ہیں۔ ان میں کتب کے عناوین کا بھی فرق پایا جاتا ہے، ان کے ذیلی ابواب کے عناوین بھی بہت سے مقامات پر مختلف ہیں۔ ان سے زیادہ کتب کی تعداد کا بھی اختلاف ہے اور ان کے ابواب کی تعداد کا بھی، اصل چیز احادیث موطأ کا اختلاف ہے اور اس کا ایک حوالہ آچکا ہے ان سب کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حضرت شاہؒ کے نسخۂ مصمودی سے اس کا موازنہ بھی کیا جائے گا۔

کتب و ابواب موطأ کا اختلاف:

تمام متداول نسخوں اور مطبوعہ نسخ مصمودیؒ میں اولین بحث "کتاب وقوت الصلوۃ ہے" جبکہ حضرت شاہؒ کے نسخہ میں اس کا عنوان کتاب الصلوۃ ہے۔ نسخہ فواد وغیرہ میں کتاب وقوت الصلوۃ کا

اولین باب "باب وقوت الصلوۃ" ہے جبکہ حضرت شاہ کے نسخہ میں اس کا کافی مفصل اور طویل عنوان ملتا ہے جو ایک اصولی تشریح بھی پیش کرتا ہے۔۔۔باب الصلوت الخمس، أحد أركان الاسلام، ولا تجب علی المکلف من الصلاۃ شئ غیر الخمس، وکذلک الصوم ولا تجب منہ شئ غیر رمضان، وکذلک الزکوۃ،،۔اس سے زیادہ اہم اس باب کی حدیث کا اختلاف ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہؒ کے نسخہ میں۔۔باب وجوب الوضوء والغسل والتیمم الخ،،اور اسکی احادیث دی گئی ہیں، اور متداول نسخوں میں دیگر نمازوں کے ابواب ہیں۔ اور ان کی حدیثیں اور روایتیں بھی مختلف ہیں۔ دونوں میں یہ اختلاف اس بنا پر ہے کہ حضرت شاہؒ نے اولین حدیث صلوۃ کے بعد ایک طرح پوری کتاب الطہارۃ پیش کردی ہے اور اسی سے متعلق تمام روایات دی ہیں جبکہ متداول نسخوں میں تمام اوقات نماز سے متعلق ابواب کے بعد کتاب الوضوء/ کتاب الطہارۃ آتی ہے جو کتاب وقوت الصلوۃ کے آٹھ ابواب کے بعد آتی ہے: یہ ابواب ہیں۔۔ وقت الجمعۃ، من أدرک رکعۃ من الصلوۃ، ما جاء فی دلوک الشمس و غسق اللیل، جامع الوقوت، النوم عن الصلوۃ، النھی عن الصلاۃ بالھا جرۃ، النھی عن دخول المسجد بریح الثوم وتغطیۃ الفم۔

(نومو: ۳: ۳۔۱۷، مرموش ۱۳۔۲۲، دیوبند: ۲۔۶، ملو جز ۱/۲۱ نیز مصفی مسوی ۱/۲۲۔۶۹ و مابعد)۔

احادیث کتب وابواب کا اختلاف:

سب سے زیادہ نا قابل فہم اختلاف احادیث وروایات کا ہے جو کتب وابواب موطاً میں لائی گئی ہیں، یہ وہ اختلاف یا بوقلمونی حدیث نہیں ہے جو موطا امام مالکؒ کے مختلف تلامذہ و جامعین کے سولہ نسخوں میں پایا جاتا ہے تمام متداول مطبوعہ اور بیشتر دستیاب شروح موطاً میں جو نسخہ مصمودی پر مشتمل ہیں یہ اختلاف روایات ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت شاہؒ کا زیر استعمال نسخہ مصمودی بالکل مختلف اگر نہ تھا تاہم دوسرے نسخوں سے الگ ضرور تھا، بالعموم تمام متداول مطبوعہ متون موطاً اور ان کی شروح جدیدہ ایک متن رکھتی ہیں اور حضرت شاہؒ کا نسخہ دوسرا متن، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان دونوں میں اشتراک روایات نہیں ہے، بلکہ بہت روایات دونوں میں الگ الگ ہیں۔ جن کی چند مثالیں یہاں دی جاسکتی ہیں:

اولین کتاب وقوت الصلاۃ کے باب وقوت الصلاۃ میں تمام متداول نسخوں میں تاخیر صلوٰۃ پر حضرت ابومسعود بدریؓ کی حدیث ہے: ان عمر بن عبدالعزیز اُخرالصلوۃ ...... الخ

حضرت شاہؒ کی کتاب الصلوۃ کا اولین حصہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ تیمیؓ کی حدیث ہے جس میں ایک نجدی صحابیؓ کے سوال اور رسول اکرم ﷺ کے جواب میں نماز پنجگانہ، صیام رمضان اور زکوٰۃ کے واجب ہونے کا ذکر ہے اور باقی اعمال کے تطوع ہونے کا۔

تمام متداول نسخوں میں اس کے بعد مختلف نمازوں کے اوقات سے متعلق احادیث ملتی ہیں جیسے عصر، فجر، وغیرہ کی نمازیں۔

حضرت شاہؒ کے نسخہ میں اولین حدیث مذکورہ بالا کے بعد وضوء وطہارت سے متعلق احادیث کا بیان آ جاتا ہے، جو مصفّٰی کے صفحہ ۶۹ تک وسیع ہے، اس کے بعد اوقات صلوٰۃ کا باب بلاعنوان اور اس کی حدیثیں ہیں، وہ بھی مختلف ہیں، خاکسار راقم نے "حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث" میں ان تمام ابواب کے اختلاف اور ان کی متعدد مختلف حدیثوں کی نشاندہی کی ہے۔ (ملاحظہ ہو: ۸۷-۱۶۳ وغیرہ۔)

متداول نسخوں میں کتاب الطہارۃ نسخہ فواد کے مطابق ۱۳۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ حسب معمول ان کے ابواب کے عناوین میں باہم اختلاف ملتا ہے: مثلاً نسخہ عرموش، نسخہ دیو بند اور اوجز المسالک میں صرف آٹھ ابواب ہیں۔ نسخہ فواد میں کتاب الطہارۃ کا عنوان لگایا ہے جبکہ نسخہ دیو بند میں وہ کتاب الطہارۃ کا عنوان نہیں ہے اور العمل فی الوضوء سے اس کا آغاز ہوتا ہے، عرموش نے یہ البتہ وضاحت کی ہے کہ کتاب الطہارۃ کا عنوان انھوں نے لگایا ہے، اصل میں نہیں تھا۔ حضرت شاہؒ کے ابواب طہارۃ کی تعداد باسٹھ تک پہونچتی ہے۔ ان تمام ابواب کے عناوین میں بھی اور ان کی ترتیب میں بھی کافی فرق ہے۔

عام متداول نسخوں اور حضرت شاہؒ کے نسخہ مصوی میں ایک اور بنیادی فرق ہے: حضرت شاہؒ کتاب الصلوۃ کے بعد طہارت سے متعلق تمام ابواب لے آتے ہیں اور پھر بلافصل کتاب الصلوۃ کے ابواب لاتے ہیں جن کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے، دوسرے نسخوں میں باب وقوت الصلاۃ کے

بعد کتاب الصلوٰۃ شروع ہوتی ہے جو اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے جیسے ..(۱) کتاب السہو ،/ (۲) کتاب الجمعۃ ، (۳) کتاب الصلوٰۃ فی رمضان ، (۴) کتاب صلاۃ اللیل (۵) کتاب صلوٰۃ الجماعۃ ، (۶) کتاب قصر الصلوٰۃ فی السفر (۷) کتاب العیدین (۸) کتاب صلوٰۃ الخوف ، (۹) کتاب صلاۃ الکسوف ،(۱۰) الاستسقاء ، وغیرہ ، ان میں سے ہر کتاب صلوٰۃ کے بالعموم ایک سے زیادہ ذیلی ابواب ہیں جیسے ۲۔ میں ۱۹ ابواب ہیں ، ۵۔ میں ۱۰ ابواب ہیں وعلیٰ ھذا القیاس ۔

(مصفّٰی ۱/ ۶۹۔ ۲۰۶، نسخہ فواد ۶۷۔ ۲۴۳، نسخہ مرموش ، ۵۵۔ ۱۶۱، نسخہ دیو بند ۳۲، ۱۰۲، ۱۰ وجز ۱/ ۱۷۱۔ ۳۷۸)۔

اسی طرح دوسری کتب موطأ کے ابواب اوران کے تمام ذیلی ابواب کا معاملہ ہے ۔ ان کی تعداد ہر متداول نسخہ میں نہ سہی بیشتر میں مختلف ہے ۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مختلف مرتبین نے اپنے اپنے اضافہ باب کا اظہار کیا ہے ۔ سب سے زیادہ ابواب کا اضافہ شیخ فواد نے کیا ہے ، اور دوسروں نے ان سے کم ، لیکن جا بجا اضافے انھوں نے کئے ضرور ہیں ۔ اسی بنا پر ہر متداول مطبوعہ نسخہ موطأ اور اسکی معروف شروح میں کتب کی تعداد مختلف ہے اوران کے ابواب کی بھی ۔

۱۔ کتاب الزکوٰۃ میں تمام متداول مذکورہ نسخوں میں ابواب کی تعداد تیس ہے اور نسخہ حضرت شاہ میں چھتیس ۔

۲۔ کتاب الصیام میں اس سے زیادہ دلچسپ معاملہ ہے : شیخ فواد نے بائیس ابواب کے علاوہ کتاب الاعتکاف کو مزید ابواب میں تقسیم کرکے تعداد ۲۸ کردی ہے ۔ نسخہ دیو بند میں کتاب الاعتکاف میں صرف پانچ ابواب ہیں اور نسخہ فواد کا چھٹا باب ماجاء فی لیلۃ القدر کو نسخہ دیو بند میں جامع الصیام کے تحت رکھا گیا ہے ۔ یہی حال نسخہ مرموش وغیرہ کا ہے ۔ اس کے برعکس نسخہ شاہ میں کتاب الصیام کے چھیالیس ابواب ہیں اوران میں بہت سے دوسرے اختلافات ہیں ۔

(مصفّٰی ۱/ ۲۳۰۔ ۲۶۶، نسخہ دیو بند ، ۸۸۔ ۱۰۳ وجز ۲/ مابعد ۔ نسخہ مرموش ۱۹۳، ۲۱۱۔ نسخہ فواد ۲۸۶۔ ۳۲۱، شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث ، ۱۲۷ ومابعد)

کتاب الحج میں نسخہ فواد تراسی (۸۳) ابواب رکھتا ہے ۔ بعض دوسرے اختلافات کے ساتھ

یہی تعداد نسخہ دیو بند اور نسخہ عرموش میں ہے۔ حضرت شاہؒ کے نسخہ میں ابواب کی تعداد ۱۴۳ ہے، یعنی دو گنے کے قریب۔

بہر حال ان ہی مثالوں سے تمام متون موطأ کے کتب وابواب کے اختلافات کثیرہ کا اندازہ ہوسکتا ہے، تمام کتب وابواب کے اختلافات کا تجزیہ کرنے سے تو ایک ضخیم کتاب جامع الاختلاف تیار کی جاسکتی ہے۔ ان کتب وابواب موطأ کے اختلاف کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کے عناوین بھی مختلف ملتے ہیں۔ صرف چند مثالیں پیش ہیں۔

۱۔ اولین کتاب کے مواقیت الصلوٰۃ اور وقوت الصلوٰۃ کے علاوہ شاہ صاحبؒ کے یہاں صرف کتاب الصلاۃ ملتا ہے۔

۲۔ کتاب الزکوۃ میں نسخہ عرموش" زکوۃ الشرکا ء" عنوان رکھتا ہے تو نسخہ فواد ونسخہ دیو بند" زکوۃ الرکاز"، اسی طرح زکوۃ زیورات کے باب میں ان تینوں میں عنوان کی زبان مختلف ہے: ما لا زکوۃ فیه من الحلی والتبر والعنبر (دیو بند/عرموش) مالا زکوۃ فیه من الحلی والعنبر (فواد)

۳۔ کتاب الصیام، کتاب الحج میں اسی طرح کے متعدد عنوانی اختلافات ملتے ہیں۔ اور دوسرے ابواب میں۔

۴۔ حضرت شاہؒ کے نسخہ میں کتاب البیوع والمعاملات کا طویل عنوان ہے اور دوسرے متون میں صرف کتاب البیوع ہے۔

۵۔ تمام متداول نسخوں میں کتاب الجامع آخری کتاب ہے۔ حضرت شاہؒ کے نسخہ میں وہ سرے سے نہیں ہے۔ حضرت شاہؒ نے بخاری وغیرہ کی مانند ایک کتاب الرقاق کا ذکر کر کے اس کے تحت بہت سے ابواب گنائے ہیں، وہ کتاب کے نام سمیت زیادہ تر متداول نسخوں میں نہیں ہیں۔ جس طرح "کتاب سیر النبی ﷺ وأصحابہ" ان عام نسخوں میں نہیں ہے۔

ترتیب کتب وابواب کا اختلاف:

مطبوعہ متون موطأ، خواہ ہندی ہوں یا عالم عرب کے نسخ مصوری کے کتب کی ترتیب میں بھی

کافی اختلاف رکھتے ہیں، ان کے عناوین میں بھی کافی فرق بعض اوقات پایا جاتا ہے اور عناوین میں عبارت کی تبدیلی بھی نظر آتی ہے۔

ترتیب کتب کا سب سے پہلا اختلاف کتاب الصلوۃ کے بعد ہی ملتا ہے، نسخۂ فواد، نسخۂ عرموش اور نسخۂ شاہ میں کتاب الصلاۃ کے بعد کتاب الزکاۃ ہے اور اس کے بعد کتاب الصیام ہے، نسخۂ دیوبند اور اوجز المسالک میں کتاب الصلوۃ کے بعد کتاب الصیام ہے اور کے بعد تیسری کتاب، کتاب الزکوۃ ہے، موخر الذکر دونوں ہندی نسخے اس باب میں منفرد ہیں۔

کتاب الحج اس کے بعد سب میں مشترک ترتیب رکھتی ہے، مگر اس کے بعد کے اشتراک کے باوجود اختلافات بھی ملتے ہیں۔ تمام متداول مذکورہ نسخوں میں صرف عنوان کتاب البیوع ہے، نسخۂ حضرت شاہ میں وہ کتاب البیوع والمعاملات ہے اور اس میں متعدد دوسری کتب شامل ہیں، جیسے کتاب القراض، کتاب المساقاۃ، کتاب کراء الارض، کتاب الشفعۃ، کتاب لاقضیۃ اور کتاب الوصیۃ وغیرہ، دوسرے نسخوں میں یہ سب الگ الگ کتب بن گئی ہیں۔

نسخۂ شاہ میں پہلے کتاب الفرائض اس کے بعد ہے اور اس کے بعد کتاب النکاح، متداول نسخوں میں ان کی ترتیب بھی مختلف ہے اور بعض دوسری چیزیں بھی جیسے مذکورہ بالا دونوں کتب کی ترتیب برعکس ہے (نسخۂ فواد و نسخۂ عرموش)، نسخۂ دیوبند میں وہ کتاب لاقضیۃ کے بعد اور کتاب العقول سے قبل رکھا گیا ہے۔

اسی طرح نہ صرف نسخۂ شاہؒ سے کتاب الطلاق، کتاب الرضاع، کتاب العتقیۃ، کتاب الفرائض اور کتاب الصید وغیرہ کی ترتیب مختلف ہے بلکہ متداول نسخوں میں بھی ان کی ترتیب میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے، اوجز المسالک اور نسخۂ دیوبند میں بالعموم ترتیبی مماثلت ملتی ہے اور دوسرے نسخوں میں نسخۂ فواد سے مطابقت ملتی ہے۔

ایک دلچسپ اختلاف یہ ہے کہ حضرت شاہؒ بہت سی کتب موطأ کو ایک جامع عنوان/کتاب کے تحت لاتے ہیں، اور دوسرے مرتبین و شارحین الگ الگ کتب میں ہی ان کو مرتب کرتے ہیں اور

کسی جامع عنوان کتاب کے تحت نہیں لاتے۔

حضرت شاہؒ کے نسخۂ مصمودیؒ میں ایک جامع عنوان ہے: ''کتاب أحکام الخلافۃ''، اس کے نظام موضوعات میں شامل ہیں: احکام، بیعت، اقضیہ، حدود، دیات، قسامہ، عقول، سرقہ، زنا، قذف، تعریض کے علاوہ متعدد کتب جہاد بھی، متداول نسخوں میں نہ صرف ان کی ترتیب کہیں کہیں مختلف ہے بلکہ بعض کتب کا عنوان بھی دلچسپ ہے جیسے کتاب الاشربۃ، جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ تمام جائز وحرام مشروبات کا باب ہے جیسے بخاریؒ وغیرہ میں ہے، مگر وہ صرف شراب نوشی سے متعلق ہے۔

(مصفی: ۲/۹۳-۱۷۲، فواد: ۳۴۳، ۷۲۱، ۷۱۹، ۷۶۰، ۸۱۹-۸۸۳، عرموش: ۲۹۴-۳۱۳، ۵۰۹-۵۲۷، ۵۸۹-۶۳۸، نسخۂ دیوبند: ۱۶۶-۱۷۷، ۲۹۹-۳۲۰، ۳۳۲-۳۵۷)۔

اس کے علاوہ حضرت شاہؒ کے نسخۂ مصمودی میں ایک اور جامع عنوان کتاب ہے:

"كتاب الأحكام المتعلقة بالطعام والشراب واللباس وغير ذلك مما يحتاج إليه الإنسان في معيشة، اس میں جو معاملات معیشت شامل ہیں، وہ ہیں:

ذبیحہ، کھانے، پینے، شکار، لباس، زیب وزینت، کھیل کود، علاج معالجہ، حجامت، جھاڑ پھونک، بدشگونی، فال، رویا صالحہ، استیذان، سلام، مصافحہ، سفروآداب مسافر، حرمتِ کذب، نذر وایمان کے علاوہ متعدد دوسرے اس کے برخلاف متداول نسخوں میں کتاب النذ ور والایمان، کتاب الضحایا، کتاب الذبائح اور کتاب الصید کے تحت اس کے معاملات ہیں، پھر شاہ صاحبؒ کے نسخہ کے دوسرے تمام امور کو اور بعض نئے ابواب کتب کو کتاب الجامع کے تحت لایا گیا ہے:

اس کتاب الجامع میں نئے امور ومعاملات ہیں: ''کتاب صفۃ النبی ﷺ، کتاب دعوۃ المظلوم، کتاب جہنم، کتاب أسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ۔

(مصفی: ۲/۱۷۲-۲۲۵، فواد: ۳۷۲-۵۰۰، ۸۸۳-۱۰۰۳، عرموش: ۳۱۴، ۳۳۵، ۶۳۹-۷۰۸، نسخۂ دیوبند: ۱۱۷-۱۸۶، ۳۵۸-۳۹۲، اوجز المسالک: ۶/۱۰۷-۵۰۹ وغیرہ)۔

اسی پر تمام متداول نسخ موطأ تمام ہوتے ہیں۔

حضرت شاہؒ کی اگلی کتاب ہے: کتاب الرقاق جو دوسرے متداول نسخوں میں نہیں ہے، اس میں متداول نسخوں کی کتاب الجامع کے بعض ابواب وکتب بھی شامل ہیں، حضرت شاہ کے نسخہ میں کتاب الجامع سرے سے نہیں ہے۔

سب سے اہم آخری کتاب نسخۂ شاہؒ ہے: ''کتاب سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وأصحابہ''، یہ کتاب دوسرے تمام متداول نسخوں میں نہیں ہے، ان کی کتاب الجامع میں دو تین باب جیسے ''صفۃ النبی ﷺ اور ''اسماء النبی ﷺ'' وغیرہ موجود ہیں، لیکن حضرت شاہؒ کے نسخہ میں اس کتاب میں تیئس (۲۳) ابواب ہیں جن میں سے بیشتر بلکہ سب کے سب متداول نسخوں سے غائب ہیں۔

تمام متداول نسخے ناقص ہیں:

نسخۂ مصمودی کے ان تمام متون کے موازنہ سے ایک انتہائی حیرت انگیز حقیقت سامنے آتی ہے، تمام متداول متون اور ان کی شروح میں نسخۂ مصمودی ناقص ہے بلکہ ناقص الطرفین ہے جس کا اعتراف مرتبین وشارحین نے کی ہے مثلاً حضرت شیخ الحدیث کو آغاز موطأ میں بسملہ اور مقدمہ وغیرہ نہیں ملا اور اسی طرح اولین باب کا عنوان بعض کو نہیں ملا، ابتدا میں تو حضرت شاہؒ کا نسخۂ مصمودی بھی کامل نہیں نظر آتا کہ وہ تمہیدی بیانات اور بعض ضروری چیزوں سے عاری ہے لیکن آخر میں متداول نسخوں کا نقص بری طرح ظاہر ہوتا ہے، اس کی کچھ مزید تفصیل ضروری ہے حالاں کہ اوپر موازنہ میں وہ آچکی ہے۔

تمام متداول ومذکورہ نسخوں میں خاتمہ موطأ ''اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' سے متعلق صرف ایک حدیث نبوی پر ہوتا ہے، شیخ فواد نے اس کے آغاز میں ''کتاب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کا وسیع تر عنوان لگایا ہے پھر اس کے بعد ''باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم''، دوسروں نے بالعموم کتاب کا ذکر نہیں کیا اور صرف باب کا عنوان لگا کر قصہ تمام کر دیا ہے، ان میں سے کسی محدث، مرتب، جامع، شارح یا شیخ الحدیث نے یہ بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اچانک کتاب موطأ صرف اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے تمام ہوگئی، اس کی ایک دلیل بستان المحدثین سے حضرت شاہ عبدالعزیز

دہلویؒ کے قول سے دی جاتی ہے کہ کتاب موطا کی یہ آخری حدیث ہے، حالاں کہ ان کا یہ استدلال واطلاق غلط ہے۔

البتہ حضرت شاہ موصوف کا بیان صحیح ہے لیکن دوسرے جامعین کرام نے اس کا اطلاق صحیح نہیں کیا ہے، شاہ عبدالعزیزؒ نے کہا ہے کہ یہ نسخۂ یحییٰ بن یحییٰ تمیمی حنظلیؒ (۱۴۲-۷۵۹-۲۲۲-۸۳۷) کی آخری حدیث ہے،نسخۂ سیزدہم از موطاً روایت یحییٰ بن یحییٰ تمیمی است در باب ماجاء فی اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم می گویداین باب آخرابواب موطاً اوست کہ بداں ختم شد۔(بستان، دہلی غیر مورخہ، ۲۶) یہ دوسرے شاگرد وامام اور جامع موطاً تھے جیسا کہ حافظ عبدالبرؒ،شارح موطاً نے صراحت کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ امام مسلم موطاً امام مالک کی احادیث صرف ان ہی سے لیتے ہیں:
(الانتقاء،۶۲-۶۳-مولانا عبدالحی لکھنوی ا/۸۱-۸۲ بحوالہ مقدمہ اوجز المسالک ا/۲۳، خاکسار کی کتاب مذکور۹۵ومابعد)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے اپنے حاشیہ میں مزید صراحت کی ہے جو اس سلسلے میں بہت دل چسپ ہے،فرماتے ہیں کہ اسی باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا حدیث متعلقہ پر تمام مصری نسخوں کا اختتام ہوتا ہے، خواہ متون ہوں یا شروح، اس حدیث کے بعد ان میں کوئی کلام نہیں پایا جاتا، البتہ ہندی متون اور نسخوں میں خاتمہ کی یہ عبارت ملتی ہے کہ یہ کتاب موطاً کی آخری حدیث یا آخری کلام ہے اور اسی پر نسخۂ مصعودی تمام ہوتا ہے، لیکن یہ عبارت نہ تو نسخۂ تمیمی میں ہے نہ ہی مصفی مسوی میں ہے، لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ نقل کرنے والوں نے ختم/ خاتمہ کتاب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہ عبارت اپنی طرف سے بڑھادی ہے، حضرت شیخ نے ایک اور عجیب بات یہ کہی کہ شاہ ولی اللہؒ نے اس خاتمہ کتاب کا ذکر نہیں کیا مگر انہوں نے ان کے نسخۂ مصعودی کے اختتام اور اس کی آخری حدیث اور خاتمہ موطاً کا ذکر نہیں فرمایا۔

اس پوری بحث کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ''اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' پر مشتمل حدیث نبوی نسخۂ تمیمی حنظلی کی آخری حدیث ہے، نہ کہ نسخۂ مصعودیؒ کی، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی وضاحت سے یہ حقیقت

ثابت ہوتی ہے پھر دوسرے مرتبین وشارحین نے اسے نسخۂ مصمودی کی آخری حدیث کیسے سمجھ لیا؟ اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ ان کو دونوں اکابر کے یکساں ناموں سے اشتباہ ہوگیا، دونوں کا نام یحییٰ بن یحییٰ ہے، صرف اوپر کی پیڑھیوں یانسبتوں میں فرق ہے، اس سے یہ مزید شبہ پیدا ہوا کہ وہ کتاب موطاً کی آخری حدیث ہے، حالانکہ شاہ عبدالعزیز کے مطابق وہ تمیمی کے موطاً کی آخری حدیث ہے، اس کے علاوہ ابھی تک یہ شہادت نہیں مل سکی کہ نسخۂ مصمودی کی بھی وہ آخری حدیث ہے۔

حضرت شاہؒ کے نسخۂ مصمودی کے آخری بحث ''کتاب سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ'' اور اس کے ابواب سے مزید ثابت ہوتا ہے کہ نسخۂ مصمودی کی وہ آخری حدیث ہے اور نہ آخری کلام اور نہ ہی اس پر کتاب موطاً کا اختتام ہوتا ہے، اس نسخۂ مصمودی کے آخری بحث کتاب کے تیئیس (۲۳) ابواب ہیں: ''اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکیفیۃ عمرہ، باب کیف کان یأتیہ الوحی، باب بدئ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اجتہاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی عبادۃ ربہ، دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم لأمتہ، شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے بعد ایک باب سے زیادہ کتاب المعجزات ہے جس میں بہت سے معجزات کا بیان ہے، پھر خصائص نبوی سے متعلق کچھ ابواب ہیں جیسے"باب عینیہ تنامان والقلب لاینام، باب ما أکرمہ اللہ تعالیٰ أنہ کان یری من ظھر کما یری من أمامہ، التخییر فی موتہ ، ماتکلم بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم عند موتہ، قصۃ وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شدقعوت النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی أمتہ، حکم ترکۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، أداء أبی بکر الصدیق عدات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، باب سیرۃ أبی بکر الصدیق، باب سیرۃ عمر بن الخطاب، باب سیرۃ جمع من الصحابۃ رضی اللہ عنھم أجمعین"۔

(جن میں شامل صحابہ کرام ہیں: ابوطلحہ انصاری، عائشہ صدیقہ، سعد بن ربیع، عمرو بن الجموح وعبداللہ بن عمرو انصاریین، عبداللہ بن رواحہ خزرجی، ابو ہریرہ دوسی، ابی بن کعب، عبداللہ بن عمر عدوی قریشی، ابوالدرداء رضی اللہ عنہم) نسخۂ مصمودی کا آخری باب فضل مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس میں متعدد احادیث ہیں اور ان کی آخری حدیث مکہ اور مدینہ میں سے افضل پر حضرت عمرؓ کا معنی خیز بیان ہے، اس پر

نسخۂ مصمودی ختم ہوتا ہے۔ (مصفّی، ۲/۲۸۴۔۳۱۷) اس کے بعد حضرت شاہؒ کے شاگرد داور جامع مصفّی محمد عاشق پھلتی کا تسوید وطباعت وتدوین سے متعلق بیان ہے۔

کامل ترین نسخۂ مصمودی:

موطّا ت امام مالک یا موطأ امام مالک کے مختلف نسخوں میں نسخۂ مصمودی کو سب سے نمائندہ نسخہ تسلیم کیا گیا ہے، حضرت شاہؒ نے اسی بناپر اور دوسرے جامعین متون اور شارحین کرام نے بھی اسی کو اپنی اپنی تدوین متن کے لیے اساس بنایا ہے لیکن بقول شیخ الحدیث تمام مصری اور ہندی متون وشروح جس حدیث اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام ہوتے ہیں وہ سب ناقص ہیں، یا تو اولین نسخۂ مصمودی کو مخلوطہ سے تیار کرتے وقت نسخۂ تمیمی حنظلیؒ کا آخری حصہ اس سے مخلط وآمیختہ ہوگیا، یا کسی کاتب نے نسخۂ تمیمی کو نسخۂ مصمودی بنادیا اور کسی نے اس تصحیف یا گمراہ کن غلطی کا ادراک نہیں کیا۔

حضرت شاہؒ کا نسخۂ مصمودی ان سب میں واحد کامل ترین اور جامع ترین اور صحیح ترین نسخۂ موطأ ہے، بلاشبہ حضرت شاہؒ نے تنسیق جدید کی ہے، ترتیب کتب وابواب بھی نئی کی ہے اور ممکن ہے کہ اور بھی کئی ترتیبی تبدیلیاں کی ہوں، ان میں سے ایک اہم ترین تبدیلی یا اضافہ یہ ملتا ہے کہ ہر کتاب موطأ کے آغاز میں متعلقہ آیات کریمہ بھی ملتی ہیں جو دوسرے تمام متون وشروح میں نہیں ہیں، حضرت شاہؒ نے وضاحت کی ہے کہ ان کا اضافہ انہوں نے کیا ہے اور اس کا ترجمہ فارسی بھی دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی صراحت کردی ہے کہ نسخۂ مصمودی کی احادیث میں انہوں نے کسی طرح کی کمی بیشی نہیں کی ہے، ورنہ وہ شیخینؓ کے ساتھ حضرات عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کے مناقب کا اضافہ ضرور کرتے مگر نسخۂ مصمودی کی کامل پابندی نے اس سے باز رکھا، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت شاہؒ نے اندرونی ترتیب وتنسیق کے علاوہ کسی باب وکتاب اور ان کی احادیث کا اضافہ نہیں کیا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت شاہؒ کے زیر استعمال اور مدون نسخۂ مصمودی میں نئی احادیث اور ان کے کتب وابواب کہاں سے آئے؟ اس کا صرف ایک جواب ہے کہ وہ حضرت شاہؒ کے پاس موجود نسخۂ مصمودی میں موجود تھے، دوسرے مرتبین وشارحین کے زیر استعمال نسخوں میں موجود

نہ تھے، لہٰذا ان کے نسخے/متون ناقص رہ گئے اور حضرت شاہ کا نسخۂ مصمودی کامل ترین بن گیا، اسے حدیثی اصطلاح میں "اصح نسخ المصمودی" کہا جاسکتا ہے یا "اصح کتب موطأ"

مختصر تجزیہ:

تیرہویں، چودہویں/انیسویں، بیسویں صدی میں متعدد متون موطأ امام مالک اور ان کی شروح کی طباعت ہوئی، ان میں کئی مصری طباعتیں ہیں اور متعدد ہندوستانی، ان میں سے اولین مطبوعہ متن کا انحصار بہر حال کسی مخطوطہ پر رہا تھا مگر اس کی تحقیق ابھی باقی ہے، بعد کی تمام طباعتیں اسی اولین مطبوعہ متن پر بنیادی طور سے مبنی ہیں، صرف اختلافات کو دور کرنے اور صحیح تدوین کے لیے دوسرے مطبوعہ نسخوں سے مدد لی گئی ہے جیسا کہ فواد کے نسخہ کا حال ہے یا شیخ الحدیث کا بیان ہے۔

(شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث، ۹۹ وما بعد، مقدمہ اوجز المسالک ۱/۶۱ وما بعد، نیز مقدمہ شیخ فواد، ز-ی وغیرہ)

۲- ان تمام مطبوعہ متون اور ان کی شروح میں ایک اہم صفت مشترک ہے، وہ ہے ان کے آغاز موطأ اور اختتام نسخۂ مصمودی کی یکسانیت، وہ سب "وقوت الصلوۃ" سے شروع ہوتے ہیں اور "اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم" پر ختم ہوتے ہیں، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے مطابق یہ خاتمہ یحیٰی بن یحیٰی تمیمی حنظلیؒ کے نسخۂ موطأ میں ہے، نسخۂ مصمودی میں وہ کیسے در آیا تحقیق طلب ہے۔

۳- ان تمام متداول اور مطبوعہ نسخوں میں کتب وابواب کے متعلق گوناگوں اختلافات ملتے ہیں جن کو اندرونی تدوینی ضبط وتنسیق کا اختلاف کہا جاتا ہے، کتب وابواب کے عناوین مختلف ہیں، ان کی باہمی ترتیب میں اختلاف ہے، ان کی احادیث میں بھی بسا اوقات فرق پایا جاتا ہے، بعض احادیث وروایات کی اسناد میں بھی تبدیلی ملتی ہے، تعداد روایات کا اختلاف تو ایک مسلمہ حقیقت ہے، جیسا کہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے بستان المحدثین میں مختلف سولہ روایات موطأ کے بارے میں بتایا ہے، حافظ ابن عبدالبر قرطبیؒ نے خاص موطأ یحیٰی بن یحیٰی (مصمودیؒ) کی زائد احادیث پر تو پوری ایک کتاب لکھ دی ہے۔

(قاہرہ ۱۳۵۰ھ) بستان المحدثین، ۲۶، ابن عبدالبر قرطبی، الزیادات التی تجمع فی الموطأ عنہ یحیٰی بن یحیٰی عن مالک، شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث ۹۷)۔

۴۔ احادیث وروایات کی تعداد اور کتب وابواب کا فرق صرف سولہ نسخ موطأ تک محدود نہیں ہے بلکہ دو نسخہ مصمودی میں بھی پایا جاتا ہے، وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ موطأ مصمودی کے نسخے بھی متعدد تھے اور ان کی تفصیل فواد سزگین وغیرہ کے بیانات میں ملتی ہے، اور دوسرے شواہد و حقائق سے بھی معلوم ہوتی ہے، تمام نسخ موطأ کی مانند تمام نسخہ ہائے مصمودی کا تحقیقی مطالعہ ابھی باقی ہے۔

(شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث کا باب" شاہ ولی اللہ کے پیش نظر نسخہ مصمودی، نیز ماقبل بحث بر روایات ۹۰-۱۶۳)

۵۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نسخہ مصمودیؒ تمام متداول مطبوعہ نسخوں سے ہر طرح مختلف اور جداگانہ ہے، آغاز کتاب الصلوۃ کی حدیث حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمیؓ سے ہوتا ہے جس میں نماز و زکوۃ وصیام کی فرضیت کا بیان نبوی ہے، جب کہ تمام متداول نسخوں میں حضرت ابو مسعود بدریؓ کی حدیث جبریل علیہ السلام سے ہوتا ہے، یہ حدیث نسخہ شاہ میں کافی بعد میں ہے اور اختتام کتاب سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ کے کامل کتاب اور تئیس (۲۳) ابواب کی بہت سی احادیث وروایات پر ہوتا ہے، اور جس کی آخری حدیث فضیلت وتحریم مکہ و مدینہ کی حدیث حضرت عمرؓ پر ہے۔

(مصفی ۱/۲،۲۲/۳۱۶-۳۱۷)

۶۔ حضرت شاہؒ کے نسخہ مصمودی میں کتب کی ترتیب بھی مختلف ملتی ہے اور ابواب کی ترتیب بھی، بسا اوقات ان کے عناوین بھی مختلف ہیں اور احادیث ومرویات کا اختلاف وامتیاز تو سب سے زیادہ ہے جو متداول نسخوں میں نہیں ہیں، کتاب الرقاق، کتاب سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند دوسری کتب بھی متداول نسخوں میں نہیں ملتیں اور ابواب ذیلی بھی ان میں نہیں ہیں، اسی طرح متداول نسخوں کے متعدد ابواب اور کئی کتب جیسے کتاب الجامع حضرت شاہؒ کے نسخہ مصمودی میں نہیں پائی جاتی اور متعدد احادیث وروایات بھی حضرت شاہؒ کے نسخہ مصمودی میں نہیں ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر کو دوسرے ابواب میں تلاش کیا جاسکتا ہے خاص کر کتاب الجامع کی احادیث وروایات کو جیسا کہ گذشتہ مفصل بحث میں گزرا۔

۷۔ بالعموم حضرت شاہؒ پر قریب قریب الزام ہی لگا دیا جاتا ہے کہ انہوں نے نسخہ مصمودی کی تنسیق جدید کی تھی بلاشبہ وہ تنسیق تھی مگر تنقیح نہ تھی جیسا کہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے، حضرت شاہؒ نے کتب وابواب

کی ترتیب کے ساتھ بعض احادیث وروایات کی تنسیق جدیدان کے ابواب وکتب کے لحاظ سے کی تھی مگر اس میں کسی قسم کا اضافہ یا نسخ نہیں کیا تھا، سوائے کتب موطأ کے آغاز میں آیات متعلقہ کے اضافہ کے، جس کی انہوں نے صراحت کردی ہے، باقی حصہ میں ایمانداری بشرط استواری ہے، اندرونی ترتیب کتب وابواب اور بعض احادیث وروایات کی تقدیم وتاخیر اور عناوین کے اضافہ وغیرہ کا کام تو تمام مرتبین نے کیا ہے، جیسا کہ شیخ فواد، شیخ الحدیث محمد زکریاؒ، مفتی محمد شفیعؒ، عرموشؒ وغیرہ نے اعتراف کیا ہے، اور دوسروں نے بھی یہ کام کیا ہے، تدوین متون میں بسا اوقات یہ کام ناگزیر ہوجاتا ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تدوین میں بھی اختلاف نسخ وغیرہ کا اثر پڑا ہے، جیسا کہ اس کی طبع جدید دارالسلام ریاض کے مرتبین نے جابجا حواشی میں کیا ہے اور امام نووی کی شرح کے طبع جدید میں ملتا ہے۔

۸۔ تدوین، تنسیق اور ترتیب کے لحاظ سے تمام متداول نسخے صرف ایک نسخۂ مصمودی پر مبنی ہیں اور صرف ایک روایت مصمودی کو پیش کرتے ہیں، تمام اندرونی اختلافات اور موضوعاتی گوناگونی اور جزوی تفردات کے باوجود اپنی اصل میں یکساں ہیں، لہٰذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ صرف ایک ہی نسخۂ مصمودیؒ، مخطوطہ ہو یا مطبوعہ، پر مبنی ہیں، وہ اصل اور بنیادی نسخۂ تدوین کون سا ہے؟ ابھی تک تحقیق طلب بات ہے۔

۹۔ ان کے برعکس حضرت شاہؒ کا نسخۂ مصمودی قطعی مختلف ومنفرد ہے وہ دوسری روایت مصمودی پیش کرتا ہے، مطبوعہ مصفّٰی-مسوّی کا متن موطأ اسی خاص نسخۂ مصمودیؒ پر مبنی ہے، حضرت شاہؒ کے پاس یہ نسخہ مصمودی کہاں سے آیا تھا؟ ایک خیال ہے وہ حرمین شریفین سے اسے لائے تھے اور دوسرا یہ کہ وہ دہلی میں مختلف تجار کتب کی فراہم کردہ کتب میں تھا جیسا کہ ان کے نادر مکتوبات وغیرہ کے عمومی بیانات سے معلوم ہوتا ہے، یہ بھی تحقیق طلب ہے کہ وہ نسخۂ شاہؒ اب کہاں ہے؟

۱۰۔ تقابلی مطالعہ، تدوینی موازنہ اور متون کی جمع وترتیب کے اصول دو اہم حقیقتیں ثابت کرتے ہیں: اول یہ کہ تمام متداول مطبوعہ نسخوں کے متون اور ان پر مبنی شروح کے متون ناقص ہی نہیں ناقص الطرفین ہیں، بالخصوص آخری کتب وابواب کے لحاظ سے، دوم حضرت شاہؒ کا نسخۂ مصمودیؒ کامل ترین اور

صحیح ترین ہے، اور وہی اصل نسخۂ مصمودی ہے، دوسرے تصحیف کا شکار ہیں۔

۱۱۔ شیخ فوادؒ، امام شنقیطیؒ اور دوسرے مصری اور عرب علماء نے بالعموم اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ وغیرہ ہندی مرتبین وشارحین نے بالخصوص حضرت شاہؒ کے نسخۂ مصمودی اور ان کی شروح مصفّی ومسوّی کا قدم قدم پر حوالہ دیا ہے، حتیٰ کہ انہوں نے صحیحین بالخصوص بخاری کے موطأ امام مالک سے مستخرج ومستفیض ہونے کے نظریہ شاہ کو قبول کرلیا ہے اور شیخ شنقیطیؒ نے تو ابواب احکام کے علاوہ دوسرے ابواب حدیث میں بھی بخاری وغیرہ کے موطأ امام پر مبنی ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے، اس کے باوجود ان تمام اکابر حدیث نے تدوین موطأ کے باب اہم ترین میں شاہ ولی اللہؒ کے ایڈیشن سے فائدہ نہ اٹھایا۔

(مسوّی، ۱/۹-۱۰: إن الكتب المصنفة في السنن كصحيح مسلم وسنن أبي داؤد والنسائي وما يتعلق بالفقه من صحيح البخاري وجامع الترمذي مستخرجات على الموطأ الخ)

۱۲۔ ابھی تک تمام متون موطأ ناقص اور تدوین کے لحاظ سے فروتر ہیں، حضرت شاہؒ کے مصفّی، مسوّی پر مبنی کر کے صحیح ترین اور جامع وکامل ترین طباعت موطأ اہل علم پر واجب ہے، اس کا موزوں ترین نام ''ولی اللّٰہی طباعت موطأ'' رکھا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہؒ موطأ امام مالکؒ اور کے نسخۂ مصمودیؒ کے نہ صرف مالک ومطابع وناشر تھے بلکہ فن حدیث کے عظیم ترین امام الہند تھے۔



محدثین ہند کا مسلکی توسع

از: مولانا عبدالرشید ندوی

ہندوستان کے علماء کرام کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں مسلکی تشدد، جمود وتنگ نظری انتہا درجہ کی پائی جاتی ہے اور فقہی مسالک ان کے نزدیک ایسے آہنی سانچے ہیں کہ جن کا ٹوٹ جانا تو ممکن ہے، لیکن وسیع ہونا ممکن نہیں، مجھے اس مقالہ میں اس کے اسباب سے بحث نہیں کرنی ہے، اور نہ یہ بیان کرنا ہے کہ اس میں کہاں تک حقیقت اور سچائی ہے، اور کتنا الزام وافترا یا مبالغہ ہے، لیکن میں نے ابتدائی کوشش کی ہے اور چند مشاہیر محدثین اور علماء کے یہاں پائی جانے والی ان آراء کا عمومی جائزہ لیا ہے جن سے ان کا مسلکی توسع آشکارا ہوتا ہے، اور اس کی چند مثالیں پیش کی ہیں، اس میں بھی تیرھویں اور چودھویں صدی کے علماء ہیں لیکن تمہیدی طور پر میں نے شاہ ولی اللہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس شخصیت کا نام نامی آتا ہے وہ فخر ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ کی شخصیت ہے، سب سے پہلے تو یہ واضح رہے کہ شاہ صاحب ائمہ اربعہ کی تقلید کے جواز کے قائل ہیں، انہوں نے "الإنصاف في بيان أسباب الإختلاف" ص ۹۷ اور حجة الله البالغة ج ا ص ۱۵۴ پر صراحت سے فرمایا:

"إن هذه المذاهب الأربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الأمة أو من يعتد به منها على جواز تقليدها إلى يومنا هذا، وفي ذلك من المصالح مالا يخفى، لاسيما في هذه الأيام

التي قصرت فيها الهمم جدا، وأشربت النفوس الهوى، وأعجب كل ذي رأي برأيه".

''امت کا معتد بہ حصہ مسالک اربعہ کی تقلید کے جائز ہونے پر متفق ہے، اوراس میں جو مصلحتیں ہیں وہ مخفی نہیں ہیں، خصوصا ہمارے اس دور میں جب کہ ہمتیں پست ہوگئی ہیں، اور دلوں میں اهواء پرستی ہے، ہرشخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے اوراسی پر فریفتہ ہے''۔ (حجۃ اللہ البالغۃ مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)

لیکن شاہ صاحب رحمہ اللہ کا یہ توازن واعتدال ہے کہ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

"فإن بلغنا حديث من الرسول المعصوم ﷺ الذي فرض الله علينا طاعته بسند صالح يدل على خلاف مذهبه، وتركنا حديثه واتبعنا ذلك الظن فمن أظلم منا، وما عذرنا يوم يقوم الناس لرب العالمين" (حجۃ اللہ ج۱ص۱۵۶)

''پھر اگر رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہم تک صحیح سند سے پہنچے جوان امام کے مسلک کے مخالف دال ہو اور ہم آپ کی حدیث کو چھوڑ کر اس ظن وقیاس پر چلیں تو ہم سے بڑا ظالم کون ہوگا اور روز محشر اللہ کے سامنے ہم کیا جواب دیں گے''۔

اسی طرح حضرت شاہ صاحب نے محدثین اور فقہاء دونوں کے مسلک کے درمیان جمع وتطبیق کا راستہ اختیار کرنے کو حق وانصاف کی بات فرمایا ہے "وإن التخريج على كلام الفقهاء، وتتبع لفظ الحديث، لكل منهما أصل أصيل في الدين فلا ينبغي أن يهمل أمر واحد منهما بالمرة كما يفعله عامة الفريقين، وإنما الحق البحث أن يطابق أحدهما بالآخر، وأن يجبر خلل كل بالآخر فمن كان من أهل الحديث ينبغي أن يعرض ما اختاره وذهب إليه على رأي المجتهدين، ومن كان من أهل التخريج فينبغي أن يحصل من السنن ما يحترز به من مخالفة الصريح الصحيح ومن القول برأيه فيما فيه حديث أو أثر بقدر الطاقة ولا ينبغي أن يرد حديثا أو أثرا تطابق عليه القوم لقاعدة استخرجها هو وأصحابه كرد حديث المصراة، وكإسقاط سهم ذوي القربى، فإن رعاية الحديث أوجب من رعاية تلك القاعدة المخرجة. وإلى هذا المعنى أشار الشافعي حيث قال: مهما قلت من قول أو أصلت من أصل فبلغ عن

رسول الله صلى الله عليه وسلم خلاف ما قلت فالقول ما قاله صلى الله عليه وسلم .

(حجۃ اللہ ج اص ۱۵۶، ۱۵۷، اور" الإنصاف في بيان أسباب الاختلاف" ص ۶۳ تخلیص کے ساتھ)

آپ نے تفہیمات میں اپنی اولاد اور احباب کے نام ایک وصیت میں فرمایا:

"در فروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میاں فقہ وحدیث کردن، ودائما تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن، آنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن، والا کالائی بدبر بش خاوند دادن، امت راہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغناء حاصل نیست، وسخن متقشفہ فقہا کہ تقلید عالمی رادست آویز ساختہ تتبع سنت راترک کردہ اند نشنیدن، وبدیشاں التفات نہ کردن، وقربت خداجستن بدوری ایناں"۔ (تفہیمات ص ۲۴۰ مطبوعہ مدینہ برقی پریس بجنور ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء)

یہ شاہ صاحب کے کلیات ونظریات تھے اب آیئے جزئیات وفروع میں آپ کے اعتدال وانصاف کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۱۰ میں رفع یدین اور ایک رکعت وتر کے بھی سنت ہونے کی صراحت فرماتے ہیں: "فعله النبي صلى الله عليه وسلم مرة وتركه مرة، والكل سنة، واخذ بكل واحد جماعة من الصحابة والتابعين ومن بعدهم ، وهذا أحد المواضع التي اختلف فيها الفريقان أهل المدينة والكوفة، ولكل واحد أصل أصيل، والحق عندي في مثل ذلك أن الكل سنة، ونظيره الوتر بركعة واحدة أو بثلاث، والذي يرفع أحب إليّ ممن لا يرفع، فإن أحاديث الرفع أكثر وأثبت، غير أنه لا ينبغي لإنسان في مثل هذه الصور أن يثير على نفسه فتنة عوام بلده"

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین کیا بھی ہے اور آپ نے کبھی اس کو ترک بھی فرمایا ہے اور دونوں سنت ہے،...... ایسے مسائل میں میرے نزدیک حق یہ ہے کہ سب سنت ہیں، اسی طرح ایک رکعت اور تین رکعت وتر کا مسئلہ ہے جو رفع یدین کرتا ہے وہ شخص مجھے زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے جو نہیں کرتا ہے، کیوں کہ رفع یدین کی حدیثیں تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ثبوت کے اعتبار سے بھی اقوی، لیکن ایسے مسائل میں انسان کو اپنی ذات کے لیے اپنے علاقہ والوں کی طرف سے فتنہ نہیں پیدا

کرنا چاہیے''۔

''مصراۃ'' یعنی وہ جانور جس کا دودھ تھنوں میں جمع کردیا جائے تاکہ مشتری فریب میں آجائے جس کے بارے میں حدیث وارد ہوئی کہ مشتری کو اختیار ہے کہ اس کو رکھے یا واپس کردے اور ساتھ میں ایک صاع کھجور یا نصف صاع گیہوں مزید دے دے، احناف اس کو خاص واقعہ قرار دیتے ہیں، شاہ صاحب کا کلام اس ضمن میں ملاحظہ ہو:

واعتذر بعض من لم يوفق للعمل بهذا الحديث بضرب قاعدة من عند نفسه، فقال: كل حديث لا يرويه إلا غير فقيه إذا انسد باب الرأي فيه يترك العمل به، وهذه القاعدة على ما فيها لا تنطبق على صورتنا هذه، لأنه أخرجه البخاري عن ابن مسعود رضي الله عنه أيضا، وناهيك به، ولأنه بمنزلة المقادير الشرعية بترك الطفل حسن تقدير ما فيه ولا يستقل بمعرفة حكمة هذا القدر خاصة اللهم إلا عقول الراسخين في العلم ".

"بعض وہ لوگ جن کو اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ملی، انہوں نے اپنی طرف سے ایک قاعدہ بنا کر اس کا جواب دیا ہے وہ یہ کہ ''غیر فقیہ جب خلاف قیاس مسئلہ میں کوئی حدیث روایت کرے اس پر عمل ترک کیا جائے گا''، صرف نظر اس سے کہ خود یہ ضابطہ محل نظر ہے، لیکن ہمارے اس مسئلہ میں یہ بھی منطبق نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس حدیث کو بخاری نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۱۱۱)

حضرت شاہ صاحب کے بعد اس سلسلہ میں جس دوسری شخصیت کا اسم گرامی آتا ہے وہ فخر المتأخرین حضرت عبدالحی فرنگی محلی حنفی ہیں، انہوں نے صاف لکھا ہے اور عمل بالحدیث کو اور اشتغال بالحدیث کو نعمت خداوندی قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

"ومن منحه أني رزقت التوجه إلى فن الحديث وفقه الحديث، ولا أعتمد على مسألة مالم يوجد أصلها من حديث أو آية، وما كان خلاف الحديث الصحيح الصريح أتركه وأظن المجتهد فيه معذوراً بل مأجوراً، ولكني لست ممن يشوش العوام الذين هم كالأنعام، بل

انكلم الناس على قدر عقولهم" (النافع الكبير ص ۲۷ ط: المطبع المصطفائی ۱۲۹۱ھ)

"اللہ کا ایک احسان مجھ پر یہ ہے کہ مجھے حدیث اور فقہ حدیث سے شغف عطا فرمایا کسی بھی مسئلہ پر میں اس وقت تک اعتماد نہیں کرتا ہوں جب تک آیت قرآنی یا حدیث نبوی سے اس کی اصل نہیں ملتی، جو رائے صحیح وصریح حدیث کے خلاف ہوتی ہے میں اس کو ترک کر دیتا ہوں اور مجتہد کو معذور بلکہ ماجور سمجھتا ہوں، لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں جو عوام کالانعام کو تشویش میں ڈالتے ہیں بلکہ میں ہر ایک شخص سے اس کی ذہنی سطح سے بات کرتا ہوں"

ایک دوسری جگہ اور تحریر فرماتے ہیں: "ويعلم أيضاً أن الحنفي في مسئلة مذهب إمامه لقوة دليل خلافه لايخرج عن ربقة التقليد ، بل هو عين التقليد في صورة ترك التقليد ، ألا ترى إلى أن عصام بن يوسف ترك مذهب أبي حنيفة في عدم الرفع، ومع ذلك هو معدود في الحنفية، ويؤيده ماحكاه أصحاب الفتاوى المعتمدة من أصحابنا من تقليد أبي يوسف يوماً الشافعي في طهارة القلتين، وإلى الله المشتكى من جهلة زماننا حيث يطعنون على من ترك تقليد إمامه في مسئلة واحدة لقوة دليلها ويخرجونه عن مقلديه، ولا عجب منهم فإنهم من العوام، إنما العجب ممن يتشبه بالعلماء ويمشي مشيهم كالأنعام

(الفوائد البهية في تراجم الحنفية ص ۱۱۶ مطبوع في المطبع المصطفائي)

"حنفی کسی مسئلہ میں اپنے امام کے مسلک کو دوسری قوی دلیل کی بنا پر اگر ترک کر دے تو اس سے وہ دائرہ تقلید سے خارج نہیں ہو جاتا، بلکہ ترک تقلید کی شکل میں یہ عین تقلید ہے، چنانچہ دیکھئے کہ عصام بن یوسف نے رفع الیدین کے مسئلہ میں ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک چھوڑ کر دوسرا مسلک اختیار کیا لیکن پھر بھی ان کا حنفیہ میں شمار ہوتا ہے...... ہمارے دور کے جاہلوں کے رویہ کا ہم اللہ ہی سے شکوہ کرتے ہیں، وہ اس شخص کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں جو دلیل کی قوت کی بنا پر کسی مسئلہ میں اپنے امام کے مسلک کو ترک کر دیتا ہے اور اس کو تقلید سے خارج کر دیتے ہیں، عوام پر تو کوئی تعجب نہیں لیکن تعجب ان پر ہے جو علماء کی مشابہت اختیار کرتے ہیں"۔

اس طرح کی عبارتیں آپ کے فتاویٰ میں بھی جگہ جگہ پائی جاتی ہیں، یہ فروعی مسائل تو بے شمار مسائل میں انہوں نے مسلک حنفی کے علاوہ کو ترجیح دی ہے، چند کا تذکرہ اس موقع پر کیا جاتا ہے۔

آمین بالجہر کے بارے میں فرماتے ہیں: " والإنصاف ان الجهر قوي من حيث الدليل.

(التعلیق الممجد ج ا ص ۳۴۷)

یعنی انصاف کی بات یہ ہے کہ آمین بالجہر دلیل کے اعتبار سے قوی ہے۔

رکوع سے اٹھنے کے بعد قومے، سجدوں میں نیز جلسہ میں جو دعائیں احادیث میں آتی ہیں ان کے بارے میں احناف کا موقف مشہور ہے کہ وہ ان کو نوافل پر محمول کرتے ہیں، علامہ فرماتے ہیں:" إن حمل جميع الأخبار الواردة في الأذكار الزائدة على النوافل مشكل، ولا حاجة إلى التزامه فالحق هو ماذهبنا إليه ، وبميل إليه صاحب الحلية وابن عابدين هو أن الأخبار الواردة في ذلك لا تثبت الدوام لتدل على السنية كما اختاره الشافعية، بل هي محمولة على الإتيان بها أحيانا فتكون من المستحبات فاحفظه.

(السعایہ ج ۲ ص ۲۰۹ مطبوعہ لاہور سہیل اکیڈمی ۱۴۰۸ھ ۱۹۸۷ء)

"ان احادیث کو سبھی کو نوافل پر محمول کرنا اشکال سے خالی نہیں ہے، اور اس کی چنداں ضرورت نہیں، صحیح بات یہی ہے جو ہم نے اختیار کی اور صاحب حلیہ اور ابن عابدین کا رجحان بھی اسی جانب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ یہ احادیث دوام پر دلالت نہیں کرتی ہیں کہ ان اذکار کو سنت کہا جائے جیسا کہ شافعیہ فرماتے ہیں، بلکہ احیاناً پڑھنے پر محمول ہیں اور ان کا درجہ استحباب کا ہوگا، اس کو اچھی طرح یاد رکھو"۔

عصر کی نماز کے دوران سورج غروب ہو جائے، اسی طرح فجر کی نماز کے دوران طلوع ہو جائے اس مسئلہ میں جمہور کی تائید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إن الرأي والقياس لا مدخل له حين ورد النص وههنا قدورد حديث دالّ صريحا على مساواة حكم صلاة الفجر وصلاة العصر في أنها لا تفسد باعتراض الطلوع والغروب فالتعليل لإثبات خلافه يكون مردودا".

''نص جب آجائے تو رائے اور قیاس کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے اور اس مسئلہ میں صریح حدیث موجود ہے کہ نماز فجر اور نماز عصر دونوں کا حکم ایک ہے کہ طلوع وغروب کے بیچ میں ہو جانے سے وہ فاسد نہیں ہوں گی چنانچہ اس کے خلاف کے لیے علت بیان کرنا قابل رد ہوگا''۔

شیخ رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ ظہر کا وقت ایک مثل تک رہنے اور اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جانے کو راجح قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"الدليل يرجع قولهما، والمستدل به على رواية المثلين لا يخلو شيئ منها عن شيئ و قال: فالتحقيق الذي ارتضاه المحققون أن الصحيح من المذهب هو العمل برواية المثل في الظهر، ويدخل بعده وقت العصر، ومع ذلك فالأولى أن يفرغ من الظهر قبل انقضاء المثل سوى فيئ الزوال ويدخل في صلاة العصر بعد المثلين لئلا يكون صلاته مختلفا فيها، لكن التشدد في ذلك مما لا ينبغي أيضاً" (الكوكب الدري ص ۱۹۱ - ۱۹۹)

''دلیل کے اعتبار سے صاحبین کا قول راجح ہے، مثلین پر جن دلائل سے استدلال کیا جاتا ہے ان میں اشکال ہے اور استدلال محل نظر ہے، چنانچہ محققین کے نزدیک مثل کی روایت پر عمل کرنا پسندیدہ ہے اور اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ظہر کی نماز مثل تک پوری کر لی جائے اور عصر کی نماز مثلین کے بعد ہی شروع کی جائے تاکہ کوئی اختلاف نہ رہے، لیکن اس میں بھی تشدد نہیں کرنا چاہیے''۔

قلتین کے مسئلہ میں حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں اور احناف کی تردید فرماتے ہیں۔

"قد أجاب بعض الحنفية عن حديث القلتين بأجوبة لا ترضاها الطبائع السليمة وأنت تعلم أن كل ذلك تعسف، فإن صحة رواية القلتين غير منكرة، والروايات الواردة في السنن شاهد صدق على ذلك" .

(الكوكب الدري ج ۱ ص ۹۰-۹۷)

''بعض احناف نے کے قلتین کی حدیث کے بارے میں ایسے جوابات دیئے ہیں جن کو سلیم

طبائع پسند نہیں کرتی ہیں، اور آپ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یہ سب تکلف اور تعسف ہے، اور قلتین کی روایت کی صحت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، سنن کی روایات اس کی شاہد عدل ہیں"۔

"الکوکب الدري" کے جامع مولانا یحییٰ فرماتے ہیں: حضرت شیخ گنگوہی نے احناف اور شوافع کے مسلک میں جمع وتطبیق دی، احناف کا مسلک یہ ہے کہ اگر اتنا بڑا حوض ہے کہ ایک کنارہ ہلانے سے دوسرے میں حرکت نہ ہو تو وہ ماء کثیر کے حکم میں ہے، آپ نے ایک گڑھا کھودنے کا حکم دیا اور اس میں دو قلے کی مقدار میں پانی ڈلوایا، پھر تجربہ کیا تو ایک کنارے کے حرکت دینے سے دوسرے میں حرکت نہیں ہوئی۔

حضرت گنگوہی نے مغرب سے پہلے نفل پڑھنے کے بارے میں حدیث کے پیش نظر ارشاد فرمایا:

"هذا مما اختلف فيه علماء نا والصحيح عدم كراهتها إذا لم لم يخف فوات التكبيرة الأولى. (الكوكب الدري ج ا ص ۲۱۴).

مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے رفع یدین کے ثبوت کی صراحت فرمائی اور ان احناف کی تردید کی جو اس کو منسوخ قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں۔ (فیض الباری ج ۲ ص ۲۵۷-۲۶۱)۔

"واعلم أن الأحاديث الصحاح في الرفع تبلغ إلى خمسة عشر، وإن سلكنا مسلك الإغماض فإلى ثلاثة وعشرين، ولنا حديث ابن مسعود مرفوعا ومسند آخر في التخريج للزيلعي، فقد ثبت الأمران عندي ثبوتا لا مرد له ولا خلاف إلا في الاختيار وليس في الجواز فالقول بالكراهة في مسئلة متواترة بين الصحابة ، رضي الله عنهم، شديد عندي ، ثم تتبعت الكتب فوجدت أبابكر الجصاص قد صرح في أحكام القرآن تحت قوله تعالى: "كتب عليكم الصيام" أن المسئلة إذا وردت فيها الأحاديث الصحاح من الجانبين فالخلاف فيها لا يكون إلا في الاختيار سيما إذا كانت كثيرة الوقوع، وعد منها الترجيع في الأذان و إفراد الإقامة والجهر بالتسمية ورفع اليدين، وحينئذ فاسترحت حيث تخلصت رقبتي من الأحاديث

الثابتة في الرفع وقد اشتهر في متأخري الحنفية القول بالنسخ، وإنما تعلموه عن الشيخ ابن الهمام، والشيخ اختاره تبعا للطحاوي، وقد علمت أن نسخ الطحاوي أعمّ مما في الكتب، فإن المفضول بالنسبة إلى الفاضل، والأضعف دليلا بالنسبة إلى أقواه كله منسوخ عنده كما يتضح ذلك لمن يطالع كتابه.

وكيف ما كان إذا ثبت عندي القول بالجواز ممن هو القدم في الحنفية وساعدته الأحاديث أيضا فلا محيد إلا بالقول به، وخلافه لا يسمع لمن شاء فليسمع.

''رفع یدین کی صحیح حدیثوں کی تعداد۱۵ ہیں اور اگر تسامح سے کام لیں تو ۲۳ ہے، اور ہماری دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے اور ایک اور مسند حدیث ہے جو تخریج زیلعی میں ہے، تو میرے نزدیک رفع یدین اور ترک رفع یدین دونوں قطعی طور پر ثابت ہیں اور اختلاف صرف اختیار و ترجیح میں ہے، جواز میں کوئی کلام نہیں، جو مسئلہ صحابہ کے درمیان متواتر رہا ہو اس کو مکروہ کہنا میرے نزدیک بہت سخت ہے، پھر میں نے کتابوں کو چھانا تو پایا کہ جصاص نے احکام القرآن میں کتب علیکم الصیام کے تحت صراحت کی ہے کہ جب کسی مسئلہ میں جانبین کی طرف صحیح احادیث موجود ہوں تو اختلاف صرف اختیار و ترجیح کا ہوتا ہے، خصوصاً جب وہ مسئلہ کثیرۃ الوقوع ہو، اور اس کی مثال میں انہوں نے اذان میں ترجیع، اقامت میں افراد، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہراً پڑھنا اور رفع یدین کو لیا ہے، جب میں نے یہ دیکھا تو راحت ملی کہ رفع یدین کی ثابت حدیثوں کی مخالفت کرنے سے نجات پا گئے۔

متاخرین احناف کے یہاں منسوخ ہونے کا قول مشہور ہو گیا ہے اور اس کو انہوں نے شیخ ابن الھمام سے اخذ کیا ہے اور انہوں نے امام طحاوی سے لیا ہے، حالاں کہ آپ جانتے ہیں کہ امام طحاوی کے یہاں نسخ کے معنی زیادہ عام ہیں ان کے نزدیک فاضل کے مقابلہ میں مفضول اور اقوی کے مقابلہ میں اضعف منسوخ میں شمار ہو جاتا ہے، جیسا کہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے یہ بات ظاہر ہے۔

بہر حال جب میرے نزدیک حتقدم حنفی سے جواز کا قول ثابت ہو گیا اور احادیث اس کی مؤید ہیں تو اس کا قائل ہونے سے کوئی مفر نہیں ہے، اور اس کے خلاف کوئی قول نہیں سنا جائے گا، جس کو سننا ہو وہ سنے''۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم ج ۲ ص ۴۰ پر حضرت کشمیری سے نقل کیا ہے:

"الصحيح أن فوق السرة وتحتها وعند الصدر كما هو عند البزار ألفاظ مقاربة وليس البون بينها بعيداً"

''یعنی ناف کے اوپر ہاتھ باندھنا یا ناف کے نیچے یا سینہ پر جیسا کہ بزار کی روایت میں ہے یہ سب قریب قریب الفاظ ہیں، جن میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے''۔

نیز فیض الباری ج ۲ ص ۲۶۷ میں آپ فرماتے ہیں: "الوضع فوقها وتحتها كلها صور غير مقصودة على التعيين وكان الشرع ارسله إلى طبائع الناس ليفعلوا فيه ماشاء وا"۔

یعنی ناف کے اوپر ہاتھ باندھنا یا ناف کے نیچے باندھنا یہ تمام صورتیں بالذات مقصود نہیں گویا کہ شریعت نے اس کو لوگوں کے مزاج پر چھوڑ دیا ہے کہ جس کو جو اختیار کرنا ہو کر لے''۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے خطبہ کے وقت تحیۃ المسجد کی بحث کے ضمن میں فتح الملہم ج ۲ ص ۴۱۷ پر تحریر فرمایا ہے:

"إن أدلة الحظر والإباحة قد تعارضت في تحية المسجد فيترجح الحاظر على المبيح لكونه محرما، ولكونه قريبا من التواتر وأوفق بجمهور السلف، وإن ترجح المبيح لكونه خاصا ونصافي المسئلة والحاظر ليس كذلك والله سبحانه وتعالى أعلم بالصواب، هذا غاية السعي في هذا المقام، والإنصاف أن الصدر لم ينشرح لترجيح أحد الجانبين إلى الآن ولعلّ الله يحدث بعد ذلك أمراً"۔

خطبۂ جمعہ کے دوران تحیۃ المسجد کے سلسلہ میں جواز اور منع جواز کے دلائل متعارض ہیں، تو اب منع جواز کی دلیل راجح ہے کیوں کہ وہ محرم ہے، اور جمہور سلف کے معمول سے اقرب ہے، اگر چہ

جواز کی دلیل راجح ہے اس اعتبار سے کہ یہ عام نوافل سے الگ خاص مسئلہ ہے، جس میں نص آیا ہے واللہ اعلم بالصواب، اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ابھی تک کسی ایک پہلو کے راجح ہونے میں انشراح صدر نہیں ہوا ہے، شاید کہ بعد میں اللہ کچھ فیصلہ فرما دے"۔

اس کے بعد فرماتے ہیں جس سے جواز کی طرف ان کے میلان کا پتہ چلتا ہے:

"وأما ما قال بعض المدرسين أن الأصل في الباب قصة سليك وهي واقعة عين تحتمل وجوها، ثم فهم منها بعض الرواة ضابطة ورووها كما فهم، فجعل الجزئية كلية، فسياق الروايات يرده، فإن في بعض الروايات الصحيحة وقع الجمع بين القصة الجزئية والضابطة الكلية، والأصرح منها ما في سنن أبي داود بعد ذكر قصة سليك، ثم أقبل على الناس ثم قال: إذا جاء أحدكم الحديث، فهذا صريح في أنه صلى الله عليه وسلم خاطب به الناس بعد ما خاطب سليكاً، ونبه على أن الحكم ليس مختصا به والله أعلم"۔

یعنی بعض مدرسین کا یہ کہنا کہ اس مسئلہ میں اصل دلیل سلیک رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہی ہے، اور یہ ایک خاص واقعہ ہے جس میں کئی احتمالات ہو سکتے ہیں، پھر بعض رواۃ نے اس سے ایک ضابطہ سمجھا اور پھر روایت بالمعنی کر دیا اور اس کو عام قاعدہ کی شکل میں بیان کر دیا، روایات کا سیاق وسباق اس قول کی تردید کرتا ہے، کیوں کہ بعض روایات میں جزئی قصہ اور کلی ضابطہ دونوں موجود ہیں، اور اس سے زیادہ صریح ابوداود کی روایت ہے جس میں حضرت سلیک کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد یہ وارد ہوا ہے کہ پھر آپ لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی خطبہ کے وقت آئے تو چاہیے کہ دو رکعت ہلکی پڑھ لے، تو یہ روایت صریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلیک سے خطاب کے بعد لوگوں سے الگ خطاب فرمایا اور اس پر تنبیہ فرما دی کہ یہ صرف ان کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ واللہ اعلم

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فقہی موقف پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا:
مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا عمل یہ رہا ہے کہ عقائد میں سلف صالحین رحمہم اللہ کے

مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتامہ نہیں ہوسکی ہے، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقیح کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو"۔

(شذرات سلیمانی: ج ۲ ص ۳۱۸ مطبوعہ دار المصنفین ۱۹۹۸ء)

مولانا ظفر احمد تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "اعلاء السنن" جز ۲ ص ۸۶ پر جمع بین الصلاتین کی بحث میں ایک عنوان قائم فرمایا "لا بأس بتقليد غير إمامه عند الضرورة الشديدة" اور اس میں علماء احناف کے وہ اقوال ذکر فرمائے جن میں دوسرے مسلک پر اس کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے عمل کرنے کو لابأس بہ فرمایا گیا ہے، اس سے جمع بین الصلاتین کے جواز کی طرف آپ کا رجحان واضح ہوجاتا ہے۔

حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اذان میں ترجیع یعنی شہادتین کو چار مرتبہ کہے جانے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"اس عاجز کا خیال یہ ہے کہ جیسی حضرت ابومحذورہ کی ایک عاشقانہ ادا یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر کے اگلے حصہ (ناصیہ) پر جہاں دست مبارک رکھا تھا وہ وہاں کے اپنے بالوں کو کبھی کٹواتے نہیں تھے، اسی طرح ان کی ایک ادا یہ بھی تھی کہ وہ ہمیشہ ترجیع کے ساتھ اذان کہتے تھے جو رسول اللہ نے ان کی خاص حالت کی وجہ سے ان سے کروائی تھی، اور بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا لیکن حضور نے منع نہیں فرمایا، اس لیے اس کے بھی جواز میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں اور حقیقت وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ نے بیان فرمائی ہے کہ اذان واقامت کے کلمات کا یہ اختلاف بس مختلف قرأتوں کا سا اختلاف ہے، واللہ اعلم۔

(معارف الحدیث ج ۳ ص ۱۵۲ تا ۱۵۳)

قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"الحمد للہ پوری بصیرت اور یقین کے ساتھ اس عاجز کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کے مایۂ

فخر اور استاذ الاساتذہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں اصولی طور پر جو راہ عدل واعتدال ان اختلافی مسائل کے بارے میں اختیار کی ہے، اس دور میں امت محمدیہ کے لیے بس وہی راہ ہے جس کو اپنا لینے کے بعد امت کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر سے جڑ سکتا ہے۔

(معارف الحدیث: ج ۳ ص ۲۳۵)

اسی طرح حضرت نعمانی رحمہ اللہ نے آمین بالجہر اور آمین بالسر، رفع الیدین اور ترک رفع الیدین میں بھی انتہائی توسع اور اعتدال کے ساتھ کلام فرمایا اور دونوں صورتوں کا اللہ کے رسول سے ثابت ہونا تحقیق فرمایا اور ائمہ کے درمیان اختلاف صرف افضلیت واختیار کا ہے اس کی طرف اشارہ فرمایا۔

(دیکھئے معارف الحدیث ج ۳ ص ۲۶۳-۲۶۵)

یہ صرف چند علماء کی چند مثالیں ہیں، کتابوں کو کنگھالنے سے ایسی اور بے شمار مثالیں ہم کو مل جائیں گی۔



تیرہویں وچودہویں صدی ہجری کے چند ممتاز محدثین عظام اور جلیل القدر اساتذۂ حدیث

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

از: جناب مولانا عبدالحلیم چشتی

عبدالعزیز اصلی نام ہے اور تاریخی نام غلام حلیم ہے، سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہے۔

موصوف دہلی میں جمعہ کے دن ۲۵؍رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ-۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے، حافظہ اور ذہانت خداداد تھی، قرآن مجید کے ساتھ فارسی بھی پڑھ لی اور گیارہ برس کی عمر میں عربی تعلیم کا انتظام ہوا اور پندرہ سال کی عمر میں جملہ علوم رسمیہ سے فراغت حاصل کر لی، شاہ صاحبؒ نے علوم عقلیہ کی تحصیل والد بزرگوار کے بعض شاگردوں سے کی اور حدیث وفقہ شاہ ولی اللہؒ نے خود پڑھائی تھی، ابھی سترہ برس کے تھے کہ شاہ ولی اللہ کا انتقال ہوگیا تو شاہ ولی اللہؒ کے تلمیذ خاص محمد عاشق پھلتی سے تکمیل کی، موصوف چوں کہ شاہ صاحبؒ کے سب سے بڑے فرزند تھے اور علم وفضل میں بھی سب سے ممتاز تھے، لہٰذا مسندِ درس وخلافت ان ہی کے سپرد ہوئی، اور موصوف درس وتدریس، ہدایت و ارشاد اور تصنیف وتالیف میں ہمہ تن مصروف ہوگئے، شاہ صاحبؒ کو تمام علوم متداولہ اور فنون عقلیہ ونقلیہ میں کامل دستگاہ حاصل تھی، حافظہ بھی بلا کا قوی تھا، تقریر معنی خیز وسحر انگیز، مرتب ودل نشین ہوتی تھی، جس نے آپ کی ذات کو مرجع عوام وخواص بنا دیا تھا، علوِ اسناد کی وجہ سے دور دور سے لوگ سفر کر کے حلقۂ درس میں شرکت کرتے اور سند فراغ حاصل کرتے تھے، درس وتدریس، افتاء، تصنیف، فصل خصومات، پند وموعظت اور شاگردوں کی تربیت میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے، موصوف

کی ذات سے ہندوستان میں علوم اسلامیہ خصوصاً حدیث وتفسیر کا بڑا چرچا ہوا، مسلمانوں کی اصلاح ہوئی اور فتنوں کا سد باب ہوا، ان ہی کی مساعی جمیلہ، نالۂ نیم شبی اور توجہ نے شاگردوں اور مریدوں میں وہ روح پھونکی جس نے مسلمانوں میں بڑا انقلاب پیدا کیا اور مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور ثقافتی حالت کو اس درجہ بہتر بنایا کہ ایک مرتبہ تو قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہوگئی، شاہ صاحبؒ کو حدیث، فقہ، تفسیر، کلام ہی میں کمال حاصل نہ تھا بلکہ منطق وفلسفہ اور شعر وادب میں بھی مہارت حاصل تھی، حدیثیں کثرت سے یاد تھیں، مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے شیخ محمد تھانویؒ شاگرد شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے نقل کیا ہے:

(انہوں نے) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی نسبت فرمایا" ان کو چھ ہزار حدیث کے متن یاد تھے"۔ (الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ، ادارۂ اشرفیہ پاکستان کراچی ۱/۲۷۰)

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی "الیانع الجنی" میں رقم طراز ہیں:

قد بلغ من الكمال والشهرة بحيث	وہ کمال اور شہرت کے ایسے مقام کو پہنچے کہ تم
ترى الناس في مدن أقطار الهند	دیکھتے ہو لوگ بلاد ہند میں اپنا ان سے
يفتخرون باعتزائهم إليه بل	انتساب کرنا فخر سمجھتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو
بانسلاكهم في سمط من ينتمي إلى	ایسے رشتے میں منسلک کرنے میں جوان کے
أصحابه ومن سجاياه الفاضلة	شاگردوں پر منتہی ہوتا ہے قابل فخر خیال
الجميلة التي لايدانيه فيها عامة أهل	کرتے ہیں، ان کے خصائل حمیدہ اور اخلاق
زمانه قوة عارضته لم يناضل أحدا	فاضلہ ایسے ہیں کہ جن میں ان کے عام
إلا أصاب غرضه وأصمى رميته	معاصرین ان سے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے،
وأحرز خصله، ومن ذلك براعته	جس نے بھی ان سے مقابلہ کیا وہ ان کے
في تحسين العبارة وتحبيرها والتأنق	نشانہ پر گرا اور اس نے ان ہی کے نشانہ پر تیر
فيها وتحريرها حتى عده أقرانه	چھوڑا اور ان کے طور طریق کو اختیار کیا، اور

مقدما من بين حلبة رهانه وسلموا له قصبات السبق في ميدانه ومنها فراسته التي أقدره الله بها على تأويل الرؤيا فكان لايعبر شيئا منها إلا جاء ت كما أخبر به كأنما قد رآها وهذا لايكون إلا لأصحاب النفوس الزاكيات المطهرة من أدناس الشهوات الردية وأرجاسها، وكم له من خصال محمودة وفضائل مشهودة.

ان کے منجملہ محاسن کے عبارت آرائی اور انشاء پردازی میں فائق ہونا اور اس میں سحر آفرینی ہے، ان کی تحریریں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان کے معاصرین نے ان کو اپنا پیش رو مانا اور سب نے اس امر کو تسلیم کیا کہ وہ میدان مسابقت میں گوئے سبقت لے جانے والے ہیں اور نشان پر قبضہ کرنے والے ہیں اور منجملہ اس کے ان کی فراست ہے جس کی بدولت اللہ تعالی نے ان کو خوابوں کی تعبیر پر قدرت عطا فرمائی، جیسی تعبیر دیتے ویسی ہی ہوتی، اور گویا ایسی خبر دی جیسے کہ خود انہوں نے اس کو دیکھا ہے، یہ باتیں ایسے نفوس قدسیہ سے ظہور میں آتی ہیں جو خواہشات نفسانی کی آلودگیوں سے پاک صاف ہوتے ہیں، ان کے خصائل حمیدہ بہت ہیں اور ان کے فضائل مشاہدہ میں آچکے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی "إتحاف النبلاء المتقين بإحياء مآثر الفقهاء المحدثين" مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ ص ۲۹۶ میں رقم طراز ہیں:

شاہ عبدالعزیز بن الشیخ الاجل ولی اللہ محدث الدہلوی بن شیخ عبدالرحیم العمری رضی اللہ عنہم استاذ الاساتذہ وامام المجاہذ وبقیۃ السلف حجۃ

شاہ عبدالعزیز بن شیخ اجل ولی اللہ محدث دہلوی بن شیخ عبدالرحیم عمری رحمہم اللہ استاذ الاساتذہ، امام نقاد، بقیۃ السلف حجۃ خلف اور دیار ہند کے خاتم

الخلف خاتم المفسرین والمحدثین بالدیار
الہندیہ در وقتِ خود مرجع علماء و مشائخ بودند
و دستگاہ ایشاں در جمیع علوم متداولہ و غیر متداولہ
از فنون معقولہ و نقلیہ فوق الوصف ست، در
کثرت حفظ و علم، تعبیر رؤیا و سلیقۂ وعظ و انشاء
و تحقیقات خائس علوم و مذاکرہ و مباحثہ باخصوم
ممتاز اقران بودند و معتقد فیہ موافق و مخالف
تمام عمر در تدریس و افتاء و فصل خصومات و وعظ
و تربیت مریداں و تکمیل شاگرداں گزرانیدند
وجاہ و عزت صوری و احترام و تعظیم ظاہری
باکمالات باطنی فراہم داشتند، سید احمد
بریلوئی امیر المجاہدین را بیعت طریقت
بایشاں بود، ریاست علم و عمل بلاد ہند بسوئے
ایشاں و برادران ایشاں منتہی گشتہ از علمائے دیار
ہندوستان بلکہ بلاد دیگر کم کسے باشد کہ نسبتِ تلمذ
یا استفادۂ باطن بایں خاندان درست نکردہ باشد
شاگردی ایشاں فخر کبار علماست و کتب مؤلفۂ
ایشاں معتمد فضلا، والد فقیر نیز از ایشاں روایت
دارند، اخذ علوم از والد ماجد خود و خلفائے ایشاں
کردہ ان و خلفئے بسیار از جناب ایشاں استفادہ
نمودہ چوں اسانید علوم تحصیلیہ ایشاں از فقہ

مفسرین و محدثین تھے اور اپنے وقت میں علماء اور
مشائخ کے مرجع تھے، تمام علوم متداولہ اور غیر
متداولہ میں خواہ فنون معقولہ ہوں یا نقلیہ، ان کو
جو دستگاہ حاصل تھی وہ بیان سے باہر ہے، کثرتِ
حفظ و علم، خوابوں کی تعبیر، سلیقۂ وعظ، انشاء
پردازی، تحقیقاتِ خائس علوم، مذاکرہ اور مخالفوں
کے ساتھ مباحثہ کرنے میں وہ اپنے معاصرین
سے ممتاز تھے، اور موافق و مخالف سب کو ان سے
اعتقاد تھا، تمام عمر درس و تدریس، افتاء، فصل
خصومات، وعظ و تربیت مریدین اور تکمیل تلامذہ
میں گزاردی، باطنی کمالات کے ساتھ صوری جاہ
و عزت اور ظاہری تعظیم و احترام بھی میسر تھا، امیر
مجاہدین سید احمد (شہید) بریلوی کو ان ہی سے
بیعت طریقت حاصل تھی، بلاد ہند میں علم و عمل کی
سیادت ان پر اور ان کے بھائیوں پر ختم تھی، دیار
ہند کے علماء ہی میں نہیں بلکہ بیرون ہند میں بھی کم
ہی کوئی ایسا عالم ہوگا جو تلمذ یا استفادہ باطن کی
نسبت اس خاندان سے نہ رکھتا ہوگا، ان کی
شاگردی بڑے بڑے علماء کے لیے باعث فخر
ہے اور ان کی لکھی ہوئی کتابیں فضلاء کی معتمد علیہ
ہیں، فقیر کے والد کو بھی ان سے روایت کی

وحدیث وتفسیر وغیر آں در تصانیف ایشاں مرقوم است ودر مردم مشہور، خاندان ایشاں خاندان علوم حدیث وفقہ حنفی ست خدمت ایں علم شریف چنانکہ ازیں اہل بیت بوجود آمدہ در کشور از خاناں دیگر معلوم ومعہود نیست تخم عمل بالحدیث درحقیقت پدر ایشاں دریں سرزمین کاشتہ اند وایشاں آنرا برگ وبار بخشیدہ۔

اجازت حاصل ہے، موصوف نے علوم کی تحصیل اپنے والد اور ان کے خلفاء سے کی اور بڑی خلقت نے ان سے استفادہ کیا، ان کے علوم تحصیلیہ فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کی سندیں ان کی تصانیف میں مذکور ہیں اور لوگوں میں مشہور ہیں، ان کا خاندان علوم حدیث اور فقہ حنفی کا خاندان ہے اس علم شریف کی خدمت جیسی کہ اس خاندان سے اس اقلیم میں بن آئی دوسرے کسی خاندان کی بابت معلوم اور مشہور نہیں، در حقیقت اس سرزمین میں عمل بالحدیث کی تخم ریزی ان کے والد ماجدؒ نے کی اور انہوں نے اُس کو برگ وبار بخشے اور پروان چڑھایا۔

مولانا سید عبدالحی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر ج ۶ص ۲۶۸ میں موصوف کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

"الشيخ الإمام العالم الكبير العلامة المحدث عبدالعزيز بن ولي الله بن عبدالرحيم العمري الدهلوي سيد علماء نا في زمانه وابن سيد هم، لقبه بعضهم "سراج الهند" وبعضهم "حجة الله".

اور پھر لکھا ہے:

وكان رحمه الله أحد أفراد الدنيا بفضله وآدابه وعلمه وذكائه وفهمه وسرعة حفظه اشتغل بالدرس

مرحوم اپنے علم وفضل، آداب، ذکاوت، ذہانت، فہم وفراست اور سرعتِ حافظہ میں عالم کے اندر یگانۂ روزگار علماء میں سے

والإفادة وله خمس عشرة سنة فدرس
وأفاد حتى صار في الهند العلم المفرد
وتخرج عليه الفضلاء وفضلته الطلبة
من أغلب الأرجاء وتهافتوا عليه
تهافت الظمآن على الماء
ولعلك تتعجب أنه كان مع هذه
الأمراض المؤلمة والأسقام المفجعة
لطيف الطبع حسن المحاضرة جميل
المذاكرة فصيح المنطق مليح الكلام
ذا تواضع وبشاشة وتودد لايمكن
الإحاطة بوصفه ومجالسه هي نزهة
الأذهان والعقول بمالديه من الأخبار
التي تنشف الأسماع والأشعار
المهذبة للطباع والحكايات عن
البلاد البعيدة وأهلها وعجائبها
بحيث يظن السامع انه قد عرفها
بالمشاهدة ولم يكن الأمر كذلك
فإنه لم يعرف غير كلكته ولكنه
كان باهر الذكاء قوي التصور كثير
البحث عن الحقائق فاستفاد ذلك

تھے، پندرہ برس کی عمر سے درس وتدریس
میں مصروف ہوئے، درس دیا اور فیض
پہنچایا یہاں تک کہ ہندوستان میں یکتا عالم
ہوگئے اور فضلاء نے ان سے اکتساب
کمال کیا، بیشتر مقامات سے طلبہ محض ان
سے پڑھنے کے لیے آتے اور ان پر ایسے
ٹوٹ پڑتے جیسے پیاسا پانی پر ٹوٹ پڑتا
ہے اور شاید تم کو تعجب ہوگا کہ موصوف ان
تکلیف دہ بیماریوں اور اندوہناک امراض
کے باوجود خوش طبع، حاضر جواب، شیریں
گفتار، بڑے فصیح، خوش کلام، متواضع،
بشاش بشاش اور باوقار تھے، ان کے
اوصاف کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، ان کی
مجلسیں عقول اور اذہان کی سیر وتفریح کا
سامان تھیں، ان کی حکایتیں کانوں کو، ان
کے شائستہ اشعار طبائع کو بھاتے تھے اور
دور دراز کے قصے اور وہاں کے باشندوں
کی داستانیں بھی خوب ہوتی تھیں اور تعجب
کی بات یہ ہے کہ سننے والے کو یہ گمان ہوتا
تھا کہ موصوف نے ان باتوں کو دیکھ کر

بوفود أهل الأقطار البعيدة إلى حضرة دهلي.

جاتا ہے حالاں کہ بات یہ تھی کہ انہوں نے کلکتہ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، غیر معمولی ذکی، قوی تصور تھے، اور حقائق سے خوب بحث کرتے تھے انہوں نے ان باتوں کو ان لوگوں سے سنا تھا جو دور دراز سے دار السلطنت دہلی میں آئے تھے۔

مولوی عبدالقادر کا بیان ہے:

''مولانا شاہ عبدالعزیز علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ میں شہرۂ آفاق تھے، اور ہیئت، ہندسہ، مجسطی، مناظر، اصطرلاب، جرثقیل، طبعیات، منطق، مناظرہ، اتفاق واختلاف، ملل ونحل، قیافہ، تاویل، تطبیق مختلف اور تفریق مشتبہ میں یکتائے زمانہ تھے، فن ادب اور ہر قسم کے اشعار کے سمجھنے میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، منقول میں کلام اللہ اور حدیث سے دلیل پیش کرتے تھے اور معقول میں جو ثبوت مناسب سمجھتے، خواہ مخواہ یونانیوں میں سے افلاطون، ارسطو اور متکلمین میں سے فخر رازی وغیرہ کے اقوال کی تائید میں مبتلا نہیں ہوتے تھے اور اپنی تحقیقات کو فن معقول میں صاف صاف بیان کردیتے تھے''۔

(علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) ج ا ص ۲۳۶ شائع کردہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی ۱۹۶۰ء)۔

سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان کا تذکرہ حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''أعلم العلماء، أفضل الفضلاء، أكمل الكملاء، أعرف العرفاء، شرف الأماثل، فخر الأماجد والأماثل، رشك سلف، داغ خلف، أفضل المحدثين، أشرف علماء ربانيين، مولانا وبالفضل أولانا شاه عبدالعزيز دهلوي قدس سره العزيز کی ذات فیض سمات ان حضرت بابرکت کی فنون کسبی و وہبی اور

مجموعۂ فیض ظاہری و باطنی تھی، اگر چہ جمیع علوم مثل منطق وحکمت و ہندسہ و ہیئت کو خادم علوم دینی کا کر کر تمام ہمت وسراسر سعی کو تحقیق غوامض حدیث نبویؐ و تفسیر کلام الٰہی اور اعلائے اعلام شریعت مقدسہ حضرت رسالت پناہی میں مصروف فرماتے تھے، چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد عمدۂ علمائے حقیقت آگاہ شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی خدمت میں تحصیل علوم عقلی ونقلی اور تکمیل کمالات باطنی سے فارغ ہوئے تھے، حافظہ آپ کا نسخۂ لوح تقدیر تھا، باوجود اس کے کہ سنین عمر شریف قریب اسی (۸۰) کے پہنچ گئے تھے اور کثرت امراض جسمانی سے طاقت بدن مبارک میں کچھ باقی نہ رہی تھی، خصوصاً قلت غذا سے، لیکن برکات باطنی اور حدت قوائے روحانی سے حسب تفصیل مسائل دینی اور تبیین دقائق یقینی پر مستعد ہوتے تو ایک دریائے زخار موجزن ہوتا تھا اور فرط افادات سے حضار کو حالت استغراق بہم پہنچتی تھی۔

ہفتہ میں دو بار مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی اور شائقین صادق العقیدت وصافی نہاد خواص وعوام سے مورو ملخ سے زیادہ جمع ہوتے تھے اور طریقۂ رشد وہدایت کا استفاضہ کرتے (بروز یکشنبہ ۹ رشوال) ۱۲۳۹ھ میں اس جہان فانی سے سفر آخرت کو اختیار کیا، ایک قطعہ لکھتا ہوں ۔

حجۃ اللہ ناطق و گویا شاہ عبدالعزیزؒ فخر زمن
روز شنبہ و ہفتم شوال درمیان بہشت ساخت وطن
مہر نصف النہار در عرفاں مثل بدر منیر در ہمہ فن
از سر لطف وحلم تاریخش رضی اللہ عنہ گفت حسن

حکیم مومن خاں مومنؔ نے تاریخ وفات خوب کہی ہے:

دست بیداد اجل سے بے سرو پا ہوگئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم وعمل

(ق ی ض ن ط ر ل م (۱۲۳۹ھ))

علوم حدیث میں شاہ عبدالعزیزؒ کی دو کتابیں بستان المحدثین اور عجالۂ نافعہ مقبول اور

مشہور کتابیں ہیں، اول الذکر جو حدیث کی مشہور کتابوں اور ان کے مؤلفین کے حالات وتعارف پر مشتمل ہے، اس کا اردو میں شگفتہ ترجمہ استاد مرحوم مولانا عبدالسمیع صاحب شیفتہ مدرس دارالعلوم دیوبند نے کیا تھا جو پہلے مطبع قاسمی دیوبند سے شائع ہوا تھا اور اب اس ترجمہ کو نور محمد اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب کراچی نے شائع کر دیا ہے، دوسرا رسالہ عجالۂ نافعہ ہے، یہ ان کا ثبت اور حدیث سے متعلق علوم کا آئینہ دار ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی چند مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تفسیر القرآن الکریم موسوم بہ فتح العزیز، شاہ صاحبؒ نے اس کو مرض کی شدت اور ضعف میں املا کرایا تھا، یہ کتاب کئی جلدوں میں تھی، جس کا اکثر حصہ ۵۷ء کے ہنگامہ کی نذر ہو گیا، صرف دو جلدیں اول وآخر کی رہ گئی ہیں۔

۲۔ الفتاوی فی المسائل المشکلۃ۔ یہ بہت ضخیم تھی مگر اس کی تلخیص دو جلدوں میں دستیاب ہے۔

۳۔ تحفۂ اثنا عشریہ۔ شیعہ مذہب کی تردید میں بے نظیر کتاب ہے۔

۴۔ بستان المحدثین۔ اس میں کتب حدیث اور محدثین کی مفصل فہرست اور تذکرہ ہے مگر نامکمل ہے۔

۵۔ عجالۂ نافعہ۔ یہ اصول حدیث میں فارسی رسالہ ہے، نیز طلبۂ حدیث کے حفظ کے لیے بھی ایک رسالہ ہے۔

۶۔ میزان البلاغت۔ یہ فن بلاغت میں ایک بہترین متن ہے۔

۷۔ میزان الکلام۔ یہ علم کلام میں ایک بہترین متن ہے۔

۸۔ السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل۔ یہ بھی ایک رسالہ ہے جس میں خلفائے راشدینؓ کے فرق مراتب پر بحث کی گئی ہے۔

۹۔ سر الشہادتین۔ حضرات حسنینؓ کی شہادت سے متعلق ایک رسالہ ہے۔

۱۰۔ ایک رسالہ انساب کے موضوع پر ہے۔

۱۱۔ ایک رسالہ تعبیر رؤیا سے متعلق ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد رسائل ہیں۔

منطق اور حکمت میں یہ کتابیں ہیں:

۱۲۔ رسالہ "میرزاہد"، "میرزاہد ملا جلال"، "میرزاہد شرح مواقف"، "حاشیہ ملا کوج" پر عزیزیہ کے نام سے اور صدر شیرازی کی "شرح ہدایت الحکمت" ان سب پر حضرت شاہ صاحبؒ کے حاشیے ہیں۔

۱۳۔ ایک کتاب "ارجوزۂ اصمعی" کی شرح کے نام سے ہے۔



شیخ المحدثین شاہ محمد اسحاق دہلویؒ

از: مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

سب سے پہلے میں اپنے مخلص ومحب، فاضل جلیل ومحدث شہیر حضرت مولانا تقی الدین صاحب ندوی مدظلہ العالی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس عظیم الشان مجلس مذاکرہ میں نہ صرف حاضر ہونے کی دعوت دی بلکہ اس سلسلہ میں برابر مشورہ اور اس کی تیاری کے مرحلہ میں بھی پوری طرح شریک رکھا۔

میرے لئے بڑی سعادت کی بات ہے کہ آج اس مجلس میں شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیمؒ کے خانوادۂ علم وعمل کے ایک روشن چراغ اور علم حدیث میں امتیازی شان کے مالک شیخ المحدثین شاہ محمد اسحاقؒ کے تذکرہ پر مشتمل یہ مختصر مقالہ پڑھنے کا موقع دیا گیا، اور مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم کو اعلام امت کے سامنے کھڑے ہونے کی عزت مرحمت کی گئی، اور اس شہر علم وادب اور مرکز سیرت وسنت کے جنت نشان ماحول میں ایک بے ادب اور علم نا آشنا شخص کو حاضر ہونے کی اجازت عطا کی گئی۔

سب سے پہلے شجرۂ ولی اللہی پر ایک نظر:

اکثر مؤرخین اور اصحاب تراجم نے حضرت شاہ ولی اللہ کی نسبت امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کی طرف کی ہے اور ان کو انہیں کی پشت کا امتداد قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم کو ان کی ۳۳ ویں پشت میں شمار کرایا ہے، لیکن یہاں ایک بہت بڑا مغالطہ ہوتا ہے، وہ یہ ہے

کہ سیدنا عمر بن الخطابؓ کی اولاد میں کسی کا نام محمد نہیں ہے، جب کہ دیگر تمام مؤرخین نے بالاتفاق ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: ولی اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین بن قاسم بن قاضی بدھ (غالباً یوم الاربعاء مراد ہے) بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین بن شیر ملک بن محمد عطا بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم بن عادل بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ماہان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب۔

اس میں امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ کی اولاد میں محمد بن عبداللہ کا ذکر آیا ہے، جب کہ عبداللہ بن عمرؓ کے کسی بیٹے کا نام محمد نہیں ہے، اور تاریخ کے شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ کے بارہ (۱۲) صاحبزادگان میں سے کسی کا نام عفان یا محمد نہیں (۱)، اور ان بارہ صاحبزادوں کی آنے والی پشت میں محمد کا کوئی فرد صاحب اولاد نہیں، کئی پشتوں کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر کے ایک پڑپوتے کا نام محمد ہے اور ان کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا گیا ہے، محمد بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ، یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار کرنا ناممکن ہے، یہیں سے شجرۂ ولی اللہی کی نزاہت محل نظر ہے اور اسی طرح ان کی کسی پشت میں ان کے وطن اصلی کا ذکر نہیں ہے، اس لئے آج تک یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا کہ شاہ ولی اللہؒ کے کون سے جد امجد کس خطۂ ارض سے ہندوستان تشریف لائے تھے، صرف قیاس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تاتاریوں کے حملے کے بعد جب بہت سے اہل علم ومعرفت عراق، ایران اور ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے، اسی موقع پر شاہ ولی اللہ کے کوئی جد امجد ہندوستان میں ہجرت کر کے آئے ہوں گے، لیکن کسی مؤرخ کو نہیں معلوم کہ ان کے کون سے جد امجد کب اور کس جگہ سے ہندوستان آئے، یہ ایک ایسا معمہ ہے جس کا حل کرنا کسی طرح ممکن نہ ہو سکا، اس لئے قطعی طور پر ان کی نسبت فاروق اعظم عمر بن الخطابؓ کی طرف اور

(۱) عبداللہ بن عمر کے بارہ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں: ابوبکر، ابوعبیدہ، واقد، عبداللہ، عمر، عبدالرحمن، سالم، عبیداللہ، حمزہ، زید، بلال، ابوسلمہ، حفصہ، سودہ، عائشہ، قلابہ۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۴/۱۴۲، بیروت ۱۴۰۵ھ)۔

پورے یقین کے ساتھ کرنا، علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے میل نہیں کھاتا، کسی تاریخی ذریعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تاتاریوں کے سیلاب میں اس خاندان کا کوئی فرد ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا اور نہ کسی مؤرخ نے اس ملک یا شہر کی تعیین کی ہے، جہاں سے ہجرت کا کوئی عمل شروع ہوا تھا۔

شاہ ولی اللہؒ کی باکمال اولاد واحفاد:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے شاہ صاحب کو پانچ عالم باعمل بیٹے عطا فرمائے تھے، پہلی شادی جو کم عمری یعنی ۱۴ سال کی عمر میں آپ کے ماموں شیخ عبیداللہ صدیقی پھلتی کی صاحبزادی سے ہوئی، ان کے بطن سے سب سے پہلے صاحبزادہ شیخ محمد پیدا ہوئے، وہ شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر اور تعلیم وتربیت سے آراستہ ہونے کے بعد قصبہ بڈھانہ میں منتقل ہو گئے اور وہیں ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی، پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد دوسری شادی سونی پت کے سید ثناء اللہ صاحبؒ کی صاحبزادی جو "ارادت" کے نام سے مشہور تھیں، سے ہوئی اور ان کے بطن سے آپ کے چار مشہور زمانہ فرزند پیدا ہوئے، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی، جو اس ملک میں علوم اسلامیہ اور قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح اور علم حدیث کے علمبردار شمار کئے گئے۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ:

شاہ محمد اسحاقؒ کے حالات ان کے نانا جان شاہ عبدالعزیز کے مختصر تذکرہ کے بغیر بیان کرنا مشکل ہے، اس لئے پہلے شاہ عبدالعزیز کے کچھ حالات پیش کئے جا رہے ہیں:

شاہ عبدالعزیزؒ کی شخصیت علم وایمان کی جامع تھی، انہوں نے فضل وکمال کے میدان میں سب پر فوقیت حاصل کر لی تھی اور اپنی قدرت فہم اور دین میں اپنے گہرے تعلق کی وجہ سے کم عمری میں فضل وکمال کی سند حاصل کر لی تھی اور ابھی ۱۵ سال کے بھی نہ تھے کہ انہوں نے مسند درس وافادہ بچھا دی اور درس ومواعظ کا سلسلہ شروع کر دیا، انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے اہم کارنامے اور بیش قیمت خدمات انجام دیں جن کا سرانجام دینا بڑے بڑے علماء وعارفین کے لئے بھی آسان نہیں ہوتا۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحبزادہ اور اپنے دور کے علماء کے

سردار زادہ تھے، بعض علماء نے ان کو "سراج الہند" اور بعض نے "حجۃ اللہ" کا لقب دیا ہے، وہ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد اور دیگر اساتذہ فن سے دینی علوم کی تحصیل کی اور حفظ کیا اور وہ اپنے زمانہ کی اہم شخصیات اور کمیاب لوگوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

کم عمری میں کارہائے نمایاں:

انہوں نے علم و دین میں بلند مرتبہ حاصل کیا اور ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی توفیق تاریخ اسلام میں معدودے چند علماء ہی کو نصیب ہوئی، وہ علم وادب، دین ومعرفت، سلوک وطریقت، تصنیف وتالیف اور درس وافادہ کے متعدد پہلوؤں پر کامل دسترس رکھتے تھے اور بیک وقت ان تمام صفات کے جامع تھے، چنانچہ ان کے ان کمالات سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے علماء، عوام اور مسلمانوں کے زمرے میں خیر کثیر کا اضافہ کیا، تاریخ نے اس کو محفوظ تو کیا، لیکن اس کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا۔

تاریخ کی شہادت لوگوں کے احوال وواقعات جاننے کا واحد ذریعہ ہے، ایک نہایت امانت دار مؤرخ علامہ عبدالحی حسنیؒ مصنف نزہۃ الخواطر کا بیان ہے، وہ لکھتے ہیں: "شاہ عبدالعزیزؒ اپنے فضل وکمال، علم وذہانت، فہم وفراست اور زود حفظ کی وجہ سے دنیا کے ممتاز لوگوں میں سے ایک تھے، ۱۵ سال کی عمر ہی میں وہ درس وافادہ سے منسلک ہو گئے اور درس وتدریس کی وجہ سے ہندوستان میں یکتائے روزگار شخصیت کے مالک ہو گئے، بڑے بڑے فضلاء نے ان سے علوم وفنون کی تکمیل کی اور ملک کے اکثر حصوں سے طلباء ان کے پاس آتے اور ایک تشنہ کام کی طرح اس جامع علم ومعرفت پر ٹوٹ پڑتے"۔

زندگی کا افسوس ناک پہلو:

اسی کے ساتھ ان کی زندگی کا افسوس ناک پہلو ان کے وہ دردناک امراض تھے جو ۲۵ سال کی عمر میں ان کو لاحق ہو گئے تھے، انہیں جذام، برص اور نظر کی کمزوری کی شکایتیں لاحق ہو گئیں، امراض اتنے زیادہ تھے کہ ۱۴ قسم کے امراض ان کے اندر شمار کئے گئے ہیں، لیکن ان دردناک امراض کے باوجود انہوں نے اپنی مشغولیات اور سرگرمیوں سے سمجھوتہ نہیں کیا اور واجبات وفرائض کی ادائیگی میں ان بیماریوں کو خلل انداز نہیں ہونے دیا اور ان تمام اعذار کے باوجود ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے جو اللہ

تعالیٰ نے ان کے ناتواں کاندھوں پر ڈالی تھیں، وہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہے اور دین اسلام کے غلبہ کے لئے جدوجہد کرتے رہے، انہوں نے اپنی دعوت وعلوم کو عام کیا اور اسلام اور اس کے پیغام کو عام کرنے کے لئے جان وتن سے معروف رہے۔

اپنے آلام ومصائب کے آگے انہوں نے کبھی سر نہیں ڈالی اور اپنے علم وافادہ کے میدان میں وہ ہمیشہ سرگرم رہے، اپنے جہد عمل کے ذریعہ وہ لوگوں کو دین کی باتیں سمجھاتے اور احسان وتصوف کے مفہوم سے آگاہ کرتے اور کتاب وسنت کے حقائق کھولتے، چنانچہ دور دراز سے آنے والوں کی ایک بھیڑ ان کے پاس اکٹھا ہوتی، تاکہ ان کے درس حدیث وقرآن سے فیض یاب ہو اور اسلامی دستورِ حیات، اخلاق نبوی اور خدائی احکام کے حقائق سے باخبر ہو سکے۔

ان امراض نے ان کی آخری عمر میں انہیں معذور کر دیا اور ایک مجلس میں دیر تک بیٹھنا ان کے لئے مشکل ہونے لگا، لیکن اس شدت مرض اور عذر کے سامنے انہوں نے اپنا سر خم نہیں کیا، بلکہ افادہ واستفادہ کے لئے انہوں نے دوسرا راستہ اپنایا، لوگ ان کے ساتھ چلتے رہتے اور وہ درس وفتاویٰ کا کام جاری رکھتے تھے، وہ لوگوں کو خیر وصلاح کے راستوں سے روشناس کراتے اور دنیا وآخرت میں ذریعہ نجات بننے والے اعمال کی طرف ان کی مکمل رہنمائی فرماتے تھے۔

علمی مشاغل:

یہ ان کا شب وروز کا مشغلہ تھا، علمی مباحث میں گفتگو، فتویٰ نویسی اور درس وافادہ سے وہ نہ تھکتے اور نہ اکتاتے تھے، بلکہ اس کی سرگرمی میں انہیں قلبی لذت اور دلی تقویت حاصل ہوتی تھی، اس لئے کہ جو بھی ایمان کی حلاوت کو چکھ لیتا ہے وہ اس حلاوت ولذت کو دوسرں کے دلوں تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے تاکہ وہ لوگ بھی اس حلاوت ولذت سے آشنا ہوں، اور اس شعور ووجدان کو اپنے اندر جاگزیں کریں، ہندوستان کے بڑے مؤرخ علامہ سید عبدالحی حسنی لکھتے ہیں: ''لیکن ان تمام امراض کے باوجود خود درس دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ تصنیف وتالیف، فتویٰ نویسی، وعظ وپند کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے، ہر منگل کو قرآن مجید کے حقائق پر مشتمل ان کے مواعظ بھی ہوتے تھے، آخری عمر میں

جب دیر تک بیٹھنا بالکل مشکل ہو گیا، تو وہ اپنے دونوں قدیم وجدید مدرسوں کے درمیان چلتے رہتے تھے اور وہاں اس وقت بہت سے لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے تھے، اسی حالت میں درس دیتے تھے، افتا نویسی کرتے تھے اور لوگوں کی حق کی جانب رہنمائی کرتے تھے، اسی طرح عصر ومغرب کے درمیان چہل قدمی کرتے ہوئے وہ مدرسہ اور جامع مسجد کے درمیان والی سڑک تک جاتے تھے، وہاں بھی دائیں بائیں لوگ ٹوٹے پڑتے تھے، لوگ راستہ میں ان کے آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے اور اپنے مسائل ومشکلات کو حل کرنے میں ان سے مدد لیتے تھے"۔

ان کے علم وادب کے سرچشمہ اور فضل وکمال کے خزینہ پر ہر چہار جانب سے لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا، ادبا وشعراء ان کے پاس ان کے ادبی موتیوں اور شہپاروں کو چننے کے لئے آتے، تو علماء ان کے معانی ومفاہیم سے استفادہ کے لئے ان کی طرف رخ کرتے، اصحاب معرفت وسلوک ان سے معرفت کی روشنی اور نور باطن کے حسن وجمال کی جلوہ آرائی اور اپنے دلوں کو منور کرنے کے لئے ان کی طرف رخت سفر باندھتے اور وہ ان کے اندر ایمان خالص اور یقین صادق کے بیج بو دیتے، اسی طرح بیمار اور ضرورت مند لوگ اپنے دنیاوی مسائل اور فقر وحاجت براری کے لئے ان کے یہاں قصد کرتے، شاہ صاحب ان کی دلجوئی کرتے اور ان کی ضرورت پوری کرتے، ان کے پاس سے کوئی بھی ضرورت مند دل شکستہ اور مضطرب واپس نہ جاتا، وہ ہر ایک کو اپنے علم وفضل، مال ودولت، احسان واخلاق اور سخاوت وفیاضی میں سے ضرور کچھ نہ کچھ عطا کر دیتے تھے۔

دیکھئے مورخ ان کے اس وصف کو کس خوبی سے بیان کرتا ہے: "عوام ان کے پاس ان کے علم وادب کے سرچشموں سے سیرابی کے لئے قصد کرتے، اور ادبا مان کی ادب نوازی کی وجہ سے ان کے پاس آتے اور اپنے اشعار پیش کرتے، ضرورت مند ان کے پاس اپنی غرض سے آتے کہ وہ ارباب حکومت کے پاس ان کی سفارش کر دیں، وہ حسب امکان ان کے ساتھ غم خواری وہمدردی کرتے، ان کی ہمدردی اور دلجوئی کی یہ صفت متفق علیہ ہے، بیماران کے علاج ومعالجہ سے فائدہ کے لئے ان کے پاس آتے تھے، اہل جذب وسلوک ان کے انوار کی کرنوں سے اپنے دلوں کو منور کرنے کی غرض سے ان کے پاس آتے اور

اہل علم وصلاح اور غریب اللہ یاران کے پاس ٹھہرتے ، وہ انہیں آرام کے ساتھ رکھتے ، ان کی حاجت براری اور مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے اور اگر ان کی مجلس میں کوئی گم کردۂ راہ یا کوئی ایسا شخص جس کو دینی مسائل میں اشکال ہوتا، شریک ہوتا تو اس کے سامنے اپنی جادو بیانی سے اس کی ایسی تشریح کرتے جو دوسروں کے لئے ممکن نہیں ہوتی اور وہ مطمئن اور راضی ہو کر ان کے پاس سے واپس ہوتا"۔

ایسی عظیم شخصیت برملا اس کی مستحق تھی کہ وہ ایمان وعمل اور علم ومعرفت کا سب سے اونچا مقام حاصل کرے، اور اس روئے زمین پر جو بھی دین ودنیا کی فلاح اور زندگی کی سعادت اور اطمینان خاطر کا طلب گار رہتا، شاہ صاحب کی پوری زندگی اس کے لئے اسوہ کا کام کرتی تھی۔

علم وفتویٰ میں ان کو یدطولیٰ حاصل تھا، خاص طور سے علم حدیث وقرآن پر ان کو بڑا عبور تھا، انہوں نے ان دونوں کے حقائق پر غور وفکر اور تدبر کیا اور اس کی تہوں تک پہونچ گئے اور وہاں سے ایسے بیش قیمت موتی چن کر لائے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی، انہوں نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کی صرف ۲ جلدیں ہی باقی بچیں، بقیہ جلدیں بغاوت ہند میں ضائع ہوگئیں۔

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں رقم طراز ہیں: "وہ شہرت وکمال کی اتنی بلندی پر پہونچ گئے تھے کہ ہندوستان کے لوگ ان کی جانب نسبت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ شاہ صاحب کے اصحاب سے بھی تعلق کو وہ اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے"، وہ یہ بھی لکھتے ہیں: "ان کے ان اوصاف وکمال اور کارناموں میں ان کی وہ فراست بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو خواب کی تعبیر کے سلسلے میں عطا کی تھی، وہ کسی خواب کی تعبیر جس طرح بتاتے تھے خدا کا کرنا ایسا ہوتا تھا کہ بالکل ویسا ہی پیش آتا تھا، گویا انہوں نے دیکھ لیا ہو، یہ چیز صرف چند پاکیزہ اہل دل ہی کو حاصل ہوتی ہے جن کا آئینہ گھٹیا کاموں اور گناہ ومعصیت کے خیال سے دور رہتا ہے"، اور انہوں نے اس قسم کی بے شمار خوبیاں شاہ صاحب کے فضائل میں بیان کی ہیں۔

فضائل وکمالات:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف قسم کے فضائل وکمالات عطا کئے تھے، جن کی

وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں فائق وممتاز تھے اور اگر یہ شعر کہنے والا شاعر ان کو دیکھتا تو اسے ان کی ذات میں اپنے شعر کی تصدیق مل جاتی ۔

ولم ار امثال الرجال تفاوتا لدى المجد حتى عد الف بواحد

(مقام ومرتبہ میں انسانوں کے درمیان اس قدر فرق ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک انسان ہزار انسانوں کی خوبیاں اور فضائل اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے)۔

اگر چہ شاعر نے اپنے حساب سے اس شعر میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ شاہ صاحب کی مدح وتوصیف سے قاصر رہا، جب اس طرح کے شاعر سے ان کے فخر وکمالات کو بیان کرنا مشکل ہے تو مجھ جیسا شخص کس طرح انہیں بیان کرسکتا ہے، ان کے کمالات بے شمار اور ان کے فضائل بے پناہ۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو فاسد خیالات کی اصلاح اور گمراہ عقلوں کے سدھار اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے میں صرف کیا، ان کی ان مساعی نے اپنا اچھا اثر ظاہر کیا، چنانچہ ہندوستان میں علماء ربانیین کی ایک پوری جماعت تیار ہوئی، جن کے علم وفضل اور کمال ومعرفت کی عظمت کا سہرا شاہ عبدالعزیز کے سر جاتا ہے، شیخ نے محض علمی وادبی غذا کی فراہمی کا کام نہیں کیا، بلکہ اپنے پیچھے ایک ایسی جماعت چھوڑی جس نے ان کے علم کے سر چشمے سے سیرابی حاصل کی اور ان کے روحانی خزانہ سے استفادہ کیا، شاہ عبدالعزیز ۸۰ سال اس دار فانی میں گزار کر ۱۲۳۹ھ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے، اس پورے عرصہ میں وہ دلوں میں اللہ کی معرفت کو جاگزیں کرتے رہے، ان کی اصلاح کرتے رہے، ان کو اللہ کا قرب عطا کرتے رہے، لوگوں کو علم دین کی غذا فراہم کرتے رہے اور بیمار دلوں کا مداوا اپنے تجربہ کی بنیاد پر بہتر طریقے سے کرتے رہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے روحانی اثرات اور خداداد صلاحیت کی عطر بیزی سے اس چمنستان ہند کو لالہ زار کیا، ان کی مساعی سرزمین ہند میں مسلمانوں کی بیداری کے لئے ایک بڑا محرک ثابت ہوئیں اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے ایک داعیہ پیدا ہوا، شاہ

صاحب کے عہد میں ہندوستان ان کے علمی و روحانی فیض کی وجہ سے پوری دنیا میں سر بلند ہوا اور وہ ہمیشہ ان کے علمی و روحانی ورثہ پر فخر و انبساط محسوس کرتا رہے گا، اور شاہ صاحبؒ کی شخصیت تاریخ کی پیشانی کا نور اور ان کے کارنامے جلوۂ طور شمار کئے جاتے رہیں گے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کی اولاد:

تاریخی شہادت کے مطابق شاہ صاحب کی شادی مولوی نور اللہ بڑہانوی کی صاحبزادی سے ہوئی اور ان کے بطن سے ۳ لڑکیاں تولد ہوئیں اور وہ تینوں کم عمری کے باوجود شاہ صاحب کی زندگی ہی میں وفات پا گئیں، بڑی صاحبزادی کا عقد شاہ رفیع الدین کے صاحبزادہ مولوی محمد عیسیٰ سے ہوا، دوسری بیٹی کا عقد مولوی محمد افضل لاہوری سے ہوا، انہیں سے ۲ فرزند شاہ محمد اسحاقؒ اور شاہ محمد یعقوبؒ تولد ہوئے، شاہ صاحب کی تیسری صاحبزادی کا نکاح مولوی عبدالحی بڑہانوی سے ہوا جو شاہ صاحب کی اہلیہ کے بھتیجے تھے، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ان کا انتقال بھی شاہ صاحب کی زندگی میں ہو گیا۔

شاہ محمد اسحاق دہلویؒ:

شاہ محمد اسحاق دہلویؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے بڑے نواسے اور ان کے خلیفہ و جانشین تھے، ان کی تاریخ ولادت ۶/ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ ہے، وہ خاندان ولی اللّٰہی کے آخری اور عظیم رکن شمار کئے جاتے ہیں، ان کو درس حدیث کا خاص ذوق عطا ہوا تھا، اور ایک عظیم محدث کی حیثیت سے متعارف ہوئے، مسند تحدیث پر بیٹھنے کے بعد طالبان علوم نبوت آپ سے حدیث پڑھنے اور اس کی اجازت حاصل کرنے کے لئے ہر طرف سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور علم حدیث میں ان کا دائرۂ فیض بہت وسیع ہوا، حجاز مقدس میں حدیث کی درس و تدریس کی خدمت کے ساتھ وہاں کے محدث وقت شیخ عمر بن عبدالکریم سے اجازت حدیث حاصل کی، ۲ سال تک حجاز مقدس میں قیام کے دوران خود بھی بہت سے علماء کو حدیث کی اجازت دی اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا، حجاز سے واپسی کے بعد تقریباً ۱۶ سال تک درس حدیث کے ساتھ ارشاد و افتاء کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں عبادت و اطاعت کے ساتھ ساتھ درس

حدیث اور اصلاح باطن کا مشغلہ جاری رکھا اور جوارِ حرم میں ۴ سال اور چند ماہ قیام کرنے کے بعد ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں مکہ مکرمہ میں انتقال فرمایا اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کی قبر مبارک کے جوار میں مدفون ہوئے، إنا لله و إنا إليه راجعون ۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران بھی تدریس حدیث میں مشغول رہے اور وہاں علماء کی ایک بڑی تعداد اس سرچشمۂ حدیث سے سیراب ہوئی۔

شاہ صاحب کی علمی یادگار میں حدیث کی مشہور کتاب ''مشکوۃ المصابیح'' کا اردو ترجمہ اور فارسی رسالہ شعب الایمان (قلمی) ہے۔

ہندوستان میں شاہ صاحبؒ کے جلیل الشان مشہور تلامذہ:

محدث جلیل شیخ عبدالغنی بن ابوسعید عمری دہلوی مہاجر مدنی، محدث شہیر سید نذیر حسین میاں بن جواد علی حسینی دہلویؒ، عالم جلیل شیخ عبدالرحمن بن محمد انصاری پانی پتی، شیخ عالم علی مراد آبادیؒ، شیخ عبدالقیوم بن عبدالحی بڈھانویؒ، شیخ قطب الدین بن محی الدین دہلویؒ، مولانا شاہ محمد یعقوب (آپ کے برادر حقیقی)، شاہ محمد عمر بن سید نا محمد اسماعیل شہیدؒ، مولوی کرامت علی اسرائیل، سید عبدالخالق دہلویؒ، مولوی صبغت اللہ والد ماجد قاضی محفوظ پانی پتی، مولوی یار علیؒ، مولوی محمد ابراہیم نگرنہسوئیؒ، شیخ محمد تھانویؒ، مولوی علی احمد ٹونکیؒ، شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ، مفتی عنایت احمد کاکورویؒ، مولوی محمد حازم عربیؒ، مولوی محمد سبحان بخش شکار پوریؒ، مولوی عبداللہ سندھیؒ، مولوی گل کابلی، مولوی نور علی سہسراوانی، مولوی محمد فاضل سورتیؒ، مولوی بہاء الدین دکھنیؒ، قاری حافظ کرم اللہ دہلویؒ، مولوی نورالحسن کاندھلویؒ، مولوی نصیرالدینؒ، مولوی عبدالقیوم بھوپالی، مولوی نوازش علی دہلویؒ، مولوی رستم علی خانؒ، مولوی احمد علی سہارن پوریؒ (محشی الجامع الصحیح للبخاری)، نواب صدرالدین خان دہلویؒ، مولوی عبدالرشید مجھروئیؒ، حافظ مظہر علی کاکورویؒ، مولوی امداد العلی (امروہہ)، مولوی احمد اللہ انامیؒ (استاد مولانا سخاوت علی جونپوریؒ)، سید شاہ محی الدین عبداللطیف معروفؒ قطب ویلور، منشی جمال الدینؒ (مدارالمہام ریاست بھوپال)، سرسید احمد خانؒ، مولانا محمد عرف جھاؒ۔

شاہ صاحبؒ کے بارے میں علماء عظام کی شہادت:

شیخ شمس الحق ڈیانوی نے اپنی کتاب ''تذکرۃ النبلاء'' میں تحریر کیا ہے کہ: شاہ محمد اسحاق کا جب انتقال ہوا تو ان کا غسل شیخ عبداللہ سراج مکی نے دیا، اور فرمایا کہ شیخ ابھی زندہ رہتے اور میں ان سے حدیث کی کتابیں پوری عمر پڑھتا رہتا، تب بھی میں ان کے درجہ تک نہ پہونچ پاتا'' ، شاہ اسحاقؒ کے شیخ اور استاد شیخ عمر بن عبدالکریم مکی، علم حدیث اور رجال حدیث میں ان کے درجۂ کمال اور علو مرتبت کی گواہی دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نانا شیخ عبدالعزیز کی برکت اتار دی ہے، شیخ عبدالعزیز تحدیث نعمت کے طور پر اکثر یہ آیت پڑھا کرتے تھے: الحمد لله الذی وھب لی علی الکبر إسماعیل و إسحاق اور محدث جلیل شیخ نذیر حسین میاں فرماتے تھے کہ میں نے ان سے بہتر کسی عالم کی صحبت نہیں اختیار کی اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ۔

براہ رہبریٔ قوم فساق ☆ دوبارہ آمد اسماعیل و اسحاق

شاہ صاحبؒ کے مواعظ اور ان کے اثرات:

شاہ محمد اسحاقؒ کے مواعظ نہایت مؤثر اور رگ و ریشے میں اتر جانے والے ہوا کرتے تھے، ان کی مجلس وعظ میں بے شمار لوگ شریک ہوا کرتے تھے، باہر مردوں کا انتظام ہوتا اور اندر عورتیں جمع ہوتی تھیں، ان میں ہر طبقے کے مرد و عورت حاضر ہو کر فیض حاصل کرنے کی سعادت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، اس سلسلہ میں سرسید احمد خاں مرحوم کا بیان ہے:

''میں شاہ (اسحاق) صاحب کے وعظ میں حاضر ہوتا، باہر مردوں کا ہجوم ہے، زنانہ میں عورتیں جمع ہیں، ڈولیوں کا شمار، نہ پالکیوں کی گنتی، محلات شاہی کی بیگمیں تک حاضر ہوتیں، امراء کے یہاں سے مکلف کھانوں کی ڈیگیں کہاروں کے کندھوں پر لدی چلی آ رہی ہیں، صاحبزادی حاضر ہو کر عرض کرتی ہیں: حضرت جی! کھانے آ گئے، فرماتے تقسیم کر دو، زنانہ حلقہ وعظ میں عورتیں اپنے اپنے برتن پیش کرتی ہیں، سب سے پہلے طلباء کے لئے کھانا بھیجا جاتا، پھر عورتوں کو بٹتا، اس پر بھی بچ رہتا تو صاحبزادی عرض کرتیں، حضرت جی کچھ کھانا بچ گیا ہے، فرماتے بیٹی! ہمارے لئے نہیں بچا، اسے رہنے دو۔

شاہ صاحبؒ خود معمولی چپاتی، یخنی کا سا شوربہ، گاڑھے کے دسترخوان پر رکھ کر تناول کرتے، میں نے ان کا ساکھانا کسی کو کھاتے نہ دیکھا، گردونواح کی محتاج عورتیں آجاتیں اور اس بے فکری سے دولت کدہ پر بہتوں رہی آتیں، گویا باپ دادا کے گھر میں آگئی ہیں، جب خود ہی جی چاہتا رخصت ہوتیں، محتاج عورتوں کی اسی طرح کی مہمان داری مکہ مکرمہ میں بھی جاری رہی"۔

(تراجم علماء اہل حدیث مؤلفہ ابو یحییٰ امام خان نوشہروی ص ۱۱۷ تا ۱۱۸)

شاہ محمد اسحاقؒ اور مدرسہ رحیمیہ:

تقریباً ۱۱۱۲ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم نے "مہدیوں" میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، بعد میں اس کا نام "مدرسہ رحیمیہ" رکھا گیا اور اسی مدرسہ میں شاہ صاحب اور ان کے فرزندان اعلیٰ مرتبت نے تعلیم حاصل کی، اور پھر وہیں مسند حدیث بچھائی، اس مدرسہ میں شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ عبدالغنیؒ، شاہ اہل اللہؒ، شاہ محمد عاشقؒ، شاہ محمد اسماعیلؒ، شاہ محمد اسحاقؒ، شاہ عبدالغنی مجددیؒ اور میاں نذیر حسین دہلویؒ اور دیگر حضرات نے فیض حاصل کیا اور حدیث کے مستند علماء شمار کئے گئے، شاہ صاحب کے بعد یہ مدرسہ ۱۱۵۱ھ ۱۱۶۱ھ کے دوران "مہدیوں" سے "کلاں محل" منتقل کر دیا گیا، اور اس کو شاہ عبدالعزیزؒ نے مرکز درس وارشاد بنایا، پھر ان کے جانشین شاہ محمد اسحاقؒ نے اس میں درس حدیث جاری رکھا، اس مدرسہ سے ملک اور بیرون ملک کے ہزاروں علماء نے علم حاصل کیا اور ہندوستان میں تفسیر وحدیث اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا رواج ہوا۔

شاہ محمد اسحاقؒ کی محدثانہ خدمات:

ان کا سب سے بڑا حدیثی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کا ذوق اور اس کی نشر واشاعت کو علماء ہند کے درمیان عام کیا اور علم حدیث کی اہمیت اور اس کی عظمت کو اہل اللہ کے حلقے میں رواج دیا اور محدثین کی ایک وسیع نسل کو پیدا کیا اور حجاز مقدس میں اپنے قیام کے دوران علماء کی ایک بڑی جماعت کو درس حدیث دیا اور سند اجازت عطا کی، حدیث کی مشہور کتاب "مشکوٰۃ شریف" کا اردو ترجمہ بھی علم حدیث میں آپ کے بلند مقام کی شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، اس کتاب

کا ترجمہ ہر حدیث کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے اپنے خاص اسلوب میں کیا تھا، بعد میں ان کے شاگرد خاص شیخ محمد قطب الدین دہلویؒ نے اس کی تشریح اور اس سے مستنبط مسائل کا اضافہ کر کے شائع کیا، اس بنا پر یہ کتاب شیخ قطب الدینؒ کی طرف منسوب ہوئی، حالاں کہ اس کا اصل بنیادی کام شاہ اسحاق دہلویؒ نے کیا تھا اور اسی کی روشنی میں شیخ قطب الدینؒ نے تشریح اور فوائد و مسائل تحریر کر کے کتاب کی افادیت کا دائرہ وسیع کیا، اور اپنے استاد شاہ محمد اسحاق کی علم حدیث میں محققانہ بصیرت اور ان کی وہبی صلاحیت سے نہ صرف اس ملک کے علمی حلقوں کو روشناس کرایا، بلکہ عالم اسلام میں ان کی تحدیثی عظمت کا تعارف کرایا، اس عظیم الشان کتاب کی پہلی حدیث امیر المومنین عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے، اس میں اعمال کا دارومدار نیتوں پر بتایا گیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا ترجمہ و تشریح ''مظاہر حق'' کے نئے ایڈیشن سے جس کی ترتیب و تنقیح مولانا عبداللہ جاوید کے قلم سے ہے، کا مختصر خلاصہ پیش کر دیا جائے، اس سے بھی فن حدیث میں شیخ دہلویؒ کی مہارت و براعت اور ان کے تحدیثی مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، تاکہ علوم دینیہ میں ان کی الہامی بلندی کا راز کسی حد تک دریافت ہو سکے۔

مظاہر حق اور مشکاۃ کی پہلی حدیث کا ترجمہ اور تشریح:

عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال ، قال رسول الله ﷺ : إنما الأعمال بالنيات و إنما لامرئ ما نوى ، فمن كانت هجرته إلى الله و رسوله ، فهجرته إلى الله و رسوله ، و من كانت هجرته إلى دنيا يصيبها أو إمرأة يتزوجها فهجرته إلى ما هاجر إليه .
(متفق علیہ)

اس کا ترجمہ شاہ صاحب نے اپنی خاص قدیم اردو میں کیا تھا، اس کو شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد رشید نواب قطب الدین نے مرتب کیا اور مولانا عبداللہ جاوید صاحب نے اس کو تنقیح و ترتیب کے بعد عصر حاضر کی شگفتہ اردو زبان میں منتقل کیا، جو حسب ذیل ہے:

''حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام کاموں کا مدار نیتوں پر ہے (عمل کا ثمرہ نیت پر مرتب ہوتا ہے) لہٰذا جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کے

لئے (بہ نیت خالص) ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہوگی، اور جس شخص نے دنیا حاصل کرنے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اس چیز کے لئے ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا''۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث کی تشریح میں ہجرت کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ محض اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لئے دارالکفر کے اپنے وطن کو ترک کر کے دارالاسلام کو اپنا وطن بنالے اور وہاں جا کر بس جائے، پس اگر ہجرت کرنے والا شخص اپنی نیت میں مخلص ہے اور اس کی ہجرت صرف اللہ کے لئے ہے تو ثواب پائے گا اور اس کا یہ عمل عند اللہ مقبول ہوگا، لیکن اگر نیت میں کھوٹ ہے اور ہجرت (ترک وطن) سے اس کا مقصد طلب دنیا یا حصول جاہ وزر ہے تو یقیناً وہ ثواب سے محروم رہے گا لیکن اگر طلب دنیا اور خواہش نفس کے ساتھ رضائے حق کی نیت بھی کر لیتا ہے تو ثواب ملے گا''، اس حدیث کی روشنی میں نیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''حدیث کے پہلے دونوں جملوں کا ایک ہی مطلب ہے، دراصل انما لا مری مانوی سے تاکید کی جارہی ہے پہلے جملے کی کہ عمل بغیر نیت کے معتبر نہیں ہوگا، یعنی جو شخص نیت کرے گا وہی اس کا اجر پاوے گا، چنانچہ ایک عمل میں جتنی نیت کرے گا اتنے ہی ثواب اسے حاصل ہوں گے''۔

اس سلسلے میں انہوں نے دو مثالیں دی ہیں: ایک کسی عزیز قریب کی غربت کی وجہ سے اس کی مدد اس نیت سے کرنا تاکہ وہ رضائے الٰہی کا سبب بنے، لیکن اگر وہ اس کے ساتھ ہی صلہ رحمی کی بھی نیت کر لیتا ہے تو اس نیت کی وجہ سے وہ دو ثواب کا مستحق ہوگا، دوسری مثال مسجد کی حاضری میں متعدد نیتوں سے دی ہے اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ ثواب بتایا ہے، مثلاً ایک شخص مسجد میں جاتا ہے تو وہ یہ نیت کرے کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، جہاں آنے والا گویا اللہ کی زیارت کرنے آتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے اور کریم کے لئے مہمان کی ضیافت ضروری ہوتی ہے، لہذا میں بھی اس کا امیدوار ہوں تو اس کو یہ ثواب بھی حاصل ہو جائے گا۔

اور نیت کرے، جماعت کے انتظار کا، چونکہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جماعت کا انتظار کر رہا ہے

گویا حالت نماز میں ہے، پس اس نیت سے اس کا ثواب مل جائے گا، اور نیت کرے کہ کان وآنکھ اور تمام اعضاء بازاروں وسڑک میں گناہ میں گرفتار ہوتے ہیں اور یہاں مسجد میں آکر محفوظ ہو جائیں گے، مسجد میں آتے ہی اعتکاف کی نیت کرلے کیوں کہ علماء نے لکھا ہے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو چاہئے کہ اعتکاف کی نیت کرلیا کرے، اور جن علماء کے نزدیک اعتکاف کی مدت کم سے کم ایک ساعت ہے، ان کے یہاں وہ اعتکاف معتبر ہوگا، تو یہ ثواب بھی کہیں نہیں گیا، (مسجد میں دخول کے وقت اعتکاف کی نیت کرنا اور پھر اس پر ثواب ملنا درحقیقت خداوند قدوس کی جانب سے ایک نعمت ہے جو بغیر محنت کئے ہوئے حاصل ہوتی ہے، مگر افسوس کہ مسلمان اس سے غافل ہیں) یا اسی طرح جانتا ہے کہ مسجد میں آتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت مسنونہ دعا پڑھنا یا نبی کریم ﷺ پر سلام بھیجنا سعادت کا باعث ہے تو اگر دخول مسجد کے وقت اس کی بھی نیت کرلے تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔

اور نیت کرے کہ مسجد میں تنہائی اور سکون نصیب ہوتا ہے، جہاں ذکر اللہ، تلاوت قرآن یا وعظ ونصیحت باطمینان کیا جاسکتا ہے تو اس کا ثواب بھی ملے گا، کیوں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص صبح مسجد میں ذکر ووعظ کے لئے جاتا ہے تو گویا وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے مرتبہ کا ہوتا ہے یا کوئی جماعت مسجد میں بیٹھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہو اور آپس میں تذکیر ونصیحت کرتے رہیں تو اس جماعت کو ملائکہ ڈھانک لیتے ہیں اور رحمت خداوندی کا ان پر سایہ ہوتا ہے۔

اسی طرح نیت کرے کہ وضو کرکے مسجد میں نماز کے لئے جانے سے حج اور عمرہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے، اور نیت کرے کہ مسجد میں لوگوں کے اجتماع سے افادہ واستفادہ بالعلم اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مواقع میسر آتے ہیں، نیت کرے وہاں مسلمان بھائیوں سے ملاقات کی اور ان پر سلام ورحمت پہونچانے کی اور نیت کرے محاسبہ نفس اور تفکر فی الآخرۃ اور اپنے گناہوں سے استغفار کی کیوں کہ مسجد میں سکون اور دلجمعی سے یہ کام ہوسکتا ہے جو دوسری جگہ مشکل ہے، بہر حال مسجد میں آنے کا عمل ہے، لیکن چونکہ نیتیں الگ الگ ہوکر بہت زیادہ ہیں، اس لئے ثواب ان سب نیتوں کا ملے گا، گویا عمل ایک اور یہ سب نیت ثواب اتنے زیادہ۔ (منقول از: ''مظاہر حق جدید'' ج۱ص۵۶،۵۷ مرتبہ مولانا عبداللہ جاوید)

شاہ اسحاقؒ کا مرتبہ اہل علم کی نظر میں:

علامہ سید سلیمان ندویؒ شاہ محمد اسحاقؒ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بڑی برکت عطا فرمائی، تمام بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد تھے، چند رسالے بھی ان کی تصنیف ہیں، غدر کے بعد مکہ مکرمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور وہاں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، آخر وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی، ان کے تلامذہ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ، نواب صدر الدین خاں دہلویؒ، نواب قطب الدین خانؒ جنہوں نے کتب حدیث کا اردو ترجمہ کیا ہے، مولانا سید نذیر حسین صاحب (بہاری) دہلویؒ، مولانا عالم علی صاحب مراد آبادیؒ، شیخ محمد صاحب تھانویؒ، مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی، مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی۔ (مقالات سلیمان ج۱ ص۵۲-۵۳)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد پنجم ص ۳۷۹ پر شاہ محمد اسحاقؒ کے بارے میں رقم طراز ہیں: "شاہ (عبدالعزیز) کے ذوق خاص، درس حدیث، اجازت و اسناد اور علوم دینیہ کی نشر و اشاعت میں آپ کے دونوں نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق (۱۱۹۷ھ-۱۲۶۲ھ) اور شاہ محمد یعقوب (۱۲۰۰ھ-۱۲۸۲ھ) تھے، جو شاہ محمد افضلؒ کے صاحبزادے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے حضرت شاہ محمد اسحاق کو اپنا جانشین بنایا، اور اپنی تمام کتابیں اور گھر وغیرہ آپ ہی کو ہبہ کر دیا، آپ شاہ صاحب کے بعد ان کی مسند درس پر بیٹھے اور ۱۲۳۹ھ سے لے کر ۱۲۵۸ھ تک دہلی اور ۱۲۵۸ھ سے (آپ نے مکہ معظمہ ہجرت کی) ۱۲۶۲ھ تک حجاز مقدس میں حدیث کی تدریس وخدمت میں سرتا پا غرق و منہمک رہے اور ہندوستان کے صدہا علماء نے آپ سے حدیث کا درس لیا اور بڑے بڑے علماء و اساتذۂ حدیث نے بلاد و امصار سے آ کر آپ سے استفادہ کیا، اور حدیث کی سند لی، جن میں شیخ عبداللہ سراج مکیؒ اور دوسرے کبار علماء شامل ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو شاہ محمد اسماعیل (بھتیجہ) اور شاہ محمد اسحاق (نواسہ) کی شکل میں دو قوت بازو اور عصائے پیری عطا فرمائے اور اکثر آیت پڑھتے، "الحمدلله الذی وھب لی علی الکبر إسماعیل و إسحاق" دوشنبہ ۲۷ رجب

۱۲۶۲ھ کہ معظمہ میں وفات پائی اور جنۃ المعلاۃ میں حضرت سیدہ خدیجہ کی قبر کے پاس دفن ہوئے"۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک" ص ۹۷۔۹۸ میں شاہ محمد اسحاق کے بارے میں تحریر کیا ہے: "۱۲۳۹ھ میں امام عبدالعزیزؒ فوت ہوئے تو آپ نے اپنا مدرسہ مولانا محمد اسحاقؒ کے سپرد کیا، یہ حزب ولی اللہ کی امامت کا عرفی دستور تھا، سید احمد شہیدؒ کا قافلہ جب حج سے واپس آیا، تو انہوں نے امام عبدالعزیزؒ کے بعد شاہ محمد اسحاقؒ کی امامت کو تسلیم کرلیا، اس زمانہ میں اگر جمعیت (۱) کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا، مولانا محمد اسحاقؒ صدارت کرتے اور سید احمد شہیدؒ حلقہ میں بیٹھتے، اور جب مدرسہ سے باہر مجلس ہوتی تو سید احمد شہیدؒ صدر بنتے، اور مولانا محمد اسحاقؒ حلقہ میں شریک ہوتے، اس طرح حزب ولی اللہ کی اساسی مصلحت کی حفاظت اور رجال اور اموال جمع کرنے کے لئے کئی دعاۃ کا سلسلہ عبدالعزیزؒ کے مدرسہ سے متعلق رہا، اور عسکری اور سیاسی قیادت سید احمد شہیدؒ کی جماعت سے وابستہ ہوئی"۔

دیگر تصنیفات:

شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی دیگر تصنیفات میں جن کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے ان میں مسائل اربعین مائۃ مسائل، تذکرۃ الصیام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، بعض اہل علم نے ان کی تصنیفات کی تعداد دو اتک بتائی ہے۔

میں اپنے اس ناچیز مقالہ کو ان کی تاریخ وفات کے جملے "اسحاق شیخ آفاق" پر ختم کرتا ہوں جس سے ان کی تاریخ وفات ۱۲۶۲ھ نکلتی ہے۔

وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وعلى آله وصحبه وبارك وسلم.



---

(۱) یہ جمعیت ایک اصلاحی تحریک کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے قائم کی تھی، اس کی شاخیں پورے ملک میں پھیلی، اسی طرح حزب ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صدارت میں ظاہر ہوئی (ماخوذ از کتاب: شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک)

صحیح بخاری، سنن ترمذی ومشکوۃ المصابیح وغیرہ کے حاشیہ نگار نیز بنیادی کتب حدیث صحیح مسلم، سنن ابوداؤد وغیرہ کے سب سے پہلے مصحح وناشر جلیل القدر محدث اور خادم حدیث

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ

کی خدمات حدیث

(مختصر اشارات)

از: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

اگرچہ اس سیمینار کا موضوع ''ہندوستان میں علم حدیث تیرہویں چودہویں صدی ہجری میں'' ہے مگر:

بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

تیرہویں چودہویں صدی ہجری میں خدمت حدیث کا عنوان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ کم سے کم برصغیر ہند میں بارہویں صدی ہجری کی خدمت حدیث کی تاریخ شامل نہ کی جائے، کیوں کہ اس سرزمین پر بعد کی صدیوں میں حدیث شریف کی جو بھی خدمات انجام پائیں اور جس پہلو سے بھی حدیث شریف پر توجہ کی گئی اس کی تمام کڑیاں اور تمام واسطے بارہویں صدی ہجری کے نادرۂ روزگار علماء اور محدثین کرام سے جڑے ہوئے ہیں، برصغیر کے بارہویں صدی کے محدثین کرام کو نظرانداز کرکے ہم نہ بعد کی تاریخ سے انصاف کرسکتے ہیں نہ اس سے پہلے کی تاریخ سے۔

بارہویں صدی ہجری میں برصغیر ہند کے دینی علمی افق پر، خصوصاً خدمت حدیث کی کہکشاؤں میں ایسے کئی نجوم وماہتاب نمودار ہوئے جن کی روشنی عرب وعجم میں جگہ جگہ پہنچی، اور ان سے

نہ صرف اس دور میں دنیا بھر کے خادمانِ حدیث نے استفادہ کر کے اپنا دامن مراد پُر کیا، بلکہ ان کے علوم وتصانیف کی ضوفشانی سے حدیث کی دنیا میں چراغاں سا ہو گیا۔ بعد کے دور کا ہر شخص ان کا دامن گرفتہ ہے، ہر اک خادمِ حدیث ان کی تحریرات وعلمی آثار سے استفادہ واستناد کر سکتا ہے، اور بعد کی ہر اک علمی خدمت میں ان کی فکر ونظر کے ستارے جھلملاتے نظر آتے ہیں۔

اگرچہ بارہویں صدی ہجری میں برصغیر ہند میں خادمانِ حدیث اور اس مبارک موضوع کی تدریس وتعلیم اور شرح وتحقیق میں مشغول رہنے والے اصحاب کی فہرست خاصی طویل ہے، تاہم ان میں سے جن حضرات کو عالمی شہرت اور اعتماد نصیب ہوا، ان میں سب سے زیادہ تعداد علمائے سندھ کی ہے، مثلاً صحاح ستہ اور مسند امام احمد بن حنبل کے محشی وشارح، محدث کبیر علامہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر (وفات ۱۱۳۸ھ۔ ۱۷۲۶ء) شیخ ابوالحسن سندھ کے جلیل القدر شاگرد اور قائم مقام، علامہ شیخ محمد حیات سندھی (وفات ۱۱۶۳ھ۔ فروری ۱۷۵۰ء) فقیہ زماں، علامہ مخدوم ہاشم سندھی (وفات ۱۱۷۴ھ۔ ۶۱-۱۷۶۰ء) شیخ ابوالحسن صغیر (وفات ۱۱۸۷ھ۔ دسمبر ۱۷۷۳ء)۔

اسی فہرست میں مولانا شیخ محمد امین ٹھٹوی سندھی (وفات تقریباً ۱۱۸۷ھ۔ ۱۷۷۳ء) کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، بعد کے حضرات میں علامہ جلیل، محدث کبیر شیخ محمد عابد سندھی (وفات ۱۲۵۷ھ۔ جون ۱۸۴۱ء) بھی اسی سنہری زنجیر کی ایک اہم کڑی ہیں۔

اسی زمانہ میں جب سندھ کے علماء عالم اسلام کے علمی افق پر جگمگا رہے تھے، شمالی ہند کی ایک چھوٹی سی بستی سے وہ مردِ جلیل نمودار وجلوہ فگن ہوا، جس کے وجود، دینی علمی خدمات، آفاقی ملی تصورات اور فکر وخیال کے خیاباں سے عالم اسلام میں گویا ایک انقلاب آ گیا تھا، جو علم ومعرفت کی گہرائی، ظاہر وباطن کی جامعیت، بلند نگاہی وبلند نظری، فکر وتخیل کی جولانی، تحریر وقلم کی رعنائی اور علوم اسلامیہ شرعیہ، قرآن مجید، تفسیر وحدیث، فقہ واصول، کلامیات ومعقول، تصوف وسلوک، شعر وادب، نظم ونثر ہر اک فن میں، ہر اک کمال میں گویا فرد فرید اور اپنے معاصرین واہل نظر سے بہت آگے، بلکہ فخر اقران وامثال تھا۔

یہ حضرت شاہ ولی اللہ (احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین) رحمۃ اللہ علیہ دہلوی کی ذات گرامی تھی، جو (۴؍شوال سنہ ۱۱۱۴ھ؍اگست ۱۷۰۲ء) میں تولد ہوئے اور (محرم ۱۱۷۶ھ) میں واصل بحق ہو گئے۔ کہنا چاہئے کہ بعد کے دور میں برصغیر ہند میں خدمت حدیث کے جس پہلو پر بھی کام ہوا اور جس زاویہ سے بھی حدیث شریف کی خدمت کی گئی، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ کا فیضان اور ان کی ذات سے جاری سرچشمہ علم وایقان کا ایک بڑا حصہ ضرور شامل ہے۔ بعد کے دور میں علمائے برصغیر ہند کی جن خدمات حدیث اور علوم اسلامیہ کا تذکرہ اور ان پر فخر کیا جاتا ہے، وہ تمام حضرت شاہ صاحب اور ان کے خانوادۂ گرامی کی خدمات کا پرتو اور ان کی تربیت وتعلیم اور ہدایات وفیض تابی کا اثر ہے۔ علمائے دیوبند و سہارنپور ہوں، یا علمائے ندوہ، حضرات اہل حدیث ہوں یا دوسرے مکاتب فکر سے وابستہ اصحاب، ہر ایک نے اسی چشمہ صافی سے سیرابی پائی ہے اور ہر ایک اسی دریا کا ممنون کرم اور پروردہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے گرامی مرتبت اخلاف کرام نے حدیث شریف کی ہمہ جہت خدمات کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا، اور اسی نہج پر اپنے شاگردوں اور وابستگان کی تربیت کی۔ علوم اسلامیہ کی ترقی وتازگی اور ان کو زیادہ سے زیادہ مفید وثمر بار بنانے اور عام کرنے میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندان عالی مرتبت کی خدمات، کسی ایک پہلو کے لئے مختص اور ایک دائرہ میں محدود نہیں تھیں، بلکہ جب جہاں اور جس طرح کی خدمت کی ضرورت ہوئی اور جس پہلو سے بھی ان کا عرفان وفیضان عام کرنے کی کوشش ہو سکتی تھی، اس کی بلا تاخیر کوشش وتدبیر فرمائی۔ منجملہ اور علوم دینیہ کے، خدمت حدیث کے لئے بھی یہی معمول تھا، حدیث شریف کے درس وتعلیم، شرح وتحقیق، تصحیح وتعلیق، تقریر وتحریر اور نقل ومقابلہ ہر ایک مقصد کے لئے یہ سب حضرات خود بھی توجہ فرماتے، اس میں مشغول رہتے اور اپنے شاگردوں کو بھی اسی کے لئے تیار فرماتے تھے، جس کے نتیجہ میں ایسے ایسے دیدہ ور بالغ النظر علماء اور محدثین انکے حلقۂ درس سے نکلے کہ ان کے دم سے علمی محفلوں میں تازگی اور بہار آگئی اور ان کے دم قدم سے خدمت علم خصوصاً خدمت قرآن مجید اور حدیث کے گلستاں لہلہا اٹھے۔ ان ہی علماء اور اخیار میں سے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان سے فیض یافتہ اور جرعہ نوش ہیں، ایک بڑا اور

نہایت گرامی قدر و مرتبت نام حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی سہارنپور کے انصاری خاندان کے فرزند تھے،ان کا سلسلہ نسب حضرت سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔حضرت مولانا کے جد امجد شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے خلیفہ تھے،ابتدائی سلسلہ نسب اس طرح ہے:مولانا احمد علی بن لطف اللہ بن محمد جمیل بن محمد خلیل،حضرت مولانا کی ولادت (سنہ ۱۲۲۵ھ-۱۸۱۰ء) میں ہوئی،ابتدائی تعلیم سہارنپور کے مقامی علماء واساتذہ سے حاصل کی،متوسطات سے تقریباً صحیح بخاری تک تمام درسیات،حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی،حضرت مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری اور حضرت مولانا وجیہ الدین صدیقی حسنی سہارنپوری سے اخذ کیں۔

حضرت مولانا کی بخاری شریف کی پہلی سند اس طرح ہے:مولانا وجیہ الدین سہارنپوری از مولانا عبدالحی بڈھانوی،از حضرت شاہ عبدالعزیز۔

تکمیل علوم کے بعد کئی سال تک فرخ آباد میں رہے،وہاں بھی ایک عالم سے پڑھا،مگر اس کی تفصیل دریافت نہیں۔آخر میں جب مولانا کی عمر تقریباً تینتیس سال کی تھی،خاندان ولی اللہی سے براہ راست استفادہ کا شوق ہوا،(سنہ ۱۲۵۸ھ-۱۸۴۲ء) کے غالباً اواخر میں حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوئے،مگر اس وقت حضرت شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ فرما چکے تھے،دہلی سے سفر کا وقت قریب ہونے کی وجہ سے حضرت مولانا سے معذرت فرمائی،مولانا نے عرض کیا کہ اگر میں مکہ معظمہ حاضر ہو جاؤں؟فرمایا کہ اگر تم آ گئے تو میں ضرور پڑھاؤں گا،مولانا پر حضرت شاہ صاحب سے استفادہ کا شوق ایسا غالب تھا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق کی دہلی سے ہجرت کے چند مہینہ بعد ہی (رجب ۱۲۵۹ھ-اگست ۱۸۴۳ء) میں مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہو گئے۔مکہ معظمہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر صحاح ستہ اور تفسیر وفقہ کی اعلیٰ ترین کتابیں تحقیق واطمینان سے پڑھیں،حضرت شاہ صاحب نے حضرت مولانا کو جو سند عطا فرمائی اس میں بائیس کتابوں کے نام لکھے ہیں،یہ کتابیں مولانا نے حضرت شاہ صاحب سے تحقیق سے پڑھیں،جس میں تفسیر کی چھ

کتابیں تفسیر بیضاوی، تفسیر بغوی، تفسیر جامع البیان، تفسیر جلالین تفسیر رحمانی وغیرہ شامل تھیں۔ حدیث شریف میں سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، شمائل ترمذی، مسند امام ابوحنیفہ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، مسند دارمی، جامع صغیر، مشکوٰۃ المصابیح اور حصن حصین وغیرہ کی قرأت وسماعت میں شریک رہے، آخر میں حضرت شاہ صاحب نے ان سب کی مفصل تحریری اجازت سے نوازا، تقریباً دو سال تک شاہ صاحب کی تعلیم وتلمذ کے بعد غالباً سنہ (۱۲۶۲ھ۔ ۱۸۴۶ء) میں ہندوستان واپس پہنچے۔

حضرت شاہ صاحب نے حضرت مولانا کو رخصت کرتے وقت خدمت حدیث میں مشغول رہنے کی ہدایت اور وصیت فرمائی تھی، حضرت مولانا نے بخاری شریف کے اختتامیہ میں حضرت شاہ اسحاق کی اس وصیت کا تذکرہ کیا ہے، حضرت مولانا نے جن کو مبدأ فیاض نے اس خدمت کے لئے چن لیا تھا، اس پر دل کی گہرائیوں سے لبیک کہا اور ہندوستان واپس آتے ہی اس وصیت کی پاسداری اور بجاآوری میں مشغول ہوگئے۔

حضرت مولانا احمد علی نے حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندانی معمول کے مطابق خدمت حدیث کے تمام پہلوؤں پر بیک وقت توجہ فرمائی، درس وافادہ، تصحیح ومقابلہ اور تحریر وتعلیق ہر ایک کو سامنے رکھا اور ہر ایک کی پوری پوری خدمت کرنے، بلکہ اس کا حق ادا کرنے کی ایسی کوشش فرمائی کہ جس کی نظیر نہیں۔ درس حدیث کی مسند بچھائی اور تمام عمر اس کی آراستگی اور ترقی کے لئے کوششیں فرماتے رہے، دہلی میں اس وقت سے سنہ ۱۸۵۷ء تک، حضرت مولانا کا مطبع احمدی خصوصاً حدیث کی اعلیٰ ترین کتابوں کی طباعت واشاعت کا کام کرتا رہا۔ تحقیق وطباعت کی بے پناہ مصروفیات کے ساتھ بھی درس وافادہ کا سلسلہ بلاناغہ جاری رکھا جس میں طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔

حضرت مولانا نے بخاری شریف کے اختتامیہ میں طلبہ کی کثرت اور درس کی مشغولیت کا ذکر کیا ہے، جب سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں مطبع تباہ ہوگیا تو دہلی سے سہارنپور واپس آگئے، تین چار سال تک سہارنپور میں درس حدیث جاری رہا، اس کے بعد کلکتہ چلے گئے تھے سنہ (۱۲۹۱ھ۔ ۱۸۴۷ء) میں حضرت حاجی امداداللہ کی فرمائش کے احترام میں کلکتہ کی ملازمت [جس سے مولانا کو علامہ شبلی

نعمانی کے الفاظ میں، پانچسو روپے مہینہ کی آمدنی تھی) ترک کر کے سہارنپور آگئے تھے، یہاں مظاہر علوم میں اور اپنے گھر پر درس حدیث جاری فرمایا، درس حدیث کا یہ معمول پوری شدومد سے زندگی کے آخر دنوں تک اسی شان سے جاری رہا، اسی میں وفات پائی۔

اس حلقۂ درس سے جو تقریباً بتیس سال برابر جاری رہا، سینکڑوں اصحاب فیضیاب ہوئے، ان میں سے متعدد وہ ہیں جو ہماری علمی تاریخ کا غازہ اور متاخر دور کے لئے سرمایہ صدمباہات وافتخار ہیں۔حضرت مولانا کے شاگردوں میں سے چند اہم نام ملاحظہ ہوں: حضرت حاجی امداداللہ مہاجرمکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا یعقوب گنگوہی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا عبدالجبار عمرپوری، مولانا سلامت اللہ جے راج پوری مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی، مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا تجمل حسین دسنوی، مولانا فدا حسین دربھنگوی، مولانا برکت اللہ سورتی، مولانا محمد بن غلام رسول سورتی، مولانا نوراحمد امرتسری، مولانا وصی احمد سورتی، مولانا قمرالدین چکرالوی وغیرہ رحمہم اللہ۔

حضرت مولانا قدیم علماء کے مطابق متنوع کمالات کا مرقع تھے، بڑے مدرس تھے، محدث تھے، مصنف تھے، محقق تھے، محشی وحاشیہ نگار تھے اس کے علاوہ بڑے فقیہ، معروف ومعتمد مشہور مفتی اور مصلح تھے نیز تحریک حضرت سید احمد کے طرز پر اتباع سنت اور رسوم وبدعات کی تردید میں عملی طور پر مصروف ومشغول تھے۔حضرت مولانا کے فتاوی اس دور میں نہایت وقعت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، خصوصاً دہلی اور نواح میں ان کی بڑی منزلت تھی۔حضرت مولانا نے نکاح بیوگان کے احیاء اور رسوم وبدعات کی تردید کے لئے ہر پہلو سے متواتر جدوجہد کی، اس کے لئے وعظ وتقریر کرتے، فتاوی لکھتے، تقریریں کرتے، مولانا کے متعدد فتاوی قدیم مطبوعات میں دیکھے جاسکتے ہیں، اسی طرح نکاح بیوگان کی ترغیب میں کی گئی کئی تقریریں اس موضوع کے مجموعوں میں محفوظ ہیں۔

مولانا کا اس علاقہ میں جو مقام اور عظمت واحترام تھا، اس کا اس ایک واقعہ بلکہ اعزاز سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ جب دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی عمارت، نودرہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا، تو اس

وقت اکابر دیو بند نے جو تقریباً سب ہی حضرت مولانا کے شاگرد تھے، اس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے حضرت مولانا سے درخواست کی تھی، حضرت مولانا دیو بند گئے اور نودرہ کا سنگ بنیاد، پہلی اینٹ اپنے دست مبارک سے رکھی تھی، پتہ نہیں اس خدمت کے لئے دیو بند کے قطعاً غیر معروف شخص میاں جی منے کا نام کیوں مشہور کر دیا گیا حالانکہ اس کا دارالعلوم کی کسی قدیم تحریر یا روداد میں تذکرہ نہیں ہے مگر دارالعلوم کی روداد میں پہلی اینٹ رکھنے کے لئے حضرت مولانا احمد علی کے نام کی صراحت ہے۔

حضرت مولانا کی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے چند دنوں کے بعد، ۶ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ ۱۷اپریل ۱۸۸۰ء شنبہ کو سہارنپور میں وفات ہوئی۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، سرسید احمد، عبدالغفور نساخ وغیرہ متعدد اہل علم وذوق نے تعزیتی مضامین لکھے اور قطعات تاریخ کہے۔

حدیث شریف کی اہم ترین کتابوں کی تصحیح، حاشیہ اور اشاعت کی خدمت:

حضرت مولانا کی زندگی کا امتیازی وصف اور اہم ترین کارنامہ اور جس پر برصغیر کی علمی تاریخ ہمیشہ فخر وناز کرتی رہے گی اور جس میں حضرت مولانا نہ صرف برصغیر بلکہ بعض پہلوؤں سے پورے عالم اسلام میں ممتاز ومنفرد ہیں، حدیث شریف کی امہات کتب کی نہایت اہتمام سے اعلیٰ درجہ کی تصحیح وتحقیق وتعلیق اور حاشیہ نویسی کے بعد اعلیٰ درجہ کی اشاعت ہے، جو تقریباً ان سب کتابوں کی پوری دنیا میں پہلی اشاعت بھی تھی۔

حضرت مولانا احمد علی کی طباعت کتب حدیث کی یہ خدمت دراصل خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہ کی اشاعت کتب حدیث کے منصوبہ کی توسیع وتکمیل تھی، جب تیرہویں صدی ہجری کے آغاز پر اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندوستان میں پہلی بار پریس آیا اور کتابوں کی نقل کے قدیم طریقہ کی جگہ طباعت کی ابتداء ہوئی اور اس کے ذریعہ سے ایک ایک کتاب کے حسب ضرورت سینکڑوں ہزاروں نسخے ایک معیار وکیفیت کے سامنے آنے ممکن ہو گئے، اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیزؒ حیات تھے، سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب نے اس نئے طریقہ سے استفادہ کا ارادہ کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ کی جلیل القدر تصانیف ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی

طباعت کا سروسامان کیا، الفوز الکبیر تو چھپ گئی لیکن حجۃ اللہ کی اس طباعت کا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ اسی اصول کے تحت حضرت شاہ عبدالعزیز کی تفسیر عزیزی، حضرت شاہ عبدالقادر کا موضح قرآن وغیرہ کئی اہم کتابیں کلکتہ کے مطابع سے شائع ہوئیں اور ملک بھر میں پھیل گئیں۔

یہ سعادت بھی خانوادۂ ولی اللّٰہی کے لئے مقدر تھی کہ حدیث شریف کی بنیادی کتابوں کی اشاعت کی ابتدا بھی اسی گھرانے سے ہو۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات (۱۲۳۹ھ۔۱۸۲۴ء) کے بعد پریس دہلی پہنچا، دہلی میں سب سے پہلا مطبع قلعہ معلی میں بادشاہ وقت کے اہتمام وانصرام سے قائم ہوا، اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز کے جانشین اور خانوادۂ ولی اللّٰہی کی نسبتوں اور کمالات کے جامع، حضرت شاہ محمد اسحاق نے حدیث شریف کے بنیادی متون کی اشاعت کا ارادہ اور اہتمام فرمایا۔

حضرت شاہ محمد اسحاق نے سنن نسائی سے اپنی خدمت کا آغاز کیا اور دہلی بلکہ برصغیر اور عالم اسلام میں بھی حدیث شریف کی ایک اہم کتاب سنن نسائی کا ایک عمدہ نسخہ، جو اس دور کی اعلیٰ اور حسین ترین طباعت کا نمونہ تھا، غالباً حضرت شاہ محمد اسحاق کے تصحیح اور حواشی سے مزین ہو کر، حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے مختصر افادات کے ساتھ چھپا، جس کی سند کا آغاز:

..يقول العبد الضعيف ،خادم علماء الآفاق محمد اسحاق،، کے الفاظ سے ہوتا ہے، یہ نسخہ جو سفید عمدہ کاغذ پر چھپا ہے، مطبع سلطانی، قلعۂ معلی دہلی سے سنہ (۱۲۵۶ھ۔۱۸۴۰ء) شائع ہوا تھا لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق اس کی طباعت کے بعد جلد ہی ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے، اس لئے حضرت شاہ محمد اسحاق کے اس مشن اور علم کو حضرت شاہ صاحب کی ہدایت اور وصیت کے مطابق حضرت مولانا احمد علی نے سنبھالا اور اس شان سے بلند رکھا کہ پوری دنیا میں خدمت حدیث کی آواز گونج گیا۔

حضرت مولانا احمد علی کی حدیث شریف کی اس خدمت کو ماشاء اللہ ایسی مقبولیت و پذیرائی ہوئی جو کسی اور کو آج تک حاصل نہیں ہوئی، برصغیر ہند بلکہ مشرقی ایشیائی ملکوں کا حدیث شریف کا کون طالب علم اور خادم ہے جس نے حضرت مولانا کی مرتبہ اور شائع کی ہوئی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن ابوداؤد اور مشکوۃ المصابیح سے استفادہ نہ کیا ہو، حضرت مولانا کی شائع کی ہوئی کتابوں کو

کچھ ایسی پذیرائی حاصل ہوئی کہ وہ سنہ (۱۲۵۶ھ۔۱۸۳۸ء) سے آج تک مقبول خاص وعام ہیں اور بلا استثناء ہر طبقہ کے علماء اور طلبہ کے لئے سرمہ بصیرت بنی ہوئی ہیں۔

حضرت مولانا نے کتب حدیث خصوصاً صحاح ستہ کی مرکزی کتابوں کی اشاعت کا اس وقت منصوبہ بنایا تھا اور اس کو نہایت شایان شان طریقہ پر پورا کیا تھا، جب عالم اسلام میں ان میں سے کسی بھی کتاب کی اشاعت نہیں ہوئی تھی، حضرت مولانا نے اگر چہ اپنے کام کی ابتداء صحیح بخاری کی تصحیح وتعلیق اور اشاعت سے کی تھی، مگر سب سے پہلے سنہ ۱۲۵۶ھ میں سنن ترمذی کی اشاعت مکمل ہوئی، پھر ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری کی پہلی جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوکر آئی، بعد ازاں صحیح مسلم کا مکمل نسخہ دو جلدوں میں، جس پر امام نووی کی شرح بھی ہے جلوہ افروز ہوئی، سنہ ۱۲۷۰۔۱۲۷۱ھ میں سنن ابوداؤد کے نہایت صحیح اور اعلیٰ نسخہ کی طباعت کا اہتمام فرمایا، دیگر کتابوں میں سنہ ۱۲۷۲ھ میں مشکوٰۃ المصابیح کا نہایت عمدہ نسخہ مفصل حاشیہ سے آراستہ ہوکر نمودار ہوا، اسی سال میں حصن حصین کی عمدہ حاشیہ کے ساتھ اشاعت کی، اسی سنہ ۱۲۷۱ھ میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کی تقریب التہذیب کی اشاعت کا اہتمام کیا، اسی دوران رسالہ اصول حدیث سید شریف جرجانی اور علامہ شیخ عبدالحق کا مقدمہ بھی شائع کیا، یہ اشاعتیں ان تمام کتابوں کی عالم اسلام میں پہلی اشاعت تھیں، اگر چہ اس سے پہلے یورپ سے بخاری شریف کے چند اجزاء شائع ہو چکے تھے، مگر ان میں وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

اس مقصد کے لیے حضرت مولانا نے سب سے پہلے ایک بڑے مطبع کا بندوبست کیا، دہلی میں حضرت مولانا کے استاذ، مولانا وجیہ الدین سہارنپوری کا ایک مطبع تھا، جو مطبع احمدی کے نام سے کام کررہا تھا، حضرت مولانا نے اس کو خرید لیا اور اس سے اپنی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا اور اس مطبع کو اس قدر ترقی دی کہ کام کی وسعت اور بڑی کتابوں کی طباعت کے انصرام میں شمالی ہند کا کوئی اور مطبع اس کے ہم پایہ نہیں تھا، اگر چہ اس مطبع سے اور حضرت مولانا احمد علی کی تصحیح واہتمام سے اور بھی متعدد موضوعات کی بیسوں پچاسوں کتابیں شائع ہوئیں، یہاں حدیث شریف کی ان چند اہم مطبوعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو برصغیر ہند کی علمی تاریخ کا ایک سنہرا اور نہایت درخشاں عنوان ہیں،

حضرت مولانا نے جو کتابیں مرتب و مدون کر کے اور ان پر وقیع عالمانہ حاشیے لکھ کر چھپوائیں ان میں سب سے پہلی کتاب سنن ترمذی ہے اس کے بعد صحیح بخاری، مشکوۃ المصابیح، صحیح مسلم مع نووی اور ان کے بعض متعلقات وضمیمے شائع ہوئے، جس میں سب سے زیادہ توجہ اور اہمیت قدرتی طور پر صحیح بخاری کو حاصل رہی اور حق بھی یہی ہے کہ تمام کتب حدیث میں سب سے پہلے صحیح بخاری کا تذکرہ ہو، اور اس پر جہاں تک ممکن ہو توجہ کی جائے، اس لیے آئندہ صفحات میں بھی سب سے پہلے حضرت مولانا احمد علی کے مرتبہ صحیح بخاری، اس کے حواشی، ان کے مختلف پہلوؤں اور متعلقات کا تذکرہ ہے اس کے بعد اور کتابوں کا مختصر تذکرہ کیا جارہا ہے۔

صحیح بخاری کی تصحیح وتحقیق متن اور حاشیہ وغیرہ:

صحیح بخاری، قرآن مجید کے بعد امت مسلمہ کا سب سے اہم ممتاز ترین، اعلی ترین اور معتمد ترین مرجع ہے، جس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا شرف وامتیاز حاصل ہے، سیرت پاک کے تمام پہلوؤں، فرائض وعبادات کے تمام گوشوں اور امت کے جملہ دینی معاملات ومسائل میں سب سے پہلے بخاری شریف سے مراجعت واستفادہ کیا جاتا ہے، اور جو کتاب اس غیر معمولی بلند مقام پر فائز ہو اور امت کے مسائل وعقائد کی اساس وبنیاد ہو، اس کے متن کی صحت، اس کے مقابلہ وتصحیح کی ضرورت اور اس میں صحیح ترین الفاظ وکلمات کا انتخاب کس درجہ ضروری ہے محتاج بیان نہیں، نیز اس کے نکات ودقائق کے حل، اس کی مشکلات ومبہمات کی تنقیح، اس کے مطالب ومندرجات کی توضیح کی کس حد تک ممکن سے ممکن کوشش کی جانی چاہیے، اس میں بھی گفتگو کی گنجائش نہیں۔

بخاری شریف کی تصحیح کا معاملہ اور کتابوں کی تصحیح وتدوین سے کہیں زیادہ اہم، نازک، پیچیدہ اور غیر معمولی اہمیت کا کام ہے، اس کے لیے حضرت مولانا نے وہ تمام کوششیں اور اہتمامات فرمائے جو اس بڑے کام کے لیے ضروری اور شایان شان تھے، حضرت مولانا نے بخاری شریف کے متن کی تعیین کے لیے اس نسخہ کو بنیاد بنایا ہے جو علامہ یونینی کا مرتب کیا ہوا ہے، حضرت مولانا نے اس نسخہ کو سامنے رکھ کر فقط تصحیح کر کے شائع نہیں کر دیا، بلکہ حضرت مولانا نے اس نسخہ کے کامل استناد اور اعلیٰ ترین

تدوین وترتیب کے لیے بخاری شریف کے نسخۂ فربری کی تمام روایتوں اور حضرات محدثین کرام کے مرتب کیے ہوئے تمام نسخوں سے کامل استفادہ کیا، حضرت مولانا نے اس مقصد کے لیے بخاری شریف کے انیس اہم ترین ممتاز نسخوں کو سامنے رکھا ہے، اور ان تمام نسخوں کا بخاری شریف کے مقدمہ میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ان نسخوں کے حضرت مولانا کے پیش نظر موجود بنیادی نسخہ سے جو اختلافات ہیں، حضرت مولانا نے ان سب کو اپنے مرتبہ نسخہ میں اس طرح جمع کیا ہے کہ کوئی اختلاف لفظ، اختلاف روایت قطعاً ایسا باقی نہیں رہا جس کو حضرت مولانا نے حاشیہ میں نسخ کے ذیل میں پوری وضاحت اور مکمل حوالہ کے ساتھ درج نہ کیا ہو، اگر کوئی کلمہ کسی ایک محدث کی ترجیح ہے یا صرف ایک ہی نسخہ میں درج ہے تو اس کی بھی صراحت کی ہے اور مرجع کا حوالہ دیدیا ہے، اور اگر کسی ایک لفظ وعبارت پر دو تین یا چار پانچ یا زائد نسخے متفق ہیں تو ان سب کا بھی علاحدہ علاحدہ مفصل حوالہ یک جا درج کیا ہے، اور اگر کوئی لفظ ایسا ہے کہ متعدد اصحاب نسخہ نے اس پر اعتماد کیا ہے مگر حضرت مولانا دلائل وشواہد کی وجہ سے اس کو ثانوی درجہ کا سمجھتے ہیں تو ان کا بھی تذکرہ ہے۔

اس محنت اور دیدہ ریزی کی وجہ سے حضرت مولانا احمد علی کا مرتبہ صحیح بخاری کا نسخۂ فربری کی روایت پر مبنی صحیح بخاری کے ائمہ محدثین کے تمام نسخوں کی خوبیوں کا جامع اور اختلاف روایت کا ایسا بہتر ذخیرہ ہو گیا ہے کہ اس کے بعد مزید تحقیق وتنقیح کی زیادہ ضرورت نہیں رہی اور حضرت مولانا کے پیش نظر تمام انیس نسخوں کی جزئیات اور اختصاصات اس نسخہ میں اس طرح شامل بلکہ جذب ہو گئے ہیں کہ حضرت مولانا کے مرتبہ نسخہ کے آئینہ میں تمام سابقہ نسخوں کے امتیازات واختلافات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور ان پر چند اضافات اور اہتمامات کا بھی، یعنی یہ نسخہ ان سب کی خصوصیات کا نمائندہ وترجمان بھی ہے اور ان سے ممتاز والگ بھی:

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

تفہیم متن کے لیے بعض وضاحتیں:

حضرت مولانا نے بخاری شریف کی تصحیح میں صرف صحیح نسخہ کی ترتیب پر اپنے کام کو ختم نہیں

کر دیا ہے بلکہ اس نسخہ کو قارئین کے لیے آسان اور مفید ترین بنانے کے لیے جو صورت ہو سکتی تھی اس کا بھی پورا اہتمام فرمایا ہے، مثلاً اگر بخاری شریف کی کسی عبارت کی تعیین یا تکمیل وتخفیف میں بخاری شریف کے قدیم معروف نسخے اور شارحین بخاری کی اطلاعات مختلف ہیں، اس عبارت و روایت کے چند الفاظ وکلمات کسی ایک نسخہ یا نسخوں میں شامل ہیں لیکن اور نسخے اس سے اتفاق نہیں کرتے، یا شراح بخاری نے یہاں کسی لفظ یا فقرہ کی کمی زیادتی یا عبارت کی ترتیب میں اختلاف کا ذکر کیا ہے، ایسے موقعوں پر حضرت مولانا نے اس فقرہ کی ابتداء اور خاتمہ دونوں پر ''صح'' کا اشارہ دے دیا ہے۔

لیکن حضرت مولانا کی ترتیب میں یہ اس قسم کا واحد اشارہ یا وضاحت نہیں ہے، حضرت مولانا نے اور بھی کئی رموز یا علامتیں کئی طرح کی وضاحتوں کے لیے مقرر فرما رکھی ہیں، حضرت مولانا نے عطف، معطوف علیہ، لاحق وسابق، جار مجرور ہر اک کے لیے علاحدہ نشانات مقرر فرمائے ہیں اور اس کی حکمت کوشش کی ہے پڑھنے والوں کو غلطی اور التباس نہ ہو۔

حضرت مولانا کے حاشیہ کی ترتیب، اس کے چند امتیازات اور طریقۂ کار:

متن کتاب مکمل ہونے کے بعد دوسرا اہم بلکہ اہم ترین مرحلہ کتاب کے نکات ومبہمات کی توضیح، علمی فنی دقائق کے حل، باریکیوں اور مباحث کی تفصیل وتخصیص کا ہے، حضرت مولانا نے جو اس بے پایاں دریا کی وسعت وگہرائی سے آشنا تھے، اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر مکمل کرنے کا ارادہ فرمالیا، اور پوری کتاب پر (آخری غالباً تین پاروں کے علاوہ) نہایت جامع اور مکمل حاشیے تحریر فرمائے ہیں۔

حضرت مولانا کا طریقۂ کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اول ان مقامات کو نشان زد فرماتے ہیں، جن کی شرح وتفہیم کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہے، پھر اپنے سامنے موجود جملہ شروحات، کتب حدیث اور متعلقات کو ملاحظہ فرما کر یہ طے کرتے ہیں کہ اس عبارت وبحث کی تفصیل وتحقیق کے لیے سب سے بہتر گفتگو کس عالم وشارح نے فرمائی ہے، پھر اس کتاب سے اخذ واقتباس کر کے، حسب ضرورت مفصل یا مختصر حاشیہ درج فرما دیتے ہیں، جو مقامات مفصل بحث کے طالب نہیں وہاں مختصر بات فرماتے ہیں، جن مقامات کی وضاحت ضروری ہے، وہاں حسب ضرورت متوسط یا مفصل حاشیہ تحریر ہوگا، اس حاشیہ

نویسی میں بھی دو طریقے ہیں، کبھی خود کچھ تحریر فرما کر اپنے ماٰخذ کا اشارہ و تذکرہ فرما دیتے ہیں، جہاں اس سے بات نہ بنے وہاں مفصل بلکہ مفصل ترین حاشیہ درج ہوگا، اس تفصیل میں بھی کئی پہلو نظر آتے ہیں، کبھی دو تین یا زائد کتابوں سے مختصر مختصر مگر جامع اقتباسات ایسی خوبصورت ترتیب سے درج فرمائیں گے جس سے متعلقہ بحث وگفتگو آئینہ ہوجائے، کبھی ایک ہی کتاب کے نسبۃً مفصل اقتباس پر اکتفا کریں گے، کئی مرتبہ ایک اور صورت اختیار فرماتے ہیں کہ کسی ایک شارح یا محقق کی تحریر پر مشتمل مفصل بحث کو جو دو چار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اپنے الفاظ میں درج فرمائیں گے، اور اس مفصل بحث کا اس طرح عرق کشید فرمائیں گے یا جو ہر کھینچ لیں گے کہ عبارت مختصر سے مختصر ہوجائے مگر بحث واصل کا کوئی ضروری حصہ باقی نہ رہے، یہ حضرت مولانا کا ایک خاص وصف ہے جس کا حواشی بخاری میں پچاسوں سینکڑوں مقامات پر اظہار ہوا ہے۔

کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب یا شرح کے پہلو یا گوشہ کی طرف اشارہ مقصود ہو، اس وقت تمام مندرجات کا احاطہ اور عبارت نقل کرنے کا اہتمام نہیں فرماتے، اس کا اشارہ اپنے الفاظ میں فرما کر آخر میں اس کا مختصر حوالہ ذکر فرما دیتے ہیں۔

حضرت مولانا کے حاشیہ میں یہ بات بطور خاص محسوس کی جاسکتی ہے کہ مصنف ومرتب نے اس حاشیہ کو بوجھل بنانے سے احتیاط برتی ہے، حضرت مولانا صرف ایسے موقعوں پر حسب ضرورت مفصل یا مختصر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں جہاں اس سے متعلقہ عبارت کو حل کرنے میں واقعۃً خاص مدد ملتی ہو یا اس کی عمدہ گرہ کشائی متوقع ہو، موقع بے موقع حاشیہ کا اہتمام کرنا حضرت مولانا کا مزاج نہیں، ساتھ ہی یہ بھی اہتمام رہتا ہے کہ کسی ایک مسئلہ یا بحث پر جہاں تک ممکن ہو کر گفتگو نہ کی جائے، حاشیہ نہ لکھا جائے، اس میں اس کا بھی اہتمام رہتا ہے کہ جہاں اس حاشیہ یا بحث کی بطور خاص ضرورت ہے، حاشیہ اسی مقام پر رقم ہوگا، اگر یہ الفاظ وکلمات اس سے پہلے بھی کہیں آئے ہیں، مگر وہاں ضمناً تھے تو وہاں حاشیہ نہیں ہوگا، وہاں لکھ دیں گے کہ یہ گفتگو یا بحث فلاں باب کے تحت فلاں جگہ آرہی ہے، جس میں کہیں کہیں صفحات کی بھی صراحت ہوتی ہے، جہاں موقع آئے گا، وہاں کسی قدر وضاحت سے

اپنے اصول وطریقۂ کار کی پاسداری کرتے ہوئے حاشیہ تحریر فرمائیں گے اور یہ صراحت بھی کردیں گے کہ یہ بات اگر چہ فلاں فلاں موقع پر گزر چکی ہے مگر اس پر گفتگو کا موقع یہ ہے، اس کے بعد بھی اگر کہیں اعادہ ہوتا ہے تو گذشتہ باب کا حوالہ دیا جائے گا کہ یہ بحث وتحقیق فلاں باب یا عنوان کے تحت گزر گئی ہے۔

حواشی بخاری میں حضرت مولانا کے مآخذ:

حضرت مولانا نے بخاری کے مقدمہ میں اپنے حواشی کی تصنیف میں اپنی معاون کتابوں کی فہرست درج کی ہے، جو پینسٹھ کتابوں پر مشتمل ہے، اس میں بخاری شریف کی گیارہ، مشکوٰۃ المصابیح نیز موطأ امام مالک کی چھ شروحات شامل ہیں، لیکن یہ حضرت مولانا کے مراجع کی مکمل فہرست نہیں ہے، اس کا نہ صرف اس فہرست کے اختتام پر وغیر ذلک کے لاحقہ سے اندازہ ہوتا ہے، بلکہ بخاری شریف کا سب سے پہلا حاشیہ بھی اس کی پردہ کشائی کردیتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنے متعدد مآخذ کا اس فہرست میں ذکر نہیں فرمایا، سب سے پہلے حاشیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک عبارت سے استدلال ہے جو کہ مسوی کی نہیں ہے، جب کہ مسوی حضرت شاہ ولی اللہ کی واحد کتاب ہے جس کا حضرت مولانا نے اپنے مآخذ میں ذکر کیا ہے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے چند مراجع اور مآخذ اور بھی ہوں گے جن کا حضرت مولانا کی فہرست ومآخذ میں تذکرہ نہیں ہے۔

اطراف بخاری کی وضاحت ونشاندہی:

حضرت امام بخاری کا ایک خاص معمول یہ بھی ہے کہ وہ متعدد احادیث کو اپنی خاص ذہنی ترتیب اور اس حدیث سے ماخوذ مختلف مسائل ونکات کی وجہ سے بخاری شریف میں مختلف ابواب میں علاحدہ علاحدہ موضوعات کے تحت درج فرمادیتے ہیں، جس میں کئی مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک حصہ ایک باب اور موضوع میں آئے گا، دوسرا حصہ یا ٹکڑا کسی اور باب میں پیش فرمائیں گے، ایسی صورت میں بخاری شریف سے عام استفادہ کرنے والے تو کہاں، کئی مرتبہ فاضل اساتذہ اور اہل نظر بھی ایسی تمام معلومات کو مستحضر رکھنے میں دشواری محسوس فرماتے ہیں کہ حضرت امام نے اس روایت سے کہاں

کہاں، کس مسئلہ پر کس کس طرح استدلال فرمایا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ روایت کے ہر ایک ٹکڑے کے ساتھ یہ صراحت ہو کہ یہ روایت یا اس کا کوئی حصہ، فلاں کتاب میں فلاں موضوع اور عنوان کے تحت گزر گیا ہے، حضرت مولانا احمد علی صاحب نے اس کی نشاندہی کا اہتمام کیا ہے، جو حصہ گزر گیا ہے اس کا بھی ذکر ہے "مرّ فی باب فلاں" اور جو حصہ یا پہلو کہیں آنے والا ہے اس کی تصریح ہے "سيجئى في باب فلاں" اس کا پہلے صفحہ سے آخر تک مکمل اہتمام کیا گیا ہے۔

بخاری شریف کے اس نسخہ کی پہلی طباعت:

حضرت مولانا نے جلد اول کی تصحیح، حاشیہ اور کتاب ومقابلہ کا نہایت دشوار گزار مرحلہ مکمل ہونے کے بعد جلد اول کی طباعت کا اہتمام کیا، پہلی جلد کی پہلی طباعت کی، سید عبد الغفور (برادر سر سید احمد) کے مطبع سید الاخبار دہلی میں ۱۸؍ جمادی الآخر سنہ ۱۲۶۴ھ (مئی ۱۸۴۸ء) میں ابتداء ہوئی، مگر طباعت کی رفتار بہت سست تھی، چھ مہینہ میں (ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ تک)، فقط ایک سو چوراسی (۱۸۴) صفحات چھپے تھے، ادھر حضرت مولانا کا مرتبہ سنن ترمذی کا نسخہ مع حواشی کے مکمل ہو چکا تھا، اس لیے حضرت مولانا نے بخاری شریف کی طباعت کا کام وقتی طور پر روک کر، سنن ترمذی کی طباعت مطبع العلوم دہلی سے شروع کرا دی تھی، سنن ترمذی کی طباعت جاری تھی کہ حضرت مولانا کے اپنے ذاتی پریس، مطبع احمدی کا انتظام ہو گیا، اس لیے اب حضرت مولانا کی کتابوں صحیح بخاری اور سنن ترمذی، دونوں کی طباعت مطبع احمدی میں منتقل ہو گئی، اس طرح مطبع احمدی سے بخاری شریف جلد اول کی پہلی طباعت، رجب سنہ ۱۲۶۷ھ (مئی ۱۸۵۱ء) میں مکمل ہوئی، اسی وقت دوسری جلد کی طباعت کا آغاز ہو گیا تھا، جو محرم الحرام سنہ ۱۲۷۰ھ (سنہ ۱۸۵۳ء) میں مکمل ہوا۔

خیال رہے کہ عالم اسلام میں بخاری شریف اس طباعت کے تیئیس سال بعد سنہ ۱۲۹۲ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔

پہلی طباعت کے صرف تین سو پچیس نسخے چھپے تھے، جس پر فی نسخہ اٹھارہ روپے خرچہ آیا تھا، فی جز پانچ روپے آٹھ آنہ کاتب کی اجرت تھی، تین روپے بارہ آنہ کا کاغذ لگا تھا، چار روپے آٹھ آنہ

طباعت کے دیئے گئے، بارہ آنہ کا متفرق صرفہ ہوا تھا، پچیس روپے اس کی قیمت رکھی گئی تھی جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بہت بڑی رقم تھی، پچیس روپے ایک گھرانہ کے اوسط سے بہتر ماہانہ اخراجات تھے، جس میں اچھی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی مگر اس بڑی قیمت کے باوجود، بخاری شریف کی طلب اس قدر تھی اور خریدار اس درجہ مشتاق اور تشنہ لب تھے کہ عام لوگوں کی استطاعت اور قوت خرید سے کہیں زیادہ قیمت کے باوجود کتاب بہت جلد، تیزی سے فروخت ہوئی اور غالباً اسی سال اس کی دوسری طباعت کی ضرورت پیش آ گئی تھی، اس کے بعد سے جو اس کی طباعت وفروخت کا سلسلہ شروع ہوا تو دس سال کے قلیل عرصہ میں آٹھ سے زائد ایڈیشن چھپے، جو حضرت مولانا کے علاوہ دہلی بمبئی وغیرہ کے مختلف مطابع نے شائع کیے۔

نسخہ حضرت مولانا احمد علی کی تکمیل اور نظر ثانی شدہ اشاعت:

پہلی طباعت کے بعد ہی حضرت مولانا نے اس نسخہ کی تصحیح مزید اور نظر ثانی کا کام شروع کر دیا تھا، دوسری اشاعت میں جس کا ذکر ہوا، مقدمہ شامل کیا گیا تھا، اس کے بعد کی طباعتیں چوں کہ حضرت مولانا کے علاوہ اور علماء اور مطابع کے ذریعہ عمل میں آئی تھیں، اس لیے ان میں حضرت مولانا کی نظر ثانی یا کوئی اضافہ وترمیم شامل نہیں لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت مولانا نے جس کام کو مقصد حیات بنا کر شروع کیا تھا، اس سے غفلت فرماتے، مگر اس سے پہلے کہ حضرت مولانا کی آخری مکمل نظر ثانی، ترمیمات واضافہ والا نسخہ شائع ہوتا، سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک شروع ہوگئی، جس کی زد میں حضرت مولانا کا مطبع بھی آیا، اس کا تمام موجود علمی سرمایہ، چھپی ہوئی کتابوں کے تمام نسخے، اور حضرت مولانا کا نہایت قیمتی ذاتی کتب خانہ اس طرح خراب وبرباد ہوا کہ ایک کتاب بلکہ ایک ورق بھی محفوظ نہیں رہا، حضرت مولانا سہارنپور تھے کہ یہ سانحہ پیش آ گیا، اب دہلی جانے اور مطبع کے دوبارہ زندہ کرنے کا موقع نہیں تھا، تاہم حضرت مولانا کی صحیح بخاری سے گہری وابستگی بدستور قائم رہی، غالباً اسی دوران حضرت مولانا نے دہلی کے مطبوعہ نسخوں پر نئے سرے سے محنت کی، پہلی طباعتوں کے متن میں کتابت وطباعت کی جو غلطیاں رہ گئی تھیں، ان کی موقع پر تصحیح فرمائی، حاشیہ پر بھی مکمل نظر ثانی فرمائی، حاشیوں

کی بعض عبارتوں میں کچھ تبدیلی کی، مراجع کی مزید تحقیق وتنقیح فرمائی، بعض حاشیے اور حوالے اضافہ کیے، بعض کو قلم زد فرمایا۔

رجال بخاری کا اضافہ:

بخاری کی اب تک کی کسی بھی طباعت میں رجال صحیح بخاری کا تعارف اور تذکرہ درج نہیں تھا، اس طباعت کے لیے حضرت مولانا نے رجال بخاری کا اضافہ فرمایا جس میں حسب ضرورت، رواۃ کے صرف نام ونسب یا نسبت وکنیت کی مختصر بلکہ مختصر ترین وضاحت کی گئی ہے، مگر اس وقت غالبًا اس کی تکمیل نہیں ہوسکی، یہ صرف نصف اول پر ہے، نصف ثانی اس اضافے سے محروم ہے، نصف ثانی کے تراجم بعد میں مکمل ہوئے جو صحیح بخاری کی اس طباعت میں شامل وشائع کیے گئے جو بہت اہتمام سے حضرت مولانا کے علمی جانشین، بڑے فرزند، مولانا حبیب الرحمٰن نے مطبع مصطفائی کان پور سے سنہ ۱۳۰۸ھ میں شائع کیا تھا۔

حضرت مولانا کے مرتبہ نسخہ کی تکمیل اور نظر ثانی شدہ اشاعت میرٹھ ۱۲۸۳ھ:

حضرت مولانا کا مطبع احمدی دہلی کے ہنگامہ، سنہ ۱۸۵۷ء میں تباہ ہوکر بے نام ونشان ہوگیا تھا مگر اس کام کی تکمیل باقی تھی جس کے لیے حضرت مولانا نے اس مطبع کو اساس بنایا تھا اس لیے اس حادثہ کے تقریبًا آٹھ سال بعد، سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں حضرت مولانا نے مطبع کے اسی پرانے نام مطبع احمدی کو میرٹھ میں دوبارہ قائم کیا، جس کی ابتدائی مطبوعات میں بخاری کا حضرت مولانا کی آخری تصحیح ونظر ثانی والا نسخہ بھی شامل تھا، اس نسخہ کی مطبع احمدی میرٹھ سے سنہ ۱۲۸۲ھ میں طباعت شروع ہوکر ۱۲۸۳ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں مکمل ہوئی، یہی وہ نسخہ ہے جو بعد میں ہندوستان کے مختلف مطابع نے کثرت سے بلکہ پچاسوں مرتبہ شائع کیا، یہ بات اہل علم نے برملا کہی ہے کہ مطبع مصطفائی کانپور کا سنہ ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۱ء) میں چھپا ہوا نسخہ سب سے بہتر اور صحیح ترین نسخہ ہے، اس کے بعد اصح المطابع دہلی کا ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۸ء) شائع نسخہ سب سے عمدہ، بہتر اشاعت قرار دیا جاتا ہے، اس وقت عمومًا اصح المطابع کے نسخہ کاری پرنٹ یا عکس چھپتا ہے، نئی کتابت یا تصحیح مزید کی اس کے بعد کوئی کوشش نہیں ہوئی، لیکن

یہاں یہ عرض کردینا چاہیے کہ نسخہ اصح المطابع میں شامل حل لغات اور حضرت شاہ ولی اللہ کا رسالہ ''الابواب والتراجم'' حضرت مولانا احمد علی کی مطبوعہ و مرتبہ کسی طباعت میں شامل نہیں، یہ اصح المطابع کا اضافہ ہے، اس صحیح بخاری کے حاشیہ کی تصحیح و مقابلہ پر حضرت مولانا احمد علی نے بیس سال سے زیادہ وقت صرف کیا مگر اس بے مثال کوشش اور تصحیح کے نادر اہتمام کے باوجود، کاتبوں کی عنایات اور شاید کہیں کہیں سہو ناقل سے بھی مختلف قسم کی غلطیاں ہوگئی ہیں، چوں کہ معاملہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا تھا، اس لیے مئوضلع اعظم گڑھ کے ایک عالم مولانا عبدالجبار مئوی (شاگرد حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مئو) نے بہت عمدہ و دیدہ ریزی سے ان حواشی کی متن متعلقہ مراجع اور کتب رجال وغیرہ سے تصحیح کی تھی، جو صحیح بخاری کی مناسبت سے اسی پیائش کے دو مختصر حصوں میں چھپی ہے، یہ کام اگرچہ ایک درجہ میں غیر معمولی اور نہایت اہم ہے مگر ناتمام ہے کیوں کہ مولانا عبدالجبار صاحب کو حضرت مولانا کے متعدد اصل مراجع (بعض مطبوعہ بھی) دستیاب ہی نہیں ہوئے اس لیے ان سے مراجعت اور تصحیح کی تمنا باقی رہی اور اب بھی باقی ہی ہے۔ وللہ الأمر من قبل ومن بعد [1]

صحیح مسلم کی شرح نووی کے ساتھ اشاعت ۱۲۷۰ھ:

حضرت مولانا بخاری شریف کی طباعت کے دوران ہی صحیح مسلم کا محقق نسخہ بھی مرتب فرما چکے تھے، مگر اس پر خود حاشیہ نہ لکھ کر حاشیہ پر حضرت امام نووی کی بابرکت شرح شائع فرمانے کا منصوبہ بنایا، صحیح مسلم کے اس نسخہ کی طباعت، بخاری شریف کی جلد ثانی کی طباعت مکمل ہونے سے پہلے تقریباً سنہ ۱۲۶۹ھ میں شروع ہوگئی تھی، اس کا حضرت مولانا نے بخاری شریف کے جلد ثانی کے خاتمہ میں اعلان بھی کردیا تھا، اس اعلان کے مطابق نسخہ غالباً سنہ ۱۲۷۰ھ کے قریب شائع ہوگیا تھا اور اس قدر مقبول ہوا کہ صحیح بخاری کی پہلی طباعت کی طرح اس کے نسخے چند دنوں میں ختم بلکہ ناپید ہوگئے

[1] یہ سعادت محدث جلیل حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کے مقدر میں لکھی تھی انہوں نے بڑے اہتمام سے مکمل مراجعت و تصحیح کا بیڑا اٹھایا اور اب بخاری شریف کا صحیح ترین نسخہ ان کی تحقیق و تعلیق سے پندرہ جلدوں میں بیروت سے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو رہا ہے۔ (از: مرتب)

تھے (یہ طباعت اس درجہ کم یاب ہے، کہ راقم سطور کو خاصی تلاش کے باوجود اس کے کسی نسخہ کا سراغ نہیں ملا) مگر کتاب کی طلب اسی طرح باقی تھی، اس لیے حضرت مولانا نے اس کی دوسری طباعت پر فوراً توجہ کی، جو حضرت مولانا کے ایک شاگرد، مولانا محمد حسین فقیر (پنجی دہلوی) کی تصحیح، حضرت کے اہتمام وانصرام سے مطبع افضل المطابع، شاہدرہ دہلی سے شائع ہوئی، اس کے آغاز پر، حضرت مولانا احمد علی نے حضرت شاہ محمد اسحاق سے اپنی سند درج کی ہے، آخر میں مولانا محمد حسین فقیر کے قلم سے اختتامیہ ہے، سنہ طباعت درج نہیں، قیاساً ۱۲۷۲-۷۱ھ (۵۶-۱۸۵۵ء) کی طباعت ہے۔

حضرت مولانا کے چھوٹے بھائی اور ناظم مطبع، شیخ ظفر علی کے اہتمام سے صحیح مسلم کا بھی نسخہ جس کے حاشیہ پر شرح نووی ہے، آج تک اسی طرح اسی ترتیب بلکہ تقریباً اسی طرز کتابت پر شائع ہو رہا ہے اور حضرت مولانا کی حسنات میں اضافہ کر رہا ہے۔

سنن ترمذی کا حاشیہ اور طباعت ۱۲۶۵ھ:

حضرت مولانا نے صحیح بخاری کے حاشیہ کی ترتیب وتدوین کے ساتھ ہی سنن ترمذی پر بھی کام شروع کر دیا تھا، اس پر بھی حضرت مولانا نے حاشیہ لکھا اور متن کی کسی قدر تصحیح کی، مگر سنن ترمذی کے حاشیہ اور تصحیح دونوں میں اس درجہ کا اہتمام نظر نہیں آتا جس کا حضرت مولانا نے صحیح بخاری میں التزام کیا ہے، ترمذی شریف کا یہ نسخہ غالباً سنہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) کے اواخر میں مکمل ہو گیا تھا اور صفر سنہ ۱۲۶۵ھ (جنوری ۱۸۴۹ء) میں مطبع العلوم دہلی میں اس کی طباعت شروع ہوئی، مگر جو صورت صحیح بخاری کی طباعت میں پیش آئی تھی یہاں اس سے سابقہ ہوا، طباعت کی رفتار بہت کم تھی، اور خود حضرت مولانا کا مطبع بھی شروع ہو چکا تھا، اس لیے اس کی طباعت بھی مطبع احمدی میں منتقل ہوئی، صفر سنہ ۱۲۶۵ھ میں اس کی دونوں جلدوں کی طباعت مکمل ہوئی۔

اس نسخہ کے متن کی تصحیح اور مقابلہ میں حضرت مولانا مملوک العلی، مولانا احمد علی کے رفیق و مددگار تھے، سنن ترمذی کا یہ نسخہ بھی حضرت مولانا کی مرتب اور شائع کی ہوئی کتابوں کی طرح مقبول خاص وعام ہوا، اور آج تک اسی طرح چھپ رہا ہے۔

رسالہ اصول حدیث علامہ سید شریف جرجانی ۱۲۶۵ھ:

حضرت مولانا نے صحیح بخاری کے آغاز پر ایک مفصل مقدمہ تحریر فرمایا تھا مگر سنن ترمذی کے لیے علاحدہ سے مقدمہ نہ لکھ کر اس کے مقدمہ کے طور پر علامہ سید شریف جرجانی کے رسالہ اصول حدیث کا انتخاب کیا، یہ رسالہ جو سنن ترمذی کی مذکورہ طباعت کے ساتھ چھپنا شروع ہوا تھا، آج تک اس کے ایک حصہ کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔

مشکوۃ المصابیح ۱۲۶۹ھ:

حضرت مولانا احمد علی نے اپنے طریقہ کار کے مطابق مشکوۃ المصابیح کو بھی مرتب کیا اور اس پر بھی اور کتابوں کی ترتیب پر مفصل جامع حاشیہ لکھا، اس کا طریقہ کار بھی تقریباً وہی ہے جو صحیح بخاری اور سنن ترمذی کے حاشیہ کا ہے، مشکوۃ المصابیح کا یہ نسخہ اور کتابوں کی نسبت زیادہ مقبول ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں چھپا، تیسرا ۱۲۷۲ھ میں (۱۸۵۶ء) میں، اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت مولانا کے مطبع احمدی میرٹھ سے بھی چھپا اور اس وقت سے آج تک متواتر چھپ رہا ہے۔

مقدمہ شیخ عبدالحق محدث ۱۲۶۹ھ:

حضرت مولانا نے سنن ترمذی کے ساتھ علامہ سید شریف جرجانی کا رسالہ اصول حدیث شائع کیا تھا، اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے مشکوۃ المصابیح کے آغاز پر، شیخ عبدالحق محدث کا مقدمہ مشکوۃ المصابیح پہلی مرتبہ شائع کیا تھا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ حضرت مولانا کا مرتبہ مشکوۃ المصابیح کا یہ نسخہ اور اس کے حاشیے دنیائے عرب میں متعارف تو پہلے بھی تھے اور ان کا تذکرہ بھی کیا جاتا تھا، مگر تقریباً دو سال پہلے ایک عرب فاضل رمضان بن احمد بن علی، آل عوف العوف نے حضرت مولانا کے حواشی کو کسی قدر تعلیق وتحقیق کے بعد نسخہ قدیمہ ہندیہ کے نام سے چھ جلدوں میں شائع کر دیا ہے، چھٹی آخری جلد، مؤلف مشکوۃ کی الاکمال فی اسماء الرجال اور فہارس پر مشتمل ہے، یہ نسخہ مکتبہ التوبہ اور دار ابن حزم بیروت سے سنہ ۱۴۲۳ھ، ۲۰۰۳ء میں چھپا ہے، نہایت افسوس ہے کہ مرتب اور ناشر دونوں اس جلیل القدر حاشیہ

کے حاشیہ نگار حضرت مولانا احمد علی اور اس نسخہ کے پس منظر سے واقف نہیں، سنا ہے کہ اس کے بعد حضرت مولانا کے حاشیہ صحیح بخاری پر بھی اسی قسم کا کام شروع ہوا ہے۔

حصن حصین ۱۲۷۱ھ:

حضرت مولانا نے علامہ جزری کی حصن حصین کا بھی ایک عمدہ خوش قلم نسخہ جس پر مختصر افادات بھی درج ہیں، مطبع احمدی سے سنہ ۱۲۷۱ھ سے شائع کیا تھا، آخر میں قطعۂ تاریخ بھی درج ہے۔

تقریب التہذیب ۱۲۷۱ھ:

رجال حدیث پر شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کی مشہور کتاب تقریب التہذیب بھی سنہ ۱۲۷۱ھ میں اپنے مطبع سے شائع فرمائی تھی، مگر اس نسخہ پر نہ کوئی مقدمہ ہے، نہ حواشی، لیکن سرورق پر اور آخر میں مطبع کا نام اور سنہ طباعت ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) درج ہے۔

سنن ابوداؤد ۷۲-۱۲۷۱ھ:

حضرت مولانا نے جن کتابوں کی تصحیح وحاشیہ اور طباعت کا ارادہ کیا تھا ان میں سنن ابوداؤد بھی شامل تھی، حضرت مولانا کو اس کا مکہ معظمہ میں قیام کے زمانہ سے خیال تھا، اس مقصد کے لیے مکہ سے سنن ابوداؤد کا ایک نہایت عمدہ صحیح نسخہ ساتھ لائے تھے مگر یہاں آکر تحقیق وحواشی اور طباعت واشاعت کے جس بڑے سلسلہ کا آغاز ہوا، اور اس میں حضرت مولانا کی جو بے پناہ مصروفیت رہی اس کی وجہ سے حضرت مولانا کو سنن ابوداؤد پر حاشیہ لکھنے کا موقع نہیں ملا اور اس نسخہ کی طباعت میں بھی تاخیر کا اندیشہ ہوگیا جو حضرت مولانا نے مرتب فرما رکھا تھا تو حضرت مولانا نے یہ خدمت اپنے استاذ، حضرت شاہ محمد اسحاق کے ایک پرانے شاگرد اور دہلی کے مشہور عالم اور مدرس، مولانا نوازش علی کے سپرد کردی، مولانا نوازش علی نے اس خدمت کو توجہ اور اہتمام سے تکمیل تک پہنچایا، سنن ابوداؤد کا یہ نسخہ مطبع قادری دہلی سے مولانا محمد بن بارک اللہ پنجابی کے حواشی اور اہتمام سے شعبان سنہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں شائع ہوا تھا، یہ نسخہ سنن ابوداؤد کے دنیا بھر کے مطبوعہ نسخوں میں صحت متن کے لحاظ سے بے نظیر ہے، علمائے عرب وعجم اس کی صحت وکمال کے مداح ومعترف ہیں، مثلاً مولانا شمس الحق ڈیانوی نے عون المعبود میں اس نسخہ کا

ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: "وهو اصل صحيح لم يوجد له نظير"

اگر چہ اس نسخہ کی طباعت حضرت مولانا احمد علی کے انتظام سے نہیں ہوئی مگر یہ طباعت بھی حضرت مولانا کا کارنامہ ہے اوران کی توجہ محنت اور رہنمائی بلکہ مکمل علمی سرپرستی سے وجود میں آئی تھی۔

موطأ امام مالک بحاشیہ حضرت مولانا محمد مظہر کی اشاعت ۱۲۶۶ھ:

یہ حاشیہ اگر چہ حضرت مولانا کے قلم فیض رقم کا ثمر نہیں ہے مگر اس کی مقبولیت اور متواتر طباعت میں حضرت مولانا کی برکت اور مطبع کا اثر ضرور شامل ہے، موطأ امام مالک کا یہ حاشیہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی نے لکھا تھا، حضرت مولانا کے مطبع احمدی دہلی سے سنہ ۱۲۶۶ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا، یہ موطأ امام مالک کا وہی حاشیہ ہے جو عموماً تمام اہل درس اور طلبہ کے ہاتھوں میں رہتا ہے، ہندوپاکستان وغیرہ میں اس کی طباعت اور اس سے استفادہ حدیث شریف کے ہر اک عالم وطالب علم کا گویا دائمی معمول ہے۔

حضرت مولانا کا آخری علمی کارنامہ قسطلانی شرح بخاری کی تصحیح واشاعت:

میری معلومات میں حضرت مولانا کا آخری علمی تصنیفی اشاعتی کارنامہ قسطلانی کی "ارشاد الساری" شرح بخاری کی تصحیح وطباعت ہے، یہ نسخہ حضرت مولانا کی ہدایت پر حضرت مولانا کے بڑے صاحبزادے مولانا حبیب الرحمن بیدل سہارنپوری نے (جو غالب کے بھی ممتاز شاگردوں میں تھے) قلمی نسخوں کی مدد سے صحیح ومرتب کیا، یہ نسخہ پہلے مطبع نظامی کانپور سے، دوبارہ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے چھ جلدوں میں چھپا تھا، بہت عمدہ وصاف ستھری طباعت ہے۔

الدليل القوي على ترك القرأة للمقتدي:

متعدد متون حدیث کی تصحیح، تحقیق اور حواشی وطباعت کے علاوہ حضرت مولانا کی قرأت خلف الامام کے موضوع پر، ایک تالیف بھی ہے جس میں حضرت مولانا نے اس سلسلہ کی احادیث نقل فرمائی ہیں اور قرأت خلف الامام کے دونوں پہلوؤں پر علمی فنی استدلالی گفتگو کی ہے، یہ رسالہ فارسی میں لکھا تھا، جو مطبع احمدی دہلی سے شعبان سنہ ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوا، یہ رسالہ ستائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو ترجمہ ''الدلیل القوی'' ۱۲۹۵ھ:

''الدلیل القوی'' کی طباعت کے پچیس سال بعد، حضرت مولانا نے مولانا محمد بن مولانا عبدالقادر لدھیانوی کی فرمائش پر اس کا خود ہی اردو ترجمہ کیا، یہ ترجمہ بھی اصل کتاب کے ہی نام سے، مطبع منشی رحمت اللہ لدھیانہ سے رجب سنہ ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا، یہ اشاعت یا ترجمہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس سال اس ترجمہ کی اشاعت ہوئی، اس سال علامہ شبلی نعمانی حضرت مولانا کی خدمت میں حدیث پڑھنے کے لیے حاضر تھے، علامہ حضرت الاستاذ اور ان کے رسالہ سے بہت متاثر تھے اور اس کی تائید وتقلید میں علامہ نے ''اسکات المعتدی'' تالیف کیا تھا۔

''بعض الناس فی دفع الوسواس'' کی اشاعت:

حضرت امام بخاری کا معمول ہے کہ وہ الجامع الصحیح میں فقہی کلامی مباحث میں قال بعض الناس کے مبہم اشارہ سے بعض معاصر اور قریب العہد فقہائے مجتہدین یا محدثین کے نظریات ومسائل کی تردید فرماتے ہیں، جس کی زد میں کئی موقعوں پر حضرت امام ابوحنیفہ بھی آئے ہیں، چوں کہ حدیث پڑھنے والوں کے لیے ہمیشہ یہ ایک بحث طلب مسئلہ اور سوال ہوتا ہے، اس لیے غالبا حضرت مولانا احمد علی کی فرمائش پر، ایسے تمام اعتراضات کا مدلل جواب لکھا گیا، جس کو مؤلف نے ''بعض الناس فی دفع الوسواس'' کے نام سے موسوم کیا تھا، اس رسالہ کو حضرت مولانا کے صاحبزادوں مولانا عبدالرحمن اور مولانا خلیل الرحمن صاحبان نے علاحدہ علاحدہ موقعوں پر شائع کیا، اس رسالہ کے مؤلف کی تحقیق نہیں، ایک روایت یا خیال ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی یا مولانا خلیل احمد اسرائیلی علی گڑھی جو حضرت مولانا نانوتوی کے شاگرد بھی تھے، اس کے مؤلف ہیں مگر دونوں روایتوں کی تصدیق مشکل ہے، بعض الناس کی اشاعت کے بعد اس کے کئی جواب لکھے گئے، علمائے احناف نے ان کے جواب الجواب بھی تحریر کیے ہیں۔

چند اور علمی خدمات:

یہ حضرت مولانا کی صرف حدیث کے موضوع کی تصنیفی اشاعتی خدمات کا اجمالی تذکرہ ہے لیکن حضرت مولانا کے عمل کا دائرہ اور بھی متعدد موضوعات میں پھیلا ہوا تھا، حضرت مولانا نے تفسیر، فقہ،

اصول، کلامیات وعقائد، تاریخ وادب وغیرہ موضوعات پر پچاسوں کتابوں کی تصحیح وحواشی کا اور اپنے معمول کے مطابق عمدہ طباعت کا اہتمام کیا، ایسی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے، مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ، حضرت مولانا کے مطبع کی تقریباً چالیس کتابوں کا مجھے علم ہے، قرآن کریم کے نہایت عمدہ اور صحیح نسخے ، جس میں ایک نسخہ اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ اس کی تصحیح میں حضرت شاہ ابوسعید مجددی، حضرت شاہ عبدالغنی، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، اور جامع مسجد دہلی کے امام مولانا سید احمد، نیز دہلی کے اعلیٰ درجہ کے قراء اور ماہرین شامل تھے، یہ قرآن مجید اس قدر صحیح تھا کہ اس میں ایک غلطی کی نشاندہی پر دواشرفی کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا، حضرت مولانا نے اس کے علاوہ بھی کئی مرتبہ قرآن مجید شائع کیا، ہر ایک اشاعت میں کوئی خصوصیت اور امتیاز ضرور ہے۔

تفاسیر میں تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین کے نہایت عمدہ صحیح نسخے شائع کیے، تفسیر بیضاوی پر علماء کی ایک جماعت سے علاحدہ مفصل حاشیہ لکھوایا، جس میں شیخ احمد بن محمد یمانی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری جیسے صاحب فن صاحب نظر علماء بھی شامل تھے، تفسیر بیضاوی دو بڑی جلدوں میں سنہ ۱۲۹۸ھ میں چھپی تھی، اسی سال میں تفسیر جلالین بھی شائع کی، اس پر حاشیہ نہیں ہے۔

حضرت مولانا کی مرتب اور شائع کی ہوئی کتابوں میں فارسی کی بعض اہم مصنفات مثلاً تحفہ اثناعشریہ حضرت شاہ عبدالعزیز، اخبار الاخیار شیخ عبدالحق، احوال ومقامات حضرت مرزا مظہر وغیرہ بھی شامل ہیں جو ان سب کتابوں کے آج تک سب سے بہتر اور صحیح ترین نسخے شمار کیے جاتے ہیں اور بھی متعدد کتابیں حضرت مولانا کے فیوض توجہ سے شائع ہوئیں یہاں ان کے تعارف کی ضرورت نہیں۔

یہ حضرت مولانا کی علمی تصنیفی خدمات کا ایک اجمالی سرسری جائزہ ہے امید ہے کہ حضرات اہل علم ان معروضات پر اضافے فرما کر کاروان علم وتحقیق کو آگے بڑھائیں گے۔

وما توفیقی إلا باللہ والحمد للہ اولا و آخرا وصلی اللہ علی خیر خلقہ وعلی آلہ وصحبہ.



مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی

اور

علم حدیث

از: مولانا محمد فرمان ندوی

قافلۂ سخت جاں کے قائد شیخ حسن البنّاؒ سے سوال کیا گیا کہ کیوں آپ تصنیفی شغل نہیں رکھتے؟ انہوں نے جواب دیا: "انی اصنف الرجال لا اصنف الکتاب" اس وقت میرا عمل رجال سازی ہے نہ کہ تصنیف کتاب (۱)، شیخ محترم کے اس نظریہ کے حقیقی مصداق اور مکمل آئینہ دار شخصیت میاں نذیر حسین محدث دہلوی ہیں، اس باب میں ان کا نام نامی سنہرے حرفوں سے لکھا ہوا ہے، ان کی زندگی تعلیم وتربیت، دعوت وارشاد اور سیرت وسنت کا ہشت پہلو ہیرا تھی، ان کی کیمیاوی نظر اور بافیض صحبت نے ہر میدان کے رجال کا رتیار کئے، اور درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تصوف وسلوک، باطل نظریات کی تردید، دعوت وتبلیغ اور جہاد وقتال کے انمول جواہر پارے تشکیل دیئے، یہ حقیقت ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" میاں صاحب کے نامور تلامذہ کو دیکھتے ہوئے یہ محاورہ ان پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔

سنہ ولادت اور جائے پیدائش کی تحقیق وتوجیہ:

"الاعلام بمن فی تاریخ الھند من الأعلام" کے مطابق میاں صاحب کی تاریخ ولادت ۱۲۲۰ھ۔ اور ۱۲۲۵ھ ہے (۲) مولانا محمد ادریس نگرامی نے (۳) اور ڈاکٹر محمد اسحاق (۴) نے ۱۲۲۵ھ کو

ترجیح دی ہے، مولانا فضل حسین نے میاں صاحب کی سوانح عمری "الحیاۃ بعد المماۃ ص ۲۵" میں بھی متعدد روایتیں ذکر کی ہیں، مولانا محمد عزیز شمس نے ۱۲۱۱ھ، ۱۲۱۶ھ کی روایتیں ذکر کی ہیں (۵)، اس اختلاف روایت کی توجیہ مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ نے عون المعبود کے مقدمہ کے حاشیہ میں اس کی وضاحت اس طرح کی ہے: الأول هو أصح لأن بعض الثقات من سكان على نجر الدلهو متصل بسورج گڑھ قال: إني رأيت مكتوبا على بعض الدفاتر بخط بعض القدماء أن ولادته عام عشرين بعد الألف والمائتين وهكذا سمعنا من أفواه بعض الخيار وإنما أرخت في غاية المقصود سنة خمس وعشرين لأن شيخنا العلامة لما سألته عن عام ولادته ،اجابني اني لم احفظه بالتعيين ،لكن أظن أني ولدت سنة خمس وعشرين أو قبل ذلك بقليل (۶)، اسی طرح سوانح نگاروں نے میاں صاحب کا گاؤں سورج گڑھ لکھا ہے، جب کی تاریخی شواہد سے یہ تصریح محل نظر ہے، کیونکہ ان کا مولد اصلی بلتھوا ہے، سورج گڑھ اسی سے متصل ایک مشہور قصبہ ہے، اسی وجہ سے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہے، میاں صاحب کا خاندان دادیہالی اور نانیہالی دونوں رشتوں سے حسینی نقوی ہے۔

علمی سفرنامہ:

میاں صاحب نے ابتدائی تعلیم والد ماجد سید جواد علی سے حاصل کی، ۱۲۳۶ھ میں آپ نے ابھی زندگی کی سولہ بہاریں دیکھیں تھیں کہ اپنے بچپن کے ساتھی کے ہمراہ پٹنہ گئے، اور چھ ماہ کی مدت میں ترجمہ قرآن اور مشکوۃ کی تعلیم مکمل کر لی، مزید علمی تشنگی بجھانے کے لئے پٹنہ سے دہلی کے ارادہ سے مولانا امداد علی صاحب کے ہمراہ نکلے، حسن اتفاق سے چند روز غازی پور میں قیام کیا اور کچھ کتابیں مولانا احمد علی چریا کوٹی سے پڑھ کر الہ آباد کے لئے روانہ ہوئے، صرف ونحو کی تعلیم سات آٹھ ماہ یہاں کے علماء سے حاصل کی، پھر ۱۳ رجب ۱۲۴۳ھ دہلی پہونچ کر مفتی شجاع الدین صاحب کے مکان پر فروکش ہوئے، اور ہفتہ عشرہ کے بعد مولانا عبدالخالق صاحب سے عربی زبان وادب میں خصوصی استفادہ کیا، اس میکدۂ علم سے جرعہ نوشی کے بعد اپنے کو زبدۃ المحدثین مولانا محمد اسحاقؒ کے در علم پر ڈال دیا، ۱۲۴۶ھ سے ۱۲۵۸ھ تک ان سے مستفید ہوتے رہے، اور تفسیر وحدیث کی امہات الکتب کا درس لیا، بعض علماء احناف نے

شک ظاہر کیا ہے کہ میاں صاحب نے شاہ محمد اسحاق سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، ان کے شک کا مستدل شاہ صاحب کی طرف سے ان کو عطا کی گئی سند اجازت حدیث ہے، جس میں مذکور ہے: لهيقول العبد الضعيف محمد إسحاق: إن السيد المولوي نذير حسين قد قرأ علينا أطرافا من الصحاح الستة وشيئا من كنز العمال والجامع وغيرها وسمع مني الأحاديث الكثيرة، فعليه ان يشتغل بقراءة هذه الكتب ويدرس بها لأنه أهلها بالشروط المعتبرة عند أهل الحديث (۷)، لیکن علامہ سید سلیمان ندوی حیات شبلی ص ۴۰ میں اس شک کے تارعنکبوت کو دلائل کی روشنی میں بکھیر دیا ہے اور ان کی باقاعدہ شاگردی کو ثابت کیا ہے، علامہ موصوف لکھتے ہیں: "شاہ محمد اسحاق صاحب کے ایک دوسرے شاگرد مولانا سید نذیر حسین صاحب بہاری دہلوی ہیں، احناف اسکا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے تبرکاً اجازہ حاصل تھا، اور اہل حدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں، مجھے نواب صدیق حسن خان مرحوم کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا جس میں بتصریح مذکور ہے کہ ۱۲۳۹ھ میں شاہ صاحب کے درس میں داخل ہوئے، البتہ شاہ صاحب سے سند اجازت تحریری انہوں نے ۲ شوال ۱۲۵۸ کو حاصل کی ہے"۔

خانگی حالات:

دہلی کے دوران قیام مولانا عبدالخالق صاحب سے خصوصی تعلق ہوا، یہی ان کے عقد نکاح کا سبب بنا، مولانا محترم نے اپنی صاحبزادی میاں صاحب کی زوجیت میں دی، اس وقت آپ حضرت شاہ صاحب کے درس میں پابندی سے جاتے تھے، چنانچہ شاہ صاحب اور آپ کے برادر خورد نے ان کی کفالت کا معقول انتظام فرمایا، بحمد اللہ میاں صاحب کو اللہ تعالی نے ایک صاحبزادہ عطا فرمایا، جن کا نام سید شریف حسین ہے، لیکن بمقدر الہی وہ میاں صاحب کی زندگی ہی میں راہی آخرت ہو گئے، سید شریف صاحب سے دو صاحبزادے سید عبدالسلام اور سید ابوالحسن ہیں، جن سے خاندان کا امتداد ہوا، میاں صاحب نے علم و عمل، کردار و اخلاق سے بھرپور زندگی گذاری۔ بالآخر ۱۳۲۰ھ بمطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء پسماندگان اور عوام و خواص کو روتا بلکتا چھوڑ کر رخصت ہو گئے، نماز جنازہ آپ کے پوتے سید

عبدالسلام نے پڑھائی، اس طرح میاں صاحب کی پوری عمر ۱۰۰ سال ہوئی، لیکن شمسی میں ۱۹۰۲ء، اور قمری میں ۱۳۲۰ھ مذکور ہے، اس اختلاف کی وجہ شمسی مہینوں کے ایام ہر سال دس دن کم ہوتا ہے، اس لحاظ سے پوری ایک صدی میں تین سال کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

قضیہ نامرضیہ:

آپ کی زندگی کا افسوس ناک پہلو وہ ہے جب آپ کو وہابیت کے مقدمہ میں ۶۵۔۱۸۶۴ء میں راولپنڈی کے اندر نظر بند کر دیا گیا، حاسدوں کا خیال تھا کہ اس طرح میاں صاحب کا علمی اثر کم ہو جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، آپ نے جیل کی کال کوٹھری کو مرکز درس بنا کر سنت یوسفی کی یاد تازہ کی، اور ایک متروک و مجہور روش کی احیاء کے باعث ہوئے، ان تلخ و شیریں حالات میں بھی عمل بالحدیث کو اپنا شعار بنائے رکھا، بخاری شریف کا درس دیا، اور مجرموں کی تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، ۱۳۰۰ھ میں جب آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی تو وہاں منیٰ وغیرہ مقامات میں آپ کے خطبات اور بیانات مخالفین کی آنکھوں کے خار ثابت ہوئے اور آپ کی علمی ترقی پسند نہ آئی، چنانچہ آپ پر معتزلی یا وہابی کا الزام لگایا، جس کی وجہ سے آپ کو حراست میں رکھا گیا، لیکن جب صحیح صورت حال سامنے آئی تو عزت و اکرام کے ساتھ آپ کو رہا کر دیا گیا، ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں: ''جب آپ حج سے واپس تشریف لائے تو اسٹیشن دہلی پر استقبال کے لیے اس قدر لوگ حاضر ہوئے کہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ختم ہو گیا، کارپردازان اسٹیشن حیران تھے کہ یہ کس نامی گرامی شخص کی آمد آمد ہے''۔(۸)

میاں صاحب کی زندگی کا نمایاں نبوی وصف:

میاں صاحب کا اصل موضوع تدریس وتربیت تھا، ان کی فطرت میں خلاق ازل نے مربیانہ شفقت، مصلحانہ بصیرت اور متکلمانہ قوت استدلال ودیعت فرمائی تھی، انہوں نے مزاج نبوت کو سمجھ کر تربیتی نظام کی لڑی میں اپنے کو پرو دیا، کردار سازی اور افراد سازی کو اپنا جزء زندگی بنا لیا، طلبہ واساتذہ کی ایک بڑی تعداد کا آپ کے درعلم پر ہجوم ہوتا، آپ کو دنیا کے مسلمانوں اور ہندوستانی

مسلمانوں کی صورت حال کا پورا اندازہ تھا کہ آج ان کا اکثریتی طبقہ تصنیف وتالیف کی طرف مائل ہے، نظام تربیت کو در خور اعتنا نہیں سمجھا جا رہا ہے، اس بے توجہی کے شکار پہلو کی طرف میاں صاحب نے توجہ کی، اور ہر میدان کے علماء کی جماعت تیار کردی، مولانا محمد عزیز شمس نے اپنی کتاب ''مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات وخدمات'' کے مقدمہ میں فن کے لحاظ سے ان علماء کی فہرست درج کردی ہے، مثلاً درس و تدریس میں حافظ عبدالمنان وزیرآبادی، مولانا عبداللہ غازیپوری، دعوت و تبلیغ میں مولانا ابراہیم آروی، مولانا عبدالغفار مہدانوی، تصوف وسلوک میں مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا معین الحق پھلواری، علمی و تصنیفی کام میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولانا عبدالرحمن مبارکپوری، باطل نظریات کی تردید میں مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، جہاد وقتال میں علماء صادق پور وغیرہ۔ اسی طرح ''الحیاۃ بعد المماۃ مؤلفہ مولانا فضل حسین'' نے ملکوں اور ہندوستانی صوبوں کے لحاظ سے میاں صاحب کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ۴۹۰ کا تذکرہ کیا ہے، اس سے افراد سازی کی آفاقی سوچ کا پتہ چلتا ہے، افراد سازی کا یہ عمل حاشا وکلا اپنی علمی ذریت بڑھانے کے لئے نہیں تھا، بلکہ محمدی مزاج کا عکس اور پر تو تھا اور اشتغال بالحدیث کا نتیجہ تھا۔

میاں صاحب اور تدریس حدیث:

میاں صاحب نے شاہ محمد اسحاق کی صحبت میں ۱۳ سال گذارے ۱۲۵۸ھ میں جب شاہ صاحب نے حجاز کا قصد کیا تو میاں صاحب نے شاہ صاحب کے خطوط پر خدمت دین کو جاری رکھا، جبکہ اس زمانہ میں دو قسم کے مراکز قائم تھے علمی اور تعلیمی، علمی میدان کی قیادت نواب صدیق حسن خاں کر رہے تھے، میاں صاحب نے تعلیمی کارکو آگے بڑھایا، مسجد اورنگ آبادی واقع پنجابی کٹرہ میں میاں صاحب نے پڑھانا شروع کیا، (۱) مولانا ابراہیم سیالکوٹی لکھتے ہیں: ''آپ نے مسجد اورنگ آبادی میں اپنا مستقل حلقۂ درس قائم کیا ۱۲۷۰ھ تک فنون درسیہ کی ہر شاخ اور تفسیر کی کتابیں بلا استثناء پڑھاتے رہے'' (۹) اسی مسجد میں آپ کے خسر مولانا عبدالخالق صاحب بھی پڑھاتے تھے، ۱۲۶۱ھ میں ان کا انتقال ہوگیا تو آپ اس میں تنہارہ گئے جہاں طلباء کی انبوہ کثیر جمع رہتی تھی اور ذوق وشوق کا مظاہرہ

ہوتا تھا، سو اتفاق کہ ۱۸۵۷ء میں یہ مسجد شہید کر دی گئی، تو میاں صاحب نے اورنگ آبادی کی بنائی ہوئی دوسری مسجد واقع دھوبی کٹرہ پھاٹک حبش خاں میں تشنہ کامان علم کی شیفتگی کو دیکھتے ہوئے تدریسی عمل کو جاری رکھا، اور فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم وفنون کی تدریس فرماتے رہے، شیخ عزیز الرحمٰن سلفی رقم طراز ہیں" یہ مدرسہ اس زمانہ کی حدیث کی یونیورسٹی تھا، جب تک اس مدرسہ کی سند نہ ہوتی کسی کو وقار نہیں ہوتا، خاندان ولی اللهی کی عملی میراث اور فن حدیث آئندہ نسلوں تک پہونچانے میں میاں صاحب کی علمی خدمات اور کردار کی اہمیت سب کے نزدیک مسلم ہے"(۱۰) یہیں میاں صاحب کی علمی وتدریسی سرگرمیاں جاری رہیں، اس مدرسہ میں ایک کتب خانہ ہے جو کتب خانہ نذیریہ کہلاتا ہے(۱۱)

مولانا ابو یحیٰ نوشہروی اپنی کتاب" تراجم علماء اہل حدیث" کے حاشیہ میں لکھتے ہیں": ۱۰ شوال ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۲۲ پریل کو (کتب خانہ نذیریہ) قائم ہوا، اس وقت مولوی سید ابوالحسن نبیرۂ حضرت میاں صاحب بقید حیات تھے، جلسۂ افتتاحیہ انہی کی صدارت میں ہوا، ستمبر ۱۹۲۳ تک کتابوں کی تعداد آٹھ ہزار (۸۰۰۰) تھی، اور اس وقت مہتمم مولوی سید عبد الرؤف صاحب ہیں"(۱۲) اس عظیم ذخیرۂ کتب سے اندازہ ہوتا ہے کہ میاں صاحب کس قدر اہتمام سے درس کی تیاری کرتے اور حدیث کے مفہوم ومدلول کو طلباء کے ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے۔

منہج تدریس حدیث:

میاں صاحب نے شاہ محمد اسحاق کے ہجرت کرنے کے بعد اپنا تدریسی عمل مسجد اورنگ آبادی واقع پنجابی کٹرہ اور دھوبی کٹرہ میں جاری رکھا، میاں صاحب کے درس کا انداز بہت نرالا تھا، حدیث کی قراءت، صحت وضعف کی وضاحت، صحیح وسقیم قول کی جانچ پڑتال، اشکالات کا تشفی بخش جواب آپ کے درس حدیث کے نمایاں امتیازات ہیں، تحقیقی مواد پیش کرنا، سامعین کو مطمئن کرنا اور بروقت بطور استشہاد اشعار کا نوک زبان ہونا آپ کی فطرت ثانیہ تھی، طلباء کے ذہن کو ملتفت کرنے کیلئے کبھی کبھی استفسار کے طرز پر کوئی صیغہ یا ترکیب پوچھتے، تدریس کی تیاری کے لئے آپ نے ایک نظام بنایا تھا، قدیم وجدید، مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہتیں، بقول مولانا فضل حسین" پڑھانے میں جب

تقریر کرتے تو ایک بحر مواج معلوم ہوتے تھے"۔(۱۳) ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: میاں صاحب "إنما الأعمال بالنيات" ۲۷ دن میں پڑھاتے ہیں، میاں صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ پہلی حدیث جو بخاری کی ہے ۲۷ روز میں پڑھاتا ہوں مگر اب وہ زمانہ نہیں ہے اب تو تعطیل پر سرسوں جماتا ہوں، دو برس میں پوری صحاح ستہ اور ایک ماہ رمضان میں آپ جلالین پڑھاتے تھے"۔(۱۴)

ایک کامیاب مدرسہ صرف زیر درس اصول سے بحث نہیں کرتا، بلکہ ما لہ وما علیہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے، حدیث چونکہ قدیم وجدید علوم کا خزینہ ہے، میاں صاحب عصری مسائل میں گفتگو کا خاص ذوق رکھتے تھے، آپ نے اکثر علوم وفنون کے مبادیات پڑھ لئے تھے، صاحب "الحياة بعد المماة" لکھتے ہیں: "ایک روز ایک طبی مسئلہ کی تحقیق کے موقع پر فرمانے لگے کہ میں نے پانچ شرحیں من أوله إلى آخره پڑھ لی ہیں"۔

میاں صاحب صبح فجر کے بعد قرآن کا درس دیا کرتے تھے، ایک رکوع روزانہ خاص تھا، پہلے آیتوں کی تلاوت اچھی لے میں کرتے، ان کا ترجمہ پیش کرتے، اصول تفسیر کے مطابق پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتے، پھر احادیث نبویہ کو تائیداً نقل کرتے، ان سے مستنبط مسائل کا تذکرہ کرتے اور علماء وطلباء کے مذاق طبیعت کی رعایت کرتے ہوئے فلسفہ ومنطق کے دقیق مسائل کی بھی گتھیاں سلجھاتے، سادگی اور صفائی کی جلوہ گری ہوتی، اس سے سامعین پر بڑا اثر پڑتا، عوام وخواص فرط مسرت سے جھوم جاتے، ایک مرتبہ سورۂ قارعہ کا درس لیا، شاہدین کا بیان ہے: وہ بیان عجیب پر کیفیت، پر لطف، بلیغ اور پر اثر تھا، حالات قیامت بہ الفاظ وعبارات مختلفہ جتنی جگہ قرآن میں وارد ہوئے ہیں، ان کے ہم معنی الفاظ کو جمع کر کے تطبیق دیتے اور ہر تعبیر کے فوائد کا تذکرہ کرتے، علامہ سید عبدالحی حسنیؒ ان کے درس کی اثر آفرینی کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

إنه حضرت دروسه سنة اثنتي عشرة وثلاث مائة وألف فوجدته إماما جوالا في الحديث والقرآن، حسن الطريقة حلازما للتدريس ليلا ونهارا انتهت إليه رئاسة الحديث في بلاد الهند (۱۵)

میاں صاحب کی حدیثی کاوشیں:

میاں صاحب کے علمی کمالات کا اندازہ ان تحریری نقوش کے ذریعہ ہوگا جو انہوں نے اپنی حیات میں سپرد قلم کئے، سطور ذیل میں کچھ اہم کاوشوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے: مولانا شمس الحق "غایۃ المقصود" میں رقمطراز ہیں: "اما مؤلفاتہ التی ھی موسومۃ باسامیھا فلم الإمعار الحق و والمعۃ الفتوی، ودافعۃ البلوی، وثبوت الحق الحقیق، ورسالۃ فی تحلی النساء بالذھب، والمسائل الأربعۃ، وھذہ کلھا بالھندیۃ، و فلاح الولی باتباع الولی، و مجموعۃ بعض الفتاوی، ورسالۃ یا بطال المولد بالعربیۃ (۱۶)

میاں صاحب کی حیات مستعار کا اکثر حصہ درس و تدریس میں گذرا، آپ نے فتویٰ نویسی کا بھی شغل رکھا، اور عوام کی ضرورتوں کے پیش نظر ان کو تشفی بخش جواب دیے، اور قرآن وحدیث سے مستنبط مسائل بتائے، شرک وبدعت، اوہام وخرافات پر حدیث کی روشنی میں نکیر کی، آپ کے شاگرد رشید مولانا فضل حسین لکھتے ہیں: "میاں صاحب وفات سے ستائیس برس پہلے فرماتے تھے، کہ اگر میرے کل فتاوی کی نقل رکھی جاتی تو فتاوی عالمگیری کے برابر ہوتی"۔ (الحیاۃ بعد المماۃ: ۳۱۵)

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ بیک وقت انسان محدث اور فقیہ نہیں ہوسکتا، اور محدث جلیل حضرت اعمش کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے جو انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کو مخاطب کر کے کہا تھا: انتم الاطباء ونحن الصیادلۃ " آپ طبیب اور ہم لوگ عطار ہیں" (جامع بیان العلم وفضلہ: ج ۲ص ۱۳۱) لیکن میاں صاحب کی زندگی اس سے مستثنیٰ ہے، انہوں نے دونوں میدانوں میں حذاقت پیدا کی اور زمانہ نے آپ کی علمی عبقریت کا لوہا مانا، ان کے معاصر عالم سر سید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں: زبدۂ اہل کمال، اسوۂ فضل وافضال مولوی نذیر حسین صاحب بہت صاحب استعداد ہیں، خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد بہم پہونچائی ہے کہ اپنے نظائر واقران پر گویا فوقیت لے گئے ہیں" (۱۷) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ محمد اسحاق صاحب چالیس سال تک درس و تدریس اور فتویٰ نویسی میں مصروف رہے، اس درمیان اگر وہ مجلت میں ہوتے تو استفتاء میاں صاحب کی طرف محول کر دیتے، آپ کے فتاوی میں حدیثی رنگ غالب ہوتا۔

فتاویٰ نذیریہ:

یہ میاں صاحب کے تحریر فرمودہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے، شروع میں ان کے رکھنے اور نقل لینے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، چناچہ آپ کے صاحب زادہ سید شریف حسین صاحب نے اس کی نقل کا اہتمام کیا، مگر موصوف کی عمر نے وفا نہیں کی، پھر ان کے صاحبزادہ نے اس کی طرف توجہ کی اور ایک معتد بہ ذخیرہ جمع ہو گیا، اور انہی کے اہتمام میں یہ کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آئی، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے، ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی، اس کی پہلی جلد کتاب الایمان والعقائد سے شروع ہوتی ہے۔

''سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس عقیدہ میں کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور پیدا کیا اور اس کا نام محمد رکھا؟ بینو بالآیات والحدیث تؤجروا.

الجواب: یہ بات بالکل غلط اور خطا ہے اور مخالفت اس کی نصوص سے ظاہر ہے کیوں کہ نصوص ظاہرہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ سب سے پہلے عرش اور پانی پیدا ہوئے بعد اس کے پیدائش آسمان و زمین اور سب چیز کی ہوئی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وھو الذی خلق السموات والأرض فی ستة أیام وکان عرشه علی الماء . کمالین حاشیہ جلالین میں ہے: ای قوله یعنی ماکان تحته قبل خلق السموات والأرض إلا الماء، وفیه دلیل علی أن العرش والماء کانا مخلوقین قبل خلق السموات والأرض، اور امام بخاریؒ نے عمران بن حصینؓ سے روایت کی ہے کہ جئناک لنتفقه فی الدین ولنسئلک عن أول هذاالأمر ماکان ، قال کان الله ولم یکن شئی قبله وکان عرشه علی الماء ثم خلق السموات والأرض ، رواہ البخاری مشکوۃ باب بدء الخلق ۔ کہا شیخ عبدالحق نے لمعات میں دل الحدیث علی أن العرش والماء کانا مخلوقین قبل السموات انتهی ".(۱۷)

میاں صاحب نے اس کے علاوہ مزید حدیثوں کو مذکورہ مسئلہ کی تائید میں نقل کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر مسلمان کو ایسے عقیدہ سے دور ہونا اور بھاگنا چاہئے اور نور نامہ والا بہت بڑا جاہل، کندہ ناتراش، ناواقف قرآن مجید اور حدیث شریف سے ہے، اس کی باتوں کو ہرگز تسلیم نہیں کرنا چاہئے اور اس کو جھوٹا کہنا مناسب ہے۔

اس طرح کی تحقیقی باتوں پر مشتمل یہ کتاب ہدیہ خاص وعام ہے، اس کتاب کے اندر صرف میاں صاحب کے چند فتاوی جمع کئے گئے ہیں، مولانا شمس الحق عظیم آبادی فرماتے ہیں کہ: واما الفتاوی المتفرقة التی شاعت فی البلاد والقری وانتفع بها خلق الله فکثیرة مابین مطول ومتوسط ومختصر بالألسنة الثلاثة المذکورة بحصر عددها وظن أنها لو جمعت لبلغت إلی مجلدات ضخام و! ن سمیت فتاواه علی نمط رسائل الحافظ والسیوطی وجعلت رسائل مستقلة فی کل باب بلغت إلی المائتین موأما الفتاوی الصغیرة التی تکتب کل یوم فی الحوادث والواقعات فلو جمعت لبلغت إلی عشرة مجلدات ضخام.(۱۸)

معیار الحق:

میاں صاحب نے اصول تقلید کے سلسلہ میں ایک کتاب بنام "معیار الحق" تالیف فرمائی جو رطب ویابس سے پاک اور حشو وزوائد سے صاف ہے، اس کتاب میں جن کتب مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے وہ عباقرہ فن کے نزدیک مستند ہیں، کتاب کی ابتدا حمد وثناء سے کی گئی ہے اور ائمہ اربعہ کو قوام الدین ثابت کیا گیا اس کتاب میں اگر چہ ایک خاص نظریہ کو غلبہ حاصل ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں قرآنی آیات سے استناد میں فراخ دلی کا مظاہر کر کے مدعا کو دلائل سے مبرہن کیا گیا ہے۔

معیار الحق کی رد میں مولانا ارشاد حسین رام پوری نے انتصار الحق نامی کتاب لکھی وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں: یقول العبد الأفقر إلی رب الغنا ابن محمد ارشاد حسین عفی عنه بانه قد وقع لبعض أهل العصر أن نطقت ألسنتهم بمضادةالحق الصراحی من التقلید ومدافعة الأخبار الصحاح فی فضل الإمام أبی حنیفة الرشید فحدانی حمیة الحق النقاح و أغرانی عصبیة الصدق القراح ان أحق الحق وأبطل الباطل وأذب عن الخزعبل الخزعبیل وتأید عرمی با لتماس بعض الخلان، فاستخرت الله وشرعت فیه مستعینا بواهب الحق فی التبیان وسمیته بانتصار الحق فی إکساد أباطیل معیار الحق (۱۹)

اس کتاب کی تردید میں میاں صاحب کے تلامذہ نے چار کتابیں لکھیں: (۱)براهین اثنا عشر. (۲)تلخیص الأنظار فیما بنی علیه الانتصار (۳)اختیار الحق (۴)بحر ذخار.

جناب محمد حسین بٹالوی اشاعۃ السنۃ میں تحریر فرماتے ہیں: ''معیار الحق کو خاکسار نے جمع ومرتب کیا اور حضرت شیخنا وشیخ کل سید نذیر حسین صاحب دہلوی نے میری درخواست پر اصلاح وکمی بیشی کر کے اپنے نام نامی کی طرف اس کو منسوب کر کے اس کو عزت، افتخار واعتبار بخشا''۔ (۲۰)

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ معیار الحق میاں صاحب کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ ان کے شاگرد جناب حسین بٹالوی کی مرتب کی ہوئی کتاب ہے۔

گیارہ سوالات کے جوابات:

یہ ۶۲ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے مولانا تلطف حسین عظیم آبادی کی سعی وکوشش سے میاں صاحب سے پوچھے گئے گیارہ سوالات کے جامع ومدلل جوابات کا خلاصہ اپنے اندرون میں رکھتا ہے۔ کچھ استفسارات فارسی میں ہیں اور کچھ اردو وعربی میں۔ پہلا سوال: چہ می فرمائند علمائے محققین از اہل سنۃ والجماعت کہ ایمان فی نفسہ بانضمام اعمال قابل زیادہ ونقصان است۔ آخری سوال یہ ہے کہ شکار جانور وحشی چارپایہ یا پرندہ مباح ہے یا ممنوع۔ ان دونوں سوالات کے جوابات میں میاں صاحب کا راہوار قلم قرآن کی آیتوں اور حدیث کے شہ پاروں کو لیکر مسئلہ کی صحیح ترجمانی کرتا نظر آتا ہے جس سے ہر قاری کو تشفی بخش غذا ملتی ہے اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے، یہ رسالہ مطبع انصاری واقع دہلی میں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔

مکاتیب نذیریہ:

میاں صاحب نے اپنی حیات میں متعدد احباب کو امور دین سے آگاہ کرنے کیلئے کچھ خطوط اور مکتوبات تحریر فرمائے تھے ان میں دوستوں کے مرثیے بھی ہیں اور خوشیوں کے تذکرے بھی۔ طلباء کو نصیحت اور عازمین حج کو سوغات علم بھی۔ غرض اس رنگارنگی اور بوقلمونی کے مجموعہ میں ایک اسلامی زندگی کا لائحہ موجود ہے، اس کا خاص امتیاز یہ ہے کہ جملوں کے بیچ میں حدیث کا تراشا ہوا جملہ یا مشہور فقرہ اس خوبی کیساتھ استعمال کیا گیا ہے کہ گویا وہ وہیں کے لیے کہا گیا تھا، ۲۴۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں زمانہ ماضی کی حکایتیں بھی ہیں اور مستقبل کی بشارتیں بھی۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: اے عزیز فرمان الٰہی کے اس محاسبہ سے ذرا رہو۔ ان تبدوا ما فی انفسکم اپنے نفس کی خواہش میں مبتلا نہ رہ

اور فاذکرونی اذکرکم کے مراقبہ میں غور کرکر اور دل کی آنکھ بمصداق وجوہ الخ مشاہدہ الٰہی کے نظارہ میں لگا دے اور اس کا نظارہ کر، اس سرمایہ سے تو دین خالص کی پونجی بمصداق اَلا للہ الدین الخالص حاصل کر سکے۔ شاید اس طرح کی کوشش سے کوئی بھید اسرار الٰہیات سے تجھ پر کھل جائے (۲۱)۔

میاں صاحب کے یہ مکاتیب فارسی زبان میں ہیں۔ محبوب المطابع برقی پرنٹنگ ورکس زیر جامع مسجد مچھلی والان دہلی کے اس مطبوعہ نسخہ میں ترجمہ بھی درج ہے۔

میاں صاحب کی نمایاں حدیثی خوبیاں:

(۱) تقوی (۲) خشیۃ الٰہی (۳) صبر وضبط (۴) خوش خلقی (۵) شرافت نفسی (۶) شرم وحیا (۷) سخاوت وفیاضی (۸) توکل علی اللہ (۹) عفت و پاکدامنی (۱۰) اللہ ورسول کی محبت (۱۱) عفو ودرگذر (۱۲) مجاہدہ وریاضت وغیرہ یہ وہ شہ سرخیاں ہیں جو اخلاق نبوی کی تشریح وتفصیل میں ذکر کی جاتی ہیں، میاں صاحب ان خوبیوں سے اپنی ذات کو مزین کئے ہوئے تھے اور اس کا عملی مظاہرہ بھی ان کی شبانہ زندگی میں ہوتا رہتا تھا، مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے منجملہ ان تمام خوبیوں کے تفسیر، حدیث، فقہ، صرف ونحو کی جزئیات میں وسعت ومہارت اور ممتاز ویگانۂ روزگار شاگردوں کو بھی شامل کیا ہے۔

میاں صاحب کی زندگی کے چند حدیثی مظاہر:

☆ بیعت کرنا اور اصلاحی تعلق رکھنا کوئی رسمی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ نبوی طریقہ پر گامزن رہنے کی ایک شکل ہے، کیوں کہ یہ دین دو واسطوں سے ہم تک پہنچا ہے، ایک کتاب اللہ دوسرے رجال اللہ، میاں صاحب بھی اس دوسرے واسطے کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے، وہ خود پٹنہ کے قیام کے دوران حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلہ سے نہ صرف متاثر ہوئے، بلکہ اس کے وعظ وارشاد نے آپ کے دل پر گہرے نقوش چھوڑے، مولانا شاہ اسماعیلؒ کے بیانات نے ان کے دل کی دنیا بدل دی اور وہ حضرت سید صاحب سے بیعت ہو گئے، اپنے شاگردوں سے بھی اس طریق کے اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے اور باطن پر ان کی توجہ مبذول کراتے، یہی وجہ ہے کہ "۱۲۹۴ھ میں ایک روز فرمانے لگے کہ ۵۰ برس

ہوئے، بحمد اللہ تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی مگر دو بار، ایک مرتبہ جب نہایت شدید بخار میں مبتلا ہو گیا تھا اور کئی دن بیہوش رہا دوسری بار بھی ایسی ہی حالت میں قضا ہوئی جس کو صحت کے بعد میں نے پڑھ لیا"(۲۲)

☆ تصوف ایک جدید اصطلاح ہے جو احسان کے معنی میں استعمال کی جاتی ہے، اور یہ قرآنی تعبیر تزکیہ کے عین مرادف ہے لیکن اس وقت کے نام نہاد تصوف نے اس کو یکسر بدنام کر دیا ہے۔ میاں صاحب اس مروجہ تصوف پر بہت نکیر فرماتے تھے، وہ علم شریعت اور طریقت دونوں کے جامع تھے، امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین کی افادیت کے بہت قائل تھے اور شیخ محی الدین بن عربی کو شیخ اکبر اور خاتم الولایۃ المحمدیہ کے نام سے یاد کرتے تھے، ایک مرتبہ مولانا ابو الطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی نے میاں صاحب سے کئی دن متواتر شیخ اکبر کی نسبت بحث کی اور فصوص الحکم کی عبارتوں کو مستدل بنا کر اعتراضات کیے، میاں صاحب نے پہلے تو بہت سمجھایا، پھر اخیر میں فرمایا کہ فتوحات مکیہ ابن عربی کی آخری تصنیف ہے، یہ اپنی ماسبق کتابوں کے لیے ناسخ ہے جس سے یہ مسئلہ رفع ہو گیا۔

یہ اثر تھا حدیث نبوی کی تدریس کا، قرآن اور احادیث نبویہ کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان اپنے پیش روؤں سے حسن ظن رکھے، اور ان کی علمی تحقیقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھے اور حرز جاں بنائے الا یہ کہ نا قابل تسلیم مسئلہ ہو، بلا تفکر و تدبر علمائے سلف کو طعن و تعریض کا نشانہ بنانا حدیثی مزاج کے حامل افراد کے شایان نہیں ہے۔

حوالہ جات:

(۱) حسن البناء کی ڈائری: ۶۵

(۲) الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام: رقم الترجمة ۵۲۷

(۳) تذکرہ علماء حال: ۹۳

(۴) علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ: ۲۰۲

(۵) حیاۃ الشیخ شمس الحق: ۲۴۵

(۶) عون المعبود: ج ۱/۱۳

(۷) تراجم علمائے اہل حدیث: ۱۳۲

(۸) تاریخ اہل حدیث: ۴۲۹

(۹) أیضاً: ۴۲۷

(۱۰) جماعت اہل حدیث کی تدریسی خدمات: ۱۶

(۱۱) علم حدیث میں پاک وہند کا حصہ: ۲۰۳

(۱۲) تراجم علماء اہل حدیث: ۱۳۱

(۱۳) الحیاۃ بعد المماۃ: ۸۶

(۱۴) أیضاً: ۸۶

(۱۵) الإعلام بمن فی تاریخ الہند من الأعلام مطبوعہ بیروت: ۱۳۹۲

(۱۶) غایۃ المقصود: ۱۶

(۱۷) فتاوی نذیریہ ج ۱/ ۲

(۱۸) غایۃ المقصود ج ۱/ ۱۳

(۱۹) مقدمہ انتصار الحق مولفہ ارشاد الحق فاروقی

(۲۰) ترجمان اہل حدیث: ج ۲۷ شمارہ ۵۔ ۱۱ صفر ۱۴۲۸ھ

(۲۱) مکاتیب نذیریہ: ۱۸۹

(۲۲) الحیاۃ بعد المماۃ: ۱۷۲



امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی کی حدیثی خدمات

از: مولانا احمد خانپوری

جامعہ اسلامیہ مظفر پور میں "مركز الشيخ ابو الحسن الندوي للبحوث والدراسات الإسلامية" کے زیر اہتمام "دو روزہ عالمی مذاکرہ علمی" منعقد ہو رہا ہے، میں اسی مناسبت سے بہ طور تمہید شیخ ابو الحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کی تحریر سے اپنے مقالہ کے آغاز کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے، اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" [المائدہ ۳] آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لیے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے، اور اس کا شباب بروقت قائم ہے ۔

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے: مگر وہ زندگی سے پُر ہے، اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تبارک

وتعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے، اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو، اپنی زندگی کھو چکا ہو؛ بلکہ ایک زندہ دین ہے جو علیم وحکیم صانع کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔

"ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ" [الانعام ۱۲] یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

"صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْ أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ" [النمل ۸۸] کاریگری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

یہ دین چوں کہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے: اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور مکان وزمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں: ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل ومکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت وطاقت ہے اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض

اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ انتظامِ خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت وقوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس "تریاق" کی حاجت تھی وہ اس امت کو عطا ہوا۔

کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی وایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوتِ عمل پیدا کر دیں۔ زندگی کے تقاضے ہر وقت جواں ہیں، مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتاً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُر جوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی جنھوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات ومنات

اس کا مقابلہ جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کے اس طویل اور پُر آشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہوگئی، حقیقتِ اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امتِ اسلامیہ کا ضمیر بالکل بے حس ہوگیا ہو اور تمام عالمِ اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لیے کوئی فتنہ نمودار ہوا اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا، اور اس کو میدان سے ہٹا دیا:

بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں: لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں جو قدریت، جہمیت،

اعتزال، خلق قرآن، وحدت الوجود اور اکبر کے دین الٰہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علَم بردار تھے: لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی اسلام کی تاریخ، اور ایسا ہی مسلسل ہے جیسی مسلمانوں کی زندگی۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ص ۱۷، ۱۸، ۲۶، ۲۷، ۲۸)

پچھلے سوا سو، ڈیڑھ سو سال سے جس جماعت اور گروہ کو اس تاریخ دعوت وعزیمت کے لیے کلاہ افتخار، مجد اسلامی کی آبیاری، رسوم و بدعات کے لیے شمشیر براں اور باطل فرقوں کے سروں پر دھاکہ خیز بم کا مقام حاصل ہے وہ علمائے دیوبند کا گروہ ہے: ان میں قرونِ اولیٰ کے نمونے اور اعلیٰ صلاحیتوں اور ذہانتوں کے مالک اور کبار محدثین پیدا ہوتے رہے، جن میں بطور خاص قابل ذکر قطب الارشاد حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، صاحب بذل المجہود حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ وغیرہم ہیں، ان میں کا ہر کوئی علمی دنیا کا آفتاب و مہتاب ہے۔

اس وقت مرکز کے ذمہ داران نے حضرت گنگوہیؒ کی حدیثی خدمات و مہارت کے سلسلہ میں کچھ پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر مامور کیا ہے: اس لیے آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی جامعیت، علمی و عملی کمالات اور حدیث و فقہ میں مہارت کے سلسلہ میں ماہرینِ فن اور اکابرین کی کچھ شہادتیں اور وقیع کلمات پیش کیے جائیں:

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی شہادت:

ہر کس کہ از یں فقیر محبت و عقیدت و ارادت دارد، مولوی رشید احمد سلمہ و مولوی محمد قاسم سلمہ را - کہ

جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند- بجائے من فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق ازمن شمارند- اگر چہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشاں بجائے من ومن بمقام اوشاں شدم- وصحبت اوشاں راغنیمت دانند، کہ ایں چنیں کساں دریں زمان نایاب اند، واز خدمت بابرکت ایشاں فیضیاب بودہ باشند۔

(ضیاء القلوب ص ۷۰ از الطیب الذکی ۱؍۶۰)

(۲) حضرت نانوتویؒ کی شہادت:

سیدنا الامام النانوتوی قدس سرہ نے حضرت اقدس مولانا گنگوہی قدس سرہ سے- جوان کے رفیق درس، زمانہ طالب علمی میں شب و روز کے ہمدم تھے- ایک بے تکلف مجلس میں ارشاد فرمایا کہ: ''اللہ نے آپ کو فقہ وحدیث میں جو کمال عطا فرمایا ہے اس پر رشک آتا ہے'' حضرت گنگوہی نے اسی بے تکلفی سے جواب دیا کہ: جی ہاں! ہمیں دوچار لقمے آگئے تو آپ کو بڑا رشک آتا ہے، اور خود علم کا سمندر پئے بیٹھے ہیں جس پر ہم نے کوئی رشک نہیں کیا۔

یہ اس ہستی کی شہادت ہے جس کی علوم عقلیہ میں ژرف نگاہی، حکمت شرعیہ میں بالغ نظری اور فہم قرآن وحدیث میں اپنے معاصرین پر امتیاز کی ایک دنیا معترف ہے، اور ان کی تیس سے زائد کتابیں اس کا شاہد عدل ہیں، یہ شخصیت بانی دار العلوم دیوبند حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی ہے، وہ شہادت دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت گنگوہی قدس سرہ کو فقہ وحدیث میں قابل رشک کمال عطا فرمایا تھا۔

(ماخوذ از تقریظ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم، الطیب الذکی ۱؍۲۹)

(۳) حضرت علامہ کشمیریؒ کی شہادتیں:

(الف) حضرت علامہ نے بھاولپور میں قادیانیوں کے خلاف مقدمہ میں بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا:

روافض کے اکفار میں اختلاف ہے، علامہ شامی ابن عابدین عدم تکفیر کی طرف مائل ہیں، اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اکفار کرتے ہیں، ہمارے نزدیک بھی یہی صحیح ہے، اصل میں جو ابتلاء

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو پیش آیا وہ علامہ شامی کو پیش نہیں آیا، مسئلہ کا اختلاف نہیں ابتلاء کا ہے، ویسے ہمارے نزدیک حضرت شاہ صاحب علامہ شامی سے فقیہ ہیں، اور حضرت گنگوہی کو بھی ہم نے شامی سے فقیہ النفس پایا۔ (انوارانوری ص:۱۵۰ از الطیب الذکی ۵۸/۱)

(ب) حضرت شاہ صاحبؒ حضرت گنگوہیؒ کو مجتہد فرماتے تھے، حضرت علامہ نے حضرت گنگوہیؒ کی شان میں قصیدہ لکھا تھا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

إليه المنتهى حفظاً و فقهاً ☆ وأحصى في الرواية كالمدار

فنفي التحديث رحلة كل راو ☆ وفي الأخبار عمدة كل قاري

فقيه النفس، مجتهد، مطاع ☆ وكوثر علمه بالخير جاري

(نفحة العنبر ص:۱۸٤، از الطیب الذکی ۵۸/۱)

(ج) نیز حضرتؒ کی شان میں فرماتے ہیں:

"وكثرت الفتيا، وازدحمت المسائل على الشيخ رشيد أحمد حين التبس الحق بالباطل، فأجاب فيها بالصواب، كان فقيها مجتهداً، فأخذنا ذلك إماما في الأصول، وهذا إماما في الفروع." (نفحة العنبر ص:۷۷، از الطیب الذکی ۵۹/۱)

(۴) "نزهة الخواطر" کے مصنف اور نامور مؤرخ مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلویؒ فرماتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں، ان کا وجود مغتنمات میں سے ہے، اس تورع واستقامت کا دوسرا شخص ان کے سوا اس زمانہ میں عالم آشوب میں نظر نہیں آتا علم الٰہی میں جو کوئی ہو اس کی خبر نہیں، مولوی صاحب کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف تورع ہے۔

(دہلی اور اس کے اطراف، تالیف مولانا عبدالحی ص ۷۷۔۱۳، از الطیب الذکی ۶۱/۱)

(۵) مولانا یوسف صاحب بنوریؒ کا فرمان:

ہمارے اکابر دیوبند تو جیہات کے باب میں بہت آگے ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور ان

کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے بہترین توجیہات پیش کی ہیں، جب کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد حضرت گنگوہیؒ وہ شخص ہیں، جنھوں نے محض اپنے نور قلب سے حدیث کی مشکلات حل کی ہیں اور کچھ تھوڑا سا حصہ حضرت شیخ الہندؒ کو اس سے ملا ہے۔

(ماہنامہ بینات، مولانا محمد یوسف بنوری، ص ۱۲۶، ماز الطیب الذکی ۱/۵۷)

(۶) حضرت مفتی تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم "الكوكب الدري على جامع الترمذي" کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

بلاشبہ حل ترمذی کے نقطۂ نظر سے یہ کتاب دریا بکوزہ کا مصداق ہے، اس میں مختصر، جامع اور تشفی بخش تشریحات بھی ہیں، اور علم ومعرفت، تحقیق و تدقیق کے خزانے بھی، یہ ترمذی کی انتہائی بہترین اور مختصر شرح ہے، اس کا صحیح اندازہ جب ہوتا ہے جب انسان مطولات کے مطالعہ کے بعد اس کا مطالعہ کرے، خاص طور سے حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم کے حواشی نے اس کے منافع کو دوچند کر دیا ہے۔ (درس ترمذی ۱/۱۴۰)

- فخر المتأخرین حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی حل مشکلات کے لیے حضرت امام ربانیؒ سے رجوع کرتے رہتے تھے۔ (الطیب الذکی ۱/۵۷)
- اہل حدیث کے نامور متعصب بلکہ متشدد عالم وکیل اہل حدیث مولوی محمد حسین بٹالوی بعض احادیث ورموز کی شرح وتفہیم کے لیے حضرت مولاناؒ سے رجوع کرتے تھے۔

(الطیب الذکی ۱/۵۷)

قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ:

- ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ بروز پیر بوقت چاشت محلہ سرائے قصبہ گنگوہ میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا اسم گرامی مولانا ہدایت احمد ابن قاضی پیر بخش، اور والدہ محترمہ کا نام کریم النساء بنت فرید بخش ہے۔
- ۱۲۵۲ھ میں والد صاحبؒ کا گورکھپور میں انتقال ہوا۔
- ۱۲۶۱ھ میں ۱۷ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لیے دہلی کا سفر کیا اور وہاں تقریباً چار سال مقیم رہے۔

- ۱۲۶۵ھ میں فراغت ہوئی، فراغت کے بعد آپ نے اپنے وطن ہی میں حفظ قرآن مکمل کیا۔
- ۱۲۷۶ھ میں الزام بغاوت کی بنیاد پر گرفتار کیے گئے اور کم وبیش چھ ماہ کے بعد رہائی ہوئی۔
- ۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست بنائے گئے۔
- ۱۲۹۹ھ میں تیسرے حج کے بعد ایک سال کے اندر اندر پوری صحاح ستہ ختم فرمانے کا التزام فرمایا اور یہ سلسلہ ۱۳۱۴ھ تک جاری رہا، اور اسی سال مظاہر العلوم سہارنپور کی سرپرستی قبول فرمائی۔
- ۸ یا ۹ر جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ = ۱۹۰۵ء بروز جمعہ، اذان جمعہ کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔
- آپ کے باقیات صالحات دو صاحبزادے حکیم مسعود احمدؒ اور مولوی محمود احمدؒ (حضرت کے انتقال سے قبل وفات پا چکے تھے) اور ایک صاحبزادی صفیہ خاتونؒ تھے۔
- آپ کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ رہا جس میں بڑے بڑے نامور علماء شامل ہیں اسی طرح آپ کے خلفاء کی ایک وسیع فہرست ہے۔
- آپ کی چھوٹی بڑی تقریباً چودہ کتابیں ہیں۔

حضرتؒ کے بے مثال قابل تقلید صحاح ستہ کے درس کا کچھ حال لکھا جارہا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ ایک ایسے محدث تھے جن میں اجتہاد واستنباط کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں، حافظہ اور ثقاہت وتقدیس وتبحر، فراست وہمہ دانی خوبی تطبیق وارتباط، جودت ذہن اور اتقان وعدالت جتنے اوصاف وخوبیاں جو ایک اچھے محدث استاذ میں پائی جانی ضروری ہیں ان تمام سے آپ متصف تھے، آپ کے درس حدیث میں ایک خاص خوبی تھی کہ مضمون حدیث سن کر اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا، یہ خاص اثر اس لیے تھا کہ اس دور میں آپ ہر فرد سے زیادہ متبع سنت تھے، آپ صحیح معنوں میں محب رسول اور شیدائی سنت تھے، آپ کی تدریس میں محویت کا ایسا عالم ہوتا تھا کہ ہر شریک درس کی یہ خواہش ہوتی کہ سلسلۂ درس دراز ہو، اور جب سبق ختم ہوتا تو خیال ہوتا کہ ابھی تشنگی باقی ہے،

کاش سبق شروع رہتا؛ لیکن جب سبق کے بعد اوراق وصفحات شمار کیے جاتے تو حیرت ہوتی کہ اس قدر سبق کیوں کر ہوگیا! آپ کی تقریر کے بعد کتب، شروح اور حواشی دیکھنے کی مطلق ضرورت نہ رہتی تھی، اور یوں خیال ہوتا تھا کہ تمام شرحوں اور تفصیلات کا خلاصہ حضرت نے سامنے کردیا۔

صحاح میں سب سے پہلے عموماً جامع ترمذی شریف شروع کراتے تھے، اور مالہ وماعلیہ کی تحقیق کے ساتھ واضح تقریریں فرماکر طلبہ کے ذہن نشین کردیا کرتے تھے، ہر ہر حدیث کا ترجمہ اور معنیٰ مطابقی سلیس اور عام فہم الفاظ میں بیان فرماتے، اور نفس مطلب کو ایسا کھول دیا کرتے تھے گویا پوست اور چھلکے سے مغز اور گودے کو نکال کر سامنے رکھ دیا، اس کے بعد احادیث کا باہم یا حدیث کا کسی آیت قرآن سے تعارض ہوتا تو اس کا رفع فرماتے، اور مطابقت وموافقت ظاہر فرماتے تھے، بقدر ضرورت اسماء الرجال ذکر فرماتے، رواۃ کی تحقیق اور توثیق وتضعیف کرتے تھے، اسناد میں ضروری جرح وتعدیل فرماتے، اور اس کے بعد حدیث کی باب سے مناسبت بیان کرتے تھے، باہم عبارت اور سیاق وسباق میں ارتباط مخفی ہوتا تو اس کو کھولتے، اور ایک مضمون کا دوسرے مضمون سے ربط دیتے جاتے تھے، اگر کوئی حدیث دیگر کتب کی کسی حدیث کے معارض ہوتی تو ان کو بھی تطبیق دیتے، اصول حدیث اور اصول فقہ کے نکات اور عبارت کے اشارات بھی بیان فرماتے تھے، مشکل مقامات کو متنبہ کرکے کئی کئی بار بیان فرماتے۔

ترمذی شریف کے ختم ہونے پر صحاح کی دوسری کتابیں ہوتیں، اور ان میں ترجمہ نہ ہوتا، البتہ اگر کوئی نئی حدیث آتی تو اس کا معنی ومطلب حسب سابق بیان فرماتے۔

حضرت مولانا مذہب حنفیہ کی اگر چہ مدلل مکمل ترجیح کرتے جاتے؛ مگر کیا مجال کہ کسی جگہ کسی دوسرے فقیہ یا امام کی ذرا سی تنقیص ہوجائے، فرمایا کرتے کہ مجھے حنفی مسلک سے خاص محبت ہے اور اس کی حقانیت پر کلی اطمینان ہے، اگر کسی طالب علم نے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جس سے دوسرے مسلک کی توہین وتنقیص کا مطلب نکلتا تو فوراً عملاً اس کی اصلاح فرماتے، یہاں تک کہ نفس تقلید میں بھی تعصب کا حد سے بڑھنا آپ کو پسند نہ تھا، بعض طلبا دتشدد وعصبیت میں محدثین کے متعلق کوئی ذرا

ناگوار کلمہ کہہ دیتے تو حضرت کے چہرے پر کراہیت کے آثار پیدا ہوتے، اور فوراً امام بخاریؒ اور دیگر مذاہب کی ترجیح مذہب حنفیہ پر ظاہر کرتے، اور فرماتے کہ: ان حضرات نے ان وجوہ کی بناء پر اس مسلک کو اختیار کیا ہے، جب طلباء کی بدظنی دور ہو جاتی تو پھر آگے چلتے۔

خلاصہ یہ کہ حضرتؒ درس حدیث میں ان امور کا لحاظ فرماتے تھے:

(۱) "ماله وماعليه" کی تحقیق۔

(۲) سلیس ترجمہ۔

(۳) عام فہم الفاظ میں مطلب اور وہ بھی اس قدر رزالا کہ بقول مولانا عاشق صاحب میرٹھیؒ کہ ایسا لگتا تھا کہ جب رسول مقبول ﷺ یا آپ کے صحابی نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہوگا تو ہمارے حضرت وہیں کسی جگہ کھڑے سن رہے ہوں گے۔ (تذکرۃ الرشید ۸۹)

(۴) دفع تعارض۔

(۵) حدیث کی باب سے مناسبت۔

(۶) باہم عبارت اور سیاق وسباق میں ارتباط۔

(۷) اصول حدیث اور اصول فقہ کے نکات۔

(۸) عبارت کے اشارات۔

(۹) بقدر ضرورت اسماء الرجال، رواۃ کی توثیق وتضعیف، اور جرح وتعدیل۔

(۱۰) مشکل مقامات پر متنبہ کر کے کئی کئی بار بیان فرماتے۔

اب ہم "لامعُ الدَّراري" اور "الكوكبُ الدُّرّي" سے کچھ نمونے پیش کر رہے ہیں جن سے آپ کی فقہ الحدیث، قوت استنباط، دفع تعارض کی غیر معمولی صلاحیت، اشارۃ النص اور عبارۃ النص وغیرہ سے مسائل ودلائل کا استخراج، فقہاء کے مابین رفع اختلاف کا اچھوتا انداز، جابجا اصولوں کی روشنی میں مسائل کا حل، ضروری مقامات پر حکمتوں کا بیان، مشکل مسائل کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کا ملکہ اور مشکل ترین مسائل کو دو لفظوں میں حل کرنے کی قوت وغیرہ اوصاف

کا اندازہ ہوگا، نیز آپ نے بخاری شریف کے بعض مشکل ترین تراجم حل فرمائے ہیں جن کا حل آپ ہی کا مقدر تھا۔

دفع تعارض کی غیر معمولی صلاحیت:

(۱) صلاۃ کو وضوء کے معنی میں لے لیا جائے:

مسواک وضو کی سنت ہے یا نماز کی، یہ مسئلہ احناف اور شوافع کے درمیان مختلف فیہ ہے: احناف وضو کی سنت مانتے ہیں اور شوافع نماز کی، حدیثوں میں عام طور پر "عند کل صلوۃ" کا لفظ آیا ہے، اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت میں "مع کل وضوء" آیا ہے، اس تعارض کو حضرتؒ اس طرح حل فرماتے ہیں:

"عند کل صلوۃ" کی روایت کو وضو کی روایت پر محمول کیا جائے گا (یعنی صلوۃ کو وضو کے معنی میں لے لیا جائے) اور یہ مجاز متعارف ہے جو نصوص میں جاری ہوتا ہے جیسے: ﴿یاأیها الذین آمنوا إذا قمتم إلی الصلوۃ﴾ میں "قیام إلی الصلوۃ" سے "قصد إلی الصلوۃ" مراد ہے۔

(الکوکب الدري ۱:۵۵)

رفع اختلاف کا اچھوتا انداز:

(۲) حدیث قلتین احناف کے مخالف نہیں

پانی کی طہارت کا مسئلہ فقہاء کے درمیان معرکۃ الآراء مسائل میں سے ہے، اور اس باب میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی دلیل "حدیث القلتین" ہے، فقہاء احناف نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں، لیکن حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں: کہ یہ روایت احناف کے خلاف ہے ہی نہیں؛ گویا اختلاف ہی ختم۔ اس کو حضرت مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم کی زبانی سنیے:

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حنفیہ کے خلاف نہیں، دراصل

حنفیہ کے نزدیک مدار خلوص اثر نجاست پر ہے، اگر کسی مقام پر مبتلیٰ بہ کو یہ یقین حاصل ہو کہ قلتین کی مقدار میں خلوص نجاست نہیں ہوتا تو اسے طہارت حاصل کرنا جائز ہے: چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود اس کا عملی تجربہ کیا، ایک گڑھا کھدوا کر اس میں پانچ مشکیزے پانی ڈالا جو قلتین کی۔کتابوں میں لکھی ہوئی۔ مقدار کے مطابق تھا، اس میں ایک طرف کی تحریک سے طرف آخر متحرک نہیں ہوئی، ظاہر کہ ایسی صورت میں حنفیہ بھی پانی کو نجس نہیں کہتے، البتہ بعض صورتیں ایسی بھی نکل سکتی ہیں کہ ان میں اثر نجاست کا خلوص ہو جائے، ایسی صورت میں وہ پانی نجس سمجھا جائے گا: گویا اصل مدار خلوص نجاست پر ہے: اس لیے قلتین کو بطور ایک حد کے مقرر کرنا درست نہیں اور کلی تحدید کرنے کے بجائے اس سے رائے مبتلیٰ بہ پر چھوڑا جائے گا، حضرت گنگوہیؒ کی یہ توجیہ زیادہ اطمینان بخش ہے۔ (درس ترمذی ۱/۲۷۱، الکوکب الدري ۱: ۹٤)

(۳) ہیئت صلاۃ پر سونے سے وضوء ٹوٹنے کا مسئلہ:

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ: نوم کے ناقض ہونے کا اصل مدار حدیث باب کی تصریح کے مطابق استرخاء مفاصل پر ہے، اور اسی لیے فقہاء نے مختلف علامتیں مقرر کی ہیں، اور چوں کہ استرخاء مفاصل زمانہ اور لوگوں کے قویٰ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اس لیے یہ حدود بھی دائمی نہیں ہیں، لہٰذا حنفیہ کو آج کل اپنے اس مسلک پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ ہیئت صلاۃ پر سونے سے وضوء نہیں ٹوٹتا: کیوں کہ اس دور میں ہیئت صلاۃ پر بھی استرخاء متحقق ہو جاتا ہے اور سونے والے کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ (درس ترمذی ۱/۱۹۵، الکوکب الدري ۱: ۱۰۸)

(۴) نشر اصابع کا معنیٰ:

امام ترمذیؒ نے "باب في نشر الأصابع عند التكبير" میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ

روایت ذکر فرمائی ہے: "كان رسول الله ﷺ إذا كبر للصلاة نشر أصابعه" اب اس کے مقابلہ میں فقہاء کا یہ کہنا - سجدے کے وقت انگلیوں کو ملانا، رکوع کے وقت فاصلہ رکھنا اور باقی اوقات میں انگلیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دینا - اس حدیث کے خلاف معلوم ہوتا ہے، اب اس حدیث کی وضاحت حضرت گنگوہیؒ کی زبانی سنیے:

> نشر کے دو معنی ہیں: ایک ضد الضم یعنی دو انگلیوں کے درمیان فاصلہ رکھنا جو ملانے کی ضد ہے، دوسرا ضد القبض یعنی انگلیوں کو سیدھا رکھنا جو موڑنے کی ضد ہے، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، لہٰذا فقہاء کا قول اس حدیث کے خلاف نہیں۔ (الكوكب الدري ١: ٢٥٦)

اشارۃ النص اور دلالۃ النص سے مسائل و دلائل کا استخراج:

(۵) وضوء میں ترتیب کے غیر مشروط ہونے کی دلیل

امام ترمذیؒ نے مسح راس کے سلسلہ میں دو باب قائم فرمائے ہیں: (۱) "يبدأ بمقدم الرأس إلى مؤخره" (۲) "يبدأ بمؤخر الرأس" دوسرے باب میں ربیع بنت معوذ کی یہ روایت ذکر فرمائی ہے کہ: "أن النبي صلى الله عليه وسلم مسح برأسه مرتين بدأ بمؤخر رأسه الخ"، حضرتؒ "بدأ بمؤخر رأسه" کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> اس سے اعضائے وضو کے دھونے میں ترتیب کا غیر مشروط ہونا بھی مستنبط ہو رہا ہے۔ (الكوكب الدري ١: ٦٤)

(٦) ماءِ مستعمل سے متعلق منفرد کلام:

"باب المنديل بعد الوضوء" میں امام ترمذیؒ نے دو مرفوع حدیثیں ذکر کی ہیں جن سے وضوء اور غسل کے بعد تولیے سے پونچھنے کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے، اس باب کے تحت ماءِ مستعمل کے سلسلہ میں حضرتؒ کا نہایت ہی عمدہ کلام ملاحظہ ہو:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعضائے وضو کا پونچھنا بیان جواز اور

اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے تھا کہ ماء مستعمل ناپاک ہے نہ ناپاک کرنے والا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ماء مستعمل نجاست حکمی کے لیے مطہر نہیں رہتا۔

وجہ یہ ہے کہ نجاست ظاہری حکم باطنی ثابت نہیں کرتی اور نجاست باطنی حکم ظاہری پیدا نہیں کرتی، ماء مستعمل کے ساتھ جب تک نجاست ظاہری کا اختلاط نہیں ہوگا وہاں تک ظاہراً اس پر نجاست کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اور اس کے ذریعہ ظاہری نجاستوں کا زائل کرنا بھی جائز ہوگا، البتہ باطن میں اس ماء مستعمل سے معاصی کی نجاست کو زائل کیا گیا ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے، اب دوبارہ اس کے ذریعہ سے نجاست باطنی کا ازالہ متصور نہیں، جیسا کہ نجاست حقیقی زائل کیے ہوئے پانی سے دوبارہ نجاست حقیقی زائل نہیں کی جاسکتی؛ چناں چہ ماء مستعمل کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی معتمد روایت یہی ہے کہ وہ طاہر غیر مطہر ہے جس کا استعمال نجاست حقیقیہ کے ازالہ میں جائز ہے، حکمیہ میں جائز نہیں: چوں کہ نجاست حقیقیہ میں مدار طہارت نجاستوں کو ان کی جگہوں سے دور کرنا ہے، اور یہ ماء مستعمل سے ممکن ہے، اور نجاست حکمیہ میں مدار طہارت گناہوں کا ازالہ ہے اور یہ ماء مستعمل سے ایک مرتبہ ہو چکا ہے اس لیے دوبارہ درست نہیں۔ (الكوكب الدري ۱:۷۷)

نوٹ: وضو کے بعد اعضاء پونچھنے کی حدیث سے ماء مستعمل کا مسئلہ حل کرنا آپ ہی جیسے فقیہ النفس حضرات کا کام ہے، نیز ماء مستعمل کے حکم پر اس طرح کی گفتگو کارے دارد!۔

جواب اصول کی روشنی میں

(۷) "لا وضوء" میں نفی کمال:

"لا وضوء لمن لم يذكر اسم الله عليه" پر ذرا بن کثیر کا کلام ملاحظہ کیجیے:

یہاں پر کمال وضوء کی نفی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ "لا" حقیقۃً نفی ذات کے لیے مستعمل ہوتا ہے، اس وقت قرینہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اور مجازاً نفی کمال کے لیے مستعمل ہوتا ہے، یہاں مجازی معنی مراد ہے اور اس کا قرینہ آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے: " من توضأ وذكر اسم الله كان طهوراً لجميع بدنه، ومن توضأ ولم يذكر اسم الله كان طهوراً لأعضاء وضوئه ".

(الكوكب الدري ١: ٥٨)

ملحوظ: اس میں خوبی کی بات یہ ہے کہ جہاں نفی کمال کہہ کر جواب دے رہے ہیں، وہیں طلباء کو ایک اصول بھی اس سہل انداز سے پیش فرما رہے ہیں کہ جس سے ذہنوں کے بند قفل کھل جائیں، اور یہ کنجی ان کو ہر "لا" میں کام دے۔

(۸) نص ظاہر پر مقدم ہوتا ہے:

امام ترمذیؒ نے "باب ماجاء في النوم عن الصلاة" میں حضرت ابوقتادہؓ سے لیلۃ التعریس کی روایت مختصراً ذکر کی ہے جس میں آپ ﷺ کا یہ فرمان ذکر کیا ہے: "إذا نسي أحدكم صلاة أو نام عنها فليصلها إذا ذكرها" ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اگر کوئی شخص مکروہ وقت میں یعنی عند الطلوع یا عند الغروب بیدار ہو یا نماز یاد آجائے تو اسی وقت نماز پڑھ لینی چاہیے، ورنہ قضا کرنے کا گناہ لازم ہوگا، وہ اس حدیث کے عموم سے استدلال کرتے ہیں۔ اور احناف کے نزدیک مکروہ وقت میں نماز پڑھنا جائز نہیں، حضرت گنگوہیؒ کا اصولی جواب ملاحظہ کیجیے:

> " فليصلها إذا ذكرها " ادائے صلاۃ کے باب میں نص اور بیان وقت میں ظاہر ہے اور " أحاديث النهي عن الصلاة في الأوقات المكروهة " بیان وقت کے سلسلہ میں نص ہیں اور نص ظاہر پر مقدم ہوتا ہے۔
>
> (الكوكب الدري ١: ٢٠٨)

قوتِ استنباط:

(۹) ایک روایت سے دس مسائل کا استنباط:

امام ترمذیؒ نے "باب ماجاء في مصافحة الجنب" میں یہ روایت بیان کی ہے: "عن أبي هريرةؓ أن النبي صلى الله عليه وسلم لقيه وهو جنب قال فانخنست فاغتسلتُ ثم جئتُ فقال أين كنت أو أين ذهبت قلت إني كنت جنباً قال إن المؤمن لاينجس" اب ذرا دیکھئے کہ حضرت امام ربانیؒ کی قوتِ استنباط جوش میں آتی ہے تو اس حدیث پاک سے کس قدر مسائل مستنبط فرماتے ہیں:

> اس قصہ اور الفاظ حدیث سے چند مسائل مستنبط ہوتے ہیں (۱) جنبی سے حالت جنابت میں مصافحہ کرنا جائز ہے اور اسی کو بیان کرنے کے لیے مصنفؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے۔ (۲) نجاست حکمیہ غیر کو، نہ ملوث کرتی ہے نہ ناپاک، جب تک وہاں نجاست حقیقیہ موجود نہ ہو، ورنہ ابو ہریرہؓ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے نجس ہاتھ کو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں میں دے دیتے۔ (۳) جنبی آدمی اپنی ضرورت کے لیے بازار اور دیگر مقامات میں جا سکتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو جب ان کے جنبی ہونے کا علم ہوا تو ان کے گھر سے باہر نکلنے پر نکیر فرماتے۔ (۴) نماز کا وقت آنے تک غسل جنابت میں تاخیر کی جا سکتی ہے۔ (۵) اکابر میں سے کسی کے حکم صریح کے بعد اس کے حکم پر ترک عمل جائز ہے بشرطیکہ یقین ہو کہ وہ اس کی مخالفت پر ناراض نہیں ہوگا، بلکہ حقیقت واضح ہونے کے بعد ان کو مسرت ہوگی، اس لیے کہ ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑا تھا تو آپ کا ارادہ ان کو اپنے ساتھ لے کر چلنا تھا، لیکن ابو ہریرہؓ کو چونکہ یقین تھا کہ اس کے خلاف کرنے میں بھی آپ کی رضا شامل رہے گی، تو انہوں نے آپ کے اس حکم کے مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کی،

کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ یہ مخالفت ایک امر خیر (یعنی طہارت) حاصل کرنے کے لیے کی گئی ہے، لہٰذا اس کو معصیت نہیں جانا جائے گا، اور نہ یہ مخالفت آپ کی ناراضگی کا سبب ہوگی، اسی لیے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے چپکے سے کھسک جانے پر کوئی نکیر نہیں کی، اور حضور ﷺ کا بوقت ملاقات بعد میں یہ کہنا ''اَیْنَ کُنْتَ'' اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے ساتھ رکھنے اور لے چلنے کا قصد فرمایا تھا کما قلنا ۔ (۶) اگر کسی سے کوئی عمل ایسا صادر ہو جائے جس پر نکیر کی جا سکتی ہے، تو اس سے اس کا عذر معلوم کرنا چاہیے، تا کہ اگر اس کا عذر معقول ہے تو اس کو قبول کر لیا جائے، اور اس کو صحیح بات بتا کر اس کی امرِ حق کی طرف رہنمائی کی جائے، اور اگر ضرورت ہو تو جرم پر اس کی تعزیر کی جائے۔ (۷) کسی کو برا بھلا کہنے اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں جلدی نہ کی جائے جب تک اس غلط کام کا سبب نہ معلوم ہو جائے۔ (۸) علماء، مشائخ، ائمہ اور خلفاء کے سامنے ایسی باتوں کو زبان پر لانے کی گنجائش ہے، جو شرعاً معیوب نہیں ہیں، دیکھیے! ابو ہریرہؓ سے سوال کرنے کے بعد اگر وہ جواب نہ دیتے اور حیا کی وجہ سے سکوت اختیار فرماتے تو معصیت اور نافرمانی شمار کی جاتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے زمانے کے جہلاء میں جو یہ بات رائج ہو گئی ہے، کہ اپنے بڑوں کے سامنے اس قسم کی باتوں کو زبان پر لانا بوقت ضرورت بھی بے شرمی خیال کرتے ہیں، حتیٰ کہ آدمی دن بھر جنابت کی حالت میں رہتا ہے، لیکن گھر والوں کی حیا کی وجہ سے غسل نہیں کرتا، چاہے ایک نماز یا کئی کئی نمازیں فوت ہو جائیں اس کی پرواہ نہیں، لیکن نہ گھر والوں کے سامنے غسل کرتا ہے نہ کسی ایسی جگہ غسل کرتا ہے جس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ یہاں نہانے سے گھر والوں کو اس کا علم ہو جائے گا۔ اور یہ بارگاہ رب العزت میں بے حیائی ہے کہ اس نے فرض نماز قضا

کردینے کو حیا سمجھا، حالانکہ اس کا حیا سے کوئی تعلق نہیں؛ یہ تو شیطانی مکر ہے کہ وہ اس کے ذریعہ ارتکاب معصیت کا وسیلہ بن گیا، اور اس بات کا امکان ہے کہ کہیں ایسے لوگوں کا نور ایمان سلب نہ ہو جائے۔ (۹) کسی چیز پر ایسے لفظ سے حکم لگانا جائز ہے، جو اس معنی سے عام ہے جس کا ثابت کرنا مقصود ہے، اسی طرح کسی شیٔ کی مطلق نفی بھی جائز ہے، اگر چہ اس کی ایک نوع کے علاوہ کوئی اور نوع منفی نہ ہو۔ دیکھیے! رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إن المؤمن لا ينجس" حالانکہ یہ معلوم ہے کہ مومن ہر قسم کی نجاستوں کے ساتھ یعنی: حدث، جنابت، حیض ونفاس وغیرہ سبھی نجاستوں کے ساتھ ملوث ہوتا ہے، اور یہ نجاستیں بعض بعض سے بڑھ کر ہیں، حتی کہ ان میں سے اکثر نجاستوں میں جب تک ان نجاستوں کے ساتھ تلبس ہے عبادات کی ادائیگی حرام ہے، پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ مومن ناپاک نہیں ہوتا، یہ ارشاد بطریق اشارہ بتلا رہا ہے جو قائم مقام تصریح کے ہے، کہ کبھی شیٔ پر شیٔ کا اطلاق کیا جاتا ہے لیکن مراد اس سے اس کی بعض انواع کا اثبات ہوتا ہے، اور بہت سی مرتبہ ایک شیٔ کی بعض قسموں کے منفی ہونے سے شیٔ کی بالکلیہ نفی کردی جاتی ہے، اگر چہ وہاں ظاہری لفظ عموم پر دلالت کرتا ہے بشرطیکہ کلام کا مقصد فوت نہ ہو، کیونکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس طرز کلام سے مخاطب پر مراد کلام مخفی نہیں رہے گی۔

اس تقریر سے وہ سب اشکالات ختم ہو جائیں گے جو بہت سی روایات میں ہوا کرتے ہیں، اور جن کے بارے میں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث فلاں حدیث کے مخالف ہے، کہ اس حدیث میں ایک حکم کا اثبات ہے اور دوسری حدیث میں اسی حکم کی نفی ہو رہی ہے، کیونکہ یہ مخالفت اس لیے پیدا ہوئی کہ دونوں حدیثوں میں عموم کو عموم جنسی پر محمول کیا گیا، ورنہ اگر دونوں کو عموم نوعی پر

محمول کیا جاتا تو ان دونوں میں معارضہ نہ ہوتا۔(۱۰)اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علماء صالحین کی مجلس میں حاضری کے لیے طہارت کا اہتمام مستحب ہے۔واللہ اعلم۔ (الكوكب الدري ۱: ۱۵۳، ۱۵٤)

(۱۰) کپڑے سے استنجاء ممنوع ہے:

امام ترمذیؒ نے "بـاب كراهية مـا يستنجى بـه" میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: "لاتستنجوا بالروث ولا بالعظام؛ فإنه زاد إخوانكم من الجن" اس حدیث میں گوبر اور ہڈی سے استنجاء کرنے کی ممانعت ہے، اور اس کی علت فـإنـه زاد إخـوانكم بتلائی گئی ہے، اس سلسلہ میں حضرتؒ کا کلام ملاحظہ ہو:

> " فـإنـه زاد إخـوانكم" نہی ثانی کی علت ہے، اور نہی اول کی علت بدیہی طور پر معلوم ہے، اور وہ مقام کو ناپاک کرنا ہے؛ اور اس کا بھی احتمال ہے کہ دونوں کی علت ہو، ہڈی جنات کا توشہ ہوگا، اور گوبر ان کے جانوروں کا، اور جنات کی طرف نسبت مجازا ہوگی۔
>
> اس علت سے اشارہ نکلتا ہے کہ استنجاء ہر ایسی چیز سے مکروہ ہے جو قیمتی ہو یا قابل انتفاع ہو، خواہ کھانے کی چیز ہو یا اس کے علاوہ، اور اس کا نفع جانوروں سے وابستہ ہو یا کسی اور سے: چناں چہ یہ حکم کپڑوں اور گھاس وغیرہ کو بھی شامل ہوگا۔ (الكوكب الدري ۱: ۵۱)

دو لفظوں میں مسئلہ حل:

(۱۱) استقبال جہت امام:

امام ترمذیؒ نے "بـاب فـي استقبال الإمام إذا خطب" میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت ذکر کی ہے: "كـان رسـول الله ﷺ إذا اسـتـوى عـلـى المنبر استقبلناه بوجوهنا" اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ کے وقت تمام قوم کو امام کی طرف منہ کر کے بیٹھنا افضل ہے، امام

ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ کا مسلک بھی یہی ہے: لیکن متأخرین فقہاء نے استقبال قبلہ کے ساتھ استماع خطبہ کو راجح قرار دیا ہے کمـا فـي البحر - حضرت گنگوہیؒ اس گتھی کو کتنی آسانی سے سلجھا رہے ہیں:

اس حدیث میں استقبال سے مراد استقبال جہت امام (جہت قبلہ) ہے، نہ کہ عین امام کی طرف متوجہ ہونا: اس لیے کہ اگر عین امام کی طرف متوجہ ہونا مراد ہو تو اس سے تحلّق (حلقہ بنانا) قبل الجمعہ لازم آئے گا جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے "نهى عن التحلق قبل الصلوة يوم الجمعة".

(ابوداؤد، باب التحلق يوم الجمعة قبل الصلوة ۱: ۱۵۴) (درس ترمذی ۲/ ۲۸۳، الكوكب الدري ۱: ۳۱۹)

(۱۴) مسئلۂ استحاضہ کی اطمینان بخش تقریر:

حضرت مولانا محمد تقی صاحب فرماتے ہیں: استحاضہ کے مسائل اس قدر پیچیدہ ہیں کہ عقلیں حیرت زدہ ہیں، قدم ڈگمگا گئے ہیں، اور اہل علم کی رائے بھی انتشار کا شکار ہیں اور فقہاء کے اقوال میں بھی اختلاف ہے۔

ہمارے حضرت الاستاذ نے اس موقع پر انتہائی تشفی بخش اور تشویش دور کرنے والی تقریر فرمائی جو ہم آپ کے سامنے بعینہ پیش کر رہے ہیں، امید ہے کہ اس تقریر سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں:

مصنف نے استحاضہ کے مسائل کو بیان کرنے کے لیے یہاں مسلسل چار ابواب قائم کیے ہیں: کیونکہ استحاضہ کے مسائل میں کافی اختلاف ہے، اور جو احادیث اس باب میں وارد ہوئی ہیں بظاہر وہ بھی ایک دوسرے کے خلاف ہیں:

پس باب اول یہ بتلانے کے لیے منعقد کیا ہے کہ مستحاضہ حائضہ کے حکم میں نہیں ہے: لہٰذا دم استحاضہ صوم وصلوۃ سے مانع نہیں ہے، مصنف کا اصل مقصد تو یہی بیان کرنا ہے: لیکن ضمناً مصنف نے استحاضہ کے بعض احکام بھی

بیان کیے ہیں جن کو بعض ائمہ نے اختیار کیا ہے۔

دوسرا باب جمہور کے یہاں مستحاضہ کا حکم بیان کرنے کے لیے منعقد کیا ہے،اور وہ یہ کہ مستحاضہ دوران استحاضہ ہر نماز کے لیے وضو کرتی رہے اور نماز پڑھتی رہے،اور اس مسئلہ میں جمہور کی دلیل وہ حدیث ہے جو مصنف نے اس باب میں ذکر کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:"انها تغتسل وتتوضا عند كل صلاة" ۔(اگر چہ اس جملہ کی تشریح میں جمہور کے مابین اختلاف ہے : شافعیہ کے یہاں ہر فرض نماز کے لیے وضو ضروری ہے،اور حنفیہ کے یہاں ہر فرض نماز کے وقت وضو ضروری ہے)۔

تیسرے باب میں مستحاضہ کے لیے "جمع بين الصلوتين بغسل واحد" کا حکم بیان فرمایا ہے جیسا کہ روایت میں ہے، کہ آپ ﷺ نے ظہر وعصر کو ایک غسل سے اور مغرب وعشاء کو دوسرے غسل سے پڑھنے کا حکم دیا،اور فجر کے لیے علاحدہ غسل کا حکم فرمایا اور یہی بعض ائمہ کا مختار ہے۔

چوتھے باب میں مصنف نے مستحاضہ کے لیے ایک اور حکم کو بیان فرمایا ہے،اور وہ ہے غسل لكل صلوة یعنی کہ مستحاضہ ہر نماز کو الگ الگ غسل سے ادا کرے۔جس کو بعض لوگوں نے اختیار کیا ہے،اور ان کی دلیل ام حبیبہؓ کی حدیث ہے،جس کو مصنف نے اس باب میں ذکر فرمایا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے وضو لکل صلوۃ والی روایت لی ہے اور لام کو وقت کے معنی میں لیا ہے جیسا کہ اس کا استعمال عام ہے اور بعض روایات میں صراحۃً وقت کا لفظ موجود ہے:لہٰذا لام کو وقت کے معنی سے الگ نہیں کر سکتے پھر ہر مجتہد نے ان روایات کا جواب دیا ہے جو اس کے مذہب کے خلاف ہیں،امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا حضور اقدس ﷺ نے فاطمہ بنت ابوحبیش کو جس چیز کا حکم دیا ہے وہی تمام بنات حوا کے لیے لائق عمل ہے اور ان روایات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو وضو

لکل صلوۃ کی روایت کے خلاف ہو بلکہ تمام روایات درحقیقت وضولکل صلوۃ کو ثابت کرتی ہیں، اور جن روایات میں حضور ﷺ نے مستحاضہ کوغسل کا حکم فرمایا ہے وہ بطور علاج کے ہے وہ مستحاضہ کا حکم شرعی نہیں ہے اور امام شافعیؒ اگر چہ وضو کے واجب ہونے اور غسل کے واجب نہ ہونے میں تو ہمارے موافق ہیں، مگر انھوں نے صلوۃ کو اس کے اصطلاحی معنی پر محمول کیا ہے، اور لام کو وقت کے معنی پر محمول نہیں کیا ہے، اور اس سلسلہ میں ان پر تفصیلی روایت اور ان جیسی جگہوں میں لام کو کثرت سے وقت کے معنی میں استعمال کی وجہ سے حجت قائم ہوگی اور اسی قبیل سے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿أقم الصلوة لدلوك الشمس﴾۔

(الکوکب الدری ۱:۱۶۰)

(۱۳) روایت بالمعنی کے جواز کی انوکھی دلیل:

امام ترمذیؒ نے "أبواب الأطعمة" "باب ما جاء في أكل الأرنب" میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت ذکر فرمائی ہے: عن هشام بن زيد قال سمعت أنساً يقول انفجنا أرنباً بمر الظهران، فسعى أصحاب رسول الله ﷺ خلفها، فأدركتها فأخذتها فأتيت بها أبا طلحة فذبحها بمروة، فبعث معي بفخذها أو بوركها إلى النبي ﷺ، فأكله، فقلت أكله؟ قال قبله.

ہشام ابن زید کے پوچھنے پر کہ آپ ﷺ نے خرگوش کا گوشت کھایا؟ تو حضرت انسؓ نے فرمایا قبول فرمایا تھا۔ اس حدیث میں حضرت گنگوہیؒ کا ذہن کتنا دور پہنچتا ہے ملاحظہ کیجیے:

> حضرت انس کا "فأكله" کہنا اس بات کی طرف مشیر ہے کہ روایت بالمعنی مع تغیر کثیر جائز ہے جب کہ معنی مرادی نہ بدلے، جیسا کہ یہاں پر حضرت انس نے "قبله" کی جگہ پر "فأكله" فرمایا، اور یہ اس لیے فرمایا کہ ان جیسی جگہوں میں قبول کرنا کھانے کے لیے ہوتا ہے، تو گویا کھانا لازم اور قبول ملزوم ہے،

یہاں ملزوم کی جگہ لازم ذکر کیا گیا۔ (الکوکب الدری ۳:۶۰)

وضاحت: ایک طرف اس حدیث میں راوی کے فضلہ کی جگہ فاکلہ کہنے کی بہترین توجیہ فرمائی، دوسری طرف وضع اللازم مکان الملزوم کا اصول طلباء کے حوالہ کیا، نیز روایت بالمعنی تغیر کثیر پر دلیل بتایا۔

(۱۴) تشبہ بالکفار کے متعلق اہم تنبیہ:

امام ترمذیؒ "باب ما جاء في النهي عن الأكل والشرب بالشمال" میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت ذکر فرمائی ہے: عن عبد الله بن عمر ان النبي قال لا يأكل احدكم بشماله ولا يشرب بشماله، فإن الشيطان يأكل بشماله ويشرب بشماله.

حضرتؒ "فإن الشيطان يأكل بشماله" سے تشبہ بالکفار کے متعلق ایک اہم تنبیہ فرمارہے ہیں کہ:

> اس سے معلوم ہوا کہ تشبہ کی بنیاد پر جو فعل ناجائز ہو اس میں تشبہ کے حرام ہونے کے لیے ان لوگوں کا وہاں موجود ہونا مشروط نہیں، جیسا کہ شیطان معلوم ہے نہ محسوس کہ وہ کہاں ہے؟ اس کے فعل کا کسی حال میں ادراک نہیں ہوتا ہے، اس کے باوجود ہمیں اس کے تشبہ سے روک دیا گیا، بنابریں اگر کسی علاقہ میں یہود نہ ہوں تب بھی ان لوگوں کے لیے ان کی عادات وحرکات کی پیروی درست نہیں فافهم واغتنم فإنه يفيد فوائد. (الکوکب الدري ۳:۱۲)

ملحوظہ: تشبہ کے متعلق ایسی تنبیہ پیش فرمارہے ہیں کہ وہاں تک عموماً رسائی نہیں ہوتی۔

(۱۵) تین انگلیوں سے کھانے کی دلنشیں حکمت:

امام ترمذیؒ نے "باب ماجاء في اللقمة تسقط" میں حضرت انسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے: "إن النبي ﷺ كان إذا أكل طعاماً لعق أصابعه الثلاث وقال إذا وقعت لقمة أحدكم فليمط عنها الأذى وليأكلها ولا يدعها للشيطان الخ"

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ تین انگلیوں سے کھانا تناول

فرماتے تھے اس کی حکمت سنیے: اتنی انگلیاں کافی ہیں، پانچ سے کھانا شدت حرص کی علامت ہے اور زیادہ کھانے کا باعث ہے نیز تین سے کھائے گا تو لقمہ چھوٹا ہوگا، اور چھوٹا لقمہ اچھی طرح چبایا جا سکتا ہے اور اچھی طرح چبائے گا تو اجزاء معدہ میں پھیل جائیں گے جس سے سیری اچھی طرح حاصل ہوگی۔ (الکوکب الدری ۳: ۱۴)

(۱۶) نماز پہلے یا کھانا پہلے؟ نہایت ہی معتدل کلام:

امام ترمذیؒ نے "باب ما جاء إذا حضر العشاء وأقيمت الصلوة فابدؤا بالعشاء" میں حضرت انسؓ کی یہ روایت ذکر کی ہے: "قال (النبي) إذا حضر العشاء وأقيمت الصلوة فابدؤا بالعشاء" کھانا سامنے آجائے اور نماز کھڑی ہو جائے تو پہلے کھانا ضروری ہے یا نہیں؟ اور نماز پڑھنے کی صورت میں درست ہوگی یا نہیں؟ اور پہلے کھانے کا حکم دینے کی علت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے جو "درس ترمذی ۱۲۷/۲" میں تفصیل سے موجود ہے: لیکن اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کا نہایت ہی جامع اور سب میں ہی منفرد فرمان سنیے:

> صحابۂ کرام چوں کہ بہت کم کھاتے تھے: اس لیے اشتہا بھی زائد ہوتی تھی، اور کھا کر جلدی فارغ بھی ہو جاتے تھے، لہٰذا آج کل ہم لوگوں کو صحابۂ کرام پر قیاس کر کے کھانا سامنے آنے کے بعد ہمیشہ نماز مؤخر نہ کرنی چاہیے، بلکہ صرف اس وقت مؤخر کریں جب اشتہا اتنی زائد ہو کہ نماز میں دل نہ لگنے کا اندیشہ ہو۔
>
> (درس ترمذی ۱۲۸/۱، الکوکب الدری ۱: ۳۳۹)

(۱۷) ایمان میں کمی زیادتی:

ایمان میں کمی زیادتی کا مسئلہ اہل علم کے یہاں نہایت ہی معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، طویل طویل بحثیں کی گئی ہیں اور کی جاتی ہیں: اُن بحثوں کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ حضرتؒ کے ان چند سطری کلمات پڑھیے، محسوس ہوگا کہ ان دسیوں صفحات کا حاصل یہی ہو سکتا ہے اور بس، ان کلمات سے پوری بحث کا لب لباب بھی معلوم ہو رہا ہے، اور تمام آیات اور روایتوں میں تطبیق بھی ہو جاتی

ہے، ملاحظہ کیجیے:

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایمان باعتبار کیفیت کے اور مراتب کمال کے کم وزیادہ ہوتا ہے، اور باعتبار کمیت کے کم وزیادہ نہیں ہوتا: پس نزاع مابین الفریقین صرف لفظی ہے: جو نافی کم وزیادت ہیں وہ کمیت کو کہتے ہیں، اور جو مثبت کم وزیادت ہیں وہ کیفیت کے اعتبار سے اثبات زیادت ونقصان کرتے ہیں۔ (تالیفات رشیدیہ ص ۱۵۶)

بخاری کے بعض تراجم الابواب ایسا معمہ ہیں کہ شراح بخاری اور اہل علم کو اس میں کافی کدوکاوش کی ضرورت پڑی، لیکن اس کے باوجود بعض تراجم تشنہ ہی رہے، اس عقدہ کشائی کا سہرا اگر کسی کے سر ہے تو وہ حضرت امام ربانی کی ذات گرامی ہے؛ کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

(۱۸) باب کیف کان بدأ الوحي إلی رسول اللّٰہ:

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کی ابتداء "باب کیف کان بدء الوحی إلیٰ رسول اللہ" سے فرمائی، پھر اس کے تحت سب سے پہلی حدیث إنما الأعمال بالنیات ذکر فرمائی لیکن اس حدیث کا ترجمۃ الباب سے کیا تعلق ہے؟ اور دونوں میں کیا مطابقت ہے؟ شراح بخاری نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں، کسی نے فرمایا: اس حدیث کا ترجمۃ الباب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ خطبہ کے قائم مقام ہے۔ کسی نے فرمایا: کہ امام بخاری نے اپنی نیت کی صفائی بتلانے اور طلبہ کو بھی اخلاص کی دعوت دینے کے لئے اس حدیث کو یہاں ذکر فرمایا، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس پر اعتراض کیا: کہ اگر امام کا مقصد یہی ہوتا تو اس حدیث کو ترجمۃ الباب سے پہلے ذکر فرماتے۔

اس سلسلے میں ایک توضیح یہ فرمائی گئی ہے: کہ وحی اور ہجرت میں مناسبت ہے، دونوں میں گہرا تعلق ہے، آپ ﷺ نے دو ہجرتیں فرمائیں: ایک ہجرت آپ کے گھر سے غار حرا تک، دوسری مکہ سے مدینہ تک، دونوں ہجرتوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ پہلی ہجرت نزول وحی کے لیے مبدأ ہے، اور دوسری ہجرت ظہور وحی کا مبدأ ہے، اس مطابقت کا مدار ہجرت اور وحی کی مناسبت ہے۔

علامہ کشمیریؒ نے ترجمۃ الباب اور حدیث میں تطبیق اس طرح فرمائی: کہ وحی اور نیت عمل کی دونوں جانبوں میں واقع ہیں، عمل کا تعلق وحی کے ساتھ بھی ہے اور عامل کی نیت کے ساتھ بھی، کیونکہ عمل کی دو حیثیتیں ہیں: (۱) ورود عمل (۲) صدور عمل، ورود یعنی: اوامر ونواہی کے ماتحت عامل کا مکلف ہونا، یہ وحی پر موقوف ہے، اور صدور یعنی: اس تکلیف کے ماتحت عمل کرنا، یہ نیت پر منحصر ہے، تو جس طرح وحی ورود اعمال کا مبدأ ہے، نیت صدور اعمال کا مبدأ، اس تطبیق کا مدار وحی اور نیت کی مناسبت ہے۔

اب ہم حضرت گنگوہیؒ کی توجیہ کو دیکھتے ہیں جو بالکل واضح ہے، عقل وفطرت کے موافق ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

> ترجمۃ الباب میں جو لفظ ''کیف'' وارد ہوا ہے، اس کے معنیٰ میں عموم مجاز ہے، کلام عرب میں اکثر لفظ ''کیف'' سے کسی چیز کی کیفیت، حالت اور صفت کا سوال کیا جاتا ہے، لیکن کبھی وہ علت اور سبب کے سوال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے کیف جئت (بھئی بتلایئے کیسے آئے؟) اب یہ سوال عربی میں بلکہ اردو میں بھی ہم لوگ سبب معلوم کرنے کے لیے کرتے ہیں، اب ترجمۃ الباب: کیف کان بدء الوحي إلی رسول اللہ ﷺ قائم کر کے امام بخاری دو چیزیں بتلانا چاہتے ہیں: (۱) وحی کی کیفیت (۲) وحی کا سبب، اول مقصد تو باب کی دوسری احادیث سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے، لیکن مقصد دوم میں امام بخاری یہ بتلانا چاہتے ہیں: کہ نبوت اور رسالت جس میں وحی کا نزول ہوتا ہے اگرچہ وہ ''وہبی'' چیز ہے اس کا سبب محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصطفا اور اس کا اختیار ہے ﴿اللّٰہ یصطفی من الملٰئکۃ رسلاً وّ من النّاس﴾ ﴿اللّٰہ أعلم حیث یجعل رسالتہ﴾ لیکن اس کے باوجود بھی نیت اور اعمال کا اثر اس کے حصول میں ایک گونہ ضرور ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی ان ملکات واعمال کا خالق

ہے، لیکن فطری طور پر اللہ تعالیٰ ہر نبی کو نبوت سے پہلے بھی برائیوں سے دور رکھتا ہے اور بھلائیوں کی توفیق دیتا ہے، جو بالآخر نبوت کا سبب بنتے ہیں ﴿یا صالح قد کنت مرجوّاً قبل ھذا﴾ ﴿والذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا﴾ حضور اقدس ﷺ نے حکیم ابن حزام ؓ کو فرمایا تھا "أسلمت علی ما أسلفت من خیر" شراح حدیث نے اس جملہ کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ آپ کی زمانۂ جاہلیت کی بھلائیوں کے نتیجہ میں آپ ابھی اسلام لے آئے۔

(لامع الدراری ۱:۴۸٦)

(۱۹) باب الفتیا و ھو واقف علیٰ ظھر الدّابّة:

اس باب کے تحت امام بخاریؒ نے وہ حدیث ذکر فرمائی ہے جس میں یہ تذکرہ ہے: کہ حضور اقدس ﷺ منیٰ میں کھڑے ہیں اور لوگوں کے سوالات کا جواب دے رہے ہیں، اب اکثر لوگوں کا مطمح نظر اس جگہ یہی ہے: کہ امام نے ترجمۃ الباب میں وقوف علی ظھر الدابۃ کا تذکرہ کیا ہے جبکہ حدیث باب میں اس کا ذکر نہیں، تو اس کی تطبیق یوں دی گئی کہ اس حدیث کے دوسرے طرق جس کی تخریج خود مصنف نے "کتاب الحج" میں فرمائی ہے: وقوف علی ظھر الدابۃ کا تذکرہ ہے، تو گویا امام بخاریؒ نے حدیث کے ایک طریق کو ذکر کر کے ترجمۃ الباب کے اثبات میں دوسرے طریق کی طرف اشارہ کیا، لیکن حضرت گنگوہیؒ اس کی توجیہ کچھ اس طرح فرماتے ہیں کہ:

ابوداؤد کی روایت میں آیا ہے کہ "إنما کم أن تتخذوا ظھور دوابکم منابر" قرآن کریم میں ہے ﴿والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا و زینة﴾ دوسری جگہ ہے ﴿لتحملوا أثقالکم إلی بلد لم تکونوا بالغیه إلا بشق الأنفس﴾ آیات و احادیث کا منشایہ ہے کہ جانوروں کو سواری اور ان کے لائق کاموں کے علاوہ استعمال نہ کرو، ایسا نہ کرو کہ سواری پر سوار ہو اور دوسرے کاموں میں مشغول رہو، نیز امام مالکؒ سے منقول ہے کہ جب تک عمدہ

پوشاک اور اچھی خوشبو لگا کر مسندِ علم پر نہ بیٹھتے اس وقت تک حدیث بیان نہ فرماتے، نیز دوسری علمی گفتگو نہ فرماتے، تو امام بخاریؒ یہ باب قائم کر کے یہ فرمانا چاہتے ہیں: کہ ہنگامی حالت میں اگر کوئی سواری پر سوار ہونے کی حالت میں اگر علمی بات ہو تو کوئی حرج نہیں، اس طرح کرنا ممانعت میں داخل نہیں ہے۔

(لامع الدراري ٢:٤٢)

(۲۰) باب من بدأ بالحِلاب أو الطيب قبل الغسل

اس ترجمۃ الباب میں لفظ "حلاب" بكسر الحاء وتخفيف اللام آیا ہے، حلاب اس برتن کو کہا جاتا ہے جس میں ایک مرتبہ اونٹنی کا دوہا ہوا دودھ آ جائے، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں: کہ امام بخاریؒ کا اس ترجمۃ الباب سے کیا مقصد ہے اور حدیث سے اس کی کیا مطابقت ہے؟ شروع ہی سے علماء کے لیے یہ معاملہ مشکل اور مبہم رہا ہے۔

اس معاملہ میں کچھ حضرات نے امام بخاریؒ پر طعن کیا ہے کہ امام بخاریؒ کو اس حدیث میں وہم ہو گیا ہے کہ امام نے "حلاب" کا مطلب خوشبو سمجھا، حالانکہ لغت عرب میں اس لفظ کا ترجمہ یہ نہیں، ابن جوزیؒ فرماتے ہیں: کہ "غلط جماعة في تفسير الحلاب منهم البخاري فإنه ظن أن الحلاب طيب" یہی بات اسماعیلی، خطابی اور ابن قرقول نے امام بخاریؒ کے متعلق کہی ہے۔

کچھ حضرات نے کہا ہے: کہ امام بخاریؒ کی مراد حلاب بالحاء المهملة نہیں بلکہ بالجيم المضمومة يعني: جُلاب بمعنی گلاب کا پانی ہے، لیکن لوگوں نے اس میں تصحیف کر لی ہے اس لیے ترجمۃ الباب کا سمجھنا مشکل ہو رہا ہے، اب مطلب یہ ہوا کہ حضور اقدس ﷺ غسل کے وقت اپنے سر مبارک کو گلاب کے پانی سے دھویا کرتے تھے، یہ بات زہری نے "التهذيب" میں لکھی ہے لیکن علماء کی ایک جماعت نے زہری کا رد کیا ہے۔

امام طبریؒ نے اس ترجمۃ الباب کا مطلب یوں لکھا ہے: کہ اس باب میں لفظ "طيب" سے مراد بدن کی صفائی ہے اور لفظ "أو" بمعنی "واو" ہے اور حلاب سے مراد پانی کا برتن ہے، مطلب یہ

ہوا کہ حضور اقدس ﷺ غسل کی تیاری میں پانی کا برتن رکھتے اور میل کچیل والی جگہوں کو پہلے صاف کر لیتے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: کہ امام بخاریؒ کا مقصد اس ترجمہ سے ابن مسعودؓ سے مروی ایک حدیث "کان یغسل رأسه بالخطمي" حضور ﷺ اپنا سر مبارک "خطمی" سے دھوتے تھے پر رد کرنا ہے۔

بہر حال اس ترجمۃ الباب اور حدیث پر جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یا تو امام بخاریؒ پر طعن ہے یا الفاظ حدیث کی دور دراز کی تاویلات ہیں یا دوسری روایت پر رد۔

اب سنئے! حضرت گنگوہیؒ کا کلام جس میں ترجمۃ الباب کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے، امام پر طعن بھی نہیں ہوتا، تاویلات بعیدہ سے بھی احتراز ہو جاتا ہے اور روایات میں بھی تطبیق ہو جاتی ہے؛ چناں چہ فرماتے ہیں کہ:

> امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے غسل کرنے کے دو طریقے تھے: کبھی صرف پانی استعمال فرماتے اور کبھی غسل سے پہلے خوشبو استعمال فرماتے، ترجمۃ الباب میں غسل کے دونوں طریقوں کو بیان کیا "من بدأ بالحلاب" یعنی پانی کے برتن کو سیدھے استعمال کرنا شروع کر دیا "او الطیب" یا خوشبو کو استعمال کیا "عند الغسل" غسل کے وقت۔ پھر اس باب کے تحت صرف وہی ایک حدیث بیان فرمائی جس میں پہلا طریقہ مذکور ہے، کیوں کہ دوسرا طریقہ لوگوں میں معروف ہے، یا وہ روایات جس میں خوشبو کا استعمال آیا ہے بخاری کی شرط پر نہیں اترتی، امام نے اس روایت کو ذکر نہیں فرمایا۔ "ابو داؤد" اور "ابن ابی شیبہ" نے ان روایات کو نقل فرمایا ہے۔ (لامع الدراری ۲: ۲۰۹)

(۲۱) باب صنع الطعام والتکلف للضیف:

اس باب کے تحت میں امام بخاری نے ابو جحیفہ کی یہ روایت نقل فرمائی ہے

قال آخى النبي ﷺ بين سلمان و أبي الدرداء فزار سلمان أبا الدرداء فرء ى أم الدرداء متبذلة فقال لها ما شأنك قالت :أخوك أبو الدرداء ليس له حاجة في الدنيا فجاء أبو الدرداء فصنع له طعاماً فقال كل فإني صائم فقال ما أنا بآكل حتى تأكل فأكل فلما كان الليل ذهب أبو الدرداء يقوم فقال نم فنام ثم ذهب يقوم فقال نم فلما كان من آخر الليل قال سلمان قم الآن فصليا فقال له سلمان إن لربك عليك حقا ولنفسك عليك حقا ولأهلك عليك حقاً فاعط كل ذي حق حقه فأتى النبي ﷺ فذكر ذلک له فقال النبي ﷺ صدق سلمان.

علامہ عینیؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: کہ حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب کے ساتھ بالکل واضح ہے کیوں کہ حدیث میں "فصنع له طعاماً" آیا ہے اور ترجمۃ الباب میں بھی یہی ثابت کرنا مقصود ہے لیکن ترجمۃ الباب کا دوسرا جز علامہ عینی کی مطابقت سے ثابت نہیں ہوتا جو مقصود اصلی ہے حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

> اصل مطابقت لفظ "إني صائم" سے ہوتی ہے کیوں کہ ان لوگوں کے یہاں اکثر دن میں روزہ ہوتا تھا تو اگر کوئی روزہ دار نہ ہوتا اس کے لیے رات کے بچے ہوئے کھانے ہی پر اکتفا ہوتا تھا لیکن یہاں روزہ دار ہونے کے باوجود ان کے لیے تازہ کھانا بنانا تکلف ہے جس کا اثبات ترجمۃ الباب میں مقصود ہے، بس اسی سے ترجمۃ الباب کے دونوں اجزاء کا ثبوت ہو جاتا ہے یا پھر دوسرے جز کا اثبات فأکل کی وجہ سے ہوتا ہے کیوں کہ حضرت ابوالدرداء نے صائم ہونے کے باوجود محض حضرت سلمان کی وجہ سے افطار کر لیا تو یہ تکلف ہی ہوا۔
>
> (لامع الدراري ۱۰:۳۶)

(۲۲) حضرت گنگوہیؒ اپنے مختصر کلام میں وہ باتیں بیان کر دیتے تھے، جو طویل کتب تاریخ کا حاصل اور کتب فقہ کا لب لباب ہوتا ہے، نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

" باب التأذين عند الخطبة" حدثنا ......عن الزهري قال سمعت السائب بن يزيد يقول إن الأذان يوم الجمعة كان أوله حين يجلس الإمام يوم الجمعة على المنبر في عهد رسول الله ﷺ وابي بكر وعمر فلما كان في خلافة عثمان وكثروا أمر عثمان يوم الجمعة بالأذان الثالث فأذن به على الزوراء فثبت الأمر على ذلک

"وکثروا" کی تشریح میں حضرتؒ فرماتے ہیں: کہ لوگوں کی کثرت حضرات شیخین کے زمانہ میں بھی تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں حضور ﷺ کی برکت صحبت کے قرب کی وجہ سے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان کے رعب وجلال کی وجہ سے لوگ جمعہ میں سستی نہیں کرتے تھے، اس لیے تیسری اذان (یعنی اذان اول) کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور حضرت عثمانؓ چوں کہ باحیا اور نرم تھے تو لوگ ان کے زمانہ میں وہ ہمت کر لیتے تھے جس کی ہمت حضرت عمرؓ کے زمانہ میں نہ ہوسکتی تھی، اور کچھ ایسا تساہل کر لیتے تھے جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں نہیں ہوسکتا تھا، اوران کے زمانہ میں امور دینیہ میں کچھ سستی رونما ہو چکی تھی، تو انھوں نے تیسری اذان کو بڑھا دیا۔

پھر حضور اقدس ﷺ اور حضرات شیخین کے زمانہ میں پہلی اذان حاضرین اور بقیہ غائبین کی اطلاع کے مقصد سے ہوتی تھی، تو اس میں رفع صوت کی ضرورت ہوتی تھی جو ضرورت شروع میں ایک اذان بڑھا دینے سے اب نہ رہی، اس لیے ہمارے زمانہ میں دوسری اذان میں صرف اتنی ہی آواز بلند کی جاتی ہے جو حاضرین کی اطلاع کے لیے کافی ہو کیوں کہ غائبین کو پہلی اذان سے اطلاع ہو چکنے کی وجہ سے اب اطلاع دینے کی ضرورت نہیں رہی، نیز اس کو بلند مقام پر چڑھنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، کچھ لوگ آج بھی یوں سمجھتے ہیں کہ اذان ثانی میں سنت طریقہ یہ ہے کہ اس کو اسی طرح ادا کیا جائے جیسا

حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں کیا جاتا تھا، حالاں کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ علت ختم ہو چکی ہے کیوں کہ پہلی اذان اس کے قائم مقام ہو چکی ہے۔

(لامع الدراري ٤: ٦٧، ٦٨، ٦٩)

(۲۳) "باب صلاة الطالب والمطلوب راكبا وإيماءً" امام بخاریؒ نے اس باب کے تحت صرف اتنا ہی نقل فرمایا ہے کہ: " وقال الوليد: ذكرت للأوزاعي صلاة شرحبيل بن السمط وأصحابه على ظهر الدابة، كذالك الأمر عندنا إذا تخوف الفوت، واحتج الوليد بقول النبي "لايصلين احد العصر إلافي بني قريظة" اور پھر اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا۔

اس باب میں جس مسئلہ کو ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ، حالت خوف میں سواری پر سوار ہونے کی حالت میں اشارہ سے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس میں تقریباً تمام ائمہ یہ فرماتے ہیں کہ: اگر انسان سواری پر مطلوب ہے یعنی دشمنوں سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے تو اس کا نماز پڑھنا صحیح ہے؛ لیکن اگر طالب ہے تو جمہور کے یہاں اس کی نماز صحیح نہیں، البتہ بعض ائمہ یہ فرماتے ہیں کہ: طالب ہے لیکن دشمنوں کا کمین گاہ میں چھپے ہوئے ہونے کا اندیشہ ہے، یا اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر اتنا دور ہو چکا ہے کہ اندیشہ ہو کہ پیچھے سے دشمن حملہ کر سکتا ہے، یا دشمنوں کے اپنے ہاتھوں سے بچ نکلنے کا اندیشہ ہو تو پڑھنا جائز ہے، اب امام بخاریؒ نے جو ذکر کیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا وہ اوزاعی کی بات کی تائید میں ہیں یا پھر جمہور کے ساتھ ہیں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے، اسی لیے کرمانیؒ نے کہا ہے: "هذا الحديث من مضائق الكلام ومضايق الأفهام ومزالق الأقدام" بہرحال اگر امام بخاریؒ بنی قریظہ والی روایت سے یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ صحابۂ کرام نے طالب ہونے کے باوجود رکباناً نماز پڑھی ہے، تو یہ استدلال چوں کہ مسلک حنفیہ کے خلاف ہے؛ اس لیے حضرت گنگوہیؒ امام بخاریؒ کی ان دونوں دلیلوں کا جواب اختصار کے ساتھ اس حسن وخوبی سے دیتے ہیں کہ آپ اگر بخاری کی تمام شروحات کو چھان لو گے تو آپ کو وہ تشفی نہ ہوگی جو حضرت گنگوہیؒ کے مختصر سے کلمات سے ہو جاتی ہے؛ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمام شروحات

،روایات اور مخالفین کے استدلالات کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت گنگوہیؒ نے ان مختصر کلمات میں تمام مسائل حل کردیے، اور احناف کے مسلک کی تائید فرمادی، اب حضرت گنگوہیؒ کا کلام سنیے:

شرحبیل بن السمط اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ امام بخاریؒ نے اس طور پر مکمل ذکر نہیں فرمایا کہ ان کا طالب یا مطلوب ہونا معلوم ہوجائے، (اس لیے اس سے استدلال صحیح نہیں) پھر بنی قریظہ کی طرف کوچ کرنے والے صحابۂ کرامؓ کے واقعہ سے استدلال کرنا تام نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ استدلال موقوف ہے اس بات کے ثبوت پر کہ انھوں نے سوار ہونے کی حالت میں نماز پڑھی ہے، حالاں کہ یہ (کسی بھی روایت سے صراحۃً) ثابت نہیں، صرف اتنا ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے راستہ میں نماز پڑھی، اور ظاہر کا تقاضہ یہ ہے کہ انھوں نے سواری سے اتر کر نماز پڑھی ہے؛ اس لیے کہ اگر وہ سواری پر اشارہ سے نماز پڑھتے تو ان کے ساتھیوں کو جنھوں نے نکیر کی اس کا پتہ بھی نہ چلتا، اور اگر بالفرض یہ ثابت ہوجائے کہ انھوں نے سواری کی حالت میں اشارہ سے نماز پڑھی تو احتمال ہے کہ ان کو بعد میں نماز کے لوٹانے کا حکم دیا گیا ہو، اور اگر بالفرض یہ بھی مان لیا جائے کہ ان کو اعادہ کا حکم نہیں دیا گیا (تو بھی استدلال صحیح نہیں) اس لیے کہ نص کے سمجھنے میں ان سے اجتہادی غلطی ہوئی، اور ان کی اپنی اجتہادی رائے کے لحاظ سے نماز صحیح واقع ہوئی تھی۔ (لامع الدراری ٤: ۱۱۲-۱۱۹)

(۴۳) امام بخاری نے کتاب الرقاق میں "باب قول النبي بعثت انا والساعة كهاتين" کے تحت بطور فصل ایک باب بلا ترجمہ ذکر فرمایا ہے اس کے تحت ذیل کی روایت بیان فرمائی ہے:

عن ابي هريرة رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ قال لا تقوم الساعة حتى تطلع الشمس من مغربها فإذا طلعت فرا ها الناس امنوا اجمعون فذلك حين لا ينفع نفساً ايمانها لم تكن آمنت من قبل أو كسبت في ايمانها خيراً ولتقومن الساعة وقد نشر الرجلان ثوبهما

بينهما فلا يتبايعانه ولا يطويانه ولتقومن الساعة وقد انصرف الرجل بلبن لقحته فلا يطعمه ولتقومن الساعة وهو يليط حوضه فلا يسقي فيه ولتقومن الساعة وقد رفع أحدكم أكلته إلى فيه فلا يطعمها.

اس روایت کو پڑھ کر ایک سوال اکثروں کے دلوں میں اٹھتا ہے، کہ حضرت آدم علیہ السلام سے قیامت تک ہزاروں خوارق عادت چیزیں رونما ہو چکیں، لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ اس خارق عادت چیز کو دیکھ کر تمام اہل زمین ایمان لے آئے ہوں، آخر طلوع شمس من المغرب میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ اس کو دیکھ کر تمام ایمان لے آئیں گے، اس سوال کا جواب کسی بھی شارح حدیث نے نہیں دیا کہ ایسا کیوں ہوگا؟ حضرت گنگوہیؒ اس کا سبب اور حکمت بیان فرماتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> شیاطین اور گمراہی پھیلانے والے اغوا اور اضلال سے خود اس لیے رک جائیں گے کہ اب ان کا مشن پورا ہوا، اب ان کے اغوا اور اضلال کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیوں کہ اب اگر کوئی ایمان لاتا ہے تو اس کا ایمان معتبر نہیں، نیز قرب قیامت کا یہ واقعہ قیامت کے ساتھ ملحق ہے کہ اب مغیبات منکشف ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے مکلفین کے دلوں پر غفلت کو طاری کرتا تھا جو ایمان سے رکنے کا سبب ہوتی تھی، اب وہ حکمت باقی نہیں رہے گی، اس غفلت کا پردہ تھوڑی دیر کے لیے لوگوں کے دلوں سے اٹھا دیا جائے گا، لہٰذا اب وہ حق قبول کرلیں گے، لیکن اب ان کے ایمان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔
>
> (لامع الدراري ۱۰: ۹۳).



امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی حدیثی خدمات

از: مولانا عبدالحفیظ رحمانی

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ۶ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء کو قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں ہوئی، سات سال کی عمر میں آپ کے والد ماجد مولانا ہدایت احمد صاحب کا گورکھپور میں انتقال ہوگیا، اور آپ کم سنی میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئے، تعلیم وتربیت کی ذمہ داری آپ کے ماموں مولانا محمد تقی نے سنبھالی، وہ اپنے ساتھ کرنال لے گئے، مولوی محمد تقی بسلسلۂ ملازمت یہیں مقیم تھے، انھوں نے بقدر ضرورت خود ہی فارسی پڑھائی، فارسی سے فراغت کے بعد آپ کے دادا قاضی پیر بخش نے اپنے آبائی وطن رامپور کے ایک باصلاحیت استاذ مولانا محمد بخش کے سپرد فرمایا، انہوں نے ہدایۃ النحو تک عربی کی ابتدائی تعلیم دی، پھر انہی کے مشورہ سے دادا قاضی پیر بخش نے اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی بھیج دیا۔

دہلی میں قدیم عربک کالج میں ۱۲۶۱ھ میں داخلہ ہوا، اس کالج میں ایک سال پہلے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ داخلہ لے چکے تھے، حضرت نانوتوی کافیہ پڑھ رہے تھے، حضرت گنگوہیؒ کی استعداد سے مطمئن ہوکر مولانا مملوک العلی صاحب نے کافیہ کی جماعت میں شامل کردیا،

اس طرح حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی ہم سبق ہو گئے۔

حضرت گنگوہی نے بیشتر کتابیں مولانا مملوک العلی نانوتوی سے پڑھیں، چند کتابیں مفتی صدرالدین آزردہ صدرالصدور اور قاضی احمدالدین پنجابی سے پڑھیں، علوم وفنون کی کتابوں سے فراغت کے بعد علم حدیث کے لیے خانوادۂ ولی اللّٰہی کے فیض یافتہ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے چشم وچراغ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں بہ نیت ہجرت مکہ مکرمہ جا چکے تھے اور حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب پابہ رکاب تھے، دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان کے ساختہ وپرداختہ اور فیض یافتہ صرف باپ بیٹے یعنی حضرت شاہ ابوسعید مجددی اور حضرت شاہ عبدالغنی رحمہما اللہ رہ گئے تھے، حضرت امام ربانی، حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تحصیل حدیث کے لیے حاضر ہوئے تو ان ہی کے ہو کر رہ گئے، حضرت شاہ صاحب سے امام ربانی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے صحاح ستہ پڑھیں، فراغت کے بعد حضرت شاہ صاحب نے حسب دستور سند حدیث عطا فرمائی، اس وقت امام ربانی کی عمر اکیس سال ہو چکی تھی۔

سند حدیث حاصل کر کے امام ربانی اپنے وطن مالوف گنگوہ تشریف لائے، چوں کہ آپ نے تعلیم پورے ذوق وشوق اور خدمت دین کے لیے حاصل کی تھی اس لیے ملازمت کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور کسب معاش کے لیے طبابت کا پیشہ اختیار کیا لیکن تدریس جو فطری ذوق بن چکی تھی، اس کے لیے بھی اوقات مخصوص کر لیے اور بغیر کسی معاوضہ کے تدریس کا آغاز کر دیا، امام ربانی کے لیے تدریس کوئی نیا کام نہیں تھا کہ انھوں نے اس جولانگاہ میں پہلی مرتبہ قدم رکھا ہو، زمانۂ طالب علمی میں بہت سے طلبہ کو ان کی درخواست پر پڑھایا کرتے تھے، اس دور کی تدریس نے آپ کو آزمودہ کار مدرس بنا دیا تھا، تدریس کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ علم میں وسعت کے ساتھ پختگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت کے ساتھ افہام وتفہیم پر دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔

چنانچہ امام ربانی نے پورے اعتماد کے ساتھ تدریس کا آغاز فرما دیا، زمانۂ طالب علمی میں

جن طلبہ کو آپ نے پڑھایا تھا ان میں ملا محمود کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے، یہ وہی ملا محمود ہیں جو دارالعلوم دیو بند کے پہلے مدرس مقرر ہوئے تھے، ان کے نامور شاگردوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی کا نام نامی کافی ہے۔ یہاں گنگوہ میں تدریس کے ابتدائی زمانہ میں جن طلبہ نے تعلیم حاصل کی، ان میں مولانا ابوالنصر اور مولانا ابوالقاسم کے نام قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے امام ربانی کے زمانہ طالب علمی میں بھی پڑھا تھا، امام ربانی کا حلقۂ درس روز بہ روز وسیع ہوتا رہا اور ملک کے دور دراز علاقوں سے طلبہ کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا تھا، ۱۳۱۳ھ تک یہ حلقۂ درس پوری آب وتاب کے ساتھ قائم رہا، ۱۳۱۳ھ میں بینائی کمزور ہوگئی اور یہی سن تدریس کا آخری سال تھا اس کے بعد بینائی ختم ہونے کی وجہ سے تدریسی سلسلہ تو بند ہوگیا، لیکن زندگی کے دیگر مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا۔

یہ حقیقت ہے کہ امام ربانی کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو کا تقاضا ہے کہ اس پر گفتگو کی جائے لیکن نہ اس کا موقعہ ہے اور نہ عنوان ہی اس کی اجازت دیتا ہے، اس لیے کارناموں کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے امام ربانی کی حدیثی خدمات پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

۱۸۲۹ء امام ربانی کی ولادت کا سال ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس وقت چڑھتی جوانی تھی، ملک کے دروبست پر اسی کا قبضہ تھا، مغل سلطنت برائے نام تھی اور وہ بھی دہلی اور لال قلعہ تک محدود تھی، پورا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں تھا، روز بہ روز اس کی غاصبانہ روش میں تیزی آرہی تھی، اس کے خلاف آواز اٹھانے کا کسی میں یارا تھا اور نہ ہمت تھی، امام ربانی جب دہلی میں زیر تعلیم تھے گو اس وقت مغل حکومت لال قلعہ میں محصور تھی پھر بھی دلی میں معتبر و متبحر علماء اسلام کی کمی نہیں تھی، علمی وادبی مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں، ان میں علمی تبادلۂ خیال ہوا کرتا تھا اس کے اثرات پورے ملک پر تھے، مسلمانوں میں نہ فرقہ بندیاں تھیں اور نہ مسلکی تشدد کہیں سے رونما تھا۔

لیکن ۱۸۵۷ء میں جب مغل سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا، آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر فرنگیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر رنگون جلاوطن کر دیئے گئے اور شاہزادوں کے سروں کو خوان میں سجا کر بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کیا گیا تو یہ امید بھی ٹوٹ گئی کہ مستقبل میں اس خاندان کا کوئی

جیالا اپنی عظمت رفتہ کو یاد کر کے حکومت کی بازیابی کے لیے جرأت وشجاعت کی داد دے گا، اس کا منطقی نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ملت اسلامیہ اپنے مستقبل کے تئیں مایوسی کا شکار ہوگئی اور اس ہراسانی میں ایسی بے لگام ہوگئی کہ نئے نئے نظریات سامنے آنے لگے، عیسائیت نے اپنے پر پرزے نکالے اور حکومت کی شہ پر جارحانہ مسیحی تبلیغ شروع ہوگئی، اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں کا بازار گرم ہوگیا، دوسری طرف شیعیت نے سرابھارا جواب تک کسی غار میں روپوش تھی، ایک تیسرا محاذ شرک وبدعات کا سامنے آکھڑا ہوا، اس نے عقائد اور صحیح اسلامی تعلیمات کو چیلنج کیا اور شرک وبدعات کو فروغ دینے کی ہرممکن جدوجہد کا آغاز کردیا، اس محاذ کو بدایوں اور بریلی نے طاقت بہم پہنچائی، ایک چوتھا محاذ مولانا سید نذیرحسین دہلوی نے کھول دیا، یہ تھا غیر مقلدیت کا آغاز جو جارحانہ انداز سے سامنے آیا، اس نے ائمہ اربعہ کے ساتھ کسی مقلد عالم فاضل کی آبرو باقی نہ رکھی اور ایک نئے مسلک نے جنم لے لیا، بہت بعد میں اس فرقہ کے لوگوں نے اپنا نام اہل حدیث تجویز کیا اور باضابطہ مولانا محمد حسین بٹالوی نے انگریزی حکومت سے اپنی جماعت کا نام اہل حدیث منظور کرایا۔

پانچواں محاذ انگریزی حکومت کی بڑھتی ہوئی چیرہ دستیوں اور اس غاصبانہ حکومت کے خلاف نبرد آزمائی تھی، یعنی جہاد حریت، اسی ظالم وغاصب حکومت کے خلاف حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاد کا فتوی دیا تھا اور ملک میں اس فتوے نے جہاد حریت کی لہر پیدا کردی تھی اور جلد ہی حضرت شاہ اسماعیل شہید دہلوی، حضرت سید احمد شہید بریلوی نیز دیگر رفقاء جماعت نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتوی کو عملی جامہ پہنا دیا، مشہد بالاکوٹ ہمیشہ اس کی گواہی دیتا رہے گا، اور جب ضرورت ہوئی تو حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے واشگاف الفاظ میں جہاد کا فتوی صادر فرما کر اپنی عزیمت پر مہر تصدیق ثبت کردی، حضرت گنگوہی نے اپنے اکابر کے نقش قدم پر میدان کارزار بھی گرم کیا اور شاملی میں انگریزی فوج سے نبرد آزمائی میں تحصیل پر مجاہدین نے قبضہ کرلیا، حضرت حافظ ضامن علی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی معرکہ آرائی میں جام شہادت نوش کیا تھا، معرکہ آرائی ختم ہوئی تو گرفتاری عمل میں آئی اور چھ مہینے مظفر نگر جیل میں گزارے، مقدمہ

میں ثبوت بہم نہ پہنچنے پر رہائی ہوگئی، یہ وہ پانچ محاذ تھے جن پر امام ربانی نبرد آزما تھے، ان محاذوں پر امام ربانی کو کن دشواریوں سے گذرنا پڑا، تفصیل طلب ہے، البتہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس چومکھی جنگ کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، آپ نے درس نظامی کی سب متداول کتابیں پڑھائیں، عمر گرامی کے آخری حصہ میں صحاح ستہ کا درس اس وقت تک دیا جب تک بینائی نے ساتھ دیا ۱۳۱۴ھ میں تدریسی سلسلہ بند ہوگیا، صرف بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری رہا اور مسترشدین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا، ان ارادتمندوں میں ہر زمرہ اور ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے، سرفہرست تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی اور حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری ہیں، ان حضرات گرامی کے علاوہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی وغیرہم ہیں جن کی تعداد اکتیس ہے، ان مجازین میں اکثر وبیشتر علماء کبار ہیں، یہ امام ربانی کی عظمت ومقبولیت کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔

گوناگوں مصروفیات میں امام ربانی تصنیف وتالیف کے لیے وقت نہیں نکال سکے، پھر بھی چند چھوٹی بڑی کتابوں نے یہ ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ جو کچھ ہے وہ ضخیم مجلدات پر بھاری ہے، ہم ذیل میں ان کتابوں کا تعارف پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں، آخر میں امام ربانی کی حدیثی خدمات پر روشنی ڈالی جائے گی، انشاء اللہ۔

۱۔ سبیل الرشاد

یہ کتاب کسی ایک موضوع پر مرتب تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک سائل کے شکوک وشبہات اور احناف پر اعتراضات کا جواب ہے، سائل کے سوالات کتاب میں مندرج نہیں ہیں لیکن جوابات سے سوالات خود بخود متعین ہوجاتے ہیں، جواب کا اسلوب محققانہ اور محدثانہ ہے، کوئی جواب قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبویہ سے خالی نہیں ہے، جو گفتگو کی گئی ہے وہ حضرات محدثین کے اصول وضوابط کے مطابق ہے، مثال کے طور پر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تابعیت پر سائل کو اطمینان نہیں ہے، امام ربانی نے اس شبہ کو دور کرتے ہوئے پہلے صحابی کی متفق علیہ تعریف بیان کی اور اس کے بعد تابعی کی تعریف بیان

کرتے ہوئے امام اعظم کی تابعیت پر دارقطنی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی روایات پیش کی ہیں۔

دارقطنی نے فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ سے کسی صحابی کی ملاقات نہیں ہوئی البتہ انہوں نے حضرت انس بن مالک کو دیکھا ہے ان سے سماع حدیث نہیں کیا ہے۔

دوسری روایت حافظ ابن حجر عسقلانی کی ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں کہ" امام ابوحنیفہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے، کیوں کہ آپ کوفہ میں ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور اس وقت کوفہ میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی موجود تھے جن کا انتقال بعد میں ہوا، اسی طرح بصرہ میں حضرت انس بن مالک موجود تھے، ان کا انتقال ۹۰ھ یا اس کے بعد ہوا ہے۔

ان دونوں روایات کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ امام اعظمؒ تابعی تھے، اور اگر اس کے باوجود کسی کو امام اعظم کی تابعیت میں شبہ ہو تو تبع تابعی ہونے میں تو کسی کو اعتراض نہیں ہے، امام ربانی نے فرمایا پھر بھی آپ خیر القرون میں ہیں، حدیث میں جو خیر القرون فرمایا گیا ہے اس میں تبع تابعین کا دور بھی شامل ہے، یہ ہے امام ربانی کا محدثانہ اسلوب تحریر۔

محدثین کا ایک اصول ہے کہ اگر کوئی حدیث ضعیف ہے لیکن متعدد طرق سے اس کی شہادت موجود ہے تو وہ حدیث حسن لغیرہ ہوگی، امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے اَصحابی کالنجوم پر کیے گئے سوال کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر جواب دیا ہے کہ یہ روایت صحاح ستہ میں نہیں ہے، رزین میں ہے، حافظ ابن حجر نے اس کی تضعیف کی ہے لیکن چند صحیح احادیث اس کی شاہد ہیں، پس یہ سب طرق جمع ہو کر یہ حدیث حسن لغیرہ ہوگئی۔

اس حدیث سے امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے تقلید کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور استدلال کے طور پر یہ تاریخ بھی دہرائی ہے کہ تقلید شخصی اور غیر شخصی نیا کام نہیں ہے، تقلید صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے عہد مسعود سے جاری ہے، شخصی بھی اور غیر شخصی بھی۔

آیت کریمہ فاسئلو اھل الذکر إن کنتم لاتعلمون سے استدلال کرتے ہوئے حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ ہر ناواقف کو حکم شرعی معلوم کرنا واجب ہے خواہ فرد واحد سے مسئلہ معلوم کرے

خواہ جماعت سے، پہلی صورت تقلید شخصی کی ہے اور دوسری صورت تقلید غیر شخصی کی ہے اور یہ دونوں صورتیں اسی آیت کریمہ سے سامنے آتی ہیں، کیوں کہ آیت میں لفظ اُھل الذکر آیا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، اس میں دلیل طلب کرنے کا اشارہ تک موجود نہیں ہے۔

اسی طرح تقلید کے استدلال میں آیت کریمہ یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم پیش فرمائی ہے کہ اولی الامر اپنے عموم کی وجہ سے خلفا، علما، وفقہا سب کو شامل ہے، حضرت جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عباس، عطاء، مجاہد، ضحاک، ابوالعالیہ، حسن بصری نیز دیگر صحابہ، تابعین اور تبع تابعین نے اولی الامر سے علماء فقہاء ہی کو مراد لیا ہے، مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنی تفسیر میں قاضی شوکانی، ابن کثیر، قاضی بیضاوی اور مدارک وغیرہ کے حوالہ سے کہا ہے کہ اولی الامر سے مراد علماء فقہاء ہیں۔

اور پھر یہ تاریخی حقیقت کیونکر نظر انداز کی جاسکتی ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام اسلامی مملکت میں پھیل گئے تھے، متعدد شہروں اور آبادیوں میں ان کا قیام تھا، یہی حضرات مرجع خلائق تھے، شرعی احکام لوگ انہی سے دریافت کرتے تھے اور اسی پر عمل کرتے تھے، ایک صحابی سے حکم شرعی دریافت کرنے کے بعد کسی دوسرے سے مسئلہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، اسی کا نام تقلید ہے کہ بلا دلیل پوچھے ہوئے مسئلہ معلوم کرلیا جائے اور اسی پر عمل کیا جائے، چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نے اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کے بعد فرمایا کہ:

> ''پس ہر کور بصیرت پر روشن ہوجاتا ہے کہ خیرالقرون میں تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں بلانکیر جاری رہی، صحابہ، تابعین وتبع تابعین کے طبقات میں کسی نے تقلید شخصی کو حرام اور شرک یا مکروہ یا بدعت نہیں کہا اور کیوں کر ہوسکتا ہے کہ جس امر کو کتاب وسنت فرض وواجب فرمادے، اس کو کوئی اہل حق رد کردے، یہ کام بدون بددین جاہل کے کوئی نہیں کرسکتا''۔

(سبیل الرشاد ص ۳۸)

اسی طرح حضرت امام ربانی نے اس کتاب میں قیاس پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے اور قیاس کے اقسام بتانے کے بعد نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود میں حضرات صحابہ نے جو قیاس کیے ہیں، ان کے چند حوالے پیش فرمائے ہیں، مثلاً بنوقریظہ کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک جماعت کو بھیجا تھا اور فرمایا تھا کہ بنوقریظہ پہنچنے سے پہلے راستہ میں عصر کی نماز نہ پڑھی جائے، عصر کا وقت تنگ ہو گیا تو چند صحابہ نے عصر کی نماز بنوقریظہ پہنچنے سے پہلے پڑھ لی اور چند لوگوں نے نہیں پڑھی، واپسی کے بعد جب معاملہ بارگاہ رسالتمآب میں پیش ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جماعت کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا یعنی دونوں کی تقریر فرمائی، ایک جماعت کی نظر ممانعت کی علت پر تھی اور ایک کی ظاہر نص پر۔

دوسری نظیر قیاس کے سلسلہ میں یہ تحریر فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ فلاں شخص پر زنا کی تہمت ہے اس کو قتل کر دو، حضرت علیؓ نے اس کو قتل نہیں کیا اور واپس آ کر یہ بتایا کہ وہ برہنہ غسل کر رہا تھا، میں نے اس کو دیکھا کہ وہ مقطوع الذکر تھا، اس لیے میں نے قتل نہیں کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویب فرمائی، حضرت علیؓ نے علت پر نظر ڈال کر فیصلہ کیا تھا اور ظاہر نص پر عمل نہیں کیا۔

اسی ضمن میں حضرت امام ربانی نے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی فرمایا کہ ظاہر حدیث پر عمل ہر جگہ نہیں ہوتا، اس کے متعدد وجوہ اور اسباب ہیں جب تک ان کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ نہیں کیا جائے گا تو فیصلہ غلط ہوگا، چنانچہ بطور استشہاد آپ نے ترمذی شریف کی ایک روایت سحری کھانے کے سلسلے میں پیش فرمائی جس پر کسی کا عمل نہیں ہے۔

اس کتاب میں قرأۃ خلف الامام پر امام ربانی نے طویل گفتگو فرمائی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ یہ مسئلہ قدیم سے مجتہد فیہ اور مختلف فیہ ہے، بحث میں دلائل دونوں فریق کے ہیں، ہر ایک حدیث کو سامنے رکھ کر تطبیق دی گئی ہے، یہی امام ربانی کا کمال ہے کہ وہ متعدد احادیث کو جو باہم متضاد و مختلف نظر آتی ہیں، ان میں تطبیق کی ایسی صورت پیدا کرتے ہیں جو مسئلہ کی حقیقت کو واضح کر دیتی ہے،

چنانچہ قرأت کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت لا صلوۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب فصاعداً پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دیگر روایات میں فصاعداً کا لفظ موجود نہیں ہے لیکن محدثین کا اصول ہے کہ ثقہ کی زیادتی حجت ہوتی ہے، اس لیے فصاعداً کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سفیان سے امام زہری نے بھی فصاعداً کی زیادتی کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے، اس روایت کو سامنے رکھنے کے بعد مسئلہ صاف ہو گیا کہ قرأۃ خلف الامام کے تعلق سے جتنی روایات ہیں وہ مقتدی کے لیے نہیں بلکہ امام اور منفرد کے لیے ہیں کہ وہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھیں گے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں وما زاد کا لفظ موجود ہے اسی طرح ابوسعید کی ایک روایت میں وما تیسر موجود ہے، ان روایات نے واضح کر دیا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کا تعلق امام اور منفرد ہی سے ہے مقتدی سے نہیں ہے ورنہ فصاعداً، وما زاد اور ما تیسر کی کیا تاویل کریں گے؟ احناف کے وجوہ ترجیح کیا ہیں وہ تفصیل طلب ہیں، اس تعارف میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) اوثق العری فی تحقیق الجمعۃ فی القری:

چالیس صفحات کا یہ رسالہ اصل میں ایک سائل قاضی علیم الدین ساکن شاملی ضلع مظفرنگر کے جمعہ سے متعلق سوالات کا جواب ہے، امام ربانی نے احادیث صحیحہ اور آثار موقوفہ سے ثابت کیا ہے کہ جمعہ کی نماز شہر اور بڑے گاؤں میں ہی درست ہے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی نماز درست نہیں ہے۔

کتاب کی ابتداء میں ایک فتویٰ نقل کیا گیا ہے، اس پر تین علماء کے دستخط ہیں، سید محمد نذیر حسین، سید محمد عبدالسلام غفرلہ سید محمد ابوالحسن، یہ مؤیدین ہیں، ابو محمد عبدالحق اعظم گڑھی صاحب کے فتوی کے، اسی کی تائید وتصویب تلطف حسین صاحب نے بھی کی ہے، اس فتوی کے مندرجات کا امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے محدثانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے پہلے تو یہ ثابت فرمایا کہ جمعہ کی نماز مکہ مکرمہ میں فرض ہوئی لیکن

عدم استحکام کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں جمعہ کی نماز نہیں پڑھی گئی، البتہ مدینہ منورہ میں جب مسلمانوں کی معتد بہ جماعت ہوگئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ منورہ میں جمعہ قائم کیا گیا۔

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو قبا میں کم از کم چودہ دنوں قیام کیا لیکن آپ ؐ نے قبا میں جمعہ کی نماز نہیں پڑھی، اسی طرح عوالی مدینہ میں بھی جمعہ کی نماز نہیں پڑھی گئی، ہاں مدینہ سے باہر بحرین کے قریہ جواثی میں جمعہ قائم ہوا، لیکن جواثی چھوٹا گاؤں نہیں شہر تھا، حضرت گنگوہیؒ نے اس کے شہر ہونے پر متعدد ثبوت بہم پہنچائے ہیں اس لیے جواثی میں قیام جمعہ کو دلیل میں پیش کرنا کہ ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں جمعہ درست ہے، سراسر مغالطہ ہے، حضرت گنگوہیؒ نے اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرمایا لیکن اس طویل مدت میں عوالی مدینہ میں جمعہ کی نماز نہیں پڑھی گئی، نہ ہی باشندگان عوالی کو جمعہ نہ پڑھنے پر سرزنش کی گئی، نہ ہی عوالی کے باشندوں نے تارکین جمعہ پر نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وعیدیں فرمائی ہیں ان کا مصداق خود کو سمجھا، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ جمعہ کی نماز ہم پر فرض ہی نہیں ہے، ہاں عوالی کے باشندے ایسا ضرور کرتے تھے کہ انھوں نے مدینہ منورہ میں جا کر جمعہ پڑھنے کی باری مقرر کر لی، کبھی چند افراد جاتے تو دوسرے جمعہ کو چند دیگر افراد جاتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے صراحتہ اس کو بیان فرمایا ہے، بخاری کتاب الجمعہ میں یہ تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریر کے آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشہور اثر "لاجمعة ولا تشريق ولا فطر ولا اضحى إلافي مصر" پر جامع تفصیلی گفتگو کی ہے، معترضین اس اثر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ احناف کے اصول کے مطابق یہ اثر حجت نہیں ہے کیوں کہ اس کے خلاف حدیث مرفوع موجود ہے، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ جس حدیث موقوف میں قیاس کو دخل ہوتا ہے وہ صحابی کا قول ہوتا ہے، ایسے ہی موقوف کو صاحب فتح القدیر حدیث مرفوع کے مقابلہ میں معتبر نہیں مانتے، اور جو حدیث موقوف قیاس سے خالی ہو یا وہ حدیث مرفوع کی مؤید وشید ہو تو وہ حدیث موقوف بحکم مرفوع ہوتی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر قسم ثانی کے زمرہ میں ہے اور اعلیٰ درجہ کا مرفوع ہے۔

اسی محدثانہ اسلوب میں جواب اختتام پذیر ہوا، اوثق العری کی اشاعت کے بعد مئو کے مولانا ابوالکارم نے کسر العری اور مولانا محمد سعید بنارسی نے ہدایۃ الوری کے نام سے بیس صفحات کے کتابچے شائع کیے اور انداز تحریر جارحانہ اختیار کیا، ان کتابچوں کا جواب نہایت تفصیل سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے شائع کیا، اپنی کتاب کا نام رکھا، احسن القری فی توضیح اوثق العری، یہ کتاب ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب نہایت عالمانہ اور محدثانہ اسلوب میں ہے۔

۳- الرأي النجيح:

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ بھی ایک مستفتی کے جواب میں ہے اور فتاوی رشیدیہ میں شامل ہے، بعد میں اس کی اشاعت رسالہ کی شکل میں ہوئی، اس رسالہ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے رکعات تراویح کے موضوع پر محدثانہ گفتگو کی ہے، پہلے فریقین کے ثبوت ودلائل پیش فرمائے ہیں، پھر تراویح اور تہجد کے فرق کو واضح کیا ہے کہ دونوں الگ الگ نمازیں ہیں، تہجد کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے اور تراویح کی نماز احادیث رسول سے ثابت ہے، تہجد کی نماز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخر شب میں پڑھتے تھے اور تراویح کی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اول شب میں ادا فرمائی، تراویح کی نماز باجماعت ادا فرمائی، جب کہ تہجد کی نماز تنہا ادا فرماتے تھے، جماعت کے لیے کبھی دعوت نہیں دی، تراویح کی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دنوں تک پڑھائی، البتہ رکعات کا تعین کرنے میں اختلاف ہے، اس لیے کہ ان تین دنوں کی نماز تراویح میں رکعات کا ذکر نہیں ہے، راوی حضرت ابوذرؓ ہیں، مشکوۃ میں یہ حدیث، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ کے حوالہ سے منقول ہے۔

البتہ مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک روایت میں بیس رکعات کا تعین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس رکعات تراویح کی نماز پڑھائی مگر یہ روایت ضعیف ہے، اس پر کلام کرتے ہوئے حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حدیث گو ضعیف ہے لیکن آثار صحابہ سے اس کی تائید ہوتی ہے، حضرات صحابہ نے بیس رکعات تراویح تسلسل کے ساتھ پڑھی ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر بیس رکعات پڑھتے تھے۔

اس مسئلہ میں بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے محدثانہ اسلوب سے ذرا بھی انحراف نہیں کیا ہے، حسب دستور فریقین کے دلائل لکھنے کے بعد احادیث میں تطبیق وجمع کی صورت سامنے رکھ دی ہے، یہ ایک ایسی علمی ومحدثانہ تحریر ہے جس میں جمع وتطبیق کے اصول وضوابط واضح طور پر نظر آتے ہیں، کسی حدیث کو ترک کردینے اور کسی حدیث کو اختیار کر لینے کا کیا اصول ہے، اسی طرح راجح ومرجوح کا فیصلہ کس اصول کے تحت ہوگا، یہ سب کچھ اس رسالہ میں موجود ہے، انہی محدثانہ اصولوں کے پیش نظر بیس رکعات تراویح پڑھنے کا فتوی دیا گیا ہے، البتہ جن لوگوں نے بیس رکعات تراویح کو بدعت کہنے پر اصرار کیا ہے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا لب ولہجہ ان کے بارے میں کسی قدر تیز ہے، میں اس تیزی کو عین اسلامی فطرت کے مطابق سمجھتا ہوں، جس عمل کو صحابۂ کرام نے پورے وثوق واعتماد کے ساتھ بلا اختلاف کیا ہو اس کو بدعت کہنے کی جرأت کرنا حضرات صحابہ کی عدالت وثقاہت پر انگلی اٹھانا ہے، حضرات صحابہؓ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سنت نبویہ کے خلاف کوئی عمل کریں گے۔

حضرت گنگوہی نے متعدد روایات جو باہم مختلف نظر آتی ہیں، ان میں تطبیق کی صورت یہ پیدا کی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ تین وقتوں میں تین احکام صادر فرمائے ہوں، پہلے آٹھ رکعات تراویح اور تین وتر کا حکم دیا ہو، پھر اٹھارہ رکعت تراویح اور تین کا حکم دیا ہو، آخر میں بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر کا حکم دیا ہو، اس لیے کسی عدد کا انکار نہیں کیا جاسکتا، تطبیق کی اس صورت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے خلفاء راشدین کی سنت پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے اور حدیث پاک علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين پیش کر کے یہ فرمایا کہ حضرات خلفاء راشدین کامل بیس رکعات تراویح پڑھنے کا تھا اور اسی کا حکم بھی دیا تو اس سے انحراف گویا نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انحراف وانکار ہوا، آخر میں حضرت گنگوہیؒ نے حضرات خلفاء راشدین کی سنت سے کیا مراد ہے؟ وضاحت سے سمجھایا ہے کہ سنت خلفاء سے حدیث میں وہ امر مراد ہے کہ اس کی اصل کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں موجود ہو مگر اس کا شیوع نہیں ہوا، پھر کسی خلیفہ نے اس کا شیوع کیا، اس لیے سنت خلفاء، درحقیقت سنت رسول ہی ہے، کسی سنت کے شیوع پر حضرات

صحابہ کا اس پر متفق ہو جانا اجماع ہے، یہی صورت بیس رکعات تراویح کی ہے اس کو حضرات صحابہ نے قبول کرلیا اور اسی پر اجماع ہے، ظاہر ہے کہ اجماع حجت ہے، لا تجتمع امتي علی الضلالة۔

السرای النجیح کے یہ وہ مباحث ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تفصیل تو کتاب ہی میں ملے گی۔

٤ ۔ هداية المعتدي في قراءة المقتدي:

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب سبیل الرشاد کا تعارف پہلے آچکا ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں بھی وہی محدثانہ اصول ہیں اور احادیث کو پیش نظر رکھ کر بصیرت افروز بحث کی گئی ہے، مدعیان قراءت خلف الامام جو احادیث اپنے ثبوت و دلائل میں پیش کرتے ہیں، حضرت گنگوہی نے محدثانہ نقطۂ نظر سے ان کا علمی جائزہ لیا ہے اور ہر اس حدیث پر بحث کی ہے جو مدعیان قراءت نے پیش کی ہے، آخر میں نتیجہ کے طور پر فرمایا ہے کہ مقتدی کا سورۂ فاتحہ پڑھنا صحیح نہیں ہے، موافق و مخالف احادیث کو سامنے رکھنے کے بعد یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے مدعیان قراءت کے دلائل کو نمبر وار پیش کر کے ہر دلیل کا علمی جائزہ لیا ہے، ان کی تعداد دس ہے، بعض مواقع پر اپنی کتاب ''سبیل الرشاد'' کا بھی حوالہ دیا ہے، ان تمام دلائل کا اس موقعہ پر پیش کرنا وقت طلب ہے، اس لیے نہایت اختصار کے ساتھ حضرت گنگوہی کے محدثانہ جائزہ کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے، مدعیان قراءت نے سورہ مزمل کی آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن کو اپنے استدلال میں پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس عموم میں امام و مقتدی دونوں شامل ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اس آیت سے طویل نماز تہجد منسوخ ہوئی، مختصر نماز تہجد کی فرضیت برقرار رہی، واضح رہے کہ اس وقت تک پانچوں وقت کی نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں، ایک عرصہ کے بعد نماز پنجگانہ فرض ہوئی تو آیت کریمہ فاذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا نازل ہوئی اور مقتدی کی قراءت منسوخ ہوگئی، محمد بن کعب القرظی کی روایت میں اس کی تفصیل موجود ہے، بیہقی اور الدر المنثور میں یہ حدیث دیکھی جاسکتی ہے۔

دوسری دلیل مدعیانِ قراءت کی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو بخاری ومسلم اور دیگر کتب حدیث میں موجود ہے یہ روایت کہیں پوری نقل کی گئی ہے، اور کہیں صرف ایک جزء نقل کیا گیا ہے، اول یا آخر کا، اس لیے جب تک پوری روایت سامنے نہ ہو اس کے کسی ایک جزء کو استدلال میں پیش کرنا غلطی ہے، اسی کے ساتھ روایت کے سیاق وسباق پر بھی نظر ڈالنی پڑے گی کہ وہ ارشادِ نبوت کس موقع پر سامنے آیا، اصول کا تقاضا یہی ہے، حضرت گنگوہی نے ترمذی سے پوری روایت نقل فرما کر اس پر بحث فرمائی کہ اگر صرف عبادہ بن صامت کی روایت پر نظر ڈالی جائے اور دیگر احادیث کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس روایت سے صرف اباحت ثابت ہوتی ہے، امام بخاری نے روایت کے ایک جزء کو نقل فرمایا ہے، جب کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اسی حدیث کو معمر سے نقل کیا ہے اس میں فصاعداً کا لفظ زیادہ ہے، اس زیادتی کو محدثین نے تسلیم کیا ہے، امام بخاری نے اس زیادتی کو تسلیم نہیں کیا ہے لیکن یہ محدثین کے اصول کے خلاف ہے، فصاعداً نے یہ ثابت کر دیا کہ فاتحہ اور دیگر آیات کی قرأت امام ومنفرد کے لیے ہے، مقتدی کے لیے نہیں ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس روایت پر بحث کرتے ہوئے دیگر احادیث کو بھی اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا ہے اور مدعیانِ قراءت کی پیش کردہ احادیث پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مدعیانِ قراءت اپنے موقف کی تائید میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کل صلوۃ لایقرء فیھا بام الکتاب فھی خداج پیش کرتے ہیں، اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت ابوہریرہ، حضرت انس اور حضرت ابوامامہ کی روایات پیش کی ہیں، ان پر محدثانہ گفتگو کرتے ہوئے حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا ہے کہ جب صراحۃً قراءت کی ممانعت دیگر احادیث سے ثابت ہے اور اس میں منازعت کو علت بتایا گیا ہے تو پھر سورہ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، یہ بحث کم وبیش ۱۳ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے ہم نے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے چند اشارات کیے ہیں، ہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت گنگوہی نے چند جلیل القدر صحابہ کرام کے نام گنائے ہیں جو قراءت خلف الامام کے قائل نہیں تھے، اسماء گرامی یہ ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس،

حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو درداء، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہم، نیز حضرت گنگوہی نے علامہ بدرالدین عینی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ۸۰ رصحابہ کرام کا یہی مسلک تھا۔

۵۔ زبدۃ المناسک:

یہ کتاب ۶۰ رصفحات پر مشتمل ہے، اس میں حج کے مسائل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، اور عازمین حج کے لیے ضروری ہدایات فراہم کی گئی ہیں کہ ارادۂ حج کے ساتھ عازمین کو کیا کرنا چاہیے، مثلاً اخراجات سفر، اہل وعیال کے اخراجات کا بندوبست، رشتہ داروں اور احباب ومتعلقین سے ملاقات کرکے تقصیرات کی معافی اور دعاؤں کی درخواست۔

حج کی تینوں اقسام افراد، قران اور تمتع کے لیے الگ الگ فصلوں میں طریقۂ حج اور مسائل بیان کیے گئے ہیں، آخر میں عمرہ کرنے کا بیان ہے، اور اختتام مدینہ منورہ کی حاضری پر ہے، اس میں سلام پیش کرنے کا طریقہ، ادب واحترام کی تاکید، زیارت کا اجر وثواب تفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔

۶۔ ہدایۃ الشیعہ:

یہ کتاب ایک شیعی عالم ہادی علی لکھنوی کے سوالوں کے جواب میں لکھی گئی ہے، ہادی علی لکھنوی نے لکھا تھا کہ علماء اہلسنت اگر میرے سوالات کا تسلی بخش جواب دے دیں گے تو میں اہل سنت والجماعت کا مسلک اختیار کرلوں گا، حضرت گنگوہیؒ نے ان سوالوں کا عالمانہ تسلی بخش جواب تحریر فرمایا ہے، سوالات نئے نہیں وہی فرسودہ سوالات ہیں جن کے جوابات علماء اہلسنت ہر موقعہ پر دیتے رہے ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''تحفۂ اثنا عشریہ'' پہلے ہی اپنا لوہا منوا چکی ہے اور آج تک کسی شیعی عالم سے اس کا جواب نہ بن پڑا، اپنے دور میں حضرت گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بھر پور تعاقب کیا، ان کے بعد حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی نے شیعوں کو لاجواب بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، شیعی عالم نے دس سوالات کیے ہیں، ہر سوال کا جواب حضرت گنگوہی نے اپنے مخصوص عالمانہ اسلوب میں شرح وبسط کے ساتھ دیا ہے۔

استشہاد قرآن مجید کی آیات، احادیث نبویہ اور شیعوں کی مستند کتابوں سے کیا ہے، ہم ذیل میں شیعی عالم کے سوالات نقل کر رہے ہیں، یہ سوالات بجائے خود اس بات کا اعلان ہیں کہ ہم میں تاب مقاومت تو نہیں ہے لیکن ہم اپنے گروہ کو خوش کرنے کے لیے اپنی سی تگ و دو کر رہے ہیں۔

پہلا سوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان ثابت کرنے سے متعلق ہے، دوسرا سوال سقیفۂ بنی ساعدہ سے متعلق ہے کہ اس موقعہ پر اہل بیت کے فضائل ومناقب کیوں نہیں بیان کیے گئے اور الائمة من قریش پر کیوں اکتفا کیا گیا؟ تیسرا سوال میراث سے متعلق ہے کہ حضرت فاطمہ کو باپ کی میراث نہ دے کر بد دیانتی کی گئی ہے، چوتھا سوال امامت سے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ پر رسول کا بھیجنا واجب ہے تو خلفاء کی تقرری بھی منجانب اللہ ہونی چاہیے، کوئی امام بغیر خدا کے حکم کے مقرر ہوا تو اس کی نشاندہی کیجئے، پانچواں سوال تھا کہ عترۃ کو کاذب کہنے اور جاننے والا کافر ہوتا ہے، چھٹا سوال تھا کہ جس نے اپنے امام زمانہ کو نہیں پہچانا وہ کافر مرا، ساتواں سوال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو امام وخلیفہ تھے، ان سے حضرت عائشہؓ جنگ کر کے کافرہ ہوگئیں کیوں کہ وہ مسلمانوں کے خلیفہ بلافصل تھے، آٹھواں سوال، حضرت حسن کے ساتھ ایک لاکھ مسلمان تھے اور ان پر جان فدا کرنے والے تھے مگر بحفاظت خون مسلم حضرت معاویہ سے صلح کر لی، حضرت حسین نے مددگار نہ پانے کے باوجود شہادت پائی، سنی ان کو امام نہیں مانتے، جب کہ خلفائے ثلاثہ ظالم تھے، نواں سوال، قرآن کی آیت نؤمن ببعض ونکفر ببعض کا کیا مطلب ہے؟ دسواں سوال، آیت ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہے سنی عام کیوں کہتے ہیں؟

سوالات کس قدر بودے اور فرسودہ ہیں وہ جگ ظاہر ہیں، اس کے باوجود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے عالمانہ جوابات دے کر شیعوں کے منہ بند کر دیئے، چوں کہ جوابات کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا اسلوب محققانہ اور عالمانہ ہے، احادیث پر بحث وتحقیق کی ان جوابات میں ضرورت نہیں تھی، اس لیے ان کے اختصار کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اگر محدثانہ رنگ کی گفتگو ہوتی تو ہم ضرور اختصار کو پیش کرتے ہوئے اس اسلوب کو واضح کرتے۔

اسی طرح حضرت گنگوہیؒ کی ان دو کتابوں کا تعارف بھی یہاں پیش نہیں کیا جا رہا ہے جو حضرت گنگوہی کی طبع زاد تصانیف نہیں ہیں بلکہ ترجمے ہیں، ان تراجم میں حضرت گنگوہی نے اسقدر مفید اضافہ کیا ہے جس نے مستقل تصنیف کی حیثیت حاصل کر لی ہے، ایک کا نام ہے امداد السلوک، یہ آٹھویں صدی ہجری کے شیخ قطب الدین دمشقی کی تصنیف ''رسالہ مکیہ'' کا آزاد ترجمہ ہے، اصل کتاب عربی زبان میں ہے، اس کا تمام تعلق تصوف اور اس کے مسائل واصطلاحات سے ہے۔

دوسری کتاب کا نام ہے تصفیۃ القلوب، یہ بھی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی کی تصنیف ضیاء القلوب کا اردو ترجمہ ہے، اصل کتاب فارسی میں ہے، اس کا موضوع بھی تصوف اور ذکر واذکار ہے، سلوک کے منازل اور متعدد طرق کی تفصیلات پر یہ کتاب مشتمل ہے۔

۷۔ فتاوی رشیدیہ:

یہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی مرتب تصنیف کسی ایک موضوع پر نہیں ہے بلکہ یہ کتاب حضرت کی ان تحریروں پر مشتمل ہے جو فتاوی کی صورت میں آپ نے تحریر فرمائے ہیں، ضخامت پانچ سو صفحات کی ہے، فتاوی میں بیشتر تحریروں کا تعلق ان کھٹکتے ہوئے مسائل سے ہے جو اس وقت کے مسلم معاشرہ میں پھیلے ہوئے تھے، حقیقت یہ ہے کہ جب علما حق نے بالخصوص حضرت گنگوہیؒ نے اصلاح معاشرہ کی تحریک کا آغاز فرمایا تو پورے سماج میں ارتعاش پیدا ہو گیا، بدایوں اور بریلی کے علماء نے بدعات وخرافات کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں بھر دیا تھا، وہ رسوم ورواج کے خلاف کوئی بات سننا تو کیا پسند کرتے، بدعات کی مخالفت کرنے والوں سے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے، معاشرہ کتنے رسم ورواج اور بدعات وخرافات میں جکڑا ہوا تھا ان کا استقصا بھی مشکل ہے، جو مسلمان خود کو سنی کہتے اور سمجھتے تھے وہ بھی شیعوں کی خرافات کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے تھے، تعزیہ داری، علم اٹھانا، تعزیہ پر چڑھاوا چڑھانا تو ثواب کا کام بن چکا تھا، اسی طرح مزارات پر میلہ لگانا، قبروں پر چادر چڑھانا، قبروں کو سجدہ کرنا، بزرگوں کے نام پر منتیں ماننا، قبروں پر اذان دینا، مدد کے لیے غیر اللہ کو پکارنا، یا علی، یا عبدالقادر کے نعرے لگانا، مردوں کا تیجہ اور چہلم منانا، شادی بیاہ میں مشرکانہ رسمیں ادا کرنا وغیرہ وغیرہ

سیکڑوں خرافات مسلم معاشرہ میں در آئی تھیں، ان کے خلاف جب آواز اٹھی اور معاشرہ کی اصلاح کا آغاز ہوا تو معاشرے میں پھیلے ہوئے مسائل کے تعلق سے استفسارات کا سلسلہ بھی شروع ہوا، یہ جاننے کا شوق پیدا ہوا کہ حقیقت میں ان بدعات کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟ چنانچہ فتاوی کا معتد بہ حصہ رسوم ورواج اور بدعات وخرافات کے مسائل پر مشتمل ہے، حضرت گنگوہیؒ ان استفسارات کا دوٹوک جواب تحریر فرمادیتے تھے۔

ان کے علاوہ اسی فتاوی میں وہ جواب بھی موجود ہیں جو ایک نئے فرقہ کے سوالات ومسائل سے متعلق ہیں، یہ استفسارات احادیث کے حوالے سے ہوتے تھے، اس لیے حضرت گنگوہی ان کے جواب محدثانہ اصول کو مدنظر رکھ کر عالمانہ انداز میں دیتے تھے، ان جوابات میں حوالوں کی کثرت بھی ہے اور دلائل کا تنوع بھی ہے، چند جوابات تو اس قدر مفصل ہیں کہ وہ علاحدہ کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، سبیل الرشاد، الرأی النجیح، اوثق العری، ہدایۃ المعتدی اسی قبیل کی کتابیں ہیں، ان کا تعارف گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، اس لیے ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خالص حدیثی خدمات کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صرف حدیث کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، جن رسائل کا تعارف پیش کیا گیا ہے گوان کا تعلق احادیث نبویہ ہی سے ہے لیکن ان کو احادیث کے سلسلہ کی کتابیں نہیں کہا جا سکتا، حالاں کہ وہ رسائل امام ربانی کے فن حدیث میں مہارت اور وسیع النظری کا بین ثبوت ہیں، حضرت گنگوہیؒ نے درس نظامی کی متداول کتابوں کی تدریس سے یک سو ہوکر سالہا سال تک صحاح کا درس دیا ہے، جرأت کی بات ہے کہ تن تنہا صحاح کی ہر کتاب مکمل پڑھاتے تھے، اللہ تعالی نے وقت میں بہت برکت عطا فرمائی تھی، کسی کتاب کو نامکمل نہیں چھوڑتے تھے، ملک وبیرون ملک کے کم وبیش آٹھ سو طالبان علوم نبوت نے احادیث کی سند حاصل کی، انہی طلبہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی حضرت مولانا محمد یحیی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہیؒ کے ممتاز شاگرد رشید تھے، انہوں نے طالبان علوم نبوت پر عظیم الشان احسان یہ کیا کہ

حضرت گنگوہی کی درسی تقریروں کو قلمبند کرلیا اور صاحبزادہ گرامی حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے ان تقریروں کو تصحیح کے بعد شائع کردیا۔

یہ شائع شدہ کتابیں الکوکب الدری، لامع الدراری، الفیض السمائی اور الحل المفہم کے نام سے منظر عام پر آچکی ہیں، ان کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث کے اساتذہ کے لیے اصول تحفہ ہے تو حدیث کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بیش بہا خزانہ ۔ دیکھئے یہ الکوکب الدری ہے، حضرت گنگوہیؒ نے ترمذی شریف کا درس دیتے ہوئے جو تقریریں فرمائی ہیں اور ہر حدیث پر جو نکتے اور مفہوم بیان فرمایا ہے وہ سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے، حضرت گنگوہیؒ ترمذی شریف کی تعلیم کو صحاح کی دیگر کتابوں پر ترجیح دیتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ حدیث کی اس کتاب میں وہ مباحث ہیں جو صحاح کی دیگر کتابوں میں نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت گنگوہیؒ ترمذی شریف کی تدریس میں جو علمی نکتے اور مباحث پیش فرماتے تھے وہ دیگر کتابوں کی تدریس میں سامنے نہیں آتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ کی تدریس کا یہ امتیاز ہے کہ وہ متعدد احادیث میں تعارض کو دفع کرنے کے ساتھ ساتھ تطبیق کی قریب الفہم شکل سامنے لاتے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے اور تطبیق کی یہی صورت قابل قبول ہے، حضرت گنگوہی کی تدریس کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ چوں کہ رواۃ پر گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے روایت کے قوت وضعف کا فیصلہ فرماتے تھے، احادیث سے مسائل کا استنباط کیسے کیا جاتا ہے، اس کے اصول وضوابط کیا ہیں یہ بھی مباحث میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں، علماء احناف کے مسلک وموقف کی تائید احادیث کی روشنی میں کس طرح ہو رہی ہے وہ بھی وضاحت کے ساتھ اختلافی مسائل کی بحث میں جابجا نظر آتی ہے۔

امام ترمذی نے ایک باب قائم کیا ہے، باب ماجاء في الجمع بين الصلوتين. اس کے تحت ایک حدیث صحیح نقل کی ہے، حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی وجہ سے فقہاء ومحدثین میں اضطراب پایا جاتا ہے، امام ترمذی نے تو یہاں تک فرمادیا کہ مذاہب مشہورہ میں سے کسی مذہب میں اس پر عمل نہیں ہے، اس حدیث کی مراد ومنشاء کیا ہے؟ سب نے اس کی توجیہات کی ہیں،

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جمع صلوتین کو جمع صوری قرار دیا ہے، جمع کو حقیقی نہیں مانتے، بلکہ تحقیق کی بات یہ ہے کہ ایک ضعیف حدیث اس حدیث کی معارض ہے، حالاں کہ ضعیف حدیث قوی حدیث کی معارض نہیں بن سکتی لیکن مجتہدین نے اس کو قبول فرما کر قوت عطا کردی ہے، نیز عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے ضعیف حدیث قوی کی معارض بن گئی۔

اس نہج پر ہر اختلافی مسئلہ پر محدثانہ گفتگو ہے، خواہ رفع یدین کا مسئلہ ہو یا آمین بالجہر کا، امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی بات ہو، یا فوق السرۃ یا تحت السرۃ ہاتھ باندھنے کا مسئلہ ہو، ہر موقعہ پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اصولی بحث کا حق ادا کردیا ہے، اسی طرح جہاں امام ترمذی نے اہل کوفہ کا مسلک نقل کیا ہے، اس موقعہ پر حضرت گنگوہی کی بحث خوب سے خوب تر ہوتی ہے، اہل علم کے نزدیک اہل کوفہ سے امام ترمذی کی مراد امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین ہوتے ہیں، حضرت مولانا تقی الدین ندوی مظاہری نے الکوکب الدری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کبھی اہل کوفہ سے دوسرے علماء کوفہ مراد ہوتے ہیں، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی اپنے استاذ امام بخاری سے متاثر ہیں۔

الکوکب الدری پہلے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تعلیقات وحواشی کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی، اب یہ عربی ٹائپ میں چار جلدوں میں دستیاب ہے۔

ترمذی کے شروح میں الکوکب کو امتیازی درجہ حاصل ہے، اس کی خصوصیات کی طرف واضح اشارات کیے جاچکے ہیں، مزید ایک امتیاز یہ بھی پیش نظر رہے کہ امام ترمذی نے جس حدیث کو حسن کہا ہے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا سبب بھی بیان فرمایا ہے کہ اس حدیث کو حسن کیوں کہا گیا ہے؟ اسی طرح مسلک احناف کی تائید میں محدثانہ بحث میں اس کتاب کو امتیاز حاصل ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات پر مشتمل ایک کتاب "الحل المفہم لصحیح مسلم" ہے، یہ بھی حضرت گنگوہی کے شاگرد رشید حضرت مولانا یحیٰی کاندھلوی نے درس میں منضبط کیا ہے، اس کو سہارنپور کے مکتبۂ خلیلیہ نے عربی ٹائپ میں اہتمام سے شائع کیا ہے، الکوکب

الدری کی طرح اس کا حاشیہ بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے البتہ اس کا حاشیہ کوکب سے قدرے مفصل ہے اور ایسا مفید حاشیہ ہے جو دیگر حواشی اور شروح سے مستغنی کر دیتا ہے، اس کتاب میں بھی حضرت گنگوہی کا اسلوب بیان وہی ہے جو صحاح کی دیگر کتابوں میں ہے، مختلف فیہ مسائل میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر رواۃ پر بحث اور نقادان فن کے اقوال پر نظر رکھتے ہوئے اصولی فیصلہ، یہ ضرور ہے کہ الحل المفہم اس قدر مختصر ہے کہ حاشیہ کی مدد کے بغیر کماحقہ استفادہ مشکل ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات پر مشتمل ایک کتاب "الفیض السمائی علی سنن النسائی" ہے، اس کا حاشیہ مولانا محمد عاقل صاحب کے قلم سے ہے، حاشیہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق دونوں درسی نسخوں کے حوالے بھی موجود ہیں، ایک نسخہ کو التقریر الکبیر اور دوسرے کو التقریر الصغیر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس کتاب کا حاشیہ بھی اس قدر مفصل ہے کہ اس کو شرح کہنے میں تامل نہیں ہوتا، حاشیہ میں حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ کی اوجز اور دیگر کتابوں سے مکمل استفادہ کیا گیا ہے، حاشیہ میں محدثانہ اسلوب غالب ہے، ہر مختلف فیہ مسئلہ میں حضرات ائمہ اور محدثین کے اقوال حوالوں کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، اسی کے ساتھ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی ترجیح کے مضبوط دلائل بھی فراہم کیے گئے ہیں، نسائی شریف کو سمجھنے کے لیے یہ حاشیہ دیگر کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

محشی نے الفیض السمائی کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

۱۔ کتاب میں ان عبارتوں کو حل کیا گیا ہے جن کو کسی شارح نسائی اور حاشیہ نگار نے حل کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔

۲۔ سند کے رجال کی ان مواقع پر تحقیق کی گئی ہے جہاں روایات میں اختلاف ہے۔

۳۔ نسخوں کے اختلاف ذکر کر کے ترجیح کے وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔

۴۔ ترجمۃ الباب کی احادیث سے مطابقت واضح کی گئی ہے۔

۵۔ ائمہ اربعہ کے مذہب کے ساتھ فقہی مسائل بیشتر ابواب میں بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں مذہب احناف کو ترجیح دی گئی ہے البتہ فریق مخالف کے دلائل کی طرف اشارات کردیئے گئے ہیں، یہ ہے الفیض السمائی کا مختصر تعارف جو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ کی حدیثی خدمات کو واضح کرتا ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیثی خدمات میں لامع الدراری کو امتیاز حاصل ہے، یہ بھی حضرت گنگوہیؒ کے درسی افادات ہیں جن کو حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اثناء درس قلمبند کیا تھا، ایک مدت کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ نے اس کے تحشیہ کی طرف توجہ فرمائی اور مکمل بارہ سال کی طویل مدت میں حاشیہ کی تکمیل ہوئی، یعنی ۱۳۷۶ھ سے ۱۳۸۸ھ تک حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ اسی میں مصروف رہے، یہ کتاب ہندوستان، پاکستان اور مصر میں متعدد بار طبع ہوچکی ہے، آخری مرتبہ نہایت اہتمام سے پاکستان میں دس مجلدات میں شائع ہوئی ہے۔

یہ کتاب اہل علم میں مقبول ہوئی اور علوم حدیث کے شائقین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہ نظر استحسان دیکھا، حاشیہ اس قدر مبسوط ہے کہ دیگر شروح بخاری سے بے نیاز کردیتا ہے، حاشیہ محققانہ اور اسلوب خالص محدثانہ ہے، اس میں ترجمۃ الباب کے تعلق سے پیش کردہ حدیث کی مطابقت، احادیث کا دیگر کتب حدیث کی احادیث سے مقابلہ، رواۃ پر تحقیقی بحث، اختلافی مسائل، مذہب احناف کی وجہ ترجیح سب کچھ اس حاشیہ کیا شرح کی خصوصیات ہیں، کتاب کا پورا نام ہے ''لامع الدراری علی صحیح البخاری''۔

محسوس ہورہا ہے کہ گفتگو تشنہ ہے، ہر کتاب کا تقاضا ہے کہ اس کی خصوصیات وامتیازات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیگر شروح سے مقابلہ کرتے ہوئے الگ الگ مقالہ لکھا جائے، یہ کام مشکل بھی ہے اور وقت طلب بھی، کاش اہل علم حضرات توجہ فرماتے تو ایک وقیع حدیثی خدمت منظر عام پر آجاتی۔

وصلی اللہ علی النبی الکریم



حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی

خدمت حدیث کے نمایاں گوشے

از: مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی

حجۃ الاسلام والمسلمین، آیۃ من آیات رب العالمین حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نوراللہ مرقدہ کی شخصیت گرامی تحریکی، جہادی اور انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ہی اعلیٰ درجے کی علمی استعداد اور علمی وفنی رسوخ اور فضل وکمال کی جامع شخصیت تھی، ان کی خرق عادت ذہانت وفطانت اور کسبی سے زیادہ وہبی اور لدنی علوم کی کرشمہ سازیاں ان کی علمی خدمات میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

ہجری تقویم کے اعتبار سے ۴۹ سال اور عیسوی تقویم کے لحاظ سے ۴۸ سال کی مختصر زندگی میں حضرت الامام نے جو لافانی علمی کارنامے انجام دیئے اس مختصر مقالے میں اس کا احاطہ تو کجا، اس کی پوری جھلک پیش کرنا بھی مشکل ہے، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ کی یہ شہادت سب سے بڑی اور وقیع سند ہے کہ:

''مولوی محمد قاسم صاحب جیسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے، مولوی صاحب کی تحریر وتقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو''۔(۱)

تحصیل علوم حدیث:

حضرت الامام نے علم حدیث پر بطور خاص توجہ دی اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ

کے حلقۂ درس میں شریک ہوکر ان سے صحیح بخاری کا کچھ حصہ، صحیح مسلم، جامع ترمذی، موطأ مالک، تفسیر جلالین وغیرہ کتابیں پڑھیں، ان کتابوں کی صراحت حضرت شاہ عبدالغنی کی سند میں موجود ہے (۲) بعض اہل علم نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ حضرت الامام نے حضرت شاہ عبدالغنی دہلویؒ سے ابن ماجہ اور سنن نسائی کا درس بھی لیا (۳) البتہ ان کتابوں کا ذکر اس سند میں نہیں ہے جو حضرت شاہ عبدالغنی نے حضرت الامام کو مرحمت فرمائی اور جس کا عکس مولانا گیلانی کی سوانح قاسمی میں ہے (۴) تاہم یہ طے ہے کہ سنن ابی داؤد کا درس کسی سبب سے حضرت الامام حضرت شاہ عبدالغنی سے نہ لے سکے (۵) بعد میں تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری محدث کے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کے مشغلے کے دوران حضرت الامام نے سنن ابی داؤد کا درس محدث سہارنپوری سے لیا (۶) حضرت الامام نے تحصیل حدیث میں انہیں دو جلیل القدر محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور کسب فیض فرمایا، اور انہیں کا رنگ نمایاں طور پر حضرت الامام کی حدیثی خدمات و مآثر میں جلوہ گر رہا۔

حضرت الامامؒ اور خدمت حدیث:

حضرت الامام کی علمی اور بالخصوص حدیثی خدمات کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ ان اہل علم کی صف اول میں ہیں جن کے ہاں وسعت سے کہیں زیادہ عمق اور گہرائی و گیرائی ہے، کمیت سے کہیں زیادہ کیفیت ہے، ان کی باضابطہ تصانیف تعداد میں کم ہیں مگر ان میں وہبی علوم و معارف کا جو عمق اور فیضان ہے کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں ہے۔

حضرت الامام کی خدمت حدیث کے متنوع پہلو اور گوشے ہیں، ذیل میں ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

تدریس حدیث اور افراد سازی:

حضرت الامام نے دسمبر ۱۸۶۱ء میں سفر حج سے واپسی پر نانوتہ میں کچھ عرصہ مستقل قیام کیا، اور اس دوران متعدد علماء کی پرخلوص درخواست پر نانوتہ میں صحیح بخاری کا درس دینا شروع کیا، حضرت مولانا

محمد یعقوب نانوتویؒ نے اسی موقعہ پر حضرت الامام سے صحیح بخاری پڑھی (۷) پھر اس کے بعد اپنے ایک مخلص منشی ممتاز علی مرحوم کی درخواست پر ان کے مطبع میں میرٹھ میں تصحیح کتب کا مشغلہ اختیار کیا، میرٹھ کے اس قیام میں خالی اوقات میں حضرت الامام نے سلسلۂ درس جاری فرمایا، علماء کا طبقہ صحاح ستہ کے درس میں شریک ہوتا تھا، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے اس دور میں حضرت الامام سے صحیح مسلم کا درس لیا (۸) اور اسی دور میں ایک درس میں حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے بھی شرکت کی تھی (۹) نانوتہ کے درس بخاری میں مولانا رحیم اللہ بجنوری بھی شریک رہے تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک بار بلا وضو درس میں شریک ہو گیا، حضرت نے ہاتھ کے اشارے سے منع فرمایا پھر بلا کر تنبیہ کی "میاں! صحیح بخاری میں تو ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ آدمی بلا وضو بھی بیٹھ جائے"۔ (۱۰)

درسِ حدیث کا اسلوب اور امتیازات:

اس تعلق سے حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی شہادت نقل کی جاتی ہے، وہ رقم طراز ہیں۔

> "طالب علمی کے زمانے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شریک ہونے کی سعادت مجھے بمقام میرٹھ میسر آئی تھی، غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب صحیح مسلم کا درس جاری تھا، حدیث پڑھی گئی، حنفیوں اور شافعیوں کے کسی اختلافی مسئلہ سے حدیث کا تعلق تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا نے ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی جس سے کلیۃً شافعی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی تھی، طلبہ حیران ہوئے، کہنے لگے کہ آپ کی اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ ہی کا مسلک صحیح ہے اور حنفیوں کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے، تب میں نے دیکھا کہ مولانا نانوتویؒ کا رنگ بدلا اور فرمانے لگے کہ شوافع کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید میں زیادہ سے زیادہ کہنے والے اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں جو تم سن چکے ہو، اب سنو! امام ابوحنیفہ کے مسلک کی بنیاد یہ ہے، اس کے بعد مولانا نانوتوی نے پھر

اس طرح تقریر کی کہ لوگ مبہوت سنتے رہے، ابھی جس مسلک کے متعلق ان
کا یقین تھا کہ اس سے زیادہ حدیثوں کے مطابق کوئی دوسرا مسلک ہو نہیں
سکتا، اچانک معلوم ہوا کہ درحقیقت حدیثوں کا مفاد وہی ہے جسے امام ابوحنیفہ
نے منقح فرمایا ہے''۔(۱۲)

حضرت الامام کا درس حدیث طائرانہ نہیں بلکہ محققانہ ہوا کرتا تھا، اس میں تحقیقی نکات،
تجزیاتی معلومات اور استدلالی لطائف کا وافر ذخیرہ ہوتا تھا، شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کی پوری جھلک
ہوتی تھی، علوم ولی اللہی کا ظہور ہوتا تھا، حضرت الامام کے تلمیذ ارشد حضرت شیخ الہند کا بیان ہے کہ:

''میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیفات دیکھ کر حضرت نانوتوی
کے درس میں شریک ہوتا تھا اور وہ باتیں پوچھتا تھا جو شاہ صاحب کی
تصنیفات میں غایت مشکل ہیں، شاہ صاحب کے یہاں جو آخری جواب
ہوتا تھا وہ حضرت نانوتوی اول ہی مرتبہ فرما دیتے تھے، میں نے بارہا اس کا
تجربہ کیا ہے''۔(۱۳)

مسلک احناف کی ترجیح واثبات اور اس کے وجوہ کو ترجیح کے مدلل تذکرہ کا جو منہج اور درس
حدیث میں توضیح وتنقیح کا جو اسلوب دارالعلوم دیوبند کا نشان امتیاز اور برصغیر کے ۹۵ فیصد مدارس میں
مقبول ومتداول ہے اس کے فروغ میں حضرت الامام کا کردار سب سے نمایاں اور اولین ہے، اس
سے پہلے درس حدیث میں صرف ترجمۂ حدیث اور ذکر مذاہب اربعہ پر انحصار ہوتا تھا، یہ سلسلہ
تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک رہا، پھر جب جماعت اہل حدیث کے غلو پرستوں نے مذہب
احناف کو ہدف طعن وملامت بنایا اور اسے مخالف حدیث ثابت کرنے کی مہم چھیڑ دی تو شاہ محمد اسحاقؒ
اور ان کے تلامذہ نے درس حدیث میں مذہب حنفی کے اثبات بالحدیث اور ترجیح پر توجہ دی، اور پھر اس
سلسلے کو فروغ دینے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے میں حضرت الامام نے نمایاں کردار ادا کیا۔

حضرت نانوتوی کے منہج درس کے تذکرہ میں ان کے ممتاز شاگرد مولانا حکیم منصور علی خاںؒ

نے لکھا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ جب کسی اہم اور مشکل مسئلہ کو جمہور کے تصورات کے خلاف ثابت فرماتے تو بڑے بڑے ارباب علم وفضل حیران اور انگشت بدنداں رہ جاتے تھے، جو حکم ظاہر میں قطعاً بے دلیل و برہان معلوم ہوتا وہ تقریر کے بعد عقل کے عین مطابق معلوم ہونے لگتا تھا، آپ کے پیش کردہ دلائل کے خلاف بڑے بڑے ارباب علم وفضل کو جرأت نہ ہوتی تھی''۔ (۱۴)

حضرت الامام کے درس حدیث میں مذاہب اربعہ کی توضیح، ہر مذہب کے دلائل کا مفصل ذکر، مذہب حنفی کی ترجیح، رجال حدیث اور حدیث کے مقام کا ذکر، الفاظ کے فرق اور اس کے نتیجے میں احکام کے استنباط پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ، متکلمانہ اسلوب میں اصولی بحث اور فکری اعتدال جیسی خصوصیات ہوتی تھیں۔

حضرت الامام کے درس حدیث کے امتیازات میں نمایاں طور پر یہ چیزیں شامل ہیں:

- ☆ سند حدیث پر متوازن اور وقیع تبصرہ
- ☆ حدیث کے فنی مقام کی نشان دہی
- ☆ متعلقہ مسئلہ میں مذاہب اربعہ کا بیان
- ☆ ہر مذہب کے مفصل دلائل کی ایسی توضیح جو بالکل غیر جانبدارانہ ہو
- ☆ مذہب حنفی کے اثبات اور عقل ونقل سے اسے مبرہن کر کے اس کی وجوہ ترجیح کا بیان
- ☆ احکامی پہلو کے ساتھ حدیث کے اخلاقی وتربیتی پہلو کی سیر حاصل وضاحت
- ☆ تحقیقی، تجزیاتی، استدلالی، متکلمانہ اور اصولی انداز بحث
- ☆ تشریح احادیث کے ضمن میں نکتہ رسی
- ☆ متعارض احادیث میں تطبیق اور متکلمانہ اسلوب میں اس طرح انطباق دینا کہ کوئی اشکال باقی نہ رہے۔
- ☆ سلف صالح اور تمام ائمہ کا احترام

☆ کتاب وسنت سے فقہ اسلامی کا ربط واضح کرنا

☆ مختلف فیہ مسائل میں اعتدال وتوازن کی روش اور ڈگر پر پوری طرح قائم رہنا

ان امتیازات سے حضرت الامام کے محدثانہ ذوق اور رسوخ فی العلوم کی کیفیت کا علم ہوسکتا ہے، حضرت الامام کے ذوق محدثانہ کی جھلکیاں ان کی گراں قدر تصانیف میں جا بجا موجود ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس اور قیام:

حضرت الامام کی خدمت حدیث کے پہلوؤں میں دارالعلوم دیوبند کا قیام نہایت اہمیت کا حامل ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت الامام کا سب سے عظیم کارنامہ ہندوستان میں دینی علوم کی نشأۃ ثانیہ کے لئے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس کی تاسیس، تعلیمی تحریک کا احیاء، اور اس کے لئے راہ نما اصول اور مفید ترین، جامع، ٹھوس اور استعداد ساز نصاب تعلیم کی تدوین وتنفیذ ہے، دارالعلوم دیوبند اور اس کی ہمہ جہت خدمات اور کتاب وسنت کی نشر واشاعت کا مقدس سلسلہ حضرت الامام کی فکری بصیرت کا بے مثیل شاہکار اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے، دارالعلوم کے قیام کے بعد حضرت الامام نے اس کے لئے جو نصاب تعلیم طے فرمایا اس سے ان کے ذوق محدثانہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ایک معروف فاضل کے بقول:

> ''حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی تعلیمی تحریک میں کتاب وسنت کی تعلیم کو ان کے شایان شان مقام دیا، صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں کو نصاب درس میں شامل کیا، درس کا وہ انداز اختیار کیا کہ کتاب وسنت سے فقہ اسلامی کا ربط ورشتہ کھل کر لوگوں کے سامنے آجائے اور قرآن وحدیث قندیل ہدایت کا کام دیں اور ان کی روشنی میں الجھے ہوئے مسائل کی گرہیں سلجھائی جائیں، خلافی مسائل پر الامام النانوتوی کے مکتوبات اور تحریریں اپنے اندر اجتہادی شان رکھتی ہیں، کتاب وسنت کی عطر بیزیاں قدم قدم پر نمایاں ہیں اور ایسے لطیف استنباط پائے جاتے ہیں جن کی نظیر فقہائے

متقدمین کے یہاں بھی نہیں ملتی''۔(۱۵)

حضرت الامام نے اپنے ذوق خاص سے دارالعلوم کے نصاب میں حدیث نبوی کی تعلیم کو مرکزی اہمیت دی، اس طرح خانوادۂ ولی اللہی سے جو چشمۂ حدیث جاری ہوا تھا اور جو گردش زمانہ سے خشک ہو چلا تھا اسے حضرت الامام نے رواں کر دیا، اور درس حدیث کا سلسلہ پورے زور وشور سے جاری کر دیا، حالات کے تقاضوں اور نزاکتوں کے پیش نظر یہ ضرورت تھی کہ درس حدیث میں درایتی طریقہ اپنایا جائے، فقہ حنفی کو مؤید کیا جائے اور فقہ حنفی کو احادیث سے ثابت کر کے پیش کیا جائے، چنانچہ انہیں خصوصیات کے ساتھ دارالعلوم کا درس حدیث حضرت الامام نے شروع کیا جسے اتنا قبول عام حاصل ہوا کہ دارالعلوم پورے برصغیر میں تعلیم حدیث کا سب سے اہم مرکز بن گیا۔

حاصل یہ ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس، وہاں کے نصاب تعلیم کی تدوین، نصاب تعلیم قرآن اور حدیث کی طرف مکمل التفات، درس حدیث میں تحقیقی اور معیاری وتفصیلی اسلوب اور طرز کا آغاز، یہ اور ان جیسے متعدد کارناموں کی روشنی میں حضرت الامام کی خدمت حدیث کے گوشے جاگر ہوتے ہیں۔

سب سے ممتاز حدیثی کارنامہ: تحشیۂ بخاری:

خدمت حدیث کے ضمن میں حضرت الامام کا سب سے نمایاں، وقیع، قابل قدر اور علمی کارنامہ حاشیۂ بخاری کی تکمیل ہے، اور باعث تعجب یہ ہے کہ اتنا عظیم اور لائق صد آفریں کارنامہ حضرت نے ۱۸ رسال کی عمر میں انجام دیا (۱۶) حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ نے تحشیۂ بخاری کا بے مثال کارنامہ انجام دیا، مگر مصروفیات کے پیش نظر بخاری کے آخری چند اجزاء کے تحشیہ کا کام حضرت الامام کے سپرد کیا جو ان کے شاگرد رشید تھے اور جن کے جوہر کا ادراک حضرت سہارنپوری کو پہلے سے تھا۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ لکھتے ہیں:

''جناب مولوی محمد علی سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کے پانچ چھ سپارے جو آخر کے باقی تھے مولوی صاحب کے سپرد کیا، مولانا

صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے؟ اس زمانے میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے، جناب مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا؟ اس پر مولوی احمد علی صاحب نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ ان لوگوں کو دکھلا دیا، جب لوگوں نے جانا"۔(۱۷)

تحشیۂ بخاری جیسا عظیم علمی کام حضرت الامام کے سپرد کئے جانے پر بعض علماء نے محدث سہارنپوری کے سامنے اعتراض کیا تھا جس کے جواب میں محدث سہارنپوری نے فرمایا:

''تم لوگ بخاری کے جتنے مشکل مقامات ہوں ان پر نشان لگالو پھر ان سے (حضرت الامام سے) دریافت کرلو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، پھر ان مقامات کا حاشیہ منگوا کر دکھایا تو مولانا نانوتوی نے جو جو احتمالات پیدا کر کے ان کے جوابات دیئے تھے، وہ احتمالات اور شبہات ان حضرات کے احتمالات سے بھی زیادہ تھے، یہ دیکھ کر وہ لوگ مولانا کے تبحر علمی کو مان گئے''۔(۱۸)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تحریر کے پیش نظر یہ مشہور ہے کہ حضرت الامام نے آخر کے پانچ اجزاء کے حواشی تحریر فرمائے ہیں، ایک رائے ساڑھے چار اجزاء کے حواشی کی بھی ہے، مگر تحقیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت الامام نے بخاری کے آخری تین اجزاء (از کتاب المحاربین تا آخر) کے حواشی لکھے ہیں (۱۹) تدریس بخاری کا تجربہ رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ بخاری کے آخری تین اجزاء کے حواشی کا رنگ اور انداز و نہج اور اسلوب باقی اجزاء کے حواشی سے بہت مختلف نظر آتا ہے، ایک فرق تو تفصیل و اختصار کا ہے، آخری اجزاء کے حواشی میں تفصیلی مباحث ہیں، شروح بخاری کے طویل اقتباسات ہیں، اسلوب کا یہ فرق ثابت کرتا ہے کہ آخری تین اجزا کا تحشیہ حضرت الامام کا کارنامہ ہے۔

حضرت الامامؒ کے تحشیۂ بخاری کو شرح بخاری قرار دینا زیادہ مناسب ہے، اور فہم کتاب کی

تسہیل، رفع اشکالات، شرح مشکلات ومبہمات، تفصیل اجمالات، اغلاط واخطاء کی تنبیہ، رواۃ ورجال کی تحقیق وتنقید، تعارض کی صورت میں تطبیق وترجیح، مسلک راجح کی ترجیح اور تذکرۂ وجوہ ترجیح اور اس جیسی تمام خصوصیات حضرت کے حواشی میں موجود ہیں۔

صحیح بخاری کا یہ آخری حصہ اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں امام بخاری نے حضرت امام اعظم کے فقہی افکار وآراء پر تبصرے شدت کے ساتھ کئے ہیں جن میں بسا اوقات جارحیت محسوس ہوتی ہے، اس حصہ پر حضرت الامام نے حاشیہ لکھا اور امام بخاری کے اشکالات اور تنقیدی تبصروں کا اس طرح علمی جواب دیا اور تجزیہ کیا کہ حق ادا ہو گیا۔ (۲۰)

مولانا اسیر اُدروی لکھتے ہیں:

> ''امام بخاری نے اخیر کے ان پاروں میں امام ابوحنیفہ پر اہم اعتراضات کی نشان دہی کی ہے اور اس کی جانب اشارات کئے ہیں اور امام بخاری کی روایات کا جو وزن ہے اس سے سارا عالم اسلام واقف ہے، اس لئے ان اعتراضات کے جوابات پورے ذخیرۂ حدیث پر بصیرانہ نظر ڈالے بغیر ممکن نہ تھے، اور روایتوں کی ایسی معقول اور مدلل توجیہ پیش کرنی ضروری تھی کہ مسلک احناف کا منشأ شریعت کے مطابق ہونا ثابت ہو جائے، حضرت نانوتوئی نے یہی کیا، کوئی بات بغیر سند اور حوالۂ کتب کے نہیں کہی ہے، نہ روایتوں کی بیجا تاویل کی ہے اور نہ ان سے انکار، بلکہ دوسری مستند روایتوں میں امام بخاری کی اس روایت کا ایسا مطلب پیش کیا ہے جو مسلک احناف کے مطابق ہو''۔ (۲۱)

حضرت الامام کے حواشی بخاری میں اسناد اور متون دونوں پر نفیس بحثیں ملتی ہیں اور حضرت کے عمق علم پر شاہد ہیں، اس تحشیے کے نمایاں امتیازات یہ ہیں:

☆ احادیث کے معانی اور مراد کی سیر حاصل اور عام فہم تشریح

☆ اسناد کی تحقیق اور رواۃ کے مقام کی تعیین

☆ اغلاط واوہام پر تنبیہ

☆ متعارض روایات میں نفیس تطبیق

☆ مذہب حنفی کی ترجیح اور اس کا اثبات بالحدیث

☆ امام بخاری کی احناف پر لطیف چوٹوں کا حکیمانہ اور مدلل جواب اور مستند روایات سے مسلک حنفی کی تائید کا ذکر

☆ تاویلات فاسدہ ورکیکہ سے گریز

☆ حوالے کا اہتمام

☆ موضوع کا احاطہ

☆ کوئی بات بے سند محض اپنے فہم سے نہ لکھنے کا اہتمام (۲۲)

☆ فقہ کے حدیث سے ارتباط کی کوشش وغیرہ

یہ مختصر مقالہ اس کا متحمل نہیں کہ حضرت الامام کے تحشیے کے نمونے پیش کئے جائیں، البتہ بہت اہم بحثیں ان حواشی میں موجود ہیں، پڑوسی کے لئے حق شفعہ کے ثبوت وعدم ثبوت پر حضرت نے احناف کی تائید اور امام بخاری کے نقد کے رد پر بڑی عمدہ بحث کی ہے (ملاحظہ ہو بخاری دوم حاشیہ: ۵ص/۱۰۳۲) اسی طرح صوم وصال کی ممانعت (۱۰۷۵حاشیہ: ۹ بخاری دوم) قضاء قاضی کا نفاذ ظاہراً ہوگا یا باطناً (بخاری دوم ص/۱۰۳۰) غلام مدبر کی بیع (ص/۱۰٦٦ حاشیہ:۱) اور ان جیسے دسیوں موضوعات پر حضرت الامام نے بیحد نفیس تحقیقی بحث کی ہے، بیعت کے باب میں بھی حضرت نے مفصل حاشیہ لکھا ہے جو حضرت کی گہری اور وسیع تاریخی نظر کا شاہکار ہے (ملاحظہ ہو ص/۱۰٦۹ حاشیہ:۵) ہدایا الحکام و العمال کے تعلق سے بھی حضرت نے بہت تحقیقی گفتگو فرمائی ہے (ص/۱۰٦۸ حاشیہ:٦) لغوی بحثیں بھی جابجا موجود ہیں، کلام اللہ اور قول اللہ کے موضوع پر بھی مسلک معتزلہ اور مسلک حق کی توضیح وتفصیل بھی حضرت نے خوب لکھی ہے (ص/۱۱۱۳ حاشیہ:۱) بخاری کی آخری حدیث پر بھی حضرت نے بہت گراں

قدر حواشی تحریر کئے ہیں، اور ان تمام حواشی اور بحوث سے یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ یہ تحشیہ حضرت کے ذوق محدثانہ اور خدمت حدیث کا سب سے اہم شاہکار اور آئینہ دار ہے۔

دیگر حدیثی خدمات:

حضرت الامام کی حدیثی خدمات میں ایک نمایاں خدمت یہ ہے کہ آپ نے حضرت امام ولی اللہ دہلوی کے افکار و نظریات کی روشنی میں کتب حدیث کے مراتب و طبقات اور اصول تنقید کی تحقیق فرمائی، حضرت امام دہلوی نے کتب حدیث کی خاص ترتیب قائم فرمائی ہے جو برصغیر کے علمی حلقوں میں رائج ہے، اس ترتیب و تقسیم کے تعلق سے حضرت الامام النانوتوی نے اپنی تصنیف ''ہدیۃ الشیعۃ'' میں بیحد نفیس اور مدلل بحث ارقام فرمائی ہے، علم حدیث کے ماہرین کی متفقہ رائے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے کتب حدیث کے اصول تنقید کو حضرت نانوتوی سے بہتر کسی نے نہیں سمجھا (۲۳)۔

ممتاز محدث حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی لکھتے ہیں:

> ''مولانا (نانوتوی) نے اپنی کتاب ہدیۃ الشیعۃ میں کتب حدیث کے طبقات اور اصول تنقید کو جس خوبی سے بیان فرمایا ہے اس کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ حجۃ اللہ البالغۃ کے اصول تنقید و قواعد تطبیق کو آپ سے بہتر کسی نے نہیں سمجھا''۔ (۲۴)

حضرت الامام کے مکتوبات کی فراہم شدہ تعداد سو سے زیادہ ہے اور ان میں بیشتر مکتوبات علمی ہیں، یہ علمی مکتوبات تفسیری و فقہی مباحث کے ساتھ بیش قیمت حدیثی مباحث بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اور متعدد حدیثی نکات و لطائف ان میں بکھرے ہوئے ہیں۔ (۲۵)

حضرت الامام کا ایک مکتوب اور رسالہ مسئلہ تراویح سے متعلق ہے اور احادیث کی روشنی میں اس مسئلے کی تنقیح کی گئی ہے، اسی میں مرسل روایات کی حجیت کی بحث بھی ملتی ہے، (۲۶) یہ مکتوب ''الحق الصریح'' کے نام سے ہے، اس میں خبر واحد سے اعتقادی احکام کے عدم ثبوت اور واجبات و سنن کے ثبوت کی بحث ہے، تراویح اور تہجد کے دو الگ الگ نماز ہونے پر کلام ہے، اور احادیث

کے مراتب پر گفتگو بھی ہے، اسی طرح ''توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام'' کے نام سے بھی حضرت کا ایک رسالہ ہے جو قراءت خلف الامام کے مشہور مختلف فیہ مسئلے سے متعلق ہے، حضرت نے اس میں آیات اور احادیث کی روشنی میں بڑی متکلمانہ بحث کی ہے، آیات و روایات میں تطبیق کا کام بھی کیا ہے، اس مسئلے میں حضرت کی اپنی ایک مستقل توجیہ ہے:

> ''اور وہ یہ ہے کہ مقتدی کے سورۂ فاتحہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کا تعلق اصل میں اس اصل سے ہے کہ امام مقتدیوں کا نائب ہوتا ہے اور اسی کی نماز اصل ہوتی ہے، امام کی یہ حیثیت نماز میں بتدریج پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے، ابتداء میں سلام وکلام بھی جائز تھا، اسے منسوخ کیا گیا، پھر مقتدی سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ ضم سورت بھی کیا کرتے تھے تو ضم سورت کا حکم منسوخ ہوا، پھر مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم بھی منسوخ ہوگیا تا کہ امام کی نیابت اور نماز میں اس کے ضامن ہونے کی کیفیت آہستہ آہستہ درجۂ کمال کو پہونچ جائے''۔(۲۷)

اسی طرح راوی محمد ابن اسحاق کے بارے میں علمائے جرح وتعدیل کا اختلاف، بعض موقوف حدیثوں کا مرفوعات کے حکم میں ہونا اور ایسی دیگر علمی بحثیں اور نکتے اس رسالے میں موجود ہیں جو حضرت الامام کی قوت استخراج واستنتاج اور عمیق مطالعے کا مظہر ہیں۔

حضرت الامام کا ایک رسالہ "حدیث فضل العلماء علی العابد کفضلی علی ادناکم" سے متعلق ہے، اس کا ذکر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ایک مکتوب میں موجود ہے۔(۲۸)

حضرت کے ایک مکتوب میں ''فدک'' کے تعلق سے مفصل گفتگو ہے، اس میں حدیث "نحن معاشر الأنبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقة" پر محققانہ کلام اور شیعوں کا رد ہے، اسی طرح ایک مکتوب حدیث نبوی "کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور، الا فزوروھا" سے مرتبط ہے، جس میں زیارت قبور کے مسئلہ کو احکامی و اخلاقی ہر دو پہلو سے مکمل واضح کیا گیا ہے، ان کے علاوہ حضرت الامام کی جملہ تصانیف ومکاتیب ورسائل میں جابجا حدیثی بحثیں بکھری ہوئی ہیں، اسرار شریعت کا موضوع بھی حدیث سے

متعلق ہے، حضرت نے اس موضوع پر بہت کچھ تحریر فرمایا ہے، حضرت کا حدیث پر کوئی مستقل اور مربوط کام نہیں ہے مگر یہ ضمنی اور غیر مستقل کام اتنے وقیع ہیں کہ ان سے حضرت کی محدثانہ شان بلند کا ظہور ہوتا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر حضرت کی توجہ صرف حدیث پر ہوتی تو بے انتہا عظیم کام سامنے آتے۔

خلاصۂ کلام:

حاصل یہ ہے کہ حضرت الامام النانوتوی محدثین کی فہرست میں ممتاز مقام کے حامل ہیں، اور احادیث کی جو خدمت زبان وقلم سے آپ نے انجام دی اس کی عظمت، افادیت اور تاثیر ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، دارالعلوم دیوبند کی خدمت حدیث کا جو فیض اس کے ابتدائے قیام سے جاری ہے اور ان شاء اللہ تا صبح قیامت جاری رہے گا اور اس کے فیض یافتگاں خدمت حدیث کرتے رہیں گے، یہ ساری خدمت حضرت الامام کے حسنات میں بھی شامل ہوگی اور ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوگی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت الامام کی حدیثی خدمات کو مفصل اور مرتب انداز میں اجاگر اور نمایاں کیا جائے اور فکری اعتدال کے اسی امتیاز کو عام کیا جائے جو حضرت الامام کی خصوصیت تھی، اور زمانے کی نزاکتوں اور تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حدیثی وعلمی خدمات انجام دی جائیں۔

حضرت الامام کے لئے سچا خراج عقیدت یہی ہے کہ انہیں خطوط پر کام کیا جائے جن پر حضرت نے کام کیا، رفع اللہ درجاتہ و جزاہ اللہ عنا و عن سائر المسلمین خیراً و انزل علیہ شآبیب رحمتہ و رضوانہ۔

حواشی:

(۱) ملاحظہ ہو قاسم العلوم احوال وآثار مرتبہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی/ ۱۹۶ و ۱۹۷

(۲) سوانح قاسمی از مولانا گیلانی: ۱/ ۲۶۰، ۲۶۱

(۳) مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات وکارنامے از اسیر ادروی/ ۹۳

(۴) سوانح قاسمی: ۱/ ۳۶۰

(۵) مذہب منصور از مولانا منصور علی خاں، بحوالہ حیات وکارنامے/ ۹۳

(۶) حیات وکارنامے/ ۹۴

(۷) ایضاً/ ۹۹

(۸) ایضاً/۱۰۱

(۹) سوانح قاسمی ۲/۳۳۲

(۱۰) حیات وکارنامے/۱۰۳

(۱۱) ایضاً/۱۰۸ تا ۱۱۲، واحوال وآثار/ ۲۲۷، ۲۲۸

(۱۲) سوانح قاسمی: ۲/۳۳۲، ۳۳۳

(۱۳) تاریخ دارالعلوم: ۱/۱۱۳

(۱۴) ایضاً بحوالہ مذہب منصور دوم/۱۷۸

(۱۵) الامام نانوتوی حیات وافکار مرتبہ تنظیم ابنائے قدیم/۶۴ مضمون حضرت مولانا عتیق احمد قاسمی

(۱۶) حیات وکارنامے/۷۶

(۱۷) سوانح مولانا قاسم از مولانا محمد یعقوب نانوتوی/ ۸،۷

(۱۸) احوال وآثار/۳۷ بحوالہ ماہنامہ دارالعلوم رمضان ۱۳۷۱ھ

(۱۹) یہ رائے حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہ شیخ الحدیث مظاہر علوم کی ہے، اور قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے، ملاحظہ ہو۔ احوال وآثار/۷۵

(۲۰) حیات وافکار/۳۰۱ مضمون حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی

(۲۱) حیات وکارنامے/۷۶

(۲۲) حیات وافکار/ ۳۰۷

(۲۳) احوال وآثار/۹۳۱

(۲۴) ایضاً/۹۳۳

(۲۵) مدرسی کتابت کے حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو: احوال وآثار/۷۱۶

(۲۶) حیات وکارنامے/۳۶۵ تا ۳۶۸

(۲۷) حیات وافکار/۲۹۲ مضمون حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

(۲۸) احوال وآثار/۷۳۱



مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ

حیات وخدمات

از: مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی

''ہندوستان میں تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں علم حدیث اور محدثین'' کا کوئی تذکرہ محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ صاحب بذل المجہود شرح أبی داؤد کے ذکر جمیل کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، مولانا خلیل احمد صاحبؒ کا شماران نابغۂ روزگار ہستیوں میں ہے جو اپنے عہد میں فضل وکمال اور شہرت ومقبولیت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے، ان کے علمی کارناموں میں اگر بذل المجہود شرح ابی داؤد کی تصنیف کے علاوہ کوئی اور چیز نہ بھی ہوتی تو یہی ایک کتاب ان کی محدثانہ حیثیت، علمی تبحر، وسعت نظر اور گہری بصیرت کی شہادت دینے کے لئے کافی ہوتی، لیکن حضرت سہارنپوری کی حیات وخدمات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کا ہر پہلو اور زندگی کا ہر لمحہ دلکش، جاذب نظر اور قابل رشک ہے، اتباع سنت، ورع وتقوی، اخلاص وللہیت، حسن اخلاق، تواضع وانکساری، احسان وسلوک، فقہ وفتاوی سے گہری مناسبت، علم حدیث اور اس کے جملہ متعلقات سے والہانہ تعلق، مسلک حق کی حمایت اور باطل کے ساتھ نبردآزمائی کا مخلصانہ جذبہ، مولانا مرحوم کی ہشت پہل شخصیت کے وہ روشن پہلو ہیں جو ہر رخ سے اپنی تابانی کے ذریعہ

دیدہ کو حیراں کو خیرہ کئے ہوئے ہیں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

لیکن ان تمام خدمات جلیلہ اور اوصاف جمیلہ کے درمیان احسان وسلوک، فقہ وفتاویٰ اور علم حدیث کے میدان میں مولانا کی فیض رسانی انتہائی نمایاں ہے۔

آج کے موضوع کے لحاظ سے راقم الحروف حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی علم حدیث سے متعلق تدریسی وتصنیفی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرے گا لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ ؂

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچیں تو از تنگیٔ داماں گلہ دارد

تاہم اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کا مختصر سوانحی خاکہ بھی پیش کر دیا جائے، جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ سعادت ازلی اور مولاناؒ کی فطری صلاحیت کے ساتھ وہ کون سے عوامل تھے جن کا مولانا مرحوم کی بلند قامت شخصیت کی تعمیر میں حصہ رہا ہے۔

خاندانی پس منظر، ولادت اور ابتدائی تعلیم:

مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی ولادت اواخر صفر ۱۲۶۹ھ مطابق اوائل دسمبر ۱۸۵۲ء میں انقلاب ۱۸۵۷ء سے پانچ سال قبل اپنے ننہیال قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہوئی، مولانا کے والد شاہ مجید علی انصاری اپنے وطن انبہٹہ ضلع سہارنپور میں موجود نہیں تھے، اس لئے آپ کی والدہ ماجدہ مبارک النساء بی بی اپنے والد حضرت مولانا مملوک العلی صاحب نانوتویؒ کے مکان پر نانوتہ میں مقیم تھیں، آپ کے نانا مملوک العلی صاحبؒ کا دو سال قبل ۱۲۶۷ھ میں انتقال ہو چکا تھا اس لئے آپ کے بڑے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ گھر کے ذمہ دار تھے، بچپن میں خلیل احمد کے علاوہ آپ کے کئی اور نام بھی رکھے گئے مگر یہ نام سب پر غالب آیا، آپ توام پیدا ہوئے تھے، لیکن دوسرے بھائی کا جلد ہی انتقال ہو گیا اور آپ ہی سب کے مرکز توجہ بن گئے، آپ کے والد ملازمت کے سلسلہ میں اکثر وطن سے دور دراز کی ریاستوں میں مقیم رہتے، اس لئے ابتدائی زمانہ میں آپ کے سرپرست اور مربی آپ

کے ماموں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ہی تھے، اور ابتدائی نشو ونما کا زمانہ انہیں کی نگرانی اور سرپرستی میں گذرا، جب عمر پانچ سال کی ہوئی تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے میرٹھ، دہلی اور مغربی یوپی میں ایک حشر برپا تھا، اسی ہنگامہ خیز دور میں آپ کی مکتبی تعلیم اور ابتدائی اردو فارسی کی تعلیم ہوئی، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رست وخیز میں خاندان کے بعض بزرگوں کے ساتھ مولانا کے والد شاہ مجید علی بھی گرفتار ہوگئے جس کا اثر مولانا کے معصوم دل پر ہونا لازمی تھا، مولانا کے چچا مولانا انصار علی صاحب گوالیار میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے، والدہ محترمہ کی اجازت سے آپ چچا کے ساتھ گوالیار چلے گئے، اس وقت مولانا کی عمر گیارہ سال ہو چکی تھی، وہیں رہ کر چچا کی محبت وشفقت کے زیر سایہ تعلیمی مراحل طے کرنے لگے، ابتدائی عربی وفارسی کی تعلیم مولانا نے اپنے چچا ہی سے حاصل کی، آپ کے والد بھی گوالیار ہی میں ملازم تھے، لیکن آپ کا قیام اپنے چچا کے ساتھ تھا، جب شاہ مجید علی صاحب کی مدت ملازمت پوری ہوگئی تو بھائی سے اجازت لے کر صاحبزادے کو وطن انبہٹہ لے آئے، یہاں آ کر مولانا دلجمعی کے ساتھ عربی تعلیم میں مشغول ہوگئے، انبہٹہ کے ایک عالم مولانا سخاوت علی صاحب سے کافیہ، شرح جامی تک کی تعلیم مکمل کی، اس وقت آپ کی عمر ۱۲ سال کی تھی، اس دوران اعزہ کی تحریک پر آپ کے والد نے آپ کو انگریزی تعلیم میں لگا دیا لیکن مولانا کی طبیعت اس سے مانوس نہیں تھی، مگر والد کے ادب میں خاموش رہے، ادھر قدرت کی طرف سے کچھ اور ہی فیصلہ ہو رہا تھا، ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی اور اس کے اولین صدر المدرسین آپ کے حقیقی ماموں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ قرار پائے تو مولانا نے والدین سے اجازت لے کر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا اور اپنے مشفق ماموں کی زیر سرپرستی تعلیم میں مشغول ہوگئے، لیکن قیام دارالعلوم دیوبند کے چھ ماہ بعد ہی رجب ۱۲۸۳ھ مولانا سعادت علی صاحب سہارنپوریؒ نے جو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت سے وابستہ تھے، سہارنپور میں مظاہر علوم کا آغاز فرمایا اور مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ کو اس کا صدر مدرس مقرر فرمایا، مولانا محمد مظہر نانوتویؒ مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے رشتہ کے ماموں تھے، مولانا کو دیوبند کی آب وہوا راس نہیں آتی تھی اس لئے دیوبند چھوڑ کر مظاہر علوم آ گئے اور مختصر المعانی کی جماعت میں داخل ہو

گئے ، دوسرے ہی سال آپ نے حدیث شریف شروع کر دی، حدیث میں آپ کے استاذ مولانا محمد مظہر صاحبؒ تھے ، آپ نے ۱۳۸۳ھ مولانا محمد مظہر صاحبؒ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی ، یہ عمر کا پندرھواں سال تھا، اس کے بعد آپ نے متعدد اساتذۂ کرام سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں لیکن حدیث کی تقریباً تمام کتابیں مولانا محمد مظہر صاحبؒ سے پڑھیں، قیام مدرسہ کے تیسرے سال ۱۳۸۶ھ میں پہلے سال دورۂ حدیث قائم ہوااور بخاری شریف پڑھائی گئی، مولانا نے بھی اس سال دورۂ حدیث میں شرکت کی اور بخاری شریف اور ہدایہ اخیرین میں سالانہ امتحان دے کر اول نمبر سے کامیابی حاصل کی ، ابوداؤد شریف اس سال نہیں ہو سکی تھی ، مولانا محمد مظہر صاحبؒ رمضان شریف اپنی سسرال لکھنوتی میں گذارتے تھے ، ایک سال مولانا نے بھی ان کے ساتھ رمضان میں لکھنوتی قیام کر کے ابو داؤد شریف مولانا محمد مظہر صاحبؒ ہی سے پڑھی ، ۸۶۔۱۳۸۵ھ میں مولانا دورۂ حدیث سے فارغ ہو گئے ، اس کے بعد تکمیل علوم میں دو سال لگ گئے ، مکمل فراغت ۱۳۸۸ھ میں ہوئی۔

ادب کی بعض کتابیں مولانا فیض الحسن صاحب ادیب سہارنپوریؒ سے لاہور یونیورسٹی جا کر پڑھیں۔

بیعت وسلوک:

طبیعت میں سلامت روی پہلے سے موجود تھی ، اکابر اہل اللہ کی صحبت اور معیت نے اس جذبہ کو اور جلا بخشی ، حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ پہلے ہی سے تھا ، ۸۹۔۱۲۸۸ھ میں حضرت کے دست اقدس پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور کمال علو ہمت اور حوصلہ کے ساتھ منازل سلوک طے کرنے لگے ، بیعت کے تقریباً ۹ سال بعد حج کے لئے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو حضرت گنگوہیؒ کے ایک گرامی نامہ کے ساتھ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دی ، حاجی صاحبؒ ان کے احوال باطنی سے بے حد مسرور ہوئے اور اپنی دستار مبارک اتار کر ان کے سر پر رکھ دی اور حضرت گنگوہیؒ کے نام ایک مبارک بادی کا خط اور خلافت نامہ تحریر کر کے ان کے حوالہ کیا ، یہ واقعہ محرم ۱۲۹۷ھ کا ہے۔

اسنادِ حدیث:

حضرت مولانا خلیل احمدؒ صاحب کو متعدد مشائخ عظام سے حدیث کی اجازت حاصل تھی۔

۱۔ مولانا نے حدیث کی تمام کتابیں حضرت مولانا محمد مظہرؒ صاحب نانوتوی صدر المدرسین مظاہر علوم سہارنپور سے پڑھیں۔

۲۔ ۱۲۹۳ھ میں مولانا خلیل احمدؒ صاحب نے بھوپال کے زمانہ قیام میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ دہلوی کے داماد مولانا عبدالقیوم صاحبؒ بڑھانوی سے صحیح بخاری از اول تا آخر، شمائل ترمذی، حدیث المسلسلات، مسند الجن المسمّٰی بالنوادر، الدر الثمین، مسلم شریف کے کچھ اوراق اور مسند دارمی کا بعض حصہ پڑھ کر ان سے روایت حدیث کی اجازت عامہ حاصل کی۔

۳۔ ۱۲۹۴ھ میں جب مولانا کو مدینہ منورہ میں قیام کا موقع نصیب ہوا تو آپ نے شاہ عبدالغنی مجددیؒ مہاجر مدنی سے صحاح ستہ کے اوائل پڑھ کر اجازت حدیث حاصل کی۔

یہ تینوں سلسلے مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ تک جاتے ہیں۔

۴۔ ان کے علاوہ ممتاز عرب محدثین سید احمد زینی دحلان امام المسجد الحرام اور سید احمد برزنجی مفتی الشافعیہ بالمدینۃ المنورۃ سے بھی حضرت مولانا کو براہ راست اجازت حدیث حاصل تھی۔

علاوہ ازیں شیخ بدر الدین محدث شامی سے بذریعہ مراسلت اجازت حدیث حاصل تھی۔

ان تمام سندوں کی تفصیلات اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اسانید اصحاب صحاح ستہ تک حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ برنی مہاجر مدنی نے اپنی بے نظیر کتاب العناقید الغالیۃ من الاسانید العالیۃ میں درج فرمادی ہیں، یہ تفصیلات شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اوجز المسالک کے مقدمہ میں اور الدر المنضود اور الیانع الجنی کے مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔

تدریسی خدمات:

حضرت مولانا کی فراغت ۱۲۸۸ھ میں ہوئی، اس وقت آپ کے تمام اکابر موجود تھے، جن میں آپ کے حقیقی ماموں اور مربی مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

نانوتوی، مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، شاہ عبدالغنی صاحب مجددی، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اور مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی رحمہم اللہ موجود تھے۔

انھیں اکابر کے اشارے اور مشورے پر مولانا نے ۱۲۸۸ھ سے ۱۳۰۸ھ تک منگلور، بھوپال، سکندرآباد، بھاولپور اور بریلی میں مختلف مدارس میں تدریسی تبلیغی خدمات انجام دیں اور اس درمیان مختلف اکابر ومشائخ سے استفادہ بھی فرماتے رہے، اور تائید حق اور تردید باطل کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

۱۲۹۷ھ میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا انتقال ہوا پھر ۱۳۰۴ھ تک ایک ایک کر کے اکابر واساتذہ رخصت ہوتے رہے، ۱۳۰۶ھ سے ۱۳۰۸ھ تک آپ کا قیام بریلی میں رہا، ۱۳۰۸ھ میں آپ کے شیخ ومرشد حضرت گنگوہیؒ نے آپ کے لئے دارالعلوم دیوبند کا قیام تجویز فرمایا، بریلی والے مولانا کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے، مولانا گنگوہیؒ نے ان کی جگہ ایک عالم مولوی محمد عمر ولایتی کو بریلی بھیجا اور آپ دیوبند آگئے۔

دارالعلوم دیوبند میں:

دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر مدرس دوم کی حیثیت سے ہوا، اس وقت دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ تھے، اور ان دونوں بزرگوں میں ایسا والہانہ اور مخلصانہ تعلق تھا جیسے ایک جان دو قالب، مولانا خلیل احمدؒ صاحب کا قیام دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۰۸ھ سے ۱۳۱۴ھ تک رہا، اس دوران آپ کے ذمہ کتب حدیث کی تعلیم تھی، اور دیگر فنون کی بھی اعلیٰ کتابیں آپ سے متعلق تھیں، خصوصاً مسلم شریف آپ ہی پڑھاتے تھے اور بیشمار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا، ۱۳۰۹ھ میں مولانا حسین احمدؒ صاحب مدنی بغرض تعلیم دیوبند پہونچے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مکان کے قریب اپنے دو بھائیوں کے ساتھ قیام کیا، بڑے بھائی نے حضرت شیخ الہندؒ سے تبرکاً بسم اللہ کرانے کی درخواست کی لیکن حضرت نے مولانا خلیل احمدؒ صاحب سے فرمایا آپ شروع کرادیں، چنانچہ حضرت مولانا نے میزان اور گلستاں کی بسم اللہ کرادی، اس کے بعد حضرت مولانا

۱۳۱۴ھ تک دیوبند رہے، اس درمیان آپ نے مولانا حسین احمدؒ صاحب کو تخلیص المفتاح پڑھائی، دارالعلوم دیوبند میں آپ کے تلامذہ میں سب سے نمایاں نام حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کا ہے۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں:

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا قیام بھی دارالعلوم دیوبند کے چھ ماہ بعد انھیں مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا جن مقاصد کے لئے دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی تھی، دونوں ادارے مسلک و مشرب اور نقطہائے نظر میں بھی متحد تھے، اکابر کا سلسلہ بھی ایک تھا، اساتذہ بھی مشترک تھے، شاہ ولی اللہؒ کے شجرہ طوبیٰ سے دونوں کی شاخیں ملتی تھی، سید احمد شہیدؒ کا جذبۂ جہاد وحریت دونوں کی رگوں میں رواں دواں تھا اور حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے چشمۂ معرفت وسلوک کے سوتے دونوں میں جاری تھے، اس لئے دونوں اداروں میں ابتداء سے باہم ربط واتحاد کی خوشگوار فضا قائم تھی، یہ ضرور تھا کہ دارالعلوم دیوبند کو اول مقام حاصل تھا، اور مظاہر علوم کو دوسرا، اہل مدرسہ کی درخواست پر ۹ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے مدرسہ مظاہر علوم کی باقاعدہ سرپرستی قبول فرمائی تو مدرسہ خیر وبرکت کے نئے دور میں داخل ہو گیا، حضرت گنگوہیؒ سے مدرسہ کے لئے ایک باصلاحیت اور جید الاستعداد صدر مدرس کی درخواست کی گئی اور اہل شہر نے حضرت مولانا خلیل احمدؒ صاحب کے نام کی تجویز پیش کی جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں مدرس دوم کے عہدہ پر فائز تھے اور اعلیٰ کتابیں ان کے زیر تدریس تھیں، حضرت گنگوہیؒ دونوں اداروں کے سرپرست بھی تھے اور حضرت سہارنپوریؒ کے مربی بھی۔

حضرت نے اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے مولانا سہارنپوریؒ کو ایک گرامی نامہ تحریر فرما کر مظاہر علوم کے مدرس اول کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے سہارنپور آنے کا حکم فرمایا، حضرت کے حکم پر مولانا خلیل احمدؒ صاحب ۵/ جمادی الثانیہ ۱۳۱۴ھ کو مظاہر علوم آ گئے اور اپنے استاذ مولانا محمد مظہرؒ صاحب نانوتوی کے مسند درس کو رونق بخشی، اس وقت مدرسہ کے مہتمم مولانا عنایت الٰہی تھے۔

حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی اور مولانا خلیل احمدؒ صاحب کی صدر مدرسی کے بعد مظاہر علوم کی رفتار ترقی تیز تر ہو گئی، اکابر دیوبند کے ساتھ ربط وضبط میں بھی اضافہ ہوا، مولانا خلیل احمدؒ صاحب نے

پہلے سال ۱۳۱۴ھ میں دیگر کتب متعلقہ کے ساتھ موطأ امام محمد کا بھی درس دیا، لیکن ۱۳۱۵ھ سے دورۂ حدیث کے اہم اسباق مولانا سے متعلق ہو گئے، اس سال بخاری شریف مکمل، ابوداؤد شریف مکمل، ترمذی شریف مکمل اور مسلم شریف (۳۰ صفحات) کے اسباق آپ سے متعلق رہے، اور اگلے سال سے مسلم شریف بھی کامل آپ کے سپرد ہوگئی، اور پھر ۱۳۴۴ھ میں مستقل قیام کے لئے حجاز مقدس تشریف لے جانے تک صدارت اور آخری برسوں میں اس کے ساتھ نظامت کی ذمہ داری بھی آپ کے ذمہ رہی، اس طویل مدت میں آپ سے بے شمار طلبہ نے استفادہ کیا اور مدرسہ ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے برابر ترقی کرتا رہا، اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو حضرت مولانا کے تلامذہ کے نام ہی حضرت کی علمی عظمت کی شہادت کے لیے کافی ہوں گے۔

دیوبند اور سہارنپور میں حضرت سے استفادہ کرنے والے اپنے وقت میں آسمان علم وفضل کے آفتاب ومہتاب بن کر چمکے، جن میں چند نمایاں نام مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا سید عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم، مولانا محمد حیات صاحب سنبھلی بانی مدرسہ حیات العلوم مراد آباد، مولانا عبدالرحمن صاحب کیمل پوری صدر المدرسین مدرسہ مظاہر علوم، صاحب الطیب الشذی مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی، مولانا ظفر احمد تھانوی صاحب اعلاء السنن، مولانا اسعد اللہ صاحب رامپوری ناظم مدرسہ مظاہر علوم، مولانا بدر عالم میرٹھی جامع فیض الباری، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی صاحب التعلیق الصبیح، مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث سہارنپور، مولانا منظور احمد خان صاحب سہارنپوری، حکیم محمد ایوب صاحب سہارنپوری صاحب تراجم الاحبار وشارح طحاوی، مولانا خیر محمد مظفر گڑھی ثم المکی مدرس مسجد حرام مکہ مکرمہ، مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، مفتی سعید احمد اجراڑوی اور مفتی عبدالکریم گمتھلوی رحمہم اللہ وغیرہم۔

حرم شریف میں آپ کا درس حدیث:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو متعدد بار حج وزیارت مدینہ منورہ کی سعادت بخشی، اپنے تیسرے سفر حج میں حج سے فراغت کے بعد آپ نے ۱۳۲۴ھ میں تقریباً نصف ماہ مدینہ منورہ میں قیام فرمایا، اس

وقت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا قیام مدینہ طیبہ ہی میں تھا اور موصوف حرم نبویؐ میں درس حدیث دیا کرتے تھے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ، حضرت مدنیؒ کے اساتذہ واکابر میں شامل تھے، حضرتؒ کی مدینہ طیبہ تشریف بری کے موقع پر حضرت مدنیؒ نے علمائے مدینہ منورہ اور اپنے تلامذہ سے حضرت کا تعارف کرایا، اس سفر میں حضرت سہارنپوریؒ کا مدینہ طیبہ میں پندرہ دن قیام رہا، اس مدت میں آپ نے مسجد نبویؐ میں درس حدیث بھی دیا اور بڑے مجمع نے اوائل کتب حدیث سنا کر اجازت حدیث حاصل کی، اس واقعہ کی تفصیل خود حضرت مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''نقش حیات'' میں تفصیل کے ساتھ درج فرمائی ہے۔

درس مسلسلات:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے تینوں رسائل المسلسلات، الدرالثمین، النوادر اور ان کے علاوہ بعض دیگر احادیث مسلسلہ کی اجازت حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددیؒ اور مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانویؒ اور دیگر اکابر علماء سے حاصل تھی، مولانا کے یہاں مسلسلات کے درس کا بھی اہتمام تھا، یہ سلسلہ حضرت مولانا کے بعد ان کے حقیقی علمی وارث اور جانشین شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ نے جاری رکھا، اس ناکارہ کو بھی دوبار حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ سے مسلسلات پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور سند و اجازت سے بھی سرفرازی حاصل ہوئی۔

تصنیفات:

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے قلم سے متعدد علمی کتابیں وجود میں آئیں، براہین قاطعہ، ہدایات الرشید، مطرقۃ الکرامۃ، تنشیط الأذان، المہند علی المفند، المغتنم فی زکوۃ الغنم، إتمام النعم اور بذل المجھود ان میں ھدایات الرشید اور مطرقۃ الکرامۃ رد روافض سے متعلق ہے، براہین قاطعہ، تنشیط الأذان اور المہند علی المفند رد بدعت کے سلسلے کی کتابیں ہیں، إتمام النعم احسان وسلوک کے موضوع پر اور المغتنم فی زکوۃ الغنم بھیڑ کی زکوۃ کے مسئلہ پر

ایک رسالہ ہے، ہر کتاب علمی استدلالات سے پُر ہے اور اپنے موضوع پر انتہائی مکمل اور جامع ہے، لیکن آپ کی تصانیف میں سب سے قیمتی اور مفصل کتاب ''بذل المجہود فی حل سنن أبی داؤد'' ہے۔

بذل المجہود:

بذل المجهود في حل سنن أبي داؤد حضرت مولانا خلیل احمدؒ صاحب کا ایک عظیم علمی شاہکار ہے، حضرت مولانا کے ذہن میں متعدد اسباب کے تحت ابوداؤد شریف کی ایک مفصل اور جامع شرح لکھنے کا داعیہ مدت سے تھا، کئی بار اس کا آغاز بھی فرمایا لیکن طرح طرح کے مشاغل، متعدد بار نقل مکانی اور اہل باطل کے ساتھ آویزشوں کی وجہ سے یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں مل پار ہا تھا، ''كل امر مرهون باوقاته'' کے تحت جب اس تصنیف کا وقت آ ہی گیا تو بالآخر ربیع الاول ۱۳۳۵ھ میں اس شرح کا آغاز فرمایا، اس وقت حضرت عمر مبارک کی چونسٹھویں منزل میں تھے، ہاتھوں میں رعشہ اور قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو چکا تھا لیکن تصنیف کا داعیہ پورے شباب پر تھا، اس مبارک کام میں آپ کے قرۃ العین، عاشق صادق، محب کامل، فدا کار تلمیذ و مسترشد مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ نے آپ کے دست و بازو کا کام انجام دیا اور خود کو اس کام کے لئے وقف کر دیا، اور خدمت کا حق ادا کر دیا، سفر و حضر میں حضرت مولاناؒ کے ساتھ رہے اور تسوید و تبییض اور کتابت و طباعت کی ساری ذمہ داریوں کو اپنے سر لے لیا، آخر کار ۱۳۴۰ھ میں بذل المجہود کی پہلی جلد مکمل ہوئی پھر ۱۳۴۲ھ میں دوسری، آغاز کار کے نو سال بعد ۱۳۴۴ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب طویل قیام کے ارادے سے حجاز مقدس تشریف لے گئے اور آپ کے دست راست خادم خاص مولانا محمد زکریا صاحب بھی رفیق سفر رہے، اب بڑھاپا اپنے شباب پر تھا لیکن تکمیل کتاب کا شوق فراواں ہر ضعف پر غالب تھا، آخر کار ۲۳ شعبان المعظم ۱۳۴۵ھ کو اس مبارک شرح کا اختتام ہوا، اس موقعہ پر حضرت مولاناؒ نے مدینہ طیبہ کے علماء و مشائخ کی بڑے اہتمام کے ساتھ دعوت کی۔

زندگی کی شام ہو چکی تھی، بذل المجہود کی تکمیل کے بعد ہی علالت کا آغاز ہو گیا اور بتدریج مرض کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا اور مختلف عوارض پیش آتے رہے، آخر کار ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ

بروز چہارشنبہ بعد نماز عصر آواز بلند اللہ اللہ کا ورد شروع کیا، آواز آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

یہ آفتاب علم و معرفت مشرق و مغرب میں اپنی علمی وعرفانی کرنیں بکھیرنے کے بعد مدینہ طیبہ کے افق میں روپوش ہوگیا، آپ کا جسد عنصری جنۃ البقیع میں قبۂ اہل بیت کے قریب سپرد خاک کر دیا گیا۔

شمع کی گود میں پروانے کو نیند آئی ہے

بذل المجہود ابتداءً فارسی رسم الخط میں بڑے سائز کی پانچ جلدوں میں شائع ہوئی، اہل علم نے اس کتاب سے خوب خوب استفادہ کیا لیکن طرز کتابت اہل عرب کے لیے نامانوس ہونے کی بنا پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خواہش تھی کہ کتاب عربی ٹائپ میں شائع کردی جائے، چنانچہ حضرت کی حیات ہی میں دوبارہ عربی ٹائپ کے ساتھ بیس جلدوں میں شائع ہوئی، لیکن اس میں بھی کتابت کی بعض غلطیاں باقی رہ گئی تھیں۔

اللہ تعالیٰ خوب خوب جزائے خیر عطا فرمائے ڈاکٹر مولانا تقی الدین صاحب مظاہری ندوی مدظلہ العالی کو کہ انہوں نے اکابر کی کتابوں کو نئے انداز میں تحقیق وتعلیق کے ساتھ اعلیٰ معیار پر شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اور جس کے تحت اوجز المسالک، جزء حجۃ الوداع اور دیگر کئی کتابیں اعلیٰ معیار کی تحقیق وتحشیہ اور جاذب نظر کتابت وطباعت سے مزین ہوکر منصۂ شہود پر آچکی ہیں، اسی سلسلہ کی اب تک آخری کڑی بذل المجہود کی تازہ طباعت ہے، اس مختصر سے مقالہ میں بذل المجہود کی طبع جدید پر مکمل تبصرہ ممکن نہیں ہے، ضرورت ہے کہ اس طباعت کی خوبیوں پر کوئی صاحب نظر مستقل روشنی ڈالے۔

بذل المجہود کی خصوصیات وامتیازات:

جہاں تک اس عظیم المرتبت کتاب کی خصوصیات اور امتیازات کا تعلق ہے تو اس بے بضاعت طالب علم کا یہ منصب نہیں کہ وہ اس سلسلہ میں لب کشائی کر سکے۔

آنکھ والا ترے جلووں کا تماشہ دیکھے
کور بے چارے کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

البتہ متعدد ارباب بصیرت اہل علم نے کتاب کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، جن میں امام العصر مولانا سید انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، محدث جلیل مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور داعی کبیر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور حضرت کے سوانح نگار مولانا محمد ثانی حسنی رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں، انھیں حضرات کی تحریروں سے چند امتیازات کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کرنا مناسب ہوگا۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس شرح کے بارے میں فرماتے ہیں:

شفی و کفی ما فی الصدور فلم یدع
لذی اربۃ فی القول جداً ولا ھزلاً

مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ کا تاثر یہ ہے کہ:

الف۔ یہ کتاب الفاظ کی تحقیق، احادیث کی تشریح، موقعہ بموقعہ احادیث سے مسائل کے استنباط کے ساتھ اسماء الرجال کے سلسلے کی مفید بحث پر مشتمل ہے۔

ب۔ اس شرح کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قطب الارشاد، فقیہ النفس، محدث جلیل حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ کی وہ علمی توجیہات اور افادات بھی شامل ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو شرح صدر عطا فرمایا تھا، جو حل مشکلات کے سلسلہ میں بے نظیر ہیں، ان افادات کو حضرت گنگوہیؒ کے خادم خاص اور تلمیذ ارشد مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ نے بھی ضبط فرمایا تھا اور خود حضرت سہارنپوریؒ بھی ان افادات کے امین تھے۔

ج۔ یہ ایسی واضح اور سہل الماخذ شرح ہے جس سے اساتذۂ کرام اور تلامذہ بیک وقت استفادہ کر سکتے ہیں۔

د۔ ابوداؤد شریف میں جہاں کسی راوی کے نام میں اشتراک یا اشتباہ واقع ہوا ہے شرح میں اس

نام کی تعیین کر دی گئی ہے۔

ہ۔ احادیث کی تسلی بخش تشریح کے ساتھ ائمہ مذاہب کے اقوال وآراء اور ان کے دلائل سے بھی بحث کی گئی ہے، کہیں کہیں صحابہ کرام اور تابعین کے بھی اقوال نقل کئے گئے ہیں۔

و۔ یہ شرح بیک وقت فقیہ اور محدث دونوں کے لئے مفید اور نفع بخش ہے۔

ز۔ قال ابوداؤد کی دلنشیں تشریح کی گئی ہے، ابوداؤد شریف کے نسخوں میں اگر کہیں اختلاف ہے تو صحیح ترین نسخے کی نشان دہی کی گئی ہے، امام ابوداؤد نے جو روایات وآثار تعلیقاً ذکر کئے ہیں ان کے اسناد اور ماخذ کی حتی الامکان تحقیق کی گئی ہے، جو ابواب بظاہر مکرر ہیں ان کی توجیہ اور تکرار کی حکمت ومصلحت سے بحث کی گئی ہے۔

مولانا علی میاںؒ صاحب نے بذل المجہود کے اس پہلو کو خاص طور پر اجاگر کیا ہے کہ برصغیر میں حدیث کی شروح پر عامۃً متکلمانہ رنگ غالب رہا ہے، چندہی کتابیں اس سے مستثنیٰ ہیں لیکن بذل المجہود خالص محدثانہ طرز پر لکھی گئی ہے، جس میں ہر مرحلہ پر اسماء الرجال اور اصول حدیث کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

اگر کسی مسئلہ میں پیش رو شراح کے درمیان اختلاف ہوا ہے تو اس میں قول فیصل کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

اس کوتاہ نظر طالب علم کی نظر میں اس شرح کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے صاحب بصیرت اور بالغ نظر عالم کی تصنیف ہے جو بیک وقت ماہر فن حدیث اور وسیع النظر فقیہ ہونے کی بنا پر "رب حامل فقہ إلی من ھو أفقہ منہ" کا کامل مصداق ہے اور ساتھ ہی اس کا سینہ عشق الٰہی اور محبت رسول سے معمور ہے، اور وہ اپنی عمر عزیز کا نصف صدی سے زائد حصہ درس حدیث، افتاء اور ارشاد میں صرف کر چکا ہے، جس کی تربیت ایسے قطب وقت، فقیہ النفس محدث کے ذریعہ ہوئی ہے جس کی پوری عمر درس حدیث، فقہ وفتاویٰ اور ارشاد وسلوک میں گذری ہے، اور ظاہر ہے کہ ہر تصنیف مصنف کے علم وشعور اور احساسات کا پرتو ہوتی ہے، اس لئے یہ شرح بھی ان تمام خصوصیات کی حامل

ہے جو مصنف کے اندر موجود تھیں، راقم کے نزدیک ایسی جامعیت کم افراد کو میسر ہوتی ہے۔

اس مقالہ کی ترتیب میں مندرجہ مراجع سے خاص طور پر مدد حاصل کی گئی ہے۔

۱۔	بذل المجہود	حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ
۲۔	مقدمہ	حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ
۳۔	مقدمہ	حضرت مولانا عبدالحئی صاحب لکھنویؒ
۴۔	مقدمہ	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ
۵۔	مقدمہ	حضرت مولانا تقی الدین صاحب مظاہری ندوی
۶۔	مقدمہ اوجز المسالک	حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ
۷۔	نقش حیات	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ
۸۔	تذکرۃ الخلیل	حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ
۹۔	حیات خلیل	حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ
۱۰۔	العناقید الغالیہ فی الأسانید العالیہ	حضرت مولانا عاشق الٰہی برنی مہاجر مدنیؒ
۱۱۔	مقدمہ فتاویٰ خلیلیہ	حضرت مولانا محمد شاہد مظاہری
۱۲۔	حیات شیخ	حضرت مولانا محمد شاہد مظاہری



محدث جلیل مولانا شمس الحق عظیم آبادی

حیات وخدمات

۱۲۷۳ھ - ۱۳۲۹ھ

از: مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی

بہار میں دریائے گنگا کے کنارے بسا عظیم آباد جس کا پرانا نام پاٹلی پتر ہے قدیم زمانہ سے علم وعرفان اور تہذیب وثقافت کا گہوارہ رہا ہے، مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی اس مرکز علم وثقافت سے جڑ کر خطۂ بہار کے دیگر علاقے اور قصبات اپنے یہاں بھی علم کے جوت جگاتے رہے۔(۱)

بہار کی راجدھانی عظیم آباد اور اس کے اطراف جن کی علمی اور ثقافتی تاریخ رہتی دنیا تک روشن رہے گی، ان میں ڈیانواں، شکرانواں، استھانواں، اگانواں، مبدانواں، صادق پور، پھلواری، نیمی، دیسنہ، اور گیلانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بہار کے مشاہیر خاص طور پر علم حدیث کی خدمت میں جن کے اسمائے گرامی رہتی دنیا تک یاد کئے جائیں گے ان میں حضرت مخدوم شرف الدین احمد بن یحیٰ منیری (م ۷۸۲ھ) حضرت مخدوم احمد لنگر دریا (م ۸۹۱ھ) مولانا عتیق بہاری (م ۱۰۳۷ھ) تلمیذ شیخ نور الحق دہلوی، حضرت شاہ ظہور الحق (م ۱۲۳۴ھ) مولانا کمال علی پوری (م ۱۲۳۴ھ) مولانا سعید حسرت (م ۱۳۰۴ھ) حضرت مولانا سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) مولانا شیخ محمد نور علی محدث سہرامی (م ۱۲۶۲ھ) مولانا عبد

العزیز رحیم آبادی (م ۱۳۳۶ھ) مولانا عبدالغفار مہدانوی (م ۱۳۱۵ھ) مولانا ابومحمد ابراہیم آروی (م ۱۳۱۹ھ) مولانا رفیع الدین شکرانوی (م ۱۳۳۸ھ) مولانا شمس الحق ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ) مولانا شوق نیموی (م ۱۳۲۲ھ) مولانا اصغر حسین بنولوی (م ۱۹۲۸ء) مولانا سید فضل اللہ مونگیری (م ۱۹۷۹ء) مولانا سید مناظر احسن گیلانی (م ۱۳۷۵ھ) علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) مفتی سید محمد عمیم الاحسان مجددی (م ۱۳۹۴ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری کے جن ہندوستانی علماء نے اپنی زندگی خدمت حدیث کے لئے وقف کر دی تھی ان میں ڈیانواں کے فرزند جلیل علامہ ابوالطیب شمس الحق بن امیر علی نہایت ممتاز نظر آتے ہیں۔

پٹنہ شہر سے جنوب مشرق کی جانب چوبیس میل کے فاصلے پر اور ''فتوحہ'' اسٹیشن سے آٹھ میل کی دوری پر ''ڈیانواں'' ایک چھوٹی سی بستی ہے، علامہ شمس الحق عظیم آبادی کا ننیہال یہیں تھا، ان کی پرورش و پرداخت اور نشوونما بھی یہیں ہوئی اور وہ اخیر عمر تک اسی بستی میں مقیم رہے۔ (۲)

عظیم آباد کی یہ چھوٹی سی بستی علم حدیث کی ضوفشانیوں سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی یہیں ''التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی''، ''غایۃ المقصود'' اور ''عون المعبود'' جیسی اہم کتابیں لکھی گئیں۔ (۳)

مولانا شمس الحق کے آباء واجداد کا اصل مکان موضع ''برداس بگھہ'' تھا جو فتوحہ اسٹیشن سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے، ان کے پردادا مولانا شیخ غلام حیدر ذی ثروت اور صاحب مقدرت شخص تھے، ''گذری محلّہ'' عظیم آباد میں ان کی کئی عالیشان کوٹھیاں تھیں، ان کے والد مولوی شیخ امیر علی کا قیام کبھی ''برداس بگھہ'' اور کبھی ''گذری'' میں رہتا۔

۱۲۶۳ھ میں جب ان کا نکاح ''رمنہ محلّہ'' عظیم آباد اور ''ڈیانواں'' کے رئیس مولانا گوہر علی (م ۱۲۸۷ھ) کی صاحبزادی سے ہوا تو وہ اکثر رمنہ میں اپنے خسر صاحب ہی کے مکان پر قیام کرنے لگے، کیونکہ مولانا گوہر علی اور ان کی بیوی اپنی اکلوتی لڑکی کی فرط محبت کی وجہ سے اپنے سے جدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ (۴)

مولانا کے والد ماجد شیخ امیر علی بڑے نیک دل اور منکسر المزاج مخلص تھے، انہوں نے فارسی کے اسباق اپنے بزرگوں سے پڑھے، اور مولوی عبد الحکیم، مولوی شیخ مسیح اللہ، اور مولوی ابو الحسن (م ۱۲۹۳ھ) وغیرہ سے رمنہ میں شرح وقایہ، شرح جامی اور دیگر کتابیں پڑھیں، اس کی وجہ سے شرعی مسائل میں ان کو اچھی سوجھ بوجھ ہوگئی تھی، ان کی ولادت ۱۲۳۳ھ اور وفات رمنہ میں ۱۲۸۳ھ میں ہوئی اور ہر داس گھ میں مدفون ہوئے۔(۵)

مولانا کی والدہ ماجدہ ماہ صفر ۱۲۲۹ھ میں بمقام محلہ رمنہ میں پیدا ہوئیں، جب سن شعور کو پہونچیں تو منشی بشارت کریم نے ان کو نماز وروزہ کے ضروری مسائل کی تعلیم دی، اور پارہ عم اور مختلف سورتیں اور ادعیہ ماثورہ پڑھائیں، ربیع الاول ۱۲۶۳ھ میں ان کا نکاح مولوی شیخ امیر علی سے ہوا، بڑی نیک بخت خاتون تھیں، ابتداء ہی سے صوم وصلاۃ کی پابند تھیں، نفل نمازیں پڑھتیں اور نفل روزہ کا التزام سے رکھتی تھیں، اعتکاف وقیام رمضان کا بھی بڑا اہتمام کرتی تھیں، ۱۳۱۲ھ میں اپنے پوتوں اور خاندان کے بعض اعزہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی زیارت اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئیں، حج سے واپسی کے بعد مدتوں زندہ رہیں، اللہ تعالی نے انہیں پانچ لڑکیاں اور چار لڑکے عطا کیے تھے، بڑے لڑکے کبیر الحق اور چھوٹے ظہیر الحق کمسنی ہی میں رحلت کر گئے، تیسرے لڑکے مولانا شمس الحق اور چھوٹے مولانا محمد اشرف (م ۱۳۲۶ھ) تھے۔(۶)

مولانا عظیم آبادی کے نانا مولانا گوہر علی (جن کی ولادت "ڈیانواں" میں ۱۲۱۳ھ میں ہوئی) علاء کے بڑے قدرداں اور نہایت فیاض طبع مخلص تھے، بعض علماء نے مستقل طور پر ان کے یہاں بود وباش اختیار کر رکھی تھی، ان کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا، ان کے کتب خانہ میں قلمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا ۱۲۸۷ھ کو وفات پائی اور "ڈیانواں" میں مدفون ہوئے۔(۷)

مولانا عظیم آبادی کا سلسلۂ نسب دادیہال اور نانیہال دونوں طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، موصوف ۲۷/ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ، جولائی ۱۸۵۷ء کو رمنہ میں پیدا ہوئے، پانچ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے نانیہال "ڈیانواں" چلے آئے اور یہیں مستقل

سکونت اختیار کرلی، کیونکہ ان کی والدہ بھی مستقل طور پر یہیں رہتی تھیں، ابھی گیارہ سال کی عمر تھی کہ ۱۲۸۴ھ میں والد ماجد انتقال کر گئے، ان کی ماں، نانی اور بڑے ماموں نے بڑے لاڈ پیار سے پالا پوسا، ان کے بڑے ماموں مولوی محمد احسن (م ۱۳۰۱ھ) ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور کبھی ان کی کوئی خواہش رد نہیں کرتے تھے، تعلیم وتربیت اور تمام ضرورتوں کی اس طرح کفالت کی کہ مولانا کو کبھی باپ کے سایۂ شفقت سے محرومی کا احساس نہ ہونے دیا۔ (۸)

مولانا محمد ابراہیم نگرنہسوی (م ۱۲۸۲ھ) نے بسم اللہ کرائی اور سورہ اقرأ پڑھائی، پھر ''ڈیانواں'' ہی میں حافظ اصغر علی رام پوری اور دوسرے معلمین سے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے، ان میں مولوی سید راحت حسین بھتوی اور مولوی عبدالحکیم شیخ پوری (م ۱۲۹۵ھ) کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے، فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا لطف علی بہاری (م ۱۲۹۶ھ) سے عربی شروع کی اور شرح جامی، قطبی، میبذی، اصول الشاشی، نور الانوار، شرح وقایہ، کنز الدقائق اور جامع الترمذی وغیرہ پڑھیں، اسی عرصہ میں اپنے ماموں مولوی نور احمد ڈیانوی (م ۱۳۱۸ھ) سے بھی استفادہ کرتے رہے۔ (۹)

۱۲۹۲ھ میں حصول علم کے لئے پہلی بار ''ڈیانواں'' سے باہر قدم نکالا اور لکھنؤ تشریف لے گئے، یہاں مولانا فضل اللہ لکھنوی (م ۱۳۱۱ھ) سے سال بھر تک معقولات کا درس لیتے رہے، ۲۶ رمحرم ۱۲۹۳ھ کو مراد آباد مولانا بشیر الدین قنوجی (م ۱۲۹۶ھ) کی خدمت میں کتب درسیہ کی تکمیل کے لئے حاضر ہوئے، ایک سال سے کچھ زیادہ قیام کرنے کے بعد ربیع الاول ۱۲۹۴ھ میں وطن واپس آئے اور پھر دوبارہ ۲۰ رجمادی الاولی ۱۲۹۴ھ کو مولانا موصوف کی خدمت میں مراد آباد پہونچے اور معقولات، بلاغت اور معانی کی کتابیں، قرآن مجید کا ترجمہ اور مشکاۃ المصابیح کا کچھ حصہ پڑھا، اور قرآن وحدیث اور فقہ وعقائد سے متعلق مسائل کی تحقیق بھی کرتے رہے۔ (۱۰)

اوائل محرم ۱۲۹۵ھ میں دہلی مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں استفادہ کے لیے تشریف لے گئے، اخیر محرم ۱۲۹۶ھ میں میاں صاحب سے حدیث کی سند حاصل کر کے اپنے مکان

واپس آگئے، اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، چھ سال بعد ۱۳۰۲ھ میں میاں صاحب کی کشش اور محبت دوبارہ ان کو دہلی کھینچ لے گئی، چنانچہ ان سے دوسری سند لے کر ۱۳۰۳ھ میں ''ڈیانواں'' تشریف لائے، دونوں مرتبہ دہلی میں میاں صاحب کے یہاں قیام کی مدت تقریباً ڈھائی سال رہی، اس عرصہ میں ان سے ترجمہ کلام مجید، تفسیر جلالین، صحاح ستہ، موطأ امام مالک، سنن دارمی، سنن دارقطنی اور شرح نخبۃ الفکر سبقاً سبقاً پڑھی اور فتوے بھی قلم بند کرتے رہے۔ (۱۱)

دہلی کے دوسرے سفر میں شیخ حسین بن محسن یمانی انصاری (م ۱۳۲۷ھ) کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے، اور صحاح ستہ کے اطراف پڑھ کر ان سے عام اجازت حاصل کی، اس کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں وہ دس بارہ دفعہ علامہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے۔ (۱۲)

ابتدا ہی سے ان پر اتباع سنت کا شوق غالب تھا، عقائد و اعمال میں صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کا مسلک اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے، ان کا خود بیان ہے:

''مولانا علیم الدین حسین نگرنہسوی کے پند و نصائح سے بڑا فائدہ حاصل ہوا، اللہ تعالی نے اتباع سنت کا شوق انہیں کے واسطے سے ہم کو عطا فرمایا ہے، اور میرے رفیق حبیب مولوی تلطف حسین محی الدین پوری (م ۱۳۳۴ھ) نے بھی ان امور میں میری بڑی مدد کی ہے'' جزاهما الله خيرا۔ (۱۳)

جب پہلی بار مراد آباد کے سفر سے ''ڈیانواں'' واپس ہوئے تو ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ میں چھپرہ (سارن) کے مولوی عبداللطیف صدیقی کی دوسری صاحبزادی سے ان کا عقد ہوا۔ (۱۴)

۱۰ رجب ۱۳۱۱ھ کو مولانا ''ڈیانواں'' سے حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے، اس سفر میں بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہونے کے علاوہ حرمین کے متعدد اہل فضل و کمال سے ملاقات و استفادہ کا موقع ملا۔ (۱۵) جن مشائخ نے سند و اجازت مرحمت کی تھی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) علامہ خیر الدین ابوالبرکات نعمان بن محمود الآلوسی الحنفی البغدادی (م ۱۳۱۷ھ)۔

(۲) شیخ احمد بن ابراہیم بن عیسیٰ النجدی ثم المکی الحنبلی (م ۱۳۲۹ھ)۔
(۳) شیخ احمد بن احمد بن علی المغربی التونسی ثم المکی (م ۱۳۱۴ھ)۔
(۴) شیخ قاضی عبدالعزیز بن صالح بن مرشد الحنبلی المشرقی (م ۱۳۲۴ھ)۔
(۵) عبدالرحمٰن بن عبداللہ السراج الحنفی الطائفی (م ۱۳۱۵ھ)۔
(۶) شیخ محمد بن سلیمان حسب اللہ الشافعی المکی (۱۳۳۵ھ)۔
(۷) شیخ ابراہیم بن احمد بن سلیمان المغربی ثم المکی۔
(۸) شیخ محمد فاتح بن محمد بن عبداللہ الطاہری ثم المہداوی المالکی المدنی (م ۱۳۲۸ھ)۔ (۱۶)

ان علماء سے چھ ماہ تک استفادہ کرنے اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد ۱۰ محرم ۱۳۱۲ھ کو وطن واپس آئے۔(۱۷)

میاں صاحب کے یہاں سے جب پہلی مرتبہ ۱۲۹۶ھ میں اپنے وطن واپس ہوئے تو دیگر علمی کاموں کے ساتھ ہی درس و تدریس کا مشغلہ بھی اختیار کیا، ۱۳۰۳ھ میں دوسری بار جب وہاں سے واپس آئے تو باقاعدہ مسند درس پر رونق افروز ہوئے، ان کے حلقۂ درس میں ملک کے گوشہ گوشہ سے لوگ آ کر مستفید ہوتے تھے، عرب اور ایران کے طلبہ بھی ہوتے تھے، وہ طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے، طلبہ کے قیام و طعام، ان کے لئے کتابوں کی فراہمی اور ضروری اخراجات کا سامان بھی کرتے تھے، ان کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا، میاں صاحب کے بعد کم ہی لوگوں کے حلقۂ درس کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔(۱۸) مولانا کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں :

(۱) مولانا احمد اللہ پرتاب گڈھی (م ۱۳۶۲ھ)۔
(۲) مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی (م ۱۳۸۱ھ)۔
(۳) مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (م ۱۳۶۹ھ)۔ (۴) مولانا عبدالحمید سوہدروی (م ۱۳۳۰ھ)۔
(۵) مولانا فضل اللہ مدراسی (م ۱۳۶۱ھ)۔ (۶) مولانا شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی (م ۱۳۲۶ھ)۔

(۷) مولانا ابوعبداللہ محمد زبیر ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ)۔ (۸) حکیم محمد ادریس ڈیانوی (م ۱۳۶۰ھ)۔

(۹) مولانا کی چار لڑکیاں اور تین لڑکے تھے لڑکوں کے نام یہ ہیں:

(۱) محمد شعیب : یہ بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔

(۲) حکیم ابوعبداللہ محمد ادریس ۱۶ ر رجب ۱۲۹۸ھ کو پیدا ہوئے، دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے طب کی تحصیل کی اور اپنے اطراف کے ایک بڑے طبیب کی حیثیت سے معروف ہوئے، ان کے مضامین اور مقالات اہل حدیث امرتسر میں شائع ہوئے ہیں، مدرسہ اصلاح المسلمین (پٹنہ) کے ناظم بھی بہت دنوں تک رہے، اخیر عمر میں ڈھاکہ منتقل ہو گئے اور وہیں ۱۹۶۰ء کو وفات پائی۔

(۳) حافظ عبدالفتاح المعروف بہ محمد ایوب : ۷ ر محرم ۱۳۰۵ھ کو پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد دینی تعلیم حاصل کی، اپنے والد، چچا (مولانا محمد اشرف) اور بڑے بھائی (حکیم محمد ادریس) کے ساتھ ۱۳۲۱ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، وہاں حجاز کے علماء و مشائخ سے استفادہ کیا، وطن واپس آنے کے بعد وہ چند سال ڈیانواں میں رہے، پھر بہار اس گھر منتقل ہو گئے، کچھ دنوں صادق پور میں بھی مقیم رہے، ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا۔ (۲۰)

مولانا کے احباب کی فہرست مع ان کے حالات زندگی وعلمی کارنامے "حیاۃ المحدث شمس الحق وأعمالہ" کے فاضل مؤلف نے ذکر کئے ہیں، جن کے اسماء درج ذیل ہیں :

(۱) مولانا رفیع الدین شکرانوی (م ۱۳۳۸ھ)۔

(۲) مولانا محمد اسمٰعیل علیگڑھی (م ۱۳۱۱ھ)۔

(۳) مولانا عبدالتواب ملتانی (م ۱۳۶۶ھ)۔

(۴) مولانا ابومحمد ابراہیم آروی (م ۱۳۱۹ھ)۔

(۵) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (م ۱۳۳۶ھ)۔

(۶) مولانا عبدالجبار غزنوی (م ۱۳۳۱ھ)۔

(۷) مولانا عبداللہ غازیپوری (م ۱۳۳۷ھ)۔

(۸) مولانا عین الحق پھلواروی (م ۱۳۳۳ھ)۔
(۹) مولانا تلطف حسین عظیم آبادی (م ۱۳۳۴ھ)۔
(۱۰) مولانا علیم الدین حسین نگرنہسوی (م ۱۳۰۶ھ)۔
(۱۱) مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (م ۱۳۵۳ھ)۔
(۱۲) مولانا عبدالسلام مبارکپوری (م ۱۳۴۲ھ)۔
(۱۳) مولانا محمد اشرف ڈیانوی عظیم آبادی (م ۱۳۲۶ھ)۔
(۱۴) مولانا عبدالجبار ڈیانوی (م ۱۳۲۱ھ)۔
(۱۵) مولانا یوسف حسین خانپوری (م ۱۳۵۹ھ)۔
(۱۶) مولانا ابویحییٰ محمد شاہجہانپوری (۱۳۳۸ھ)۔
(۱۷) مولانا ابومحمد عبداللہ چھپراوی (م ۱۳۴۸ھ)۔
(۱۸) مولانا سعید بنارسی (م ۱۳۲۲ھ)۔
(۱۹) مولانا ابوالمکارم محمد علی مئوی (م ۱۳۵۲ھ)۔
(۲۰) مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۳۶۷ھ)۔ (۲۱)

مولانا شمس الحق عظیم آبادی کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ ان کا کتب خانہ ہندوستان کے عظیم الشان کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا، یہ مختلف فنون کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا، فن حدیث کے اتنے عمدہ ذخیرہ سے اس وقت کے اکثر کتب خانے خالی تھے، اس کتب خانہ میں مخطوطات اور نادر و نایاب کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تھا، جو یورپ کے بعض بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ (۲۲)

بنارس کے ٹاؤن ہال میں ۱۴ راپریل ۱۹۰۶ء کو ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام جن نادر و کمیاب کتابوں کی نمائش کی گئی تھی، ان میں فن حدیث کی بعض نہایت قدیم اور نایاب کتابیں مولانا کے کتب خانہ سے آئی تھیں، مولانا شبلیؒ نے مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

"مسند عبد بن حميد، مسند أبي عوانه، كشف الأستار عن زوائد مسند البزار للهيثمي، مصنف ابن أبي شيبه، معرفة السنن و الآثار للبيهقي، معالم السنن للخطابي، شرح سنن أبي داود لابن القيم". (۲۳)

ان کے علاوہ صحیح ابن حبان، مسند بزار، مسند حمیدی، الثقات لابن حبان، تاریخ الاسلام للذہبی، قیام اللیل للمروزی، الإلمام لابن دقیق العید، شروط الأئمۃ الخمسۃ للحازمی، التنقیح للزرکشی، نور العینین فی اثبات رفع الیدین لأبی اسحٰق المحمر اوی الأعظمی، التمہید لابن عبدالبر، الأطراف للمزی اور النکت الظراف علی الأطراف لابن حجر جیسی اہم قلمی کتابیں ان کے کتب خانہ میں موجود تھیں، (۲۴) یہ کتب خانہ مولانا عظیم آبادی کی عمر بھر کی محنت وجانفشانی کا نتیجہ اور ان کے خدا داد شوق علم کا ثمرہ تھا۔

مولانا عظیم آبادی کو تصنیف وتالیف کا بڑا عمدہ ذوق تھا، کتب حدیث کی شرح وتحقیق اور تصحیح تالیف کے علاوہ فقہ وفتاوی، رجال وتاریخ اور تذکرہ وسیر میں بھی انہوں نے مفید اور بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان سے ان کے علمی تبحر، جامعیت، وسعت نظر، حدیث وفقہ میں بصیرت، رجال واسناد اور تاریخ وسیر میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (۲۵)

ذیل میں ان کی تصانیف کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے:

(۱) غاية المقصود في حل سنن أبي داود:

یہ سنن ابی داود کی مبسوط اور جامع شرح ہے لیکن اس کی صرف ایک ہی جلد مطبع انصاری دہلی سے ۱۳۰۵ھ میں مولانا تلطف حسین عظیم آبادی (م ۱۳۳۴ھ) کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے، عام خیال ہے کہ ۳۲ جلدوں میں ہے لیکن یہ سب جلدیں لکھی نہ جاسکیں بلکہ یہ مولانا کا پروگرام تھا، وفات تک شرح نامکمل ہی رہی: "عون المعبود" میں کئی جگہ غایۃ المقصود کا حوالہ آیا ہے، آخری بار" باب في الدعاء للميت إذا وضع في قبره" (ج:۳ص:۲۰۶) جو سنن ابی داود کے اکیسویں پارے میں ہے) میں "غاية المقصود" کا ذکر ہے، اس کے بعد پھر کہیں اس کا حوالہ نہیں آیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ" غاية المقصود" کم از کم اکیس پارے تک مکمل ہو چکی تھی، مگر افسوس کہ شرح کے جو اجزاء لکھے جا چکے تھے ان

میں سے صرف دو جلدیں خدا بخش لائبریری میں محفوظ رہ گئی ہیں، جن میں ''کتاب الطہارۃ'' کی شرح مکمل ہوگئی ہے اور ''کتاب الصلاۃ'' کے بھی چند ابواب کی شرح موجود ہے، باقی حصوں کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا ہوئے؟۔(۲۶)

مطبوعہ جلد بڑی تقطیع کے ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ابتداً یعنی کتاب الطہارۃ کے ۷۵ ابواب کے تحت درج ۱۸۴ حدیثوں کی شرح وتوضیح کی گئی ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جو امام ابوداود کے حالات وکمالات اور ان کی سنن کے متعلق مختلف معلومات پر مشتمل ہے، اس کو سنن ابی داود کی مفید اور اہم شرحوں میں خیال کیا جاتا ہے، بلکہ متعدد حیثیتوں سے یہ سنن کی تمام شرحوں سے بہتر ہے۔(۲۷)، اس شرح کا ایک ایڈیشن محقق فاضل محمد عزیز شمس کی تحقیق سے علمی اکیڈی کراچی سے شائع ہو چکا ہے، جس میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ دونوں حصے شامل ہیں۔

(۳) عون المعبود: یہ بھی سنن ابی داود کی شرح اور دراصل غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے، جو چار ضخیم جلدوں میں مطبع انصاری دہلی سے بڑی تقطیع کے ۱۹۰۰ صفحات پر ۱۳۱۸ھ تا ۱۳۲۳ھ میں شائع ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عون المعبود اصلاً مولانا عظیم آبادی ہی کی شرح ہے، مگر چونکہ ابتدا کی دونوں جلدوں کو غایۃ المقصود سے مختصر کرنے کا کام ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد اشرف اور کچھ دوسرے علماء مثلاً مولانا عبدالرحمن مبارکپوری، حکیم محمد ادریس ڈیانوی، مولانا عبدالجبار ڈیانوی، قاضی حسین خانپوری وغیرہ نے کیا تھا، اور اس سلسلہ میں ہر طرح مولانا کی مدد کی تھی اس لئے تالیف قلب کی غرض سے ابتدائی دو جلدوں کی نسبت اپنے بھائی کی طرف کردی۔(۲۸) جیسا کہ صاحب ''نزھۃ الخواطر'' مولانا محمد اشرف کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

" وقد عزا إليه صنوه شمس الحق المجلد الأول من عون المعبود اعبرني بذلك الشيخ شمس الحق". (۲۹)

اسی طرح مولانا کے تمام احباب وتلامذہ نے عون المعبود کو مولانا شمس الحق ہی کی تالیف بتایا

ہے۔(۳۰) عون المعبود کے ناشر مولانا تلطف حسین عظیم آبادی اور دوسرے تقریظ نگاروں نے بھی چاروں جلدوں کو مولانا شمس الحق ہی کی جانب منسوب کیا۔(۳۱)

اوپر کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ عون المعبود کے مؤلف مولانا شمس الحق عظیم آبادی ہی ہیں، انہیں سنن ابی داود کی شرح لکھتے وقت اس کی ایک مختصر شرح کی تالیف کا خیال ہوا کیونکہ وہ دو جلدوں کے بقدر مفصل شرح لکھ چکے تھے، اسی لئے تلخیص کا کام جو نسبتاً آسان تھا اپنے چھوٹے بھائی اور بعض دوسرے علماء کے ذمہ کر دیا اور انہوں نے مولانا کے مشورہ اور امداد سے یہ کام انجام دیا، اس طرح ان دونوں جلدوں کے بعد یہ مختصر شرح کی ترتیب و تالیف کا کام مولانا شمس الحق نے ان علماء کے اشتراک سے کیا اس شرح کی تالیف میں کل سات سال کی مدت صرف ہوئی۔(۳۲)

اس شرح میں بھی غایۃ المقصود کی اہم خصوصیات آگئی ہیں، دونوں میں محض اجمال اور تفصیل کا فرق ہے، بعض مقامات پر عون المعبود میں بھی بڑے طویل مباحث آگئے ہیں، اہل فن کا خیال ہے کہ اس میں سنن ابی داود کی اسانید و متون کی مشکلات حل کی گئی ہیں، اور یہ بے شمار لطیف و دقیق مسائل و مباحث کا مجموعہ، نادر تحقیقات اور علمی نکات پر مشتمل ہے اور مختصر ہونے کے باوجود مفید ہے۔(۳۳)

یہ شرح ہندوستان کے علاوہ لبنان اور پاکستان سے بھی فوٹو اسٹیٹ پر اور سعودی عرب سے ٹائپ پر طبع ہو چکی ہے، المکتبۃ السلفیۃ مدینہ منورہ سے متوسط سائز کی ۱۴ جلدوں میں شیخ عبدالرحمٰن محمد عثمان کی تصحیح کے ساتھ ۱۹۶۸ء۔۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی ہے، اس میں متن پر اعراب بھی ہے اور ہر ہر باب کی حدیثوں پر نمبر بھی لگا دیا گیا ہے لیکن افسوس کہ اس میں بہت تصحیفات در آئی ہیں۔

اس شرح کے سلسلہ میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی ایک بڑی علمی خدمت یہ ہے کہ سنن ابی داود کے متن کی تصحیح کا انہوں نے خاص اہتمام کیا تھا، چنانچہ سنن کے گیارہ نسخے جمع کئے گئے جن میں تین مطبوعہ اور آٹھ مخطوطہ نسخے تھے، [۳۵] ان مخطوطات کی تفصیل یہ ہے:

(۱) نسخہ مکتوبہ ۱۱۰۳ھ بخط شیخ صدیق بن محمد حنفی زبیدی تلمیذ علامہ زکی الدین طاہر بن حسین بن عبدالرحمٰن، یہ نسخہ صحیح اور اصل سے مقابلہ کردہ تھا۔

(۲) نسخہ مکتوبہ ۱۰؍شوال ۱۱۶۷ھ بخط شیخ محمد خلیلی اس پر علامہ مرتضیٰ زبیدی کے خطوط تھے۔

(۳) نسخہ مکتوبہ ۱۱۸۳ھ بخط سید یحییٰ بن احمد بن علی بن حسین یمنی۔

(۴) نسخہ صحیحہ عتیقہ ناتمام حضرت مولانا نذیر حسین دہلوی سے مستعار۔

(۵) نسخہ مکتوبہ ۱۲۴۴ھ بخط مرزا حسن علی محدث لکھنوی، اس پر علماء کرام کے خطوط تھے، حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی سے مستعار۔

(۶) شیخ عبدالغنی بن اسماعیل نابلوی کے نسخہ سے مقابلہ کیا ہوا نسخہ، شیخ نابلوی کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ ۱۰۹۹ھ میں بارہ نسخوں سے مقابلہ کیا گیا تھا۔

(۷) قاضی حسین بن محسن انصاری یمانی کے اصل مصحح نسخہ سے مقابلہ کردہ نسخہ۔

(۸) نسخہ قدیمہ عتیقہ. ناتمام جوابوبکر محمد بن بکر بن محمد بن عبدالرزاق التمار المصری معروف بہ ابن داسہ کی روایت کا تھا۔

نسخہ مطبوعہ میں ایک مصری نسخہ تھا جس کی طباعت ۱۲۸۰ھ میں ہوئی، دوسرا دہلی کا چھپا ہوا تھا جو حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری کے اصل کی نسخہ سے منقول اور اس کے علاوہ چند قدیم نسخوں سے مقابلہ کردہ تھا، یہ نسخہ ۱۲۷۲ھ میں چھپا۔

تیسرا نسخہ مصری عن الحواشی ہندوستان ہی کا مطبوعہ تھا۔ (۳۶)

اس شرح کے سلسلہ میں جن نادر و کمیاب کتب کی طرف مراجعت کی گئی تھی ان میں سے بعض کتابیں یہ ہیں:

تحفة الأشراف للحافظ المزی، مختصر السنن للحافظ منذری، جامع الأصول للحافظ ابن أثیر، معالم السنن للخطابی، معرفة السنن والآثار للبیهقی، المنتقی لابن تیمیه الجد، کتاب الأحکام للحافظ عبد الحق الاشبیلی، نصب الرایة للزیلعی، حاشیة السنن لابن القیم، تلخیص الحبیر للحافظ ابن حجر، الاستیعاب لابن عبد البر، أسد الغابة لابن الأثیر، تجرید أسماء الصحابة للذهبی، الإصابة للحافظ ابن حجر. (۳۷)

۳- التعليق المغني : علامہ شمس الحق کا دوسرا کارنامہ ہے، جو سنن دارقطنی کی نہایت بہتر شرح ہے، سنن دارقطنی کی تصحیح میں بھی انہوں نے متعدد مخطوطات کا مقابلہ کیا، اس کا نہایت عمدہ خوشخط کامل نسخہ ان کی ذاتی ملکیت میں تھا، مقابلہ کے لئے مولانا صدیق حسن خاں سے ایک کامل نسخہ مستعار لیا، اور مولانا رفیع الدین بہاری کا نسخہ بھی پیش نظر رکھا۔ (۳۸) مولانا کے حواشی، تعلیقات کی نوعیت کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوتا ہے :

" اكتفى بها على تنقيح بعض احاديثه وبيان علله وكشف بعض مطالبه على سبيل الإيجاز والاختصار ". (۳۹)

اس کے مقدمہ میں امام دارقطنی اور ان کی سنن کے متعلق مفید معلومات تحریر کی گئی ہیں، یہ کتاب بڑی تقطیع کی دو جلدوں میں مطبع فاروقی دہلی سے پہلی بار ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی، اس کا فوٹو پاکستان سے شائع ہو چکا ہے، ایک اور ایڈیشن ٹائپ پر شیخ عبداللہ یمانی کی تصحیح کے ساتھ مدینہ منورہ سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا، اس کا فوٹو بھی لبنان اور پاکستان میں کئی بار لیا جا چکا ہے۔

۴- رفع الالتباس عن بعض الناس :

۳۷ صفحہ کا یہ رسالہ ۱۳۱۱ھ میں بڑی تقطیع پر مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن مولانا عبدالتواب ملتانی (م ۱۳۶۶ھ) نے ملتان سے ۱۳۵۸ھ میں شائع کیا تھا۔ تیسرا[۴۱] ایڈیشن محقق فاضل محمد عزیز شمس کی تصحیح و ترتیب کے بعد ٹائپ پر بنارس سے ۱۳۹۶ھ میں شائع ہوا۔ دارالصحوۃ مصر نے بھی ۱۴۰۵ھ میں محمد عزیز شمس کا تصحیح کردہ نسخہ شائع کیا ہے۔

امام بخاری سے متعلق ایک حنفی عالم نے جب ایک کتاب " بعض الناس فی دفع الوسواس " جس میں انہوں نے امام ابوحنیفہ پر امام بخاری کے ۱۴۴ اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی تو مولانا عظیم آبادی نے بڑے محققانہ انداز میں اس کی تردید " رفع الالتباس عن بعض الناس " کے نام سے لکھی اور دکھایا کہ کس طرح امام بخاری حق بجانب ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی تنقیص کی ہے بلکہ اس میں بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ (۴۲)

۵-إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر :

مطبع انصاری دہلی نے ۱۳۰۵ھ میں بڑی تقطیع کے ۲۷۶ صفحات پر اس کو شائع کیا تھا، موضوع نام سے ظاہر ہے، اکثر اہل علم نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی رسالہ نہیں لکھا گیا، ادارہ علوم اثریہ پاکستان نے جناب ارشاد الحق اثری کی تخریج وحواشی کے ساتھ بہترین ٹائپ پر اس کو ۱۹۸۷ء میں دوبارہ شائع کیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ بخط مؤلف خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ (۴۳)

۶- المكتوب اللطيف إلى المحدث الشريف :

مولانا نے میاں صاحب محدث دہلوی کو مکہ معظمہ سے ایک طویل خط لکھ کر اجازۂ عامہ سے متعلق بعض سوالات دریافت کیے تھے، اس رسالہ میں مولانا کے مکتوب گرامی کے ساتھ میاں صاحب کا جواب خط بھی آ گیا ہے جو چھ رسالوں کے ایک مجموعہ کے ساتھ مطبع انصاری دہلی سے ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوا ہے، اس کا قلمی نسخہ بخط مؤلف خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ (۴۴)

۷- القول المحقق:

یہ چھ صفحہ کا فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے اور ''إعلام اہل العصر'' کے ساتھ چھپ چکا ہے، مؤلف نے اس میں مندرجہ ذیل سوالوں کا مفصل جواب تحریر کیا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے کیا ان کے گوشت کو فربہ اور عمدہ بنانے کے خیال سے ان کو خصی کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ (۴۵)

۸- عقود الجمان في جواز تعليم الكتابة للنسوان :

یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے، پہلی بار سبل السلام شرح بلوغ المرام کے ساتھ مطبع فاروقی دہلی سے ۱۳۱۱ھ میں شائع ہوا تھا، اس کا عربی ترجمہ کس شخص نے کیا تھا، اس کا نام نہیں ملتا، یہ ترجمہ شیخ محمد بن عبد العزیز بن مانع کی تعلیقات کے ساتھ عمدہ ٹائپ پر ۱۹۶۱ء میں دمشق سے شائع ہوا ہے، اس عربی ترجمہ کا نیا ایڈیشن ڈاکٹر وصی اللہ محمد عباس بستوی کی تعلیق کے ساتھ علمی اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا، مصنف نے اس میں حدیث کی روشنی میں عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا جائز قرار دیا ہے، اصل فارسی رسالہ کا ایک قلمی نسخہ بخط

مؤلف خدابخش لائبریری میں موجود ہے۔(۴۶)

۹- الأقوال الصحيحة في أحكام النسيكة :

اس رسالہ میں عقیقہ کی نیت اور ولادت کے وقت اذان دینے کے علاوہ اس امر پر بھی بحث کی گئی ہے کہ بچہ کا نام کس دن رکھنا افضل ہے، ۱۲۹۷ھ میں مطبع فاروقی دہلی نے اس کو شائع کیا تھا، یہ رسالہ فارسی میں ہے۔(۴۷)

۱۰- غنية الالمعي :

یہ مختصر عربی رسالہ المعجم الصغیر للطبرانی کے ساتھ (ص ۲۳۹-۲۶۳) مطبع انصاری دہلی سے ۱۳۱۱ھ میں شائع ہو چکا ہے، اس کا دوسرا ایڈیشن المکتبۃ السلفیۃ مدینہ منورہ سے ۱۹۶۸ء میں ٹائپ پر بھی شائع ہوا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ بخط مؤلف خدابخش لائبریری میں موجود ہے، اس میں تین حدیثی اور فقہی مسائل پر گفتگو کی ہے۔(۴۸)

۱۱- تعليقات على إسعاف المبطأ برجال الموطأ :

رجال موطأ پر علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی مشہور کتاب ''إسعاف المبطأ'' پر یہ مولانا کی مختصر مفید تعلیق ہے، اس میں سیوطی کے بیان پر اضافہ بھی کئے گئے ہیں اور کہیں کہیں ان کی غلطیوں پر تنبیہ بھی کی گئی ہے، مولانا عظیم آبادی نے سیوطی کے اس کمیاب رسالہ کو متعدد نسخوں کے مقابلہ وتصحیح کے بعد اپنی تعلیقات کے ساتھ ۱۳۲۰ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع کیا تھا، اس کا قلمی نسخہ بخط مؤلف خدابخش لائبریری میں موجود ہے۔(۴۹)

۱۲- الكلام المبين في الجهر بالتأمين والرد على القول المتين :

یہ رسالہ محمد علی صاحب مرزاپوری کے رسالہ ''القول المتين في إخفاء التأمين'' کے جواب میں اردو میں لکھا گیا ہے، ۱۳۰۳ھ میں مطبع انصاری دہلی سے متوسط سائز کے ۴۴ صفحات پر شائع ہوا تھا۔(۵۰)

۱۳- التحقيقات العلى باثبات فرضية الجمعة في القرى :

یہ رسالہ بھی اردو میں ہے اور ۱۳۰۹ھ میں مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا تھا، موضوع نام سے ظاہر ہے، اس کا قلمی نسخہ بخط مؤلف خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ (۵۱)

۱۴- هداية النجدين إلى حكم المعانقة والمصافحة بعد العيدين :

یہ اردو رسالہ ایک استفتا کا جواب ہے، جسے ولی اللہ خاں نے مطبع احسن المطابع پٹنہ سے شائع کیا تھا، اس کا عربی ترجمہ "حیاۃ المحدث شمس الحق وأعمالہ" میں ص: ۲۳۰ سے ۲۴۸ پر شائع ہوا ہے۔

خدا بخش لائبریری میں اس کا قلمی نسخہ ان کے مجموعۂ فتاوی میں شامل ہے، یہ رسالہ اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔ (۵۲)

۱۵- فتوی ردتعزیہ داری :

یہ اردو میں لکھا گیا تھا، جو مطبع سعید المطابع بنارس سے شائع ہو چکا ہے، اس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے، اپنے موضوع پر یہ بھی لاجواب ہے۔ (۵۳)

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مولانا کی متعدد کتابیں اور رسالے غیر مطبوعہ بھی ہیں، اوپر "غایۃ المقصود" کی غیر مطبوعہ جلدوں کا ذکر کیا جا چکا ہے، مزید غیر مطبوعہ کتابوں میں سے حسب ذیل چار قلمی نسخے خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔ (۵۴)

۱۶- تنقيح المسائل :

یہ مولانا کے فتاوی کا مجموعہ ہے، جن کی ترتیب وتکمیل وہ اپنی حیات میں نہ کر سکے، یہ مولانا کے علمی وتحقیقی رجحان اور فتوی نویسی میں ان کے مخصوص اسلوب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ (۵۵)

۱۷- الرسالة في الفقه :

اس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے، جو ۱۳۱۱ھ میں مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اندازہ ہے کہ یہ بھی ان کے فتاوی ہی کا ایک حصہ ہوگا۔ (۵۶)

۱۸- هدية اللوذعي بنكات الترمذي :

اس کتاب کا اکثر علماء نے ذکر کیا ہے، اس کا ایک ناقص نسخہ ۱۲ صفحات پر مشتمل خدا بخش

لائبریری میں موجود ہے، یہ درحقیقت جامع الترمذی کے مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسے مولانا نے سات فصلوں پر تقسیم کیا تھا، قلمی نسخہ میں صرف ابتدائی تین فصلیں مکمل اور چوتھی فصل ناقص موجود ہے، پتہ نہیں مولانا اسے مکمل کر سکے تھے یا نہیں؟ اس کتاب سے مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (م ۱۳۵۳ھ) نے ''مقدمہ تحفۃ الاحوذی'' میں استفادہ کیا تھا، اس سے ایک طویل اقتباس مولانا مبارکپوری نے ابوعیسیٰ کنیت رکھنے کے جواز کے سلسلہ میں نقل کرتے ہوئے مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے نام کی تصریح کے بجائے صرف بعض الأعلام لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ (۵۷)

۱۹- الوجازة في الإجازة :

اس کتاب میں مولانا نے تمام حدیث کی کتابوں کی ان کے مؤلفین تک اپنی سندیں جمع کی ہیں، شروع میں اپنے حدیث کے گیارہ اساتذہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان میں سے تین ہندوستانی (مولانا بشیر الدین قنوجی، مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی، شیخ حسین بن محسن یمانی انصاری) اور باقی آٹھ عرب ہیں، جن سے حجاز میں سند حدیث حاصل ہوئی، ان میں سے ہر ایک نے مولانا کو اپنے تمام سلسلہ ہائے سند سے روایت کی اجازت عطا کی تھی، اس کتاب کا تذکرہ مولانا کے سوانح نگاروں میں سے (باستثناء محقق فاضل محمد عزیز شمس) کسی نے نہیں کیا۔ اس کے دو قلمی نسخے خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں، جن میں سے ایک بخط مؤلف ہے۔ (۵۸)

ان مطبوعہ اور قلمی کتابوں کے بعد یہاں ان تصانیف کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا تذکرہ خود مولانا نے یا ان کے سوانح نگاروں نے کیا ہے اور ان کی کہیں موجودگی کا علم ''مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات'' کے مؤلف کو نہیں ہو سکا جو حسب ذیل ہیں :

۲۰- فضل الباري شرح ثلاثيات البخاري :

شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مبارکپوری لکھتے ہیں کہ ''افسوس ہے کہ علامہ اس شرح کو اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے۔'' (۵۹)

۲۱- النجم الوهاج في شرح مقدمة الصحيح لمسلم بن الحجاج :
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ مقدمہ امام مسلم کی مبسوط شرح ہے مولانا نے خود اپنی اس تالیف کا ذکر اپنے قلمی رسالہ ''الوجازۃ فی الإجازۃ'' (ورق:۳) میں کیا ہے۔(۶۰)
دوسرے بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔(۶۱)

۲۲- تعليقات على سنن النسائي :
اس میں سنن نسائی کے بعض مشکلات کو حل کیا گیا ہے۔(۶۲)

۲۳- نخبة التواريخ :
اس میں مولانا نے قدیم و جدید علماء کے سوانح اور کارنامے فارسی زبان میں لکھے تھے، ''الحیاۃ بعد المماۃ'' (ص:۲۷۳-۲۷۴) میں اس کا ایک طویل اقتباس میاں صاحب کے حالات پر مشتمل موجود ہے۔(۶۳)

۲۴-تذكرة النبلاء في تراجم العلماء :
یہ بھی فارسی میں ہے اور متعدد کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔(۶۴)، مصنف نے یہ کتاب مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کو نزہۃ الخواطر کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں دے دی تھی، چنانچہ اس میں جابجا ان کے حوالے ملتے ہیں خصوصاً ''نزہۃ الخواطر'' کی آخری دونوں جلدوں میں۔(۶۵)
اسی طرح محمد ادریس نگرامی نے ''تذکرہ علمائے حال'' میں کئی جگہ استفادہ کیا ہے۔(۶۶)
ساتھ ہی یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ مولانا نے بہت سے لوگوں کے حالات کے حصول کے سلسلہ میں مؤلف کی مدد کی ہے۔(۶۷)
''الحیاۃ بعد المماۃ'' میں بھی مولانا کے استاذ شیخ احمد بن احمد بن علی التونسی المغربی (م ۱۳۱۴ھ) کے حالات ''تذکرۃ النبلاء'' سے ماخوذ ہیں۔(۶۸)

۲۵- نهاية الرسوخ في معجم الشيوخ : یہ کتاب عربی میں تھی، اس میں اپنے اساتذہ اور سلسلۂ اسناد کے شیوخ کے حالات تحریر کئے ہیں، ''عون المعبود'' کے مقدمہ میں گیارہ علماء کے مختصر

حالات اسی سے منقول ہیں، (۶۹)، نظامی بدایونی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ناقص رہ گئی۔ (۷۰)

۲۶- تفریح المتذکرین بذکر کتب المتاخرین : یہ اہم کتاب فارسی میں تھی، ابو یحیٰ امام خاں نوشہروی نے غلطی سے اس کو عربی میں بتایا ہے، افسوس کہ یہ کتاب ناقص رہ گئی اور اس کا کوئی نسخہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ (۷۱)

۲۷- النور اللامع فی أخبار صلاۃ الجمعۃ عن النبی الشافع :

موضوع نام سے ظاہر ہے، مولانا نے یہ کتاب عربی میں لکھی تھی مگر افسوس اسے مکمل نہ کر سکے، (۷۲)، انہوں نے اپنی کتاب "التحقیقات العلی فی فرضیۃ الجمعۃ فی القریٰ" (ص: ۱۷) میں اس تصنیف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (۷۳)

۲۸- تحفۃ المتہجدین الأبرار فی أخبار صلاۃ الوتر و قیام رمضان عن النبی المختار :

مولانا نے اس میں وتر اور قیام رمضان سے متعلق حدیثیں جمع کی تھیں اور ان پر تحقیقی کلام بھی کیا تھا، افسوس کہ یہ بھی مکمل نہ ہو سکی، سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق یہ بھی عربی میں تھی۔ (۷۴)

۲۹- غایۃ البیان فی حکم استعمال العنبر والزعفران :

مولانا نے اس نام کی ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا، جیسا کہ انہوں نے خود عون المعبود (ج: ۳ ص: ۳۷۷) میں اس کی تصریح کی ہے، معلوم نہیں اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنا سکے یا نہیں؟ البتہ اس سے متعلق تفصیلی بحث "عون المعبود" میں موجود ہے جس سے ان کے نظریات کا پتہ چل سکتا ہے۔ (۷۵)

۳۰- سوانح عمری مولانا عبداللہ صاحب جھاؤ میاں الہ آبادی :

اس کا تذکرہ مولوی ابو ضیا محمد قمر الدین الہ آبادی نے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مولانا نے جھاؤ میاں صاحب کے حالات جمع کئے تھے، لیکن نامکمل ہونے کی بنا پر وہ شائع نہ ہو سکے۔

مولانا نے "تذکرۃ النبلاء" میں جھاؤ میاں صاحب کے نسبتاً مفصل حالات تحریر فرمائے

تھے، مولانا عبدالحی حسنی نے ''نزھۃ الخواطر'' (ج:۷ص:۳۰۴-۳۰۶) میں اسے نقل کرلیا ہے، اس طرح گویا مولانا عظیم آبادی کے جمع کردہ حالات مکمل یا نامکمل شکل میں محفوظ رہ گئے۔ (۷۷)

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ بہت سی کتابوں پر مولانا کے حواشی اور تعلیقات موجود ہیں مثلاً: خلق أفعال العباد للبخاری (ص:۹۲ طبع دہلی ۱۳۰۵ھ) کتاب القراءۃ خلف الإمام للبیہقی (ص:۱۳ طبع دہلی ۱۳۱۵ھ) مجموعہ التاریخ الصغیر للبخاری وضعفاء الصغیر للبخاری والضعفاء والمتروکین للنسائی وغیرہ، (۷۸)، یہاں خصوصیت کے ساتھ مولانا کے ایک مجموعہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو خدا بخش لائبریری میں ''مجموعہ تسویدات'' کے نام سے زیر رقم ۳۸۳۴ موجود ہے، اس میں مولانا کے مفید نوٹ بعض مؤلفین مثلاً زیلعی وغیرہ پر ان کے تعقبات، چند مباحث سے متعلق ان کے نظریات اور کچھ حدیثوں پر ان کے کلام پائے جاتے ہیں۔ (۷۹)

حدیث وسنت اور عقیدۂ سلف کی تائید وحمایت کے لئے مولانا عظیم آبادی پوری طرح کمربستہ رہتے تھے، اوران کی معمولی مخالفت بھی برداشت نہیں کرتے تھے، ڈاکٹر عمر کریم پٹنوی اور سید عبدالغفور عظیم آبادی نے جب حدیث، ائمہ حدیث، اور امام بخاری کے خلاف زبان طعن دراز کی تو انہوں نے اپنے تلمیذ رشید اور ممتاز عالم مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (م ۱۳۶۹ھ) سے اس کا جواب لکھوایا اور اس سلسلہ میں ان کی ہر قسم کی علمی اور مالی اعانت بھی کی اور اس موضوع پر ان کی تمام کتابیں (حل مشکلات بخاری، الأمر المبرم، ماء حمیم، صراط مستقیم، الریح العقیم، العرجون القدیم وغیرہ) اپنے خرچ پر شائع کیں، (۸۰)، اس طرح جب مولانا شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) نے اپنی کتاب ''سیرۃ النعمان'' میں محدثین اور امام بخاری پر خصوصاً تنقید کی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک مستقل کتاب امام بخاری کے حالات اور کارناموں پر مشتمل لکھی جائے جس میں ان کی عظمت کا بیان اور شبلی کے اعتراضات کا بھرپور جواب ہو، چنانچہ مولانا نے اس وقت کے مشہور عالم اور محقق مولانا عبدالسلام مبارکپوری (م ۱۳۴۲ھ) سے ''سیرۃ البخاری'' لکھوائی، اس سلسلہ میں ہر طرح علمی معاونت کی اور طباعت کے بعد اس کے سو نسخے خریدنے کا وعدہ بھی کیا لیکن افسوس کہ مولانا اس کی اشاعت سے چند

ماہ قبل ہی ۱۹۱۱ء میں انتقال کر گئے یہ کتاب آج تک اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔ (۸۱)

اسی طرح مولانا ظہیر احسن شوق نیموی (م ۱۳۲۲ھ) کے فقہی مسائل کا جواب دینے کے لئے مولانا نے خصوصی طور پر مولانا محمد سعید بنارسی (م ۱۳۲۲ھ) اور مولانا ابوالمکارم محمد علی مئوی (م ۱۳۵۳ھ) کو تیار کیا تھا، اور ان لوگوں کے لئے بھوپال کی ریاست سے ماہانہ وظیفہ متعین کرایا، چنانچہ انہوں نے متعدد رسالوں کے جوابات لکھے، ان کی اشاعت بھی مولانا نے اپنے خرچ پر کی اور مفت تقسیم کروائے، جیسا کہ ان رسالوں کے مقدموں اور خاتموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ (۸۲)

مولانا کی تالیفات اور فتاوی کی طرح ان کے خطوط بھی مختلف علمی اور تاریخی مباحث پر مشتمل ہوا کرتے تھے، افسوس کہ اب ان میں کے چند ہی محفوظ رہ گئے ہیں، ''مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات'' کے ضمیمہ میں (۸۳)، مؤلف نے نو خطوط شائع کئے ہیں جس کی تفصیل فاضل مؤلف کی زبانی پیش خدمت ہے:

''ان میں سے شروع کے چار خطوط مولانا عبدالحی حسنی (م ۱۳۴۱ھ) کے نام ہیں جن میں ''نزھۃ الخواطر'' کے سلسلہ میں مولانا نے اپنی کتاب ''تذکرۃ النبلاء'' کے متفرق ومنتشر اجزاء ان کے پاس روانہ کرنے کا تذکرہ کیا ہے اور بہت سے مفید مشورے بھی دیئے ہیں، کچھ تاریخی اور علمی مباحث بھی ضمناً آ گئے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں، خصوصاً ''عون المعبود'' (اجزائے اربعہ) کے مؤلف کا ذکر، اپنی تذکرہ نویسی کی ابتدا کی تاریخ، اور اس موضوع پر معاصرین کی تالیفات کا جائزہ وغیرہ وغیرہ۔

راقم الحروف کو یہ خطوط رائے بریلی میں محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی کے یہاں ملے جو آج بھی ایک البم میں محفوظ ہیں۔ دو خط مولانا ابومحمد عبداللہ چھپراوی (م ۱۳۴۸ھ) کے نام ہیں جن میں ان کی تالیف ''رفع الغواشی عن وجوہ الترجمۃ والحواشی'' پر مولانا عظیم آبادی کا تبصرہ قابل توجہ ہے، ان خطوط سے مولانا چھپراوی اور مولانا عظیم آبادی کے درمیان دوستانہ تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ایک خط مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۳۶۷ھ) کے نام ہے، اور اس لحاظ سے قابل ذکر ہے

کہ بقول مولانا امرتسری غالباً مولانا کے ہاتھ سے لکھا ہوا آخری خط ہے، اس سے جمعیت اہل حدیث سے ان کی وابستگی اور اس کے انتظامی امور سے دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک خط مولانا محمد عبدالحق ملتانی (م ۱۳۶۵ھ) کے نام بھی ہے، آخری خط عربی میں فاس (مراکش) کے شیخ عبدالحفیظ بن محمد طاہر کے نام لکھا گیا ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ مولانا کا عربی قصیدہ اور "رفع الالتباس" سے متعلق اپنی تالیف ہونے کی تصریح بہت اہم ہے، اس خط سے مولانا کی عظمت اور عربوں کے درمیان ان کی شہرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔(۸۳)

حواشی وحوالہ جات:

۱- خطۂ بہار کے محدثین کی عربی زبان وادب میں خدمات،از: ڈاکٹر عبدالباری۔مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۱۹۸۸ء ج: ۱۴،ص:۷۵۔

۲- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات،از: محمد عزیر شمس۔علمی اکیڈمی،کراچی ۱۹۸۳ء۔

۳- علم حدیث بہار میں ایک اجمالی خاکہ، علامہ ابومحفوظ الکریم معصومی۔مجلہ برہان دہلی فروری ۱۹۵۱ء۔

۴- مولانا شمس الحق عظیم آبادی: حیات اور خدمات،ص:۴۸۔

۵- ایضاً ص:۴۸، ۴۹۔ ۶- ایضاً ص:۴۹۔ ۷- ایضاً ص:۴۹، ۵۰۔

۸- ایضاً ص:۵۱، نیز دیکھئے "یادگار گوہری" از: محمد زبیر ڈیانوی، ص:۱۰۰۔(مطبع احمدی خدابخش لائبریری پٹنہ کا زیراکس)

۹- ایضاً ص:۵۱، نیز دیکھئے "یادگار گوہری" از: محمد زبیر ڈیانوی، ص:۱۰۲۔

۱۰- ایضاً ص:۵۱

۱۱- ایضاً ص:۵۲، نیز دیکھئے "یادگار گوہری" از: محمد زبیر ڈیانوی، ص:۱۰۰۔

۱۲- ایضاً ص:۵۲، نیز دیکھئے "یادگار گوہری" از: محمد زبیر ڈیانوی، ص:۱۰۹۔

۱۳- یادگار گوہری، ص:۱۰۴، ۱۰۶۔

۱۴- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات، ص:۵۳۔

۱۵- یادگار گوہری، ص:۶، ۱۷، نیز دیکھئے تذکرہ علمائے حال، ص:۳۱، نزہۃ الخواطر ۸/۱۸۰۔

۱۶- مولانا عظیم آبادی نے ان کا تذکرہ اپنی کتاب "الوجازۃ فی الاجازۃ" میں کیا ہے، ان علماء و مشائخ کے مختصر حالات "حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ" (ص: ۲۷۳-۲۸۲ طبع دوم) میں درج ہے۔

۱۷- یادگار گوہری، ص: ۱۷۶۔

۱۸- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات، ص: ۵۶،۵۵۔

۱۹- ایضاً ص: ۵۲ ان تمام بزرگوں کے حالات "حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ" (ص ۱۸۳-۲۹۶) میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۰- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات، ص: ۶۹-۷۰۔

۲۱- حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ، ص: ۲۹۷-۳۳۴۔

۲۲- ایضاً ص: ۱۷، ڈیانواں کے کتب خانہ پر مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری کا مضمون مجلہ "برہان" دہلی جولائی ۱۹۵۱ء میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۳- الندوہ، ج: ۳، شمارہ: ۲، مقالات شبلی، ج: ۷، ص: ۱۱۱۔

۲۴- سیرۃ البخاری، ص: ۳۵،۲۰۶۔

۲۵- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات، ص: ۷۳۔

۲۶- ایضاً ص: ۷۳-۷۶۔ ۲۷- ایضاً ص: ۷۶۔ ۲۸- ایضاً ص: ۷۶-۷۷۔

۲۹- نزهۃ الخواطر، ج: ۸، ص: ۲۰۸۔

۳۰- اس سلسلہ کے جملہ حوالہ جات مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات، ص: ۸۷ کے حاشیہ پر درج ہیں۔

۳۱- عون المعبود، ج: ۴، ص: ۵۵۴-۵۵۸-۵۷۰۔

۳۲- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات، ص: ۷۸۔

۳۳- ایضاً: ۷۹۔ ۳۴- ایضاً۔

۳۵- علم حدیث بہار میں ایک اجمالی خاکہ : مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی، مجلہ برہان دہلی فروری ۱۹۵۱ء۔

۳۶- ایضاً۔ ۳۷- ایضاً۔ ۳۸- ایضاً۔

۳۹- التعلیق المغنی، ج: ۱، ص: ۲۔

۴۰- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات، ص:۸۰۔

۴۱- ایضاً، ص:۸۱۔ ۴۲- ایضاً، ص:۶۰۔ ۴۳- ایضاً، ص:۸۱۔ ۴۴- ایضاً، ص:۸۱-۸۲۔

۴۵- ایضاً، ص:۸۲۔ ۴۶- ایضاً، ص:۸۲۔ ۴۷- ایضاً، ص:۸۲۔ ۴۸- ایضاً، ص:۸۳۔

۴۹- ایضاً، ص:۸۳۔ ۵۰- ایضاً، ص:۸۳۔ ۵۱- ایضاً، ص:۸۳۔ ۵۲- ایضاً، ص:۸۴۔

۵۳- ایضاً، ص:۸۴۔ ۵۴- ایضاً، ص:۸۴۔ ۵۵- ایضاً، ص:۸۴۔ ۵۶- ایضاً، ص:۸۵۔

۵۷- ایضاً، ص:۸۵۔ ۵۸- ایضاً، ص:۸۶۔

۵۹- سیرۃ البخاری، ص:۲۴۷ (حاشیہ) بحوالہ مصدر سابق۔

۶۰- دیکھئے: الوجازۃ فی الاجازۃ، ورق:۳، مخطوطہ خدا بخش بحوالہ مصدر سابق ۸۴۔

۶۱- سیرۃ البخاری، ص:۳۱۴، مجلہ اہل حدیث (امرتسر) ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء، ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، ص:۴۳،

بحوالہ مصدر سابق، ص:۸۷۔

۶۲- سیرۃ البخاری، ص:۳۳۷ بحوالہ سابق۔

۶۳- الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۲۷۳، ۲۷۴، بحوالہ سابق، مقدمہ تحفۃ الاحوذی طبع اول (خاتمہ) ص:۳ میں بھی اس کتاب کا ذکر ملتا ہے۔

۶۴- یادگار گوہری، ص:۱۱۰، تذکرہ علمائے حال، ص:۳۱، اہل حدیث امرتسر ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء، نزہۃ الخواطر، ج: ۸، ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، ص:۹۷۔

۶۵- نزہۃ الخواطر میں تیس علماء کے حالات تذکرۃ النبلاء سے ماخوذ ہیں وہ حوالے یہ ہیں :

ج:۷، ص:۳، ۵، ۶، ۱۲، ۵۲، ۵۶، ۷۹، ۸۰، ۸۵، ۸۸، ۸۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۴۳، ۱۲۵، ۱۳۹، ۲۴۷،

۲۴۷، ۳۰۲، ۳۰۶، ۳۱۲، ۳۱۶، ۳۱۶، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۳۱، ۳۶۶، ۳۹۵، ج:۸، ص:۳۴، ۲۷۴، ۳۱۶،

۳۴۷، ۳۳۸، ۳۹۹، (دیکھئے حوالہ سابق، ص:۸۸)۔

۶۶- تذکرہ علمائے حال، ص:۵۷، ۹۳۔

۶۷- تذکرہ علمائے حال،ص:۳۱۔

۶۸- الحیاۃ بعد المماۃ،ص:۲۶۵۔

۶۹- ج:۱،ص:۳-۴،طبع اول۔

۷۰- قاموس المشاہیر،ج:۲،ص:۲۰۔

۷۱- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات،ص:۸۹۔

۷۲- یادگار گوہری،ص:۱۰۰۔

۷۳- مولانا شمس الحق عظیم آبادی حیات اور خدمات،ص:۸۹۔

۷۴- ایضاً،ص:۹۰۔ ۷۵- ایضاً،ص:۹۰۔ ۷۶- ایضاً،ص:۹۰۔ ۷۷- ایضاً،ص:۹۱۔

۷۸- ایضاً،ص:۹۱۔ ۷۹- ایضاً،ص:۹۱۔ ۸۰- ایضاً،ص:۵۹۔

۸۱- ایضاً،ص:۵۹۔مولانا عبد السلام مبارکپوری کے علاوہ مولانا عبد العزیز رحیم آبادی (م ۱۳۳۶ھ) نے بھی ''سیرۃ النعمان'' کے جواب میں ''حسن البیان'' تالیف کی، یہ بھی اپنے موضوع پر شاہکار ہے۔

۸۲- ایضاً،ص:۶۰،مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:''اوثق العری با تمۃ الجمعۃ فی القری'' تالیف مولانا محمد سعید بنارسی، ص:۲،طبع بنارس ۱۳۱۸ھ ''المذہب المختار فی الرد علی جامع الآثار'' تالیف مولانا ابو المکارم، طبع بنارس ۱۳۱۸ھ۔

۸۳- ایضاً،ص:۱۲۲،۹۵۔ ۸۴- ایضاً،ص:۹۶،۹۵۔



مولانا نواب صدیق حسن خاں قنوجی

اور

ان کی خدمت حدیث

پیدائش: ۱۸۳۲ء وفات: ۱۸۹۰ء

مولانا ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی

مولانا نواب صدیق حسن قنوجی ہمارے اس عزیز ملک کے ان ممتاز اور نامور علماء میں تھے جنہوں نے عقیدہ وفکر، علم ودانش، صلاح وفلاح اور پاکیزہ اسلامی تعلیم وتربیت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، انیسویں صدی بیسوی کے ان ہندوستانی محققین اور چوٹی کے علماء میں ان کا شمار ہے جنہوں نے اسلامی علوم اور خصوصا تفسیر قرآن اور حدیث نبوی کی عظیم وجلیل اور ناقابل فراموش خدمات پیش کیں، ساتھ ہی ساتھ عربی زبان وادب کے موضوع پر گرانقدر کتابیں تصنیف کیں، ان کے تمام کارناموں میں ان کا اپنا رنگ وآہنگ، خداداد صلاحیت، گہرا مطالعہ اور فکر سلیم نمایاں ہے۔

نواب صدیق حسن ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں اپنے ننہال بانس بریلی میں پیدا ہوئے، کچھ دن بعد ان کی والدہ ان کو لے کر قنوج چلی گئیں جہاں ان کے والد مولانا اولاد حسن کا قیام تھا، یہ بچہ ابھی پانچ سال کا تھا کہ مشفق ومربی باپ کے سایہ سے محروم ہوگیا، اب بچہ کی تعلیم وتربیت اور کفالت کی تمام تر

ذمہ داری ماں کے سر آپڑی، ماں بڑے باپ کی بیٹی تھی، ایسے جلیل القدر عالم اور متحرک وفعال داعی اور مجاہد (مفتی محمد عوض عثمانی) کی بیٹی، جس نے تحریک آزادی میں انگریزوں کے خلاف شخصی طور پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے، ماں خود بھی مومنہ تھیں اور تقویٰ و پرہیزگاری، سوجھ اور بوجھ اور تربیتی امور میں ماہر تھیں، انہوں نے بیٹے کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی اور بچپن ہی سے اس کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی، مولانا صدیق حسن خاں خود تحریر کرتے ہیں:

''میں سات برس کا تھا، مسجد میرے گھر سے قریب تھی، فجر کی نماز کے لیے میری والدہ گہری نیند سے مجھ کو جگا کر وضو کراتیں اور پابندی سے مسجد بھیجتیں، گھر میں نماز ادا کرنے کی اجازت ہرگز نہ دیتیں، اور اگر کبھی گہری نیند سے اٹھنے میں دیر لگاتا تو میرے چہرے پر پانی کی چھینٹیں مار کر زبردستی مجھ کو جگا تیں'' (ابقاء المنن ص ۱۴) اس طرح کی دینی تربیت حاصل کرنے کے بعد مولانا صدیق حسن عمر بھر دینی فرائض کی ادائیگی میں چاق وچوبند رہے اور منصب واقتدار اور عزت وشہرت کے بلند وبالا مقام پر فائز ہونے کے بعد بھی کبھی ان کے عقیدہ ومسلک اور عمومی دینی روش میں سرمو فرق نہ آیا۔

صدیق حسن شہر کے مدرسہ میں داخل کیے گئے، ابتدائی عربی فارسی کتابیں اپنے بڑے بھائی سید احمد حسن سے پڑھیں پھر فرخ آباد اور کانپور چلے گئے، وہاں بھی علم حاصل کرتے رہے، علم کا شوق کشاں کشاں دار السلطنت دہلی کھینچ لایا، یہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے علمی خانوادے سے استفادہ کیا، صدر الافاضل مفتی ہند مولانا صدر الدین خاں آزردہ سے بھی کسب فیض کیا، حدیث نبوی کی تعلیم شیخ زین العابدین بن محسن یمانی (۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء) اور امام محمد شوکانی کے شاگرد شیخ عبدالحق بنارسی محدث ہندی (متوفی بمقام منیٰ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) سے حاصل کی، نیز شیخ یحییٰ حازمی، علامہ نعمان آلوسی، قاضی حسین بن محمد یمانی اور مولانا محمد یعقوب محدث دہلوی سے حدیث کی اجازت لی۔ (ابجد العلوم: ص ۲۷۵)۔

دہلی میں دو سال پورے کرنے کے بعد اپنے استاذ دمربی مفتی صدر الدینؒ سے اجازت حاصل کی، مفتی صاحب نے اپنے قلم سے سند اجازت مرحمت فرمائی، نواب صاحب اس کے بعد وطن

واپس ہوئے، آپ نے دہلی میں دوران قیام بہت کچھ حاصل کیا، دہلی کی شعری وادبی نشستیں اور تعلیمی محفلیں انہیں برابر یاد آتی رہیں وہ انہیں یاد کر کے جھوم اٹھتے اور گنگناتے:

سقی اللہ وقتا کنت اخلو بوجھکم　　　وثغر الھوی فی روضۃ الأنس ضاحک

أقمنا زمانا والعیون قریرۃ　　　واصبحت یوما والجفون سواکب

"یاد بخیر وہ زمانہ کہ جب ہمیں تمہاری ہم نشینی میسر تھی، اور جب باغ الفت میں محبت کی باچھیں کھل رہی تھیں، ایک زمانہ تک ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی رہیں اور قلبی خوشی سے قیام پذیر رہے، اور آج یہ حال ہو گیا ہے کہ اپنا سوز دروں ہویدا ہے"۔

دہلی سے وطن واپس ہوئے تو چند ماہ کے بعد ہی تلاش معاش کے لیے کانپور، ٹونک اور بھوپال کے سفر کیے، ٹونک میں ملازمت مل گئی تھی مگر جی نہیں لگا، قنوج واپسی کا ارادہ کر رہے تھے کہ نواب بھوپال سکندر جہاں بیگم اور مدارالمہام جناب منشی جمال الدین کا دعوت نامہ ملا، ان دونوں سے شرف نیاز حاصل ہوا، منشی جمال الدین صاحب خانوادہ ولی اللہی کے فیض یافتہ تھے، ان کی دور بین نگاہ جوہر شناس تھی، بیگم صاحبہ سے مشورہ کے بعد ایک اہم عہدہ پر متعین کر دیا، صدیق حسن کی محنت، لیاقت، دیانت اور ایمانداری نے مقبولیت عطا کر دی اور حکومت وقوم کی پسندیدگی نے ان کو مزید ترقی درجات سے نوازا۔

مولانا صدیق حسن صاحب کو جب اطمینان بخش ملازمت اور پرسکون گھریلو زندگی حاصل ہوگئی تو حج وزیارت کی فکر دامن گیر ہوئی، انہیں حرمین شریفین کے علمی وروحانی فضاؤں سے کسب فیض کا بے پایاں شوق تھا، وہاں کے دینی وعلمی کتابوں کے حصول اور نوادر سے استفادہ کا بھی اشتیاق تھا، چنانچہ ۱۲۸۵ھ میں وہ حج کے لیے روانہ ہوئے، حجاز پہنچ کر حج وزیارت سے مشرف ہوئے، اس مبارک سفر سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا، امیر محمد اسماعیل صاحب سبل السلام کے ۲۵ رسالے نقل کیے اور درج ذیل کتابیں خریدیں:

اقتضاء الصراط المستقیم: شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ارشاد الفحول الی تحقیق الحق فی الاصول، نیل

الاوطارشرح منتقی الاخبار (نصف اول) فتح القدیر: امام شوکانی۔

نواب صاحب کتابوں کے بڑے شوقین تھے، عرب ممالک میں ان کے بہت سے معاونین اسی مقصد پر مامور تھے، ان کا کام ہی یہ تھا کہ وہ دیارِ عرب کے کونے کونے سے کتابیں تلاش کر کے ان کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، مولانا صدیق حسن صاحب برابر انہیں لکھتے اور یاد دہانی کراتے تھے، ۱۲۸۶ھ میں آٹھ مہینے کے بعد حج سے واپس ہوئے اور عربی میں حج کا سفر نامہ (رحلۃ الصدیق إلی البیت العتیق) کے عنوان سے مرتب کیا، یہ سفرِ حج مختلف حیثیتوں سے آپ کے حق میں ایسا سود مند وساز گار ثابت ہوا کہ آپ کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا، آپ تصنیف وتالیف وترجمہ کے کاموں میں ہمہ تن مشغول ہوگئے، زود نویس اور بسیار نویس تھے، اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے، جس وقت اور جہاں بھی وقت ملتا، بستہ نکالتے اور لکھنے بیٹھ جاتے تھے، ان کی تصنیف وترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے، یہاں ان تمام علمی تصانیف کے تذکرہ کی گنجائش نہیں ہے، حدیث نبوی سے متعلق چند اہم کتابوں کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

مولانا صدیق حسن صاحب کو جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے، تمام علوم وفنون سے شغف تھا اور ان سے متعلق ان کی کوئی تصنیف وترجمہ ضرور ملتا ہے لیکن حدیث نبوی سے انہیں عشق تھا، اسی لیے ان کی تمام تر توجہ اس فن شریف پر تھی، اور خود ان کا عمل کتاب وسنت کی روشنی میں دلیل پر مبنی تھا تقلید پر نہیں، اس کی وضاحت انہوں نے اپنی کتابوں میں کی ہے، خاص طور سے ابقاء المنن: ص ۱۲-۲۲-۶۵، المغنم البارد: ص ۱۳، اور جلب المنفعۃ: ص ۶۴-۶۵ میں تفصیل سے ذکر کیا ہے، عرب وہند کے محدثین سے اجازت بھی حاصل کی، انہیں بھوپال میں قیام کی دعوت دی اور ان کے لیے ان کے شایان شان نظم کیا تا کہ ان کا فیض عام رہے اور خود بھی حدیث سے متعلق تصنیف وترجمہ کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا، صرف حدیث سے متعلق ان کی پندرہ کتابیں ہیں:

۱- عون الباری بحل أدلۃ البخاری (شرح کتاب التجرید) آٹھ جلدیں، ۱۲۹۷ھ میں بولاق سے چھپی، نیل الأوطار کے حاشیہ پر بھوپال سے ۱۲۹۹ھ میں دو حصوں میں شائع ہوئی۔

۲- حسن الأسوۃ بما ثبت عن اللہ ورسولہ فی النسوۃ (الجوائب:۱۳۰۱ھ)

۳- السراج الوھاج من کشف مطالب صحیح مسلم بن الحجاج: بھوپال ۱۳۰۲ھ۔

۴- أربعون حدیثاً فی فضائل الحج والعمرۃ: بھوپال

۵- أربعون حدیثاً (متواترۃ): بھوپال

۶- العبرۃ بما جاء فی الغزو والشھادۃ والھجرۃ، بھوپال ۱۲۹۴ھ-۱۸۷۷ء

۷- الحرز المکنون من لفظ المعصوم المکنون: بھوپال

۸- الرحمۃ المھداۃ إلی من یرید زیادۃ العلم علی أحادیث المشکاۃ: بھوپال

۹- الجنۃ فی الأسوۃ الحسنۃ بالسنۃ فی اتباع السنۃ، بھوپال ۱۲۹۰ھ۔

۱۰- یقظۃ الاعتبار بما ورد فی ذکر النار وأصحاب النار: بھوپال ۱۲۹۴ھ

۱۱- الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ: کانپور ۱۲۸۳ھ

۱۲- الموائد العوائد من عیون الأخبار والفوائد (تقریباً تین سو حدیث) بھوپال ۱۲۹۸ھ۔

۱۳- الإذاعۃ لما کان ویکون بین یدی الساعۃ: بھوپال ۱۲۹۳ھ (الجوائب ۱۸۷۶ء)

۱۴- الروضۃ الندیۃ: شرح الدرر البھیۃ قاضی محمد شوکانی، علویہ لکھنؤ ۱۲۹۰ھ، مصر ۱۲۹۶ھ

۱۵- فتح العلام، شرح بلوغ المرام حافظ ابن حجر عسقلانی، امیریہ، قاہرہ ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۵ء۔

اس کے سوا فارسی اور اردو میں حدیث وعلم اصول حدیث سے متعلق متعدد کتابیں مرتب کی ہیں، فارسی زبان میں (منہج الوصول إلی اصطلاح أحادیث الرسول) بہت اہم کتاب ہے، اس علم سے متعلق جتنی کتابیں تصنیف کی جا چکی تھیں ان کا حروف تہجی کے لحاظ سے تذکرہ کرکے کے تعارف بھی کرایا ہے، اپنی گرانقدر کتاب ابجد العلوم کے باب انواع الفنون واصناف العلوم میں حرف ح کے تحت حدیث وعلم حدیث پر بڑی پرمغز عالمانہ گفتگو کی ہے جو دس صفحوں میں ہے، اسلاف کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، خصوصیت سے الفوائد الفاقانیہ کو کئی جگہوں پر ترجیح دی، حدیث نبوی، اس کا موضوع، روایت، درایت اور اصول وضوابط کا مختصر، جامع اور عام فہم زبان میں بیان کیا ہے، مولانا صدیق حسن صاحب

ہندوستان کے ان صاحب قلم عربی داں علماء میں تھے جن کی عربی تحریر مسجع، مقفی، تکلف، تصنع اور تعقید سے پاک تھی، وہ رقم طراز ہیں:

"وعلم الحديث هو علم يعرف به أقوال النبي صلى الله عليه وسلم وأفعاله وأحواله فاندرج فيه معرفة موضوعه، وأما غايته فهي الفوز بسعادة الدارين كذا في الفوائد الخاقانيه، وهو ينقسم إلى العلم برواية الحديث وهو علم يبحث فيه عن كيفية اتصال الأحاديث بالرسول عليه الصلوة والسلام من حيث أحوال رواتها ضبطا وعدالة ومن حيث كيفية السند اتصالا وانقطاعا وغير ذلك، وقد اشتهر بأصول الحديث كما سبق وإلى العلم بدراية الحديث وهو علم باحث عن المعنى المفهوم من ألفاظ الحديث وعن المراد منها مبنيا على قواعد العربية، وضوابط الشريعة ومطابقا لأحوال النبي صلى الله عليه وسلم، وموضوعه: أحاديث الرسول صلى الله عليه وسلم من حيث دلالتها على المعنى المفهوم أو المراد، وغايته: التحلي بالآداب النبوية والتخلي عما يكرهه وينهاه، ومنفعته: أعظم المنافع كما لا يخفى على المتأمل، ومبادئه: العلوم العربية كلها ومعرفة القصص والأخبار المتعلقة بالنبي صلى الله عليه وسلم ومعرفة الأصلين والفقه، وغير ذلك، كذا في مفتاح السعادة ومدينة العلوم، والصواب ما ذكر في الفوائد إذ الحديث أعم من القول والفعل والتقرير كما حقق في محله. (ص ۳۶۱)

علم حدیث کا جامع تعارف، مقصد، فوائد اور روایت و درایت پر مفصل گفتگو کی ہے، جو وسیع و گہرے مطالعہ اور فہم و ادراک کے ساتھ حدیث نبوی کی بصیرت اور اس سے انتہائی شغف و انہماک کی غماز ہے، ان کی چند کتب حدیث پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ انہوں نے کس شوق و لگن اور حوصلہ و جانفشانی سے استفادہ کیا ہے اور یہ مجموعے مرتب کیے ہیں، ان کے ہر حرف ولفظ سے حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تواضع و انکساری کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

الحطة في ذكر الصحاح الستة:

صحاح ستہ سے متعلق ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ان کی یہ اہم تصنیف ہے، زبان سلیس و شگفتہ

ہے، ترتیب سہل وآسان ہے ابتدائیہ، خاتمہ اور پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، چند عنوانات ملاحظہ ہوں:
ابتدائیہ میں علم وعلماء کی فضیلت اور اس کے عظیم فائدے، علم حدیث اور محدثین کرام کی عظمت ومکارم کا تذکرہ ہے۔ پہلا باب حدیث کی معرفت اور جمع وترتیب اور دوسرا باب علم حدیث کی روایت، درایت، ناسخ ومنسوخ، جرح وتعدیل اور اسماء الرجال، تیسرا باب: طبقات کتب حدیث، ضبط حدیث، صفات محدث اور دیار ہند میں علم حدیث چوتھے، باب میں ۸ فصلیں ہیں جن میں صحاح ستہ کے علاوہ موطأ اور مسند احمد کی خصوصیات اور اہمیت بیان کی ہے، پانچویں باب میں بھی ۸ فصلیں ہیں ان میں مذکورہ بالا کتب حدیث کے مرتبین کے حالات وتراجم ہیں، ان کی دوسری اہم تصنیف (الحرز المکنون من لفظ المعصوم المکنون) ہے جو چہل حدیث پر مشتمل ہے، چہل حدیث کی فضیلت میں حدیث نبوی پر عمل اور بزرگ ائمہ اور ممتاز علماء کی اقتداء مقصود ہے۔

تیسری کتاب (العبرة مما جاء في الغزو والشهادة والهجرة) ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے ترکی خلافت اور روس سے جنگ کے وقت مسلمانوں کی ہمت افزائی، جہاد اور شوق شہادت کے لیے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، فتح حاصل ہوئی جس کی تاریخ اس آیت سے نکلتی ہے (ویومئذ یفرح المؤمنون)۔

چوتھی کتاب اپنی اہلیہ نواب شاہ جہاں بیگم کی طلب پر مرتب کی جس کا عنوان ہے (حسن الأسوة بما ثبت من الله ورسوله في النسوة)، کتاب سابقہ کتابوں کی طرح عربی زبان میں ہے اور چار سو ستر (۴۷۰) صفحات پر مشتمل ہے، آیات واحادیث کی روشنی میں خواتین کے تمام مسائل بیان کیے ہیں، آستانہ استنبول سے شائع ہونے والے رسالہ (الجوائب) کے ایڈیٹر احمد فارس نے کتاب پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے، بیگم شاہ جہاں کی خواہش پر مولانا ذوالفقار بھوپالی نے اس کا اردو ترجمہ کیا، ان کے علاوہ حدیث سے متعلق نواب صاحب کے بلند پایہ کام ہیں، احادیث سے مستنبط دو کتابیں فقہی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں۔

"فتح المغيث بفقه الحديث" اور "الروضة الندية شرح الدرر البهية" اصل کتاب امام شوکانیؒ (۱۲۵۰ھ) کی ہے یہ اس کی شرح ہے جس نے اس کی افادیت کو دوبالا کر دیا ہے، معروف محدث شیخ محمد ناصر الدین البانیؒ کے حلقۂ درس دمشق میں پڑھی جاتی تھی، شیخ البانیؒ اس کی بڑی ستائش

کرتے تھے۔ (اعلامیہ صدیق حسن ۴۲-۴۴۳)۔

مولانا صدیق حسن نے اپنی علمی و عقائدی کاوشوں کے پہلو بہ پہلو ریاست بھوپال میں بڑے اہم کارنامے بھی انجام دیے اور بڑی اصلاحات کیں، حالاں کہ اسلامی شریعت کے نفاذ اور اس کی روشنی میں اصلاح کا جو عظیم الشان بیڑا انہوں نے اٹھایا تھا وہ کچھ آسان کام نہ تھا، مگر انہوں نے بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ قدم آگے بڑھایا، نواب شاہ جہاں بیگم نے ان کا پورا پورا تعاون کیا، صدیق حسن صاحب نے ریاست کے امور پر گہری نظر ڈالی اور ان کی اصلاحات کیں، جن میں درج ذیل امور خصوصیت سے لائق ذکر ہیں۔

۱۔ زمینوں کی چک بندی، اور اس کے لحاظ سے ان کی تقسیم۔

۲۔ زمین داری کی حد بندی اور اس کے مالکوں کی طرف واپسی۔

۳۔ ظالمانہ ٹیکسوں کا خاتمہ۔

۴۔ نظام زکاۃ کی شرعی تقسیم۔

۵۔ عدالتوں کی باقاعدہ تنظیم اور انصاف پسند قاضیوں کا تقرر۔

۶۔ نظام پولیس کی اصلاح۔

۷۔ ریاست کے گوشے گوشے میں مدرسوں کا قیام۔

۸۔ عمدہ پبلک لائبریریوں کا قیام۔

۹۔ ادارہ احتساب، تحقیق و تفتیش، اچھی باتوں کی ترغیب اور بری باتوں سے ممانعت کے دفاتر کا قیام۔

۱۰۔ نئی پرانی کتابوں کی طباعت کے لیے لیتھو مطبعوں کا قیام۔

۱۱۔ ادارہ امور دینیہ کا احیاء، اور اس میں صالح علماء اور داعیوں کا تقرر، گاؤں گاؤں، شہر شہر اور خود دارالسلطنت میں مسجدوں کی تعمیر اور تنظیم، اور ان میں قرآن کریم اور ابتدائی دینیات کی تعلیم کے مدرسوں و مکتبوں کا قیام و انتظام۔

۱۲۔ آیت قرآنی "وامرھم شوریٰ بینھم" کی بنیاد پر مجلس شوریٰ کا قیام۔

۱۳۔ ریاستی فوج کی از سرِ نو تنظیم اور تنخواہوں کی حسب مراتب تحدید و تعیین۔

۱۴۔ شعبہ تعمیرات کا قیام۔

۱۵۔ فکری و اخلاقی شعور کی بیداری اور فکر اسلامی کی ترویج و اشاعت۔

۱۶۔ بیواؤں کے نکاح کی ترغیب اس لیے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی مبارک تحریک سے پہلے ہندوستانی سماج میں بیواؤں کا نکاح ممنوع تھا۔

۱۷۔ سود، رشوت، جوا، اور نشہ آور چیزوں پر سخت پابندی، اس زمانہ میں یہ چیزیں عام ہوگئی تھیں۔

یہ نواب صاحب کے تعمیری اصلاحی کاموں کا ایک مختصر سا جائزہ تھا جنھیں حکمت عملی، دوراندیشی اور اخلاص کے ساتھ انہوں نے بخوبی انجام دیتے ہوئے محض رضاء الٰہی اور امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا، نیز انہوں نے عوام میں فقہ و علم کلام کے ساتھ ساتھ قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر توجہ کرنے اور گہرائی و گیرائی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرنے اور اس کے سرچشمۂ صافی کی طرف رجوع کرتے رہنے کی فضاء قائم کی اور عقائد، اعمال، کردار کی اصلاح پر انہیں متوجہ کیا۔

مآخذ وحوالہ جات:

۱۔ ابجد العلوم ۳ حصے: نواب صدیق قنوجی، دار ابن حزم بیروت

۲۔ حسن الاسوۃ: ؍؍ ؍؍، زکریا علی یوسف مطبعۃ العاصمۃ قاہرہ

۳۔ الامیر سید صدیق حسن خاں: محمد اجتباء ندوی، دار ابن کثیر دمشق ۱۳۹۹ء

۴۔ تاریخ فکر اسلامی: محمد اجتباء ندوی المرکز العلمی دہلی ۱۹۹۸ء



شیخ علامہ حسین بن محسن الیمانی
اور
ان کی حدیثی خدمات بھوپال میں

مولانا سید مشتاق علی ندوی
نائب قاضی شہر، بھوپال

ریاست بھوپال کا تاریخی پس منظر:

ہندوستان میں عرب تاجروں اور غزنی کے حکام و سلاطین کی آمد سے بہت پہلے عہد رسالت میں سرزمین بھوپال میں اسلام کی شعاعیں پہنچ چکی تھیں، اس دور میں بھوپال (جس کا قدیم نام بھوجپال ہے) ایک طویل و عریض رقبہ والی ریاست کا ایک حصہ تھا جس کا مرکزی مقام دھار تھا، جو مغربی مدھیہ پردیش کا ایک حصہ ہے، مولانا عباس رفعت شیروانی مہتمم دفتر تاریخ بھوپال نے جو مصنف فقیہ الیمن علامہ احمد شیروانی کے خلف الرشید تھے اور خود بہت بڑے مؤرخ و محقق تھے، "سراج الاقبال" میں بتفصیل اس تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ریاست دھار کے راجہ بھوج نے جو عہد نبویؐ میں مذکورہ ریاست کا حکمراں تھا، اپنی آنکھوں سے معجزہ شق القمر دیکھا تو اپنے نجومیوں کے مشورہ سے دو معتمد پنڈتوں کو حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں تحائف کے ساتھ بھیجا، اپنی مذہبی کتابوں سے اس نے کچھ سوالات کا انتخاب کیا اور پنڈتوں کو پابند کیا کہ وہ ان سوالات کے جوابات آنحضرت ﷺ سے معلوم کریں، دونوں قاصد خدمت نبویؐ میں حاضر

ہوئے اور تحائف (انگرکھا، پائجامہ، پان، چونا، کتھا، الائچی) خدمت عالیہ میں پیش کئے، قاصدوں نے آنحضرت ﷺ سے سوالات کئے جن کے درست جوابات عنایت فرمائے گئے، دونوں قاصد مشرف بہ اسلام ہوئے، کچھ دن خدمت نبویؐ میں گزار کر دھار واپس آئے اور رعبہ بھوج کو مکمل صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنے مومن ہوجانے کی خبر دی، رعبہ بھی کلی طور پر جب مطمئن ہوا تو دھار کے بڑے معبد میں جاکر اپنے قبول اسلام کا اعلان کردیا، یہ واقعہ ۳ھ مطابق ۶۲۳ء کا ہے۔

اس کے بعد راج بھوج نے اسلام کی تبلیغ وتلقین کے لئے دونوں قاصدوں کو بھوجپال روانہ کیا، یہاں کے مقامی لوگوں نے مزاحمت کی جس میں دونوں قاصد شہید ہوئے اور یہیں دفن کئے گئے، اس لئے اس مقام کو گنج شہیداں کہا جاتا ہے، دونوں صحابیوں کے مزار رعبہ بھوج کے بنوائے ہوئے بڑے تالاب کے کنارے موجود ہیں، اگرچہ وہ اب منہدم ہوچکے ہیں، یہی وہ جگہ ہے جس کو بعد میں قبرستان کربلا کا نام دیا گیا، یہ علاقہ موجودہ شہید گمر اور ساجدہ نگر دونوں محلوں پر محیط ہے، ہندوستان میں اگرچہ رعبہ بھوج متعدد گزرے ہیں لیکن رعبہ بھوج بانی بھوپال کے تعین اور اس کے اسلام کے سلسلہ میں قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی مرحوم نے اپنی کتاب ''ہندوستان اسلام کے سائے میں'' میں متعدد دلائل پیش کئے ہیں، ان میں میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ کی ایک قلمی بیاض (جو میاں نیمین محمد خاں کے گھرانے سے دستیاب ہوئی تھی) کے توسط سے رعبہ بھوج کے جنم پتری کا ذکر ہے جو اصلاً سنسکرت میں تھی جس کا ترجمہ علامہ فیضی نے فارسی میں کیا تھا، اس جنم پتری کے مندرجات سے بھی مذکورہ تاریخی واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔

اسلام کی اس آمد سے لے کر نواب دوست محمد خان کے بھوپال ورود تک کے زمانہ کی دینی اور علمی سرگرمیوں کا تاریخی اور تحقیقی طور پر کچھ پتہ نہیں چلتا البتہ نواب دوست محمد خاں نے جب ۱۷۰۷ء میں بھوپال ریاست کی تشکیل کی تبھی سے یہاں علماء وفضلاء کی آمد ہوئی اور یہ سرزمین علمی ودینی محنتوں کا مرکز بن گئی۔ (بھوپال میں مذہبی تصانیف ص، قلمی)

پھر جب ۱۲۳۳ھ میں فرمارِوائے بھوپال نواب سکندر جہاں صاحبہ نے اپنے وزیر اعظم

مولوی جمال الدین خاں کے ساتھ حج کے لئے جاتے ہوئے ''حدیدہ'' میں قیام فرمایا، کیونکہ یمن کا شہر ''حدیدہ'' مکہ مکرمہ کے لئے واحد بندرگاہ تھی، اتفاق سے نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے ''حدیدہ'' کے قاضی شیخ محمد کے گھر کے قریب قیام فرمایا اور بیگم صاحبہ کو قاضی صاحب کی علمی قابلیت اور فضیلت کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے وزیر اعظم مولوی جمال الدین کے ذریعہ قاضی محمد صاحب سے سفر حج میں ہمراہ چلنے اور رہنمائی کرنے کی گزارش کی تو قاضی صاحب نے خود تو ان کے ساتھ جانے سے معذرت کر دی مگر اپنے چھوٹے بھائی زین العابدین کو جن کی دینی تعلیم مکمل ہو چکی تھی، ان کے ساتھ سفر حج میں رہبری کے لئے روانہ کر دیا، حج سے واپسی پر نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے پھر حدیدہ میں قاضی محمد صاحب کے قرب و جوار میں قیام کیا اور قاضی محمد صاحب سے فرمائش کی کہ ان کے ساتھ بھوپال چلیں اور وہاں قاضی کی حیثیت سے تقرر کی پیشکش فرمائی، قاضی صاحب نے اپنی مصروفیت کی وجہ سے معذرت کی مگر اپنے چھوٹے بھائی زین العابدین صاحب کو بھوپال بھیج دیا اور کچھ مدت کے بعد شیخ حسین بن محسن یمانی بھی ۱۸۶۲ء میں بھوپال تشریف لائے اور بیگم صاحبہ نے بہت احترام سے ان کا استقبال کیا اور شیخ حسین صاحب یمنی سے گزارش کی کہ کچھ عرصہ قیام فرمائیں اور طلبہ کو درس حدیث سے مستفید فرمائیں، شیخ حسین صاحب نے قبول کیا پھر تو ان کے درس کی شہرت سے بھوپال شیراز ویمن سے آنکھیں ملانے لگا اور طلباء و حدیث شریف کے عاشق اطراف واکناف عالم سے بھوپال آنا شروع ہو گئے حتیٰ کہ ان کے درس کی بازگشت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی سنائی دینے لگی۔

نام ونسب:

شیخ امام علامہ محدث قاضی حسین بن محسن بن محمد بن مہدی بن ابی بکر بن محمد بن عثمان بن محمد بن عمر بن محمد بن مہدی بن حسین بن احمد بن حسین بن ابراہیم بن ادریس بن تقی الدین بن سمیع بن عامر بن عتیبہ بن ثعلبہ بن عوف بن مالک بن عمرو بن کعب بن الخزرج بن سعد الانصاری الصحابی۔

مقام پیدائش:

علامہ محدث قاضی حسین بن محسن انصاری کی پیدائش یمن کے مشہور شہر ''حدیدہ'' میں ہوئی۔

سن پیدائش: ۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ

ابتدائی تعلیم:

۱۳ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور اپنے گرامی قدر والد شیخ محسن بن محمد انصاری سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، ابھی عربی ادب، حدیث اور دوسرے علوم حاصل کر ہی رہے تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔

اعلیٰ تعلیم:

والد ماجد کے انتقال کے بعد تکمیل علم کے لیے اپنے ننھیال "مراوعہ" تشریف لے گئے کیوں کہ ان کا ننھیال علم وفضل میں معروف اور مشہور تھا اور بڑے بڑے ذی علم اور زاہد و متقی حضرات اس خاندان میں پائے جاتے تھے، چنانچہ مکمل آٹھ سال تک شیخ نے پوری یکسوئی اور دلچسپی کے ساتھ "مراوعہ" میں علوم وفنون میں مہارت پیدا کی سب سے پہلے نحو میں مضبوط اور پختہ صلاحیت پیدا کی، پھر امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق فقہ شافعی میں درک حاصل کیا، فقہ واصول فقہ میں کما حقہ استعداد پیدا کرنے کے بعد شیخ نے حدیث اور علوم حدیث کی طرف توجہ مبذول کی، سب سے پہلے سنن ابن ماجہ پھر سنن نسائی پھر سنن ابی داؤد پھر سنن ترمذی یمن کے مشہور محدث وعالم علامہ حسن بن عبدالباری الأهدل سے پڑھی، سنن اربعہ کے بعد علامہ محدث حسن بن عبدالباری سے ہی الجامع الصحیح للامام امیر المؤمنین فی الحدیث محمد بن اسماعیل البخاری اور الجامع الصحیح للامام المحدث مسلم بن حجاج النیساپوری کی تکمیل کی۔

پھر "مراوعہ" سے یمن کے دوسرے مشہور علمی شہر "زبید" تشریف لے گئے جہاں مفتی زبید علامہ سلیمان بن محمد بن عبدالرحمٰن الأهدل سے خصوصی استفادہ کیا اور صحاح ستہ کے علاوہ دوسری کتب پڑھی جیسے امام نووی اور ابن العربی کی حزب وغیرہ اور علامہ محدث سلیمان الأهدل نے اپنے دست مبارک سے لکھ کر شیخ حسین انصاری کو مکمل وعام اجازت مرحمت فرمائی اور علامہ سلیمان بن محمد نے اپنے دادا عبدالرحمٰن بن سلیمان الأهدل صاحب النفس الیمانی کو پایا تھا انھوں نے ان سے اور ان کے والد

نے محمد بن عبدالرحمٰن سے علم حاصل کیا اس کے علاوہ شیخ حسین انصاری نے علماء کے ایک بڑے طبقہ سے علم حاصل کیا، اور پھر شیخ حسین ہر سال اپنے شیخ کی خدمت میں بغرض استفادہ حاضری دیتے رہے، اگر کبھی شیخ حسین کو پہنچنے میں تاخیر ہوتی تو خود شیخ فاعد لی ان کو بلواتے۔

شیخ حسین انصاری پر اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل یہ ہوا کہ نیل الاوطار کے شہرہ آفاق مصنف مجتہد یمن علامہ محمد بن علی الشوکانی ۱۲۵۰ھ کے صاحبزادہ شیخ صفی الدین احمد بن قاضی محمد بن علی الشوکانی کسی خاص ضرورت سے صنعاء سے "حدیدہ" پہنچے تو ہمارے شیخ حسین انصاری نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور جب تک شیخ احمد الشوکانی "حدیدہ" میں مقیم رہے برابر ان کے ساتھ ہی رہے، ان دوران انھوں نے صحاح ستہ کے کچھ اجزاء شیخ احمد الشوکانی سے پڑھ کر اجازت چاہی تو شیخ احمد الشوکانی نے ان کو اجازت خاصہ اور اجازت عامہ مرحمت فرمائی اور شیخ حسین انصاری سے گہرے تعلق و محبت کا اظہار فرمایا، ان سے فرماتے تھے "تمہارے والد میرے والد کے شاگرد تھے اور تم میرے بیٹے اور میرے شاگرد ہو"۔

حرمین شریفین کی حاضری:

پھر اللہ تعالیٰ نے شیخ حسین انصاری پر فضل فرمایا کہ حرمین شریفین مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ (علی صاحبہا الف الف تحیہ وسلام) کی حاضری کا بار بار موقع عنایت فرمایا خاص طور پر مکہ مکرمہ میں خصوصیت سے حاضری دی اور وہاں شریف علامہ حافظ محمد بن ناصر حازمی سے شرف تلمذ حاصل کیا، علامہ حافظ محمد بن ناصر حازمی کا معمول تھا کہ مکہ مکرمہ میں رجب سے ذی الحجہ تک قیام فرماتے تھے، تو شیخ حسین انصاری بھی مستقل ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، سب سے پہلے حسین یمانی ۱۲۸۰ھ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پہلی کتاب حضرت سے پڑھی وہ "مسند دارمی" تھی جس کو شیخ نے اول سے آخر تک مکمل پڑھی، آپ کے ساتھ اس درس میں مفتی ایوب بن فخر الدین پھلتی ثم بھوپالی بھی شریک تھے، پھر برابر شیخ ان کی خدمت میں ماہ رجب کے شروع میں حاضر ہو جاتے اور حج کے ماہ تمام ہونے تک ان کی خدمت میں رہتے اس دوران ان سے صحاح ستہ کے علاوہ علامہ کی تمام

''مسلسلات'' پڑھیں اور اجازت حاصل کی اور علامہ حازمی نے اپنے ہاتھ سے ان کو لکھ کر اجازت کلیہ وتامہ مرحمت فرمائی اور شیخ حسین سے غیر معمولی محبت وشفقت کا معاملہ فرماتے ہوئے خصوصی دعاؤں سے نوازا۔

منصب قضاء:

شیخ حسین انصاری نے یمن کے ایک شہر'' حدیدہ'' سے تقریباً تین چار دن کی مسافت پر واقع ''لحیہ'' میں مسند قضا، کو رونق بخشی اور تقریباً چار سال کے قریب پوری دیانت داری مستعدی اور حاضر دماغی کے ساتھ قضاء کے فرائض انجام دئے اور فیصلہ اور فتوٰی میں نہ کبھی کسی کی رعایت کی اور نہ ہی مصلحت کی پرواہ کی۔

بلند ہمتی وحق گوئی:

شیخ نے ہمیشہ بلند ہمتی اور حق گوئی کے دامن کو تھامے رکھا اور کبھیں کسی کے دباؤ (Pressure) میں نہیں آئے اسی خوبی وخصلت کی بنا پر ان کو ابتلاء وآزمائش پیش آئی اور منصب قضاء سے دستبردار ہونا پڑا اور استعفٰی دیا۔

آزمائش:

واقعہ یہ پیش آیا کہ سلطنت عثمانیہ ترکی کی طرف سے'' حدیدہ'' میں متعین گورنر احمد پاشا صاحب نے''لحیہ'' کے تاجروں پر ان ہیروں پر جو وہ سمندر سے نکلواتے تھے اور جن کی نہ کوئی تعداد و مقدار متعین تھی اور نہ ہی ان کی کوئی قیمت طے تھی ایک ٹیکس عائد کیا اور علماء ومفتیان کو جمع کر کے اس کے جواز کا فتوٰی دینے کا حکم دیا تو شیخ حسین انصاری نے یہ فتوٰی دینے سے انکار کر دیا، اس بات سے احمد پاشا چراغ پا ہو گیا اور شیخ پر رعب ڈالنے کے لئے اس نے توپ منگوائی اور حاکمانہ غرور سے بولا کہ اگر تم نے یہ فتوٰی نہیں لکھا تو میں تمہیں اس توپ سے اڑا دوں گا اور تمہارے جسم کے پرخچے اڑ جائیں گے، اس پر شیخ حسین نے مکمل اطمینان ووثوق کے ساتھ جواب دیا کہ جو کرنا ہے کریں اس سے مجھے قطعاً کوئی نقصان نہیں ہوگا، نہ ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور نہ ہی لوگوں کے نزدیک، نہ عرف واصطلاح

میں، اور تمہارے پاس ہمارے سلطان (یعنی ترکی خلیفہ) کی طرف سے کوئی حکم نامہ بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ ہمارے اوپر دباؤ ڈالیں اور بفرض اگر آپ کے پاس سلطان (یعنی ترکی خلیفہ) کی طرف سے کوئی حکم نامہ بھی ہوتا تو ہم پر "بادشاہ" کی اطاعت اس وقت فرض ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آرڈر دے اور اگر کتاب اللہ اور سنت رسول کے خلاف کوئی حکم دیتا ہے تو ہم پر اطاعت ضروری نہیں اور ہمیں خلیفہ وقت سے اس کی پوری توقع ہے کہ وہ اللہ و رسول ﷺ کے حکم کے خلاف کبھی کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتے، اور یہ میرا استعفیٰ منصب قضاء سے آپ کی خدمت میں پیش ہے تو احمد پاشا نے مزید تین دن تک شیخ پر سختیاں کیں، آپ کا کھانا پینا بند کر دیا اور تین دن تک تیز دھوپ میں کھڑا کیا، یہاں تک کہ آپ کی صورت بدل گئی جس کو بھی اس واقعہ کا علم ہوا اس نے شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا، شیخ یہ تمام صعوبتیں برداشت کرتے رہے، لیکن قرآن، حدیث اور اقوال ائمہ وسلف کے خلاف فتویٰ دینے پر راضی نہیں ہوئے یہاں تک کہ شیخ کو محبوب وعزیز وطن کو بھی خیرآباد کہنا پڑا۔

بھوپال تشریف آوری:

۱۲۷۳ھ میں نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ حج سے واپسی کے وقت شیخ کے چھوٹے بھائی زین العابدین کو اپنے ساتھ بھوپال لے آئی تھیں، اور پہلے ان کو نائب قاضی اور پھر قاضی کا عہدہ جلیلہ ان کے سپرد کر دیا تھا، ادھر جب شیخ کے ساتھ مذکورہ واقعہ پیش آیا اور ساتھ ہی شیخ کی والدہ صاحبہ نے حکم دیا کہ وہ بھوپال جا کر اپنے بھائی زین العابدین کو واپس "حدیدہ" لے آئیں تو شیخ حسین انصاری ۱۸۶۲ء میں بھوپال تشریف لائے، نواب سکندر جہاں بیگم نے ان کا بہت احترام سے استقبال کیا، جب بیگم صاحبہ کو یہ معلوم ہوا کہ شیخ اپنے بھائی قاضی زین العابدین کے ساتھ واپس ہونا چاہتے ہیں تو بیگم صاحبہ نے درخواست کی کہ کچھ عرصہ بھوپال میں قیام فرمائیں اور تشنگان علوم حدیث کو سیراب فرمائیں تو شیخ راضی ہو گئے اور درس حدیث دینا شروع کر دیا، شیخ کی درس حدیث کی شہرت جلد ہی چاروں طرف پھیل گئی اور شہرت کو سن کر اطراف ہند اور بیرون ہند سے طلباء اور علماء بھوپال آ کر اس "چشمہ صافی" سے سیراب ہونے لگے، دو سال کے بعد شیخ نے پھر بیگم صاحبہ سے یمن جانے

اور اپنے ساتھ بھائی قاضی زین العابدین کو لے جانے کی اجازت طلب کی تو بیگم صاحبہ نے شیخ کے اصرار پر ان کو تو اجازت دے دی لیکن قاضی زین العابدین کو روک لیا۔

دوبارہ آمد بھوپال:

۱۸۶۹ء بعد نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ شیخ حسین دوبارہ بھوپال تشریف لائے اور چار سال بھوپال میں قیام فرما کر علم وفضل کی کرنیں بکھیرتے رہے، چار سال کے بعد پھر اپنے وطن واپس آ گئے اسی دوران نواب صدیق حسن خان صاحب حج کو تشریف لے گئے اور ''حدیدہ'' میں شیخ حسین سے ملاقات و استفادہ کا موقع ان کو مزید ملا، کیوں کہ نواب صاحب خود مشہور اور عظیم عالم و مصنف اور بڑے صاحب نظر و جوہر شناس رئیس تھے، وہ ان کے علوئے اسناد، غیر معمولی حافظہ، علوم حدیث پر ان کی غیر معمولی قدرت اور ان کا تبحر علمی دیکھ کر ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ خود ان سے سند بھی لی اور ان کو بھوپال تشریف آوری کی دعوت بھی دی۔

مستقل سکونت:

۱۸۷۵ء میں شیخ حسین یمانی بھوپال تشریف لائے اور پھر اس کو اپنا وطن بنا لیا اور حدیث وعلوم حدیث کی خدمت میں سرگرم ہو گئے، ادھر نواب صدیق حسن خان صاحب اور شاہجہاں بیگم صاحبہ جو خود بڑی عالمہ، مصنفہ، شاعرہ وادیبہ تھیں، کی قدردانی اور شاہانہ استقبال سے شیخ کی شہرت ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچ گئی اور طلباء وعلماء کی کثیر تعداد شیخ کی خدمت میں حاضری دینے لگی۔

علمی خدمات:

شیخ حسین انصاری کے متعلق علامہ عبدالحئی صاحب نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۲۵ پر رقم طراز ہیں: ''ہمارے شیخ حسین کو تالیف وتصنیف سے زیادہ شغف نہیں تھا، اگر وہ اس طرف توجہ کرتے تو ان کی حدیث پر وہ خدمات ہوتیں جو دوسروں کے بس کی بات نہیں، ان کے کچھ رسائل ہیں جن کے اندر لمبے ومفید مباحث موجود ہیں جو ایک جلد میں ہیں لیکن ان میں اکثر ضائع ہو گئے اور شیخ نے ان کے جمع وطبع کرانے کا اہتمام بھی نہیں کیا اور ان کی سنن ابی داؤد پر تعلیقات بھی ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم میں تحریر کیا ہے: وہ طالبین کے لئے بڑی غنیمت اور راحلین کے لئے بڑی نعمت ہیں، علم نافع، عمل صالح، فکر سلیم وصحیح کے حامل ہیں، علوم حدیث کی اشاعت میں عالی ہمت ہیں، ان سے ملنا سبب برکت ہے، یمن میمون کے علماء کی تالیفات سے ہم کو بہرور کیا اور اچھی اچھی کتابوں کی تیز بارش کی طرح بارش کی۔ (ابجد العلوم،ص ۸۸۷)

شمس الحق ڈیانوی نے غایۃ المقصود کے مقدمہ میں شیخ حسین کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا" میں نے ان کوعلم وعمل کا جامع پایا اور ایسی شخصیت جو نادر الوجود ہوتی ہیں ان کی شان بہت بلند اور ان کا مقام بہت اونچا ہے، اور وہ ایسا بحر زخار (موجیں مارتا ہوا سمندر) ہیں جس کا کوئی ساحل نہیں محقق، محدث، قرآن مجید کے شارح ومفسر، اہل حدیث کے بادشاہ، علل احادیث اور رجال سے مکمل باخبر، علم اصول حدیث اور فقہ کے ماہر"۔ (مقدمہ غایۃ المقصود،ص ۱۷)

علامہ عبدالحی حسنیؒ فرماتے ہیں: اس ضعیف بندے نے ان سے علم حدیث بہت کچھ حاصل کیا، اولیات الشیخ محمد سعید سنبلی، حصن حصین، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، صحیح مسلم بن الحجاج النیسا پوری، صحیح الامام محمد بن اسماعیل البخاری میں نے اول سے آخر تک پوری کی پوری شیخ سے پڑھی اور بلوغ المرام کا بھی اچھا خاصہ حصہ پڑھا، اس کے علاوہ دوسروں کی قرأت سے میں نے سنن النسائی، سنن ابن ماجہ، مسند الدارمی، موطأ، مشکوٰۃ وغیرہ سنی، اسی طرح میں نے شیخ سے بہت سی احادیث مسلسل سنی، جیسے المسلسل بالاولیۃ، المسلسل بالمحبۃ، المسلسل بیوم سعید، المسلسل بیوم عاشوراء، المسلسل بالمصافحۃ، المسلسل بالمشابکۃ اور المسلسل بالصحبۃ" وغیرہ اور شیخ نے مجھے اجازت عام وتام مرحمت فرمائی۔

صفی الرحمن مبارکپوری نے شیخ حسینؒ کے متعلق لکھا" ان کے لئے نشر علم اور اسلامی میراث کی نشأۃ ثانیہ اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے میں بڑی کوششیں اور کاوشیں ہیں اور نمایاں کردار ہے خاص طور پر کتب حدیث اور ان کی شروح کو نئی زندگی عطا کرنے میں شیخ کی گرانقدر خدمات ہیں، وہ نواب صدیق حسن خاں کے لئے طاقتور قوت بازو تھے، مخطوطات ومطبوعات کے جمع کرنے اور ان کے شائع کروانے کے سلسلہ میں بیشک شیخ، فضلاء اور تشنگان علوم کی آماجگاہ تھے۔ (ص ۷)

اور علامہ سید ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ نے ''پرانے چراغ'' جلد اول میں جو کچھ تحریر فرمایا اس سے شیخ کے تبحر علمی، غیر معمولی حافظہ، علوم حدیث پر ان کی غیر معمولی قدرت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، علامہ الندویؒ رقم طراز ہیں۔ (ص ۲۱۱)

۱۸۷۹ء میں وہ بھوپال آئے اور وہیں رہ پڑے، شیخ حسین فن حدیث کے امام اور قدیم محدثین کی (جن کی قوت حفظ اور وسعت نظر کے واقعات قدیم تذکروں میں منقول اور اس دور کے لوگوں کے لئے سرمایہ استعجاب ہیں) کی زندہ یادگار اور بولتی چالتی تصویر تھے، میں نے اپنے استاذ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء سے جوان کے شاگرد تھے خود سنا ہے کہ فتح الباری (شرح بخاری) کی تیرہ (۱۳) جلدیں تقریباً ان کو حفظ اور مستحضر تھیں، ان کی سند حدیث نہایت عالی اور قلیل الوسائط تھی جو علمائے حدیث کے یہاں ایک وجہ افتخار و امتیاز سمجھی جاتی ہے، وہ نیل الاوطار کے شہرۂ آفاق مصنف، مجتہد یمن علامہ محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۵۰ھ) کے صاحبزادہ علامہ احمد بن محمد علی الشوکانی اور دوسرے جلیل القدر علمائے یمن کے شاگرد تھے، ہندوستان میں ان کے درس حدیث میں بڑی برکت ہوئی اور ان کو ایسی مرجعیت حاصل ہوئی جو ایک دو علمائے راسخین کو چھوڑ کر کسی کو حاصل نہیں ہوئی، بڑے بڑے اساتذہ فن اور مشاہیر علماء نے جو خود صاحب درس و تصنیف تھے اور جن کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، ان کے تلمذ کو اپنے لئے باعث فخر سمجھا، تلامذہ میں نواب سید صدیق حسن خاں، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا شمس الحق ڈیانوی، (صاحب غایۃ المقصود و عون المعبود)، حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی بہاری، نواب وقار نواز جنگ، مولانا وحید الزماں حیدر آبادی، مولانا محمد طیب کی رامپوری، مولانا محمود حسن خاں ٹونکی (صاحب معجم المصنفین)، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء ہیں، شیخ حسین کے قیام نے بھوپال کو دارالحدیث اور شیراز و یمن کا ہمسر بنا دیا، تقریباً ثلث صدی سے زائد موتی مسجد جو اس چھوٹے سے شہر میں جامع ازہر سے آنکھیں ملاتی تھی، قال قال رسول اللہ ﷺ کی صدا سے گونجتی رہی وہ نہ صرف بھوپال

بلکہ ہندوستان کی فضاء کو اس نکہتِ عنبریں سے معطر و منور کرتی رہی ہیں۔

(پرانے چراغ، ج۱ص۲۱۲،۲۱۱)

میری خوش قسمتی تھی کہ اس مضمون کی تیاری کے لئے میں کوشاں تھا کہ اس دوران علامہ خلیل بن محمد عرب کے صاحبزادے یحییٰ خلیل عرب (مقیم کراچی پاکستان) سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک کتاب ان کے خاندان کے تعلق سے تحریر کی ہے، ''گلزار یمن'' تلاش کرنے پر یہ کتاب اسی خاندان کی ایک بزرگ شخصیت رافع بن عبدالرحمٰن عرب کے پاس مل گئی، انھوں نے ازراہ کرم مجھے عنایت کی، کتاب تو اصلاً اسی یمنی انصاری خاندان پر ہے اور تقریباً ۳۶۷ صفحات پر مشتمل ہے اس میں شیخ حسین بن محسن انصاری کا تذکرہ بھی یقیناً ہونا ہی تھا، شیخ رافع بن عبدالرحمٰن عرب نے اس کتاب کے صفحہ ۸۴ پر شیخ کی تصانیف کی تعداد سات تحریر کی ہے، اور پھر مجھے زبانی و تحریری طور پر مندرجہ ذیل کتابوں کے نام بتائے:

(۱) التحفة المرضية في حل بعض المشكلات الحديثية .

(۲) القول الحسن المتين في ندب المصافحة باليد اليمين .

(۳) تعليقات على سنن أبي داؤد .

(۴) مجموعة الفتاوى .

(۵) نور العين (فتاوى حسيني) .

(۶) فتح رباني على رد قاديانى .

(۷) التاج المكلل في الشاذ و المعلل .

حضرت علامہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے تحریر کیا ہے کہ میرے والد صاحب نے حدیث شیخ حسین بن محسن سے پڑھی تھی، اور ان کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے، شیخ صاحب نے بعض رسائل (جوالحمدللہ اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہیں) خاص والد صاحب کے لئے تصنیف کئے تھے۔ (پرانے چراغ، ج۱ص۲۱۳)

شیخ حسین یمانی کے خاندان کے فرد جناب ادیس عرب صاحب نے مجھے زبانی بتایا کہ ان کے پاس شیخ صاحب کے بعض مخطوطات محفوظ ہیں لیکن فی الحال وہ فراہم نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے چھوٹے بھائی زبیر عرب فی الحال ہندوستان سے باہر ہیں اور انھیں کی تحویل میں وہ تمام مخطوطات محفوظ ہیں، اللہ نے اگر توفیق دی تو پھر کبھی ان مخطوطات کو اس خاندان سے حاصل کر کے منظر عام پر لانے کی کوشش کروں گا جو یقیناً حدیث اور علوم حدیث سے شغف رکھنے والوں کے لئے ایک علمی تحفہ ہوگا۔

شیخ کا فیض جنات میں:

شیخ صاحب کے درس حدیث و قرآن میں صرف انسان ہی شریک نہیں تھے، بلکہ جنات بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھے، ویسے تو اس حوالے سے ان سے کئی واقعات منسوب کیے جاتے ہیں مگر اس کی تصدیق اس ایک واقعہ سے ہو جاتی ہے جس کا ذکر نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ جب بھی شیخ صاحب کے درس حدیث و قرآن میں شریک ہوتے تو اکثر محسوس کرتے کہ شیخ صاحب درس کے دوران ہمارے سوالوں کے جواب کے علاوہ کچھ اور لوگوں کے سوالوں کے جواب بھی دیا کرتے تھے، جو لوگ ان سے سوال کرتے تھے، ان کی آواز ہم کو نہیں آتی تھی، مگر شیخ صاحب جو بھی جواب دیا کرتے تھے وہ ہم لوگ سن لیتے تھے، ہم سب لوگ تعجب کرتے کہ شیخ صاحب کن لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں، جو ہم کو نظر نہیں آتے۔

مگر شیخ صاحب سے پوچھنے کی ہمت کسی کو نہ ہوتی تھی، شیخ صاحب کی مجھ پر خاص نظر کرم تھی، درس کے دوران وہ میرے سوالوں کے جواب بہت محبت سے اور آسان زبان میں دیا کرتے تھے، اس لئے میرے ہم جماعت طلباء نے مجھ کو پابند کیا کہ تم شیخ صاحب سے معلوم کرو کہ یہ کون لوگ ہمارے درس میں شریک ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ ایک دن ہمت کر کے میں نے پوچھ لیا کہ حضرت ہم محسوس کرتے ہیں کہ درس کے دوران آپ ہمارے سوالوں کے جواب کے علاوہ کچھ اور لوگوں کو بھی برابر جواب دیا کرتے ہیں جن

کے سوال ہم کو سنائی نہیں دیتے، شیخ صاحب مسکرائے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا: بابا تم لوگ پرو (پڑھو) تم کو اس سے کیا مطلب کہ ہم کس کو کیا جواب دیتا ہوں بہت مخلوق خدا ہے جو ہم سے پڑتا (پڑھتا) ہے تم درو (ڈرو) مت تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوگا (ہوگی) ان کا جواب سن کر ہم کو یقین ہو گیا کہ جنات بھی ہمارے شریک درس رہتے ہیں۔ (گلزار یمن ص ۹۰)

شیخ کی کرامت:

شیخ یحییٰ خلیل عرب تحریر کرتے ہیں کہ ایک اور واقعہ میں قارئین کے لئے شیخ صاحب کے متعلق نقل کرتا ہوں جو کہ نواب حمید اللہ خاں صاحب کی بڑی صاحبزادی شہزادی گوہر تاج عابدہ سلطان (سابق ولی عہد بھوپال) صاحبہ نے میری ہمشیرہ ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب کے شعری مجموعہ'' سایہ ہے کرتم ہو'' کا تعارف لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے، شہزادی صاحبہ ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے کراچی پاکستان آ گئی تھیں۔

شیخ محمد کے والد بزرگوار علامہ شیخ حسین اپنی علمی شہرت اور فضیلت کی بدولت نواب شاہجہاں بیگم والی ریاست بھوپال کی مجلس علماء کے اہم رکن ہوا کرتے تھے، نواب شاہجہاں بیگم خلد آشیانی ان کی اتنی قدر کرتی تھیں کہ ان کے مشورے کے بغیر کسی مذہبی معاملے میں قدم نہیں اٹھاتی تھیں، اس عظیم خاندان میں صرف اولی الالباب ہی نہیں پائے جاتے رہے ہیں بلکہ صاحب کرامت بھی ہوئے ہیں، علامہ شیخ حسین کا ایک تاریخی کرشمہ حسب ذیل ہے جس کو میں نے اپنے خاندان کے متعدد بزرگوں سے بار بار سنا ہے۔

کہتے ہیں کہ بھوپال میں ایک سال بارش نہیں ہو رہی تھی، سرکار خلد آشیانی شاہجہاں بیگم کا دور حکومت تھا، رئیس و رعایا سخت پریشان تھے، مروجہ دعائیں، نمازیں، ٹونے، خیرات سب ہی کچھ ہو رہا تھا مگر بارش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی، اس زمانے کے لوگ بھولے اور راسخ العقیدہ ہونے کے ساتھ ایسی آفات کو عتاب الٰہی سے منسوب کرتے تھے اور بہت زیادہ دہشت زدہ ہو جاتے تھے، چنانچہ سرکار شاہجہاں بیگم نے گھبرا کے شیخ حسین کو طلب کیا اور فرمایا: شیخ صاحب کیا کریں اللہ رب العزت بے حد

ناراض ہے کسی کی نمازیں، دعائیں اور التجائیں، توبہ استغفار قبول نہیں فرمارہا، تالاب سوکھ گئے، کنویں خشک ہو گئے، لوگ دانہ دانہ کو ترس رہے ہیں اور غفور الرحیم نے ہم سے منہ پھیر لیا ہے، وغیرہ وغیرہ، شیخ صاحب مسکرائے اور کہا: سرکار اللہ تعالیٰ نے کسی سے منہ نہیں موڑا ہے تم نے اللہ تعالیٰ کی توہین کیا ہے، سرکار تم نواب ہے تم والی ملک ہے، تم اپنا جراسی (چپراسی) کے ساتھ اللہ کو بلاتا ہے تم مساجد میں نماز استسقاء کرواتا ہے، دعائیں کرواتا ہے مگر خود شان وشوکت سے محل میں بیٹھا ہے، جراسی (چپراسی) سے دعا کرواتا ہے اللہ جل شانہ کے حضور میں خود حاضر نہیں ہوسکتا ہے، وغیرہ، اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ بحیثیت ایک والی ملک کے نواب شاہجہاں بیگم پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔

یعنی ایک وہ جو ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور دوسری وہ جو والیان ملک پر عائد ہوتی ہے اگر چہ نواب شاہجہاں بیگم بذات خود صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں اور برابر توبہ استغفار اور دعاؤں میں معروف رہتی تھیں، مگر یہ عبادات وہ نجی طریقہ سے انجام دے رہی تھیں اس لئے شیخ صاحب کے حکم سے یہ طے پایا کہ نماز استسقاء کا شہر کی عیدگاہ میں اہتمام کیا جائے، جس میں سرکار خود بھی شریک ہوں۔

اس طرح سرکار شاہجہاں بیگم علیہ آشیانی مع اپنے اسٹاف کے چلچلاتی دھوپ میں دن کے بارہ بجے ننگے پاؤں ننگے سرتاج محل سے عیدگاہ کی طرف حسب الہدایت شیخ حسین صاحب پیدل روانہ ہوئیں اور نماز استسقاء میں شرکت فرمائی۔

میرے وہ بزرگ جو اس نماز میں شریک تھے اور اس معجزہ کے عینی شاہد تھے وہ بیان کرتے تھے کہ نماز کے بعد ابھی قاضی صاحب کا خطبہ ختم نہیں ہوا تھا کہ اتنی شدید بارش ہوئی کہ خطبہ کے کاغذ (جو لوگوں میں اردو ترجمہ کے ساتھ تقسیم کیا گیا تھا) گل گل کے (بھیگ کر) لوگوں کے ہاتھوں سے گر گئے، بھلا ایسے صاحب کرامات اور صاحب علم وفضل لوگوں کا میں کیا تعارف کرا سکتی ہوں۔

(صفحہ ۱۵ تا ۱۷ "سایہ ہے کرم ہو" صفحہ ۸۰ تا ۸۱)

زندگی کے آخری ایام:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی الندویؒ کے والد ماجد علامہ سید عبدالحیٔ حسنی شیخ کے بڑے

محبوب شاگردوں میں تھے، وہ بھی شیخ کے بڑے مداح وقدر دان تھے، اس روحانی رشتہ اور قرب کی وجہ سے شیخ نے زندگی کے آخری ایام میں لکھنؤ کے کئی دفعہ سفر کئے اور مولانا عبدالحیؒ حسنی کے دولت کدہ پر ہی قیام فرماتے، مولانا کا بیان ہے کہ شیخ مجھ سے ایسی محبت وشفقت فرماتے جیسے باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے۔ (نزہۃ الخواطر: ج۸ص ۱۲۵) انتقال سے چار ماہ قبل بھی شیخ لکھنؤ تشریف لے گئے اور تقریباً ایک ماہ لکھنؤ میں قیام فرما کر مولانا حبیب الرحمٰن بن محمد تقی شیروانی کی دعوت پر حبیب گنج (ضلع علی گڑھ) تشریف لے گئے اور وہاں تقریباً چار ماہ قیام فرمایا اور دونوں کے درمیان علمی مجالس اور آراء کا تبادلہ رہا، پھر بھوپال تشریف لے آئے۔

آخری سفر:

بھوپال واپسی کے بعد صرف ۱۵ اردن ہی گزرے تھے کہ سفرِ آخرت اختیار کیا، وفات سے تقریباً ۱۰ ارگھنٹہ قبل گھر سے نکلے، یہ ۱۰ ار جمادی الآخر منگل کا دن تھا، صحت اچھی تھی، اپنے دوست واحباب سے ملاقاتیں کیں اور سب سے حسن خاتمہ کے لئے دعا کی درخواست کی، پھر اپنی اولاد واحباب کے گھروں پر تشریف لے گئے گویا ان کو رخصت کر رہے ہوں، یہ سلسلہ ظہر کی نماز سے عصر کی نماز کے بعد تک چلتا رہا، عصر کی نماز پڑھ کر اپنے صاحبزادے عبداللہ بن حسین کے گھر پہنچے اور ان سے اس مسئلہ پر گفتگو و مذاکرہ شروع کیا کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے ایک صاحبزادے زمانہ جاہلیت میں تھے ان کا نام عبدالعزیٰ تھا یا نہیں، اور اپنے صاحبزادے عبداللہ سے فرمایا کہ فلاں فلاں کتاب لے آؤ ان کے اندر اس مسئلہ کا حل اور اس سوال کا جواب مل سکتا ہے، اس کے علاوہ بھی ان سے بعض علمی مسائل پر بھی گفتگو کرتے رہے اور ان کو املا کرواتے رہے، جب سورج غروب ہونے کے قریب ہوا تو صاحبزادے محترم عبداللہ وضو کرنے کے لئے گئے، وضو کر کے جب آئے تو شیخ یمانی کا آفتاب زندگی غروب ہو چکا تھا، شیخ ایک تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما تھے، آپ کا سر ایک طرف جھک گیا اور اسی تکیہ سے لگ گیا پھر چت لیٹ گئے ہاتھ اور پیر پھیلے ہوئے تھے اور دونوں آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں تھیں، کسی نے بند نہیں کیں، پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا اور صاحبزادے محترم یہ سمجھے کہ

شیخ کی آنکھ لگ گئی ہے تو انھوں نے حرکت دے کر بیدار کرنا چاہا لیکن ان کی تو روح قفص عنصری سے پرواز کر چکی تھی، یہ شب شب چارشنبہ تھی اور اسی دن صبح اس گنجینۂ علم و معرفت، مجموعہ کمالات، آفتاب علوم نبوت کی تدفین عمل میں آئی، یہ ۱۳۲۷ھ تھا۔ (الاعلام، ج ۸ ص ۱۷۶)

وصلی اللہ علی النبی الکریم وآلہ وصحبہ اجمعین.

فہرست مصادر و مراجع:

۱۔ نزہۃ الخواطر (الاعلام بمن فی الہند من الأعلام)

۲۔ تاریخ قضاۃ ومفتیان بھوپال — مطبوعہ

۳۔ ہندوستان اسلام کے سایہ میں — مطبوعہ — از سید عابد علی وجدی الحسینی

۴۔ بھوپال میں مذہبی تصانیف — غیر مطبوعہ (قلمی) — سید شرافت علی ندوی

۵۔ گلزار یمن — مطبوعہ — از یحییٰ خلیل عرب

۶۔ پرانے چراغ حصہ اول — مطبوعہ — از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

۷۔ ابجد العلوم — مطبوعہ — علامہ نواب صدیق حسن خاں صاحب

۸۔ مقدمہ غایۃ المقصود — مولانا شمس الحق ڈیانوی

۹۔ بھوپال میں علماء یمن کا فیض — از رافع بن عبدالرحمن عرب انصاری



مولانا محمد مظہر نانوتوی

اور

انکی دو قلمی خدمات حدیث

از: مولانا محمد ارتضاء الحسن کاندھلوی

علماء ہند کے ہاتھوں سرزمین ہند میں انجام پانیوالی خدمت حدیث کا جب تذکرہ آتا ہے تو اس وقت بجا طور پر حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی قدس سرہ کا نام نامی بھی سامنے آتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ جس درجہ کی آپ کی خدمات ہیں ان کا ویسا تعارف اور شہرہ نہیں ہے، آپ نے مختلف پہلوؤں سے اس مبارک فن کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ خاص طور سے مسلمانان ہند پر ایک عظیم اور ناقابل فراموش احسان ہے، آپ کی اس فن سے مناسبت اور دلچسپی عشق کے درجہ تک پہونچی ہوئی تھی، اور کیوں نہ ہوتی جبکہ آپ اس خانوادۂ ولی اللہی کے خوشہ چین اور فیضیافتہ تھے جو حدیث اور فن حدیث کے عنوان سے چہار دانگ عالم میں مشہور ہوا اور جسکی کوششوں اور کاوشوں سے بر صغیر میں اور یہاں سے نکل کر پورے عالم میں حدیث شریف کا آوازہ اور نعرہ بلند ہوا اور دنیائے اسلام اس کا برملا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئی۔

ولادت اور ابتدائی حالات:

آپ کا وطن اصلی مغربی یوپی کے ضلع سہارنپور میں واقع ایک مردم خیز قصبہ نانوتہ ہے، آپ

شیوخ نانوتہ کے اس خانوادہ کے ایک چشم وچراغ اور موتی آبدار تھے، جس نے امت کو مولانا مملوک العلی نانوتوی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی جیسی بے مثال عبقری شخصیات فراہم کیں۔

(علامہ مظاہر علوم اوران کی علمی وتصنیفی خدمات ص:۳۰-۳۷ جلد اول مرتبہ مولانا سید شاہد سہارنپوری)

آپ کی ولادت ۱۲۲۷ھ میں ہوئی اور تاریخی نام :محمد مظہر: تجویز کیا گیا، حفظ قرآن پاک اور ابتدائی تعلیم کے بعد طلب علم کی خاطر آپ نے دہلی کا سفر کیا، جہاں آپ کے خاندان کے ایک بزرگ حضرت مولانا مملوک العلی مسند درس سجائے ہوئے تھے، آپ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور متوسطات سے لیکر مختلف علوم وفنون کی اعلی کتابوں تک ان سے پڑھا، آپ ان سے گھر میں بھی پڑھتے تھے اور دہلی کالج میں بھی۔

(تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی ص ۳ مرتبہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مطبوعہ ۱۴۲۸ھ)

بعد ازاں آپ کا تعلیمی سفر مولانا مفتی صدرالدین آزردہ اور شاہ عبدالغنی مجددی کی درسگاہوں سے ہوتا ہوا حضرت شاہ اسحٰق کے دربار حدیث تک پہونچا، اول الذکر دونوں اساتذہ کرام سے آپ نے کون کون سی کتابیں پڑھیں اس کی تفصیلات مفقود ہیں البتہ حضرت شاہ عبدالغنیؒ نے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو جو سند اجازت مرحمت فرمائی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں آپ درس موطاً میں آپ حضرت نانوتوی کے رفیق تھے۔ (سوانح قاسمی ص ۲۶۱ جلد اول مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی مطبوعہ ۱۳۷۳ھ) حضرت شاہ اسحاقؒ سے آپ نے حدیث شریف کی متعدد کتابیں پڑھیں اور اجازت حدیث سے بہرہ ور ہوئے، حضرت شاہ اسحاق صاحب ہی آپ کے اصل استاذ ہیں۔

(ابتدائیہ بذل المجہود ص ۴ جلد اموئلف مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ سہارنپور)

بنارس کالج کی ملازمت اور سفر حج:

دہلی کے انگریز افسران جو دہلی کالج سے وابستہ تھے، ان کی کالج کی کارکردگی پر گہری نظر رہتی

تھی، وہ دہلی کالج کے ہونہار اور ممتاز فضلاء پر گہری نظر رکھتے تھے تا کہ ان کے ذریعہ ملک بھر میں پھیلے سرکاری تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کا کام کیا جا سکے، آپ نے بھی چوں کہ دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی، اور اپنی ذہانت و فطانت اور صلاحیت کی بناء پر ممتاز اور فائق شمار کئے جاتے تھے، اس لئے آپ کا غالبا ۱۸۴۳ء میں بنارس کے سرکاری کالج میں شعبۂ عربی کی صدارت اور تدریس کے لئے تقرر کر لیا گیا، تنخواہ پیاسی روپے ماہانہ تجویز کی گئی، آپ نے یہاں ارباب حل و عقد کی امیدوں اور توقعات کے عین مطابق یکسوئی اور کامیابی کے ساتھ تقریبا چار سال مفوضہ خدمت انجام دی۔

(تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی: ص ۱۱)

چوتھے سال آپ کو سفر حج کا شوق ہوا، آثار وحی کے ان خدام کو مہبط وحی کی زیارت کا شوق نہیں ہوگا تو اور کس کو ہوگا، چنانچہ آپ نے کالج کی جانب سے سخت شرائط کے باوجود دو سال کی چھٹی لی اور سفر حج کیلئے روانہ ہو گئے، آپ کا یہ مبارک سفر ۱۲۶۳ھ ماہ شوال وذی قعدہ میں شروع ہوا، مگر باوجود نیت وارادہ کے دو سال میں واپسی نہ ہو سکی، بلکہ موسم کی خرابی اور دیگر وجوہات کی بناء پر تقریباً تین سال لگ گئے، غالباً ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ سے کچھ پہلے آپ دہلی واپس آئے، واپسی میں کافی تاخیر ہو جانے کی وجہ سے آپ نے بنارس کالج رابطہ کرنا اور بحالی ملازمت کی کوشش کرنا مناسب نہیں سمجھا، آپ کے پیچھے آپ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن نانوتوی بطرح نیابت کے فرائض انجام دے رہے تھے، آپ کی واپسی کے بعد بھی وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

(تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی: ص ۱۴)

ملازمتوں کا سلسلہ اور تحریک جہاد میں شرکت:

حج سے واپسی کے بعد اچھی ملازمت کی جستجو اور تگ و دو میں لگے رہے، سب سے پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر امین کے عہدہ پر تقرری اور اس کے بعد دہلی کالج میں مدرسی کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی، بعد ازاں آپ کچھ دن دہلی میں مفتی صدر الدین آزردہ کے دفتر میں اور کچھ دن رڑکی میں ملازم رہے، اسکے بعد آپ کا اجمیر کالج میں شعبۂ عربی کے صدر کے طور پر تقرر ہو گیا، اسی ملازمت

کے دوران غالباً آپ نے موطأ امام مالک کی تصحیح وتحشیہ اور طباعت کا کام انجام دیا، آپ یہاں کب سے کب تک رہے اس بارے میں تاریخی مواد رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں، اجمیر کی ملازمت کے بعد آپ آگرہ کالج میں مدرس اول کی حیثیت سے مقرر ہوئے، یہاں کی ملازمت کا عرصہ چار سال سے زائد ہے، ۱۸۵۷ء کی تحریک تک آپ یہاں ملازم رہے، جب اس تحریک نے شدت اختیار کی تو آپ اس ملازمت کو چھوڑ کر وطن روانہ ہوگئے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں آپ نے بھرپور حصہ لیا، بعض قریبی علماء کے اختلاف رائے کے باوجود آپ کو اس کے شرعی جہاد ہونے پر پورا شرح صدر تھا، آپ کے سوانح نگار محترم مولانا نورالحسن راشد صاحب رقمطراز ہیں۔

اگرچہ تفصیلات مفقود ہیں، لیکن جو مختصر اشارات اور روایات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مظہر صاحب نے اس میں مردانہ وار حصہ لیا، زخمی بھی ہوئے، مولانا کے ٹخنہ میں گولی بھی لگی تھی، جس کی وجہ سے پاؤں میں لنگ ہوگیا تھا''۔ (تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی: ص ۲۱)

میدان جنگ کا ایک واقعہ:

آپ اس جدوجہد میں کتنے مخلص اور اعلاء کلمۃ اللہ کے جذبات سے کس قدر سرشار تھے، اور آپ کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا مقام ومرتبہ تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے آپ عادتاً اپنے اوپری ہونٹ پر زبان پھیرتے رہتے تھے باصرار معلوم کئے جانے پر فرمایا:

> ''جس وقت انگریزوں سے شاملی میں لڑائی ہوئی اور مسلمانوں پر حملہ ہوا، اور میرے ساتھی جاں بلب ہوگئے اور میں نے بھی گھٹنے میں گولی کھائی، میں نے اس حالت میں حوروں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں گلاس ہیں اور مخصوص قسم کا شربت ان میں بھرا ہوا ہے، جس کو وہ میرے ان ساتھیوں کو پلا رہی ہیں جو جاں بلب ہو چکے تھے، اس دوران ایک حور نے میری طرف رخ کیا اور میرے منہ سے گلاس لگایا ہی تھا کہ دوسری حور نے

اسکا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا اور کہا یہ ان میں سے نہیں جن کا انتقال ہوگا، اس وقت کچھ معمولی سا شربت میرے اوپر کے ہونٹ پر لگ گیا تھا، جس کا ذائقہ ابتک موجود ہے اور اسی وجہ سے میری یہ عادت ہے''۔

(ملفوظات فقیہ الامت حصہ اول ص۹۳ مرتبہ مولانا مسعود احمد قاسمی)

چند سرگرمیاں اور مطبع نول کشور لکھنؤ میں ملازمت:

تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جب انگریز مکمل طور پر غالب آگیا، اور منظم پلاننگ کے تحت مسلم علماء، قائدین پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جانے لگے، تو آپ بریلی میں اپنے بھائی مولانا محمد احسن کے مکان میں روپوش ہو گئے، کئی سال کے اس عرصہ میں آپ نے مولانا خرم علی کے ترجمہ در مختار کو مکمل کیا جو غایۃ الاوطار کے نام سے شائع ہوا، اسی دوران آپ نے دوسرا سفر حج کیا، جمادی الاولی ۱۲۷۷ھ میں ایک بڑے قافلہ کی شکل میں خفیہ طور پر روانگی طے ہوئی، پنجاب سے دریا کے راستے سندھ میں داخل ہوئے پھر کراچی سے حجاز مقدس کا سمندری راستہ طے کیا حتی کہ ۲۳ ذیقعدہ کو بعافیت مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ (تذکرہ مولانا مظہر نانوتوی: ص ۵۷) واپسی تک انگریزوں کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہو چکا تھا، مگر حکومتی سطح پر معافی کا عام اعلان ہونے کے باوجود آپ نے سرکاری ملازمت گوارا نہ کی، کیوں کہ انگریزوں سے نفرت آپ کے اور آپ جیسے دیگر علماء کے دل میں جگہ کر چکی تھی، چنانچہ آپ نے مطبع نول کشور لکھنؤ میں تصحیح کتب کی ملازمت اختیار کی، تنخواہ اس دور کے اعتبار سے ایک خطیر رقم یعنی سو روپے ماہانہ منتخب ہوئی، آپ نے اس پلیٹ فارم سے علوم دینیہ کی ایک عظیم خدمت انجام دی جس سے امت تا قیامت مستفید ہوتی رہے گی۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں آمد:

آپ مشرقی یوپی کے شہر لکھنؤ میں منشی نول کشور کے یہاں ملازمت کر رہے تھے، ادھر مغربی یوپی کے شہر سہارنپور میں علاقہ کی ایک ذی علم اور برگزیدہ شخصیت حضرت مولانا سعادت علی فقیہ دینی وعلمی پھول کا ایک پودا لگا رہے تھے جو بعد میں ''مدرسہ مظاہر العلوم'' کی شکل میں نمودار ہوا اور خوب پھلا

پھولا، حضرت مولانا سعادت علی صاحب نے مدرسہ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے آپ کو طلب فرمایا، اور آپ بلا جھجک ایک موٹی تنخواہ چھوڑ کر یہاں تشریف لے آئے، آپ شوال ۱۲۸۳ھ (فروری ۱۸۶۷ء) میں مظاہر علوم تشریف لائے۔ (علماء مظاہر علوم اور ان کی علمی وتصنیفی خدمات: ص ۲۰۲ مرتبہ مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری طبع ثانی) اور تیس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی، یہاں آنے کے بعد آپ نے جو اپنی صلاحیتوں کے جلوے بکھیرے تو دنیا بانی مدرسہ کو اس حسن انتخاب پر داد و تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گئی، مدرسہ کو آپ کی ذات سے انواع واقسام کے فوائد حاصل ہوئے اور چار چاند لگ گئے، آپ نے مدرسے کی دامے درمے قدمے سخنے ہر لائن سے خدمت کی اور اسکی ترقی وعروج کیلئے بے دریغ خون جگر کا نذرانہ پیش کیا، آپ کی بے لوث خدمات کے اثرات سے مدرسہ اور ارباب مدرسہ متمتع اور مستفید ہوتے رہیں گے۔

نکاح اور سفر حج:

آپ نے اپنی حیات میں تین سفر حج کئے جن میں سے دو کا ذکر پچھلی سطور میں آچکا ہے، تیسرا اور آخری حج ۱۲۹۴ھ میں ہوا جب ترکی اور روس کے درمیان جنگ جاری تھی، اس مرتبہ قافلہ میں سو سے زائد افراد شامل تھے جن میں سے حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتوی، مولانا رفیع الدین، مولانا یعقوب نانوتوی، اور شیخ الہند مولانا محمود حسن قابل ذکر ہیں ۷ شوال ۱۲۹۴ھ کو یہ قافلہ روانہ ہوا، یکم ذیقعدہ کو بمبئی سے روانہ ہوکر ۱۳ دن بعد جدہ پہونچا، یہاں حاجی امداداللہ صاحب نے پرتپاک استقبال کیا اور ہر ایک کو اپنے مکان پر ایک وقت کے کھانے پر مدعو کیا، یہ سفر بے شمار انوار و برکات کے ساتھ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں وطن پہونچنے پر مکمل ہوا، آپ نے دو نکاح کیے، ایک لکھنوئی میں جہاں آپکا سمبا‌ل تھا قاضی محمد سید صاحب کی بھتیجی سے، دوسرا حضرت گنگوہی کے خاندان میں اشرف علی نانوتوی کی برادر زادی سے جو کہ بیوہ تھیں، دونوں بیویوں سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ (تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی: ص ۶۲)

سانحہ وفات:

آپ ایک لمبے عرصے سے درد گردہ کے مرض میں مبتلا تھے، اسمیں شدت پیدا ہوجاتی اور کبھی

تخفیف ہو جاتی، مرض الوفات کی حیثیت سے جب اسکا شدید حملہ ہوا، تو آپ نے علاج ومعالجے کی طرف توجہ نہیں فرمائی اگر کوئی اصرار کرتا تو فرماتے: ''جو دم باقی ہے آرام سے رہنے دو، کیوں تکلیف دیتے ہو، اب رہتا ہو چکا افاقہ نہ ہوگا''۔

مرض شدت اختیار کرتا گیا، اور مایوسی کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی حتی کہ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ (۱۳ اکتوبر ۱۸۸۵ء) ہفتہ کا دن گزار کر شنبہ کی رات میں آٹھ بجے آپ کا وقت موعود آگیا (علماء مظاہر علوم اور ان کی علمی تصنیفی خدمات: ص ۸۱ جلد اول) اور آپ نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور ہمیشہ کیلئے آغوش رحمت میں سو گئے۔

اب ہمارے بعد اک دنیا اسے دھرائے گی
کہتے کہتے اپنا افسانہ ہمیں نیند آگئی

دو قلمی خدمات، تعارف اور تحقیق انتساب:

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کے مختصر حالات زندگی کے بعد ہم مقالہ کا رخ انکی دو قلمی خدمات کی طرف موڑتے ہیں جو کہ اس طرح ہے۔

(۱) تصحیح وتحشیہ موطأ امام مالک (۲) تحقیق تصحیح وتحشیہ مجمع بحار الانوار

امام دار الہجرہ سیدنا امام مالک کی شہرۂ آفاق تصنیف ''موطأ امام مالک'' کا وہ نسخہ جو برصغیر ہند میں معروف ومشہور اور متداول ہے اور نہایت زریں اور قیمتی حاشیہ کے ساتھ مزین ہے اور ۱۲۶۶ھ سے مسلسل طبع ہوتا چلا آرہا ہے مگر یہ تحقیق اور تحشیہ کس کا ہے؟ اس پر وقت کی دبیز چادر نے ایسا پردہ ڈالا کہ بعد میں آنے والے اہل علم اس شخصیت پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہو گئے، اسی طرح علامہ محمد بن طاہر پٹنی کی غریب الحدیث کے موضوع پر نہایت اہم کتاب ''مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار'' کو قلمی نسخوں سے متن کی تصحیح کر کے اور نہایت قیمتی حاشیہ کے ساتھ مزین کر کے پہلی مرتبہ شائع کرانے والی ''محمد مظہر'' نامی شخصیت کون ہے، اس کی تعیین وتوضیح سے بھی تاریخ نگار وابل قلم حضرات خاموش نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں از روئے تحقیق عم محترم حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی مدظلہ کی یہ بات عرض کی جاتی ہے کہ ان دونوں علمی کاوشوں کے مرتب و مولف حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی کی ہی ذات گرامی ہے، ہماری اس خامہ فرسائی کا مقصد قدرے اختصار کے ساتھ اسی انکشاف پر روشنی ڈالنا ہے۔

یہاں یہ بات افادے سے خالی نہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں نہ تو طباعت کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور نہ ہی ہندوستان میں کوئی پریس تھا، شاہ عبدالعزیز کے آخری دور میں کلکتہ کے پریس قائم ہوئے، تو متعدد اکابر نے اس نئی ایجاد میں دلچسپی لی، اس کی اہمیت و افادیت کو بھانپ لیا، انہوں نے ماخذ تشریع بالخصوص کتب حدیث کو کسی بھی ممکنہ سازش سے محفوظ رکھنے کیلئے انکی طباعت اور اشاعت کا پلان تیار کیا، حضرت شاہ اسحاق کا اپنے بعض تلامذہ کو اس کام کی وصیت کرنا اسی پلان اور منصوبے کی ایک کڑی ہے، حضرت مولانا مظہر نانوتوی بھی چونکہ حضرت شاہ اسحاقؒ کے شاگرد بلکہ اجل ترین شاگرد تھے، لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ انہوں نے اس فکر سے حصہ نہ پایا ہو۔

مولانا کی تصحیح وتحشیہ شدہ نسخۂ موطأ مالک:

یہ نسخہ پہلی مرتبہ جناب ظفر علی صاحب (برادر زادہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری) کے زیر اہتمام مطبع احمدی دہلی سے ۱۲۶۹ھ میں شائع ہوا، اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے: ''قد طبع باهتمام احقر الانام ظفر علی فی المطبع الاحمدی الواقع فی الدہلی سنہ ۱۲۶۶ھ''۔

یہ نسخہ متوسط سائز کے ۳۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، سب سے پہلا حاشیہ پہلی حدیث کے لفظ ''أخر الصلاۃ'' پر اس طرح ہے۔

"قوله "أخر الصلاة " روى من طريق أبي داؤد عن الزهري ان عمر بن عبد العزيز كان قاعدا على المنبر فاخر العصر شيئا فعرف بذلک سبب تاخيره كانه كان مشغولا بمصالح المسلمين ۱۲".

اور سب سے آخری حاشیہ آخری حدیث کے لفظ ''وأنا الحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی'' پر ہے اور اس کے الفاظ اس طرح ہیں۔

"قوله علی قدمی" بلفظ الافراد و التثنیة ای علی اثر ی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم"۔

پوری کتاب میں از اول تا آخر کہیں بھی حاشیہ نگار کے نام کی صراحت نہیں، حاشیہ میں بہت کثرت کے ساتھ شیخ سلام اللہ دہلوی (م ۱۲۲۹ھ جو کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے پڑپوتے ہیں) کی تالیف "المحلی باسرار الموطأ" کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، اس کے علاوہ جن کتابوں سے حاشیہ سازی میں مدد لی گئی ہے ان میں مشارق الانوار، عینی، درمختار، شرح وقایہ، ہدایہ، مسوی، مصفی، کشاف، مرقاۃ، المغنی، النہایہ، موطأ محمد، القاموس، لمعات، تقریب التہذیب، طبرانی اور الصراح قابل ذکر ہیں۔

یہ تحقیق وتحشیہ مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کا ہے، اس پر ایسی دو تاریخی دستاویزات سے روشنی پڑتی ہے جو آپ کے معتبر ترین ہمعصر ذرائع ہیں۔

ایک تحریر آپ کے استاذ گرامی حضرت مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی ہے جو اس وقت دہلی کالج میں درجہ علیا کے استاذ تھے۔

دوسری تحریر جرمن نژاد مشہور مستشرق اسپرنگر (ALOIS SPRGER) کی ہے جو آپ کی بنارس کالج میں ملازمت کے وقت دہلی کالج کا پرنسپل تھا۔

مولانا مملوک العلی صاحب نے اسپرنگر کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے۔

> "بموجب حکم کے تین نسخے موطأ شریف کے بنام قائم مقام ڈاکٹر موات صاحب کے بدستخط پرنسپل بہادر کے جو لفافہ تحریر حضور کے انہوں نے کر دیئے کل کی تاریخ میں روانہ کئے، یہ عرضی اس نظر سے کہ حضور ان سے ارشاد کر کے دو نسخے واسطے مدرسہ کے خرید کریں اور ایک نسخہ بطور صدیہ کے اپنی خدمت میں رکھیں، پہلے سے لکھ بھیجی"

(مکتوبات مولانا مملوک العلی نانوتوی بنام اسپرنگر، بحوالہ تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی صفحہ ۹۷)

اس خط کے پس منظر اور پیش منظر کے بارے میں محقق مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی رقمطراز ہیں "یہ اقتباس حضرت مولانا کے جس گرامی نامہ سے لیا گیا ہے وہ گیارہ جمادی الاول

۱۲۶۷ھ (۱۵ مارچ ۱۸۵۱ء) کا لکھا ہوا ہے، یعنی یہ نسخہ اس سے پہلے شائع ہو چکا تھا، مولانا مملوک العلی صاحب نے موطأ کا یہ نسخہ اس خط کی تحریر سے کئی مہینہ پہلے اسپر گر کیلئے مختص کر کے رکھا تھا، یہ نسخہ مولانا مملوک العلی سے دہلی کالج میں فیضیافتہ ایک طالب علم اکبر سونی پتی کے پاس بھی رکھا رہا، غالباً اس کو کتاب پہو نچانے کا کوئی ذریعہ اور لیجانے والا نہیں ملتا تھا، اس لئے اس کے ارسال کرنے میں دیر ہوئی، علی اکبر نے بھی اپنے ایک خط مکتوبہ ۳ فروری ۱۸۵۱ء (یکم ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ) میں مولانا کے عنایت کئے ہوئے نسخہ موطأ کا تذکرہ کرتے ہوئے اسپر گر کے نام لکھا تھا کہ "مملوک العلی صاحب نے ایک نسخہ موطأ کا عدہ یہ تحفۂ حضور کے واسطے رکھا ہے جس طرح حکم ہو بھیجا جاوے"

(تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، ص ۸۰)

حضرت مولانا مملوک العلی اور ان کے شاگرد اکبر علی سونی پتی کی تحریرات اور ان کے پس منظر سے یقینی طور پر اتنی بات معلوم ہوئی کہ اس وقت موطأ مالک شائع ہوئی اور اس کا نسخہ اسپر گر کو پہو نچانے کی کوشش کی گئی، ان تحریرات میں شائع کرنے والے کی کوئی صراحت نہیں ہے، البتہ عقلاً اتنا طے ہے کہ شائع کرانے والا ان کا کوئی قریبی ہے، جب ہی آپ اسکی اس کاوش کو اسپر گر تک پہو نچانے کیلئے فکر مند اور کوشاں ہیں، اگر یہ کام کسی غیر متعلق کا ہوتا تو بظاہر آپ کو یہ زحمت گوارا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، رہی یہ بات کہ وہ قریبی شخص آپ کے خاندانی عزیز اور شاگرد رشید مولانا محمد مظہر نانوتوی ہیں، اسکی صراحت اسپر گر کی ایک تحریر میں موجود ہے، موصوف لکھتے ہیں "موطأ کو مولوی مظہر نے شائع کرایا، مولوی صاحب ان دنوں اجمیر میں تھے"۔

(مضمون لٹریری آف انٹیلی جنس، بحوالہ تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتویؒ صفحہ ۸۰)

اب تک کی تحریرات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ موطأ مالک کو مولانا محمد مظہر نانوتویؒ نے شائع کرایا، اسپر گر کی تحریر میں صراحت ہے اور مولانا مملوک العلی صاحب اور علی اکبر کی تحریر سے اسکی تائید ہوتی ہے، لیکن محشی اسکا کون ہے اس سلسلہ میں ان تحریرات سے صراحتاً کوئی رہنمائی نہیں ملتی، لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ اس کے محشی مولانا مظہر نانوتوی ہی ہیں اور آپ نے تواضعاً اپنے نام کی

صراحت نہیں کی، اگر اس کتاب کا محشی کوئی اور ہوتا تو یقیناً اور دیانۃ آپ اس کا نام ضرور تحریر فرماتے۔ یہ احتمال کہ شاید مولانا مظہر صاحب کا شائع کرایا، ہوا یہ نسخہ معروف اور متداول نسخے کے علاوہ ہو، قطعاً نا قابل اعتناء ہے، کیوں کہ تاریخی شواہد کی بنا پر اس دور میں کسی اور نسخہ کا سراغ نہیں ملتا، اور یہ بات تقریباً ناممکن ہے۔

بہر حال یہ کوئی یقینی اور قطعی دعویٰ نہیں، بلکہ محض ایک رائے اور اشارہ ہے جسکو بنیاد بنا کر مزید تحقیق کے لیے دلائل وقرائن فراہم کئے جاسکتے ہیں۔

تصحیح وتحشیہ مجمع بحار الانوار:

فن حدیث کی ایک اہم ترین کتاب مجمع بحار الانوار ہے، اسکی سب سے پہلی طباعت ۱۲۸۳ھ میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں ہوئی، یہ آپ کا اس مطبع میں ملازمت کا زمانہ ہے، آپ اس کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"أما بعد فيقول العبد الضعيف محمد مظهر غفر الله له ولوالديه، منذ ساقني المقدور إلى بلدة لكهنو وبوأني الدهر بهذا المطبع، كان يخطر ببالي طبع كتاب في علم لغة الحديث، فان السابقين الأولين من أرباب المطابع قد بذلوا جهد هم في طبع متون الصحاح الستة فرادى، وشروح المشكاة ونشروا العلم شكر الله سعيهم و نفع بها ولكن لم يتوجهوا إلى كتاب يجمع الجميع و يتكفل الشرح الكل. فعن لخاطري طبع الكتاب المبسوط البحر الذخار المسمى بمجمع بحار الأنوار في غرائب التنزيل و لطائف الأخبار".

یہ اشاعت چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے چوتھی جلد کے آخر میں آپ کے قلم سے خاتمۃ الطبع اور ۱۸۶ صفحات پر مشتمل تکملہ ہے، کتاب کے مجموعی صفحات مع خاتمہ وتکملہ کے ۱۲۶۶ ہیں، کتاب پر جگہ جگہ مختصر حواشی ہیں، اس کتاب کی تصحیح کیلئے آپ نے اس کے بدقت تمام چھ قلمی نسخے حاصل کئے جن میں وہ نسخہ بھی شامل ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سامنے ان کے مدرسہ میں تیار کیا گیا تھا، جو اغلاط ومشکلات ان نسخوں کی مراجعت سے حل نہ ہوئیں ان کے حل کیلئے آپ نے متعدد کتابوں سے مراجعت

کی اور جو اضافہ ملا اسکو اپنے مرتبہ نسخہ میں شامل کر دیا، ان کتابوں میں نہایۃ ابن الاثیر، قاموس فیروز آبادی، صراح، تفسیر بیضاوی اور شرح مسلم شامل ہیں، جن محتمل اغلاط کے سلسلہ میں آپ کو موجودہ کتابوں میں رہنمائی نہیں ملی، وہاں اکثر نسخوں میں مذکور عبارت بالفظہٖ کونقل کر کے ''کذا فی النسخ'' لکھ دیا تاکہ قاری کو خیال رہے کہ یہاں غلطی کا امکان ہے، نیز مرتب نے اسکی تلاش وجستجو میں بے توجہی نہیں برتی۔

جیسا کہ مقدمہ کی عبارت سے معلوم ہو گیا کہ یہ کام مولانا محمد مظہر صاحب کا ہے''نانوتوی'' کی اسمیں صراحت نہیں ہے، لیکن چونکہ اس وقت مطبع نول کشور میں آپ ملازم تھے اسلئے یقیناً یہ محمد مظہر نامی شخص آپ ہی ہیں،احیاء العلوم کے مقدمہ میں آپ کی ایک عبارت سے اسکی تائید ہوتی ہے عبارت اس طرح ہے۔

''وقد اعانني في ذلك اخي وحبيبي الشاب الصالح ووزيري في المصالح البارع في العلوم المولوي محمد يعقوب بن مولى الاعظم فخر علماء العجم استاذنا واستاذ العالم ذي الوجه البهي والفر السمي ،المولوي مملوك العلي تغمده الله برحمته وافاض على العالمين من بركاته ببقاء ولده''۔

مذکورہ بالا ان حقائق کے بعد یہ بات طے ہو چکی ہے کہ مجمع البحار کے اصل مصحح اور اولین طباعت کے محشی حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی ہیں،اور آپ کے ایک شاگرد مولانا حشمت علی بنارسی کی صراحت کے بعد تو شبہ کی کوئی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی،موصوف فرماتے ہیں:

''آپ کی تصحیح سے کتابیں مثل مجمع البحار،احیاء العلوم وغیرہ طبع ہو چکی ہیں''۔

(طریقۂ شریعت ،مؤلفہ مولانا حشمت علی بنارسی،بحوالہ تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی صفحہ ۱۶۱)

بلا شبہ میدان حدیث میں یہ آپ کا ایک بڑا کام بلکہ کارنامہ ہے،آپ کے حواشی تو مجمع البحار کی دیگر طباعتوں میں شامل نہیں کئے گئے،مگر اس کتاب کی اب تک کی بلا استثنا، تمام طباعتوں کا متن آپ ہی کا تصحیح شدہ ہے۔



علامہ محمد عبدالحی لکھنویؒ

خدمات حدیث کے آئینہ میں

از: مولانا رحمت اللہ نیپالی ندوی

مؤرخ اسلام اور مفسر قرآن علامہ سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:

''اہل تاریخ پر روشن ہے کہ ہندوستان میں اسلام دو راستوں سے داخل ہوا' خشکی سے اور تری سے' خشکی کا راستہ درۂ خیبر کا تھا' جہاں سے ترکوں' پٹھانوں اور مغلوں نے چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز سے داخل ہونا شروع کیا' لیکن ان سے صدیوں پہلے اہل عرب' تاجر اور سوداگر کی حیثیت میں سندھ اور ملیبار سے لیکر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے.......حضرت عمرؓ کے عہد سے سواحل ہند پر عربوں کی تاخت شروع ہوتی ہے' اور یہ وہ زمانہ تھا' جب ہر کلمہ گو کے لب و دہن ''اخبرنا'' اور ''حدثنا'' کی خوشبو سے معطر تھے' یعنی صحابہ کرام کا عہد تھا''۔

(مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲)

اس لحاظ سے ہندوستان بھی ان خوش قسمت ملکوں میں سے ہے' جن کی خاک صحبت یافتگان نبوی کے پاؤں سے لگ کر ہماری آنکھوں کا کحل الجواہر بن چکی ہے:

(ایضاً ص: ۳' مزید تفصیل کے لیے دیکھئے ''اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں'' چوتھی فصل ص ۱۹۴)

فرنگی محل اور علم حدیث:

فرنگی محل لکھنؤ میں علم حدیث کا کیا حال تھا؟ اور کب اور کس طرح سے اسکا کمال ہوا؟ علامہ موصوف کے الفاظ میں جواب ملاحظہ ہو:

''لکھنؤ میں فرنگی محل کا علمی مرکز عالمگیرؒ کے عہد میں قائم ہوا، ملا نظام الدین اور ملا قطب الدین رحمہما اللہ کے عہد سے لیکر مولانا عبدالحلیم تک اس خانوادۂ علم وفضل وکمال کی علمی کوششوں کی جولانگاہ، منطق اور اصول کی کتابیں رہیں، اور تعجب ہے کہ اسقدر طویل زمانے تک ہندوستان کی یہ مشرقی درسگاہ حدیث کے ترانۂ قدسی سے نا آشنا رہی، بزرگوں سے جو کچھ سنا ہے وہ یہ ہے کہ درس نظامی میں صرف مشکوٰۃ داخل تھی اور وہی پڑھائی جاتی تھی، یہ بھی سنا ہے کہ فرنگی محل میں صحیح بخاری کے پندرہ پارے موجود تھے، مگر وہ صرف تبرکاً رکھے رہتے تھے''۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۵۵)

''فرنگی محل میں علم حدیث کی معراج کمال مولانا عبدالحی صاحبؒ کے عہد کمال میں ہوئی''۔ (ایضاً ص ۶۱)

اس وقت میرے مقالے کا موضوع یہی نابغہ روزگار، یکتائے زمانہ، علامہ دفہامہ، محدث وفقیہ، فاضل دیگانہ، امام ومجدد اور عبقری شخصیت ہے، جو جامع الکمالات وکامل الحسنات ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی کنیت بھی ابوالحسنات ہی رکھتی تھی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلیؒ نے انہیں ان بلند کلمات سے خراج عقیدت پیش کیا ہے:

'' آیۃ اللہ فی العالمین، وارث علوم سید المرسلین، فخر خلف، یادگار سلف، مجدد المأۃ الرابع عشرۃ، مولانا واُستاذ اُستاذ نا مولوی حافظ ابوالحسنات محمد عبدالحیؒ، حق یہ ہے کہ ہمارے محلہ میں اس ذات گرامی کا کوئی نظیر سابق میں سوائے بحرالعلوم [۱] کے دوسری کوئی نہیں ہوئی، اور اگر مولانا کو وہی عمر اور سن خوش قسمتی سے مل جاتا جو بحرالعلوم کو مل گیا، تو یقیناً یہ شہسوار میدان علم وعمل، یہ جامع علوم معقول ومنقول، یہ فقیہ ومنطقی، محدث وواعظ اپنے اکابر تو کیا سچ یہ ہے کہ ابن ہمام اور عینی ایک طرف،

[۱] مولانا عبدالعلی محمد انصاری فرنگی محلی مراد ہیں (رحمت)

صدر الشریعہ اور تاج الشریعہ سے بازی لے جاتا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا"۔

(تذکرہ علمائے فرنگی محل ص:۱۳۵)

جبکہ ابن خلکان ہند علامہ سید عبدالحی حسنیؒ نے امام لکھنوی کے تذکرہ کا آغاز یوں کیا ہے "الشیخ العالم الکبیر العلامہ عبدالحی بن عبدالحلیم

العالم الفاضل النحریر الفضل من

بث العلوم فاروی کلّ ظمآن.

(الاعلام ج۸ص۲۵۱)

علامہ لکھنوی کے بھتیجے مولانا محمد یوسف لکھنوی اپنے عم معظم ومحترم کو ان القاب سے ملقب کرتے ہیں: " عمّی و مولاتی برئیس المحققین، افضل المدققین، خاتمة الفقهاء والمحدثین نور حلقة الطالبین والمسترشدین، خیر الفائزین بدار العلوم مو الفضل الکاملین بالمنطوق والمفهوم مولانا ابی الحسنات محمد عبدالحی"۔ (کنز البرکات خاتمہ الطبع:ص۳۷)

حافظ مولانا عبدالباقی لکھنوی اپنے برادر معظم کو ان القاب سے یاد کرتے ہیں:

"ذوالفضل والکمال مهبط رحمة الله المتعال مرجع الکرامات والبرکات، المکنّی بابی الحسنات المدعو بعبد الحی" (حسرۃ الفحول بوفاۃ نائب الرسول:ص۳)

اس کے بعد راقم سطور کے لئے الفاظ وکلمات ہی کہاں رہ جاتے ہیں جن سے انہیں یاد کیا جائے۔

مختصر حالاتِ زندگی:

ولادت باسعادت سہ شنبہ ۲۶ رذی قعدہ ۱۲۶۴ھ کو باندہ شہر میں ہوئی، جہاں ان کے والد محترم مولانا عبدالحلیم صاحب لکھنوی بحیثیت مدرس مقیم تھے۔ پیدائش کے ساتویں روز والد صاحب نے عبدالحی نام رکھا، اور بعد بلوغ آپ کی کنیت ابوالحسنات تجویز کی۔

(ملاحظہ ہو مقدمہ فتاویٰ عبدالحی ص:۳، الاعلام ج۸ص۲۵۱، حسرۃ الفحول، کنز البرکات، مقدمہ التعلیق الممجد ص:۱۱۰ بحوالہ سہ ماہی فکر اسلامی خصوصی شمارہ ص:۱۰۔)

پانچ سال کی عمر میں حفظِ قرآن شروع کیا، اور دسویں سال حفظِ قرآن کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی علوم سے فراغت ہوگئی، علومِ عربیہ مثلاً علم حدیث وتفسیر، فقہ واصول کی تعلیم اور دیگر علوم کی تکمیل والد بزرگوار سے کی، البتہ علوم ریاضی وہیئت کی تکمیل کے لئے ماہر ریاضیات حضرت مولانا مفتی محمد نعمت اللہ صاحب کی طرف رجوع کیا، اور مولانا موصوف بقول خود مفتی صاحب کے آخری شاگرد بھی ہیں۔

سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم حدیث وتفسیر، فقہ واصول، ریاضی وفلسفہ وغیرہ سے فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد شہر حیدرآباد میں ایک زمانہ تک درس وتدریس اور افادہ کا سلسلہ جاری رکھا، پھر اپنے شہر لکھنؤ آگئے، اور اپنی عمر کا ایک حصہ یہاں درس وتدریس اور افادہ وتصنیف اور دعوت وتذکیر میں گزارا، اور یہ سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا۔

علامہ لکھنویؒ کے درس کی مقبولیت اور شہرت کا کیا عالم تھا؟ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں: ''کل عمر چالیس برس کی ملی مگر اسی مختصر زمانہ میں مرحوم کے درس وتدریس، تالیف وتصنیف اور تحقیق وتدقیق کے آوازہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام گونج اٹھی، اطراف واکناف سے علم کے طالب آپ کے آستانہ پر جمع ہوئے، معقول ومنقول کا یہ مجمع البحرین زندگی کے آخری لمحوں تک موجیں مارتا رہا، دوسرے علوم وفنون کے ساتھ تمام کتب حدیث کا درس بکمال تحقیق آپ کی درسگاہ میں ہوتا تھا، پورب اور بہار کے طلبہ زیادہ تر اس فیض سے سیراب ہوئے''۔

(مقالات سلیمانی: ج ۲ص ۶۱)

علوم وفنون میں مہارت:

آپ کو مذکورہ بالا علوم وفنون میں مہارت کے ساتھ ساتھ علم الانساب، تاریخ اور فن حکمت پر بھی درک تھا اور خاصی معلومات تھیں، اچھے مناظر بھی تھے، علامہ عبدالحق بن فضل حق خیرآبادی، نواب صدیق حسن حسینی قنوجی اور علامہ محمد بشیر سہسوانی کے ساتھ آپ کے مناظرے مشہور ہیں، نواب صاحب کے ساتھ تو سخت اور ناخوشگوار مناظرہ بھی ہوا، لیکن اسکے باوجود دونوں کے صفاء قلب اور آپسی محبت وتعلق کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مولانا عبدالحی صاحب کی وفات کی خبر نواب صاحب کو

ہوئی تو مارے افسوس کے رات کا کھانا نہیں کھایا، اور علامہ لکھنویؒ کے وسعتِ علم اور جلالتِ شان کی رعایت ولحاظ میں غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھی، اور یہ بھی فرمایا کہ ہمارا ایک بازو کٹ گیا، ہمارا مناظرہ تو مسئلہ کی تحقیق اور درست رائے تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تھا۔

آپ کی مہارت، علمی مقام وانفرادیت کا انداز مختلف فنون میں آپ کی تالیفات سے بخوبی ہوتا ہے۔ فقہ مولانا کا خصوصی فن تھا، جس سے آپ کو ذوق وشوق کے ساتھ خصوصی تعلق اور مناسبت تھی، اسکی کچھ جھلکیاں فتاویٰ عبدالحی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ فتاوی عبدالحی)

اس انفرادیت اور خصوصیت اور اصول وفروع، اور احکام ومسائل میں قدرت وشہرت کا ذکر جمیل علامہ سید عبدالحی حسنیؒ نے یوں کیا ہے: " انفرد فی الهند بعلم الفتوی، فسارت بذكره الركبان، بحيث إن علماء كل إقليم يشيرون إلى جلالته، وله في الأصول والفروع قوة كاملة، وقدرة شاملة، وفضيلة تامة، وإحاطة عامة ". (الإعلام بمن ۲۵۲/۸)

مسلک:

علامہ لکھنویؒ میں بھرپور علم ہونے کی وجہ سے فروعات اور جزئیات میں توسع تھی، آپ مسلکاً حنفی تھے، لیکن متعصب نہ تھے، بلکہ دلیل کے متبع تھے، جب کسی مسئلہ میں مذہب کے خلاف نص صریح پاتے تو تقلید ترک کردیتے، اس سلسلہ میں علامہ لکھنوی اپنی کتاب " النافع الكبير " میں خود تحریر فرماتے ہیں:

ومن منحه سبحانه وتعالى أني رزقت التوجه إلى فن الحديث، وفقه الحديث، ولا أعتمد على مسألة مالم يوجد أصلها من حديث أو آية، وماكان خلاف الحديث الصحيح الصريح أتركه وأظن المجتهد فيه معذورًا بل مأجورًا ".

(الإعلام ۲۵۲/۸ – حسرة الفحول ۲۵۲/۸)

(اللہ کے فضل وتوفیق کی بات یہ بھی ہے کہ مجھے فن حدیث اور فقہ حدیث کی طرف توجہ کی دولت نصیب ہوئی، میں کسی ایسے مسئلہ پر اعتماد نہیں کرتا، جسکی اصل کسی حدیث یا آیت سے ثابت نہ ہو،

لہٰذا جو مسئلہ صحیح وصریح حدیث کے خلاف ہوتا ہے، میں اسے ترک کر دیتا ہوں اور مجتہد کو معذور بلکہ ماجور سمجھتا ہوں)۔

قدرت کے دستِ فیاض نے آپ کے اندر ذہن لطافۃ، فکرِ دور رس، اور دماغ نکتہ رس ودیعت فرمایا تھا اور قسامِ ازل کی طرف سے علم کے حظِ وافر سے انکا دامن مراد بھر دیا گیا تھا۔

مؤرخ ہند علامہ سید عبدالحی حسنیؒ نے علامہ لکھنوی کی مجلسِ علم میں اپنی بار بار حاضری، انکی ژرف نگاہی، دوراندیشی، ذکاوت وفطانت، مہارت وبراعت، خطابت اور سرعتِ فہم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

" إني حضرت بمجلسه غير مرة ، فألفيته ....ذكيا فطنا، حاد الذهن، عفيف النفس، رقيق الجانب، خطيبا مصقعا، متبحرا في العلوم، معقولا ومنقولا، مطلعا على دقائق الشرع وغوامضه ". (ايضاً ۲۵۱/۸)

دو امتیازی خصوصیت واولیت:

مولانا کی دو امتیازی خصوصیت ہے، جن میں انہیں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

(۱) کتابوں کے تحشیہ اور اشاعت کے وقت مختلف نسخوں کی فراہمی، مقابلہ اور تصحیح اور ساتھ ہی ساتھ مصنف اور تصنیف کے متعلق ہر قسم کے معلومات مقدمہ میں فراہم کر دینا، مقدمہ نگاری مولانا کی ایجاد ہے، اس سے قبل اسکا دستور نہ تھا۔

(۲) : دوسری قابلِ ذکر بات کتابوں کی صحت ہے، حیرت ہے کہ عربی کی ضخیم کتابوں پر باریک حاشیہ کی تصحیح اس طرح کی جاتی کہ بلا مبالغہ ایک نقطہ کی بھی غلطی نہیں رہ جاتی، جبکہ آجکل مطابع اور چھپائی کی کثرت کے باوجود اردو کتابوں میں بھی صحت کا اتنا اہتمام اور اسقدر التزام نہیں ہے۔

(ملاحظہ ہو مقالات سلیمان ۶۲/۲، ۶۳ - حسرۃ الفحول ص: ۵)

تعریفی وتوصیفی کلمات کے چند نمونے:

شیخ عبدالحی کتانی نے فرمایا ہے:

" خاتمة علماء الهند ، وأكثرهم تأليفا ، وأتمهم تحريرا واطلاعا وإنصافا، كان صاحب همة لاتعرف الملل ، و اعتناء بالتفيد والجمع والمطالعة ، لم يمسه الكلل ، مع النباهة وسلامة الإدراک". (الشیخ النعمی ص:۴۰)

شیخ عبدالأ ول کے الفاظ ہیں: " البحر الخضم ، البحر المتلاطم ، القدوة الفهامة، العمدة العلامة ، فريد عصره ، وحيد دهره، الجامع لأشتات الفضائل ، والبارع في الأقران والأماثل ، الذي هو شارق لسماء التحقيق والفائق الحامل للواء التدقيق ....الخ

اس طرح مکمل دس سطروں میں مدح وتوصیف اور ثنا وتعریف فرمائی ہے۔

مؤرخ ہند علامہ عبدالحی حسنیؒ نے انکے علوم وفنون میں مہارت، وسعتِ علم، اصول وفروع میں قدرت، فضیلت وفوقیت اور جلالتِ شان وغیرہ کاذکرکرنے کے بعد یہاں تک لکھدیا ہے: "الحاصل انه كان من عجائب الزمن ومن محاسن الهند ، وكان الثناء عليه كلمة إجماع والاعتراف بفضله ليس فيه نزاع". (الإعلام ص:۲۵۲/۸ الشیخ النعمی للإمام اللکھنوی ص:۴۱)

محقق ومحدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ جو علامہ لکھنوی کے دلدادہ اور انکی تحریروں کے عاشق تھے، اوران کی بہت سی کتابوں پر تعلیق وتحقیق کا کام کیا ہے، وہ کس نگاہ سے دیکھتے تھے؟ ملاحظہ ہوں انکے کلمات: "فخر المتأخرين ، ونادرة المحققين المنصفين ، المحدث ، الفقيه ، الأصولي ، المنطقي ، المتكلم ، المؤرخ النظار ، النقادة ، الإمام الشيخ أبو الحسنات محمد عبدالحي الأنصاري اللكهنوي الهندي.........الخ .

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الشیخ النعمی ص:۴۱)

بلاشبہ انہیں اس صدی کا مجدد اور خاتم المحدثین کہنا بجا ہے، اوراس پر بہت سی شہادتیں قائم کی جاسکتی ہیں، آپ کی شہرت حدِ کمال کو پہنچ چکی تھی، اور قیل وقال سے خالی تھی، آپ کے فضل وکمال کا اقرار واعتراف ہر خاص وعام نے یکساں طور پر کیا ہے۔

محدث دہلوی مولانا نذیر حسین صاحب نے جو بقول مؤرخ ہند علامہ سید عبدالحی حسنیؒ

''ہندوستان میں فن حدیث کی ریاست ان پر ختم ہے''۔[1] ایک جم غفیر میں برسر انجمن یہ اعتراف فرمایا:

"انت فريد دهرک ، وحيد عصرک ، ماجاء احد بما جئت في هذه الماة ، فبارک الله في حياتک و بر کاتک".

ان تعریفی وتوصیفی کلمات سے بڑھکر اور کیا شہادت ہوسکتی ہے۔

کثرت مطالعہ:

آپ بڑے کثیر المطالعہ وسیع العلم، محقق ومدقق تھے، مطالعہ سے خاص دلچسپی تھی، اور اس میں بڑا انہماک تھا، مطالعہ کے وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر وقت کی پوری قدر کرتے ہوئے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے، اور گھنٹوں مسلسل مطالعہ کے بعد بھی تازہ دم نظر آتے، اسی کثرت مطالعہ نے آپ کو چلتا پھرتا کتب خانہ بنا دیا تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سہ ماہی فکر اسلامی (معاصر فقہ اسلامی نمبر) ص:۱۴)

دکتور صلاح محمد سالم ابوالحاج ''المنیح العلمی للإمام اللکنوی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

"الإمام اللكهنوي في مطالعاته لا يألو جهدا في تبيين جيد الكتب من رديئها ، وبيان الغث من السمين فيها مع حكمه على المعتبر منها". (المنیح العلمی ص:۵۱)

اجازت حدیث:

علامہ لکھنوی کی سند بڑی عالی تھی، ایک اجازت تو انہیں اپنے والد سے خود حاصل ہوئی تھی، اور انہوں نے بدست خود اپنی جملہ مرویات کی تحریری اجازت مرحمت فرمائی تھی، اور یہ اجازت نامہ (سند) ۳ شعبان ۱۲۸۵ھ بروز بدھ دی تھی۔ (کنز البرکات ص:۲۰۶)

اس کے ساتھ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حج و زیارت کی دو مرتبہ سعادت بخشی۔

پہلی مرتبہ اپنے والد ماجد کے ساتھ ۱۲۷۹ھ میں اور دوسری مرتبہ والد کی وفات کے بعد ۱۲۹۳ھ میں، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علامہ لکھنوی نے شیخ احمد دحلان شافعی اور مفتی سید محمد بن عبداللہ بن حمید مدنی حنبلی سے مکہ مکرمہ میں، اور شیخ محمد بن محمد غربی شافعی اور شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی

---

[1] اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص:۲۰۳۔

مہاجر مدنی سے مدینہ منورہ میں اجازتِ حدیث حاصل کی اور دیگر علماء وشیوخ سے سندیں حاصل کیں۔

(مقدمہ فتاوی عبدالحی ص:۳- الاعلام ص:۸/۲۵۱- مقالاتِ سلیمان ص:۲/۶۱)

مذکورہ بالا علماء ومشائخ اور فنِ حدیث کی ممتاز ونامور شخصیات نے علامہ لکھنوی کو جن بلند الفاظ اور اعلیٰ کلمات سے اجازتِ حدیث دی ہے، وہ انکے رتبہ بلند کا شاہد عدل ہیں:

چنانچہ ملاحظہ ہوں شیخ الشافعیہ سید احمد دحلان کی اجازت کے یہ کلمات طیبات: "فقد أجزت الشاب النجيب اللوذعي الأديب الشيخ محمد عبدالحي بن العالم الفاضل الشيخ محمد عبدالحليم......... بكل مايجوز لي روايته و درايته من منقول ومعقول بشرط معتبر عند أهله".

اور اسکے ساتھ مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے الفاظ:

" فقد وفد علينا في طابة الطيبة الفاضل البارع الألمعي الشيخ عبدالحي ولد مولانا الشيخ عبدالحليم ....وطلب مني إجازة إشاعة علم الحديث الشريف والتفسير وغيرهما المذكورة أسانيدهما..........فاجزت له بما أجازني به مشائخي الكرام......الخ". (کنز البرکات ص:۱۳،۱۲)

اوراق اور صفحات کی تنگ دامنی کی وجہ سے صرف انہیں دونوں بزرگوں کے کلمات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

علمی آثار ونقوش:

کسی بھی عالم کی قدر وقیمت کی شناخت اور اہمیت کی پہچان اسکے علمی آثار ونقوش اور ذخیرہ دانہ وختہ سے ہوتی ہے، جسطرح درخت کی پہچان اسکے برگ وبار سے ہوتی ہے، اسکے دو پہلو ہیں:

(۱) تلامذہ:

جن کی تعلیم وتربیت اسکے ہاتھوں انجام پائی، کیونکہ معلم کی شخصیت کی جھلک اور عکس جمیل تلامذہ ہی ہوتے ہیں۔

(۲) تصنیفات وتالیفات:

جو وہ اپنے فرزندانِ عصر اور اگلی نسل کے لئے بطور یادگار چھوڑ جاتا ہے، جن سے وہ فائدہ اٹھاتی ہے۔

یہاں پر دونوں علمی آثار و یادگار کا مختصر تذکرہ برمحل ومناسب ہوگا۔

چند نامور اور ماہر فن تلامذہ:

یوں تو مختلف علاقوں اور خطوں سے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد اور آپ کے چشمۂ علم سے تشنہ لبی دور کرنے والے تشنگانِ علم اور طالبانِ علمِ نبوت کا ایک جم غفیر ہے:

صاحب کنز البرکات نے آپ کے ۵۰/ممتاز و نامور تلامذہ کے نام شمار کئے ہیں[1] اور مؤلف "المنهج الفقهي للإمام اللكنوي" نے "نزهة الخواطر" کی مدد سے ان میں سے ۳۵/نامور تلامذہ کا مختصر تذکرہ وتعارف کرایا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۸۵ تا ص ۹۲)

ہم یہاں چند مشہور فضلاء کا صرف نام ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

(۱) مولانا ظہیر احسن شوق نیموی م ۱۳۲۵ھ (صاحب آثار السنن) (۲) مولانا فتح محمد تائب لکھنوی م ۱۳۲۷ھ (صاحب خلاصۃ التفسیر) (۳) مولانا عین القضاۃ حیدرآبادی م ۱۳۴۳ھ (۴) مولانا عبدالباقی فرنگی محلی م ۱۳۶۴ھ (۵) مولانا شاہ سلیمان پھلواروی م ۱۳۵۴ھ (۶) مولانا حمید الدین فراہی م ۱۳۴۹ھ (۷) مولانا ابوالفضل محمد حفیظ اللہ اعظمی م ۱۳۶۲ھ، سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء (۸) مولانا ابوالا محمد عبدالعلیم رسولپوری م ۱۳۴۱ھ (۹) مولانا انوار اللہ حیدرآبادی م ۱۳۳۶ھ (۱۰) مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوری (۱۱) حافظ الحدیث مولانا عبدالغفور رمضانپوری بہاری (۱۲) مولانا سید محمد امین نصیرآبادی (۱۳) مولانا عبدالکریم پنجابی (۱۴) مولانا قادر بخش سہسرامی (۱۵) مولانا محمد حسین الہ آبادی (۱۶) مولانا حکیم عبدالباری عظیم آبادی وغیرہ۔

---

[1] ملاحظہ ہو کنز البرکات ص: ۲۸ تا ۳۰

یہ وہ خوش بخت وسعادت مند افراد ہیں جنہوں نے ملک کے ہر گوشہ میں پہونچ کر علم وفن کی خدمت کی، اور اصلاح وتجدید، درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔

(مستفاد از مقالات سلیمان ص: ۶۳/۲ وہ سہ ماہی فکر اسلامی ص: ۱۳)

تالیفات وتصنیفات:

علامہ لکھنوی کو دورانِ تعلیم ہی سے تصنیف وتالیف کا ذوق وشوق تھا اور یہی وجہ ہے کہ قلیل عرصہ میں درسی کتابوں پر شروح وحواشی اور تعلیقات بیشمار تحریر فرمائے، اور یہ کسی ایک علم کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ نحو، صرف، منطق، حکمت وفلسفہ، مناظرہ اور تاریخ سے بلند ہوکر خاص طور سے حدیث وفقہ کے لئے اپنا قلم وقف کر دیا، بلکہ ان دونوں فنون میں اپنی علمی وذہنی صلاحیت نچوڑ کر رکھ دی جو اہل علم کے لئے نا قابل فراموش اور ہمیشہ باقی رہنے والی یادگار اور اہم علمی کارنامے ہیں۔

(مستفاد از مقدمہ فتاوی عبدالحی)

فخر المتأخرین علامہ لکھنوی کی تصنیفات کی تعداد مختلف حضرات نے اپنی اپنی معلومات اور تلاش وجستجو کے اعتبار سے مختلف لکھی ہے، کم سے کم تعداد ۹۰ اور زیادہ سے زیادہ ۱۲۹ بتلائی جاتی ہے۔

چنانچہ فتاوی عبدالحی کے مرتب نے اپنے مقدمہ میں کل تعداد ۹۰، مؤلفِ کنز البرکات نے ۹۳[۱]، تذکرہ علمائے فرنگی محل کے مؤلف نے ۱۰۹[۲]، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے ۱۱۵،[۳] مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے ۱۲۰[۴] اور ڈاکٹر صلاح محمد سالم نے ۱۲۹ لکھی ہے۔[۵]

مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی تمام کتابوں کے نام ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''ان تالیفات کے بارے میں صرف اسقدر لکھنا چاہتا ہوں کہ اگر مولانا کی کوئی اور تصنیف نہ ہوتی اور صرف چار کتابیں آپکی مؤلفہ ہمارے ہاتھ میں ہوتیں، تب بھی مولانا کی عظمتِ شان اور مرتبہ علمی جاننے کے لئے کافی تھیں، یہ چار کتابیں چار فنونِ مختلفہ کی ہیں: ایک مصباح الدجی..........

---

[۱] ص: ۲۳/۲۰، [۲] ۱۳۳ تا ۱۳۵، [۳] مقدمہ تحفۃ الاخیار ص: ۵، [۴] ظفر الامانی ص ۲۰، (معاصر فقہ اسلامی نمبر ۱۶ سے نقل ہیں، [۵] مقدمہ النسیج العصی للامام اللکھنوی ص: ۱۰۔

جو مولانا کی وسعت نظر اور قوت علمی اور منطق میں بے مثل محقق ہونے کا گواہ ناطق ہے، دوسرے سعایہ یعنی شرح وقایہ کا حال المعن حاشیہ.......جس کے بارے میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس کتاب کو علامہ صدر الشریعہ دیکھتے تو وہ مولانا کے ہاتھوں کو محبت سے چوم لیتے، اگر یہ کتاب تمام ہوجاتی تو یقیناً علمائے زمانہ " البحر الرائق " اور " فتح القدیر " کو بھول جاتے، تیسرے موطا امام محمد کا مبسوط حاشیہ یعنی التعلیق الممجد، اس حاشیہ کی کیا تعریف کی جائے، سوائے اسکے کہ علمائے متأخرین میں اسکی کوئی نظیر "عمدۃ القاری" کے بعد نہیں ہوئی: (بحث صرف محققانہ تحریر سے ہے) اور بے تعصبی اور الحق احق بالاتباع کے اعتبار سے تو کسی آخری دور کے عالم کا آپ سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، چوتھے ظفر الامانی، اصول حدیث میں بے مثل رسالہ ہے، جو گر چہ رسالۂ سید شریف کی شرح ہے، مگر حق یہ ہیکہ وہ خود ایک مستقل تالیف ہے، اور اس کے بعد مقدمۂ ابن صلاح کی بھی ضرورت طالبان علوم نبوت کے لئے باقی نہیں رہتی۔ (مقالات سلیمان ص ۶۱/۳)

سیرت نگار نبوی علامہ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں آپ کے علمی کارنامے اور خدمات حدیث: "حدیث اور متعلقات حدیث کی متعدد نادر کتابیں، اپنے مقدمہ اور تحشیہ کے ساتھ شائع کیں، حدیث اور فقہ حنفی کی جامعیت کے ساتھ بیسیوں رسالے لکھے"۔ (مقالات سلیمانی: ۶۱/۳)

آگے تحریر فرماتے ہیں:

"متون کتب میں سے مولانا نے "مسند امام ابوحنیفہ" موطأ امام محمد" کتاب الآثار امام محمد مقدمہ اور حاشیہ لکھا اور انکو چھپوا کر شائع کیا، متعلقات حدیث میں سے "موضوعات سیوطی"، "المقاصد الحسنۃ امام سخاوی" اور " فتح المغیث فی اصول الحدیث " اور " میزان الاعتدال" وغیرہ کتابیں اسکے اشارہ سے اسکے متوسلین اور تلامذہ نے شائع کیں"۔

(ایضاً ص ۶۲/۳)

اللہ تعالی نے آپ کی مؤلفات کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مشرق ومغرب میں رائج ہوگئیں اور اطراف واکناف میں پھیل گئیں، لوگوں نے انہیں حاصل کرنے میں شوق ودلچسپی

لی، اور ضیاع سے محفوظ رکھا: یہ مقبولیت مؤلف کی زندگی اور وفات کے بعد یکساں حاصل ہوئی، بلکہ بعد از وفات اہل علم وتحقیق کا اعتنا زیادہ ہوگیا، اور وہ بڑا مرجع ومصدر بن گئیں۔

علامہ عبدالفتاح ابوغدہؒ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

"هذا الإمام الفذ النادر العجيب الذى أعطى القبول فى مؤلفاته فى حياته وبعدمماته من كل من قرأ له شيئاً من كتبه، أو وقف على نقل من كلامه، ذلك لما اتسم به رحمه الله من التحقيق الفريد و الاستيفاء البالغ والإنصاف والتواضع". (الشیخ العلمی للإمام اللکنوی:ص۸۳)

سچ تو یہ ہے کہ امام لکنوی پہلے طرز کے علماء میں سے ہیں، جن کے علوم ومعارف میں تنوع ہے، اور انکے تالیفات مختلف فنون پر مشتمل ہیں، اسی وجہ سے وہ علمائے موسوعین (انسائیکلو پیڈیسٹ) میں شمار کئے جانے کے اہل ہیں:

دکتور صلاح محمد سالم ابوالحاج لکھتے ہیں:

"إماماً اللكنوي كان من الطراز الأول إذ تنوعت علومه ومعارفه فشمل تأليفه كثيرا من العلوم حتى يصح عنه أنه من العلماء الموسوعين". (ایضاً ص:۹۳)

مؤلفات کے چند مجموعی خصائص:

(۱) تحقیقات عمدہ اور نفیس (۲) متفرق مباحث کی جمع وتالیف، تاکہ وہاں تک رسائی آسان اور استنباط ممکن ہو، (۳) مسائل کا مع دلائل واختلاف ذکر اور قول راجح کا بیان، (۴) نادر اور قیمتی نفیس ولطیف مباحث ومسائل پر مشتمل وحاوی ہونا (۵) رسائل ومقالات بلکہ مجالات کا کافی وشافی اور مفید وبہتر ہونا (۶) بعض تالیفات کا بے نظیر ولا جواب ہونا جیسے الرفع والتکمیل جو بقول مؤلف:

"هي رسالة لم يوجد لها بفضل الملك الجليل عديل ومثيل وغيرها من تاليفاتنا الفقهية والحديثية".

(۷) رطب ویابس سے پاک اور مؤلف کا تالیفات میں تقلید سے دور ہونا (۸) مؤلفات کا شہرۂ آفاق ہونا، مقبولیت ومحبوبیت کا حاصل ہونا اور ہاتھوں ہاتھ خوشی ومسرت کے ساتھ لیا جانا۔

(۹) دلائل وزوائد سے استنباطات پر مشتمل ہونا اور مفتی حضرات کے لئے مفید ہونا۔
(۱۰) مطالعہ سے ذہن ودماغ کے دریچے وا ہونا اور مطالعہ کرنے والے کا کیف ونشاط سے جھوم اٹھنا۔
(تفصیل کے لیے ملاحظہ ایضاً ص:۴۴۳ تا ۴۴۰)

علم حدیث میں چند مؤلفات کا مختصر تذکرہ وتعارف:

مولانا کی اگر چہ شہرت فقیہ کی حیثیت سے زیادہ ہوئی اور فن فقہ میں تالیفات بھی سب سے زیادہ ہیں، لیکن مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ علم حدیث سے شغف اور اس میں خدمات وتالیفات کچھ کم نہیں ہیں، یقیناً ہر لحاظ سے مولانا علمائے حدیث میں شمار کیے جانے کے اہل ہیں۔

دیگر مؤلفات کو قلم انداز کرتے ہوئے ہم یہاں "المنهج الفقهي" اور دیگر کتب کی مدد سے علامہ لکھنوی کی صرف علم حدیث پر مؤلفات کا مختصر تعارف وتذکرہ پیش کرتے ہیں، جو اس وقت ہمارے موضوع کا اہم حصہ ہیں:

(۱) التعليق الممجد:

امام محمد کی مشہور کتاب "موطأ" کا جامع اور مفصل حاشیہ ہے، صورۃً یہ حاشیہ ہے، مگر حقیقت میں موطأ کی بہترین شرح ہے، اس سے پہلے موطأ کی جو شرحیں لکھی گئیں ہیں ان میں یہ ایک مفید اور قابل قدر اضافہ ہے، تحقیق وتدقیق، اثبات حق اور عدم عصبیت کے لحاظ سے کتب حنفیہ میں ممتاز اور منفرد حیثیت کی حامل ہے، دیگر شرحوں میں رہ جانے والی خامیوں کا اس میں ازالہ بھی کیا گیا ہے، راویوں کے بقدر ضرورت حالات بھی درج کئے گئے ہیں، اس کے شروع میں تقریباً سو صفحات کا مبسوط مقدمہ بھی ہے۔

ہندوستان میں متعدد بار شائع ہو چکی ہے، ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی مظاہری نے اسکو تعلیق وتحقیق کے ساتھ خوبصورت انداز میں دارالقلم دمشق سے تین جلدوں میں شائع کیا ہے، شروع میں چالیس صفحات پر مشتمل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا مقدمہ بھی ہے۔

(سہ ماہی فکر اسلامی (معاصر فقہ اسلامی نمبر) ص:۱۷، ۱۸)

علامہ لکھنوی کے تلمیذ رشید مولانا عبدالباقی لکھنوی اس کتاب کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''میری قسم! کسی محدث نے اس طرح کی کتاب نہیں لکھی، نہ ماضی او رنہ عصر حاضر میں، بڑی قیمتی تعلیق ہے، اس میں مذاہب اور انکے دلائل ہیں، مسائل و دلائل کا نقض وابرام وجرح واحکام کے ساتھ تردیداور حق کا اختیار ہے''۔ (حسرۃ الفحول، ص:۳۶)

مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا ارشاد اس سے قبل گزر چکا ہے کہ:

''اس حاشیہ کی کیا تعریف کی جائے سوائے اس کے کہ علمائے متاخرین میں اسکی کوئی نظیر ''عمدۃ القاری'' کے بعد نہیں ہوئی''۔ (تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص:۱۳۵)

مقدمہ التعلیق الممجد۔ چند خصوصیات:

(۱) مبسوط و مفصل اور فوائد سے پر ہے (۲) ترویج حدیث کی کیفیت، تصنیفات کی ابتداء، آغاز، ان کے مختلف مقاصد، متنوع مسالک کا تذکرہ اور ان کے انواع واقسام اور حالات واطوار کا بیان (۳) امام مالک کا ترجمہ وسوانح (۴) موطأ کے فضائل، وجہ تسمیہ اور اس کے مشمولات (۵) امام شافعی کے قول ''أصح الکتب بعد کتاب اللہ موطأ'' اور جمہور محدثین کے قول ''صحیح البخاری أصح کتب الحدیث والسنۃ'' کے مابین رفع تعارض اور جمع وتوافق (۶) موطأ کے اندر بہت سی ایسی سندوں کا وجود جن پر محدثین نے اصحیت کا فیصلہ کیا ہے (۷) امام مالک کے رواۃ کی کثرت جو کسی بھی امام حدیث کو حاصل نہیں (۸) موطأ کے مختلف نسخوں کا تذکرہ (۹) موطأ کی احادیث کی تعداد کا بیان (۱۰) موطأ امام مالک پر تعلیق لکھنے والوں کے تراجم اور آخر میں خود اپنا ترجمہ (۱۱) احادیث وآثار کی تعداد باب در باب (۱۲) موطأ میں امام محمد کے عادات وآداب اور طریقہ کار۔

(حسرۃ الفحول، ص:۲۶)

الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل:

اس کتاب میں مؤلف نے جرح وتعدیل کے پر خار، دشوار، پیچیدہ اور پیچیدہ مسائل سے بحث کی ہے، اس کے قواعد اور ان کے باریک معیار بیان کیے ہیں، اور مفصل کلام کرتے ہوئے اپنا

مدعا واضح اور مقصد ظاہر کیا ہے، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے بقول:

"هو أول كتاب ألف في موضوعه ولم يسبق إليه على تمادي العصور، ووفرة الحفاظ والنقاد في علوم الحديث" کہ اس سے قبل اس فن میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

خلاصہ یہ کہ" یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر منفرد اور بقامت کہتر اور بقیمت بہتر کی صحیح مصداق ہے[1] بے نظیر و لاجواب کتاب ہے۔

شیخ نے اس کو جدید طور پر ایڈیٹ کر کے اپنے تفصیلی حاشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

ظفر الأماني بشرح مختصر الجرجاني:

اصول حدیث کے مقاصد اور علم حدیث کی معرفت میں ایک مطول اور جامع کتاب ہے، اور علماء کی تحقیق پر حاوی ہے، ایک مقدمہ اور چند مقاصد پر مشتمل و مرتب ہے، اکثر چیزیں" خلاصة حسن الطيبي في أصول الحديث" سے ماخوذ ہیں۔

یہ شرح تاخر زمانی کے باوجود اپنے بہت سے محاسن و خصائص کی وجہ سے ممتاز ہے، اکثر مختلف فیہ مسائل میں محدثین کے ساتھ فقہاء اور اصولیین کی آراء بھی پیش کرتے ہیں:

اس کتاب کے بارے میں مؤلف کی آرزو اور ارادہ خود انہیں کے الفاظ میں:

جب میری کتاب "ظفر الأمانی" طبع ہو جائے گی تو نزھۃ شرح نخبۃ کی جگہ پر افادہ کے لیے نصاب میں اسی کو رکھیں گے اور پڑھائیں گے[2] لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اس آرزو کی تکمیل نہ ہو سکی۔

بقول شیخ عبدالفتاح ابوغدہ:" یہ کافی ووافی شرح ہے، غایت و مقصد پر فائق ہے، دلائل و براہین کے ساتھ حل و تنقیح اور تحقیق و توضیح کی مؤلف نے بھرپور کوشش کی ہے۔

(ملاحظہ ہو النبع الغمی ص: ۱۰۸ تا ۱۱۲)

اس کتاب کا ایک ایڈیشن شیخ کی تحقیق و حواشی کے ساتھ شائع ہوا ہے اور متعدد ایڈیشن

---

[1] سہ ماہی فکر اسلامی ص ۱۹ و حسرۃ الفحول ص ۳۸ [2] حسرۃ الفحول ص ۳۸

ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی کی تحقیق سے شائع ہوئے ہیں[1] حدیث کے طلبہ کو اصول وقواعد سکھانے کی اچھی کتاب ہے۔

الآثار المرفوعة في الأخبار الموضوعة:

کتاب کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے، سال کے شب وروز میں نمازوں کے سلسلہ میں موضوع احادیث پر ایک نہایت جامع اور مکمل کتاب ہے، آغاز کتاب میں مؤلف نے وضع حدیث کرنے والوں کے اقسام، اسباب وضع، موضوع احادیث کی نقل وروایت اور اس پر عمل کا حکم بیان کیا ہے، پہلی تنبیہ میں ہفتہ کے شب وروز کی نمازوں کا ذکر ہے اور دوسری میں سال کے لیل ونہار کی نمازوں سے متعلق احادیث اور ان کے متعلقات کا ذکر ہے، پھر چند مخصوص نمازیں مثلاً صلاۃ التسابیح وغیرہ کا تذکرہ کر کے ان سے متعلق احادیث قابل قبول ہونے کی تحقیق پیش کی ہے۔

الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة:

کتاب کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے، مؤلف نے ایک بڑے عالم مولانا محمد حسین لاہوری کی طرف سے دریافت کیے گئے اصول حدیث سے متعلق دس استفسارات کا فاضلانہ جواب دیا ہے جو بڑا عمدہ، واضح، تحقیقی اور لاجواب ہے، حتی کہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ جیسے محقق کا اس کتاب کے بارے میں تاثر ہے۔

''میری اپنی معلومات کی حد تک آزاد مباحث پر مشتمل یہ ایک جامع کتاب ہے، اس کمال واتقان کے ساتھ کسی نے نہیں لکھا ہے، مؤلف کی یہ کتاب ان کی نادر اور بے مثال تصنیفات میں سرفہرست رکھے اور شمار کیے جانے کے لائق ہے، کیوں کہ یہ علوم حدیث کا بہت بڑا خلا پُر کرتی ہے''۔

(النبع العلمی: ص ۱۰۸ تا ۱۱۲)

حاشية الحصن الحصين:

علامہ شیخ جزریؒ کی دعاء واذکار کی مشہور ترین کتاب ''الحصن الحصین'' کی بہت سے علماء نے

[1] سہ ماہی فکر اسلامی: ص ۱۸ تا حسرۃ الفحول: ص ۴۰

شرح لکھی ہے، امام لکھنوی نے "الحرز الثمین" نامی قاری کی شرح پر اپنا حاشیہ بڑے اہتمام سے لکھا ہے، جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

الآيات البينات على وجود الأنبياء في الطبقات:

کتاب اردو زبان میں ہے، مؤلف نے زمین کے طبقات میں وجود انبیاء پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اثر کو ثابت مان کر بحث کی ہے، چوں کہ دیگر مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی مؤلف کے دور میں علماء کے مابین اختلافی ونزاعی بن گیا تھا، اور ان کی آراء کے اختلاف نے تکفیر وتضلیل کا ماحول پیدا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اس کتاب کی تالیف کی ضرورت پیش آئی۔

دافع الوسواس في أثر ابن عباس، زجر الناس على إنكار أثر ابن عباس:

یہ دونوں کتابیں مذکورہ بالا کتاب "الآیات البینات" کے سلسلہ کی تکمیل ہیں، اور اسی پس منظر میں لکھی گئی ہیں، عمدہ انداز میں معاملہ کی تحقیق کی ہے، آخر الذکر رسالہ میں بہت سی ان کتابوں سے اضافہ بھی ہے جو مؤلف کے مطالعہ میں حرمین شریفین کے دوران قیام میں آئیں اور نظر سے گزریں۔

رسالة في الأحاديث الموضوعة المشتهرة:

موضوع نام سے ظاہر ہے، مؤلف اس کتاب میں دلائل کے ساتھ ان تمام موضوع احادیث کو جمع کرنا چاہتے تھے، جن کے موضوع ہونے میں ان سے قبل کے علماء کا اتفاق یا اختلاف رہا ہے، لیکن مشیت ایزدی اس راہ میں حائل ہوئی اور تکمیل کی آرزو لیے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔

شرح ثلاثيات البخاري:

امام لکھنوی نے اپنی کتاب "الفوائد البہیۃ" میں ملا علی قاری کے ترجمہ میں لکھا ہے: "هــو أحد ثلاثيات البخاري وقد شرحها بعون الباري" عبارت واضح نہیں ہے، احتمال یہ ہے کہ ملا علی قاری کی تصنیف ہو، شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے اسی کو ترجیح دے کر اسے ملا علی قاری کی تصنیف قرار دیا ہے، واللہ اعلم۔

خير الخبر في أذان خير البشر:

"عربی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے جس میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ نومولود کے کان میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اذان ثابت ہے لیکن اقامت کے ثبوت میں توقف کیا ہے"۔

(اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص ۲۱۰)

تحفة الأخيار على إحياء سنة سيد الأبرار:

"مصنف نے اس کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ تراویح کی بیس رکعت سنت موکدہ ہے"۔

(اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص ۲۱۰)

إمام الكلام فيما يتعلق بالقراءة خلف الإمام:

اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے۔

غيث الغمام على حواشي إمام الكلام:

نزهة الفكر في سبحة الذكر:

عربی زبان میں ایک رسالہ ہے

النفحة بتحشية النزهة مزجر الشبان والشيبة عن ارتكاب الغيبة:

ان کتابوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔

یہ علامہ لکھنوی کی فن حدیث میں آسانی میسر آنے والی کتابوں کا سرسری تذکرہ وجائزہ ہے، احاطہ مقصود نہیں کہ اس کے لیے مستقل تصنیف درکار ہے۔

ولایت وبزرگی:

اتباع سنت چوں کہ ایمان کی تکمیل ہے اور حیات انسانی کا اصل جوہر، لہٰذا اگر اس پہلو کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ گوشہ تشنہ اور مقالہ ادھورا رہے گا، اس سلسلہ میں اتنا ذکر کر دینا کافی ہے کہ علامہ لکھنوی روحانی اعتبار سے بھی رتبۂ بلند رکھتے تھے، خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بار زیارت ہوئی ہے، اسی طرح سیدنا ابوبکر وعمر، ابن عباس، فاطمہ، عائشہ، ام حبیبہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی

زیارت سے بھی مشرف ہوئے ہیں، امام مالک، شمس الدین سخاوی، جلال الدین سیوطی وغیرھم ائمہ وعلماء سے ملاقات ہوئی ہے، اوران سے استفادہ بھی کیا ہے[1] اور شب بیداری اور تہجد گزاری کا یہ حال تھا کہ فجر سے قبل ہی ایک درس ہوتا تھا۔

وفات حسرت آیات:

"کل من علیھا فان" کے ضابطۂ الٰہی اور بے لاگ قانون خداوندی کے تحت آسمان علم وفن کا یہ آفتاب عالم تاب، سمائے تحقیق وتدقیق کا ماہتاب ضیابار اور فکر ونظر کا نیر تاباں اپنی عمر عزیز کے ۳۹ ر شوط پورے کر کے ماہ ربیع الاول کی آخری شب میں ۱۳۰۴ھ کو اپنی بہاروں کا جلوہ دکھلا کر دنیا کو حسرت ویاس کے عالم اور اندوہ وغم کی حالت میں خزاں رسیدہ چھوڑ کر روپوش ہوگیا، مگر غروب کے بعد بھی افق پر اپنی یادوں کے لازوال نقوش اور علمی آثار وانمول یادگار سے قائم شفق چھوڑ گیا، کہ اہل علم اس کے احسان گرانبار سے کبھی سبکدوش نہ ہوسکیں گے۔

اپنے اسلاف کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے، تدفین میں ہر گروہ وفرقہ کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی، اور ازدحام کا یہ منظر تھا کہ تین مرتبہ جنازہ کی نماز پڑھی گئی۔

(الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام: ۲۵۶/۸، تذکرہ علمائے فرنگی محل: ۱۳۶۔)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

---

[1] ملاحظہ ہو کنز البرکات: ۱۹، حسرۃ الفحول: ۴

مراجع ومصادر

نام کتاب	مصنف	ناشر	سن طباعت
۱۔ الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام	علامہ سید عبدالحی حسنی	دار عرفات رائے بریلی	۱۴۱۳ھ-۱۹۹۳ء
۲۔ فتاوی عبدالحی	مترجم مولانا خورشید عالم	مکتبہ تھانوی دیوبند	طبع اول ۱۹۸۹ء
۳۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل	مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی	اشاعت العلوم برقی پریس فرنگی محل لکھنؤ	۱۳۳۹ھ
۴۔ المعجم الفقہی لتراث الامام اللکنوی	صلاح محمد سالم ابوالحاج	دار النفائس بیروت	۱۴۲۲ھ-۲۰۰۲ء
۵۔ حسرۃ الفحول بوفاۃ نائب الرسول	حافظ مولانا محمد عبدالباقی لکھنوی	مطبع انوار محمد، باہتمام حاجی محمد تیغ بہادر	سن طباعت مذکور نہیں
۶۔ کنز البرکات لمولانا ابی الحسنات	مولانا ابوالفضل محمد حفیظ اللہ اعظمی	مطبع علوی محمد علی بخش خاں لکھنوی	۱۳۵۰ھ
۷۔ الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ مع طرب الاماثل بتراجم الافاضل	امام ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی	نور محمد کارخانہ تجارت کتب (آرام باغ)	۱۳۹۳ھ
۸۔ مقالات سلیمان جلد دوم	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	دارالمصنفین اعظم گڑھ (یوپی)	۱۳۸۷ھ-۱۹۶۹ء
۹۔ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں (الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند)	علامہ حکیم سید عبدالحی حسنی مترجم مولانا ابوالعرفان خاں ندوی	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۳۸۹ھ-۱۹۶۹ء
۱۰۔ سہ ماہی فکر اسلامی (معاصر فقہ اسلامی نمبر)	ایڈیٹر مولانا سعد قاسمی	دار العلوم الاسلامیہ ضلع بستی (یوپی)	شمارہ جولائی تا جون ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء

تلک عشرۃ کاملۃ

والحمد للہ علی ذلک



علامہ ظہیر احسن شوق نیموی

بحیثیت محدث عظیم

از: مولانا قمرالزماں ندوی

صوبۂ بہار ایک مردم خیز صوبہ ہے، جہاں بڑے بڑے علماء، مشائخ، صوفیا، محدثین، خطباء اور حکماء، ودانشوران قوم پیدا ہوئے، جنھوں نے زندگی کے ہر میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں، انہیں قابل ذکر علماء میں سے ایک اہم شخصیت محدث کبیر علامہ ظہیر احسن شوق نیموی کی ہے، علامہ ظہیر احسن شوق نیموی اپنی گراں قدر علمی و دینی خدمات کی وجہ سے ہندوستان کے معروف ومشہور علماء میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم وتربیت:

علامہ شوق نیموی پٹنہ کے ایک قریبی گاؤں نیمی کے باشندہ تھے، ان کی پیدائش ۱۲۷۸ھ میں صالح پور میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے گھر پر ہوئی، پانچ برس کے ہوئے تو مقامی کتب میں تعلیم کی غرض سے بٹھا دیے گئے، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، کچھ درسی کتابیں اپنے والد شیخ سبحان علی صدیقی (متوفی ۱۲۹۶ھ) سے پڑھیں، اس کے بعد پٹنہ چلے گئے جہاں دیگر اساتذہ کے علاوہ خاص طور پر شمس العلماء مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی (متوفی ۱۳۰۴ھ) سے کسب فیض کیا، ۱۲۹۶ھ میں غازی پور روانہ ہوئے اور مدرسہ چشمۂ رحمت میں داخلہ لیا، وہاں کے متعدد اساتذہ

کی صحبت سے مستفید ہوئے خصوصاً مشہور عالم دین مولانا حافظ عبداللہ سے اکتساب علم کیا، پھر لکھنؤ جاکر ہندوستان کے مشہور عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی (متوفی ۱۳۰۴ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور وہیں علوم عربیہ کی تکمیل کی خاص طور پر حدیث اور فقہ میں مہارت پیدا کی، طبابت کی تعلیم بھی لکھنؤ میں حاصل کی۔ (بحوالہ انکار ملی بہار نمبر، ص ۲۴۹)

علامہ شوق بحیثیت ادیب وشاعر:

قدرت نے علامہ کو فطری طور پر شعری اور ادبی ذوق بھی عطا کیا تھا، ابھی آپ کم سن ہی تھے اور گلستاں بوستاں پڑھتے تھے کہ فی البدیہ اشعار موزوں کرنے لگے تعلیم سے فراغت کے بعد درس وتدریس اور طبابت کا سلسلہ شروع کیا تاہم ادبی ذوق میں کمی نہیں ہوئی بلکہ ادبی تصنیف وتالیف کا سلسلہ مسلسل جاری رکھا، علامہ شوق نیموی اردو زبان کے مستند شاعر اور محقق وزبان داں تھے، ان کی شعری خوبیوں کو داغ دہلوی، تسلیم لکھنوی، حسرت عظیم آبادی اور احسن مارہروی جیسے نامور شعراء نے سراہا، مولانا ابوالکلام آزاد، زبیر دہلوی اور ضیاء عظیم آبادی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان کی شاگردی پر فخر کیا۔

علامہ نیموی بحیثیت محدث:

شعر وادب کے علاوہ اصل میدان جس میں انہوں نے اونچا مقام حاصل کیا وہ حدیث کا میدان ہے، فن حدیث میں آثار السنن جیسی اہم اور تاریخ ساز کتاب مرتب کیا اور اس میں احادیث ورجال کے سلسلے میں بعض ایسی نادر تحقیقات پیش کیں کہ ان سے ہندوستان کے تقریباً تمام علماء متاثر ہوئے، یہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ممتاز ترین علماء مثلاً علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا زکریا سہارنپوری وغیرہ نے ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا اور اپنی تصنیفات وتالیفات میں جابجا ''قال العلامۃ النیموی'' کہہ کر ان کے حوالے دیے ہیں۔

فن حدیث سے خصوصی شغف کی وجہ:

علامہ شوق نیموی مولانا عبدالحی فرنگی محلی جیسے عظیم عالم اور محدث سے حدیث کا درس حاصل

کر رہے تھے تبھی ان میں اس فن سے خصوصی شغف پیدا ہو گیا تھا، اور برابر کتب حدیث کا مطالعہ کرتے رہے، مگر اس کے ساتھ فن حدیث سے مناسبت کی ایک اہم وجہ وہ خواب ہے جس کو انہوں نے دیکھا، وہ خود لکھتے ہیں:

إني رأيت ذات ليلة في المنام أني أحمل فوق رأسي جنازة النبي صلى الله عليه وسلم، فعبرت هذه الرؤيا الصالحة بأن أكون حاملا لعلمه إن شاء الله العلام، لم شمرت عن ساق الجد واشتغلت بالحديث حتى وفقني الله لتاليف "آثار السنن" وهو كتاب نادر غريب في هذا الفن، وعلقت عليه تعليقا حسنا وسميته بالتعليق الحسن على آثار السنن، وأسأل الله الصدق والصواب والإصابة في كل إياب وذهاب. (مقدمه آثار السنن)

آثار السنن مرتب کرنے کی وجہ:

دوران مطالعہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ تمام مدارس اسلامیہ میں زیادہ تر حدیث کے وہی مجامع پڑھائے جاتے ہیں جو شافعی یا حنبلی علمائے حدیث کے مرتب کیے ہوئے ہیں اور ان لوگوں نے اپنے اپنے مسلک کو سامنے رکھتے ہوئے صحیح احادیث مرتب کیں ہیں، اسی وجہ سے عام طور پر طلبہ انہی کے مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں اور مسلک احناف کو کمزور سمجھ کر اس سے بدظن ہونے لگتے ہیں، جب کہ حقیقت ایسی نہیں ہے، اسی جذبے کے تحت علامہ نیموی نے ہند اور بیرون ہند کے مختلف شہروں کا سفر کیا اور جس قدر کتب احادیث دستیاب ہو سکیں انہیں یکجا کیا یا ضروری مواد حاصل کیا، اور پھر نہایت دیدہ ریزی اور محنت شاقہ کے بعد ایک کتاب مرتب کی جس کا نام آثار السنن رکھا، اس کتاب میں انہوں نے ان تمام صحیح احادیث اور روایات کو جمع کیا ہے جو مسلک احناف کی مؤید ہیں، یہ کتاب دو جز میں ہے، پہلا جزو کتاب الطهارة تا باب في الصلوة بحضرة الطعام اور دوسرا جزو باب ماعلى الإمام سے باب في زيارة قبر النبيؐ پر مشتمل ہے لیکن افسوس کہ یہ کتاب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ (بحوالہ انکار علی بہار نمبر: ص ۲۳۹)

آثار السنن کا علمی مقام و مرتبہ:

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری فن حدیث میں علامہ شوق نیموی کا مقام بہت بلند مانتے تھے

اور معرفت علل واسانید میں ہندوستان کے کسی دوسرے کوان کا عدیل ومثیل نہیں قرار دیتے ، مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ یہاں تک فرماتے تھے کہ مولانا ظہیر احسن صاحب ،حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے شاگرد ہیں لیکن صناعت حدیث میں ان سے بہت فائق ہیں۔ (بحوالہ الانور ص ۳۱۰)

حضرت مولانا منظور نعمانی آثار السنن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ محدثانہ طرز پر حنفیت کی تائید میں یہ کتاب اس زمانہ کا شاہکار ہے۔ (بحوالہ الانور ص ۳۰۹)

آثار السنن کے علمی مقام پر تبصرہ کرتے ہوئے ابو محفوظ الکریم معصومی لکھتے ہیں:

من أشهر مؤلفاته كتاب "آثار السنن" يمتاز بخصائص ومزايا فنية حديثية بالخصوص بالذب عن مختارات الحنفية في الفقه والأحكام ، ومن هنا اتخذ كتابه هدفا للمناقشات والردود، كان النيموي جماعا للكتب والمخطوطات مع إطلاعه الواسع على النسخ النادرة التي انحدرت إلى عصره واختيارها الذخائر الشخصية أو الخزائن المغمورة، وقد تخرج على العلامة الشيخ الكبير مولانا عبدالحي بن عبدالحليم اللكنوي الفرنجي محلي وتسنى له أن يؤلف رسائل غير قليلة كلها مشحونة بفوائد وشوارد جزيلة نبيلة باللغة الأردية كذاب آخرين من معاصريه وممن اعترف بباعه الطويل العلامة المحدث الشهير مولانا السيد محمد أنور شاه الكشميري أحد مشائخ العلم. (روائع الأعلاق.ص:۲۳)

دیگر تصنیفات:

اس اہم کتاب کے علاوہ علامہ نیموی نے حبل المتين، جلاء العين في رفع اليدين، جامع الآثار في صلوة الجمعة في القرى، لامع الأنوار، تذليل اور وسيلة العقبة نامی کتابیں تصنیف کی، ان کتابوں میں بعض اختلافی فقہی مسائل مثلاً رفع الیدین اور صلوۃ الجمعہ فی القری وغیرہ پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اور اپنے مسلک کو صحیح احادیث کی روشنی میں نہایت محققانہ انداز میں پیش

کیا گیا ہے؛"او شح الجید في إثبات التقليد" ان کی ایک اہم کتاب ہے جس میں انہوں نے ائمہ اربعہ کی تقلید کو مدلل طور پر ثابت کیا ہے، اور واضح کیا ہے کہ تقلید ائمہ قرآن وحدیث سے نہ صرف ثابت ہے بلکہ آج کے لیے نہایت ضروری بھی ہے۔ (بحوالہ افکار ملی بہار نمبر ص ۲۴۹)

وفات:

علامہ نیوی کا وصال ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ بمقام نیمی ہوا کل ۴۴ سال عمر پائی۔

حوالۂ کتب:

(۱) تذکرۂ علماء بہار
(۲) الانور
(۳) آثار السنن
(۴) افکار ملی بہار نمبر
(۵) روائق الاعلاق
(۶) ادب اسلامی ایک مطالعہ



مولانا محمد بشیر سہسوانی رحمۃ اللہ علیہ

اور

خدمت حدیث

از: مولانا ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی

مولانا محمد بشیر سہسوانی بن حکیم محمد بدرالدین فاروقی سہسوان، یوپی کے نامور فقیہ اور محدث تھے، برصغیر ہندوپاک کے اکابر اہل حدیث میں ان کا نام سرفہرست ہے، چودہویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی کے علمائے کبار میں ان کا نام عموماً ایک متقی، صالح، صاحب فہم وذکا فقیہ اور محدث کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ (دیکھئے نزہۃ الخواطر (عبدالحی حسنی) ج ۸۔)

مولانا محمد بشیر جن کی ولادت ۱۲۵۰ھ کے لگ بھگ ہوئی تھی، میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے خصوصی شاگرد تھے، شیخ حسین عرب بن محسن انصاری یمنی، شیخ احمد بن ابراہیم بن عیسی نجدی اور شیخ محمد بن عبدالرحمن سہارن پوری کی سے بھی انہیں سند اجازت حدیث حاصل تھی، علامہ عبدالعزیز میمن کے استاذ تھے، اور نواب صدیق حسن خانؒ کے علمی معاون اور دست راست تھے، لیکن میرے خیال میں ان کا اصل وصف امتیازی یہ تھا کہ وہ حدیث نبوی شریف سے بے پایہ شغف رکھتے تھے اور غیور وسخت گیر موحد تھے۔

سہسوان، لکھنؤ، متھرا اور دہلی کے علماء سے تحصیل علم کے بعد سینٹ جانس کالج آگرہ میں عربی فارسی کے استاذ رہے اور اسی دوران حجاز گئے اور مکہ مکرمہ کے محدثین سے خصوصی استفادہ کیا، حجاز سے واپسی پر انہوں نے آگرہ کی ملازمت سے مستعفی ہو کر نواب صدیق حسن خاں کی دعوت پر بھوپال کا سفر کیا، جہاں انھیں دینی مدارس کی صدارت و نگرانی کی ذمہ داری حاصل ہوئی، ۱۳۱۹ھ تک وہ بھوپال میں رہے، ۱۳۱۹ھ میں دہلی آئے اور ۱۳۲۶ھ میں رحلت فرما کر اپنے استاذ میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کے پہلو میں شیدی پورہ قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

مولانا محمد بشیر سہسوانی کی ساری زندگی درس و تدریس میں گذری، پھر بھی تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، بعض تصانیف درج ذیل ہیں:

۱. صيانة الإنسان عن وسوسة الشيخ أحمد بن زين دحلان.
۲. القول المحقق المحكم في زيارة قبر الحبيب الأكرم.
۳. السعي المشكور في إتمام الحجة على من أوجب الزيارة كالحجة.
۴. القول المحمود في رد جواز الربا أوسود.
۵. البرهان العجاب في فرضية أم الكتاب.
۶. رسالة في جواز الأضحية إلى آخر ذي الحجة.
۷. رسالة في إثبات البيعة المروجة.
۸. الحق الصريح في إثبات حياة المسيح (اردو) أو الرسالة في الرد على القادياني.

" كتاب صيانة الإنسان عن وسوسة الشيخ دحلان " مولانا موصوف نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے ایک معاصر مکہ مکرمہ کے اس وقت کے قاضی شیخ احمد بن زین دحلان شافعی کی کتاب الدرر السنية في الرد على الوهابية کے جواب میں لکھی تھی، کتاب لکھنے سے پہلے موسم حج میں اس موضوع پر شیخ دحلان سے مولانا کا زبانی مباحثہ ہو چکا تھا، بعد میں مکمل طور پر یہ کتاب تالیف کی گئی جو محمد بن عبدالوہاب کی دعوت اور سعودی حکومت پر لگائے گئے شیخ دحلان کے الزامات واتہامات کی تردید میں

ہے، جس میں مولانا سہسوانی صاحب نے احمد دحلان کے ان ڈھائی سو اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں جو انہوں نے شیخ محمد بن عبدالوہابؒ پر کیے تھے، زیر بحث مسائل زیادہ تر عقیدہ اور توحید سے متعلق ہیں، مثلاً زیارۃ روضۂ اطہر کی حیثیت، ذات رسالتؐ، وسیلے کا شرعی درجہ، غیر اللہ کو پکارنا وغیرہ، علاوہ ازیں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی مختصر سیرت بھی اس کتاب میں مذکور ہے، شیخ کی دعوت کی صداقت پر علماء کی شہادتیں، دعوت شیخ سے پہلے اور بعد کے حالات کا موازنہ، حدیث الغرباء کی تشریح اور توحید کے اقسام اور خوارج کے بارے میں وارد احادیث بھی اس کتاب میں زیر بحث ہیں، یہ کتاب چند سال پہلے دارالافتاء سے محمد رشید رضا کے مقدمے کے ساتھ چھپ کر مفت تقسیم ہوئی تھی۔

الحق الصریح فی اثبات حیاۃ المسیح نامی ایک دوسری کتاب مولانا کی در حقیقت مرزا غلام احمد قادیانی سے حیات مسیح علیہ السلام کے موضوع پر دہلی میں ہوئے مناظرے کی روئداد ہے جس میں مرزا قادیانی لاجواب ہو کر فرار ہوا تھا، تفصیل اس مناظرہ کی یہ بتائی جاتی ہے کہ مرزا قادیانی نے اکتوبر ۱۸۹۱ء میں دہلی میں جب اپنی نبوت کا پرچار شروع کیا تو میاں نذیر حسین محدث رحمۃ اللہ علیہ اپنے بڑھاپے کے آخری دنوں میں سخت پریشان ہوئے اور ان کی دعوت پر مولانا محمد بشیر بھوپال سے دہلی آئے اور مناظرہ پر کمربستہ ہوئے، یہ مناظرہ ''حیات وممات مسیح'' کے موضوع پر تحریری طور پر ہوا، مرزا نے تاویلات کے دروازے کھولے مگر مولانا کے دلائل کے سامنے بے کار ثابت ہوئے، تنگ آ کر مرزا مناظرہ گاہ سے یہ کہتا ہوا نکل بھاگا کہ اس کے خسر اسٹیشن پر اس کا انتظار کر رہے ہیں، مولانا نے لفظ خسر کی مناسبت سے آیت قرآنی خسر الدنیا والآخرۃ ذلک ھو الخسران المبین پڑھی، مجمع بہت خوش ہوا اور مولانا دو دن کے بعد بھوپال واپس چلے گئے۔

بھوپال کے دوران قیام مولانا محمد بشیر انتہائی فعال رہے، مفتی اور مدرس اور نگران اعلیٰ امور مدارس ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ہر دوشنبہ کو تاج محل بھوپال میں وعظ بیان فرماتے تھے، لوگ جوق در جوق دور دراز سے شریک ہوتے اور فکر آخرت میں آہ و بکا کی کیفیت محسوس کی جاتی تھی، نواب صدیق حسن صاحب علیہ الرحمۃ کی سرپرستی میں مولانا نے بارہ (۱۲) سال بھوپال میں گذارے، نواب

صاحب کی ریاست بھوپال سے علاحدگی کے بعد مولانا دہلی واپس آئے اور مسجد حوض والی (نئی سڑک) میں درس حدیث وتفسیر دیتا تھا، میں مشغول رہنے لگے، مذکورہ بالا کتاب البرهان العجاب في فرضية أم الكتاب اس زمانے کی یادگار ہے جو مولانا کے تین مہینے تک جاری رہنے والے مختصر خطبات پر مشتمل ہے، غالباً اسی بنا پر نواب صدیق حسن خاںؒ قراءۃ فاتحہ خلف الامام پر عمل پیرا تھے، حالاں کہ نماز وہ حنفی مسلک کے مطابق بغیر رفع یدین کے ادا کرتے تھے۔

حج بیت اللہ شریف سے واپس آ کر ۱۲۹۵ھ میں رسالہ القول المحقق المحكم في زيارة قبر الحبيب الأكرم شائع کیا، جس کا موضوع الصنع من شد الرحال لزيارة قبر النبي على صاحبه الصلاة والتسليم تھا، اس پر مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی علیہ الرحمہ نے ان کی مخالفت اور تردید کی، جو الکلام المبرور کے عنوان سے کتاب کی شکل میں منظر عام پر آئی، اس کا جواب مولانا بشیر صاحب نے ''القول المنصور'' کے عنوان سے دیا، جس کے جواب میں مولانا لکھنوی نے المذهب المأثور لکھی، پھر مولانا سہسوانی نے إتمام الحجة على من أوجب الزيارة كالحجة قلم بند کر کے شائع کیا، اس کے بعد آخری جواب مولانا لکھنوی کی طرف سے ایک اور آیا ہے لیکن بقول ابویحیٰ امام خاں نوشہروی صاحب تراجم علمائے حدیث ہند اب غیر موجود اور نا قابل اعتناء ہے، قابل ذکر بات حسب روایت جناب نوشہروی یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد جب کبھی مولانا محمد بشیر لکھنؤ تشریف لے جاتے علمائے فرنگی محل ہی کے یہاں مہمان ہوتے اور صاحب الافاضل علامہ لکھنوی باصرار کئی کئی روز تک روکے رکھتے، نہایت عزت واحترام کرتے، آپ کا وعظ سنتے اور اس تمام اہتمام کو اپنے لیے سعادت سمجھتے۔

آخر الذکر واقعہ کا تذکرہ محض اس لیے کیا گیا کہ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے، ہمارے اسلاف اختلاف فکر ونظر کے باوجود بربنائے اخلاص وللّٰہیت متحد اور شیر وشکر رہ کر علوم نبوت کی ترویج واشاعت کی راہ میں فریق بنے بغیر محض رفیق بن کر کارِ دعوت میں لگے رہتے تھے۔

وللہ ولي التوفيق وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین.

مراجع:

۱۔ عبدالحی الحسنی: الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام: جز ۸

۲۔ ابویحیٰ امام خاں نوشہروی: تراجم علمائے حدیث ہند الکتاب انٹرنیشنل مرادی روڈ بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر دہلی

۳۔ عبدالرشید عراقی: تذکرہ النبلاء فی تراجم العلماء، بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۴ء

۴۔ تذکرۃ المناظرین ج ۱: محمد مقتدی اثری عمری، ادارہ تحقیقات اسلامی جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو، یوپی، ہند

۵۔ قادیانیت اپنے آئینے میں: صفی الرحمن مبارک پوری

۶۔ صیانۃ الانسان (مقدمہ رشید رضا) محمد بشیر سہسوانی، شارح: الفتح، الروضۃ الریاض۔

۷۔ الأمیر صدیق حسن خان حیاتہ وآثارہ محمد اجتباء الندوی



علامہ انور شاہ کشمیریؒ

اور

خدمت حدیث

از: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

شعبہ ادبیات عربی سنٹرل حیدرآباد

شیخ محمد عبدہ کے تلمیذ رشید علامہ رشید رضا نے ایک جگہ اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم حدیث کی نشر واشاعت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا قدم سب سے آگے ہے، ہندوستان کے مسلمان علم حدیث کی ترقی واشاعت میں اس قدر جانفشانی سے کام نہ لیتے تو یہ علم اب تک ختم ہو چکا ہوتا۔

علامہ رشید رضا کی اصل عبارت یہ ہے:

" ولولا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من أمصار الشرق، فقد ضعفت في مصر و الشام والعراق والحجاز حتى بلغت منتهى الضعف في أوائل القرن الرابع عشر" (اعلام المحدثین فی الہند، مقدمہ مولانا ابوالحسن علی ندوی)

علامہ انور شاہ صاحب کشمیری اس عصر میں یگانہ تھے، مسلمانوں کے دور زوال اور سلطنت کے انقراض کے عہد میں جب انور شاہ کشمیری جیسی شخصیت علم حدیث میں پیدا ہو سکتی تھی تو مسلمانوں

نے یقیناً اپنے عہد عروج میں اس فن میں جلیل القدر خدمت انجام دی ہوگی، اور اس سرزمین سے نابغہ عصر اور یگانہ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئی ہوں گی، تاریخ اس خیال کی تصدیق کرتی ہے اور رشید رضا صاحب المنار کا یہ اعتراف بالکل درست ہے۔

سندھ پر عربوں کا پہلا حملہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہوا تھا لیکن مکمل فتح تابعین کے ابتدائی زمانہ میں حاصل ہوئی، یہ اس وقت کی بات ہے کہ عرب میں علم حدیث ایک ارتقائی دور میں داخل ہو چکا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خود ایک محدث تھے، خلیفہ ہوئے تو انہوں نے علما کو احادیث کی جمع و ترتیب کی طرف توجہ دلائی جو وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیز خود ایک محدث تھے، وہ اس کام کی عظمت اور اہمیت سے واقف تھے، علم حدیث اپنے ارتقاء کے پہلے مرحلہ میں سندھ میں داخل ہوا، سندھ ہی کے قبائل سے تعلق رکھنے والے طالبان علم عراق میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے، ہندوستان کے اسیران جنگ بھی اسلام قبول کر کے مسلمان ملکوں میں آباد ہو گئے تھے، ان مسلمان طالبان علم اور اسیران جنگ نے علم حدیث کی تحصیل اور اس کی اشاعت میں حصہ لیا، ان میں سے امام اوزاعی (وفات ۱۵۷ھ) شام میں، نجیح السندی (وفات ۱۷۰ھ) مدینہ منورہ اور بغداد میں، رجاء السندی (وفات ۲۲۲ھ) خراساں میں، ان لوگوں میں سے تھے جو ہندی الاصل تھے اور جنھوں نے علم حدیث کی تعلیم و اشاعت میں حصہ لیا، رجاء السندی کے پوتے محمد السندی نے امام مسلم کی الجامع الصحیح کی ایک مستخرج مرتب کی تھی اور خلف السندی نے جو تیرھویں صدی کے اوائل میں حدیث کے ایک شوقین طالب علم تھے، ایک مسند تیار کی تھی، لیکن دونوں کتابیں زمانہ کے دستبرد سے ضائع ہو گئیں ورنہ ہندوستان میں علم حدیث کی خدمت کا اولین نقش کا ثبوت موجود ہوتا، یہ ان ہندوستانیوں کی خدمات تھیں جو وطن سے دور علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لیے گئے تھے، تیسری صدی ہجری کے اواخر میں مدینہ منورہ اور ملتان کی عرب ریاستوں کے قیام کے بعد علم حدیث کے مراکز قائم ہو گئے تھے، جنہوں نے نامور محدثین پیدا کیے، اور علم حدیث میں اعلیٰ تعلیم اور مہارت کے لیے طلبہ کو اسلامی ممالک کے نامور اساتذہ حدیث کی خدمت میں بھیجا، پھر سلطان محمود غزنوی (۳۸۸ تا ۴۲۱ھ) تخت حکومت پر متمکن ہوا تو

اس نے بھی اس فن شریف کے فروغ کی کوشش کی، وہ خود شافعی المسلک تھا، اس کے اور اس کے جانشینوں کے عہد میں لاہور علم حدیث کا مرکز بن گیا، لاہور کے محدثین میں امام صغانی (۶۵۰ھ) جو مشارق الانوار کے مصنف ہیں فن حدیث کے امام تھے، ۶۰۲ھ میں سلطنت دہلی کا قیام ہوا، اس عہد میں علم حدیث سے زیادہ علم فقہ کو فروغ حاصل ہوا، یہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کا زمانہ ہے، اس عہد میں ملک کو قاضیوں کی ضرورت تھی اور سرکاری عہدوں تک پہنچنے کے لیے اسلامی فقہ کا جاننا ضروری تھا اس لیے ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کی ابتدائی صدیاں باب علم حدیث سے شغف کے بجائے علم فقہ سے شغف کی صدیاں ہیں، تاہم اس دور میں شیخ زکریا ملتانی (۶۶۶ھ) اور شیخ نظام الدین اولیاء (۷۳۵ھ) اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور سید علی ہمدانی (۷۸۶ھ) جیسے مشہور صوفیاء اور علماء دین نے علم حدیث کی خدمت کی اور تلامذہ اور مریدین کو اس کی تعلیم دی، چنانچہ علم حدیث سے ان بزرگوں کی محبت کی وجہ سے آٹھویں صدی ہجری میں شمالی ہند کی بعض خانقاہوں میں کتب حدیث کی تعلیم رائج ہوگئی، اگرچہ عمومی مقبولیت اور عام اشاعت کا دور بعد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد شروع ہوا۔

ہندوستان کے ثقافتی روابط جب تک وسط ایشیاء کے ممالک تک محدود رہے، علم حدیث کو ہند میں بہت زیادہ فروغ نہیں ملا، کیوں کہ وسط ایشیاء کے ممالک ماوراء النہر، خراسان اور عراق فقہ اور معقولات کے مرکز تھے، اور چوں کہ ہند کو وسط ایشیاء کی فوجوں نے فتح کیا تھا، اس لیے ان پران ملکوں کے علماء اور مفکرین کا گہرا اثر پڑا، اس کے علاوہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سلطنت اور دور حکمرانی میں فقہاء کی مانگ جتنی زیادہ تھی اتنی محدثین کی نہ تھی، لیکن نویں صدی ہجری کی ابتداء میں جب دکن میں بہمنی اور گجرات میں مظفرشاہی دو آزاد مسلم کی سلطنتیں قائم ہوگئیں اور بحری راستے کھل جانے کی وجہ سے ہندوستان اور عرب کے درمیان ثقافتی تعلقات میں استواری اور مضبوطی آئی تو علم حدیث کو نئے سرے سے فروغ شروع ہوا، اب ہندی محدثین معلم، مرتب اور مترجم اور مدرس کی حیثیت سے ہندوستان اور حجاز میں اس فن کی خدمت کرنے لگے، طاہر پٹنی (۹۱۴ تا ۹۸۶ھ) گجرات کے مشہور عالم

تھے،انہوں نے المغنی فی ضبط الرجال، تذکرۃ الموضوعات، قانون الموضوعات، اسماء الرجال اور مجمع بحار الانوار لکھی، موخرالذکر قرآن وحدیث کے مشکل اور غیر معمولی الفاظ کی ضخیم لغت ہے، نویں صدی اور گیارہویں صدی کے درمیان کے محدثین میں شیخ عبداللہ الانصاری سلطان پوری اور علی متقی برہان پوری صاحب کنزالعمال ہیں جو شیخ طاہر پٹنی کے اساتذہ میں ہیں، بارہویں صدی کے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمات فن حدیث میں ایک مستقل کتاب کا موضوع ہیں، انہوں نے حدیث، تصوف، تاریخ اور سوانح پر ایک سو سے زیادہ کتاب لکھی، انہوں نے مشکوۃ المصابیح کی شرح اشعۃ اللمعات فی المشکوۃ کے نام سے لکھی، الاکمال فی اسماء الرجال اور دیگر بیش بہا کتابوں کے وہ مصنف ہیں، ان کا ایک پورا مکتب فکر تھا اور تلامذہ تھے جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کی، پھر شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے دبستان محدثین کا زمانہ آتا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغۃ اور اربعین، تراجم البخاری اور مصفّٰی شرح موطأ علم حدیث اور فن حدیث میں ان کی اہم کتابیں ہیں، پھر اسی دبستان فکر کے قاضی ثناء اللہ پانی پتی ہیں اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین تھے، اور اسی دبستان فکر کے سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی ہیں جو ہندوستان میں ۱۱۴۵ میں پیدا ہوئے اور شاہ ولی اللہ سے بھی درس لیا، علوم حدیث کے ماہر تھے لیکن ان کی شہرت تاج العروس سے ہوئی، تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں شاہ ولی اللہ کا مکتب فکر اور دبستان حدیث دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کی طرف منتقل ہوا، فن حدیث میں خصوصی مہارت کے لیے طلبۂ دین ان اداروں اور مرکزوں کا رخ کرنے لگے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شجر علم حدیث سے کئی شاخیں پھوٹیں، حضرت شاہ ولی اللہ کے مسند درس حدیث کے وارث ان کے نامور صاحب زادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگردوں میں شاہ محمد اسماعیل شہید اور شیخ محمد اسحق دہلوی فن حدیث کے خدمت گذاروں میں تھے، شیخ محمد اسحاق شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے انتقال کے بعد مسند درس پر بیٹھے، شیخ محمد اسحاق کے کئی شاگرد رہے، دیوبند کے دبستان حدیث کا سلسلہ مولانا

قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے ملتا ہے، شیخ نذیر حسین دہلوی کا اپنا دبستان حدیث ہے (۱۲۳۰ھ) میں بہار میں پیدا ہوئے اور (۱۳۲۰ھ) میں انتقال ہوا، ان کی خدمات حدیث بہت گرانقدر ہیں اور ان کے نامور شاگرد شیخ عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے جن سے بہت سے لوگوں نے علم حدیث میں استفادہ کیا اور ان میں شمس الحق عظیم آبادی بھی تھے، شیخ عبدالرحمٰن مبارکپوری کی مشہور کتاب تحفۃ الاحوذی ہے۔

باغ کے پھولوں پر جس طرح بہار وخزاں اور موسم کی تبدیلی کا اثر پڑتا ہے اسی طرح اسلامی علوم وفنون کے پھول سازگار موسم میں کھلتے اور اپنی بہار دکھاتے ہیں، سماجی اور سیاسی اثرات کا ان پر اثر پڑتا ہے، ہندوستان کی تاریخ میں چوتھی صدی ہجری کے نصف ثانی میں، ملتان اور منصورہ کی ریاستوں پر اسماعیلیوں کا قبضہ ہوگیا، یہ صرف سیاسی تبدیلی نہ تھی بلکہ علم حدیث کی نشر واشاعت پر اس کے دوررس منفی اثرات پڑے، ملتان کی جامع مسجد تک بند کردی گئی اور محدثین کو رخت سفر باندھنا پڑا، سندھ کی یہ تاریخ ایک بار دکن میں بھی دھرائی گئی، دسویں صدی ہجری میں جب ایران میں صفوی سلطنت قائم ہوچکی تو اس کے اثرات دکن میں پڑے، علماء اہل سنت میں مظالم ہوئے، سنی طریقہ کے مطابق اذان پر پابندی عائد ہوئی، اور حدیث جو اہل سنت کا سرمایہ ہے، اس کی نشر واشاعت کا کام رک گیا، بہمنی سلاطین کے عطا کردہ اوقاف ضبط کر لیے گئے، احمد نگر کے حکمران برہان نظام شاہ نے سنی علماء کے تمام وظائف بند کر کے شیعہ علماء کو دے دیئے، عادل شاہی خاندان کے آٹھ حکمرانوں میں سے ابراہیم عادل شاہ اول (۹۶۵ھ) اور ابراہیم عادل شاہ دوم (۱۰۳۷) سنی تھے باقی شیعہ۔

مسلمانوں کی حکومت کے دور آخر میں جب زوال کے سائے بڑھنے لگے اور طاقت کا رشتہ ہاتھوں سے چھوٹنے لگا، تو پھر اس ملک میں مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے کے لیے دو سہاروں کو مضبوطی سے تھامنے کی ضرورت پیش آئی، ایک عربی زبان اور دوسرے قرآن وحدیث، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی میں نواب صدیق حسن خاں اور علامہ شوق نیموی، مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور دوسرے علماء میدان میں آئے اور انہوں نے خدمت حدیث کو اپنی زندگی کا

مقصد بنایا، دارالعلوم دیوبند نے علم حدیث کی اشاعت وتعلیم کی گراں بہا خدمت انجام دی، اس کتب فکر کی خدمت حدیث کا سب سے جلی عنوان مولانا انور شاہ کشمیری کا نام نامی ہے، اس سے پہلے کہ مولانا انور شاہ کشمیری کا تذکرہ کیا جائے اس اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا چونکہ اسلامی علوم وفنون اور دعوت وتبلیغ کے کاموں پر براہ راست اثر پڑتا ہے، اس لیے اہل نظر اور دیدہ ور علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کبھی حالات سے بے خبر اور بے پرواہ ہوکر زندگی نہ گذاریں، باخبری اور صاحب نظری حالات حاضرہ پر گہری نظر اور ان پر اثر انداز ہونے کی کوشش اہل دین کے لیے فرض عین اگر نہیں تو فرض کفایہ ضرور ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ:

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ولادت ۲۷رشوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۶راکتوبر ۱۸۸۵ء کو ہوئی، آپ کا وطن وادئ لولاب کشمیر میں تھا، یہ وہی حسین وجمیل وادی ہے جس پر اقبال نے اے وادی لولاب کے خطاب کے ساتھ پوری نظم کہی ہے:" پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب، اے وادی لولاب" ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور دارالعلوم دیوبند کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی، ابتدائی تعلیم کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، فنون کی کتابیں اور صحاح ستہ یہیں پڑھیں، دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہی سے باطنی تعلیم حاصل کی، دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کار تدریس کی ابتدا آپ نے دہلی میں فرمائی، مدرسہ اس مسجد میں قائم کیا گیا تھا، جسے سنہری مسجد کہتے ہیں اور شہر دہلی میں چاندنی چوک میں فوارہ کے بالکل روبرو واقع ہے، یہ وہی مسجد ہے جس میں ڈھائی سو برس پہلے نادر شاہ درانی نے اہل دہلی کے تہہ تیغ کا منظر دیکھا تھا اور اسی جگہ کے قریب ۱۸۵۷ء میں مغل شہزادوں کی لاشیں لٹکائی گئی تھیں، پھر اس کے بعد آپ نے اپنے وطن کشمیر کے مقام بارہ مولا میں ایک دینی درسگاہ کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد آپ نے حج کا سفر فرمایا اور حرمین شریفین کے علاوہ کتب خانوں اور مخطوطات اور قلمی نوادر کا مطالعہ کیا، حج سے واپسی کے بعد عرصہ کے بعد آپ کو دارالعلوم دیوبند میں اپنے استاذ شیخ الہند

کے حکم پر قیام اور باضابطہ حدیث کی کتابوں کی تدریس کا کام انجام دینا پڑا اور جب شیخ الہند آزادی اور ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلہ میں بعنوان ہجرت دیوبند سے روانہ ہوئے تو حضرت شاہ صاحب کو دارالعلوم کا صدر مدرس اور شیخ الحدیث بنایا گیا، آپ کے بخاری اور ترمذی کے درس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور طالبان حدیث دارالعلوم کا رخ کرنے لگے، دیوبند میں حضرت شاہ صاحب کا فوز علم پورے شباب پر تھا کہ دارالعلوم میں ایک شورش برپا ہوئی، آپ نے دارالعلوم سے استعفا دے دیا اور اس کے بعد سورت کی ایک بستی ڈابھیل کی دینی درسگاہ میں درس حدیث کی ذمہ داری قبول کی، کئی سال تک گجرات کی سرزمین آپ کے فیض سے مستفید ہوتی رہی، اس کے بعد شدید علالت کے بعد آپ کو دیوبند لایا گیا اور پھر اسی سرزمین پر آپ کا انتقال ہوا، اور یہیں مدفون ہوئے، عمر ساٹھ سال تھی، عمر زیادہ نہ تھی لیکن اس عمر مختصر کا بڑا حصہ قرآن وحدیث اور سنت نبوی کے مطالعہ اور فکر وتدبر میں گذرا، آپ نے اپنی ذہانت اور بے مثل قوت حافظہ اور سخت مجاہدہ سے حدیث میں وہ مقام حاصل کیا کہ حقہ میں علماء حدیث کی یاد تازہ کردی، مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب فتح الملهم في شرح مسلم نے فرمایا: اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے یا ابن دقیق العید سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے یا تم کو سلطان العلماء عزالدین بن عبدالسلام کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان ہستیوں سے ملاقات کا موقع ملا ہے، زمانہ کی گردشوں کا فرق ہے، ورنہ حضرت شاہ صاحب مرحوم اگر قدیم صدیوں میں پیدا ہوئے ہوتے تو سیر وسوانح میں ان کا ذکر انہیں مذکورہ اشخاص کے پہلو بہ پہلو کیا جاتا، علامہ اقبال نے کہا ہے کہ اسلام کی سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا: مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کے اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثل تھے، علم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر وسخن میں

بہرہ مند اور زہد وتقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شیدا نے قال اللہ وقال الرسول کا نعرہ بلند رکھا........ مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے، ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے، شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ یا قلمی ان کے مطالعہ سے بچی ہو، علامہ رشید رضا نے کہا کہ ما رأیت مثل ھذا الأستاذ الجلیل۔

علم کا احترام اور چند امتیازی خصوصیات:

علامہ انور شاہ صاحب کشمیری کے علم وفضل کے بارے میں ہندوستانی اور عرب علماء نے بہت کچھ لکھا انہیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی، رشید رضا اور علامہ اقبال کا اعتراف علم وفضل اور اعتبار کے لیے کافی ہے، اس سے قبل کہ حضرت شاہ صاحب کے علم وفضل اور تصنیفات کا تذکرہ کروں، ان کی خصوصیات وشمائل کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ چیزیں جبل العلم بننے اور قمۃ العلم تک پہنچنے کے لیے اساس کا درجہ رکھتی ہیں، آپ کی خصوصیات میں سے ایک چیز علم کا احترام بھی ہے، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے سات سال کی عمر کے بعد دین کی کسی کتاب کو بغیر وضو کے ہاتھ نہیں لگایا اور مطالعہ کے دوران کسی کتاب کو اپنے تابع نہیں کیا، اگر کتاب میرے سامنے رکھی ہوئی ہے اور حاشیہ دوسری جانب ہے تو ایسی کبھی نوبت نہ آئی کہ دوبارہ حاشیہ کی جانب کو گھما کر اپنے سامنے کرلیا بلکہ اٹھ کر اس جانب جا بیٹھتا ہوں، جدھر حاشیہ ہوتا، اس زمانہ میں جب کہ یہ احترام رخصت ہو چکا ہے اور لوگ خالص دینی کتابوں کا بھی اس طرح سے مطالعہ کرتے ہیں جیسے ناول اور افسانہ کا کرتے ہیں اور لیٹ کر پڑھنے کا رواج بھی عام ہو چلا ہے، حضرت شاہ صاحب کے تذکرہ میں خصوصیت کے ساتھ اس خصوصیت کے تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، مولانا انور شاہ صاحب کے معروف تلامذہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا محمد شفیع، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا منظور نعمانی کے اسماء گرامی ہیں، علم دین کے سلسلہ میں احترام اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے کہ جو

لوگ علم دین کو ثروت حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں ان کی مثال اس شخص کی ہے جو بازار سے قیمتی شال خرید کر لاتا ہے اور اس سے جوتے صاف کرنے کا کام لیتا ہے۔ علم حدیث سے مسلسل اشتغال کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کے کردار میں بعض شمائل نبوی کی جھلک ملتی تھی، آپ کی رفتار اور چال کے انداز کو دیکھ کر لوگوں کو شمائل ترمذی کی وہ حدیث یاد آجاتی ہے جس کے الفاظ ہیں "کانما ینحط من صبب" اس طرح حدیث میں آتا ہے "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت" چنانچہ حضرت شاہ صاحب بھی بہت زیادہ خاموش رہتے اور یہ صفت ان کی اتنی نمایاں تھی کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے بارے میں یہ کہا کہ کم سخن اور وسیع النظر عالم تھے، آج کل جس مجلس بے تکلف میں بیٹھئے تھوڑی دیر میں وہ مجلس غیبت وغزل کی مجلس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

غزل کی حد تک کوئی مضائقہ نہیں لیکن غیبت کے جراثیم سے محفوظ رہنا مشکل ہو گیا ہے، حضرت شاہ صاحب کے ایک شاگرد مولانا منظور نعمانی صاحب کہتے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ کا جو بندہ اس دور میں غیبت سے محفوظ رہا وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے، اور یہ اس کی بڑی کرامت ہے، میں نے حضرت استاذ کو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے ان کی زبان کو اس طرح محفوظ کیا تھا کہ کبھی اشارہ کنایہ میں بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سنتا یاد نہیں، بلکہ یاد ہے کہ حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا۔

درس حدیث کی خصوصیت:

یہ موقع نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کے اخلاق وخصوصیات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا جائے، اب حضرت شاہ صاحب کی درس حدیث کی خصوصیت کا تذکرہ مناسب ہوگا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں درس حدیث اور تعلیم واشاعت حدیث کا باقاعدہ نظام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مرہون منت ہے کہ انہوں نے ہندوستان کو اس فن اور علوم حدیث سے پورے طور پر واقف کرانے کے لیے حجاز کا سفر کیا اور وہاں تعلیم واستفادہ کے بعد ہندوستان ان علوم کی اشاعت کے لیے تشریف لائے، شاہ ولی اللہ صاحب کی درسگاہ دہلی کے بارے میں لوگ روایت کرتے ہیں کہ

مدینہ منورہ میں حدیث کی مشہور اور امہات الکتب کو ایک ہی سال میں پورا کر دیا جاتا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ نے اسی طریقہ کا تتبع کیا اور صحاح ستہ کو ایک سال کے اندر پڑھانے کا رواج شروع کیا، اسی کی نقل میں یہ دارالعلوم دیوبند میں شروع ہوا اور یہ طریقہ حضرت انور شاہ صاحب نے شروع کیا، دورۂ حدیث کے سال سے پہلے مشکوٰۃ بغیر سند کے پڑھائی جاتی تھی اور صرف متن کی تشریح ہوتی ہے لیکن صحاح ستہ کا مقصد صرف متن کی تشریح کے لیے نہیں، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سند متصل کرنے کے لیے پڑھائی جاتی تھی، طالب علم حدیث پڑھتا اور شاہ صاحب ان کو سنتے، درمیان میں جہاں کہیں تشریح کی ضرورت ہوتی تشریح بھی کرتے۔

حضرت انور شاہ صاحب کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے درس میں قرآن وحدیث سے فقہ حنفی کو مدلل کرتے جاتے اور غالباً حضرت شاہ صاحب کو یہ خیال رہا ہوگا کہ اس پیدا کردہ غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے کہ فقہ حنفی محض قیاس ورائے کا مجموعہ ہے، اور اس کی پشت پر سنت وحدیث کا وزن نہیں ہے، ایک حلقہ خاص کی طرف سے جسے تقلید سے انکار تھا یہ کہا جا رہا تھا کہ ابوحنیفہؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علی الرغم اپنی ذاتی رائے اور قیاس پر اسلامی شریعت کا ایک نیا نظام قائم کیا ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کہنے کے بجائے ابوحنیفہؒ کی شریعت کہنا زیادہ صحیح ہوگا، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی جن کے علم وفضل سے اردو دنیا واقف ہے، درس کی ایک خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ درس کے دوران معلومات کا طوفان متلاطم ہوتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ علم کا ایک بحر بیکراں میرے دل ودماغ کے ساحلوں سے ٹکرا رہا ہے، حضرت شاہ صاحب کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی، سائنس الغرض تمام علوم جدیدہ پر مشتمل ہوتا، متن حدیث کی معانی وبلاغت کے ساتھ ساتھ اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے موضوع پر بھی کلام فرماتے اور اس موضوع کی جزئیات تک ان کے حافظہ میں مستحضر ہوتیں، درس کے وقت صحاح ستہ، ان کے علاوہ حدیث کی کتابیں سامنے موجود رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو

کسی حدیث کا حوالہ دینا پڑتا تو صرف زبانی حوالہ پر اکتفانہیں فرماتے تھے، اس کے علاوہ احکام شریعت کے اسرار وحکم پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی اور اپنے درس میں شریعت کے اسرار وحکم کو کھول کر بیان کرتے ، آپ کا کہنا تھا کہ اسلام کا سب سے پہلا مطالبہ ایک مسلمان سے احکام کی بے چوں و چرا اطاعت ہے، اسی لیے قرآن وحدیث دونوں نے اسرار وحکم کے موضوع پر زیادہ توجہ نہیں کی، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اسلامی تعلیمات کا متن باجمال ایک دوسرے کی تفصیل اور شرح ہے، قرآن مجید کے اجمال کی تفسیر حدیث ہے اور حدیث میں جو اجمال ہے اس کے ایک جز ء کی شرح فقہ نے کی ہے اور دوسرے جز ء کی شرح تصوف وسلوک نے ، الغرض اسلام میں نہ فقہاء سے بے نیازی برتی جاسکتی ہے اور نہ صوفیاء سے۔

اجتماعی اور سیاسی معاملات میں حدیث وسیرت سے رہنمائی:

مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی معاملات خواہ ان کا تعلق آزادی کی تحریک سے ہو یا مسلمانوں یا غیر مسلموں کی ملی جلی حکومت سے، ان کو حدیث اور سیرت کی روشنی میں دیکھتے تھے، جب ان سے سوال کیا گیا کہ ملک کی آزادی کے لیے غیر مسلم فرقوں سے اشتراک کار کے لیے کوئی معاہدہ کیا جاسکتا ہے تو اس کے جواب میں آپ نے شرعی بنیاد کے طور پر اس معاہدہ کا تذکرہ کیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے تحفظ کے لیے یہود سے کیا تھا اور تاریخ سے مسلمانوں کے ایفائے عہد اور معاہدوں کی پاسداری کے قصے سناتے اور یہ کہا کہ مسلمان احکام اسلام اور حدود شریعت بیضاء میں رہتے ہوئے ایسے معاہدے کا سب سے پہلے خیر مقدم کریں گے بلکہ اپنے مذہبی احکام کے بموجب وہ معاہدہ کے بعد قوم کے جان ومال اور عزت وآبرو کے محافظ ثابت ہوں گے ، ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں رہنے کے لیے مسلمانوں کے لیے شرعی حدود وقیود پر روشنی حضرت شاہ صاحب کے اس قول سے ملتی ہے:

”میں یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی یہ چاہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹ کر یا آگے بڑھ کر کوئی معاہدہ کرے تو یہ ناممکن ہے بلکہ اگر مسلمان کی کوئی

جماعت مذہب سے ناواقفیت یا دہشت کی وجہ سے ایسا معاہدہ کرے بھی تو وہ قابل قبول ہوگا اور نہ قدرتی طور پر اس میں استحکام پیدا ہو سکتا ہے"۔

حضرت شاہ صاحب کی اس عبارت سے یہ واضح ہے کہ مسلمانوں کو کسی ایسے ملک میں جہاں غیر مسلموں کے ساتھ وہ رہتے اور ملک کا نظام چلاتے ہوں، یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ان حقوق کا مکمل تحفظ کریں جن کے ذریعہ انہیں دینی احکام پر عمل کرنے کی آزادی باقی رہے، اور کسی ایسے ملک میں رہنے کا یہی جواز ہے، حب وطن کی دینی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

''ہمیں ہندوستان سے ایسی ہی محبت ہے جیسے کہ ایک سچے محب وطن کو ہونا چاہیے، ہمارے سامنے آقائے کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسوہ موجود ہے کہ آپ نے کفار کے ظلم وستم سے مجبور ہو کر بحکم خداوندی جب اپنے محبوب وطن مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ اے مکہ خدا کی قسم روئے زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، اگر تیرے باشندے مجھے نہ نکالتے تو میں تجھے کبھی نہیں چھوڑتا، اور جب مدینہ جو دارالہجرت تھا آپ کا وطن ثانی بن گیا تو آپ نے مدینہ کی ترقی، خوشحالی، آب وہوا کی خوشگواری، سامان معیشت میں عظیم برکتوں کے لیے دعا کی اور فرمایا: خدایا مدینہ کو ہمارے قلوب میں ایسا محبوب بنادے جیسا کہ ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں، بلکہ مکہ کی محبت سے بھی زائد مدینہ کا تعلق عطا فرما اور مدینہ کی برکات کو مکہ معظمہ کی برکات سے بھی کئی گنا زائد فرمادے، پھر آپ نے فرمایا: سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات حب وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہو کر اس جذبۂ حب وطن سے خالی ہو۔

حضرت شاہ صاحب ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک شرعی تنظیم کو ضروری سمجھتے تھے ایک بار انھوں نے یہ فرمایا کہ:

''ہندوستانی صوبوں میں صوبۂ بہار قابل مبارکباد ہے کہ اس نے امارت شرعیہ کا ایک نظام قائم کر رکھا ہے، اور اس کے ماتحت بہت سے مفید قومی اور مذہبی امور انجام پا رہے ہیں، اگر دوسرے صوبے بھی اس فریضہ کی اہمیت کا احساس کریں اور اس کی ادائیگی میں لگ جائیں تو ان کی اجتماعی قوت

سے ہر صوبہ کی مقامی حیثیت بھی قوی ہوگی اور ہندوستان میں ایک منظم محکمہ شرعیہ قائم ہوجائے گا۔

مشکلات القرآن:

حضرت شاہ صاحب اصلاً محدث اور تدریس کے میدان کے آدمی تھے، وفورِ علم، وسعت مطالعہ اور غیر معمولی تبحر کے باوجود تصنیف وتالیف کے قواعد وضوابط اور اسلوب وانشاء کے پابند نہ تھے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے کوئی اپنی کتاب مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کو سنائی تو مرحوم نے سن کر عجیب تبصرہ فرمایا اور وہ یہ کہ شاہ صاحب اس کی شرح بھی لکھ دیجئے تا کہ اساتذہ بھی (طلبہ نہیں) اس سے استفادہ پر قادر ہوسکیں، حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات میں ایک اہم تصنیف مشکلات القرآن ہے، قرآن سے آپ کے ذوق وشوق کا یہ حال تھا کہ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کھول کر بیٹھتا ہوں تو اس کی بلاغت واعجاز معانی وجزالت وشوکت میں محویت اس قدر ہوتی ہے کہ ایک آیت سے بھی آگے نہیں بڑھتا، حضرت شاہ صاحب نے مشکلات القرآن میں مشکل آیات کی تفسیر بیان کی ہے یا تفسیر کے سلسلہ میں تفسیری کتب کی نشاندہی کی ہے، آپ کی وفات کے بعد مجلس علمی ڈابھیل نے اس کو مکمل شائع کردیا، دوسو بیس صفحہ کی یہ کتاب آپ کے نامور شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری کے طویل مقدمہ کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئی، مولانا بنوری نے چوراسی صفحہ کے طویل مقدمہ میں صاحب کتاب کی مختصر سوانح، قرآن سے ان کا غیر معمولی شغف، حقائق قرآن مجید پر مجتہدانہ بصیرت، اعجاز قرآن کے بارے میں مرحوم کے خصوصی نظریات کو بیان کرنے کے ساتھ قدیم جدید تفاسیر پر واقف کارانہ گفتگو کی ہے۔

تصنیفات حدیث:

حدیث میں حضرت شاہ صاحب مرحوم کی سب سے اہم کتاب فیض الباری فی شرح البخاری ہے، اس کتاب کی خصوصیات یہ ہیں: (۱) اس میں بخاری کی ترجمۃ الابواب کی تشریح وتوضیح ہے (۲) ان مخفی گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے جن کی طرف امام بخاری نے اشارے کیے ہیں (۳) شارحین بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی اور بدر الدین عینی کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، کہیں ان دونوں کے درمیان

محاکمہ ہے اور ان کے خیالات کی علمی تنقید اور اپنے خیال کی وضاحت (۴) شرح حدیث کے ذیل میں مصادر اور امہات کتب کا تذکرہ اور ان کا حوالہ فیض الباری درحقیقت املائی تقریریں ہیں جن کو ان کے شاگرد رشید جان السنۃ کے مصنف مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

حدیث میں ان کی دوسری کتاب العرف الشذی فی شرح الترمذی ہے، اہل نظر جانتے ہیں کہ فقاہت اور سند کے اعتبار سے ترمذی بخاری اور مسلم کے درجہ کی کتاب نہیں لیکن حدیث کے اس مجموعہ کی اہمیت فقہی اعتبار سے ہے، اور اسی لیے بہت سے دینی اداروں میں اس کتاب سے غایت درجہ اعتناء برتا جاتا ہے، حضرت شاہ صاحب ترمذی کے درس میں امام ابوحنیفہ کے افکار وعقائد اور علماء اسلام کے اقوال کا شرح وبسط کے ساتھ تذکرہ کرتے، ان کی تقریروں کو ان کے نامور شاگرد مولانا محمد چراغ صاحب نے منضبط کیا اور مرتب کر کے شائع کیا، یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

اسی طرح سنن ابوداؤد پر حضرت شاہ صاحب کے درسی افادات کو انوار المحمود کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس کے علاوہ علامہ شوق نیموی کی کتاب آثار السنن طبع ہونے سے پہلے حضرت شاہ صاحب کی نظر سے گذری، شاہ صاحب نے کچھ اضافے بھی کیے اور منظوم خراج تحسین پیش کیا، یہ قصیدہ کتاب کی طبع اول میں شامل ہے، کتاب کے طبع ہونے کے بعد آپ نے پھر تفصیلی حاشیہ لکھا، جس میں احناف کے مؤیدات کو اس کثرت سے جمع کیا گیا ہے کہ وہ حواشی خود ایک خزانہ علم ہیں۔



فن حدیث میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مرتبہ ومقام اوران کی خدمات

از: مولانا محمد زید مظاہری ندوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

احادیث مبارکہ اورارشادات نبویہ جن کی شان میں حق تعالیٰ کا فرمان ہے " وما ینطق عن الهوى إن هو إلا وحی یوحی" کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بات بھی صادر ہوتی ہے وہ ہوائے نفس سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہوتی ہے، جن کے الفاظ ومعانی سب منجانب اللہ القاء کیے ہوتے ہیں، ان احادیث میں ایک تو ان کے الفاظ ہوتے ہیں اور ایک ان کے معانی ومفاہیم، الفاظ حدیث کو ہم روایۃ الحدیث سے تعبیر کر سکتے ہیں اور معانی حدیث کو درایۃ الحدیث سے یا فقہ الحدیث سے جو حدیث پاک کا اصل مقصد ہیں۔

یہ ایک واقعہ اور مسلمہ حقیقت ہے کہ مخبر صادق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں تضاد یا خلاف واقعہ کوئی بات نہیں ہو سکتی لیکن بظاہر بہت سی احادیث وآثار ایسے نظر آتے ہیں جن کے ظاہری معنی کے پیش نظر کہیں خلاف واقعہ کا شبہ ہوتا ہے، کہیں تضاد نظر آتا ہے اور کہیں دوسرے نوع کے اشکالات واعتراضات پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا احادیث مبارکہ کی ایسی تشریح اور ایسے معانی ومطالب بیان کرنا جس سے حدیث پاک کا مطلب ومصداق بھی واضح اور متعین ہو جائے اور کسی نوع کا کوئی اشکال وتضاد بھی نظر

نہ آئے اور خلاف عقل یا خلاف واقعہ کا بھی شبہ نہ پیدا ہو، اسی کا نام ہے درایۃ الحدیث وفقہ الحدیث۔

تیرہویں چودہویں صدی میں علماء ہند میں بکثرت ایسے لوگ پائے گئے ہیں جن کو اللہ پاک نے یہ بلند مرتبہ ومقام نصیب فرمایا ہے، ان میں سب سے ممتاز اور نمایاں مقام ہم کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا نظر آتا ہے، جن کے بعض نمایاں کارناموں کا تذکرہ شیخ الاسلام علامہ زاہد الکوثریؒ نے اپنے مقالہ "حظ العلماء الهندية في خدمة الأحاديث النبوية"[۱] میں کیا ہے، اور حضرت تھانویؒ کی شان میں یہ بلند کلمات تحریر فرمائے ہیں:

العلامة الأوحد، والحبر المفرد، شيخ المشايخ في البلاد الهندية، المحدث الكبير، الجهبذ الناقد البصير، مولانا حكيم الأمة محمد أشرف علي التهانوي صاحب المؤلفات الكثيرة.

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو ایسا فہم اور ایسی بصیرت عطا فرمائی تھی کہ آپ احادیث مبارکہ کی ایسی حکیمانہ تشریح فرماتے تھے جس سے پیش آنے والے سارے اعتراضات کا جواب بھی ہو جاتا، تضاد بھی ختم ہو جاتا، خلاف واقعیت کا یا خلاف عقل کا شبہ بھی دور ہو جاتا اور حدیث کے معنی ومطلب بالکل واضح متعین طور پر پورے مصداق کے ساتھ منطبق نظر آتے تھے، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ترمذی شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"رحم الله عمر، يقول الحق وإن كان مرًّا تركه الحق وماله من صديق"

(مشکوٰۃ شریف باب مناقب العشرۃ ص ۵۶۷ ج ۲)

اللہ تعالیٰ عمر پر رحم فرمائے کہ وہ حق بات کہہ ڈالتے ہیں خواہ تلخ ہی ہو، اس حق گوئی کی بدولت ان کا کوئی دوست نہیں رہا"۔

اس حدیث پاک میں تین شبہے پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کیا دوسرے صحابہ حق گو نہ تھے؟

[۱] موصوف کا یہ مقالہ مصر میں مجلۃ "الاسلام" میں ۱۳۷۳ھ میں شائع ہوا تھا۔

دوسرا یہ کہ کیا عمر رضی اللہ عنہ کا کوئی دوست نہ تھا؟ تیسرا یہ کہ کیا حضرات صحابہ بھی حق گوئی کو برا سمجھتے تھے، اب دیکھئے حکیم الامت تھانویؒ نے ان تینوں شبہوں کا ازالہ محض قوسین میں ترجمہ کی معمولی تشریح سے کس طرح فرمادیا، فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرمائے عمر پر، وہ حق بات کہہ دیتے ہیں اگر چہ کسی کو (عقلاً یا کسی کو طبعاً) تلخ (وناگوار) معلوم ہو (یعنی ان میں یہ صفت ایک خاص درجہ میں غالب ہے، اس درجہ کی حق گوئی نے ان کی یہ حالت کردی کہ ان کا کوئی (اس درجہ) کا دوست نہیں رہا (جیسا تسامح و رعایت کی حالت میں ہوتا ہے) آگے مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس غلبہ کا مصداق یہ ہے کہ حق کے درجات متفاوت ہوتے ہیں، ایک درجہ یہ ہے کہ اس کا اظہار واجب ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ اولیٰ یا مباح ہوتا ہے، سو پہلا درجہ تو سب صحابہ میں بلکہ سب اہل حق میں مشترک ہے، اور دوسرے درجہ کے اعتبار سے بزرگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں، بعض مروت یا تسامح کو مصلحت پر ترجیح دے کر سکوت فرماتے ہیں، بعض مصلحت کو مروت پر ترجیح دے کر کہہ ڈالتے ہیں، پہلا درجہ غلبہ کا ہے، دوسرا درجہ اتصاف کا ہے۔

دوسرے (اشکال) کا جواب یہ ہے کہ دوستی کے ایک خاص درجہ کی نفی مقصود ہے یعنی اگر حضرت عمر مروت کو مصلحت پر غالب رکھ کر طرح دے جاتے اس میں ان کے جیسے دوست ہوتے ویسا اب نہیں رہے۔

تیسرے (اشکال) کا جواب یہ ہے کہ طبعی تلخی وناگواری اور اس کے مقتضا پر عمل نہ ہونا یہ خیریت کے منافی نہیں، باقی ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں ہوتے ہیں جن کو عقلی تلخی بھی ہوتی ہے اگر چہ اس وقت ایسے اقل قلیل تھے، میری مخفی توضیحات میں ان سب کی طرف قریب بصراحت اشارات ہیں، انتہیٰ بلفظہ۔ (اشرف السوانح ص ۶۱، ۶۲، ج ۲)

۲۔ دوسری مثال حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (صاحب بذل المجہود شارح ابوداؤد) نے فرمایا کہ ترمذی میں یہ حدیث ہے ''لن یغلب اثنا عشر الفاعن قلۃ'' یعنی بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر قلت تعداد کی وجہ سے کبھی دشمنوں کے مقابلہ میں مغلوب

نہ ہوگا، اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کیوں کہ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ بارہ ہزار کیا بارہ ہزار سے کہیں زائد تعداد کے لشکر اپنے دشمنوں سے شکست کھا گئے، حضرت مولانا کی برکت سے میرے ذہن میں جواب آ گیا (آگے حضرت تھانویؒ کا جواب سنئے)

میں نے عرض کیا کہ حدیث شریف کا مضمون بالکل بے غبار ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عن قلۃ فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قلت کی وجہ سے مغلوب نہ ہوگا، عن علۃ نہیں فرمایا کہ کسی اور سبب سے بھی مغلوب نہ ہوگا، لہٰذا جہاں بارہ ہزار یا بارہ ہزار سے زائد لشکر شکست کھا گئے اس کی وجہ قلت نہیں بلکہ کوئی دوسری علت ہوگی، چنانچہ اس کی تائید کتب حدیث و تاریخ سے بھی ہوتی ہے، بلکہ قرآن شریف میں بھی غزوہ حنین میں اولاً مغلوب ہونا صراحتہ مذکور ہے حالاں کہ غزوہ حنین میں مسلمان بارہ ہزار تھے، لیکن پھر بھی مغلوب ہو گئے اور اس کی وجہ قلت نہیں تھی بلکہ ایک قلبی مرض یعنی خود پسندی و عجب تھا جس کا تذکرہ قرآن شریف میں ہے، حاصل یہ کہ مسلمانوں کو غزوہ حنین میں عجب و غرور پیدا ہو گیا تھا کہ ہم اتنے زائد ہیں اسی عجب کی وجہ سے شکست ہوئی، اور جب اس گناہ سے توبہ کر لی اور معافی مانگ لی تو اسی میدان میں یہ ہزیمت خوردہ لشکر غالب آ گیا۔

(اسعد الابرار سفر نامہ لاہور: ص ۳۶۴ - اسلامی حکومت: ص ۵۰۴)

۳۔ تیسری مثال صحیحین کی روایت ہے کہ جس کو نکاح کرنے کی استطاعت ہو نکاح کرلے اور جس کو نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو اس کے لیے حکم ہے علیہ بالصوم کہ روزے رکھے۔

(بخاری و مسلم)

اس کے بعد اس حدیث پاک کے متعلق حضرت تھانویؒ کا کلام سنئے، فرماتے ہیں:

"ایک شخص میرے پاس آیا: اس پر خواہش نفسانی کا غلبہ تھا مگر غریب نادار تھا، اتنی قدرت نہ تھی کہ وہ نکاح کر سکے، اس نے آ کر مجھ سے اپنی حالت بیان کی اور علاج کا طالب ہوا، ابھی میں اس کو جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ میرے بولنے سے قبل اس کی گفتگو سنتے ہی آپ (ایک عالم صاحب) بولے کہ روزے رکھا کرو کیوں کہ حدیث میں آیا ہے "ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم" یعنی جو شخص

نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کو روزے رکھنا چاہیے، اس شخص نے جواب دیا کہ میں نے روزے بھی رکھے تھے مگر اس سے بھی میری خواہش کم نہیں ہوئی، اس کا یہ جواب سن کر ان صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا...... میں نے ان صاحب کو سنا کر اس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے کتنے روزے رکھے تھے؟ اس نے کہا دو روزے رکھے تھے، میں نے کہا: یہی وجہ ہے کہ تم کو کامیابی نہیں ہوئی، کیوں کہ تم کو کثرت سے روزے رکھنے چاہیے تھے، اور یہ شرط خود اس حدیث پاک سے ثابت ہے اور وہ اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فعلیہ بالصوم، لفظ علیٰ لزوم کے لیے آتا ہے اور لزوم کی دو قسمیں ہیں ایک لزوم اعتقادی دوسرے عملی مگر دلائل سے یہاں لزوم اعتقادی تو مراد ہو نہیں سکتا، کیوں کہ یہ صوم فرض نہیں محض علاج ہے بس لزوم عملی مراد ہوگا اور لزوم عملی ہوتا ہے کثرت وتکرار سے، چنانچہ جب کوئی شخص کسی کام کو بار بار اور کثرت سے کرتا ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ کام اس نے اپنے او پر عملی طور پر لازم کر لیا ہے، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ کثرت سے روزے رکھو، اور مشاہدہ ہے کہ قوت بہیمیہ کے انکسار کے لیے تھوڑے روزے کافی نہیں بلکہ کثرت صوم پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شروع رمضان میں ضعف نہیں ہوتا اور آخر رمضان میں ضعف ہو جاتا ہے، وہ سائل تو چلا گیا مگر مجتہد صاحب پھر کچھ نہیں بولے۔ (الافاضات الیومیہ: ج۹ ص ۱۶۵ و ج ۱۰ ص ۲۲۱)

۴۔ حضرت تھانویؒ کی درایت حدیث سے متعلق ایک مثال اور لیجئے، فرماتے ہیں:

''حدیث پاک میں روزہ کے ثواب کے متعلق آیا ہے وانا اجزی بہ یعنی میں اس کا بدلہ دوں گا، اور ایک نسخہ وانا اجزیٰ بہ مجہول صیغے سے بھی مشہور ہے، یعنی اس کا بدلہ یہ ہے کہ میں اس کو ملوں گا، اگر چہ یہ مضمون فی نفسہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ اس کے بدلہ میں مل جائیں گے مگر غلطی یہ ہے کہ اس مضمون کو اس حدیث سے نکالا جاتا ہے، جو شخص ذرا بھی عربیت سے تعلق رکھتا ہوگا وہ ہرگز اس سے یہ معنی نہ سمجھے گا، اس لیے کہ عربیت کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''میں بدلہ دیا جاؤں گا'' یعنی نعوذ باللہ مجھ کو کوئی جزا دے گا، نہ یہ کہ میں جزاء میں مل جاؤں گا، یہ اس کا ترجمہ نہیں ہے، پس یہ نسخہ غلط ہے، صحیح وہی ہے

انا اجزی بہ یعنی میں اس کو جزا دوں گا اور روزہ کی فضیلت یہ کیا کچھ کم ہے کہ فرماتے ہیں کہ میں جزا دوں گا،
باقی فی نفسہ یہ مضمون صحیح ہے کہ حق تعالیٰ اس کے بدلہ میں مل جائیں گے۔ (الصوم ص ۱۳۰)

۵۔ پانچویں مثال: حضورؐ نے فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلی غذا زمین کی روٹی ہوگی، حق تعالیٰ زمین کی روٹی بنا کر جنت والوں کو کھلا دیں گے، ظاہراً اس حدیث پر کوئی ہنسے گا کہ اچھے جنت میں گئے کہ ڈھیلے اور پتھر کھانے کو ملے، اس سے تو دنیا ہی میں اچھے تھے، وہاں تو روٹی کھاتے تھے اور یہاں ڈھیلے اور پتھر نصیب ہوئے، کسی کے حصہ میں کوہ منصوری کا پتھر اور کسی کے حصے میں کوہ شملے کا، اچھے جنت میں آئے کہ ایسی چیزیں کھانی پڑیں، اس حدیث کی شرح بجز اہل اسرار اور اہل اللہ کے اور کوئی نہیں کر سکتا، اس کی شرح سن کر آپ کو اہل اللہ کی قدر معلوم ہوگی، کہ حق تعالیٰ نے ان کو ایسا فہم دیا ہے، حقیقت میں ظل اللہ فی الارض کا لقب پورا ان ہی حضرات پر صادق ہے، سو وہ حضرات یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں اچھی سے اچھی کھا رہے ہیں، اور اچھے سے اچھے کپڑے پہن رہے ہیں، یہ کہاں سے آئے؟ زمین ہی سے تو نکلے، اگر اونی کپڑے ہیں تو اون ہوتی ہے حیوانات سے اور حیوانات نے زمین ہی کے اجزا کھائے ہیں، جن سے وہ اون پیدا ہوئی ہے، غرض جس چیز کو بھی لیجئے گا اجزائے زمین ہی اس کی حقیقت نکلے گی، زمین میں پانچ سیر گیہوں ڈالے تھے اور پیدا ہوئے پانچ من، وہ پانچ سیر سے زیادہ جو پیدا ہوئے وہ زمین ہی کے تو اجزا ہیں، انہی کی تو صورت بدل گئی ہے، یا انبہ کا درخت نکلا اور اس میں ہزاروں انبہ پیدا ہوئے، یا غلہ پیدا ہوا، یا کسی قسم کا پھل اترا، سب زمین ہی کے تو اجزا ہیں، عناصر سے مرکب ہو کر جس میں جزو غالب ارضی ہے، اس شکل سے نمودار ہو گئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے اندر سب چیز موجود ہے، بس یہ کہنا غلط ہو گیا کہ زمین میں بس ڈھیلے اور پتھر ہی ہیں، زمین میں انار بھی ہیں، انگور بھی ہیں، کھٹائی بھی، مٹھائی بھی، سب چیزیں زمین کے اندر موجود ہیں، ہر طرح کا مادہ اس میں رکھا ہوا ہے، یہ وہی مادہ ہے جو ان رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ زمین کے اندر سب کچھ ہے، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے یہاں مہمان ہو کر جاتا ہے تو اس کو بے چھنا آٹا تک نہیں کھلاتے اور لوگ جائیں گے خدا کے

مہمان ہو کر تو اللہ تعالیٰ پر یہ گمان کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کو بے چھپا کھلا دیں گے، بس وہ اپنی خدمت کی مشین سے شملہ اور منصوری کے پتھر میں جو فضلہ ہے الگ کر دیں گے، اور ان میں جو اجزا قابل کھانے کے ہیں وہ رہنے دیں گے، اب اس تقریر سے کچھ بھی شبہ نہیں رہتا (میں کہتا ہوں کہ زمین کی روٹی کے برابر کوئی چیز مزہ دار ہو ہی نہیں سکتی، اس لیے کہ دنیا میں جتنے بھی مزے ہیں سب زمین ہی کا طفیل ہے، خوشبوئیں جس قدر بھی ہیں زمین ہی سے پیدا ہوئی ہیں، اس سے جو روٹی تیار ہوگی ظاہر ہے کہ اس میں ہزاروں قسم کے تو مزے اور ہزاروں قسم کی خوشبوئیں ہوں گی لہٰذا اس کی روٹی سے کون سی چیز مزہ دار ہو سکتی ہے۔ (از مرشدی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہم: ایضاص ۴۷)

چھٹی مثال: حدیث میں ہے لعن الله السارق يسرق البيضة فتقطع يده ويسرق الحبل فتقطع يده یعنی اللہ چور پر لعنت کرے کہ وہ ایک انڈا چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور ایک رسی چراتا ہے، اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اس حدیث میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ ایک انڈا چرانے سے یا رسی چرانے سے ہاتھ کہاں کاٹا جاتا ہے، ہاتھ کاٹنے کا نصاب تو اس سے زیادہ ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انڈے اور ایک رسی پر ہاتھ کاٹنے پر فرما رہے ہیں، ہمارے (یعنی حنفیہ) کے نزدیک قطع ید کا نصاب دس درہم ہیں، دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کی اور مقدار ہے، بہر حال مذاہب متبوعہ میں کوئی ایسا نہیں کہ جس کے نزدیک اس کا کوئی نصاب نہ ہو اور انڈے اور رسی چرانے پر اہل مذاہب متبوعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی قطع ید نہیں آتا، اس لیے اس حدیث کو مؤول کرنا واجب ہوا، کہ اس کو ظاہر سے منصرف کیا جاوے، پس بعض نے کہا کہ بیضہ سونے کا مراد ہے، جس کی قیمت نصاب سے بھی زائد ہے اور بعض نے کہا کہ بیضہ سے مراد خود ہے، خود لوہے کی ٹوپی ہوتی ہے جس کو سر پر پہن لیتے ہیں تاکہ تلوار اثر نہ کرے، وہ اتنی قیمت کی ہو سکتی ہے، بعض نے کہا ہے کہ اتنی حقیر چیز پر قطع ید ابتدائے اسلام میں تھا، پھر منسوخ ہو گیا، یہ سب بعید تاویلیں ہیں، ہمارے استاذ نے جو تاویل فرمائی وہ جی کو لگتی ہوئی ہے، اور ظاہر حدیث سے کچھ بھی بعید نہیں، تو جب تک کہ متبادر معنی بن سکیں غیر متبادر کی طرف کیوں جائیں، میرے استاذ فرماتے تھے کہ حدیث میں بیضہ اور حبل کے وہی معنی مراد ہیں جو متعارف ہیں، بس انڈا اور

رہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس سے معصیت کی عادت ہوتی ہے اور بڑی معصیتوں کا باب کھلتا ہے، جو چور بدمعاش ہوتے ہیں وہ اول چوری پیسہ سے شروع کرتے ہیں، جب وہ کھپ گیا آگے جرأت ہوئی پھر اور آگے چلے، یہاں تک کہ ایک روز اس کی نوبت پہنچی کہ ہاتھ کاٹ دیا گیا، یعنی کسی زمانہ میں انڈا یا رسی چرائی تھی آج یہاں تک نوبت پہنچی کہ اتنا مال چرایا، کہ جس پر قطع ید کا حکم آ گیا، یہ مطلب ہے اس حدیث کا (احکام المال ص ۲، اشرف البیان: ص ۱۰۶)

یہ چند مثالیں بطور نمونہ کے عرض کی گئی ہیں ورنہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس نوع کی تشریحات کو اگر جمع کیا جائے جو ان کی تصانیف اور مواعظ میں منتشر ہیں تو کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، بعض اہل علم نے ''اشرف البیان فی علوم الحدیث والقرآن'' کے نام سے ایک رسالہ میں ان کو جمع بھی کیا ہے جو بہت مفید اور مختصر ہے۔

(اس کے متعلق حضرت سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں ''افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو اس کے کئی حصے مرتب ہو سکتے تھے۔)

علامہ سید سلیمان ندویؒ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے فن حدیث میں علو مرتبت اور خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو علوم الحدیث میں جو مہارت حاصل تھی اس کی شہادت ان کے مواعظ و رسائل و تالیفات کے ہزاروں صفحات دے رہے ہیں جس میں بے شمار احادیث کے حوالے، اشارے اور تلخیصات، ان کے مشکلات کی شرح، ان کے دقیق مطالب کے حل اور ان کے نکات و لطائف کا بیان ہے، خصوصیت کے ساتھ شیخ کے مواعظ میں جو زبانی تقریریں ہیں، برمحل حدیثوں کے حوالے اس کثرت سے ان میں ہیں کہ ان کو دیکھ کر کسی انصاف پسند کو ان کے حافظ الحدیث ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا''۔

اس کے بعد ان کی تصانیف کو لیجئے جو کہ فقہ و فتاویٰ اور احکام و مسائل یا اصلاح رسوم اور سلوک میں ہیں، لیکن ان کی بنیاد احادیث پر ہے، ان میں احادیث کے حوالے، دلائل کی مضبوطی اور صحت بیان کی تائید و شہادت کے لیے آئے ہیں، جو مؤلف کے علم و معرفت پر دلیل قاطع ہیں۔

اس کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فنِ حدیث سے متعلق حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے نمایاں کارناموں کا ذکر فرمایا ہے ان میں چند یہ ہیں، فرماتے ہیں:

۱۔ حضرت حکیم الامت کو فنِ سلوک کی تجدید کی جو توفیق عنایت ہوئی تھی اس کا ایک مبارک اثر یہ ہے کہ حضرت نے احادیث کی کتابوں سے ان تمام حدیثوں کو یکجا فرمایا جن میں اس فنِ شریف کے مسائل متفرق تھے، اگرچہ بعض حضرات نے اپنی کتابوں میں بعض ابواب زہد و رقاق کا تذکرہ کیا ہے تاہم ان کی حیثیت فن کی نہیں۔

اہل سلوک نے جن روایات و احادیث سے کام لیا ہے وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع تک ہیں، اسی لیے علماء سلوک کو اس فن میں کمزور سمجھا گیا ہے، اور اسی بناپر اہل حدیث و روایت نے یہ برخود غلط خیال قائم کرلیا ہے کہ فنِ سلوک اور اس کے مسائل احادیث نبوی سے ثابت نہیں، اور صدیوں سے ان کا یہ اعتراض قائم تھا، گو بعض محدثین نے ادھر توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں کچھ کام انجام دیا، حضرت حکیم الامت نے اس کام کو مستقل طور سے انجام دیا، اور "حقیقة الطریقة من السنة الأنیقة" اور "التشرف بمعرفة أحادیث التصوف" کے نام سے دو کتابیں تالیف فرمائیں۔

۱۔ **حقیقة الطریقة**: میں تین سو احادیث سے جو عموماً صحاح میں مذکور ہیں سلوک و تصوف کے مسائل کو مستنبط کیا گیا ہے اور ان کو اخلاق، احوال، اشغال، تعلیمات، علامات، فضائل، عادات وغیرہ، دس ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے، یہ اہل علم کے مطالعہ کی خاص چیز ہے۔

۲۔ **التشرف بمعرفة أحادیث التصوف**: یہ کتاب چار حصوں میں ہے، ان میں ان احادیث کی تحقیق ہے جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیاء کے کلام میں آتی ہیں، اور یہ دکھایا ہے کہ اصول و فنِ حدیث کی رو سے یہ حدیث کس درجہ کی ہے اور حدیث کی کس کتاب میں ہے، اور جو روایات ان میں دراصل حدیث نہ تھیں بلکہ عوام نے غلط فہمی سے ان کو حدیث سمجھ رکھا ہے اگر وہ اقوال نتیجہ کے طور پر کسی دوسری حدیث یا آیتِ پاک سے ثابت ہیں تو ان احادیث و آیات اور ان سے ان اقوال کی صحت کے طریق و استنباط پر گفتگو فرمائی، حصہ اول تشرف میں امام غزالی کی احیاء العلوم کی احادیث کی تخریج ہے اس

حصہ کا ماخذ زیادہ تر امام غزالی کی تخریج احیاء العلوم ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے، اور اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں ہیں جن کا ماخذ ہر روایت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ (حکیم الامت کے آثار علمیہ)

۳۔ **مناجات مقبول:** احادیث میں وارد شدہ اوراد واذکار مسنونہ کے لیے حصن حصین اور حزب اعظم ملا علی قاریؒ وغیرہ کتابیں رواج پذیر ہیں مگر طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہیں۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے عام مسلمانوں کے فائدہ کے لیے ان سب سے تلخیص کر کے مناجات مقبول کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تحریر فرمایا ہے، جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بے حد مقبول ہے، ہر دعا کے ساتھ اس کا ماخذ اور حوالہ بھی تحریر کیا گیا ہے۔

۴۔ **الخطب الماثورۃ من الآثار المشہورۃ:** جمعہ وعیدین کے خطبوں میں اس درجہ تکلف وتصنع سے کام لیا گیا ہے کہ یہ بازاری خطبے زبان اور طرز ادا اور مضامین ومطالب کے لحاظ سے عہد نبوت اور خلافت راشدہ کے اسلوب سے ہٹ کر بلغاء اور خطباء کے اظہار قابلیت کا ڈھنگ بن کر رہ گئے ہیں، حکیم الامت کی اصلاحی نظر سے محراب ومنبر کا یہ گوشہ بھی مخفی نہیں رہا، چنانچہ الخطب الماثورۃ من الآثار المشہورۃ کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع کر دیا، تا کہ خطباء مساجد ان مسنون خطبوں کو پڑھ کر ان تکلفات باردہ کے گناہ سے محفوظ رہیں، خطبات الاحکام جس میں جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبے تالیف کیے گئے ہیں اس کے علاوہ ہے، یہ خطبے بھی احادیث وآثار اور آیات قرآنیہ سے ماخوذ ہیں۔

۵۔ **حیاۃ المسلمین:** اس کتاب کے متعلق خود حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ایک کتاب لکھی ہے ''حیوۃ المسلمین'' اس میں سب کچھ مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں، اس میں جو مضامین ہیں میں نے بہت سوچ سوچ کر لکھے ہیں اور عام فہم کرنے کے لیے سہل بھی کر دیئے ہیں، اس پر عمل کرنے سے مسلمانوں کی دنیا اور دین دونوں کی فلاح اور بہبود ہے۔

(ملفوظات حکیم الامت: ص ۱۸، ج ۳)

اس کے سارے مضامین آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ماخوذ ہیں، پوری کتاب زندگی

کے مختلف شعبوں سے متعلق مختلف احادیث کا انتخاب اور ذخیرہ ہے۔

۶۔ اعلاء السنن: اس کتاب کی تاریخ اور اس کا پس منظر علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں "حضرات اہل حدیث کے اس فرقہ کی طرف سے جو غالی ہے اکثر حضرات حنفیہ پر طعن کیا گیا ہے کہ حنفی مسائل کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں، اور چوں کہ کتب حدیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی تالیف ہیں اس لیے ان میں حنفیہ کی موید حدیثیں یکجا نہیں ہیں گو امام محمدؒ کی موطا اور آثار اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار اور مسند ابی حنیفہ مرتبہ خوارزمی اور امام طحاویؒ کی تصانیف سے ان کا جواب دیا جاتا رہا ہے مگر کتب صحاح و مسانید و مصنفات سے جو رائج اور محدثین میں مقبول ہیں چن کر احادیث و روایات کو یکجا نہیں کیا گیا تھا جن سے مسائل حنفیہ کی تائید ہوتی تھی، یہ ضرورت کو ہمیشہ سے تھی مگر اس زمانہ میں اہل حدیث کے ظہور و شیوع سے اس ضرورت کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی، حضرت حکیم الامتؒ نے بھی اس ضرورت کو محسوس فرمایا اور احیاء السنن کے نام سے اس قسم کی احادیث کا مجموعہ مرتب فرمایا اور اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر رکھی لیکن افسوس کہ اس کا مسودہ ضائع ہو گیا، کچھ دنوں کے بعد پھر اس موضوع کا خیال آیا اور دوبارہ ایک جدید اسلوب پر اس قسم کی حدیثوں کا مجموعہ جامع الآثار کے نام سے مرتب فرمایا، ۱۳۳۱ھ میں یہ خیال ہوا کہ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ حضرت والا خود اس کام کو تنہا انجام نہیں دے سکتے، اس لیے آئندہ کام کے لیے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا انتخاب ہوا، مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے زیر ہدایت اس کام کو بڑی دیدہ ریزی، وسعت نظر اور تحقیق وتنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا، اعلاء السنن کے نام سے اس وقت تک اس کی بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جن میں مذہب حنفی کی موید حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا ہے اور محدثین اور اہل فن کی تحقیقات اس کے شروح وحواشی میں یکجا کیے گئے ہیں۔ (حکیم الامت کے آثار علمیہ: از علامہ سید سلیمان ندویؒ)

اس محققانہ کتاب کو دیکھ کر شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور علامہ زاہد الکوثریؒ نے بلند کلمات تحریر فرمائے ہیں، اور عجیب وغریب انداز سے اپنے تاثر کا اظہار فرمایا ہے، چنانچہ شیخ فرماتے ہیں:

"فن حدیث شریف اور اس کے اصول ومبادی اور اس سے متعلقہ مختلف علوم وفنون میں علماء

حدیث نے اس قدر کتابوں کا ذخیرہ اور ایسی تحقیقات اپنی تصانیف میں جمع کر دی ہیں جن کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے فن سے متعلقہ تمام گوشوں کو اس طرح احاطہ میں لے لیا کہ بحث کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہا، اور اس کے بعد اس سے زائد کی گنجائش نہیں، اور بعد والوں کے لیے مزید کسی استدراک اور خلا کو پُر کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن علماء ہندو پاکستان نے اخیر زمانہ میں فن حدیث شریف کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو دیکھنے کے بعد ہمارا مذکورہ بالا نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے، ہم کو ان کے یہاں ایسی جدید تحقیقات، مفید معلومات، نادر نکتے ملتے ہیں جن کو دیکھ کر امام ابن مالک نحوی کا مقولہ یاد آتا ہے کہ ''علوم الٰہیہ جب حق تعالیٰ کی خصوصی عطیہ ہیں تو حق تعالیٰ کے فضل کو کسی زمان کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا، کوئی بعید نہیں کہ بہت سے متاخرین کو علوم وفنون میں وہ مقام حاصل ہو جائے اور ان کی رسائی وہاں تک ہو جائے جہاں تک علماء متقدمین کی رسائی دشوار تھی۔

میں نے اس کتاب (اعلاء السنن) کو عجیب کتاب نہایت نافع، پُر مغز تمام مباحث کو سمیٹے ہوئے، عجیب فوائد اور نادر نقول پر مشتمل پایا، اس کتاب کو بار بار پڑھ کر میں اس سے مستفید ہوا۔

(اعلاء السنن: ص ۳ ج ۱)

علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد اپنے تاثر کا اظہار فرماتے ہیں:

''ہر باب سے متعلق حدیثوں کے استقصاء واستیعاب اور ہر ہر حدیث پر متن وسند کے لحاظ سے محدثانہ کلام قطع نظر اس سے کہ آیا ان کے مذہب کے موافق ہے یا مخالف، ایسا منصفانہ اور محققانہ کلام دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا، اور اس عظیم کارنامہ کو دیکھ کر مجھے رشک آنے لگا''۔ (اعلاء السنن: ص ۱۶ ج ۱)

واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے کارناموں میں سے فن حدیث میں ایک بڑا کارنامہ ہے جس کی تحریک وآغاز تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے ہوا، اور اس کی تکمیل حضرت تھانویؒ ہی کی زیر نگرانی ان ہی کے منہج اور ہدایات کے مطابق شیخ مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ سے ہوئی، اللہ تعالیٰ دونوں حضرات کو غریق رحمت فرمائے۔



مولانا سید قطب الہدیٰ رائے بریلوی اور خاندان قطبی

خدمت علم حدیث کے تناظر میں

از: مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی

قربی اجداد کے اثرات:

مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی رائے بریلوی ممتاز عالم و محدث گزرے ہیں۔ ان کا تعلق اس خاندان سے تھا جسے خانوادۂ قطبی حسنی علم اللٰہی کہا جاتا ہے، حضرت شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی (م ۱۰۹۶ھ) تک ان کا خاندانی نسب اس طرح ہے: مولانا سید قطب الہدیٰ بن مولانا سید محمد واضح بن مولانا سید محمد صابر بن مولانا شاہ آیت اللہ بن حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی۔ حضرت شاہ علم اللہ کا طرۂ امتیاز اتباع سنت تھا، چنانچہ سنت سے عشق اور حدیث شریف سے شغف کا وصف ان کی اولاد میں منتقل ہوا، اور جب ان کی اولاد کا تعلق حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور انکے خانوادہ سے استوار ہوا تو اس نے اس میں اور جلا بخشی، مولانا محمد واضح اور شاہ ابوسعید حسنی کا نام اس سلسلے میں کافی ہے، یہ دونوں حضرت شاہ علم اللہ کے پڑپوتے ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ کے ارشد تلامذہ میں ہوئے، خاص طور پر شاہ ابوسعید حسنی (م ۱۱۹۳ھ) جو کہ ولی اللٰہی فکر وطرز کے نمائندہ سمجھے جانے لگے، مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے اپنی کتاب ''التمہید'' حصہ اول میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مکمل نظریہ

کو سمجھنے والوں میں صرف چار تلامذہ کا ذکر کیا ہے اور یہ صراحت بھی کی ہے کہ چار سے زیادہ نہیں، ان میں ایک نام حضرت شاہ سید ابو سعید حسنی کا بھی لیا ہے۔

(ملاحظہ ہو تاریخ دعوت و عزیمت از مولانا ابوالحسن علی ندوی حصہ پنجم ص ۳۹۰)

مولانا سید محمد واضح محدث کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ:

''مولانا سید محمد واضح حسنی کو بھی حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف سے اجازت عامہ تھی، اور شاہ صاحب ان کا بلند الفاظ میں ذکر کرتے تھے''۔

(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم ص ۳۹۳ مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ)

مصنف ''خانوادۂ علم اللّٰہی'' صراحت سے لکھتے ہیں:

اپنے والد کے ارشاد کے مطابق دہلی تشریف لے گئے، اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ کے فضل و کمال اور درس حدیث کا شہرہ تھا، وہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ایک مدت تک قیام کیا، اور حدیث خصوصاً جامع صحیح امام بخاری کی سند حاصل کی، اور قادری سلسلہ میں بیعت ہو گئے۔

ان کی تدریس و اجازت کے متعلق صاحب ''تذکرۃ الابرار'' لکھتے ہیں:

''و بخدمت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ رسیدہ سند صحاح خصوصاً جامع صحیح امام بخاری حاصل کردند و در طریقۂ عالیہ قادریہ بیعت نمودہ فیضہا ربودند و باجازت تدریس صحاح و تعلیم طلباء و تسلیک مریدین امتیاز یافتہ''

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر صحاح کی سند خاص طور سے جامع صحیح بخاری کی سند حاصل کی اور سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت ہو کر فیض یاب ہو گئے، اور اجازت حاصل کر کے صحاح کی تدریس، طلبہ کی تعلیم اور مریدین کی رہنمائی میں ممتاز ہوئے۔

(خانوادۂ علم اللّٰہی ص ۹۷، از مولانا محمد ثانی حسنی مطبوعہ سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات رائے بریلی)

آگے مصنف ''خانوادۂ علم اللّٰہی'' لکھتے ہیں:

''مقبولیت ومحبوبیت اتنی بڑھی کہ عوام وخواص کا رجوع عام ہونے لگا، اور دور دور سے علماء ان کی خدمت میں آنے لگے، اور ان کی خدمت میں رہ کر استفادہ کرنے لگے، مولانا محمد واضح حدیث، فقہ، نحو وصرف کا درس دیتے اور مختلف مقامات سے طلباء اور علماء حاضر ہو کر درس لیتے، درسگاہ دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد رہتی''۔

یہی مولانا سید محمد واضح محدث ہیں جن کے عالی مرتبت فرزند مولانا سید قطب الہدی محدث رائے بریلوی تھے، یہاں یہ ملحوظ رہے کہ مولانا محمد واضح نے اپنے والد مولانا محمد صابر اور علامہ وقت ملا نظام الدین فرنگی محلی سے بھی استفادہ کیا ہے۔

مولانا سید قطب الہدی حسنی:

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے علم وفضل کے اس خاندان کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ تاثر بیان کیا ہے کہ:

''اگر شیخ الاسلام سید قطب الدین سے لے کر سید ابوالحسن علی ندوی تک اس خاندان کی جہد وسعی کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اندازہ ہوگا کہ تقضا، سلوک، عزیمت، علم وادب، دعوت وارشاد، اس خاندان کی کوششوں کا مرکز ومحور رہا ہے''۔

(مقدمہ حکیم سید فخر الدین خیالی حیات وکارنامے از ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی مکتبۂ اسلام لکھنؤ ص۵)

مولانا سید قطب الہدی کی شخصیت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد صفات آپ کے اندر جمع تھیں، اس کے ساتھ وہ ایک بہترین خطاط بھی تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں سنن ترمذی کا حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی والانسخہ ان کے خط کا لکھا ہوا محفوظ ہے جو کہ خط نستعلیق میں ہے، شیخ علامہ ابوالفیض محمد بن محمد بن علی الفاسی کا اصول حدیث پر رسالہ ''جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول'' کا نسخہ بھی مولانا سید قطب الہدی رائے بریلوی کے خط سے محفوظ ہے، اور اس رسالہ پر انکے قیمتی تعلیقات بھی ہیں، اس میں انہوں نے اپنے استاذ شیخ شیوخ الہند مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے افادات بھی نقل کئے ہیں، یہ رسالہ صرف ۴۸ صفحات کا ہے، مگر ان حواشی اور افادات سے اس کی قیمت دو چند ہو جاتی ہے

،خاندان علم الہٰی کے مورخ اور مصنف "خانوادۂ علم الٰہی" مولانا سید محمد ثانی حسنی لکھتے ہیں:

"مولانا سید قطب الہدیٰ نہایت خوش خط تھے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نیز علماء محققین کے بہت سے علمی رسائل اپنے دست مبارک سے لکھے، تقریباً چالیس نفیس اور نایاب کتب حدیث وتفسیر کی نقل کیں، کثرت تحریر کی وجہ سے انگلیوں میں نشانات پڑ گئے تھے، ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں آج بھی کتب خانہ کی زینت بنی ہیں، خط ایسا پاکیزہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا آج ہی لکھ کر اٹھا ہے۔ (خانوادۂ علم الٰہی ص ۹۲)

مؤرخ الہند الاکبر مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں:

له تعليقات شتى على "صحيح البخارى"	صحیح بخاری، جامع ترمذی، عین العلم، سفر
وجامع الترمذى، "وعين العلم" وسفر	السعادہ، وغیرہ کتابوں پر حواشی مرتب
السعادة وعلى غيرها من الكتب وله رسالة	فرمائے، نیز "الجانب الشرقی
نفيسة فى إثبات كفر فرعون المسمى	فی کفر فرعون الغرقی" کے
"بالجانب الشرقى فى كفر فرعون الغرقى"	نام سے فرعون کے کفر کے اثبات میں ایک
(خانوادۂ علم الٰہی ص ۹۲)	بیش قیمت رسالہ تحریر فرمایا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ممتاز شاگردوں میں تھے، اور علم وفضل کے ساتھ بڑے خطاط اور خوشنویس بھی تھے، اور انہوں نے حدیث کی مشہور کتاب جامع ترمذی کو اپنے قلم سے لکھ کر حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلس درس میں تقریروں اور ان کی تحقیقات سے مزین کیا ہے اور خود بھی متعدد رسائل کے مصنف ہیں"۔ (حیات عبدالحی از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۵۰)

مختصر حال:

حضرت مولانا سید محمد واضح کی آغوش میں آنکھ کھولی اور تعلیم وتربیت حاصل کی، علوم عقلیہ کی کتابیں علامہ تفضل حسین خاں اور دوسرے علماء لکھنؤ سے پڑھیں، اس کے بعد دہلی تشریف لے گئے،

اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی خدمت میں رہ کر فقہ اور حدیث کا درس لیا، اور علوم عقلیہ ونقلیہ میں پوری دستگاہ حاصل کی اور کمال پیدا کیا، علوم ظاہری سے فراغت کر کے حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی سے بیعت ہوئے اور تکمیل سلوک کی، اور فیوض باطنی سے مالا مال ہوئے، مولانا سید قطب الہدی نے جس وقت ہوش سنبھالا، تو خاندان کے بڑے بڑے بزرگوں اور مشائخ کی وفات ہو چکی تھی، ۹ رسال کے تھے کہ حضرت مولانا سید محمد عدل عرف شاہ لعل، حضرت مولانا سید شاہ ابوسعید، مولانا سید محمد نعمان کا ایک ہی سال میں انتقال ہوگیا، صرف والدہ ماجدہ کا سایۂ عاطفت تھا، جوان کے لئے سہارا تھا، مگر ابھی تعلیم سے پوری طرح فراغت حاصل نہ کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہوگیا، دل میں علم باطن کے حصول کا جذبہ موجزن تھا، اور بیقرار طبیعت سکون واطمینان پر راضی نہ تھی، وہ ایسے مرشد کی تلاش میں وطن سے باہر نکلے جوان کی پیاس کو بجھا سکے اور منزل مقصود تک پہونچا سکے، وہ اس راہ میں کن کن منزلوں سے گزرے"۔ (خانوادۂ علم اللّٰہی: ص ۸۹)

''مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے ''نزھۃ الخواطر'' میں اور مولانا فخرالدین خیالی نے ''مہر جہاں تاب'' میں لکھا ہے کہ مولانا سید قطب الہدیٰ نے مولانا شاہ غلام علی صاحب مجددیؒ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بیعت ہوگئے اور راہ سلوک طے کی اور اجازت حاصل کی''۔

(خانوادۂ علم اللّٰہی: ص ۹۰)

مولانا سید قطب الہدی حسنی کے ایک معاصر نواب وزیرالدولہ والی ریاست ٹونک نے ''وصایا الوزیر'' میں جو لکھا ہے وہ بھی مصنف خانوادۂ علم اللّٰہی کے حوالہ سے پیش خدمت ہے۔

''حضرت مولانا سید قطب الہدی امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے عزیز قریب تھے جو خود ولی کامل اور عارف باللہ تھے، ابتدائے سلوک میں تمنا ہوئی کہ کسی متبع سنت مرد خدا اور شیخ کامل کے دامن کو تھامیں، اس لئے وہ ایسے بزرگ کی تلاش میں مدت تک سفر کرتے رہے اور شہر شہر گاؤں گاؤں جہاں بھی کسی بزرگ کو سنتے پہونچتے، اور ان کی خدمت میں چند دن رہتے مگر چونکہ خود متبع سنت اور صاحب ورع وتقوی تھے اس لئے کوئی بزرگ بھی ان کی نظروں میں کامل نہ ہوتا اگر کسی میں ادنی سی

بات بھی خلاف سنت پاتے اس سے غیر مطمئن ہو کر آگے بڑھ جاتے ،حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے (جو ان کے استاذ تھے) ایک دن فرمایا کہ آپ جن شرائط کے ساتھ شیخ کامل کی تلاش میں سرگرداں ہیں،اس کا ملنا مشکل ہے،اس لئے ان شرائط کا خیال چھوڑ دیجئے ،اور کتاب وسنت کو اپنے ظاہر و باطن کا مقتدی بنا کر زندگی گزاریئے ،اس کے بعد حضرت مولانا سید قطب الہدیٰ وطن واپس تشریف لے آئے اور خلوت نشیں ہو گئے ،اور اپنی زندگی اتباع سنت میں ایسی گزاردی کہ سنت ان کی عادت ثانیہ بن گئی اور علم وتقویٰ ،احتیاط و ورع میں امتیاز حاصل کیا اور ایک عالم میں مشہور ومقبول ہوئے ،حضرت کا معمول تھا کہ سفر میں نماز اول وقت میں پڑھتے تھے اور ہمہ وقت خدا کی یاد میں مشغول رہتے لغویات وخرافات سے مکمل طور سے مجتنب رہتے بس علوم دینیہ کی تدریس یا طالبین سلوک کی تربیت صوم وصلوٰۃ کی پابندی ذکر وشغل آپ کا معمول تھا ان کی مجلس میں بیٹھنے والے بیان کرتے ہیں کہ آپ جیسا وجیہ وشکیل خوبرو اور خندہ جبیں صاحب علم وفضیلت اور عارف کامل ہماری نگاہوں میں کم گذرا ہے ،آپ کی صفات ظاہری و باطنی کا بیان کرنے سے زبان قاصر ہے۔ (ص۹۰)

وفات: جب حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی خدمت میں حضرت سید احمد شہیدؒ حاضر ہوئے اور کچھ وقت گزار کر رائے بریلی واپس آئے تو آپ کو اپنے فخر خاندان عالم دین ومحدث مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی کی زندگی کے آخری ایام میں قرب کے مواقع ملے اور شفقتیں حاصل ہوئیں ،چنانچہ انتقال کے وقت بھی آپ موجود تھے ،مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے منظورۃ السعداء ،(مؤلفہ مولانا سید جعفر علی نقوی) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا سید قطب الہدیٰ کا انتقال آپ کے سامنے ہوا اور یہ کہ آپ ان کے احتضار کے وقت موجود تھے۔ (سیرت سید احمد شہید: ج ا ص ۱۳۲)

مصنف خانوادۂ علم اللّٰہی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" جب آخری وقت آیا تو حضرت سید احمد شہیدؒ کو بڑی توجہ ہوئی اور حاضرین سے فرمایا کہ جب ماموں صاحب کا بالکل آخری وقت ہو تو اطلاع کرنا ،آخری وقت حضرت سید احمد شہید سرہانے تشریف لائے اور آخر تک بیٹھے رہے اور انتقال کے بعد خوشی کا اظہار کیا اور خدا کا شکر ادا کیا ،اور فرمایا کہ بہت اچھی حالت میں سفر

آخرت فرمایا"۔ (خانوادۂ علم اللّٰہی ۹۳)

صاحب نزہۃ الخواطر نے مولانا سید قطب الہدیٰ کی تاریخ وفات "گلشن محمودی" کے حوالہ سے ۱۹؍ ربیع الآخر ۱۲۲۶ھ لکھی ہے۔

ذاتی کتب خانہ:

خاندان علم اللّٰہی میں علم وتحقیق اور دعوت وعزیمت، جہاد وسلوک بیک وقت جمع رہے ہیں اور جیسا کہ مؤرخ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا تاثر ہے "دعوت وعزیمت اور ارشاد وتلقین، علم وفضل، سلوک وعرفان، سخنوری اور سخن شناسی کا شاید ہی کسی خاندان میں وہ اجتماع ہوا ہو جو رائے بریلی کے دائرہ شاہ علم اللہ میں بسنے والے خانوادہ کو قسام ازل نے ارزانی فرمائی جو آج تک اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے"۔

(مقدمہ مولانا فخر الدین خیالی حیات وکارنامے: ص ۱۲ مؤلفہ ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی)

مختلف میدانوں میں یہاں کی شخصیات نے اپنے کارہائے نمایاں انجام دئے، مولانا سید محمد حکم کی شخصیت ہی کو لے لیجیے بڑی جامع کمالات شخصیت تھی، دو زبانوں عربی وفارسی میں تفسیر لکھی، عربی لغت پر الگ کتاب لکھی، ان کے علاوہ مولانا سید محمد نعمان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان تمام شخصیات میں مولانا سید قطب الہدیٰ جیسا علم کا جویا نظر نہیں آتا، خود کتابیں لکھیں، دوسروں کی تصنیفات بھی اپنی خوشخطی سے سامنے لائے، اور کتابوں کا ایک خزانہ اکٹھا بھی کیا، اس طرح ایک بڑا ذخیرۂ کتب ان کے پاس جمع ہو گیا، جس کی حفاظت کی بھی انہیں بڑی فکر تھی، اپنے بعد ان کی نظر اپنے ایک برادر زادہ مولانا سید محمد ظاہر حسنی پر تھی چنانچہ ان کے نام ان تمام کتابوں کا جو مطبوعہ ومخطوطہ تھی، ہبہ نامہ تحریر کر دیا، یہ ان کی فراست ایمانی تھی جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

"حیات عبدالحی" میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں،

"مولانا سید محمد ظاہر صاحب کو اپنے پورے کتب خانہ اور علمی متروکات کا وارث بنایا، یہ تاریخی ہبہ نامہ جس پر حضرت سید احمد شہیدؒ اور تمام بزرگان خاندان کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں، ہمارے خاندانی قلمی مرقع کی ابھی تک زینت بنا ہوا ہے یہ پاس کتابی ذخیرہ میں جو زیادہ تر قلمی کتابوں اور نادر الوجود

مخطوطات پر مشتمل تھا، صاحب علم ورثاء برابر اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ مولانا حکیم سید عبدالحی کی زندگی میں اس نے ایک وسیع اور مستقل کتب خانہ کی شکل اختیار کر لی، اس خاندان کو اس قیمتی ذخیرہ پر ہمیشہ ناز رہا، اور ہر دور میں اس کے افراد اس کو سینہ سے لگائے رہے، قدرتا ان کتابوں کی دیکھ بھال، ان کے دھوپ دکھانے اور کتاب کے دشمن کیڑوں، موسم کے اثرات وغیرہ سے بچانے اور ان کی فہرست بنانے کے سلسلہ میں مطالعہ کا ذوق، عام معلومات، قلمی کتابوں کی اہمیت کا اندازہ، بوسیدہ اور کرم خوردہ کتابوں کی قدر و قیمت سمجھنے کا ذوق اور ان کے پڑھنے کی عادت وہ قدرتی عطیے اور نفسیاتی اثرات تھے جو ایسے قدیم کتابی ذخیروں کے اہل اور ہونہار وارثوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں، دائرہ شاہ علم اللہ بالکل دریائے سئی کے کنارے واقع ہے، اور وہاں ہر چند سال کے بعد طغیانی اور سیلاب کا آنا ایک دستور بن گیا ہے، ایسی افراتفری اور پریشانی کے عالم میں جب نقل سکونت کرنا ضروری ہو جاتا تھا اس خاندان کے افراد کو سب سے زیادہ اسی قیمتی ذخیرہ کی حفاظت کی فکر ہوتی تھی، اور خاندان کے ان مختلف کتابوں کے ذخیرہ میں جو اس زمانہ کے شرفاء و رؤساء کے دستور کے مطابق ہر شاخ اور تقریباً ہر گھر میں تھا، یہی کتابی ذخیرہ زمانہ کی دست برد اور بار بار آنے والے سیلابوں اور نقل مکانی کے اثرات سے محفوظ رہا، اور اس کی وجہ سے خاندانی حالات و تبرکات، قلمی تحریروں اور دستاویزوں کا بڑا قیمتی ذخیرہ تلف ہونے سے بچ گیا"۔

(حیات عبدالحی ص ۵۰، ۵۱ مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مطبوعہ سید احمد شہید اکیڈیمی دارعرفات رائے بریلی)

اس طرح یہ قیمتی اثاثہ لائق وفائق ہاتھوں میں آیا، اور اس کے افادہ کے عام ہونے کے وسائل سامنے آتے گئے، چنانچہ آج یہی علمی اثاثہ کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی زینت بنا ہوا ہے، چونکہ یہ بعد میں مولانا فخر الدین خیالی کی طرف منتقل ہوا جو کہ مولانا محمد ظاہر صاحب کے نواسہ تھے اور پھر ان کے فرزند مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی ملکیت و اختیار میں آیا، جنہوں نے اس میں وقیع اضافہ کیا اور کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ کر دیا گیا۔

یہ نامہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں لکھا گیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ "سیرت سید احمد شہید" میں لکھتے ہیں:

مولانا سید قطب الہدیٰ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے ربیع الاول ۱۲۲۶ھ میں اپنے بھتیجے مولانا سید محمد ظاہر حسنی کے نام اپنی تمام مملوکہ کتابوں کا ہبہ نامہ لکھا ہے، اس پر اعیان خاندان علم اللہی کے دستخط اور مہریں ہیں، اس میں سید صاحب کی اسم احمد بھی ہے، جو آپ کی غیر موجودگی میں نہیں پڑ سکتی، نیز ہبہ نامہ کے آخر میں درج ہے۔

''تحریر فی التاریخ بست وہشتم ربیع الاول ۱۲۲۶ھ المقدسہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام،'' یہ ہبہ نامہ مصنف کے پاس محفوظ ہے۔ (سیرت سید احمد شہید حصہ اول صفحہ ۱۳۱)

بعد کی نسلیں اور خدمت علم حدیث:

مولانا سید قطب الہدیٰ رائے بریلوی کی علم حدیث میں جو خدمات رہیں اسکے اثرات ان کے عصر میں کس قدر ظاہر ہوئے اسے موضوع بحث نہیں بنانا ہے؛ البتہ بعد کے زمانوں اور نسلوں میں اس کے جو اثرات مرتب ہوئے اس کا کچھ ذکر کرتے چلتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ مولانا سید محمد ظاہر حسنی (م ۱۲۷۸ھ) اسکے علمی وارث ہوئے، مولانا سید محمد ظاہر حسنی کے بعد دو شخصیتیں نظر آتی ہیں، ایک مولانا سید شاہ ضیاء النبی حسنی جو کہ بھتیجے تھے، دوسرے نواسہ مولانا فخر الدین خیالی، شاہ ضیاء النبی حسنی (م ۱۹۰۶ء) نے تو تعلیم وتعلم کے بعد اصلاح نفوس وتربیت اخلاق کے کام کا بیڑا اٹھایا اور وہ زہد وعبادت کے ساتھ اسی میں یکسو ہو گئے، البتہ مولانا فخر الدین خیالی (م ۱۹۰۸ء) نے علمی مشغلہ اختیار کیا اور تصنیف وتحقیق کے کام میں لگ گئے، انہوں نے تعلیم وتعلم کا مرحلہ اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہر صاحب کے سایۂ عاطفت میں طے کیا تھا، یہ مولانا محمد ظاہر کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں حضرت خیالی جیسے علم نواز سپوت ملے، انہوں نے اپنی صلاحیت سے اس کتب خانہ میں گرانقدر اضافہ کیا، مہر جہاں تاب لکھ کر ایک کارنامہ بھی انجام دیا، پھر مولانا سید عبدالحی حسنی کی شخصیت جلوہ گر ہوئی، انہوں نے کسب معاش کے لئے طب کو اختیار کیا مگر دین کے فروغ اور تعلیم و دعوت کے کاموں میں حصہ لینے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔

علم حدیث سے انہیں تعلق خاندانی ورثے کے طور پر ملا تھا جس میں علامہ حسین بن محسن الانصاری

یمانی الخزرجی کی شاگردی سے مزید جلا ملا، مولانا عبدالحی نے حدیث وسنت کی خدمت مختلف نوعیتوں سے کی، سنن ابوداؤد پر ان کی تعلیقات بھی ہیں جو عربی زبان میں تھیں مگر ان کا یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔

تلخیص الاخبار کے نام سے حدیث کا مجموعہ تیار کیا، چونکہ یہ حدیثیں تہذیب اخلاق سے متعلق تھیں اس لئے اس کو ان کے فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تہذیب الاخلاق کے نام سے مراجعت کر کے شائع کرایا، مولانا عبدالحی صاحب نے اس کی شرح بھی عربی میں ہی لکھی تھی۔

منتہی الافکار فی شرح تلخیص الاخبار مولانا سید بلال عبدالحی صاحب کی تحقیق کے ساتھ تنویر الآفاق کے نام سے سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات رائے بریلی سے طبع ہورہی ہے۔

مولانا عبدالحی حسنی کا یہ ذوق کسی حد تک ان کی اولاد میں بھی منتقل ہوا، چنانچہ ان کے دونوں صاحبزادگان مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے امہات کتب الحدیث کی تعلیم کر حاصل کی، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں جا کر حدیث کا درس لیا اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور علامہ انور شاہ کشمیری کے دروس کو عربی میں قلمبند بھی کیا تھا مگر افسوس کہ یہ قیمتی علمی اثاثہ ڈاکٹر صاحب کے ورثہ سے بغرض استفادہ لیا گیا پھر واپس نہ کیا گیا۔[1]

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا حدیث کے علم کا ذوق زمانہ طالب علمی سے ہی تھا، اور جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنے حدیث کے استاد مولانا حیدر حسن خان ٹونکی سے سنن ترمذی کا درس لے رہے تھے اسی وقت وہ پوری شیفتگی سے مطالعہ حدیث بھی کرتے تھے، مولانا سید قطب الہدی حسنی رائے بریلوی کا ترمذی کا نسخۂ خطی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مطالعہ میں اسی زمانہ سے رہا، اس پر بعض جگہ مولانا

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: بخاری شریف وترمذی شریف مولانا محمود حسن صاحب سے پڑھی اور ابوداؤد مولانا انور شاہ کشمیری سے، ڈاکٹر صاحب عربی میں درس کی تقریریں لکھتے تھے، چوں کہ اللہ تعالیٰ نے استعداد قوی اور فہم سلیم عطا فرمایا تھا اس لئے درس کی تحقیقات و مطالب بہت خوبی سے منضبط ہوئے، ان تقریروں پر مولانا انور شاہ صاحب کی نظر بھی پڑی ہے اور انہوں نے ان کو پسند کیا اور کہیں کہیں اپنے قلم سے تصحیح اور اضافہ بھی فرمایا۔

(حیات عبدالحی ضمیمہ ڈاکٹر عبدالعلی مطبوعہ یو پی بھارت ص ۳۵۶)

ہے، بعض جگہ ۱۳۵۴ھ کی تاریخ ہے، ۱۳۴۸ھ کا سن ان کا سنن ترمذی پڑھنے کا سن ہے، مولانا کے حدیث سے شغف کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں حدیث سے معاشرہ کی اصلاح اور ملت کی رہنمائی اور دین کی تفہیم وتشریح میں وہ کام لیا ہے جو حدیث کا ایک رمز شناس محقق و معلم لے سکتا ہے، مولانا ندوی کے ان حدیثی افادات کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم ومبسوط کتاب سامنے آجائے گی۔

بڑی حق تلفی ہوگی اگر ہم اس مناسبت سے مولانا ندوی کی ہمشیرہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ (رحمہا اللہ) کا ذکر نہ کریں، حدیث وسنت نبوی سے عشق ومحبت نے ان کو کس طرح عربی سیکھنے پر آمادہ کیا پھر یہ استعداد بھی پیدا کرادی کہ وہ احادیث نبوی کو اردو قالب میں ڈھال کر حدیث کے ذوق کو اردو داں طبقہ میں بھی منتقل کریں۔

چنانچہ ان کے برادر اکبر مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کو ان کی طلب صادق اور محبت وشوق کا علم ہوا تو انہوں نے ان کو امام نووی کی مقبول عام ومتداول کتاب (ریاض الصالحین) کو اردو میں منتقل کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ قریبی مدت میں ان کے قلم سے (زاد سفر) کی صورت میں دو جلدوں میں مجموعہ احادیث کا ایک شاہکار اردو میں آگیا جس نے معاشرہ کی اصلاح میں بڑا کردار ادا کیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

بھائی صاحب مرحوم نے انکو مشورہ دیا کہ مشہور محدث امام نوویؒ (المتوفی ۶۷۶ھ) کی مشہور وسراپا برکت کتاب، ریاض الصالحین کو اردو میں منتقل کردیں، یہ کتاب بھائی صاحب مرحوم کی بہت عزیز تھی اور انہیں کی تحریک سے وہ پہلی مرتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں شامل کی گئی اور اب وہ بلاد عربیہ کے دینی دعوتی حلقوں کی مقبول ترین کتاب ہے اس وقت تک اس کا اردو ترجمہ نہیں ہوا تھا لیکن کام آسان نہ تھا۔ (پرانے چراغ حصہ دوم، ص ۳۵۳)

آگے وہ لکھتے ہیں:

انہوں نے حدیث باقاعدہ حدیث کے (کسی مدرسہ اور دارالعلوم کا کیا ذکر) کسی استاد سے بھی نہیں پڑھی تھی اور خانگی تعلیم و مطالعہ اور مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم میں بڑا فرق ہوتا ہے، لیکن اللہ نے انکو ہمت دی اور انہوں نے زادسفر کے نام سے اس کا ترجمہ ذیلی عنوانات اور تشریحی نوٹس کے ساتھ مکمل کر لیا۔ (پرانے چراغ دوم: ص ۳۵۳)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۵۳ء) اس کارنامہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم کو اس اظہار میں بڑی خوشی اور مسرت ہے کہ امام نووی کی کتاب (ریاض الصالحین) کا ترجمہ اسی گھرانے نے کیا ہے جس نے سنت کی اشاعت اور بدعت کے ازالہ کا کام ایک صدی پہلے سے شروع کر رکھا ہے اور جن کے انوار و برکات ملک میں ہر جگہ نمایاں ہیں الـلهـم زد فـزد و لا تـنـقـص، اس کتاب کا ترجمہ اسی گھرانہ کے موجودہ چشم و چراغ مولانا ڈاکٹر عبدالعلی ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی خواہر عزیزہ نے کیا ہے، ہماری نئی تعلیم یافتہ خواتین نے صرف ادبیات لطیفہ کو ابھی تک اپنے قلم کا جولانگاہ بنایا ہے کہ مسلمان خواتین کی علمی وادبی خدمتیں اس سے بھی زیادہ وسیع میدان کی طالب ہیں اور وہ دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت کے کاموں کو بہت خوبی کے ساتھ انجام دے سکتی ہیں۔

مترجمہ موصوفہ نے ترجمہ میں زبان کی سلاست اور روانی کا لحاظ رکھا ہے جگہ جگہ حاشیے بڑھائے ہیں، ہر حدیث کا عنوان قائم کیا ہے جس سے حدیث کا مغز سخن تک پہنچنے میں ناظر کتاب کو بڑی آسانی ہو جاتی ہے، دعا ہے کہ یہ کتاب اسلامی گھروں میں گھر گھر پھیلے اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی اصلاح و تعلیم میں مؤثر اور بابرکت ہو۔ (زادسفر ص ۸ مطبوعہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ)

مولانا محمد منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں:

پیش نظر کتاب (زادسفر) ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث امام نوویؒ کی کتاب ریاض الصالحین کا ترجمہ ہے امام موصوف کی یہ کتاب ان خاص کتابوں میں سے ہے جو مختلف زبا

نوں میں مسلمانوں میں ایمانی روح اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، ممالک عربیہ کے دینی حلقوں میں یہ کتاب بہت مقبول اور متداول ہے لیکن ہندوستان میں نہ معلوم کیوں اس کا چرچا زیادہ نہیں رہا، ضرورت تھی کہ یہ کتاب سلیقہ سے ہماری زبان اردو میں منتقل ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق ہماری ایک بہن کو ملی، انہوں نے ترجمہ کے علاوہ کہیں کہیں مزید توضیح کے لئے حواشی بھی لکھے ہیں اور حدیثوں پر تشریحی عنوانات بھی قائم کئے ہیں جن سے مطلب اور مقصد سمجھنے میں عام ناظرین کو مدد مل سکتی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کتاب کی افادیت اور قبول عام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی غیر معمولی اہمیت کو بیان کرتے ہیں:

''زادِ سفر کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء کے وسط میں نکلا، کتاب کی غیر معمولی مقبولیت کا ایک اظہار تو بہت سے تعزیتی خطوط سے ہوتا ہے جو ان کی وفات پر موصول ہوئے اور جن کے لکھنے والوں نے اس کتاب سے اپنے گہرے تاثرات اور استفادہ کا ذکر کیا ہے دوسرے یہ کہ شاید وہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جن کی تصنیف جدہ کے سعودی ریڈیو اسٹیشن سے بالاقساط اردو پروگراموں میں نشر ہوئی اور رابطہ عالم اسلامی نے اس کے کئی نسخے خرید کر اردو بولنے اور سمجھنے والے ملکوں میں بھیجے، اس لئے ذوق کا یہ مصرعہ بالکل ان کے حسب حال ہے:۔

تیری آواز مکے اور مدینے

اس کتاب کے پہلے حصہ کا ہندی ایڈیشن بھی شائع ہو گیا، یہ ایڈیشن لکھنؤ کے ایک ہندو فاضل جناب نند کمار اوستھی نے خود شائع کیا ہے، جن کا ہندی میں ترجمہ قرآن عرصہ ہوا چھپ کر پھیل گیا ہے، ان کو یہ کتاب ایسی پسند آئی کہ انہوں نے مجھ سے اسے ہندی میں شائع کرنے کی اجازت مانگی''۔

(زادِ سفر ص ۶ مطبوعہ اسلام گوئن روڈ لکھنو)

مولانا سید ضیاء النبی کی اولاد میں ان کے پوتے مولانا سید ابوالخیر محدث نے علم حدیث میں امتیاز پیدا کیا علم حدیث سے ان کی شیفتگی کا جو حال تھا اس میں وہ اپنے وقت میں بعض حیثیتوں سے اپنی

نظیر آپ تھے بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حدیث مع اسناد یاد کرنا اور یاد رکھنا محدثین سلف کا شعار رہا ہے، ایسے محدثین کی ہر زمانہ میں کثیر تعداد رہی ہے جن کو پوری پوری حدیث کی کتاب زبانی یاد تھی، جب مطابع قائم ہوئے اور حدیث کی کتابیں گھر گھر ملنے لگیں تو حفظ حدیث کا رواج کم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا اور اسانید کے حفظ کا خیال ہی ذہن سے نکل گیا، انہوں نے موطا اور صحیح مسلم یاد کرنے کا بیڑا اٹھایا، دونوں کتابوں کی ہزاروں حدیثیں مع سند کے حفظ کر لیں صحیح تعداد اور مقدار تو معلوم نہیں ہوسکی ،ہم لوگوں میں اس بات کا چرچا تھا کہ موطا ان کو پوری یاد ہے اور مسلم کا بھی ایک خاصہ حصہ وہ ادنی مناسبت سے حدیث مع سند کے پڑھنا شروع کر دیتے تھے، اس وقت ان کے چہرے پر ایک خاص چمک، آواز میں سوز و اثر محسوس ہوتا تھا، وہ بڑے دلکش انداز میں اور عربی لہجہ میں احادیث کی تلاوت کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور ان کی روح اس سے وجد میں آرہی ہے، بعض مرتبہ مسجد میں ان کو تنہا بیٹھے ہوئے زبانی احادیث کی تلاوت کرتے ہوئے سنا تو عجیب کیف محسوس ہوا، سند بھی وہ بڑے اہتمام اور لطف سے پڑھتے جیسے ان کے کان و دہن لذت یاب ہو رہے ہیں۔ (پرانے چراغ حصہ دوم: ص ۳۳۷)

مراکش کی ایک مؤتمر میں شرکت کے لئے مولانا سید ابوالخیر تشریف لے گئے تو وہاں بھی انہوں نے اپنا لوہا منوایا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ ہیں کہ وہ قرآن کریم کی طرح احادیث مع سند سناتے تو مراکش کے علما اور دوسرے ممالک سے آئے ہوئے فضلاء جو اپنے حفظ اور استحضار میں مشہور ہیں انگشت بدنداں رہ جاتے۔

ان کے فہم حدیث سے متعلق مولانا ندوی ہی رقمطراز ہیں:

حفظ حدیث کے علاوہ وہ شرح و تطبیق احادیث سے بھی ذوق رکھتے تھے، مشکلات الحدیث کے نام سے انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا مسودہ افسوس ہے کہ ان کے مسودات کے ذخیرہ میں محفوظ نہیں رہا۔ (پرانے چراغ)

مولانا سید ابوالخیر حسنی کا انتقال ۲ جنوری ۱۹۷۰ء (۱۳۹۰ھ) کو لکھنؤ میں ہوا اور محترمہ سیدہ

[1] پرانے چراغ حصہ دوم ص ۳۳۔

امۃ اللہ تسنیم صاحبہ نے ۲۸ جنوری ۱۹۷۶ء میں وفات پائی، اس طرح خاندان قطبی میں تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں علم حدیث کی خدمت کا جو شاندار آغاز ہوا تھا وہ چودھویں صدی ہجری کے اختتام پر بام عروج کو پہنچا جس کے اثرات پندرہویں صدی ہجری میں ظاہر وباہر ہیں، اللھم زد ولا تنقص [1]۔



---

[1] مقام مسرت ہے کہ یہ ذوق وشوق نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہا، مولانا سید محمد ثانی مرحوم کی ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (غیر مطبوعہ) مولانا سید محمد واضح حسنی ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کی اربعین پر دو رسالے جن میں ایک مختصر الشمائل المحمدیہ کے نام سے مجلس تحقیقات اسلام سے طبع ہو چکا ہے اور سید بلال عبدالحی حسنی ندوی فرزند مولانا سید محمد الحسنی مرحوم مشکوٰۃ شریف کی شرح (عربی) کی خدمت انجام دے رہے ہیں، بارک اللہ فیہ۔

مولانا ظفر الدین میجروی

اور

ان کی حدیثی خدمات

از: مولانا آفتاب عالم دھنبادی ندوی

حیات اعلیٰ حضرت تین جلدیں، مکاتیب فاضل بریلوی، مواھب ارواح القدس لکشف حکم العرس، مبین الهدی فی نفی إمکا ن المصطفی، القول الأظهر فی الأذان بین یدی المنبر۔

یہ مولانا میجروی کی کچھ تصنیفات کے نام ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں کہ ان کتابوں کے فاضل مولف کس فکر وعقیدہ کے داعی وعلمبردار تھے، جی ہاں! مولانا محمد ظفر الدین میجروی، مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے تلمیذ رشید مان کے افکار ونظریات کے وکیل ومبلغ وناشر تھے، جن شاگردوں اور مریدوں پر مولانا احمد رضا خاں صاحب کو فخر تھا ان میں مولانا ظفر الدین بھی ہیں، راقم کے خیال میں ان کے تعارف کیلئے اختصار میں یہ بتادینا بھی مفید ہوگا کہ مولانا ظفر الدین میجروی بہاری، مشہور وسیع المطالعہ محقق، شاعر، صاحب قلم، نو واردان بساط علم وتحقیق کا حوصلہ بڑھانے والے اور علمی معاونت کر کے خوش ہونے والے ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے والد گرامی ہیں۔

لیکن کتابوں کی فہرست سے یہ سمجھنا کہ مولانا بہاری کی تمام تصنیفات کا تعلق مختلف فیہ

موضوعات سے ہے صحیح نہیں ہوگا۔

مولانا ظفرالدین بہاری کی قلمرو میں تاریخ، سیرت، فقہ، منطق، فلسفہ، ہیئت، توقیت، جغرافیہ، نحو، صرف، فقہ، اصول فقہ اور حدیث واصول حدیث جیسے علوم عالیہ وعلوم آلیہ شامل تھے۔

مولانا بہاری کی تصنیفات کی تعداد ڈاکٹر مختارالدین نے ۱۷۱، بتائی ہے، وہ لکھتے ہیں: مولانا محمود احمد قادری مصنف تذکرہ علمائے اہل سنت نے ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور میں چار قسطوں میں ایک مضمون ملک العلماء کی خدمت حدیث پر ۱۹۷۸ء میں شائع کیا تھا، مجھے صرف اس کی دو قسطیں دیکھنے کو ملیں، انہیں انہوں نے ملک العلماء کی کل تصانیف کی تعداد ایک سوساٹھ لکھی ہے۔ مجھے فی الحال ان کی انہی تصانیف کا علم ہوسکا جنکا ذکر او پر گذرا۔

(دیکھئے جامع الرضوی کے شروع میں شامل مضمون، ملک العلماء مولانا ظفرالدین حیات وتصانیف، از مختارالدین آرزو صاحب صفحہ ۳۸)

مصنف ''تذکرہ علمائے اہلسنت'' نے مولانا بہاری کی تصانیف کی تعداد ۱۶۰ بتائی ہے، جبکہ خود صاحبزادہ کو جو تصانیف ملیں یا جن کا علم ہوسکا ان کی تعداد ۱۷۱ ہے، ان میں بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

سوانحی خاکہ:

مولانا ظفرالدین کا تعلق اسی خطہ سے ہے جو نہ صرف ماقبل اسلام بلکہ ماقبل مسیح سے ہی سنتوں، رشیوں، منیوں، بودھ بھکشوؤں، گیانیوں اور مہاپنڈتوں کا گڑھ رہا ہے، یہاں اس کثرت سے ریاضت ومجاہدات کے مراکز تھے کہ پورا علاقہ ہی ایک وہار کی شکل اختیار کر گیا اور پھر دھیرے دھیرے یہ خطہ وہار پھر بہار کہلانے لگا۔

اسی خطہ سے ہندو دھرم کی تاریخ میں دو مرتبہ بھونچال آیا، ایک مرتبہ مہاتما جین سے، دوسری مرتبہ گوتم بدھ سے، ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد صوفیاء کرام نے اشاعت اسلام کیلئے بختیار خلجی کی آمد سے پہلے ہی اس خطہ کی طرف رخ کرنا اور وہاں مسند ارشاد و ہدایت بچھانی شروع کردی تھی جس کی شہرت راجدھانی دہلی تک تھی، حضرت نظام الدین اولیا سیر الاولیاء میں لکھتے ہیں'' میں نے

ابتدائی زمانہ میں آنے والوں سے سنا کہ شیخ خضر کی خانقاہ بہار میں درویشوں کی خدمت میں بڑی شہرت رکھتی ہے، میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ چلا جاؤں اور خانقاہ کے درویشوں اور خانقاہ کے بچوں کو تعلیم دوں، چند دنوں کے بعد وہاں سے کچھ لوگ آئے، شیخ خضر نے ان کے ذریعہ سے جو خط مجھے بھیجا اسمیں میرے اخلاق وسیرت کی بے حد تعریف کی گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ شیخ خضر نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اب میں وہاں نہ جاؤنگا۔

(مجلہ صدی تقریبات مدرسہ منیر الاسلام، بہار شریف میں شامل مضمون "بہار شریف کے چند صوفیائے کرام" بقلم سید شاہ قسیم الدین احمد منعمی (صفحہ ۱۶۳)

مخدوم شرف الدین احمد یحیٰ منیری، ملا محب اللہ بہاری، بیدل عظیم آبادی اور قریبی زمانہ میں علامہ شوق نیموی، مولانا شمس الحق ڈیانوی، شاد عظیم آبادی، علامہ مناظر احسن گیلانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالمحاسن سجاد، مفتی ظفیر الاحسان مجددی، مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی اور کلیم عاجز صاحب اسی خطہ علم وادب سے تعلق رکھتے ہیں۔

صاحب جامع الرضوی مولانا ظفرالدین صاحب کا تعلق بھی اسی خطہ سے ہے اور ان کا نسبی تعلق بہار کے ملک خاندان سے ہے جن کے مورث اعلیٰ سید ابراہیم ملک فیروز شاہ تغلق کے زمانہ (۷۵۲-۷۹۰ھ) میں شاہی فوج میں اچھے عہدہ پر تھے، قلعہ رہتاس کی جنگ میں شہید ہوئے اور تدفین بہار شریف کی ایک اونچی پہاڑی پر ہوئی، آپ کا نسب نامہ ساتویں پشت میں شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔

نالندہ اور راجگیر کے قریب ایک جگہ رسول پور مجہرا ہے جہاں ایک زمانہ سے مولانا ظفرالدین کا خاندان آباد تھا، یہیں ۱۰ محرم ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۸۰ء میں مولانا ظفرالدین کی پیدائش ہوئی، چار سال کی عمر میں رسم بسم اللہ ادا ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، جبکہ جلالین اور میرزاہد تک کی تعلیم ایک علاقائی مدرسہ مدرسہ غوثیہ حنفیہ میں ہوئی۔ جہاں انہوں نے عربی کی زیادہ تر کتابیں منٔو کے مولانا ابراہیم صاحب سے پڑھیں جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوئ کے جامع العلوم کانپور کے

شاگرد تھے، مدرسہ حنفیہ کے بعد مولانا بہاری، مدرسہ حنفیہ پٹنہ ٹی آ گئے جہاں اس وقت ایک نامور استاد مولانا شاہ وصی احمد سورتی (وفات ۱۳۳۴ھ) مدرس تھے، اس کے بعد جب مولانا سورتی مدرسہ چھوڑ کر وطن پیلی بھیت واپس چلے گئے تو مولانا ظفرالدین بہاری نے بھی ۱۳۰۲ھ میں پٹنہ کو خیرآباد کہہ کر کانپور کا رخ کیا، ان دنوں کانپور میں حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے دست گرفتہ اور مشہور عالم مدرس مولانا احمد حسن پنجابی ثم کانپوری، جو پہلے مظاہر علوم سہارنپور میں نائب صدر مدرس تھے، مسند درس آراستہ کئے ہوئے تھے، مولانا بہاری نے ان سے اور ان کے شاگرد مولانا قاضی عبدالرزاق (وفات ۱۹۳۶ء) سے متعدد کتابیں پڑھیں، پھر اس کے بعد آپ مولانا سورتی سے حدیث پڑھنے کیلئے پیلی بھیت چلے گئے (مولانا سورتی، مولانا احمد علی سہارنپوری کے شاگرد تھے) اور پیلی بھیت سے ۱۳۲۱ھ میں بانس بریلی کے مدرسہ مصباح پہونچے، جہاں انہیں مولانا غلام یسین صاحب فاضل دیوبند سے شرف تلمذ حاصل ہوا، یہیں دوران قیام مولانا احمد رضا خاں بریلوی (۱۲۷۲-۱۳۴۰ھ) سے ملاقات ہوئی جن کی شہرت تحریک ندوہ، دیوبند، ان کے نامور اکابر اور اس عہد کے بہت سے اہل علم وفکر کی شدومد سے مخالفت وتکفیر، وزودنویسی وبسیارنویسی اور ذہانت وفطانت کی وجہ سے دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس وقت تک مولانا احمد رضا خاں صاحب کا مدرسہ منظر اسلام قائم نہیں ہوا تھا۔ مولانا ظفرالدین صاحب نے مولانا احمد رضا خاں صاحب کے اہل خاندان سے مل کر مدرسہ کی تاسیس کی راہ ہموار کی، اس طرح ۱۹۰۴ء میں جن دو طالب علموں سے منظر اسلام کی شروعات ہوئی انمیں ایک مولانا ظفرالدین بہاری تھے۔ منظر اسلام میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی کے استاد مولانا ارشاد حسین رامپوری (پیدائش ۱۲۴۸ وفات ۱۳۱۱ھ) کے شاگرد مولانا حامد حسن رامپوری اور استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علیگڑھی (پیدائش ۱۲۴۴ھ وفات ۱۳۳۴ھ) کے تلمیذ خاص مولانا سید بشیر احمد علی گڑھی سے درسیات کی تکمیل کی۔

ذاتی شوق ولگن، فطری ذہانت وذکاوت اور ماہرین فن سے شرف تلمذ نے مولانا بہاری کی استعداد کو کامل اور پختہ بنادیا۔

فراغت کے بعد تدریسی زندگی کا آغاز منظر اسلام ہی سے ہوا، اس کے بعد آرہ، شمس الہدی پٹنہ، سہسرام اور پھر شمس الہدی میں ۱۹۵۰ء تک تدریسی فرائض انجام دیئے ۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک شمس الہدی میں پرنسپل کے عہدہ پر رہے۔ اس زمانہ میں شمس الہدی میں مفتی سہیل صاحب بھاگلپوری، حاجی معین الدین ندوی (وفات ۱۹۴۱ء) مولانا احمد حسن کانپوری کے صاحبزادہ مولانا مشتاق احمد کانپوری، اور مولانا مقبول احمد دربھنگوی جیسے جید الاستعداد اساتذہ ہوا کرتے تھے۔

شمس الہدی سے سبکدوشی کے بعد تصنیفی، تبلیغی و دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ تدریسی سلسلہ کو بھی گھر پر جاری رکھا۔

مولانا ظفر الدین قادری نے طویل عمر پائی۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۶۲ء میں وفات ہوئی۔

(باب السوانح کی زیادہ تر معلومات ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے مضمون "ملک العلماء حضرت مولانا ظفر الدین قادری۔ حیات و تصانیف" سے لی گئی ہیں۔ یہ مضمون جامع الرضوی کے پاکستانی ایڈیشن کیلئے خاص طور پر تحریر کیا گیا تھا، رضا اکیڈمی ممبئی کے ان کے ایڈیشن میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔)

مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے شاگردوں، خلفاء اور ان کے افکار کے علمبرداروں میں مولانا ظفر الدین صاحب بہاری اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ ان کے تعلقات دوسرے مکاتب فکر کے اہل علم سے بھی خوشگوار تھے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ ان کے متعدد باکمال اساتذہ یا تو اکابر دیوبند کے خوشہ چیں تھے یا جو صرف ایسے مدرس تھے، جنہیں اختلافی امور سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ دوسری وجہ شمس الہدی پٹنہ سے طویل عرصہ تک وابستگی ہوسکتی ہے جہاں ہر مسلک کے اہل علم کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ معارف اور صدق جدید میں ان کے بعض خطوط اور مضامین شائع ہوئے، معارف میں ۱۹۳۰ء کے جنوری و فروری کے شماروں میں "مشرق اور سمت قبلہ" کے عنوان سے ان کا ایک مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا۔

جامع الرضوی:

حدیث کے جو مجموعے محدثین نے تیار کئے انہیں ایک قسم ان مجموعوں کی ہے جن میں مسائل

واحکام کی حدیثوں کو فقہی ترتیب پر جمع کیا گیا ہے۔

اس صنف کے مجموعوں میں ابو محمد عبدالحق اشبیلی (وفات ۵۸۱ھ) کی الاحکام الکبریٰ، الاحکام الوسطی اور الاحکام الصغری، امام عبدالغنی مقدسی (وفات ۶۰۰ھ) کی عمدۃ الاحکام، حافظ ابن دقیق العید کی احکام الاحکام اور حافظ ابن حجر کی بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام وغیرہ معروف و متداول ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو ہندوستان کے باہر تصنیف ہوئیں۔

اس باب میں ہندوستانی محدثین کی قابل ذکر تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) الغرۃ المنیفۃ فی ترجیح مذہب ابی حنیفۃ تالیف ابوحفص سراج الدین عمر بن اسحاق الغزنوی (وفات ۷۰۳)

(۲) فتح المنان فی تائید مذہب النعمان تالیف شیخ عبدالحق محدث دہلوی (وفات ۱۰۵۲ھ)

(۳) عقود الجواہر المنیفۃ فی أدلۃ الإمام أبی حنیفۃ تالیف سید مرتضی بلکرامی زبیدی (وفات ۱۲۰۵ھ)

(۴) نور الإیمان فی تائید مذہب النعمان

(۵) اور المواہب اللطیفۃ فی تائید مذہب ابی حنیفۃ تالیف شیخ عبدالعلی مجراتی (وفات ۱۲۹۶ھ)

اب خاص طور پر ان مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں تالیف ہوئے اور جن میں سے ایک میرے مقالہ کا اصل موضوع ہے:

الف۔ آثار السنن ،تالیف علامہ ظہیر احسن شوق نیموی (وفات ۱۳۲۲ھ)

ب۔ إعلاء السنن تالیف مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی (وفات ۱۳۹۴ھ)

فقہ السنن والآثار تالیف مفتی عمیم الاحسان مجددی (وفات ۱۳۸۳ھ)

زجاجۃ المصابیح تالیف محدث دکن حضرت سید عبد اللہ شاہ نقشبندی۔

جامع الرضوی تالیف مولانا محمد ظفر الدین قادری عظیم آبادی (وفات ۱۹۶۲ء)

یہ سارے مجموعے وہ ہیں جنہیں حنفی مسلک کی تائید وتقویت کیلئے محدثین احناف نے تیار کئے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کے جو مجموعے امت میں مقبول اور رائج ہیں وہ سب غیر حنفی محدثین وعلماء کے ہیں۔احناف زیادہ تر اس وقت کی دنیا کے متمدن علاقوں کی فتح کے بعد امت کو درپیش نت نئے مسائل کو قرآن وحدیث کی روشنی میں حل کرنے میں ایسے غرق ہوئے کہ انہوں نے اس طرف بہت کم توجہ کی، بعد میں جب مسالک کو دلائل کے ترازو میں تولنے اور مسالک کے مابین موازنہ ومقارنہ کا دور آیا تو حنفیوں کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا اور جہاں تک برصغیر کا تعلق ہے تو جب حنفی مسلک کے بارے میں جس پر یہاں کے نوے فیصد مسلمان عمل کرتے ہیں یہ کہا جانے لگا کہ حنفی مسلک حدیث کے خلاف ہے، خاص طور پر میاں صاحب دہلوی کے نامور شاگردوں کی تصنیفات اوران کے حلقہائے درس سے اس نعرہ میں شدت پیدا ہوئی تو محدثین احناف نے ایک فریضہ سمجھ کر حدیث کے ان مجموعوں کی تالیف وترتیب کا کام انجام دیا۔

اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اس موضوع پر خالص محدثانہ طرز پر ترتیب وتالیف کا تعلق ہے تو علامہ شوق نیموی کو تقدم کا فضل اور آثار السنن کو نقش اول کا درجہ حاصل ہے۔ بعد میں آنے والوں نے انہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے، بعض نے تو اس سلیقہ سے ان کے ہنر اور فن کو اپنایا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ نقش اول کو نقش ثانی پر یا نقش ثانی کو نقش اول پر ترجیح دیجائے۔

مولانا ظفر الدین صاحب بہاری "جامع الرضوی" کو چھ ضخیم جلدوں میں مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔خطہ کے مطابق پہلی جلد عقائد پر دوسری جلد طہارت اور صلوۃ پر تیسری جلد زکاۃ، صوم اور حج پر، چوتھی جلد نکاح، رضاعت، طلاق، عتق تا شرکت اور وقف پر، پانچویں جلد بیوع، صرف، کفالت، حوالہ، قضاء، شہادت وکالت، دعوی، اقرار وصلح تا اکراہ ماذون اور غصب پر، اور چھٹی جلد شفعہ، مزارعت، مساقاۃ، ذبائح، اضحیہ، اباحت، احیاء الاموات، اشربہ، جنایات، دیات تا معاقل وصایا اور فرائض پر مشتمل ہوتی لیکن صرف دوسری اور پہلی جلد لکھی جاسکی۔اور چھپی صرف دوسری جلد جو طہارت سے شروع ہوکر ابواب ایصال ثواب پر ختم ہوتی ہے۔ درمیان میں صلوۃ اور جنائز اور متعلقہ

ابواب کی حدیثیں ہیں۔

شروع میں پچیس صفحات کا ایک مقدمہ ہے جو ۳۲ فوائد پر مشتمل ہے۔ مصنف مقدمہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

ولنقدم قبل الشروع في المقصود مقدمة تشتمل على فوائد الفطا من تصانيف العلماء لا سيما سيدي و ملاذي، شيخي و أستاذي شيخ الإسلام و المسلمين، وارث علوم سيد المرسلين، مؤيد الملة الطاهرة، مجدد المائة الحاضرة مولانا الشاه أحمد رضا خان البركاتي البريلوي نفعنا الله ببركاته في الدنيا والآخرة"۔

اس سے جہاں مولانا احمد رضا خان صاحب سے مصنف کی گہری عقیدت وشیفتگی ظاہر ہوتی ہے۔ وہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کتاب کی تصنیف کا آغاز مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی زندگی ہی میں ۱۳۴۰ھ سے پہلے ہو چکا تھا کیونکہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کی وفات ۱۳۴۰ھ میں ہوئی۔ جبکہ اس کی تسوید کا کام ۱۳۳۹ھ میں اور تبییض کا کام ۱۳۵۷ھ میں پورا ہوا۔ جب طباعت کا مرحلہ آیا تو کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کر کے چار مرحلوں میں شائع کیا گیا۔ پہلا حصہ ۲۲۰ صفحات میں ۱۲۲۳۴ حادیث پر مشتمل آگرہ سے ۱۹۳۱ء میں چھپا، بقیہ تین حصے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک پٹنہ ہی سے چھپے، اعد اء میں اس وقت کے بہار واڑیسہ کے وزیر تعلیم فخرالدین خان بہادر کا نام ہے۔ اس وقت کے متعدد علماء نے اس پر تقریظیں لکھیں اور متعدد موقر پرچوں میں حوصلہ افزا تبصرے شائع ہوئے۔ آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے نصف صدی کے بعد پاکستان سے دوسری مرتبہ یہ کتاب چھپی، اس کے بعد ہندوستان میں قلیل مدت میں دو مرتبہ چھپی، رضا اکیڈمی ممبئی، نے ابھی حال ہی میں ۲۰۰۳ء میں اسے شائع کیا ہے، جامع الرضوی ۹۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور حدیثوں کی تعداد ۹۲۸۶ ہے ۔

جامع الرضوی کے مقدمہ کے مشمولات:

☆ جامع الرضوی کا مقدمہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہے:

☆ احناف دوسروں کے مقابلہ میں حدیث پر زیادہ عمل کرتے ہیں:

☆ مراتب حدیث اوران کے اقسام، حدیث ضعیف جب متعدد طرق سے مروی ہو تو حسن درجہ کی ہو جائے گی۔ حدیث کی تقویت کیلئے دوسندیں کافی ہیں۔

☆ حدیث ضعیف اہل علم کے عمل سے قوی ہو جائے گی۔

☆ حدیث ضعیف علماء کے تجربہ سے عمل کے لائق ہو جاتی ہے۔

☆ فضائل میں ضعیف حدیث پر عمل مستحب ہے۔

☆ فضائل میں حدیث ضعیف پر عمل کا ثبوت حدیث سے۔

☆ فضائل میں ضعیف حدیث پر عمل کا عقلی ثبوت، احکام میں بھی ضعیف حدیث پر عمل کیا جاسکتا ہے، مصنف اس کو ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الحديث الضعيف يعمل به في الأحكام أيضاً ،إذا كان محلاًللاحتياط، واصله قوله صلى الله عليه وسلم ،"كيف وقد قيل "رواه البخارى عن عقبة بن الحارث النوفلى رضى الله عنه . قال العلامة الشهاب الخفاجى فى نسيم الرياض فى شرح الخطبة: اماالأحكام كالحلال والحرام والبيع والنكاح والطلاق وغيرذلک فلايعمل فيها إلابالحديث الصحيح اوالحسن إلا أن يكون فى احتياط فى شيئى من ذلک كما إذا ورد حديث ضعيف بكر اهة بعض البيوع او الأنكحة فإن المستحب ان يتنزه عنه ،ولكن لايجب".

یہ بحث دو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے، مقدمہ کا پورا زور اس پر ہے کہ کمزور احادیث سے استدلال واستنباط کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کی جائے۔ آثار السنن، اعلاء السنن، فقہ السنن والآثار، زجاجۃ المصابیح اور جامع الرضوی کا تقابلی مطالعہ، کس کی کیا شناخت اور امتیازی شان ہے، کن وجوہ سے کس کو تمام پر یا بعض پر ترجیح دی جائے، یہ کام اگر چہ ایک مستقل مقالہ کا متقاضی ہے لیکن بعض واضح اور بین امتیازات کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جامع الرضوی کا سب سے بڑا امتیاز کثرت ابواب وفصول اور بحیثیت کثرت احادیث ہے۔ فقہ السنن تالیف مفتی عمیم الاحسان میں طہارت کے ابواب وفصول کی تعداد تقریباً سواسو ہے۔ جبکہ جامع

الرضوی میں طہارت کے ابواب وفصول کی تعداد تقریباً سوا چار سو ہے۔ اور آثار السنن تالیف علامہ نیموی میں طہارت کے ابواب وفصول کی تعداد پچاس سے زائد نہیں ہے۔

صاحب فقہ السنن والآثار، صاحب اعلاء السنن اور صاحب آثار السنن ہر حدیث کی مکمل تخریج کرتے ہیں۔ ایک ماہرفن محدث کی حیثیت سے رجال سے بحث کرتے ہیں، جس حدیث کو یہ حضرات استدلال میں پیش کرتے ہیں ان کی صحت کا پورا خیال رکھتے ہیں، اس کے برعکس جامع الرضوی اس وصف سے خالی نظر آتی ہے، جہاں تک ترتیب اور عناوین کا تعلق ہے تو اس عاجز کی رائے میں اس باب کی کتابوں میں اس پہلو سے وہ فائق ہے۔

ایک قابل توجہ بات: چودہویں صدی ہجری میں مرتب احادیث الاحکام کے جن مجموعوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے انمیں سے اگر ایک کا تعلق علماء دیو بند سے ہے، تو دوسرے کا بریلی سے، تیسرے کا مدرسہ عالیہ کلکتہ سے، چوتھے کا فرنگی محل سے اور پانچویں کا تعلق جامعہ نظامیہ سے ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میدان میں احناف کے تمام مکاتب فکر کی خدمات اور کام ہیں۔



حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

اور

علم حدیث

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ہندوستان گوکہ گہوارہ علم حدیث سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر واقع ہے، لیکن اس چشمہ صافی سے فیضیاب ہونے کی سعادت ہند کے مکینوں کو اولین صدیوں میں ہی حاصل ہوگئی تھی، جب قافلہ اہل تجارت کی آمد کے ساتھ علم حدیث کے زمزمہ خیز نغمے بھی یہاں کی فضاؤں میں گونجنے شروع ہوگئے تھے، عرب و ہند کے فاصلہ نے اہل ہند کے دلوں میں ذات رسالتمآب ﷺ اور ان کے اسوہ و عمل کے ساتھ محبت و عشق کی آنچ کو ہمیشہ تیز تر رکھا اور فراق و مجبوری کی کیفیت انھیں مہمیز کرتی رہی اور وہ پیکر قدسی صفات ﷺ کی حیات طیبہ کے ایک ایک گوشہ کو محفوظ اور عام کرنے میں منہمک رہے۔

ابتدائی صدیوں کے یہ روشن نقوش بحر ہند کے ساحلوں اور ساحلی علاقوں کی خاک پر ثبت ہیں قرون اولی کا زریں عہد حجاز وشام اور عرب کے دوسرے شہروں کے لئے حدیث کی خدمت واشاعت کا تابناک اور عظیم الشان دور تھا، لیکن عہد وسطی میں جب اسلامی مملکت کی عربی بنیادیں کمزور ہوگئیں

اور علم وادب کے سرمایہ افتخار شہر ویران کر دیے گئے، اس موقع پر سرزمین ہند نے ہی بڑھ کر اس مبارک فن کے پرچم کو تھاما اور اس کے گھنیرے سایوں کی راحت آگیں ٹھنڈک سے مسلمانان ہند کے دلوں کو تازگی بخشی اور ان کی شاہراہ حیات کو روشنی فراہم کی۔ پھر اس مقدس سفر کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا اور علم حدیث کی خدمت میں علماء ہند بہترین جگر کاویاں کرتے گئے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادہ کے بعد حضرت الامام فخر ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ان کے خانوادہ اور شاگردوں نے خدمت حدیث کی ایسی چمن زاری فرمائی کہ اس کی بھینی بھینی خوشبو سے سارا عالم اسلام معطر ہو اٹھا اور عرب وعجم نے ہندی علماء کی عظیم خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

علم حدیث کے ساتھ علماء ہند کا ذہنی وفکری اور قلبی اور وجدانی تعلق رہا ہے، اس کی تعلیم وتدریس اور اس سے اشتغال کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اس کی روح پرور فضاؤں میں اپنی پوری زندگی گذار دی۔ ملک میں دیوبند، لکھنؤ، سہارنپور، اعظم گڑھ، گجرات، حیدرآباد اور کتنے ایسے خطے روشن ہوئے جہاں علم حدیث کی محفلیں سجیں اور قال اللہ وقال الرسول کی زمزمہ سنجیوں سے فضائیں گونج اٹھیں۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں سے علم حدیث کی خدمت اور اس کے فیوض کی اشاعت کے وہ چشمے جاری ہوئے جن سے ہزار ہا ہزار تشنگان علم سیراب ہو رہے ہیں اور امت مسلمہ کا رشتہ اس کے دین عزیز سے استوار رکھے ہوئے ہیں۔

سرزمین ہند کو اس بات کا بھی فخر حاصل ہے کہ یہاں کی ملت اسلامیہ ایک جانب تمام تر مظلوک الحالی اور دوسری طرف خطرناک فتنہ سامانی کے باوجود شجر اسلام سے پیوستہ رہی اور ہر ممکن قربانی دے کر اپنے دینی تشخص کا تحفظ کرتی رہی۔ یہ بھی دراصل اسی علم حدیث کے ساتھ ان کے اشتغال کا ثمرہ تھا۔

ہند کے طول وعرض پر اگر نظر ڈالی جائے تو علم حدیث کے ساتھ انتساب رکھنے اور اس کی خدمت میں مصروف رہنے والوں کی پوری کہکشاں دیکھی جاسکتی ہے، ماضی قریب کی ایسی ہی بابرکت ہستیوں میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ہے۔ حضرت علامہ عثمانیؒ ایک ہمہ جہت

شخصیت اور ہمہ اوصاف کردار کے مالک تھے، ان کی ایک ذات میں کئی شخصیتیں جمع ہوگئی تھیں، وہ سنجیدہ و متین خطیب، بہترین صاحب قلم، مدبر سیاست داں، دردمند مصلح قوم اور بیدار مغز رہبر تھے، ان کا علم گہرا اور نظر وسیع تھی، مسند درس کو انھوں نے ایک طویل عرصہ تک زینت بخشی اور رجال کار ہی نہیں رجال گر تیار کر گئے۔ وہ بیک وقت صاحب سیف و قلم تھے۔ ان کے قلم فیض رقم سے متعدد قیمتی تصنیفات نکلیں جو ان کے علمی کمالات کی غماز ہیں۔ قومی رہنمائی اور سیاست کے میدان میں بھی وہ ابتداء ہی سے اتر گئے تھے، جمعیت علماء ہند سے وابستہ رہ کر نمایاں خدمات انجام دیں، خلافت کمیٹی کے ممبر ہوئے اور اس میں سرگرم حصہ لیا، جمعیت علماء اسلام کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے، الیکشن میں حصہ لیا اور مسلم لیگ سے کامیاب ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد دستوری اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور شرعی دستور ساز کمیٹی کی صدارت فرمائی۔ یوں آپ نے مختلف ناموں اور متنوع عناوین کے ساتھ قومی رہنمائی اور رہبری کا فریضہ انجام دیا۔

گو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت کثیر الجہات تھی، لیکن آپ کا اصل میدان کار شرعی علوم و معارف کی خدمت تھی۔ ازہر ہند دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہاں تدریس کی خدمات انجام دینی شروع کی، اور برسوں (۱۳۲۸ھ۔۱۳۴۶ھ) منتہی درجات کے طلبہ کو پڑھاتے رہے، مسلم شریف کا آپ کا درس بے حد مقبول و معروف تھا، پھر آپ کا فیض علم گجرات کے شہر ڈابھیل منتقل ہوا اور (۱۳۵۲ھ۔۱۳۵۴ھ تک) آپ وہاں شیخ الحدیث کی مسند پر فائز رہے، ۱۳۵۴ھ میں دوبارہ اپنے مادر علمی دارالعلوم دیوبند واپس آئے اور یہاں آپ کا چشمہ فیض جاری ہوا۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے متعدد فنون کے میدانوں میں اپنے فضل و کمال کے نقوش ثبت کئے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن پر آپ کے تفسیری حواشی بہت مقبول ہوئے، حکمت دین اور احکام دین پر آپ نے کتابیں لکھیں، لیکن علم حدیث کے ساتھ آپ کا اشتغال سب سے بڑھا ہوا تھا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ اصلاً محدث تھے، اور مسلم شریف کے علوم حدیثیہ پر بھرپور دسترس رکھتے تھے، مسلم شریف کی شرح پر آپ کی تصنیف "فتح الملہم" اپنی نوعیت کی ممتاز شرح اور قیمتی علمی سرمایہ ہے۔

اہل علم آگاہ ہیں کہ روئے زمین پر گو کہ کلام الٰہی کے بعد اصح ترین کتاب صحیح بخاری شریف ہے، لیکن اس کے بعد دوسرے نمبر پر اور حدیث کے فنی پہلو کے متعدد امتیازی خصائص کے لحاظ سے اولین مقام پر صحیح مسلم شریف آتی ہے لیکن بخاری شریف کی شرح وتوضیح اور مختلف پہلوؤں سے اس کی خدمت پر جتنی کاوشیں صرف ہوئی ہیں اور اکابرفن نے اس پر اپنے رشحات قلم سپرد قرطاس کئے ہیں، مسلم شریف کی تشریح وتفصیل کے باب میں کم کام ہوا ہے، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نہ صرف اساطین حدیث کے صحبت اور فیض یافتہ تھے بلکہ خود بھی ایک طویل عرصہ تک مسلم شریف کی تدریس کی خدمات انجام دی تھیں، علوم وفنون حدیثیہ پر گہری نظر اور دستگاہ رکھتے تھے۔آپ کی ذات مسلم شریف کی شرح کے لئے موزوں ترین شخصیت تھی، پھر درس وتدریس اور مطالعہ وفکر کے دوران آپ نے اسلاف علم سے جو خوشہ چینی کی تھی اور خود آپ کے قلب پر جن نکات کا فیضان ہوا تھا، وہ قیمتی سرمایہ تھے، چنانچہ آپ نے اس مبارک ومسعود کام کا آغاز فرمایا اور اپنی گوناگوں بلکہ سکون شکن مشغولیات کے ماحول میں اس سلسلہ کو آگے بڑھایا، اور بڑی تقطیع کے ضخیم صفحات پر مشتمل تین جلدیں جو آغاز کتاب سے کتاب النکاح تک پر حاوی ہیں، مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آئیں، لیکن اسی منزل پر پہنچ کر آپ پیغام اجل کو لبیک کہہ گئے اور آپ کے ہاتھوں یہ سلسلہ مکمل نہ ہو پایا۔

فتح الملہم کی تین جلدیں مطبوعہ مکتبہ اشرفیہ دیوبند راقم کے پیش نظر ہیں، حضرت علامہ عثمانیؒ نے اس کتاب کو آصفجاہ سابع میر عثمان علی خاں بہادر کے نام منسوب کیا ہے، متن مسلم کی شرح سے پہلے علامہ موصوف نے اصول حدیثی وفقہی پر ایک مبسوط مقدمہ سپرد قلم فرمایا ہے، جس میں نہ صرف اصول حدیث کے اہم مباحث آگئے ہیں بلکہ حدیث سے استنباط احکام اور بظاہر متعارض احادیث میں تطبیق وترجیح کے حنفی منہج کا جامع بیان یکجا ہو گیا ہے، پھر مقدمہ مسلم کی شرح ہے اور اس کے ساتھ ہی احادیث ابواب کی شرح شروع ہو جاتی ہے۔علامہ عثمانیؒ کی شرح علوم ومعارف کا ایک گنجینہ ہے، الفاظ کی لغوی توضیح، اسماء کا ضبط، متن حدیث کا مفہوم، استنباط مسائل پر کلام اور حدیث کی حکمت ومعانی پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، بسا اوقات حضرت شارح موصوفؒ اپنے قلب پر منکشف ہونے

والے نکات کو رقم کرتے ہیں جن سے آپ کے تبحر علمی، فقاہت نفس اور علم حدیث کے ساتھ طبعی مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے، فتح الملہم بنیادی طور پر حنفی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھی گئی شرح ہے، لیکن علامہ موصوف نے دیگر فقہی مسالک کی آراء کا بھی ذکر کیا ہے، اور ان کے دلائل نقل کئے ہیں، البتہ حنفی رائے کی ترجیح ثابت فرمائی ہے، اس بناء پر فتح الملہم مسلم شریف کی حنفی نقطۂ نظر سے پہلی شرح قرار پاتی ہے، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی یہ عظیم خدمت نہ صرف فقہ حنفی کی حدیثی تشریح و استدلال کا قابل افتخار کارنامہ ہے، بلکہ مسلم شریف کی شرح کے باب میں ایک وقیع اضافہ ہے جس کی ضرورت اہل علم کے دلوں کی آواز تھی۔

حضرت علامہ عثمانیؒ کو قضاء نے شرح کی تکمیل کی مہلت نہ دی، اور کتاب النکاح سے آگے کام نہ ہوسکا، تاریخ کی کئی نامور و عظیم مصنفین اور شارحین کی طرح شرح مسلم کا یہ سلسلہ بھی مصنف کے قلم سے ناقص رہ گیا، لیکن اللہ نے بہت جلد اس کی تکمیل کا سامان بہم پہنچا دیا، اسی دار العلوم دیو بند کے مایہ ناز سپوت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے فاضل صاحبزادہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کو اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھانے کی ہدایت فرمائی اور اپنی خصوصی دلچسپی و نگرانی میں کتاب الرضاع سے شرح مسلم کا کام شروع کرایا۔ حضرت مفتی شفیع علیہ الرحمہ تو جلد ہی داعی اجل کو لبیک کہہ گئے، لیکن پیکر عزم اور فخر علماء مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے ایک طویل عرصہ میں سعی اس عظیم سلسلہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا، کتاب الرضاع سے آخر کتاب تک کی شرح علاحدہ چھ جلدوں میں تکملہ فتح الملہم کے نام سے طبع ہو کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے، اس تکملہ کی جلد اول پر نامور ان فن کے قلم سے تقریظات شامل ہیں جن میں محدث عصر حضرت شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، ممتاز فقیہ حضرت علامہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی، فقیہ تونس ڈاکٹر مختار سلامی کی تقریظات قابل ذکر ہیں، ان ممتاز شخصیتوں نے فتح الملہم کی تکمیل پر اپنی قلبی مسرت کا اظہار کیا ہے اور دونوں شارحین کے فرق اسلوب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تکملہ کے علمی مقام کا اعتراف کیا ہے۔

فتح الملہم اور تکملہ فتح الملہم نہ صرف دو علاحدہ شارحین کے قلم کا نتیجہ ہیں، بلکہ دونوں میں زمانہ کا فرق بھی موجود ہے، یہ کم سواد نہ اتنی علمی بضاعت رکھتا ہے، نہ گہرائی نظر کہ دونوں عالی مقام شارحین کے کلام کا موازنہ کرنے کی جرأت کرے۔ البتہ ظاہری نگاہوں سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ شارح اولؒ نے اپنے نصب العین کے مطابق ایک عظیم کام کا بیڑا اٹھایا اور علوم و معارف کا خزینہ شرح کی سطور میں جمع کردیا۔ اس وقت کا مطبوعہ نسخہ قدیم طرز کی طباعت پر ہے۔ شارح دوم مدظلہ العالی نے بہ ہمہ وجوہ اسلوب اول کی نقل کے بجائے اپنے اختیار کردہ اسلوب پر شرح لکھی جس میں نئے وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا، چنانچہ تکملہ کی طباعت جدید انداز کی خصوصیات کا حامل ہے اور شرح حدیث کے ضمن میں وقت کے نئے پیدا کردہ سوالات اور مباحث جیسے زمین کی ملکیت، کاغذی نوٹ، بنکاری کے مسائل اور اقتصادی نظریات و دیگر افکار پر اسلامی اصولوں کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ تکملہ میں حنفی نقطۂ نظر کی بھی توضیح ہے اور کئی مقامات پر دیگر فقہی نقاط نظر کو بھی دلائل کی روشنی میں ترجیح دی گئی ہے، ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے اسی سیاق میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا ایک جملہ نقل کیا ہے، جو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، یہ جملہ دراصل خود مفتی تقی عثمانی صاحب نے اپنے مقدمہ میں ذکر کیا ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

"لا بأس ان تكونوا حنفية في مذهبكم الفقهي ولكن اياكم و ان تتكلفوا جعل الحديث النبوي حنفيا" (مقدمہ تکملہ فتح الملہم) تکملہ فتح الملہم میں اس مشورہ کا پرتو موجود ہے اور ڈاکٹر قرضاوی نے ایسی چند مثالوں کی نشاندہی کر کے اس کی تحسین فرمائی ہے، فتح الملہم اور تکملہ کے اس فرق کے تناظر میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے اپنے مقدمہ میں مصنف مفتی تقی عثمانی کو ان الفاظ میں ایک مشورہ دیا ہے: "اقترحت عليه ان يضيف حواشي و تعليقات على شرح العلامة شبير للقسم الأول من الكتاب بالقسم الأخير منه" (مقدمہ تکملہ فتح الملہم ص۱۵، مطبوعہ ۱۹۹۱ء)، یہ مشورہ اگر عملی جامہ پہنتا ہے تو شرح اول کی نئی طباعت جدید طرز پر انجام پاکر اہل علم کے لئے استفادہ میں مزید سہولت کا باعث ہوگی۔

مقام مسرت ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کے ساتھ اشتغال واعتناء الحمدللہ روز افزوں ہے، اور نئی سہولیات سے استفادہ کرتے ہوئے نئی خدمات کا سلسلہ جاری ہے، بایں ہمہ وقت نے جن نئے مباحث کو جنم دیا ہے، علم عقائد اور علم کلام ہی نہیں بلکہ اقتصادیات، سیاسیات، سماجیات اور اخلاقیات تک کے ابواب میں نیا فلسفہ اور نئے نظریات کو مروج کر کے اسلامی اصولوں کے تئیں جو اشکالات اور سوالات کھڑے کئے گئے ہیں، سرمایۂ حدیث کی روشنی میں اس کا بھرپور جواب فراہم کرنا اور طبع سازی کو اتار پھینکنا وقت کی بڑی ضرورت ہے، علم حدیث کی تدریس اور تشریح میں اس منہج کو اپنا کر اس ضمن میں بڑی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پوری زندگی دین اور اہل دین اور علم حدیث کی خدمت میں بسر کر دی، آپ کی پیدائش ۱۰ محرم ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں بجنور میں ہوئی تھی، تقسیم وطن کے بعد آپ کراچی میں مقیم ہوگئے، ابھی آپ کی خدمات کا فیض جاری تھا اور اسی سلسلہ میں آپ جامعہ عباسیہ بھاولپور تشریف لے گئے تھے کہ وہاں مختصری علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ یہ واقعہ ۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۴۹ء کا ہے۔ اس طرح علم وعمل اور رشد وہدایت کا یہ آفتاب برصغیر کے افق پر روشن رہ کر لاکھوں انسانوں کی زندگی کو روشنی اور قلوب کو حرارت پہنچا رہا تھا، ۶۴ برس بعد خاک کراچی میں غروب ہوگیا۔ یہ آفتاب تو ضرور غروب ہوا لیکن فضاؤں میں وہ چاندنی بکھیر گیا جس سے اب بھی مسافران راہ حیات کو رہنمائی اور قلوب کو راحت مل رہی ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مقالہ کی تکمیل کے بعد میں نے آج ہی مرکز الشیخ ابی الحسن ندوی کی لائبریری میں فتح الملہم کا ایک دیدہ زیب نیا ایڈیشن دیکھا جو کمپیوٹر کی اعلی کتابت کے ساتھ ابھی تازہ ۲۰۰۶ء میں طبع ہوا ہے، بارہ جلدوں پر مشتمل اس ایڈیشن کا نام ''موسوعۃ فتح الملہم'' ہے، لیکن اس کی ۱ تا ۶ جلدوں کے سرورق پر (جس میں فتح الملہم کے قدیم نسخہ کی تینوں جلدیں آئی ہیں) تالیف شبیر احمد عثمانی، تعلیقات مفتی محمد رفیع عثمانی، تخریج وترقیم نور البشر بن نور الحق اور مراجعہ وتدقیق ڈاکٹر محمود شاکر درج ہے، اور جلد ۷ تا ۱۲ کے سرورق پر تالیف محمد تقی عثمانی، مراجعہ

وتدقیق و تکملہ محمود شاکر درج ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ فتح الملہم کے قدیم نسخہ کی جلد اول و دوم تو نئے ایڈیشن میں جدید طرز پر ترقیم اور پیراگرافنگ وغیرہ کی سہولیات کے ساتھ موجود ہیں، لیکن جلد سوم (جو کتاب الزکاۃ سے کتاب النکاح تک ہے) کے نئے ایڈیشن میں مفتی شبیر احمد عثمانی کی عبارات ہو بہو موجود ہی نہیں ہیں، کئی جگہوں پر موازنہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ عثمانی کی شرح سامنے رکھ کر نئی شرح لکھی گئی ہے جس میں علامہ عثمانی کی بہت ساری افادات قلم زد کر دی گئی ہیں، اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ نئے ایڈیشن کے آغاز میں کوئی نیا مقدمہ شامل نہیں کیا گیا ہے جس میں ان نئی خدمات یا تبدیلیوں کا تذکرہ ہو، امانت علمی کا تقاضا تھا کہ ایسی تمام تبدیلیاں اگر کسی وجہ سے ضروری محسوس کی گئی تھیں تو ان کا ذکر آغاز میں کیا جاتا، لیکن اس کے بعد بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ علامہ عثمانی کی جانب انتساب باقی رکھتے ہوئے اس میں ایسی بے تحاشا تبدیلی کہاں تک درست ہے؟ ضرورت ہے کہ اہل علم ایسی علمی اعتماد شکنی کا سخت نوٹس لیں، تا کہ اسلاف کے علمی ورثہ کا تاریخی استناد مجروح نہ ہو سکے۔



شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ

بحیثیت ایک محدث

از: مولانا عبداللہ معروفی
دارالعلوم دیوبند

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان میں باضابطہ طور سے اصول ستہ (صحاح ستہ) کے درس کی داغ بیل ڈالنے والی امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم محدث دہلویؒ (۶ے۱۱ھ) کی بابرکت شخصیت ہے، شاہ صاحب نے اصول ستہ پڑھنے، اور سند متصل کے ساتھ ان کو حاصل کرنے کی غرض سے حجاز مقدس کا سفر کیا، سال بھر سے زائد قیام کیا، اور شیخ ابوطاہر مدنی اور دیگر محدثین سے اصول ستہ کا سماع حاصل کر کے ایک نیا ذوق لے کر لوٹے اور حدیثوں کے پڑھانے کا عرب میں جو طریقہ تھا اس طریقہ پر ہندوستان میں درس جاری کیا۔

عرب میں درس حدیث کے تین طریقے تھے:

(۱) پہلا طریقہ سرد روایت: یعنی طالب علم اپنے نسخہ سے روانی کے ساتھ پڑھتا چلا جائے اور شیخ اپنے نسخہ سے مقابلہ کرتا رہے، نہ سند پر کوئی کلام اور نہ متن کی تشریح، ہاں نسخہ یا روایات وغیرہ کا اختلاف ہوتا تو شیخ اس کی وضاحت کر دیتا۔

(۲) دوسرا طریقہ بحث وحل کا تھا، کہ حدیث کی قرات کے بعد اس میں اگر کوئی مشکل لفظ ہوتا،

کوئی پیچیدہ ترکیب ہوتی، یا سند میں کوئی ایسا نام ہوتا جو بہت کم آتا ہے یا ایسے سوالات جو خود بخود پیدا ہوتے ہوں تو ان کی مختصر وضاحت کرتے ہوئے آگے بڑھ جائے۔

(۳) تیسرا طریقہ امعان وتعمق کا تھا، بایں طور کہ سند کے رجال کا تفصیلی دراسہ، جرح وتعدیل کے اعتبار سے راوی کا مقام، سند کے اتصال وانقطاع کی تشریح، اسی طرح الفاظ حدیث کے لغوی اور مرادی معنی کی وضاحت، ماسیق الکلام لاجلہ (غرض شارع) کی تعیین، فقہ حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے متعارض حدیثوں میں تطبیق، ترجیح اور ناسخ منسوخ کا فیصلہ کرنا وغیرہ، غرض ہر کلمہ کے مالہ وما علیہ کو تفصیل سے بیان کرنا۔

شاہ صاحب نے ہندوستان میں آ کر دوسرے اور تیسرے طریق پر درس حدیث کے سلسلہ کو جاری فرمایا اور جن ابواب میں بحث کی ضرورت نہ ہوتی ان کی سرداً قراءت پر اکتفاء فرماتے، شاہ صاحب کی جہاں علمی سطح بلند تھی وہیں روحانیت کے اعتبار سے بھی بہت اونچے تھے، اجتہادی شان کے مالک تھے، نصوص حدیث میں غور کر کے بذات خود ایک نتیجہ پر پہنچتے تھے، ملک کے عام رجحان مذہب حنفی کے اتباع کے برخلاف شاہ صاحب اپنے درس میں بعض دفعہ دوسرے ائمہ کی آراء کو ترجیح دیتے تھے، لیکن عمل مذہب حنفی کے مطابق ہی کرتے تھے، جیسا کہ شاہ صاحب کے ایک شاگرد محمد بن پیر محمد بلگرامی کے نسخۂ صحیح بخاری میں اس کی صراحت ہے، یہ نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے، شاہ صاحب کے الفاظ ہیں:

"كتبه بيده الفقير إلى رحمة الله الكريم الودود، ولي الله أحمد بن عبد الرحيم العمري نسباً، الدهلوي وطناً، الأشعري عقيدة، الصوفي طريقة، الحنفي عملاً، و الحنفي الشافعي تدريساً. (العون الکبیر شرح الفوز الکبیر از حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری زید مجدہ)

اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر چہ اس خاص مسئلہ میں شافعیہ کی رائے راجح ہوتی مگر حنفیہ کی رائے بھی بلا دلیل نہیں تھی، دوسری طرف مذہب حنفی کو چھوڑنے میں عوام کے مبتلائے فتنہ ہونے کا قوی اندیشہ تھا اور عوام کو فتنہ سے بچانا اس راجح مذہب پر عمل کرنے کی بہ نسبت زیادہ اہم تھا، اسی بات کو حضرت اقدس

تھانویؒ نے اپنی کتاب ''الاقتصاد فی بحث التقلید والاجتہاد'' میں یوں فرمایا: کہ کسی متبحر عالم کے نزدیک کسی مسئلہ میں دلائل قویہ سے دوسرے امام کے مذہب کا راجح ہونا معلوم ہوا اور نصوص قرآن و حدیث سے اپنے امام کے مذہب کی دلیل بھی موجود ہو، نیز مرجوح مذہب کو چھوڑ کر راجح کو اختیار کرنے میں عوام کے تشویش میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو مرجوح پر ہی عمل کرنا اولیٰ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے مذکورہ طرز عمل سے بعض اہل علم کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے شاہ صاحب کو غیر مقلد قرار دے کر اپنے حق میں غیر مقلدیت کا جواز پیدا کرلیا، جب کہ شاہ صاحب کی دو عظیم الشان کتابیں ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' اور ''عقد الجید فی بحث الاجتہاد والتقلید'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اس طرح کی فکری آزادی کو ہر کس و ناکس کے لئے باعث گمراہی سمجھتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے علوم کی وراثت ان کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز (متوفی ۱۲۳۹ھ) کی جانب منتقل ہوئی، آپ علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ پر مکمل عبور رکھتے تھے اور حنفیت کے پر جوش ترجمان تھے، آپ کے فتاویٰ اور تفسیر ''فتح العزیز'' اس کے شاہد ہیں۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے علوم کی میراث آپ کے نواسہ شاہ اسحاق (متوفی ۱۲۶۲ھ) کے حصہ میں آئی اور شاہ اسحاق کے ذریعہ علم حدیث کا سلسلہ خوب پھیلا، شاہ اسحاق کے شاگردوں میں شاہ عبدالغنی مجددی (متوفی ۱۲۹۶ھ) اور میاں نذیر حسین بھی تھے، میاں نذیر حسین کو باوجود یکہ علم حدیث میں مہارت حاصل تھی لیکن تقلید سے انحراف کی وجہ سے شاہ اسحاق اور شاہ عبدالعزیز کے نقش قدم پر قائم نہ رہ سکے، اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ فنی و حدیثی مہارت کے ساتھ تقلید اور احترام ائمہ میں پختہ تھے، اور قرآن و حدیث کی اتباع کے ساتھ مذہب حنفی پر پورے طور سے کاربند تھے، شاہ اسحاق کے مکہ ہجرت کر جانے کے بعد دہلی میں حدیث کی دو مسندیں بچھ گئیں ایک میاں صاحب کی اور ایک شاہ عبدالغنیؒ کی، شاہ عبدالغنی کے شاگردوں میں مولانا قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ)، مولانا یعقوب نانوتوی (متوفی ۱۳۰۰ھ)، مولانا محمد مظہر نانوتوی (متوفی ۱۳۰۲ھ) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی

۱۳۲۳ھ) ہیں جو فکر دیو بند کے اولین پیشوا اور امام ہیں۔

محرم سنہ ۱۲۸۳ھ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کے ذریعہ دیو بند میں ایک مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال سہارنپور کے محلہ قاضی میں بھی مولانا مظہر نانوتوی اور مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری (متوفی ۱۲۸۶ھ) کے ہاتھوں ایک عربی مدرسہ کی بنیاد پڑی، اللہ تعالیٰ نے ان مدرسوں کو وہ مقبولیت عطا فرمائی کہ متحدہ ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا جال بچھ گیا، اور سرزمین ہند کی فضا ''قال اللہ'' اور ''قال الرسول'' کے نغموں سے گونجنے لگی اور علوم شرعیہ بالخصوص علم حدیث کے میدان میں دارالعلوم، مظاہر علوم اور ان کے نہج پر قائم مدارس کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں نظر آنے لگیں، نہ صرف تدریس بلکہ تصنیفی میدان میں بھی دبستان دیو بند کو امتیازی مقام حاصل ہے، اور آج دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہوگا جہاں مدرسہ دیو بند کا فیضان بالواسطہ یا بلاواسطہ نمایاں نظر نہ آ رہا ہو۔

درس حدیث میں دبستان دیو بند کا امتیاز:

چاروں فقہی مسالک صدیوں سے مسلم چلے آ رہے ہیں، ان میں مسائل و دلائل کا اختلاف تھا، مگر کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں تھی کہ فلاں مسلک یا فلاں مکتبہ فکر طریقہ رسول ﷺ کے خلاف ہے، بلکہ چاروں مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کو رسول اللہ ﷺ کا تابعدار جانتے اور سمجھتے تھے، مگر جب ایک نئی جماعت بنام ''اہل حدیث'' وجود میں آئی، اور اس نے شوشہ چھوڑنا شروع کر دیا کہ احناف کا مسلک سنت وحدیث کے مطابق نہیں ہے تو اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ حنفی مسلک مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور عین سنت کے مطابق ہے بزرگوں نے متعدد رسائل لکھے، اور حدیث کے درس کے دوران ان مسائل سے متعلق احادیث میں بہ نسبت دیگر احادیث کے کچھ زیادہ بسط و تفصیل سے کام لیا، مذکورہ بالا اکابر دیو بند خصوصاً حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی اور حضرت شیخ الہند رحمہم اللہ کا طرز تدریس یہی تھا۔

مگر جب (سنہ ۱۳۳۳ھ) میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۵۲ھ)

دارالعلوم دیو بند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہوئے تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس طرح کے مسائل کو بہت بسط وتفصیل سے بیان کرنا شروع کیا، ہر فریق اپنی دلیل میں جس حدیث کو پیش کرتا، یا اس مسلک کے خلاف جس حدیث کو پیش کیا جاسکتا تھا اس پر مفصل گفتگو کرتے، اس کے جملہ متعلقات اور منشأ اختلاف کو بیان کرتے، شراح حدیث کی عبارتوں کو ذکر کرتے، ان کتابوں کی خصوصیات بیان کرتے، اس ضمن میں کسی محدث یا عالم کا ذکر آتا تو اس کے علمی مقام پر روشنی ڈالتے، دیگر علماء کی تحقیقات ذکر کرتے، ان پر تنقید وتبصرہ فرماتے، حوالہ کے لئے ان کے ایک جانب صحاح ستہ، موطأین اور طحاوی وغیرہ رکھی رہتی تھیں، بوقت ضرورت جو احادیث ان میں مذکور ہوتیں کتاب کھول کر انہیں پڑھتے، اور طلبہ کو سناتے تھے، الغرض علوم ومعارف کا ایک سمندر تھا جو پوری آب وتاب کے ساتھ موجزن تھا۔

تا آں کہ سنہ ۱۳۴۶ھ میں بعض ناگزیر حالات نے اس سیل رواں کے سامنے بند قائم کردیا اور دارالعلوم دیو بند علامہ کشمیری جیسی دیو ہیکل علمی شخصیت کے بدل کا محتاج ہوگیا، کرشمۂ قدرت نے بدل کے طور پر ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت کو پیش کیا جس نے بجا طور پر علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی شاندار قائم مقامی کا فریضہ انجام دیا، تاریخ ہمیں بڑے فخر سے اس شخصیت کا نام بتاتی ہے: " شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ" جو آج کی ہماری گفتگو کا محور ہیں، آیئے کچھ دیر حقیقت کے آئینہ میں شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ کے خد وخال کا مشاہدہ کرتے ہوئے آپ کے کچھ کمالات، خصوصیات، خصوصاً علم حدیث میں آپ کے مقام بلند کو کسی حد تک پہچاننے کی کوشش کریں، اگرچہ:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

مختصر حالات پیدائش سے وفات تک:

اسم گرامی حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی صاحب ہے، حسب ونسب کے اعتبار سے آپ حسینی الاصل ہیں، آپ کے آباء واجداد میں ایک بزرگ شاہ نورالحق صاحب دل، صاحب کشف وکرامات گذرے ہیں، وہ سید محمد مدنی معروف بہ سید ناصر ترمذی کی اولاد سے تھے، اور وہ سید

حسین اصغر بن علی زین العابدین بن حضرت حسینؓ نواسہ رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے تھے۔

ولادت باسعادت ۱۹ / شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء بمقام بانگر مئو ضلع اناؤ میں ہوئی، تاریخی نام چراغ محمد ہے، جب آپ کی عمر تین سال کی تھی تو والد ماجد منتقل ہو کر آبائی وطن قصبہ ٹانڈہ چلے آئے، چنانچہ آپ کی ابتدائی تعلیم مڈل تک وہیں ہوئی۔

جب عمر ۱۲ / سال کی ہوئی تو آپ کو اوائل صفر ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم دیوبند بھیج دیا گیا جہاں آپ کے دو بڑے بھائی (مولانا سید محمد صدیق اور مولانا سید احمد صاحبان) زیر تعلیم تھے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ایما، پر مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ نے علماء کے مجمع میں آپ کو گلستاں اور میزان الصرف شروع کرادی، اس طرح دارالعلوم دیوبند میں آپ کا داخلہ اس قدر بابرکت ہوا کہ حضرت شیخ الہند اور دوسرے علماء کرام کی موجودگی میں محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے آپ کے ان اسباق کی ابتداء فرمائی جوان کے منصب تدریس کی سطح کے نہ تھے، آپ ۱۳۰۹ھ تا شعبان ۱۳۱۶ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے رہے، یہ بھی آپ کی سعادت اور امتیازی شان ہے کہ ابتدائی کتب سے لے کر انتہائی کتب تک سب کچھ دارالعلوم دیوبند ہی کے جلیل القدر اساتذہ سے پڑھیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے درس نظامی اور نصاب ولی اللہی کی سترہ (۱۷) فنون کی سرسٹھ (۶۷) کتابیں ساڑھے چھ برس میں پڑھنے کا شرف حاصل کیا، اور بیشتر کتب میں امتیازی نمبرات حاصل کیے۔

چند ممتاز اساتذہ کے اسماء گرامی یہ ہیں: شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ) مولانا خلیل احمد سہارنپوری (متوفی ۱۳۴۶ھ)، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۴۷ھ)، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند، اور مولانا غلام رسول علوی ہزاروی۔

دارالعلوم دیوبند کے ہزاروں فضلاء میں سے یہ سعادت صرف حضرت مدنی کو حاصل ہوئی کہ علم صرف کی بالکل ابتدائی کتاب دستور المبتدی استاذ العلماء حضرت شیخ الہند سے پڑھی، اور دورۂ

حدیث کی پانچ کتابیں (بخاری، ترمذی، ابوداؤد، موطأ مالک، موطأ محمد) بھی آپ ہی سے پڑھیں، سنہ ۱۳۱۶ھ میں دارالعلوم سے فراغت ہوئی، معا بعد آپ اپنے والد و دیگر اہل خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ چلے گئے۔

پھر سنہ ۱۳۲۷ھ میں دیوبند واپس تشریف لائے، اور حضرت شیخ الہند سے دوبارہ بخاری و ترمذی پڑھی، اس بار آپ خوب کھل کر مسائل میں مناقشہ کرتے اور حضرت شیخ الہند پوری شفقت و توجہ سے جوابات مرحمت فرماتے، اور سنہ ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں جلسہ دستار بندی ہوا جس میں آپ کی اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی بھی دستار بندی اکابر کے مجمع میں بدست حضرت شیخ الہند ہوئی۔

سفر حجاز، بشارت غیبی اور تدریس مدینہ منورہ:

فراغت کے سال ہی سنہ ۱۳۱۶ھ میں اپنے پورے خاندان کے ساتھ حجاز مقدس کا سفر کیا، حج سے فارغ ہونے کے بعد جب کہ قافلہ مدینہ منورہ جارہا تھا، راستہ میں مقام رابغ پر پڑاؤ کے دوران خواب میں حضرت سرکار دو عالم ﷺ کا دیدار ہوا اور ساتھ ہی ایک عظیم بشارت بھی عطا ہوئی جس کو بعد کے حالات نے بالکل سچ ثابت کر دکھایا، لیجئے خود حضرت کے الفاظ میں اس کا حال ملاحظہ فرمائیے:

> ''دو ہی تین دن گذرے تھے کہ منزل رابغ کی شب میں جناب سرور کائنات ﷺ کی زیارت باسعادت خواب میں نصیب ہوئی اور یہ سب سے پہلی زیارت آں حضرت ﷺ کی تھی، آں حضرت ﷺ کو دیکھ کر قدموں پر گر گیا، آپ نے ارشاد فرمایا: کیا مانگتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! جو کتابیں میں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں ان کے متعلق اتنی قوت ہو جائے کہ مطالعہ میں نکال سکوں، آپ نے فرمایا کہ یہ تجھ کو دیا''۔ (مکتوبات شیخ الاسلام ج:۲، ص:۶۸)

پھر آپ کے والد ماجد اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے، عشق نبوی سے سرشار اس خاندان پر کیا کچھ بیتی اور کس قدر صعوبتیں اہل خاندان کو اٹھانی پڑیں اس کی داستان بڑی

دلدوز ہے جس کے بیان کا یہ موقعہ نہیں، حضرت مدنی رحمہ اللہ نے قیام مدینہ کے دوران علوم اد بیہ میں مزید مہارت حاصل کر لی، چنانچہ وقت کے مشہور ادیب شیخ آفندی عبدالجلیل برادہ کی شاگردی اختیار فرمائی اور ان سے آپ کو اجازت حدیث بھی حاصل ہے، ان کے علاوہ شیخ التفسیر حسب اللہ الشافعی المکی، شیخ عثمان عبدالسلام داغستانی مفتی احناف مدینہ منورہ، اور شیخ سید احمد برزنجی مفتی شافعیہ مدینہ منورہ سے بھی آپ کو روایت حدیث کی اجازت حاصل ہے جیسا کہ حضرت مدنی کی خصوصی سند میں مرقوم ہے۔

مسجد نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام میں آپ کا بھی باضابطہ حلقۂ درس منعقد ہونے لگا، اور بفضلہ تعالیٰ مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا، شب و روز میں تفسیر و حدیث سمیت مختلف علوم وفنون کے چودہ چودہ اسباق آپ نے پڑھائے اور بہت سی ایسی کتابیں بھی پڑھائیں جو ہندوستان میں پڑھائی نہیں جاتی تھیں اور مدینہ منورہ، مصر اور استنبول کے نصاب میں داخل تھیں، یہ مبارک سلسلہ اسارت مالٹا (سنہ ۱۳۳۵ھ) تک جاری رہا، درمیان میں کچھ اوقات کے لئے دیوبند اور گنگوہ شریف کی حاضری رہی، بگر مجموعی طور پر پندرہ سال تک حرم اطہر میں تدریس کی آپ کو سعادت میسر رہی جو شاید ہی کسی عجمی عالم کو حاصل ہوئی ہو، آپ کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ بقول صاحب نزہۃ الخواطر آپ کا لقب "شیخ الحرم" اور "امام الدین" پڑ گیا تھا۔ (نزہۃ الخواطر ج ۱۱۵/۸)

تدریس مدینہ منورہ کے دوران آپ سے فیضیاب ہونے والے چند ممتاز تلامذہ کے اسماء گرامی یہ ہیں: (۱) شیخ عبدالحفیظ الکردی عضو الحکمۃ العلیا، (۲) شیخ احمد الصباطی وکیل قاضی مدینہ منورہ، (۳) شیخ محمود عبدالجواد چیرمین میونسپلٹی مدینہ منورہ، (۴) مجاہد جلیل شیخ بشیر ابراہیمی الجزائری، (۵) الجزائر کے مشہور مجاہد آزادی اور سیاسی رہنما شیخ عبدالحمید بن بادیس۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے نقش حیات ج ۱۱۳/۱)

دارالعلوم دیوبند کی مشیخت حدیث:

مالٹا سے رہائی (سنہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء) کے بعد ہندوستان کے حالات کے پیش نظر

آپ کو یہیں قیام کرنا پڑا، اور چند ماہ امروہہ اور چند سال کلکتہ میں تدریسی خدمات آپ نے انجام دیں، بعدہ سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء تا سنہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء کے عرصہ میں آپ نے دارالعلوم سلہٹ آسام (اب بنگلہ دیش) میں رہ کر مشیخت حدیث کے فرائض انجام دیئے، نیز سنہ ۱۹۲۳ء ہی میں آپ جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی منتخب ہوئے اور تاحیات صدر باقی رہے، اس طرح وطن عزیز کو انگریزی سامراجیت سے آزادی دلانے کی بھرپور عملی جد و جہد کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی اصلاح وفلاح کے تعلق سے بھی بے حد قربانیاں دیں، تا آنکہ وہ وقت آپہونچا جب مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو ایک ایسے شیخ الحدیث کی ضرورت پڑ گئی جو علامہ انور شاہ کشمیری جیسے ابن حجر اور بیہقی دوراں کی قائم مقامی کرسکے، اس کے لئے سرپرستان دارالعلوم کی نظر میں صرف اور صرف آپ کی ذات والا صفات تھی جو اس خلاء کو پر کرسکتی تھی۔

چنانچہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں آپ کا تقرر بعہدۂ صدر مدرسی دارالعلوم میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ودیگر ارکان مجلس شوریٰ کی تجویز سے عمل میں آیا جس کو آپ نے چند شرائط (جن کا تعلق تحریک آزادی میں عملی سرگرمیوں سے تھا) کے ساتھ منظور فرمالیا، اور مجلس شوریٰ نے بھی آپ کی شرطیں بخوشی منظور کرلی، دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت اور مشیخت حدیث کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا فیض دور دور تک پہونچایا اور آپ کے غیر معمولی خلوص وللہیت کے طفیل اللہ تعالیٰ نے آپ کے تلامذہ کو بھی مقبولیت سے نوازا، ان کی ایک بڑی تعداد نے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک میں نہ صرف درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا، بلکہ علوم شرعیہ بالخصوص حدیث شریف میں نمایاں خدمات انجام دیں، بتیس (۳۲) سال تک دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے آپ حدیث نبوی کی خدمت انجام دیتے رہے، جس کا سلسلہ بظاہر اگرچہ وقت وفات ۱۳ر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء پر ختم ہوگیا لیکن حقیقت میں آج بھی جاری وساری ہے، اور آئندہ اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا جاری رہے گا، اس دوران آپ سے جن شاگردوں نے براہ راست حدیث پڑھی ان کی تعداد (۳۸۴۳) ہے۔

شیخ الاسلام کی جامعیت:

آگے بڑھنے سے پہلے حضرت شیخ مدنیؒ کے جامع کمالات ہونے پر صرف دو شہادتیں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ) اپنا فیصلہ یوں صادر فرماتے ہیں:

> ''میرے نزدیک ابوحنیفۂ زمانہ، بخاریٔ اوانہ، جنید و شبلی عصر، حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی کی مدح میں کچھ لکھنے والا'' مادح خورشید مداح خود است'' کا مصداق ہے، میرا خیال ہے: حضرت کے فضل وکمال، تبحر فی العلم والسلوک سے شاید ہی کسی اہل بصیرت کو اختلاف ہو، آپ نے سنا ہوگا کہ: مولانا کی اسارت کی خبر پر حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے کس قدر رنج وحزن کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، مجھے خیال نہیں تھا کہ'' مولانا مدنی سے مجھے اتنی محبت ہے''۔ اھ (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)

(۲) ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی کتاب'' شیخ الاسلام ایک سیاسی مطالعہ'' کا درج ذیل اقتباس بھی پڑھیے جو بلا مبالغہ آپ کی ہمہ جہت شخصیت کی پوری عکاسی کرتا ہے، لکھتے ہیں:

> ''حضرت مدنیؒ ایک بلند پایہ عالم دین تھے، وہ اپنے دور کے بے مثال محدث تھے، درس وتدریس اور تحقیق حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، تدریس حدیث میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا، جس نے انہیں اقران وامثال میں امتیاز بخشا تھا، وہ ایک بہت بڑے فقیہ تھے، انہیں نہ صرف فقہ کے مسائل ازبر تھے بلکہ فقہ وحدیث میں ان کا درجہ ایک محقق اور مجتہد کا تھا، وہ مفسر بھی تھے، نہ صرف حروف وسواد کی رہنمائی میں بلکہ معانی کی گہرائی میں اتر کر قرآن کے بصائر وحکم اور مسائل واحکام کی تشریح وتفسیر فرماتے تھے، وہ ایک زاہد شب زندہ دار بزرگ اور اپنے وقت کے ایک عظیم الشان شیخ طریقت تھے، انھیں انسان کے

امراض قلب کا پتہ چلانے، اور حسب طبائع و مزاج اصلاح و تزکیہ میں ید طولی حاصل تھا، تاریخ عالم میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور تاریخ معاشیات ہند کے وہ ایک عظیم اسکالر تھے، وہ ایک بلند پایہ مصنف اور افکار کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دینے اور انداز فکر بدل دینے والے اپنے عہد کے بے مثال خطیب بھی تھے، جنگ آزادی میں انہوں نے اپنے جسم و جان اور وقت و مال کی بے مثال قربانیاں دی ہیں، وہ ایک صاحب عزیمت شخص تھے، ان کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آئے جب وہ رخصت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے لیکن ان کی بلند ہمتی نے رخصت کی پناہ گاہوں کی پستیوں اور ذلتوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، ذوق میزبانی سے انھیں حصہ وافر ملا تھا، وہ اپنے دور کے علماء و امراء اور صوفیہ و مشائخ میں سب سے بڑے مہمان نواز تھے، شیخ الاسلام حضرت مدنی کے یہ تمام وہ کمالات ہیں جو حضرت کی صحبت و قربت رکھنے والا ہر شخص محسوس و معلوم کر لیتا تھا، اور آج بھی حضرت کی زندگی کے مطالعہ سے آسانی ان خصائص و کمالات کا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے۔ اھ

تدریسی خصوصیات و امتیازات:

تدریسی خصوصیات و امتیازات کے سلسلہ میں بندہ اپنی جانب سے کچھ لکھنے سے گریز کرتے ہوئے سب سے پہلے بطور متن مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کا یہ جامع تاثر پیش کرتا ہے جو آپ نے عینی مشاہدہ کے بعد زیب قرطاس فرمایا:

''بخاری و ترمذی کے درس میں میں شرکت کرتا تھا، مولانا کا استحضار اور مسئلہ کی مبسوط تقریر ان لوگوں کے لئے نئی بات ہے جو مولانا کی سیاسی مصروفیتوں اور سفروں کی کثرت سے واقف ہیں، ایک ایک مسئلہ پر بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل (۶۰ منٹ کے تعلیمی گھنٹہ میں) تقریر جاری رہتی اور مسئلہ کا مالہ وما

علیہ، ائمہ کے اختلافات ومذاہب، اوران کے دلائل وماً خذ، متن واسناد ورجال کی بحثیں برجستہ، ان سب پر مولانا کی قراءت حدیث، مولانا کا مخصوص دلکش لہجہ اور دارالحدیث کی روحانی و پرسکینت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے، اور گویا اس وقت بھی ''وبالسند المتصل منا الٰی أمیر المؤمنین فی الحدیث'' کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، درمیان میں طلبہ کے سوالات (جن میں بعض غیر متعلق بھی ہوتے) کا تحمل کے ساتھ جواب دیتے جاتے، آخر سال میں درس کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ عصر کے بعد بھی درس، عشاء کے بعد دیر رات تک درس، صبح کی نماز کے بعد درس، اچھے اچھے مستعد طالب علموں کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن مولانا کی مستعدی، نشاط اور قوت میں فرق نہ آتا''۔

(از مقدمہ متعارف مکتوبات حصہ دوم ص ۴۹)

اس کے بعد بطور شرح حضرت مدنی رحمہ اللہ کے ایک ممتاز شاگرد، وقت کی جامع علوم عبقری شخصیت حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی مدظلہ استاذ حدیث وصدر شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند کی تحریر کا خلاصہ پیش کردینا کافی سمجھتا ہوں، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، کیوں کہ آپ کے متعلق ''بحرالعلوم'' کا لقب فضلاء دارالعلوم میں گونجتا ہوا ہر وارد وصادر خود بخود محسوس کرتا ہے، بلکہ ملک کی تمام ہی علمی شخصیات آپ کے علمی تبحر سے پوری طرح واقف ہیں، حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ کے درس بخاری کو آپ نے شاندار طریقہ پر مرتب فرمایا ہے، جس کی ایک جلد طبع ہو چکی ہے، مولانا نے اس کتاب کے مقدمہ میں اس پہلو سے جو کچھ رقم فرمایا ہے اس کا خلاصہ ہدیہ ناظرین ہے:

حضرت شیخ الاسلام جب دارالعلوم دیوبند کے صدر نشیں ہوئے تو بخاری شریف مکمل اور ترمذی شریف مکمل آپ سے متعلق ہوئیں، لیکن جس سال میرا دورۂ حدیث تھا حضرت شیخ نے بخاری شریف مکمل اور ترمذی شریف جلد اول کا درس دیا، حضرت شیخ الہند کی اتباع میں حضرت کا بھی طرز درس

متوسط بحث کا تھا مگر جب آپ دارالعلوم کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہوئے تو حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ نے جس طرز کی طرح ڈالی تھی آپ نے بھی اسی طرز کو اپنایا اور اس کو بحسن وخوبی انجام دیا۔

جس سال میرا دورۂ حدیث تھا اس سال ترمذی شریف اول مکمل، بخاری شریف اول کی کتاب الطہارۃ، اور جلد ثانی کی کتاب المغازی والتفسیر میں مبسوط ومفصل تقریر فرماتے ہوئے آپ حدیث اور باب کے ہر گوشہ پر روشنی ڈالتے تھے۔

☆ مشکل الفاظ کی لغوی تشریح، مشکل جملوں کی ترکیب نحوی اور معانی وبیان سے متعلق امور ذکر فرماتے۔

☆ خاص طور سے ترمذی شریف میں اسناد پر بھی سیر حاصل بحث فرماتے۔

☆ اہم مباحث کی تنقیح وتجزیہ کرتے ہوئے ہر ہر جز پر مفصل ومدلل گفتگو فرماتے، تاکہ طلبہ کو سمجھنے میں سہولت ہو۔

☆ اختلافی مسائل سے متعلق احادیث کی شرح میں اختلاف ائمہ بیان کرنے کے بعد امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کو راجح فرماتے، اس وقت اندازہ ہوتا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو تفقہ فی الدین میں کس قدر کمال حاصل ہے اور ان کا قول حدیث کے کس قدر مطابق ہے۔

☆ حضرت کے ایک جانب صحاح ستہ وموطا ئین رکھی رہتی تھیں، مذکورہ بالا کتب کی کسی حدیث کا متن، اختلاف الفاظ وغیرہ بیان کرنے کی ضرورت جب ہوتی تو حدیث نکال کر بقید صفحہ پڑھ کر سناتے اور اس کی بھی تشریح فرماتے تھے جس سے طلبہ میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہوتا جاتا تھا، اور تحقیق کی راہ بھی ہموار ہوتی، اس طرح وہ درس صرف ایک کتاب کا درس نہ رہ کر تمام امہات کتب حدیث کا درس ہو جاتا تھا، تقریر کی رفتار آہستہ ہوتی، انداز بیان سادہ اور تمثیلی وتوضیحی ہوتا تھا، جس کی وجہ سے ایک طرف جہاں ذہین ومتوسط درجہ کے طلبہ خوب محظوظ ہوتے تھے دوسری طرف غبی وکند ذہن طلبہ بھی مستفید ہوتے تھے اور کوئی بھی فرد سبق سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔

☆ دوران درس طلبہ کو آزادی ہوتی تھی کہ وہ اپنے شبہات واعتراضات پرچیوں میں لکھ کر پیش

کریں، چنانچہ ان پرچیوں میں جہاں بہت سے اعتراضات معقول اور وزنی ہوتے تھے وہیں بہت سے مہمل اور لغو قسم کے بھی ہوتے تھے، مگر آپ ہر پرچی کو پوری کشادہ جبینی سے پڑھتے اور جواب مرحمت فرما کر مطمئن کرتے، اور کبھی بھی آپ کو اعتراضات سے مکدر و منقبض ہوتے نہیں دیکھا گیا۔

☆ حضرت شیخ الاسلامؒ نے حضرت نانوتویؒ کی تحقیقات وحکمتوں کا بغور مطالعہ فرمایا تھا اور آں حضرت ﷺ کے مواجہ شریف میں حاضر ہو کر رو رو کر ان علوم کے حاصل ہونے کی اللہ تعالیٰ سے آپ نے دعا کی تھی جس کے بعد آپ کے قلب میں " لا تقنطوا من رحمة الله" کا الہام بھی ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ موقعہ بموقعہ حضرت نانوتویؒ کی تحقیقات وحکم کو بھی بیان فرماتے تھے۔

☆ اخلاقیات ومعاشرت سے متعلق احادیث کے درس میں طلبہ کی اخلاقی تربیت اور ان میں معاشرہ کی اصلاح کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے اخلاقیات واصول معاشرت پر مکمل تقریر فرماتے تھے۔

☆ حضرت شیخ الاسلام نے چونکہ اپنے دور کا مڈل پاس کر کے عربی کی تعلیم شروع کی تھی جس کی علمی سطح موجودہ دور کے بی اے نہیں تو انٹر کے برابر ضرور تھی، چنانچہ آپ کا ذہن پہلے ہی سے کشادہ ہو چکا تھا، اس پر فہم کی تیزی اور خداداد حافظہ بھی آپ کو ملا تھا، نیز مدینہ منورہ کے زمانۂ تدریس میں ہندوستانی طرز تدریس سے مختلف طرز کی مشق بایں طور کہ کتاب سامنے نہ ہو، صرف مضامین کو ذہن میں مستحضر رکھ کر کتاب پڑھائی جائے، اسی طرح حنفی فقہ واصول فقہ کے علاوہ دوسرے ائمہ کے فقہ واصول کی تدریس، نیز مدینہ منورہ کے کتب خانوں سے بھر پور علمی استفادہ اور اس پاک سرزمین میں غیر معمولی ریاضت ومجاہدہ وغیرہ جملہ امور نے آپ کی شخصیت میں وہ سب صلاحتیں جمع کر دی تھیں جو ایک وسیع النظر متبحر عالم میں ہونی چاہئیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ قیام مدینہ منورہ میں عالم اسلام کے ہر نظریہ وفکر کے حامل علماء سے ملاقات کے مواقع آپ کو میسر ہوئے، اسی طرح اسارت مالٹا کے دوران چانکہ عالم اسلام کے چوٹی کے عالی دماغ لوگ سیاسی قیدیوں کی شکل میں موجود تھے، ان کے ساتھ آپ کا تبادلہ خیال ومعلومات، پھر حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ طرح طرح کے مسائل میں بات چیت اور ان کے علمی کاموں میں تعاون کی

وجہ سے اس تبحر علمی کے سوا دیگر سیاسی، معاشی، اقتصادی، تعلیمی اور معاشرتی علوم سے متعلق بھی آپ کے پاس خاصا مواد اکٹھا ہو گیا تھا، اسی طرح عالم اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہونچانے والی تحریکوں، جماعتوں اور ان کی دسیسہ کاریوں سے جتنی واقفیت حضرت کو حاصل تھی آپ کے معاصرین میں کسی کو نہیں تھی، اگر چہ ان معلومات کے اظہار کا اسٹیج اور میدان دوسرا تھا، اور حضرت ان میدانوں میں ان کا اظہار بھی فرماتے تھے، مگر حضرت کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ طالب علم محض کتاب کا کیڑا نہ بن جائے، بلکہ عالم اسلام، مسلمان اور ملک وقوم سب کے لئے مفید و نافع بنیں، اس لئے حدیث شریف کے درس میں موقع ومحل کے اعتبار سے جہاں اخلاق ومعاشرتی درس دیتے تھے تاریخی، اقتصادی، سیاسی اور عالم اسلام سے متعلق بہت سی باتیں بھی ذکر فرماتے تھے تا کہ عالمی مسائل کے سمجھنے اور عالم اسلام کے استحکام کی راہ میں جد وجہد کا جذبہ پیدا ہو۔

☆ بخاری شریف کے بقیہ حصہ کو سرداً پڑھاتے تھے البتہ کوئی مشکل لفظ آتا تو اس کو حل فرماتے، اور احادیث کو ترجمۃ الباب پر منطبق کرتے، مسائل کے بارے میں فرماتے کہ ترمذی شریف میں یہ بحث گذر چکی ہے، ہاں اگر کوئی ایسی حدیث آتی جو ترمذی شریف اول میں نہیں آئی تو مفصل کلام کرتے الغرض متوسط درجہ کے حل کتاب کے ساتھ سبق جاری رہتا مگر اخیر میں زیادہ تر اسباق سرداً ہی جاری رہتے تھے، کہیں کہیں کوئی باب ایسا ہوتا جس پر تفصیل سے گفتگو فرماتے۔

☆ حدیث کے درس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ طالب علم قراءت کرے اور استاذ سنے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ استاذ خود حدیث پڑھے اور شاگرد سنے، دونوں میں فرق و امتیاز کے لئے پہلی صورت کو "اَخبرنا" و "اَخبرنی" اور دوسری صورت کو "حدثنا" و "حدثنی" سے تعبیر کرتے ہیں، حضرت شیخ مدنیؒ کے یہاں بخاری شریف اول اور ترمذی اول کا درس اس طرح ہوتا تھا کہ حدیث کی قراءت تلامذہ کرتے تھے، مگر بخاری شریف ثانی جس کا درس رات کو عشاء کے بعد ہوتا تھا اس میں خود حضرت قراءت فرماتے تھے، بخاری شریف کی شرح "ارشاد الساری" معروف بہ "قسطلانی" سامنے ہوتی، پہلے حسب ذیل خطبہ پڑھتے:

"الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام على خير خلقه سيدنا

و مولانا محمد و آله و اصحابه اجمعين ، اما بعد ، فإن اصدق الحديث كتاب الله ، و خير الهدى هدى سيدنا و مولانا محمد ﷺ ، و شر الأمور محدثاتها ، و كل محدثة بدعة ، و كل بدعة ضلالة ، و كل ضلالة في النار ، و بالسند المتصل منا إلى الإمام الحافظ الحجة ، أمير المؤمنين في الحديث أبي عبدالله محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة ابن بردزبة ، الجعفي ، البخاري رحمه الله تعالى ، و نفعنا بعلومه ، آمين : أنه قال :

پھر قراءت شروع فرماتے ، قسطلانی میں متن حدیث کے ساتھ شرح مخلوط ہے ، مگر جب حضرت قراءت فرماتے تو ورق ورق پلٹتے جاتے ، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ متن حدیث کا کوئی کلمہ چھوٹ گیا ہو ، یا شرح سے خلط ملط ہو گیا ہو (جو اس بات کی دلیل ہے کہ بخاری شریف آپ کو از بر نہیں تو کافی حد تک مع سند و متن مستحضر ضرور تھی) ۔

حضرتؒ کی عمر کا ایک معتد بہ حصہ چونکہ مدینہ منورہ میں گذرا تھا اس لئے عربی زبان کا لہجہ ایسا فصیح تھا کہ جس کی نظیر علماء ہند میں نہیں ملتی تھی ، عربی لہجہ میں پر شوکت قراءت سے دارالحدیث میں ایک عجیب کیف آور سماں ہوتا تھا جس کو ہر شخص محسوس کرتا تھا اور جس نے بھی حضرت کے درس کا ذکر کیا اس نے اس بات کو ضرور ذکر کیا ہے ۔

☆ آپ کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی اور اس میں کبھی تخلف نہیں دیکھا گیا کہ جب آں حضرت ﷺ کا یا کسی اور پیغمبر کا نام آتا تو "علیه و علی نبینا الصلاة و السلام" کہتے ، اگر صحابی کا نام آتا تو اگر تنہا ہوتا تو " رضی اللہ عنہ " اور اگر سند حدیث میں دوسرے حضرات کے ساتھ ہوتا تو " رضی اللہ عنہ وعنہم " کہتے ، ائمہ مذاہب اور علماء سلف کا نام آتا تو اگر تنہا ہوتا تو " رحمہ اللہ " اور اگر چند ہوتے تو " رحمہم اللہ " کہتے اور طلبہ کو بھی اس کی طرف متوجہ فرماتے ، اگر کوئی طالب علم درس حدیث کے دوران اس میں کوتاہی کرتا تو فوراً اس کو ٹوکتے ، اور اس کے خیرات و برکات کو ذکر فرماتے ۔

حضرتؒ کے اس عمل پر کچھ لوگوں کو کلام ہوا تو ایک سبق میں فرمایا کہ : مدینہ منورہ کے قیام کے

دوران بھی میری عادت تھی کہ میں آخر سند میں ترضیہ میں صحابی کے ساتھ بقیہ رواۃ حدیث کو بھی شامل کرتا تھا، تو میں نے ایک دن خواب دیکھا کہ بڑے بڑے محدثین حرم محترم میں بیٹھے ہیں، میں بھی وہاں بیٹھ گیا، تو کسی نے کہا کہ: حسین احمد کے لئے دعا کرو، یہ ترضیہ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ ہم کو بھی شریک کرتا ہے۔

☆ حدیث شریف کے درس کا حضرتؒ کو حد درجہ اہتمام تھا، دیوبند میں موجود ہوتے ہوئے کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے، دن کے مختلف اوقات میں، اور رات کو بارہ بجے تک اس جانفشانی سے حدیث کا درس دیتے تھے کہ نہ جی اکتاتا تھا اور نہ تھکان ہوتی تھی، بلکہ دور دراز کے پر مشقت سفر سے واپس آرہے ہیں اور بلا آرام کئے سیدھے دارالحدیث پہونچ جاتے ہیں اور اس نشاط سے سبق پڑھا رہے ہیں کہ معلوم ہوتا کہ بالکل تازم دم ہو کر آئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ وہ پڑھانا صرف اپنے فرض منصبی کے انجام دہی نہیں تھی، بلکہ اس کو آپ رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت تصور کرتے تھے، اور اپنے لیے اس کو روحانی ترقی اور سرکار رسالت مآب ﷺ کی روح مقدسہ سے فیض کا بہت بڑا ذریعہ اور منازل سلوک طے کرنے کا سبب جانتے تھے، اور فرمایا بھی کرتے تھے کہ یہ درس حدیث حصول فیوض باطنیہ کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اور درس کے دوران فیضان انوار اور حصول کیفیات کی بنا پر نہ آپ کا جی اکتاتا، اور نہ تھکان محسوس کرتے، اس کی تائید حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے قول سے بھی ہوتی ہے، ابن مبارکؒ اپنے گھر میں اکیلے بہت دیر تک بیٹھے رہتے تھے، ان سے پوچھا گیا کہ اتنی دیر تک اکیلے بیٹھنے سے طبیعت اکتاتی نہیں؟ تو فرمایا: " کیف استوحش ، و انا مع النبی ﷺ " بھلا آں حضرت ﷺ کی صحبت بھی گھبرانے کی چیز ہے؟

اس کا اثر طلبہ کے ذہن و مزاج پر بھی خود بخود پڑتا تھا، آخر کیا وجہ تھی کہ حضرتؒ جب بھی سفر سے واپس تشریف لاتے، بس اک ذرا سی آواز پر طلبہ پروانہ وار کمروں اور بستروں سے نکل کر دارالحدیث میں جمع ہو جاتے تھے، اور جتنی دیر درس ہوتا کوئی اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔

تصنیفات:

جیسا کہ معلوم ہوا حضرت شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ صرف ایک مدرس نہیں تھے کہ اوقات تعلیم سے فارغ اوقات میں تصنیف وتالیف میں مشغول ہوتے، بلکہ آپ تو ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کی مجسم تصویر تھے، تحریک آزادیٔ ہند کے تقاضے، مسلمانانِ ہند کی گوناگوں مشکلات حل کرنے کی کوششیں، وعظ وتذکیر، اور بیعت وارشاد کے مشاغل، پوری دنیا سے تلامذہ، مسترشدین اور متعلقین کے خطوط کے جواب لکھنا وغیرہ امور کے ہوتے ہوئے تدریس کا حق ادا کردینا ہی کیا کم کرامت تھی جو آپ سے تصنیف وتالیف کا بھی مطالبہ کیا جائے، تدریس کی لائن سے جو آپ نے مردم سازی فرمائی وہ ہزار ہا تصانیف پر بھاری ہے، اگرچہ خودنوشت سوانح ''نقشِ حیات'' کے علاوہ کوئی بڑی ذاتی تصنیف پیش نہیں کی جاسکتی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے تلامذہ سے تدریسی میدان کے علاوہ تصنیفی میدان میں بھی گراں قدر اور کثیر تعداد میں کام لیا ہے اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی تصانیف بشکل تلامذہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

(۱) ''نقشِ حیات'' خودنوشت سوانح حیات، کہنے کو تو یہ ایک ''آپ بیتی'' مگر حقیقت میں ''جگ بیتی'' ہے، اس میں ذاتی حالات اور اہل خاندان سے متعلق جتنا مواد ہے اس کا کئی گنا مواد تاریخ عالم، ملک اور دنیا کے موجودہ حالات، دنیا کے سیاسی واقتصادی منظرنامے، مسلمانانِ عالم کے مذہبی وعلمی ظروف ومتعصبات پر مشتمل ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے بہت سی ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جن تک رسائی کا ذریعہ اس کتاب کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔

(۲) ''الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب'' یہ کتاب حضرت کا ایک عظیم علمی شاہکار ہے، اس کا موضوع علماء حق بالخصوص علماء دیوبند پر مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کی جانب سے صادر شدہ فتویٔ تکفیر کا رد ہے، جس میں حضرت نے قرآن وحدیث اور اجماعِ امت کی روشنی میں اصولِ تکفیر کو بیان کرتے ہوئے اس کی تطبیق میں ہونے والی غلطیوں، نیز تکفیری ذہنیت کی پینترے بازیوں کو طشت ازبام کیا ہے، کتاب ایمانیات وعقائد کی لائبریری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

(۳) ''ظہور مہدی احادیث کی روشنی میں'' قیامِ مدینہ کے دوران تیاریِ درس کے لیے آپ حرم نبوی کے کتب خانوں سے بکثرت استفادہ فرماتے تھے، اسی ضمن میں ایک اہم رسالہ ظہور مہدی سے متعلق آپ نے تصنیف فرمایا، یہ رسالہ مطبوع اور متداول ہے۔

(۴) مجموعہ افاداتِ درس بخاری بنام ''تقریر بخاری'' ضبط کردہ مولانا کفیل احمد علوی مدظلہ شیخ الہند اکیڈمی، و مدیر پندرہ روزہ آئینہ دارالعلوم دیوبند مطبوع ہے۔

(۵) دوسرا مجموعہ بنام ''درس بخاری'' حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے ترتیب دیا ہے، جو متعدد سالوں کے درسی افادات، نیز مکتوبات شیخ الاسلام (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے، اور متعلقہ ابحاث کو کتابوں سے مراجعت کرتے ہوئے موثق و مبرہن کر دیا گیا ہے، اس کی ایک جلد طبع ہو چکی ہے۔

(۶) مجموعہ افاداتِ درس ترمذی بنام "هدية المجتنی من فيوض البحر المدنی" جس کو مولانا علی احمد خیلی نے عربی زبان میں ترتیب دیا ہے، مطبوع ہے۔

(۷) ایک اور مجموعہ افاداتِ درس ترمذی'' معارف مدنیہ'' اردو میں ہے، جس کو مولانا طاہر حسن امروہیؒ نے ترتیب دیا ہے، اس کی کئی جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔

(۸) ''مکتوبات شیخ الاسلام'' ترتیب مولانا نجم الدین اصلاحیؒ، یہ کتاب آپ کے ان نجی خطوط کا مجموعہ ہے جو آپ نے اپنے متعلقین، تلامذہ، مسترشدین اور دیگر علمی و سیاسی حضرات کو تحریر فرمائے، یہ کتاب چار حصوں میں مکتبہ دینیہ دیوبند سے طبع ہوئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہی کتاب حضرت کے علمی و عملی کمالات جاننے، آپ کے علمی رسوخ و استحضار، اور ذاتی افکار و خیالات اور حقیقی ذوق و مزاج کو سمجھنے کا موثق ذریعہ ہے، جیسا کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

> ''افسوس یہ تھا کہ ایسی جلیل القدر شخصیت کے حقیقی مقام اور اس کے علمی و عملی کمالات و محاسن معلوم کرنے کے ذرائع مفقود تھے، جو لوگ صحبت سے محروم رہے، یا آئندہ آئیں گے ان کے لیے یہ جاننے کا کوئی موقع نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو

کیسی جامعیت، علمی استحضار، مسائل سلوک وتصوف پر نگاہ، اور علمی رسوخ عطا فرمایا ہے؟ صدیق محترم مولانا نجم الدین اصلاحی نے مولانا سے محبت وعقیدت رکھنے والوں پر بڑا احسان کیا اور آنے والے مؤرخین اور سوانح نگاروں کی بڑی مدد فرمائی کہ مولانا کی ان خصوصیات سے بلا واسطہ اور باوثوق طریقہ پر واقف ہونے کا ایک ایسا ذریعہ پیدا کر دیا جس سے زیادہ مستند اور یقینی ذریعہ عرصہ کی رفاقت ومعیت کے بعد کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اھ (از مقدمہ وتعارف مکتوبات حصہ دوم ص ۶۵)

تبحر علمی کے نمونے:

واضح رہے کہ یہ مکتوبات بیشتر دوران سفر ٹرین کے برتھوں، ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارموں، جلسہ گاہوں کے قریب پُر ہنگامہ عارضی قیام گاہوں جیسے بے اطمینانی کے مقامات پر لکھے گئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ علوم ومعارف کا خزانہ، اور بصائر وحکم کا گنج گراں مایہ ہیں، اس جگہ صرف حدیث اور علوم حدیث کے متعلق سے کچھ مباحث بطور نمونہ ذکر کیے جاتے ہیں جن سے حضرتؒ کے استحضار علم اور وسعت مطالعہ کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا۔

(۱) تاریخ تدوین حدیث:

مولانا احمد حسین صاحب لاہرپور ضلع سیتاپور کے نام ایک مفصل مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ بات بالکل غلط ہے کہ علم حدیث کی تدوین تین صدی کے بعد ہوئی، علم حدیث کی تدوین آں حضرت ﷺ ہی کے زمانے سے شروع ہوئی تھی، حضرت عبداللہ بن العاصؓ کو آپ نے احادیث کے لکھنے کی اجازت دے دی تھی، وہ لکھا کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: مجھ سے زیادہ احادیث نبویہ کا حافظ کوئی دوسرا بجز عبداللہ بن عمرو بن العاص نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لکھا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا''۔ (بخاری)

جناب رسول اللہ ﷺ نے جب حجۃ الوداع میں منیٰ میں اپنا نہایت جامع اور فصیح خطبہ پڑھا

جس میں اجمالاً تمام شرائع اسلامیہ کو ذکر کیا گیا تھا تو ابوشاہ یمنی نے اس کے لکھوا دینے کی استدعا کی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کو لکھ دو۔ (بخاری)

زکوۃ حیوانات اور نقود وغیرہ کے متعلق جناب رسول اللہ ﷺ نے تفصیلات اپنے عاملوں کو لکھوا کر دیں جو کہ کتاب ابن حزم وغیرہ کے نام سے مشہور ہے، دیت کی اقسام اور ان میں اونٹوں کی عمریں وغیرہ درج ہیں جس کو حضرت علیؓ نے اس سوال کے جواب میں کہ: کیا آپ کے پاس کتاب اللہ کے علاوہ کوئی چیز جناب رسول اللہ ﷺ سے موجود ہے؟ فرمایا کہ: نہیں مگر جو کاغذ ہماری تلوار کے میان میں موجود ہے، پوچھا گیا اس میں کیا ہے؟ کہا: دیت کے اونٹوں کی عمریں اور احکام اہل ذمہ وغیرہ۔ (بخاری)

غرضیکہ تسوید احادیث زمانۂ نبوی علیہ السلام میں شروع ہوگئی تھی جو کہ صحابۂ کرامؓ کی توجہ سے ترقی پذیر ہوتی رہی، اور حضرت عثمانؓ کے مصاحف کو منضبط کر دینے کی بنا پر پورے اطمینان اور وثوق کے ساتھ اس پر توجہ ہوگئی، مگر یہ تحریریں محض یادداشت اور مسودہ کے طور پر تھیں، کوئی ترتیب نہ تھی، اسلام کی نشر و اشاعت کی مصروفیت، اشتغال بالجہاد کی شدید اہمیت کی بنا پر صحابۂ کرامؓ نے اپنے اپنے حافظہ پر اعتماد کر رکھا تھا، مگر اسی زمانہ صحابہؓ و تابعین میں اہل قلم اور اہل حفظ ایسے ایسے نشو ونما پا جاتے ہیں جنھوں نے ان متفرق مسودوں کو، محفوظ فی الصدور احادیث کو ابواب پر ترتیب دینا، اور بڑے بڑے دفاتر تیار کرنا شروع کر دیا تھا، ابن شہاب زہری اور محمد بن ابی بکر بن حزم اور ان کے ہمعصر بڑے بڑے ائمہ تابعین ہر ہر مرکز میں بکثرت موجود ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ خلافت سو (۱۰۰) ہجری ہے، یعنی بعد وفات نبوی علیہ الصلاۃ والسلام نوے برس پر، انھوں نے بہت سے صحابۂ کرام سے علم حاصل کیا تھا، بہت بڑے علامہ، جلیل القدر خلیفۂ راشد ہیں، انھوں نے اپنے عہد خلافت میں نشر و اشاعت حدیث کا نہایت عظیم الشان اور غیر معمولی انتظام کیا، ان کے زمانہ خلافت میں علم حدیث کی بے بہا ترقی ہوئی، اور اس وقت سے علم حدیث کی تدوین کتابوں کی صورت میں شروع ہوگئی۔

امام مالکؒ جو سنہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے، محمد بن اسحاق اور واقدی وغیرہ کی کتاب المغازی، ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاق کی ضخیم ضخیم تصنیفات نہایت کثرت سے فقہ اور حدیث میں کی گئیں، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کی تصانیف بھی اسی زمانہ کی ہیں جن میں فقہ کے ساتھ احادیث بکثرت مذکور ہیں، امام محمدؒ کی موطأ، کتاب الآثار، سیر کبیر، سیر صغیر اور مبسوط وغیرہ کتب ظاہر الروایہ ملاحظہ فرمایئے، اوزاعیؒ کی تصانیف، نیز سفیان ثوری، اعمش وغیرہ نے نہایت بڑی بڑی کتابیں لکھیں، ہاں ان کتابوں میں یہ بات ضرور تھی کہ احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کے اقوال اور فتاویٰ بھی بکثرت ہوتے تھے، فقہی استخراجات، اور استدلالات بھی ہوتے تھے، امام شافعیؒ کی ''کتاب الام'' اور امام ابو یوسفؒ کی ''اَمالی'' وغیرہ ایسے مضامین سے بھری ہوئی ہیں، ان حضرات نے سنہ ۱۰۰ھ کے بعد عموماً ابتدائی صدی میں یہ ذخائر جمع کر دیئے ہیں۔

پھر اسی دوسری صدی کا آخری زمانہ آتا ہے جس میں ایسے بڑے بڑے اولوالعزم حضرات پیدا ہو جاتے ہیں جو کہ ان سابقہ مؤلفات کو چھانٹ کر فقط صحیح اور مرفوع احادیث کو جمع کرتے ہیں، امام بخاری سنہ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، امام احمد بن حنبل ان سے بہت پہلے پیدا ہوئے، امام بخاری نے ''الجامع الصحیح'' مشہور کتاب تصنیف کی، امام احمد ان کے استاد ہیں، انھوں نے اپنے مسند کو خاص طور پر ترتیب دیا، اور اسی دوسری صدی کے آخری زمانہ میں علی بن المدینی، ابن معین، یحییٰ بن سعید القطان، دارمی وغیرہ ہیں جن کی تصانیف کثرت سے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تدوین حدیث کا ابتدائی دور جناب رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پہلے ہی حسب الحکم شروع ہو جاتا ہے، اور حضرت عثمانؓ کے مصاحف کی ترتیب کے بعد اس میں ترقی ہو جاتی ہے، عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں عام طور پر تسوید اور ترتیب ابواب کا سلسلہ جاری ہو گیا، اور روز افزوں ترقی کے ساتھ آخر صدی تک میں بڑی بڑی کتابیں مرتب اور مہذب ہو کر وجود میں آ گئیں، ہر حدیث کے معلم کے یہاں املاء کا طریقہ جاری تھا، ان محدثین کی تفصیل جو کہ پہلی ہی صدی اور زمانۂ صحابہ میں مشہور بروایت و تدریس حدیث ہیں تاریخ میں ملاحظہ فرمایئے، صرف یہی طریقہ نہیں تھا کہ

احادیث مجمع تحدیث میں سنادی جائیں، اوران کی تفسیر کردی جائے، بلکہ عموماً قلم دوات اور کاغذ ہر طالب علم کے پاس ہوتا، اور استاد کی مرویات کا ایک ضخیم خزانہ جمع ہو جاتا تھا، ان میں استاذ کی جملہ روایات رطب ویابس لکھی جاتی تھیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اولاً یہ قدم اٹھایا کہ ان روایات کی چھان پھٹوڑ اور کاٹ چھانٹ کی، اسی وجہ سے ان کی کتاب موطأ محدثین میں بہت زیادہ مقبول ہوئی، اور عام شہرہ ہوگیا کہ :"اصح الکتب تحت ادیم السماء بعد کتاب اللہ الموطا"مگرامام بخاریؒ نے اس بنا پر کہ اس میں صحابہؓ کرامؓ کے اقوال وفتاویٰ اور تابعین کے اقوال بکثرت درج ہیں اوراس وجہ سے کہ اس میں عموماً روایات حفاظ مدینہ منورہ کی ہی پائی جاتی ہیں دوسری تصنیف کی ضرورت سمجھی، اور صحیح بخاری، اور صحیح مسلم وغیرہ ظہور پذیر ہوئیں جو کہ تیسری صدی کی ابتدائی یادگار ہیں، بہر حال یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ تدوین حدیث تیسری صدی کے بعد ہوئی۔ اھ

اس کے بعد حضرت نے علم حدیث کی تعریف، حجیت حدیث اور احادیث کی تشریعی حیثیت بیان کرتے ہوئے وحی کی اقسام، تشریع سے متعلق وغیر متعلق احادیث کے مقام ومرتبہ پر بصیرت افروز کلام فرما کر مکتوب گرامی کو اختتام تک پہونچا دیا، اخیر کی یہ سطر بھی ملاحظہ فرمائیے:

''اس وقت ریل میں جلدی میں یہ تحریر لکھ سکا ہوں، بہت سے خطوط کے جوابات میں اس کی وجہ سے حرج ہوا ہے، اگر کافی ہو فبہا، اگر اس پر کوئی شبہ ہو تو لکھیں، بوقت فرصت اس کے لیے بھی کچھ عرض کرسکوں گا''۔اھ (مکتوبات ج۱/۱۴۳تا۱۳۹)

اس لیے مرتب مکتوبات مولانا نجم الدین اصلاحی کا درج ذیل تبصرہ بالکل برمحل ہے:"صرف اسی ایک خط کو جو تاریخ تدوین حدیث وغیرہ خالص علمی مباحث پر مشتمل ہے غور کرنا چاہئے، سفر میں ٹرینوں پر قلم برداشتہ ایسی تحقیق چند منٹوں میں دنیا کے سامنے کہہ دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ وہی کہہ سکتا ہے جو واقعی محدث ہو، اور غیر معمولی تبحر رکھتا ہو، انتہی۔

(۲)روایت ودرایت کا فرق اور فہم حدیث کا معیار:

مرتب مکتوبات مولانا نجم الدین اصلاحیؒ کے نام ایک مفصل خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”روایات کے وضع اور سقم وصحت کا مدار سند اور رواۃ کے احوال وصفات پر ہے، امام بخاری اور دیگر محدثین اسی کو معیار قرار دیتے ہیں، متن کی معقولیت اور غیر معقولیت ان کا نصب العین نہیں ہے، بخلاف ائمۂ کلام واصول کے کہ ان کا نصب العین متن ہے، جو روایت ان ائمہ کی نظر میں قطعیات اور اصول دین، اور مجمع علیہ کے خلاف ہوگی اس کو موضوع قرار دیں گے خواہ رواۃ کیسے ہی بلند پایہ کیوں نہ ہوں اور محدثین اگر سند کو معیار ثقاہت وحفظ وغیرہ پر کامل پائیں گے تو صحت کے مقر ہو جائیں گے خواہ متن کا کچھ حال ہو، ائمۂ کلام جن متنوں کو قطعیات کے خلاف سمجھ کر ان کے منکر ہو جاتے ہیں ان میں بسا اوقات غور وفکر کی کوتاہی یا صاحب نظر کا ضعف فکر بھی باعث بن جاتا ہے، اور یہی امر باعث تفاوت مراتب ہے، ” رب مبلغ أو عى من سامع “ اور ” من يرد الله به خيراً يفقهه في الدين “ اور ”فقيه واحد اشد على الشيطان من ألف عابد“ اس کے شواہد ہیں، بنابریں تحقیق اور مکمل توجہ اور تفتیش کی ضرورت ہے، اس بارہ میں امام ابوحنیفہؒ کی قدر ومنزلت معلوم ہوتی ہے، چونکہ میں سفر ریل میں الہ آباد اور کانپور کے درمیان یہ لکھ رہا ہوں، کتابیں پاس نہیں ہیں اس لیے اجمال پر اکتفا کرتا ہوں، الغرض روایت ابن عمرؓ در بارۂ عبداللہ بن ابی، اور روایت ” لا يبقى على ظهر الأرض “ میں گفتگو محض ظاہری فہم اور قلت تدبر کی وجہ سے منکر ہے، ورنہ ہر دو میں کوئی مخالف قطعیات کا موجود نہیں ہے، انتہی۔

ایک اجمالی فہرست:

مکتوبات میں حدیثی مباحث جابجا موجود ہیں، کہاں تک مثالیں پیش کی جائیں، صفحات کی تنگ دامنی اجازت نہیں دیتی، ناظرین کرام کی دلچسپی کے لیے کچھ اہم مباحث کا صرف حوالہ دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) روضۂ اقدس کی زیارت کے قصد سے سفر مدینہ کے سلسلہ میں ابن تیمیہ کا مسلک، اور اس پر

حضرت کا تحقیقی تبصرہ، دیکھئے ج ا ص ۱۶۲۔

(۲) حدیث "أولیانی تحت قبائی" اور " خلق الله آدم علی صورته" کی تاویل وتشریح کے لیے دیکھئے: ج ا ص ۲۰۹۔

(۳) حدیث "أبو لاية أفضل من النبوة" اور "أنا مدينة العلم و علی بابها" کی تحقیق وتشریح: ج ا ص ۲۰۹۔

(۴) آں حضرت ﷺ کے گائے کا گوشت کھانے پر حدیث سے استدلال: ج ا ص ۲۲۵۔

(۵) حدیث: "الصلاة معراج المؤمنين" کی تحقیق اور توجیہ: ج ا ص ۲۲۰۔

(۶) پائجامہ کے سلسلہ میں روایات کا ذکر اوران سے استدلال: ج ا ص ۲۲۶۔

(۷) مسئلہ حیات النبی پر مفصل تحقیقی گفتگو، اور حدیث " رد الله علی روحی" کی توجیہات، اور اس ضمن میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی اس مسئلہ میں تقریر دلپذیر کی تفہیم، دیکھئے: ج ا ص ۲۵۲۔

(۸) جنبی کے لئے دخول مسجد کے جواز میں اختلاف مع دلیل کا ذکر، اور حدیث: " یا علی لا یحل لأحد یجنب فی هذا المسجد غیری و غیرک " کی تشفی بخش تاویل وتوجیہ، دیکھئے: ج ا ص ۲۶۳۔

(۹) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے یزید کو خلیفہ نامزد کرنے پر اشکال اور اس کا تشفی بخش جواب، نیز عظمت صحابہ پر مدلل ومبسوط مضمون، یہ ضرور دیکھنا چاہئے: ج ا ص ۲۶۵ تا ۲۷۲۔

(۱۰) تصوف کے بعض مسائل پر اشکال کا مدلل جواب، ج ا ص ۳۱۳ تا ۳۱۶۔

(۱۱) صحابہ کو معیار حق ماننے پر اشکال، اور نصوص قرآن واحادیث سے مدلل وتشفی بخش بحث: ج ۳ ص ۴۲۔

(۱۲) فقہ الحدیث اور جمع بین المتعارضین کی عمدہ ترین مثال " لا صلاة لمن لا یقرأ بفاتحة الکتاب" دیکھئے: ج ۳ ص ۵۸۔

(۱۳) حدیث "بدأ الإسلام غريباً إلخ" کی عمدہ تشریح وتفہیم: ج ۳ ص ۸۵۔

(۱۴) سجدۂ تعظیمی کی حرمت پر دلائل نصوص حدیث سے، نیز فقہاء وصوفیاء کے طرز فکر میں فرق،

اور ہندوستان میں علم حدیث کی شروعات واشاعت کا ذکر: ج ۳ ص ۲۱۳ تا ۲۱۸۔

(۱۵) حدیث " من مات و لم یعرف إمام زمانہ" کی تحقیق وتوضیح: ج ۴ ص ۳۲۸۔

حرفِ آخر:

اس لیے مولانا نجم الدین اصلاحیؒ نے مکتوبات جلد چہارم کے مقدمہ میں بجا طور پر فرمایا:

"اگر چاروں جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو بڑے سے بڑا ناقد بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ مولانا مدنی رحمہ اللہ رسوخ فی العلم کے اس مقام پر تھے کہ جہاں ان کے معاصرین میں سے شاید ہی کسی کی رسائی ہوئی ہو، باوجود اس کے تصنیف وتالیف کی طرف ذرا بھی خیال نہیں آیا، اور صاف لکھ دیا کہ: "لوگ اسلاف کرام کی کتابوں سے نفع اٹھانا نہیں چاہتے، اور نہ ان کا مطالعہ ہی کرتے ہیں، اس لیے میں نے کسی تصنیف وتالیف کا قصد ہی نہیں کیا، بلکہ اضاعت وقت سمجھا" فاعتبروا یا أولي الأبصار"۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ ایک نمونہ ہیں اس سلسلۃ الذہب کے جس کی ہر کڑی آفتاب ومہتاب ہے، جس نے ملت اسلامیہ کو علمی دینی اور روحانی غذا پہونچانے میں کبھی بخل یا مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا، خصوصاً فہم حدیث اور عمل بالحدیث کا صحیح ذوق ومزاج عام کرنا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔



محدث جلیل علامہ محمد یوسف بنوری

اور

خدمت حدیث

از: مولانا عبداللہ سورتی

تیرہویں صدی اور چودہویں صدی ہجری میں برصغیر ہند کی سرزمین پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت رہی کہ ان دونوں صدیوں میں بے شمار علماء محدثین وفقہاء پیدا ہوئے جنہوں نے اس فن شریف کی تدریس وتالیف اور اس کی طباعت ونشر کے ذریعہ ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

یہ علماء محدثین اپنے بلند علمی مقام کے ساتھ تقویٰ وطہارت، اخلاص وللہیت اور دعوت الی اللہ کے کاموں میں بھی امتیازی شان کے حامل تھے، ان کی انتھک محنت اور شبانہ روز جدوجہد کے سبب پورے عالم اسلام میں ان کے عظیم کارناموں کا اعتراف کیا گیا، نیز علم حدیث میں ان کے انہماک کے سبب شروحات حدیث میں ان کی تالیفات کا قابل ذکر ذخیرہ وجود میں آگیا جس کو پورے عالم اسلام کے علمی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھا گیا، ان محدثین کے قابل فخر تلامذہ اور مسترشدین نے علم حدیث کی نشرواشاعت اور دعوت وتبلیغ کی زبردست خدمات انجام دیں اور یہ سلسلہ الی یومنا ھذا۔ بفضلہ تعالیٰ۔ جاری وساری ہے۔ ان ہی عظیم محدثین میں حضرت علامہ محدث عصر سید یوسف بنوری رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کی ذات گرامی بھی شامل ہے جنہوں نے تقریباً نصف صدی تک علوم اسلامیہ اور خصوصا

سنت نبویہ (علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ) کی اہم خدمت انجام دی اور تدریس وتالیف کے ذریعہ اس فن شریف میں قابل قدر اضافہ فرمایا، فجزاہ اللّٰہ عنا و عن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔

مختصر حالاتِ زندگی:

محدث عصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں ضلع مردان کے ایک چھوٹے گاؤں مہابت آباد میں ایک علمی اور دینی گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے دادا امیر احمد خان بڑے ذی وجاہت بزرگ تھے، ان کے محلہ میں صرف وہی شخص سکونت کر سکتا تھا جو نماز کا پابند ہو، آپ کی دادی صاحبہ سیدہ فاطمہ بھی ولیہ تھیں، حضرت بنوریؒ فرماتے تھے کہ مجھے دعاؤں کا ذوق اپنی دادی صاحبہ سے حاصل ہوا، میں نے بہت چھوٹی عمر میں ظفر جلیل شرح حصن حصین پڑھ لی تھی، اس کتاب سے دعائیں بھی یاد کیں اور اردو بھی سیکھی۔

آپ کے والد ماجد سید زکریا نجیب الطرفین سید تھے اور صاحب حال بزرگ، جید عالم دین، حاذق طبیب اور تعبیر رؤیا کے امام تھے، کئی کتابوں کے مصنف تھے، والدہ محترمہ قبلہ محمد زئی کابل کے شاہی خاندان سے تھیں۔

ابتدائی تعلیم:

محدث عصر رحمۃ اللہ علیہ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں تحریر فرماتے ہیں: ''قرآن پاک اپنے والد ماجد اور ماموں سے پڑھا، امیر حبیب اللہ خان کے دور میں افغانستان کے دارالحکومت کابل کے ایک مکتب میں علم صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اس دور کے مشہور استاذ حافظ عبداللہ بن خیر اللہ پشاوری شہید (۱۳۴۰ھ) ہیں، علاوہ ازیں فقہ، اصول فقہ، منطق، معانی وغیرہ مختلف فنون کی متوسط کتابیں پشاور اور کابل کے اساتذہ سے پڑھیں (بینات بنوریؒ نمبر - ص ۹/۸)

دارالعلوم دیوبند میں:

کابل سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے مشکوٰۃ المصابیح کے درجہ میں داخلہ لیا، دارالعلوم دیوبند میں آپ نے اپنے وقت کے مشہور اساتذہ سے مختلف علوم وفنون کی

کتابیں پڑھیں، آپ کے اساتذہ میں مفتی محمد شفیع دیو بندیؒ، مولانا غلام رسول خان، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مفتی عزیز الرحمن دیو بندیؒ، مولانا عبد الرحمن امروہیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور خاتم المحد ثین مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ایسے اساطین علم وفضل اور نابغۂ روزگار شخصیات شامل ہیں۔

دار العلوم میں جب کچھ اختلاف شروع ہوا اور علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اپنے بعض رفقاء کے ساتھ مستعفی ہو کر گجرات کے مشہور مدرسہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک، ضلع سورت تشریف لے گئے تو مولانا بنوریؒ بھی اپنے محبوب استاذ کے ہمراہ ڈابھیل روانہ ہو گئے اور جامعہ ڈابھیل میں دورہ کی تکمیل فرمائی۔

علامہ سید محمد انور شاہؒ نے چند ہی دنوں میں آپ کی صلاحیتوں اور علمی استعداد کا اندازہ لگا لیا اور استاذ وشاگرد میں ایسا قوی تعلق پیدا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کشمیریؒ کے علوم کا آپ کو وارث بنایا، علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوت حافظہ، ذکاوت، متون وشروح حدیث کی وسیع معلومات، رجال وتاریخ، جرح وتعدیل، طبقات رواۃ کی پوری واقفیت، تقویٰ وزہد کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا، علامہ بنوریؒ نے اپنی خداداد صلاحیت کے سبب اپنے استاذ کے ان علوم سے بھرپور استفادہ فرمایا۔

علامہ کوثریؒ کے علوم سے استفادہ:

ہندوستان کے ان نابغۂ روزگار اساتذہ کے علاوہ علامہ بنوریؒ نے عالم اسلام کے معروف عالم اور محقق علامہ محمد زاہد الکوثریؒ سے بھی بھرپور فیض اٹھایا۔

علامہ بنوریؒ نے لکھا ہے کہ: ''میں شیخ سے اس زمانہ میں ملا جب میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے فیض الباری اور نصب الرایہ کی طباعت کیلئے مصر بھیجا گیا، میں نے شیخ سے علماء ہند کا تعارف کرایا۔

علامہ بنوریؒ نے شیخ زاہد الکوثریؒ کے بارے میں لکھا ہے۔'' وہ ایک ایسے شخص تھے جو انتہائی وسعت علمی، حیران کن مہارت، دقت نظر، خارق عادت حافظہ، محیرانہ استحضار جیسی خصوصیات کے ساتھ ساتھ علوم روایت کے تمام انواع واقسام علم درایت کے تمام مقاصد ومدارک، مکارم اخلاق، خصائل حمیدہ، تواضع، قوت لایموت پر قناعت، زہد وتقویٰ، مصائب پر صبر واستقامت، کریمانہ ذات،

اپنے خزائن علمیہ اور معارف گنجینہ میں سقاوت کے جامع تھے اس کے ساتھ ساتھ بسیط ارض کے مختلف گوشوں کے نادر مخطوطات اور دنیا کے کتب خانوں کی معلومات پر وسیع علم رکھتے تھے۔ مزید برآں دین کی آبرو کی حفاظت پر حمیت وغیرت اور ملت اسلامیہ تک حق بات پہنچانے میں صاف گو اور بے باک تھے۔ (مقدمۂ مقالات کوثری، بحوالہ خصوصی نمبر ص ۱۳۱)

اسی سفر میں شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری سے بھی ملاقات کی اور ان کی خدمت میں اپنے استاذ شاہ محمد انور رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مرقاۃ الطارم فی حدوث العالم" پیش کی، شیخ صبری اس سے بہت محظوظ ہوئے اور اپنی کتاب "موقف العقل والنقل" میں اس کا ذکر کیا۔

اجازت حدیث:

علامہ بنوری کو حدیث شریف کی اجازت مندرجہ ذیل مشائخ ومحدثین سے حاصل تھی: (۱) امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (۲) حضرت مولانا عبدالرحمن امروہیؒ (۳) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (۴) علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۵) حضرت مفتی عزیزالرحمن دیوبندیؒ (۶) الشیخ حسین بن محمد الطرابلسیؒ (۷) الشیخ العلامہ محمد زاہد الکوثریؒ (۸) الشیخ عمر حمدان المقدسی المالکیؒ (۹) الشیخ محمد بن حبیب اللہ بن مایابی الشنقیطیؒ (۱۰) الشیخ خلیل الخالدی المقدسیؒ (۱۱) شیخہ لمۃ اللہ بنت الشیخ عبدالغنی مہاجرہ مکہ مکرمہ (دینیات خصوصی نمبر ص ۲۷،۲۷)۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں: "یہاں اس لطیفہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ دیوبند کے مورث اعلیٰ دو بزرگ ہیں، ایک علم حدیث میں اور دوسرے طریقت وسلوک میں، چنانچہ علماء دیوبند کا علمی رشتہ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی ثم مدنیؒ سے وابستہ ہے، حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ ان کے بلاواسطہ شاگرد رشید ہیں، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری ثم مدنیؒ کو ان سے بالواسطہ تلمذ اور بلاواسطہ اجازت حدیث حاصل ہے، دیوبند کا سلسلۂ طریقت قطب عالم سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کیؒ سے پیوستہ ہے، دور اول اور دور دوم کے سارے اکابر دیوبند حضرت حاجی امداد اللہؒ کے خلفاء و مسترشدین ہیں۔

حضرت بنوریؒ زمانہ کے لحاظ سے اکابر دیوبند کے طبقہ چہارم میں آتے ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہیں حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے صرف ایک واسطہ سے اجازت حدیث حاصل ہے، عــن المحدثة امة الله بنت الشاه عبدالغنی عن ابیها ، اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کیؒ سے بھی صرف ایک واسطے سے اجازت وخلافت طریقت حاصل ہے (یعنی آپ کو حضرت گنگوہیؒ سے اور انہیں حضرت حاجی صاحب سے ، نیز آپ کو حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے اور ان کو حضرت حاجی صاحب سے) حضرات محدثین کی اصطلاح کے مطابق علوسند کا یہ شرف اس زمانہ میں بہت کم حضرات کو حاصل ہوگا۔ (خصوصی نمبر ص ۳۲،۷۳۱)

علامہ عثمانیؒ کی شہادت وتزکیہ:

علامہ عثمانیؒ نے آپ کو جو اجازت حدیث مرحمت فرمائی اس میں تحریر فرمایا کہ "وهو فی ما أری ولا أزکی علی الله احداً . صالح ، راشد ، مسترشد ، مستقیم السیرة ، جید الفهم ، ذو مناسبة قویة بالعلوم ، مسعد لقد ربها " اس سے قبل تحریر فرمایا ہے:"فجد و اجتهد فی اکتساب علم السنة و القرآن و برع فیه و فاق اقرانه ما شاء الله .

حضرت عثمانیؒ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:''مجھے جو قلبی تعلق آپ کے ساتھ ہے وہ خود آپ کو معلوم ہے، مجھے بہت سی علمی توقعات آپ کی ذات سے ہیں، سنن ابی داؤد کے درس سے میری تمنا پوری ہوئی، میں مدت سے چاہتا تھا کہ اس درجہ کا کوئی سبق آپ کے ہاں ہو، الحمدللہ آپ کا درس مقبول ہے۔ (خصوصی نمبر ص ۲۹،۷۳۹)۔

امیر شریعت شاہ عطاءاللہ کے تأثرات:

ایک بار حضرت (بنوریؒ) ملتان تشریف لے گئے، حضرت امیر شریعت علیل تھے، عیادت کیلئے ان کے دردولت پر حاضری دی، حضرت امیر شریعت خود باہر تشریف لائے، آپ سامنے کھڑے ہیں، مگر شاہ جی پوچھتے ہیں: کون؟ آپ نے سمجھا کہ شاید علالت کی وجہ سے پہچان میں فرق آ گیا اسلئے عرض کیا: محمد یوسف بنوری، شاہ جی نے پھر پوچھا: کون؟ آپ سمجھے کہ شاید مرض کی وجہ سے سماعت میں

فرق آ گیا، اسلئے ذرا بلند آواز سے کہا: محمد یوسف بنوری، فرمایا: نہیں نہیں، بلکہ انور شاہ، یہ کہہ کر آپ سے لپٹ گئے۔ (ص ر۷۸۱)۔

درس وتدریس:

اللہ تعالیٰ نے حضرت بنوریؒ کو ہرفن میں مہارت تامہ عطا فرمائی تھی، عربی زبان وادب میں ایسی مہارت تھی کہ آپ کی تحریر وگفتگو سن کر عرب علماء متعجب ہو کر جھوم جھوم جاتے تھے مگر آپ کا خصوصی ذوق فن تفسیر اور حدیث پاک میں اشتغال تھا، آپ نے حدیث پاک کی جن کتابوں کا گہرائی اور توجہ سے مطالعہ فرمایا اس کی فہرست طویل ہے، شاید ہمارے دور کے بہت کم اہل علم نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔

مجلس علمی ڈابھیل سملک:

حضرت مولانا احمد رضا بجنوری تلمیذ رشید حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ تحریر فرماتے ہیں:

''راقم الحروف کو مولانا محمد میاں سملکیؒ نے ۱۳۴۹ھ میں ڈابھیل بلایا اور حضرت شاہ صاحبؒ کی سرپرستی میں مجلس علمی کی بنیاد ڈال کر اس کے کام احقر کے سپرد کئے، پھر کچھ عرصہ قیام کر کے وہ افریقہ چلے گئے۔۔۔حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات ۱۳۵۲ھ کے بعد مجلس علمی کی سرپرستی ان کے جانشین علامہ محقق مولانا عثمانیؒ نے منظور فرمائی، اس وقت احقر نے مولانا بنوری کو پشاور سے ڈابھیل بلانے کی تحریک کی، اور مہتمم صاحب جامعہ کی منظوری حاصل کر کے وہاں بلالیا۔

موصوف نے درسی خدمات کے ساتھ مجلس علمی کے کاموں میں میری اعانت وشرکت کی، حضرت شاہ صاحب کی مکمل سوانح عمری اعلیٰ درجہ کی فصیح وبلیغ عربی میں تالیف کی جو مجلس سے اسی وقت شائع ہوگئی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ہی حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ نے مجلس علمی کی تحریک پر فیض الباری مرتب کی اور حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب گوجرانوالہ نے نصب الرایہ کی تصحیح وتحشیہ کی خدمت انجام دی، ان تینوں کتابوں کو لے کر احقر اور مولانا بنوری نور اللہ مرقدہ حرمین شریفین

ہوتے ہوئے مصر گئے، اور وہاں نو دس ماہ رہ کر ان کو طبع کرایا، ساتھ ہی وہاں کے اکابر علماء کرام اور کتب خانوں سے استفادہ بھی کرتے رہے، مصر کا یہ سفر ۱۳۵۷ھ میں ہوا تھا۔

مصر سے واپس ہو کر یہ طے کیا گیا کہ مولانا بنوریؒ نعرف الشذی پر کام کریں تا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم و کمالات کو زیادہ سے زیادہ بہتر صورت میں نمایاں کیا جا سکے۔

غیر معمولی تلاش و جستجو:

حضرت محدث بنوریؒ نے تلاش و تفحص اور مظان و غیر مظان سے اپنے شیخ کے علوم کی تخریج و توضیح کا حق ادا کر دیا ہے، محدث کشمیریؒ بحر بے کراں تھے، آپ کے درس میں حدیث کی روایت اور دوسرے مسائل کے سلسلہ میں دوسرے علوم و فنون کے حوالے آجاتے تھے، کہیں صرف و نحو کا مشکل حوالہ آجاتا، کہیں علم کلام و فلسفہ کا کوئی مسئلہ زیر بحث آجاتا، پھر ایسی کتابوں کے حوالے آجاتے تھے جو عام طور پر اہل علم کے یہاں متداول نہیں تھیں، مولانا نے متداول اور غیر متداول کتابوں سے مسائل نکالنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی اور اس کیلئے بے نظیر محنت کی شاندار مثال قائم کی، چند مسئلوں کی تحقیق کیلئے کئی کئی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی تب جا کر مسئلہ دستیاب ہوا۔

خود فرماتے ہیں: "میں نے اپنی قوت و طاقت تخریج و مآخذ سے مطلع ہونے پر پوری طرح صرف کی، ورق گردانی، مظان اور غیر مظان سے مسئلہ نکالنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، کبھی میں ایک مسئلہ کی تلاش میں گھڑیاں ہی نہیں کئی کئی راتیں اور دن گزار دیتا اور اس کیلئے ایک ایک کتاب کی مجلدات پڑھتا اور جب مجھے اپنی متاع گم گشتہ مل جاتی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا، شیخ نے دوران درس جس کتاب کا حوالہ دیا ہوتا اس سے مسائل نکالنے کا التزام کر رکھا تھا، لہٰذا میں کتاب سیبویہ، رضی شرح کافیہ، دلائل الاعجاز، اسرار البلاغۃ، عروس الافراح، کشف الاسرار دیکھنے پر مجبور تھا جس طرح میں شروح حدیث کی اہم کتابیں فتح الباری، عمدۃ القاری اور فقہ مذاہب میں شرح مہذب، مغنی لابن قدامہ اور رجال میں کتب رجال دیکھنے پر مجبور تھا اگر میری جوانی، بحث و جستجو کا شوق اور شیخ کے جواہر پارے سمیٹنے کا عشق نہ ہوتا تو میں اس بار گراں کا اہل نہیں تھا، حدیث کی اہم کتابوں کی شرح میرے

لئے اس کٹھن کام سے بہت زیادہ آسان تھی۔

ڈابھیل میں قیام اور خدمت حدیث:

حضرت بنوریؒ کے عزیز رفیق اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگر درشید مولانا محمد میاں سملکی ثم افریقی نے اپنے استاذ کے علمی کاموں کی اشاعت کی نسبت سے ڈابھیل میں ایک مجلس علمی قائم کی تو نگاہ انتخاب علامہ بنوریؒ پر پڑی اور مجلس علمی کی طرف سے وہاں قیام اور خدمت کی پیش کش ہوئی، چنانچہ آپ نے اس کو قبول فرمایا، مجلس علمی میں جو کام سپرد ہوا وہ خاصہ دشوار اور کٹھن تھا یعنی العرف الشذی کے حوالوں کی تخریج اور انہیں مکمل طور پر نقل کرنا، حضرت مولانا (بنوریؒ) فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک ایک حوالہ کیلئے بسا اوقات مجھے سیکڑوں صفحات کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا اور اس کی دو مثالیں پیش فرماتے ہیں (۱) حضرت شاہ صاحبؒ نے کسی موقع پر متعارض روایات کی تطبیق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اس قبیل سے ہے کہ" ہر راوی نے وہ بات ذکر کردی جو دوسرے نے ذکر نہیں کی" اس کے بعد فرمایا کہ یہ بڑا اہم قاعدہ ہے مگر افسوس کہ مصطلح الحدیث کے مدونین نے اس کو ذکر نہیں کیا البتہ حافظؒ نے فتح الباری میں کئی جگہ اس قاعدے سے تعرض کیا ہے۔

مولانا (بنوریؒ) فرماتے تھے کہ میں نے ان مقامات کی تلاش کیلئے پوری فتح الباری کا مطالعہ کیا تب معلوم ہوا کہ حافظؒ نے پوری کتاب میں دس سے زیادہ جگہوں پر اس قاعدے سے تعرض کیا ہے۔

(۲) حضرت شاہ صاحبؒ نے اختلاف صحابہ پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ" ابوزید دبوسی نے بالکل صحیح فرمایا کہ جب کسی مسئلہ میں صحابہ کرام کا اختلاف ہو تو وہاں منشائے اختلاف کا معلوم کرنا اور اس نزاع کا فیصلہ چکانا بڑا دشوار ہے"۔

مولانا فرماتے تھے کہ اس حوالہ کی تلاش کیلئے میں نے دبوسی کی کتاب تاسیس النظر پوری پڑھی مگر یہ حوالہ نہیں ملا، خیال آیا کہ یہ حوالہ دبوسی کی دوسری دو کتابوں اسرار الخلاف یا تقویم الادلہ میں ہوگا مگر وہ دونوں غیر مطبوعہ تھیں اور میرے پاس موجود نہیں تھیں پھر خیال آیا کہ یہ حوالہ بالواسطہ ہوگا یا تو

شیخ عبدالعزیز بخاری کی کتاب کشف الاسرار کے حوالہ سے ہوگا یا ابن امیر الحاج کی شرح التحریر کے واسطہ سے، چنانچہ ان دونوں کتابوں کا بہت ساحصہ مطالعہ کرنے کے بعد دونوں میں یہ حوالہ مل گیا۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا کو اس تخریج میں کتابوں کی کس قدر ورق گردانی کرنا پڑی اور اس کے لئے اپنی کتنی صلاحیتیں وقف کرنا پڑیں، اس طرح العرف الشذی کی تحقیق و تخریج میں معارف السنن کا مصالحہ تیار ہوگیا اور اسی تخریج کو آپ نے جدید طرز پر مدون کرکے معارف السنن تالیف فرمائی۔

ڈابھیل میں شیخ الحدیث کے منصب پر:

مولانا بنوریؒ جب سفر مصر سے واپس آئے تو گجرات کے مشہور مدرسہ جامعہ ڈابھیل میں صدارت تدریس کیلئے آپ کا انتخاب ہوا اور اس طرح آپ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت شاہ صاحب کی مسند درس حدیث کے وارث ہوئے، مولانا نے بخاری شریف اور بعض دیگر صحاح کی کتابوں کا درس شروع فرمادیا۔

راقم الحروف جامعہ کے درجہ پنجم کا طالب علم تھا، اس سال کے دورہ کے طلبہ نے سنایا کہ حضرت بنوریؒ جب جامعہ کے دارالحدیث میں مسند درس پر تشریف لاتے تو اپنے استاذ کی یاد تازہ ہوگئی اور سبق شروع کرنے سے پہلے زار و قطار رونے لگے، فرماتے تھے کہ یہ بھی اشراط الساعۃ میں ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ ایسے علم کے سمندر کی مسند پر آج مجھ جیسا ادنی طالب علم بیٹھا ہے اور جس جگہ پر بیٹھ کر حضرت شاہ صاحبؒ درس دیتے تھے اس سے تھوڑا ہٹ کر بیٹھ کر درس شروع کرایا، یہ ان کے بلند اخلاق اور اپنے اساتذہ کی عظمت و توقیر کی نشانی تھی۔

حضرت بنوریؒ کے درس کی شہرت دور دور پھیل چکی تھی، اطراف کے مدارس کے بعض اساتذۂ حدیث بھی ڈابھیل تشریف لاکر اپنے اشکالات حل کرتے تھے، اس طرح حضرت بنوریؒ کا وجود مسعود پورے علاقہ کے علماء و فضلاء کیلئے باعث خیر و برکت تھا۔

حضرت بنوریؒ نے بعض ذی استعداد نوجوان علماء کی علمی رہنمائی کرکے بہترین اساتذہ بنایا۔

پاکستان کا سفراور دارالعلوم ٹنڈوالہ یار میں علم حدیث کی خدمت:

پاکستان بننے کے بعد ہندوستان میں کچھ حالات ابتر رہے اور مدارس میں طلبہ کی تعداد بھی کم رہ گئی، اس لئے کہ پنجاب، سندھ، سرحد کے طلباء، دوسری طرف مشرقی بنگال کے طلباء کی آمد بند ہوگئی، ادھر پاکستان میں علامہ عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا احتشام الحق و دیگر علماء کرام پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے طرز کی درسگاہیں قائم کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے، چنانچہ ان ہی اکابرین کی نظر انتخاب حضرت بنوریؒ پر بھی پڑی اور حضرت کو وہاں بلایا گیا۔

ٹنڈوالہ یارخان میں شیخ التفسیر کے منصب پر:

حضرت بنوریؒ ٹنڈوالہ یار میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے نیز حدیث پاک کے اسباق بھی جاری رہے مگر قدرت کو حضرت بنوریؒ سے اور کام لینا تھا، اس لئے دارالعلوم ٹنڈوالہ یارخان میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ علامہ مستعفی ہو کر کراچی تشریف لائے۔

کراچی میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی تاسیس:

کراچی تشریف لا کر بخت بے سروسامانی کی حالت میں توکلا علی اللہ ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، حضرت بنوریؒ اس سلسلہ میں کن کن مراحل سے گزرے اس کی تفصیل آپ کی مفصل سوانح میں موجود ہے، اس مختصر مقالہ میں اس کو ذکر کرنا بے فائدہ ہے۔

تخصص فی الحدیث:

اس جامعہ کا جو نصاب مقرر ہوا اس میں حدیث شریف اور علوم حدیث کی طرف خصوصی توجہ دی گئی اور ابتداء ہی سے اپنے جامعہ میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ قائم فرما کر اس فن شریف کی اہم خدمت انجام دی، جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے جن فضلا کو مختلف عنوانات پر کام سپرد ہوا اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

نمبر	نام متخصص	عنوان مقالہ
(۱)	مولوی محمد اسحاق سلہٹی	کتابۃ الحدیث وادوار تدوینہ

(۲)	مولوی عبدالحکیم سلہٹی	وسائل حفظ الحدیث وجهود الأمة فيه
(۳)	مولوی محمد زمان ذیروی	الكتب المدونة في الحديث وأصنافها وخصائصها
(۴)	مولوی عبدالحق ذیروی	مصطلح الحديث وأسماء الرجال و الجرح
(۵)	مولوی حبیب اللہ سرحدی	الصحابة وماروو ه من الأحاديث
(۶)	مولوی حبیب اللہ مختار دہلوی	السنة النبوية والقرآن الكريم
(۷)	مولوی عبدالرؤف ڈھاکوی	السنةالنبوية والإمام الأعظم أبو حنيفة
(۸)	مولوی محمد انورشاہ بنوی	المسائل الستة من مصطلح الحديث
(۹)	مولوی مفیض الدین ڈھاکوی	حاجة الأمة إلى الفقه والا جتها د
(۱۰)	مولوی مہر محمد میانوالوی	الكوفة وعلم الحديث
(۱۱)	مولوی عبدالغفور سیالکوٹی	الإمام الطحاوی ومیزته في الحديث بين محدثي عصره
(۱۲)	مولوی عبدالقادر کھلوی	الإمام الطحاوی ومیزته في الحديث بين محدثي عصره (اردو)
(۱۳)	مولوی عبدالحق بریسالی	عبدالله بن مسعو دؓ من بين فقهاء الصحابة و امتيازه في الفقه
(۱۴)	مولوی محمد امین اورکزئی	مسانيد الإمام الأعظم أبي حنيفةؒ و مروياته من المرفوعات والآثار
(۱۵)	مولوی اظہارالحق چاٹگامی	مشائخ أبي حنيفة وأصحابه
(۱۶)	مولوی محمودالحسن میمن شاہی	الإمام أبويو سف محدثا وفقيها

(خصوصی نمبر ص ۲۶۰)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت بنوریؒ علم حدیث میں کیسے رجال کار تیار کرنے میں مصروف تھے۔

محدث عصر علامہ بنوریؒ نے علم حدیث میں حسب ذیل کام چھوڑا ہے۔

(۱) معارف السنن (۲) عوارف المنن مقدمہ معارف السنن (۳) مقدمہ فیض الباری (۴) مقدمہ نصب الرایۃ (۵) مقدمہ اوجز المسالک (۶) مقدمہ لامع الدراری (۷) جامع ترمذی کی تقریر العرف الشذی کی تصحیح فرمائی جس کا نسخہ محفوظ ہے۔

ان کے علاوہ اپنے دو ہونہار اور فاضل شاگردوں سے امام طحاویؒ کی مشکل الآثار اور امام ترمذی کی سنن میں وفی الباب پر "لب اللباب" کے نام سے عظیم الشان کام کروایا۔

شرح معانی الآثار کی اہمیت شیخ بنوریؒ کی نظر میں:

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ رقم طراز ہیں: "حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ امام طحاویؒ کی عبقریت اور فقہ وحدیث میں ان کی مہارت وحذاقت کے بڑے مداح تھے، فرماتے تھے کہ ان کے معاصرین میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہیں تھا اور بعد کے محدثین میں بھی کسی کو ان کے مقام رفیع تک رسائی نصیب نہیں ہوئی، حضرت نے تخصص فی الحدیث کے بعض شرکاء کو مقالہ نویسی کیلئے یہ موضوع دیا تھا" الامام الطحاوی ومنزلته بین معاصریه" یعنی امثال ونظائر سے یہ ثابت کیا جائے کہ امام طحاویؒ کو ابن جریر، ابن خزیمہ، محمد بن نصر وغیرہ معاصرین پر کن کن امور میں فوقیت حاصل ہے۔

حضرتؒ فرماتے تھے کہ دار قطنی، بیہقی اور خطیب تینوں مل کر حدیث میں طحاوی کے ہم سنگ ہوتے ہیں مگر تفقہ اور عقلیت میں طحاوی کا پلہ پھر بھی بھاری رہتا ہے۔

امام طحاویؒ کی تالیفات میں شرح معانی الآثار امت کے سامنے موجود ہے جو فقہ وحدیث کا مجمع البحرین ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک دیگر کتب حدیث کی طرح اس کی خدمت نہیں ہوسکی، اور اگر ہوئی ہے تو امت کے سامنے نہیں، حافظ بدرالدین عینیؒ نے مدۃ العمر اس کا درس دیا اور اس کی تین شرحیں لکھیں لیکن حیرت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حلیۂ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی۔

(الحمد للہ اب دار العلوم دیو بند کے استاذ حدیث، صاحبزادۂ محترم حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہ، حضرت مولانا محمد ارشد مدنی مدظلہ نے علامہ عینی کی شرح کی طباعت کا سلسلہ شروع فرمادیا ہے، اللہ تعالیٰ اس عظیم خدمت پر ان کو اجر عظیم عطا فرمادے اور جلد از جلد مکمل کتاب طبع ہو کر علمی حلقوں میں پہنچ جائے، آمین)

اور بھی کئی نامور اہل علم نے اس پر کام کیا ہے مگر کسی کی محنت منظر عام پر نہیں آئی، حضرتؒ محسوس فرماتے تھے کہ اس پر مندرجہ ذیل پہلو پر کام کرنے کی ضرورت ہے:

الف: رجال سند کی تحقیق جس کی روشنی میں حدیث کا مرتبہ متعین ہو سکے۔

ب: متون کی تخریج جس سے ایک طرف تو امام طحاویؒ کی ہر روایت کے متابعات وشواہد سامنے آجائیں اور طحاوی کی احادیث کے قبول کرنے میں بعض لوگوں کو جو کھٹکا ہوتا ہے وہ دور ہو جائے، اسی کے ساتھ دیگر کتب حدیث میں اس حدیث کی نشان دہی کرنے سے ان کتابوں کی شروح کی طرف مراجعت آسان ہو جائے، دوسرے حدیث کے متعدد طرق میں وارد شدہ الفاظ بیک نظر سامنے آنے سے حدیث کی مراد بھی واضح ہو جائے۔

ج: امام طحاویؒ ائمہ احناف کے مسلک کی تصریح کر جاتے ہیں اور دیگر مجتہدین کے مذاہب کی طرف اجمالاً اشارہ کر جاتے ہیں مگر ہر مذہب کے قائلین کی تصریح فرماتے، ضرورت ہے کہ اس اجمال کو رفع کیا جائے۔

د: امام طحاویؒ نے قریباً ہر مسئلہ میں احادیث وآثار کے علاوہ وجہ النظر کے ذیل میں عقلی دلیل کا التزام فرمایا ہے جو خاصی دقیق اور مشکل ہوتی ہے، اس کی تہذیب وتنقیح کر کے مقصد کی توضیح کی جائے۔

ہ: حضرات متقدمین کے کلام میں اکثر طوالت ہوتی ہے جس سے بعض دفعہ مبتدی کو فہم مطالب میں دقت پیش آتی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ طحاوی کے ہر باب کے مقاصد کی تلخیص کی جائے، یہ کام متقدمین میں سے حافظ زیلعیؒ کر چکے ہیں لیکن ان کی یہ تالیفات دستیاب نہیں اور ماضی قریب میں حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ نے بھی اس کی تلخیص کی مگر بہت زیادہ اختصار کی وجہ سے مفید عام نہ ہو سکی۔

و: یہ بھی ضرورت ہے کہ ہر باب کی احادیث وآثار کی فہرست مرتب کردی جائے کہ اتنی مرفوع ہیں، اتنی مراسیل، اتنی موقوف اور اتنی مکرر۔

ز: اور سب سے اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ شرح معانی الآثار کے متن کی تصحیح کی جائے کیونکہ اس میں بکثرت اغلاط ہیں، بعض اغلاط تو ایسے ہیں کہ جن سے عبارت ناقابل فہم بن گئی ہے یا مفہوم بالکل مسخ ہو چکا ہے اور تعجب ہے کہ حافظ جمال الدین زیلعیؒ اور ان جیسے دوسرے اکابر بھی بعض جگہ ان غلطیوں سمیت نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے جو نسخہ تھا اس میں بھی یہ اغلاط موجود تھے، حضرتؒ چاہتے تھے کہ مندرجہ بالا امور کو پیش نظر رکھ کر طحاوی شریف پر کام کیا جائے، چنانچہ آپ نے اپنے تلمیذ سعید مولانا محمد امین صاحب زید مجدہ کو اس کام پر مامور فرمایا۔

مولانا نے حضرتؒ کی رہنمائی میں جو کام کیا اس کا انداز یہ ہے:

اولاً ہر باب کی تلخیص

ثانیاً اس تلخیص کے ضمن میں مذاہب ائمہ کا بیان

ثالثاً ائمہ اربعہ کے مذاہب ان کی کتب فقہ سے بقید حوالہ نقل کرنا

رابعاً زیر بحث باب کے آثار کی تعداد اور تفصیل

خامساً نمبروار باب کی ہر حدیث کی تخریج

سادساً اصل کتاب کی حتی المقدور تصحیح

سابعاً حضرت اقدس کی خواہش کے مطابق ہر باب کے آخر میں اس بحث کے متعلق حنفیہ کی مؤید احادیث وآثار کا اضافہ جو شرح معانی الآثار میں نہیں، مولانا محمد امین صاحب نے بڑی محنت وجانفشانی سے کام کیا اور اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتب کا بالاستیعاب مطالعہ فرمایا۔

(۱) تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ۱۴رمجلدات (۲) حلیۃ الاولیاء، ابونعیم اصفہانی، ۱۰رمجلدات (۳) طبقات، ابن سعد، ۸رمجلدات (۴) تاریخ کبیر، امام بخاریؒ، ۸رمجلدات (۵) الکنی، ابی بشر دولابی، ۲رجلدیں (۶) معجم صغیر طبرانی، ایک جلد (۷) تاریخ جرجان، ارجلد۔

پھران سات کتابوں کی تمام احادیث وآثار کو کتب حدیث وفقہ کی ترتیب پر مرتب کیا، مولانا موصوف نے تو صرف اپنی تخریج کے لیے یہ کام کیا تھا مگر یہ بجائے خود ایک ایسا علمی کارنامہ ہے جس پر علمی دنیا کو ممنون ہونا چاہیے۔ (خصوصی نمبر ص: ۲۶۷)

سنن ترمذی پر عربی زبان میں ایک گراں قدر مضمون:

امام ترمذیؒ کی کتاب پر حضرت بنوریؒ کا دمشق کے مجلة المجمع العلمي العربي میں ایک اہم مضمون شائع ہوا تھا، جس میں شیخ نے امام ترمذی کی کتاب کی خصوصیات پر محدثین وائمہ کے کلام کو سامنے رکھ کر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں احادیث نبویہ کو آٹھ قسموں میں جمع کر دیا ہے:

(۱) عقائد ودینی اصول (۲) شرعی احکام، عبادات ومعاملات اور حقوق العباد سے متعلق احادیث (۳) تفسیر قرآن (۴) آداب واخلاق (۵) سیرت وشمائل نبوی (۶) مناقب صحابہؓ (۷) رقاق، وعظ ونصیحت اور ترغیب وترہیب سے متعلق احادیث (جسے کتاب الزہد کا نام دیا جاتا ہے) اور ترمذی کی کتاب الزہد کی نظیر صحاح ستہ میں نہیں ملتی (۸) علامات قیامت سے متعلق احادیث۔

یہ اقسام اگرچہ صحیح بخاری میں بھی ہیں لیکن وہ شروط کی سختی کے سبب احادیث کے ذخیرہ کو جمع نہ کر سکے ترمذی کی کتاب الزہد، کتاب الدعوات، کتاب التفسیر کا مقابلہ بخاری شریف کے ان ابواب سے کریں، حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی۔

(۲) امام ترمذیؒ نے احادیث پر صحت، حسن، غرابت اور ضعف کے اعتبار سے جو حکم لگایا ہے وہ پڑھنے والوں اور تحقیق کرنے والوں کیلئے بہت نافع اور اہم چیز ہے۔

(۳) امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں ائمہ کے مذاہب اور امت کے تعامل کو خوب عمدگی سے اس طرح بیان کیا ہے کہ اختلافی مسائل بیان کرنے والی دیگر کتب احکام وغیرہ بہت سی کتابوں سے مستغنی کر دے، امام ترمذیؒ کی یہ ایک خصوصیت ہے جس میں کوئی بھی ان کا شریک نہیں، صحابہ وتابعین کے مذاہب پر مطلع ہونا اور ایسے مذاہب جن پر عمل متروک ہو چکا ہے جیسے کہ شام کے امام اوزاعیؒ، عراق

کے امام سفیان ثوریؒ، خراسان کے امام اسحٰق ابراہیم مروزیؒ وغیرہ حضرات کے مذاہب پیش کرنا یہ بڑا دقیق و نادر علم ہے جس پر لوگ صرف امام ترمذیؒ اور ان کی کتاب کے ذریعہ ہی مطلع ہوسکتے ہیں۔

امام ترمذیؒ نے فقہاء امت کے مذاہب کو دو قسموں پر تقسیم کیا اور ہر قسم کیلئے الگ باب قائم کیا جس میں اس مسئلہ کو ثابت کرنے والی حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس طرح سے احکام سے متعلق متعارض احادیث کو دو باب میں تقسیم کردیا، امام ترمذیؒ بسا اوقات ایک قسم کی تائید کرتے ہیں اور اس کو تطلقہ یا تحدیث یا تعامل کے اعتبار سے راجح قرار دیتے ہیں یا دونوں میں جمع ہوسکے تو تطبیق دیتے ہیں۔

(۵) سند میں مذکور رواۃ اگر کنیت کے ساتھ ہوں تو ان کا نام بتلا دیتے ہیں اور اگر نام سے مذکور ہوں تو ان کی کنیت، عام طور سے ایسا اس مقام پر کرتے ہیں جہاں غموض اور خفاء یا ضرورت ہو، علماء حدیث نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں دولابی کی کتاب "الاسماء والکنی" سب سے عمدہ ہے۔

(۶) روایات ذکر کرکے امام ترمذیؒ جرح وتعدیل کرتے ہیں اور کسی خاص شرط کے پابند نہ ہونے کی تلافی اس جرح وتعدیل سے کیا کرتے ہیں اور حدیث کا درجہ صحت، حسن اور غرابت کے اعتبار سے متعین کرکے اس کمی کو پورا کردیتے ہیں۔

(۷) امام ترمذیؒ حدیث نقل کرنے کے بعد بسا اوقات نہایت عمدہ عمدہ حدیثی ابحاث اور اسنادی فوائد لاتے ہیں جو اور کتابوں میں نہیں پائے جاتے، چنانچہ حدیث کے موصول، مرسل، موقوف اور مرفوع ہونے کو بتلاتے ہیں کہ راوی حدیث صحابی ہے یا تابعی اور حدیث کا جرح کیا ہے؟

(۸) عام طور سے امام ترمذیؒ ہر باب میں حدیث کے متعدد طرق اور ساری روایات ذکر کرنے کے بجائے صرف ایک حدیث ذکر کرتے ہیں اور ایک طریق ہی لاتے ہیں، خصوصاً احکام سے تعلق رکھنے والی احادیث میں، اسی لئے جامع ترمذی میں احادیث احکام کا ذخیرہ کم ہے، البتہ اسکی تلافی وہ اس طرح کرتے ہیں کہ اس باب میں اور موضوع سے متعلق دیگر جن صحابہ کرامؓ سے احادیث مروی ہیں ان کو ذکر کردیتے ہیں اس طرح سے اس باب میں جتنے صحابہ سے احادیث ہوتی ہیں ان کی تعداد

معلوم ہو جاتی ہے، جوائمہ نقد وتحقیقین کے یہاں بڑی قابل قدر خدمت ہے اور ذوق قدیم وجدید دونوں کیلئے بڑی پرکیف خدمت ہے، وہ "فی الباب عن فلان وفلان" کے کراسی استیعاب سے نام گنوا دیتے ہیں کہ جس کی تفتیش وتخریج کیلئے ہزاروں صفحات اور بیسیوں بڑی بڑی جلدوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی بعض اوقات وہ حدیث نہیں ملتی۔

امام ترمذیؒ کی "وفی الباب" والی احادیث کی تخریج حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "اللباب" نامی کتاب میں کی لیکن سیوطیؒ اس کو ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ مجھے وہ کتاب مل نہ سکی، حضرت شیخ بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حرمین شریفین، قاہرہ اور آستانہ کے عظیم الشان کتب خانوں میں اسے تلاش کیا لیکن "اللباب" نہ مل سکی، حافظ ابن حجرؒ سے پہلے ان کے شیخ حافظ عراقی نے بھی امام ترمذیؒ کی "وفی الباب" والی احادیث کی تخریج کی تھی وہ بھی کہیں دستیاب نہیں، حافظ ابن سید الناس یعمری اور حافظ عراقی نے اپنی شروح میں "مافی الباب" کی تخریج کا التزام کیا ہے۔

(۹) امام ترمذیؒ مشکل احادیث کی گاہے بگاہے تفسیر وتاویل بھی کرتے جاتے ہیں کبھی اپنے الفاظ میں اور کبھی ائمہ فن کے کلام سے، جیسے کہ کتاب الزکوۃ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث "انما اللہ یقبل الصدقۃ ویاخذھا بیمینہ الخ" ذکر کی اور فرمایا: اہل علم اس حدیث اور اس جیسی ذات وصفات سے متعلق احادیث کے بارے میں یہ فرماتے ہیں "ان احادیث میں جس طرح آیا ہے اسی طرح تسلیم کیا جائے گا اس کی کیفیت نہیں معلوم کریں گے، امام مالک بن انس، سفیان ثوری اور عبداللہ بن مبارک وغیرہ حضرات اس جیسی صفات الٰہیہ سے متعلق احادیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بغیر کیفیت اور حقیقت بیان کئے اسی طرح اس کو مان لو، یہی علماء اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

(۱۰) امام ترمذیؒ باب میں غریب احادیث لاتے ہیں اور صحیح اور مشہور احادیث کو چھوڑ دیتے ہیں اور "وفی الباب عن فلان وفلان" میں اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں، یہ کوئی عیب نہیں ہے، اس لئے کہ اس حدیث میں جو ضعف اور عیب ہوتا ہے امام ترمذیؒ اس کی صراحت کر دیتے ہیں، یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح امام نسائیؒ اپنی کتاب میں جب حدیث کے طرق بیان کرتے ہیں تو پہلے جو کمزور یا

غلط ہوتا ہے اسے لاتے ہیں پھر اس کے مخالف صحیح اور قوی لاتے ہیں۔

(تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: مجلۃ المجمع العلمی العربی: ج ۳۲ ص ۳۰۸)

عوارف المنن مقدمۂ معارف السنن:

حضرت بنوریؒ نے معارف السنن کا ایک مفصل مقدمہ لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا مگر اس کی ایک جلد کتابی شکل میں طبع ہوسکی، اس مقدمہ کا دوتہائی حصہ مکمل ہو چکا تھا مگر افسوس کہ بقیہ کام ادھورا ہی رہ گیا، وللہ الامر من قبل ومن بعد۔

معارف السنن شرح جامع الترمذی:

یہ کتاب حضرت علامہ بنوریؒ کا ایک عظیم کارنامہ شمار ہوتی ہے، طلبۂ حدیث شریف اور اہل علم کیلئے نادر تحفہ ہے، اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر حفظہ اللہ تعالیٰ نے بہت جامع تبصرہ فرمایا ہے، موصوف معارف السنن کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

"انه اوسع شرح لمذاهب الأئمة المتبوعين من مصادرها الموثوقة وبيان تعامل الأمة واوثق مصدر لأدلة الإمام ابى حنيفة رحمه الله فى الخلافيات بين الأئمة و أكمل شرح لجامع الترمذى من جهة استيفاء المباحث حديثا وفقها واصولا وما إلى ذلك من مهمات علمية واحسن شرح لحل المشكلات وتوضيح المغلقات بعبارات ادبية وأسلوب رائع واجمل شرح لأقوال إمام العصر مسند الوقت الشيخ محمد أنور شاه الكشميرى رحمه الله فى شرح الحديث فى أماليه ومؤلفاته و مذكراته المخطوطة ورسائله المطبوعة وأشمل كتاب يحتوى على فوائد من شتى العلوم و نفائس الأبحاث رواية ودراية، فقها و حديثا، عربية وبلاغة وابدع تأليف جمع بين جمال التعبير وحسن الترتيب ومتانة البحث و رزانة البيان و استطصاء كل باب من غرر النقول لأولى الألباب و صلى الله على سيدنا محمد وآله واصحابه و سلم".

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ: شیخ بنوریؒ کی تصانیف میں جامع ترمذیؒ کی شرح معارف السنن ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے، چھ ضخیم

جلدوں میں نہایت اہم تصنیف ہے۔

شیخ جامعہ از ہرفضیلۃ الاستاذ شیخ عبدالحلیم محمودؒ کی رائے ملاحظہ فرمائیں ، فرماتے ہیں: ''ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی کی شروح حدیث پر معارف السنن کی اعلیٰ توجیہات ، بے مثال طرز استدلال اور ادب و معانی نے سبقت حاصل کر لی ہے۔

مولانا سلیم اللہ خان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ابتدائی دو جلدوں کے مطالعہ سے اس شرح کی جو خصوصیات ہمارے سامنے آئیں وہ بالا ختصار پیش خدمت ہیں:

(۱) علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی قیمتی آراء اور سنہری تحقیقات کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ حسین پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔

(۲) العرف الشذی کے مبہم یا موہم مقامات کا تشفی بخش حل پیش کرتے ہوئے امام الحدیث علامہ کشمیریؒ کے نقطۂ نظر کی عمدہ تشریحات کی گئی ہیں۔

(۳) حافظ ابن حجرؒ، علامہ شوکانیؒ، مولانا مبارک پوریؒ اور دیگر حضرات کی طرف سے احناف پر کئے گئے اعتراض کا نہایت ہی خوش اسلوبی سے ازالہ کیا گیا ہے۔

(۴) اسنادی مباحث میں معرکۃ الآراء موضوعات پر انتہائی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے اور اختلاف کی صورت میں قول فیصل بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

(۵) فقہی اور اسنادی تحقیقات کے علاوہ بعض نحوی، لغوی، کلامی اور اصولی مسائل پر نفیس اور عمدہ تحقیقات اور قیمتی فوائد اس شرح کی زینت ہیں۔

(۶) حقد مین مثل امام طحاویؒ وغیرہ کی طرح متاخرین مثل شاہ ولی اللہؒ و مولینا محمد قاسم نانوتویؒ، علامہ نیمویؒ اور شیخ لکھنویؒ کی تحقیقات و آراء کو اس شرح میں مولینا مرحوم بہت اہتمام کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

(۷) بعض حضرات صحابہ و تابعین ائمۂ فقہ و حدیث کے احوال اس شرح میں اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں کہ یکجا کسی دوسرے مقام پر اتنی تفصیل کے ساتھ ملنا دشوار ہے۔

(۸) خاص خاص مسائل پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا بہت اچھا تعارف کرایا ہے، جس کو دیکھ کر قاری میں ان کتابوں کے مطالعہ کا شوق کروٹیں لیتا ہے۔

(۹) نقل مذاہب میں یہ احتیاط برتی گئی کہ اصل مأ خذ سے ہی ان کو لیا گیا ہے، مثلاً شوافع کا مذہب کتب شوافع کی مراجعت کے بعد درج کیا گیا ہے، اسی طرح یہی احتیاط حنابلہؒ اور مالکیہؒ کے مذاہب کا ذکر کرتے وقت کی گئی ہے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ تسامح فی النقل کی وہ خامی جو دوسرے مذاہب نقل کرتے وقت بالعموم پیش آجاتی ہے اس سے یہ شرح محفوظ ہے۔

(۱۰) احناف کے اقوال نقل کرتے وقت عموماً متقدمین کی کتابوں پر اعتماد کیا گیا ہے نیز احناف میں صرف ان حضرات کی تحقیقات کو نقل کیا گیا ہے جن کا مرتبہ حدیث میں مسلم ہے جیسے طحاویؒ، عینی اور صاحب بدائع وغیرہ، تلک عشرۃ کاملۃ ۔ (خصوصی نمبر: ص ۹۵۔۳۹۳)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ تلمیذ شیخ محمد انور شاہ کشمیریؒ جنہوں نے ندوۃ العلماء میں ترمذی شریف کا درس دیا ہے تحریر فرماتے ہیں: ''معارف السنن کے مطالعہ سے مولانا بنوری مرحوم کی علمی خصوصیات اور خاص کر فن حدیث میں ان کے رسوخ و تبحر اور وسعت مطالعہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہ کی خاص تحقیقات سے واقفیت کا سب سے زیادہ مستند ذریعہ بھی اس عاجز کے نزدیک معارف السنن ہی ہے'' (خصوصی نمبر: ص ۲۸۰)

خود علامہ بنوریؒ نے معارف السنن کے بارے میں تحریر فرمایا ہے: فھذہ ھی "معارف السنن" وما ادراک ماھی "معارف السنن" شرح لأنفاس إمام العصر المحدث الكبير الكشميري في درس "جامع الترمذي" وتوضيح لأماليه وجمع درره المبعثرة في مذكراته وتآليفه، بتعبير قاسيت فيه العناء وترتيب طال لأجله الرقاد واستيفاء لكل موضوع من غرر النقول عثرت عليها بعد بحث طويل الخ۔ (خصوصی نمبر ص ۲۰۳)

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:۔

''اللہ تعالیٰ نے حضرت بنوریؒ کو اس دور میں علمی و دینی خدمات کیلئے نہ صرف چن لیا تھا بلکہ

ان کے کاموں میں غیر معمولی برکت عطا فرمائی تھی ،ان کے علم وفضل کا سب سے بڑا شاہکار جامع ترمذی کی شرح معارف السنن ہے جو تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، چونکہ پچھلے سات سال سے دارالعلوم کراچی میں جامع ترمذی کا درس احقر کے سپرد ہے اس لئے بفضلہ تعالیٰ مولانا کی اس کتاب کے مطالعہ کا خوب موقع ملا اور اگر میں کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ احقر کو اس کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے لہٰذا میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے محدثانہ مذاق کی جھلک کسی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے تو وہ معارف السنن ہے ،افسوس ہے کہ علم وفضل کا یہ خزانہ تشنۂ تکمیل رہ گیا ،اور کتاب الحج کے بعد اس کی تصنیف آگے نہ بڑھ سکی۔ الخ (خصوصی نمبر ص ۶۹۱)

حنفیت اور امام ابوحنیفہؒ:

مفتی ولی حسن ٹونکیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

ہم نے لکھا ہے کہ مولانا بنوریؒ نے اس کتاب کے ذریعہ حنفیت کی بے بہا خدمت کی ہے اور مسائل خلافیہ میں حنفیہ کے موقف کو روایت و درایت کی پوری قوت سے ثابت کیا ہے، اس سلسلہ میں چند نمونے پیش ہیں۔

(۱) مسئلۂ تیمم: معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، امام احمد اور جمہور محدثین ایک طرف ہیں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ دوسری جانب، احادیث صحاح جمہور محدثین کی مؤید ہیں، احادیث حسان اور قیاس فقہاء کے ساتھ ہے، حافظ ابن حجرؒ بھی احادیث صحاح سے متاثر ہیں اور تقریباً امام شافعیؒ کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں، مولانا بنوریؒ سب سے پہلے حافظؒ پر شدید تعقبات کرتے ہیں اور ان کے کلام کا فاضلانہ رد کرتے ہیں اور فقہاء کے مسلک کو روایت و درایت سے ثابت کرتے ہیں اور حدیث عمار بن یاسرؓ جو بقول محدثین اصح مافی الباب ہے اس میں اضطراب ثابت کر کے دوسری روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔

حضرت عمارؓ کے دو واقعے ہیں، اس کی فاضلانہ تحلیل کرتے ہیں اور مسئلہ منقح ہو جاتا ہے اور

فقہائے کبار کا مسلک روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے (مسئلہ تیمم معارف السنن ج۱، ص ۳۳۹)

(۲) مسئلہ آخر وقت ظہر: یہ مسئلہ بھی معرکۃ الآراء ہے، حدیث جبریل بظاہر مجازین کی مؤید ہے، امام ابوحنیفہؒ سے اس مسئلہ میں مختلف روایت ہیں، ان میں جمع و تطبیق اور مسلک امام کی ترجیح اور اپنے شیخ کی تحقیق کی روشنی میں فاضلانہ بحث اس کتاب کی خصائص میں سے ہے۔

(۳) مسئلہ تأمین: مشہور مسئلہ ہے، سفیان و شعبہ کی روایتوں کا اختلاف، طریق شعبہ پر محدثین کے اعتراضات اور اس کے مسکت جوابات اور ترجیح روایت شعبہ پر دونوں روایتوں کو جمع ''تذئیل'' کے عنوان سے اپنے شیخ کے کلام کی شرح و تلخیص، جہر للتعلیم کے نظائر، مد اور خفض کو جمع کرنا قابل ملاحظہ ہے۔ (معارف السنن ج۲، ص ۴۰۰، بحوالہ خصوصی نمبر ص ۱۶۱)۔

حضرت بنوریؒ کا درس بخاری شریف:

حضرت بنوریؒ نے تقریباً پچاس برس حدیث پاک کا درس دیا ہے خاص طور پر امام محمد بن اسماعیلؒ کی الجامع الصحیح، امام محمد عیسی الترمذیؒ کی سنن اور ابوداؤد شریف اکثر درس میں رہیں، حضرتؒ کے ایک امریکی نومسلم تلمیذ رشید جو انگریزی کے ادیب تھے، ساتھ ساتھ عربی زبان میں بہت عمدہ گفتگو کرتے تھے، شیخ الازہر نیو ٹاؤن تشریف لائے تو ان کی عربی تقریر سن کر مبہوت رہ گئے، ان کا نام نامی محمد یوسف طلال ہے فرماتے ہیں:

حضرت مولانا بنوریؒ کو امام بخاریؒ کی کتاب الجامع الصحیح سے بے حد محبت اور عقیدت تھی، چالیس سال سے زیادہ اس کتاب کا درس دیتے رہے، متناً وسنداً، درایۃً و روایۃً، ذوقاً و وجداناً اس کتاب کے علمی نکات، حقائق و دقائق اور غوامض و مشکلات کی جامع ترین تشریح و توضیح نہایت دلبستگی کے ساتھ کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے مولینا مرحوم سے کہا کہ ''أری البخاری ینعشکم'' (کہ میرے خیال میں بخاریؒ کی کتاب آپ کے لیے فرحت افزا ہے) انہوں نے بہت خوش ہو کر فرمایا نعم، نعم، ھو ینعشنی (ہاں، ہاں، میرے لئے فرحت بخش ضرور ہے) ان کا کمال تھا کہ ان کے طرز تدریس سے ایک قدیم ترین اسلامی کتاب بالکل تر و تازہ ہو کر طلبہ کی آنکھوں کے سامنے زندہ

ہو جاتی تھی، فرمایا کرتے تھے کہ میں اس لئے بخاری شریف پڑھاتا ہوں کہ اس میں نہ صرف اوراق ہیں بلکہ اس میں دین ہے، حضرت محمد ﷺ کے انفاس قدسیہ ہیں، ہدایت واصلاح کا پورا سامان ہے۔
(خصوصی نمبر: ص ۳۹۹)

علم حدیث میں وسعت معلومات:

حضرت بنوری کو علم حدیث میں جو بلند مقام حاصل ہوا اور جو گہرائی آپ کے درس و تالیفات میں پائی جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ آپ نے کتب حدیث کے بہت بڑے ذخیرہ کو اپنے مطالعہ میں رکھا تھا، مولینا محمد طاسین صاحبؒ (مجلس علمی کراچی) تحریر فرماتے ہیں کہ:

''علوم حدیث سے تعلق رکھنے والی جو کتابیں مولینا کے مطالعہ میں آئیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

مقدمة علوم الحديث المعروف به مقدمة ابن صلاح، التقييد والإيضاح للعراقي، فتح المغيث بشرح ألفية الحديث للعراقي، فتح المغيث بشرح ألفية الحديث للسخاوي، الكفاية في علم الرواية للخطيب، معرفة علوم الحديث للحاكم، تدريب الراوي للسيوطي، نزهة النظر شرح نخبة الفكر لابن حجر العسقلاني، ظفر الأماني في شرح مختصر الجرجاني لعبد الحي اللكنوي، كوثر النبي مع مناظرة الجلي لفرهاروي، الباعث الحثيث لابن كثير، مفتاح السنة للخولي، توجيه النظر إلى أصول علم الأثر للجزائري، شروط الأئمة الخمسة للحازمي، مقدمة فتح الملهم للعثماني، مقدمة إعلاء السنن للتهانوي، بلغة الغريب في مصطلح آثار الحبيب للزبيدي، الرسالة المستطرفة للكتاني، بستان المحدثين اور عجالہ نافعه للشاه عبد العزيز الدهلوي، السنة و مكانتها في التشريع الإسلامي للسباعي، السنة قبل التدوين لعجاج الخطيب، أضواء على السنة المحمدية لأبي رية، تدوين حديث لمناظر أحسن گيلاني، ابن ماجه اور علم حديث لعبد الرشيد نعماني و غيره.

جہاں تک متون حدیث سے تعلق رکھنے والی کتابوں کا تعلق ہے ان میں جو درسی کتابیں ہیں

جیسے صحاح ستہ، موطاً مالکؒ، مشکوۃ المصابیح، معانی الآ ثار للطحاوی یہ کتابیں چونکہ مولینا نے درس میں پڑھائی ہیں لہٰذاان میں سے ہر کتاب اس کے شروح وحواشی کے ساتھ بار بار مولانا کی نظر سے گزری، صحیح البخاری کی شروح میں سے فتح الباری اورعمدۃ القاری تو ہر سال آپ کے مطالعہ میں رہیں،ان کے علاوہ حدیث شریف کی جو کتابیں آپ نے مطالعہ فرمائیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:۔

جامع الأسانيد للإمام أبي حنيفة ، كتاب الآثار للإمام محمد بن حسن الشيباني ، كتاب الآثار للإمام أبي يوسف ، موطا للإمام محمد الشيباني ، سنن الشافعي ،مسند أحمد بن حنبل -الفتح الرباني للساعاتي ، كتاب السنة لعبد الله أحمد ، مسند الربيع بن حبيب، مسند أبي داؤد الطيالسي ، المصنف لعبد الرزاق، المسند للحميدي ، المصنف لابن أبي شيبة ، سنن سعيد بن منصور ، سنن الدارمي ، المنتقى من السنن المسندة عن المصطفى لأبي جارود، مسند أبي عوانة ، مشكل الآثار للطحاوي ، المعجم الصغير للطبراني ، سنن الدار قطني،صحيح ابن خزيمة ، المستدرك للحاكم ، السنن الكبرى للبيهقي ، الجوهر النقي في الرد على البيهقي للتركماني ، الاعتبار في بيان الناسخ و المنسوخ من الأخبار للحازمي ، مشارق الأنوار للصغاني ، الترغيب و الترهيب للمنذري ، رياض الصالحين للنووي ، كتاب الأسماء و الصفات للبيهقي ،شرح السنة للبغوي ، المحرر في الحديث لابن قدامة ، عمدة الأحكام من كلام خير الأنام لعبد الغني المقدسي ، أحكام الاحكام شرح عمدة الأحكام لابن دقيق العيد ، المحلى لابن حزم ، نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية ، جامع العلوم و الحكم لابن رجب ، طرح التثريب في شرح التقريب للعراقي ، مجمع الزوائد و منبع الفوائد للهيثمي ، التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير لابن حجر ، الدراية في تخريج أحاديث الهداية لابن حجر ، بلوغ المرام من أدلة الأحكام لابن حجر ،الجامع الصغير للسيوطي ، فيض القدير شرح جامع الصغير للمناوي ، تيسير الوصول الى جامع الأصول لابن الديبع ، جامع الأصول لأحاديث الرسول لابن الأثير الجزري ، كشف الغمة عن جميع الأمة

للشعرانی ، کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال لعلی متقی الهندی، کنوز الحقائق فی حدیث خیر الخلائق للمناوی ، جمع الفوائد من جامع الأصول ومجمع الزوائد للفاسی، نیل الأوطار للشوکانی، عقود الجواهر المنیفة للزبیدی ، شرح رموز الأحادیث لضیاء الدین الکمشخانوی ، آثار السنن للنیموی ، إعلاء السنن لظفر أحمد تهانوی ، ذخائر المواریث للنابلسی ، فضل الله الصمد شرح الأدب المفرد ، الاتحاف السنیة فی الأحادیث القدسیة للمدنی ، عمل الیوم واللیلة ، لطائف المعارف لابن رجب ، الحصن الحصین للجزری ، علل الحدیث لابن أبی حاتم ، تأویل مختلف الحدیث لابن قتیبة ، المقاصد الحسنة للسخاوی ، کشف الخفاء للعجلونی ، الفوائد المجموعة فی الأحادیث الموضوعة للشوکانی ، اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة للسیوطی ، کتاب الموضوعات لابن الجوزی ، التعقبات علی الموضوعات للسیوطی ، تذکرة الموضوعات لطاهر پٹنی ، الموضوعات الکبیر لملا علی قاری ، تنزیہ الشریعة المرفوعة للکنانی، أسنی المطالب لابن درویش و غیرها.

لغات حدیث میں جو کتابیں مولینا کے مطالعہ میں آئیں وہ یہ ہیں:-

النهایة للجزری ، الفائق للزمخشری ، مجمع البحار لطاهر پٹنی ، اور اسماء الرجال کی ان سب کتابوں کا مولانا نے مطالعہ فرمایا جو مطبوعہ شکل میں عام طور سے دستیاب تھیں ، مثلاً امام بخاریؒ کی تاریخ الکبیر اور کتاب الضعفاء الصغیر، ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح و التعدیل ، ابن سعد کی الطبقات الکبری ، علامہ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ اور اس کے تین ذیل نیز میزان الاعتدال ، المشتبه فی الرجال ، سیر أعلام النبلاء ، تجرید أسماء الصحابة ، رسالة فی الرواة الثقات المتکلم فیها، حافظ ابن حجر کی تهذیب التهذیب، لسان المیزان، تعجیل المنفعة ، تقریب التهذیب نیز الإصابة فی تمییز الصحابة اور طبقات المدلسین ، علامہ الخزرجی کی خلاصة تذهیب الکمال ، ابن القیسرانی کی الجمع بین رجال الصحیحین ، طاہر پٹنی کی المغنی فی أسماء الرجال ، ابوتراب شاہ کی کشف الأستار عن رجال معانی الآثار، عبدالوہاب مدراسی کی کشف الأحوال

فی نقد الرجال ، الجرانی کی کتاب قرۃ العین فی ضبط اسماء رجال الصحیحین ، دولابی کی کتاب الکنی و الاسماء ، علامہ ازدی کی المؤتلف و المختلف اور کتاب مشتبۃ النسبۃ ، جمال الدین الدمشقی کی الجرح والتعدیل، مولانا عبدالحی لکھنوی کی الرفع والتکمیل ،امام نوویؒ کی الاسماء والصفات ،ابن عبدالبر کی الاستیعاب ،ابن اثیر جزری کی اسد الغابۃ، ابوعمرالکشی کی معرفۃ الرجال ،حافظ برہان الدین کی التبیین لاسماء المدلسین اور الاغتباط بمن رمی بالاختلاط محب طبری کی الریاض النضرۃ، علامہ بلاذری کی انساب الاشراف اور سمعانی کی کتاب الانساب وغیرھا من الکتب.

(خصوصی نمبر ص ۳۱۴،۳۱۵)

حضرت بنوریؒ کا ترمذی پر تخریج احادیث کانمونہ:

حضرت نے ابواب الطہور کے پہلے باب کی حدیث کی خود تخریج فرمائی اور حضرت اسی طرز پر پوری کتاب پر کام کروانا چاہتے تھے۔

باب لاتقبل صلوۃ بغیر طہور:

اس باب میں تین حدیثوں کا حوالہ دیا گیا ہے، (۱) حدیث ابی الملیح عن اُبیہ ،نسائی اور ابو داؤد نے باب فرض الوضوء میں اور ابن ماجہ نے باب لاتقبل صلوۃ بغیر طہور میں ۔ (۲) حدیث ابی حریرۃ، صحیح بخاری، باب لاتقبل صلوۃ بغیر طہور میں ۔ (۳) حدیث انس، ابن ماجہ نے باب مذکوری میں ،اس لیے ہیثمی کا اسے مجمع الزوائد میں ذکر کرنا درست نہیں، لکھتے ہیں اس باب میں مندرجہ ذیل احادیث بھی موجود ہیں۔

(۱) حدیث ابی بکرہ، ابن ماجہ میں۔

(۲) حدیث ابی سعید ،طبرانی اوسط اور بزار میں ،اس میں عبیداللہ بن یزید القیروانی ہے۔

(۳) حدیث ابن مسعود، طبرانی کبیر میں ،اس میں عبادہ بن احمد عزری متروک راوی ہے۔

(۴) حدیث عمران بن الحصین ،طبرانی کبیر میں، ہیثمی کہتے ہیں :اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

(۵) حدیث ابی سبرۃ ،طبرانی کبیر میں ،اس میں یحیی بن یزید بن عبداللہ بن انیس ہے جو ہیثمی کے

یہاں غیر معروف ہے۔

(۶) حدیث ابی الدرداء، طبرانی کبیر میں، ہیثمی کہتے ہیں: اس کے رجال ثقہ ہیں۔

(۷) حدیث ابن سبرہ عن أبیہ عن جدہ، طبرانی اوسط میں۔

(۸) حدیث جدہ رباح بن عبدالرحمن، مسند احمد میں، اس کی سند میں ابوثفال ہے اور بقول امام بخاریؒ جس کی احادیث قابل نظر ہیں، (ملاحظہ ہو "مجمع الزوائد")۔

(۹) حدیث سعد بن عمارۃ، طبرانی کبیر میں، بقول ہیثمی اس میں غیر معروف راوی ہے۔

اس ایک معنی کی احادیث تیرہ صحابی روایت کررہے ہیں لہذا یہ حدیث متواتر ہوگئی اور کتاب اور اجماع سے یہ حکم ثابت ہوگیا۔ (خصوصی نمبر ص ۲۷۹-۲۷۸)

حضرت بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ حدیث کی کسی کتاب کی شرح کرنا اس وقت تک درست نہیں جب تک شارح حدیث کا حافظ اور الفاظ وطرق سے واقف نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی عالم اور محدث کے سامنے کسی حدیث کے تمام رواۃ یعنی صحابہ کرام آجائیں گے اور حدیث کا درجہ تواتر، شہرت وغیرہ کے اعتبار سے معلوم ہوجائے گا تو یہ ان لوگوں کی تردید کیلئے نہایت وزنی دلیل ہوگی جو اخبار احادیث کے منکر ہیں یا احادیث میں غلط تاویلات کا سہارا لیتے ہیں خاص طور سے ہمارے پرآشوب اور پرفتن دور میں جس میں انکار حدیث اور تاویلات باطلہ وفاسدہ مفسدین وزائغین کا شیوہ بن گیا ہے۔

جامع ترمذی کی شرح کے دوران حضرت شیخؒ نے ما فی الباب کی احادیث کی تخریج کا عزم کیا اور بروز دوشنبہ ۱۰ رجب ۱۳۶۳ھ کو اس کام کی ابتداء کی۔

چنانچہ حضرت شیخ نے ابواب العیدین کے ۵۲ (باون) باب، ابواب الزکوٰۃ کے ۳۸ (اڑتیس) اور ابواب الصوم کے ۳۲ (بتیس) ابواب کی تخریج فرمائی، ذیل میں بطور نمونہ ایک باب ذکر کیا جاتا ہے۔

باب المشی یوم العید:

اس باب میں امام ترمذیؒ نے کسی حدیث کا حوالہ نہیں دیا حالانکہ اس باب میں مندرجہ ذیل

حدیثیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) حدیث سعد القرظ، ابن ماجہ (ص ۹۳) باب ماجاء فی الخروج یوم العید ماشیاً۔

(۲) حدیث ابن عمر، ابن ماجہ (ص ۹۳) باب ماجاء فی الخروج یوم العید ماشیاً

(۳) حدیث ابی رافع، ابن ماجہ (ص ۹۳) باب ماجاء فی الخروج یوم العید ماشیاً۔

لیکن سب کی سند ضعیف ہے۔

عیداور جنازہ کے موقع پر نبی ﷺ کے سواری پر سوار نہ ہونے کے بارے میں جو روایت آتی ہے اگر چہ اس کو ابن قدامہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے لیکن وہ بے اصل ہے۔

(ملاحظہ ہو: تلخیص الحبیر ص ۱۴۳)

(۴) حدیث سعد بن ابی وقاصؓ، بزار نے تخریج کی ہے لیکن اس میں خالد بن الیاس متروک راوی ہے، (ملاحظہ ہو: مجمع الزوائد ج ۲، ص ۲۰۱) (خصوصی نمبر ص ۲۷، ۲۷ ص ۲۷۶)

افسوس کہ یہ کام حضرت نوراللہ مرقدہ کی شدید خواہش کے باوجود مکمل نہ ہو سکا، حضرت نے پہلے حضرت مفتی ولی حسنؒ سے اس کی تکمیل کی درخواست فرمائی اوران کے بعد ڈاکٹر حبیب اللہ شہیدؒ کو سپرد فرمایا، انہوں نے بہت محنت اور جانفشانی سے اس کو شروع فرمایا مگر افسوس کہ اس کی تکمیل سے قبل ہی شہید کردئے گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون ۔



مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی خدماتِ حدیث
معارف السنن کے آئینہ میں

از: مولانا محمد رضی الاسلام ندوی

تاریخ میں کچھ شخصیات ایسی گزری ہیں جن کا علم وفضل مسلم ہونے کے باوجود ان کا نام ان کے اساتذہ کے ساتھ جوڑ کر لیا جاتا ہے، جب بھی ان کا تذکرہ ہوتا ہے ان کے اساتذہ کا ذکر خود بہ خود آجاتا ہے، اور جب بھی وہ اساتذہ زیر بحث آتے ہیں، بات ان کے ان شاگردوں تک جا پہنچتی ہے، اس سلسلے میں ماضی بعید میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد علامہ ابن القیمؒ اور ماضی قریب میں علامہ شبلی نعمانیؒ اور ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندویؒ اور علامہ حمید الدین فراہیؒ اور ان کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے اسماء گرامی پیش کیے جاسکتے ہیں، اسی طرح کی ایک مثال مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی ہے جن کا نام علمی حلقوں میں ان کے استاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیری (۱۳۵۲ھ) کے ساتھ جوڑ کر لیا جاتا ہے، یوں تو علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگردوں کی ایک کہکشاں ہے جس نے علمی دنیا میں خوب ضیا پاشیاں کی ہیں اور خلق کثیر کو فیض پہنچایا ہے، لیکن ان میں غالباً سب سے زیادہ شہرت مولانا محمد یوسف بنوری کو حاصل ہوئی، قاری محمد طیبؒ نے لکھا ہے:

''حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کے علوم کی جتنی امانت مولانا بنوری کے سینے میں تھی، ان کے تلامذہ میں یہ نوعیت کسی کی نہ تھی، اور ان علوم پر جتنا افادہ انہوں نے فرمایا یہ بھی امتیازی چیز ہے جو

انہیں حاصل تھی"۔[1]

مولانا محمد تقی عثمانی رقم طراز ہیں:

"امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو جو خصوصی تعلق رہا اس کی مثال حضرت شاہ صاحب کے دوسرے تلامذہ میں نہ ملے گی، مولانا مرحوم نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت و صحبت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا، چنانچہ وہ ایک عرصہ تک سفر و حضر میں اپنے شیخ کی نہ صرف محبت سے مستفید ہوتے رہے، بلکہ ان کی خدمت اور ان سے علمی و روحانی استفادے کی خاطر مولانا نے نہ جانے کتنے مادی اور دنیوی مفادات کی قربانی دی"۔[2]

مختصر حالات زندگی:

مولانا محمد یوسف بنوری کی ولادت ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ/۳ مئی ۱۹۰۸ء کو موضع مہابت آباد صوبہ سرحد (پاکستان) میں ہوئی، ان کے جد اعلیٰ سید آدم ہندوستان کے ضلع انبالہ کے ایک گاؤں بنور کے باشندہ تھے، اسی نسبت سے ان کا پورا خاندان مشہور ہوا، ان کے والد مولانا محمد زکریا بلند پایہ عالم اور معروف شخصیت تھے، ان سے اور علاقہ کے دیگر علماء سے مولانا نے ابتدائی عربی اور متوسط عربی درجات کی تعلیم حاصل کی، ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۷ء میں وہ دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور وہاں کے اساتذہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ، مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ، مولانا اعزاز علی دیوبندیؒ، مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ اور مولانا مفتی شفیعؒ سے شرف تلمذ حاصل کیا، تاریخ دار العلوم دیوبند کے مصنف سید محبوب رضوی کے مطابق اگر چہ مولانا بنوری نے باقاعدہ دار العلوم میں داخلہ نہیں لیا، مگر ان کا تعلیمی تعلق ہمیشہ دار العلوم کے اساتذہ ہی سے رہا ہے۔[3]

۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء میں دار العلوم دیوبند میں ہونے والی اسٹرائیک کے نتیجے میں جب علامہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی وہاں سے الگ ہو کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) چلے گئے تو ان کے ساتھ مولانا یوسف بنوری بھی ہو لیے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں انہوں نے کئی سال گزارے، جہاں علامہ کشمیری سے حدیث کا درس لیتے رہے، وہیں سے انہوں نے سند فضیلت حاصل کی، پھر کافی

عرصہ تک وہیں تدریس کی خدمت انجام دی۔

پاکستان آنے کے بعد مولانا یوسف بنوری عرصہ تک سندھ کے مشہور مدرسہ ٹنڈوالہ یار میں شیخ الحدیث رہے، پھر کراچی میں نیوٹاؤن کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا، جو ترقی کرتے کرتے ایک بڑادارالعلوم بن گیا، آخروقت تک مولانا اس کے مہتمم وناظم اعلیٰ رہے، ۱۷/اکتوبر ۱۹۷۷ء/۳/ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ کومولانا کا وصال ہوا۔

ہمہ جہت خدمات:

مولانا محمد یوسف بنوری کی علمی ودینی خدمات کے متنوع پہلو ہیں، انہیں درج ذیل نکات کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ مولانا ایک مشہور اہل قلم تھے، انہوں نے عربی اوراردودونوں زبانوں میں لکھا ہے، عربی زبان میں ان کا قلم زیادہ رواں اور سیال تھا، ان کی چند تصانیف درج ذیل ہیں:

بغیۃ البیان فی شئی من علوم القرآن. علامہ انورشاہ کشمیری کی کتاب مشکلات القرآن کی ترتیب واشاعت کے وقت اس میں مولانا بنوری نے ایک مبسوط مقدمہ شامل کیا تھا، وہی بعد میں الگ سے شائع ہوا۔

نفحۃ العنبر فی حیاۃ إمام العصر الشیخ محمد انور: یہ کتاب علامہ انورشاہ کشمیری کی سوانح حیات پر ہے۔

الأستاذ المودودی وشیء من حیاتہ وافکارہ: اس میں مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودی کے بعض افکار وآراء پر تنقید کی گئی ہے۔

بغیۃ الأریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب،

نفس العنبر فی مسئلۃ الفاتحۃ خلف الإمام،

اس کے علاوہ مختلف کتابوں پر مولانا کے قلم سے مقدمے شائع ہوئے ہیں۔

مولانا نے اردوزبان میں ایک ماہ نامہ بینات کے نام سے جاری کیا جسے اپنے علمی ودینی

مضامین کی وجہ سے پاکستان کے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اس میں مولانا کے قلم سے اداریے اور علمی و دینی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

۲۔ مولانا عربی زبان وادب پر عربوں جیسی قدرت رکھتے تھے، انہیں عربی زبان میں تقریر وتحریر کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا، مؤتمر عالم اسلامی قاہرہ، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ اور عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور اجلاسوں میں اپنی زبردست علمیت اور غیر معمولی قادر الکلامی سے اثر ڈالتے تھے، بینات کی فائلوں میں مولانا کے متعدد عربی مضامین مع اردو ترجمہ محفوظ ہیں،۵ مولانا کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے مولانا کو عربی تقریر وتحریر کا جو ملکہ عطا فرمایا تھا وہ اہل عجم میں شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے، خاص طور سے ان کی عربی تحریریں اتنی بے ساختہ، سلیس، رواں اور شگفتہ ہیں کہ ان کے فقرے فقرے پر ذوق سلیم کو حظ ملتا ہے اور ان میں قدیم وجدید اسالیب اس طرح جمع ہو کر یک جان ہو گئے ہیں کہ پڑھنے والا جزالت اور سلاست دونوں کا لطف ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہے، مولانا کی تحریروں میں اہل زبان کے محاورات، ضرب الامثال اور استعارے ایسی بے تکلفی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں کہ بہت سے عربوں کی تحریروں میں بھی یہ بات نہیں ملتی، یتیمۃ العصر تو ایک طرح سے خالص ادبی تصنیف ہے، لیکن معارف السنن اور بغیۃ البیان جیسی ٹھوس علمی اور تحقیقی تصانیف میں بھی ادب کی چاشنی اس انداز سے رچی بسی ہوئی ہے کہ وہ نہایت دلچسپ اور شگفتہ کتابیں بن گئی ہیں۔۶

مولانا کی عربی دانی کے اعتراف کا مظہر یہ ہے کہ انہیں مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق (سابقہ نام المجمع العلمی العربی) نے اپنا اعزازی رکن نامزد کیا تھا، اس اکیڈمی کے قیام (۱۹۱۹ء) سے اب تک پاکستان سے اس کے صرف چار ارکان رہے ہیں، جن میں سے ایک مولانا محمد یوسف بنوری ہیں۔ ۷

۳۔ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی عربی و دینی مدارس کے مابین کوئی باہمی رابطہ نہیں تھا، وہاں کے سرکاری حلقوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہا اور ان مدارس کو سرکاری سرپرستی

میں لے کر مشرقی امتحانات کا مرکز بنادینے کی کوشش کی، لیکن مولانا یوسف بنوری نے بڑی ہمت سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا اور آزاد عربی مدارس کا ایک وفاق بنا دیا، جو بہت مفید ثابت ہوا۔[۸]

۴۔ مولانا بنوری نے مفتی محمد شفیع کے ساتھ مل کر جدید فقہی مسائل کی تحقیق کے لیے مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن اور دارالعلوم کراچی کے علماء پر مشتمل ایک ''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' قائم فرمائی تھی، مولانا محمد تقی عثمانی کا بیان ہے کہ ''اس مجلس کا اجلاس ہر ماہ دارالعلوم کورنگی یا مدرسہ عربیہ ٹاؤن میں منعقد ہوا کرتا تھا، یہ مجلس عام طور سے صبح کو شروع ہو کر شام تک جاری رہتی، بیچ میں کھانے اور نماز کا وقفہ ہوتا، پیچیدہ فقہی مسائل زیر بحث آتے، کتابوں کا اجتماعی طور سے مطالعہ ہوتا، تمام شرکائے مجلس اپنا اپنا نقطۂ نظر آزادی سے پیش کرتے...... جب تک تمام شرکا مطمئن نہ ہو جاتے، فیصلہ نہ ہوتا۔[۹]

مولانا کا ایک اہم کارنامہ پاکستان میں تحریک ختم نبوت کی قیادت اور اس کے نتیجے میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت منوانے کی صورت میں حاصل ہونے والی کامیابی ہے، یہ مسئلہ برسوں سے چلا آرہا تھا، ۱۹۵۳ء میں ہزاروں مسلمانوں نے اس کے لیے عظیم قربانیاں دی تھیں، بالآخر یہ مسئلہ سرکاری اور قانونی سطح پر ۱۹۷۳ء کی جس تحریک کے نتیجے میں حل ہوا، اس کے قائدین میں سے ایک مولانا بنوری تھے۔

۶۔ مولانا کی ہمہ جہت خدمات کا ایک اہم، بلکہ شاید سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ پاکستان میں الحاد، بے دینی اور تجدد پسندی کی راہ کا سنگ گراں تھے، باطل افکار و نظریات کے خلاف ان کی شمشیر ہمیشہ برہنہ رہتی تھی، جب بعض حلقوں کی جانب سے ایسے افکار پیش کیے جانے لگے جن کے ڈانڈے انکار حدیث سے ملتے تھے، تو مولانا نے ان کا سخت نوٹس لیا، سرکاری ادارے، ادارۂ تحقیقات اسلامی کے بعض وابستگان کی تحریروں میں جب عقلیت زدگی اور تجدد پسندی کا مظاہرہ ہونے لگا، تو مولانا نے اپنے ماہ نامہ ''بینات'' میں اس کا زبردست تعاقب کیا، مولانا عبدالسلام قدوائی نے لکھا ہے:

> ''انھوں نے پاکستان میں لامذہبیت اور بدعقیدگی کو بھی روکنے کی کامیاب کوشش کی، اس سلسلے میں بعض اوقات انہیں حکومت سے بھی ٹکر لینی

پڑی، لیکن انہوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی ۔ ۔ ۔ ان کی ہمت واستقامت نے
بہت سے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا دیا، الحاد و بے دینی کے اڈے ٹوٹ گئے
اور ملحدین کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی"۔ ۱؎

مولانا جس بات کو برحق سمجھتے تھے اس کے معاملے میں ذرا سی بھی مداہنت سے کام نہ لیتے تھے اور جو نقطۂ نظر انہیں کتاب وسنت اور جمہور امت سے ہٹا ہوا محسوس ہوتا تھا، اس پر سکوت اختیار کرنا ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا تھا، خواہ اس نقطۂ نظر کا حامل شخص ان سے کتنے ہی قریبی تعلقات رکھتا ہو اور مصالح خاموشی کا کتنا ہی تقاضا کرتے ہوں، مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی جدوجہد میں علمائے دیوبند کی ایک جماعت مؤید ومعاون رہی، لیکن جب انہوں نے بعض مسائل میں جمہور امت سے الگ راستہ اختیار کیا تو ان کے نظریات کے علمی رد کے لیے مولانا بنوری نے ایک مفصل مقالہ لکھا، یہ مقالہ مشکلات القرآن کے مقدمے میں شامل ہے جو اب "یتیمۃ البیان" کے نام سے الگ بھی شائع ہو چکا ہے، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے رکن رکین تھے، اس لیے حلقۂ دیوبند میں انہیں قدر واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن جب انہوں نے آخری دور میں بعض ایسے نظریات کی تبلیغ شروع کر دی جو جمہور علمائے امت کے خلاف تھے تو مولانا نے ان کی تردید کی، علامہ طنطاوی جوہری کی تفسیر الجواہر فی تفسیر القرآن آیات قرآنی کی سائنسی تفسیر کے رجحان کی نمائندہ ہے، سفر مصر کے دوران ایک موقع پر مولانا کی ملاقات علامہ طنطاوی سے ہوگئی، تو انہوں نے ان کے سامنے برملا اس رجحان پر تنقید کی اور اس کے خطرات واضح کیے۔

پاکستان میں بائیس نکاتی دستور کی ترتیب، تحریک ختم نبوت اور دیگر محاذوں پر انہوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ مل کر کام کیا، لیکن ان کے بعض خیالات پر جن سے انہیں اتفاق نہ تھا، ان پر سخت تنقید کی اور عربی زبان میں ایک کتاب لکھی، یہاں اس محاکمہ کا موقع نہیں ہے کہ ان مباحث میں مولانا بنوری کا موقف صحیح ہے یا دوسرے لوگوں کا، صرف اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ مولانا جس چیز کو بنی برحق سمجھتے تھے بلاخوف لومۃ لائم اس کا اظہار کرتے تھے اور کسی قسم کی مصلحت کو درمیان

میں حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔

خدمات حدیث:

علم حدیث کے میدان میں مولانا بنوری کی خدمات کے متعدد پہلو ہیں:

۱۔ مولانا کی پوری زندگی حدیث کے درس وتدریس میں گزری ہے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ وہیں خدمتِ حدیث پر مامور ہو گئے تھے، پھر جب پاکستان تشریف لے گئے تو وہاں کے بھی مختلف مرکزی مدارس میں درسِ حدیث دیتے رہے، سندھ کے مشہور مدرسہ ٹنڈو الہ یار میں عرصہ تک شیخ الحدیث رہے، پھر جب نیو ٹاؤن کراچی کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا تو وہاں کے نظم و انصرام کی نگرانی کے ساتھ طالبانِ علم کو اپنے دروسِ حدیث سے فیض پہنچاتے رہے اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔

۲۔ الحاج محمد بن موسیٰ سورتی، جو جنوبی افریقہ کے بڑے تاجروں میں سے تھے، انہوں نے ڈابھیل میں ''المجلس العلمی'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا جہاں سے قرآن، حدیث، تصوف، اسرارِ دین اور دیگر موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کی گئیں، اس ادارے سے مولانا بنوری کی دلچسپی اور کوشش سے علم حدیث کی متعدد کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، ان میں علامہ انور شاہ کشمیری کی نيل الفرقدين في مسئلة رفع اليدين اور كشف الستر في مسئلة الوتر قابلِ ذکر ہیں، اسی طرح قدیم مراجع میں سے علامہ زیلعی (۷۶۲ھ) کی نصب الراية لأحاديث الهداية بھی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آئی، یہ کتاب پہلے بھی ہندوستان میں چھپ چکی تھی، مگر اس میں بکثرت اغلاط تھیں، علامہ انور شاہ کشمیری نے ''المجلس العلمی'' کی جانب سے تصحیح کے بعد اسے دوبارہ شائع کرنے کی ہدایت کی، بعض قلمی نسخوں سے اس کا موازنہ کیا گیا، پھر مولانا بنوری نے اس کی طباعت کے لیے قاہرہ کا سفر کیا، وہاں دار الکتب المصریہ میں مخطوطہ اس کتاب کے بعض نسخوں سے موازنہ کیا، علامہ زاہد الکوثری سے اس پر مقدمہ لکھوایا اور خود بھی اس پر بعض حواشی اور کتاب، صاحب کتاب اور المجلس العلمی کا تعارف سپردِ قلم فرمایا، اس طرح یہ کتاب معیاری طباعت کے ساتھ قاہرہ

سے ۱۳۵۷ھ میں چار جلدوں میں شائع ہوئی، مولانا عبدالسلام قدوائی نے اس خدمت پر انہیں یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''قدماء کی کتابوں میں ہدایہ کی تخریج نصب الرایۃ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن پہلے یہ بہت ہی معمولی کاغذ پر چھپی تھی اور اس کے نسخے بھی بہت کم یاب تھے، مولانا بنوری کا حدیث وفقہ کے طلبہ پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے مصری ٹائپ میں بہت اچھے کاغذ پر اس کتاب کی طباعت کا انتظام کیا اور اس کے ساتھ بڑے عالمانہ حواشی تحریر کیے، جن کی وجہ سے اس کتاب کا افادہ بہت بڑھ گیا۔[۱]

۳۔ مولانا کی ایک حیثیت شارح حدیث کی ہے، جامع ترمذی کی ان کی شرح معارف السنن کو علمی حلقوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی ہے، آئندہ سطور میں اس کتاب کے حوالے سے مولانا کی خدمات حدیث کا تعارف کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

معارف السنن کی اہمیت:

معارف السنن اصلاً علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے افادات اور ان کی تحقیق وتخریج پر مشتمل ہے، لیکن ان میں مولانا یوسف بنوری کی محدثانہ شان بھی نمایاں ہے، علماء نے شروح ترمذی میں اس کی اہمیت اور قدروقیمت کا اعتراف کیا ہے، قاری محمد طیب فرماتے ہیں:

''ترمذی شریف کی نہایت ہی جامع اور بلیغ شرح لکھی، جس میں محدثانہ اور فقیہانہ انداز سے کلام کیا گیا ہے، اس کی عربیت اور طرز ادا معیاری ہے اور ذخیرۂ معلومات بہت کافی ہے، اس سے تبحر اور تعمق دونوں نمایاں ہیں''۔[۲]

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو اس دور میں علمی ودینی خدمات کے لیے نہ صرف چن لیا تھا، بلکہ ان کے کاموں میں غیر معمولی برکت عطا فرمائی تھی، ان کے علم وفضل کا سب سے بڑا شاہکار ان کی جامع ترمذی کی

شرح "معارف السنن" ہے۔..... احقر کو اس کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھنے کا شرف حاصل ہے، لہٰذا میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے محدثانہ مذاق کی جھلک کسی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے تو وہ "معارف السنن" ہے۔[۱۳]

تالیف وطباعت کا پس منظر:

علامہ انور شاہ کشمیری کتب احادیث کے درس کے دوران مسائل ومباحث پر اس طرح روشنی ڈالتے تھے کہ طلبہ انہیں نوٹ کر لیتے تھے، صحیح بخاری کی شرح فیض الباری، سنن ابی داؤد کی شرح التعلیق المحمود اور جامع ترمذی کی شرح العرف الشذی علامہ کشمیری کے اسی طرح کے افادات پر مشتمل ہیں۔[۱۴]

العرف الشذی شاہ صاحب کے ان افادات پر مشتمل ہے جنہیں مولانا محمد چراغ گوجرانوالویؒ (م ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء) نے دوران درس نوٹ کیا تھا، یہ افادات پہلے ایک جلد میں الگ سے شائع ہوئے تھے، بعد میں جامع ترمذی مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دیوبند کے ہر صفحے پر حاشیہ کی شکل میں ان کی اشاعت ہوئی ہے۔

مولانا بنوری نے لکھا ہے کہ "شاہ صاحب مروج طریقے پر املا نہیں کراتے تھے، بلکہ کچھ یادداشتوں کی روشنی میں لیکچر دیتے تھے، درس سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ انہیں نوٹ کرتے تھے، اس بنا پر وہ ان کے افادات کا کم از کم ایک تہائی حصہ نوٹ کرنے سے رہ جاتے تھے، اس کا بھی امکان رہتا تھا کہ ان سے بعض باتیں ضبط تحریر میں لانے میں غلطی ہوگئی ہو، تعبیر میں کوئی سہو ہوگیا ہو، بیان میں کوئی نقص رہ گیا ہو، یا تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ ہو سکا ہو، اس لیے "المجلس العلمی" کے ذمہ داروں نے طے کیا کہ ایک ایسی شرح تیار کی جائے جس میں اس کے نقص کو دور کیا گیا ہو، اس کی کمی کی تلافی کی گئی ہو اور جو کچھ اس میں درج ہونے سے رہ گیا ہو اس کا اضافہ مصادر ومراجع کی مدد سے کر دیا جائے۔[۱۵]

یہ ذمہ داری "المجلس العلمی" کے بانی شیخ محمد بن موسیٰ میاںؒ نے مولانا یوسف بنوریؒ کے سپرد

کی، انہوں نے انتہائی محنت سے یہ کام شروع کیا، جب کتاب الطہارۃ کی شرح مکمل ہوئی تو اس کی ضخامت اصل کتاب کے حجم کے برابر ہو چکی تھی، کام اور آگے بڑھا تو ابواب الحج کے وسط تک بڑے سائز کے دو ہزار صفحات لکھے جا چکے تھے، اس میں تقریباً ۱۵/سال کا عرصہ لگا، اس کے بعد مولانا نے تحریر شدہ مواد پر نظر ثانی کی اور اس میں ترمیم و اضافہ سے کام لیا، اس میں مزید ۷/سال لگ گئے، مگر وہ پاکستان تشریف لے گئے تو یہ کام بالکل رک گیا اور عرصہ تک اس کا دوبارہ آغاز کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

مولانا نے لکھا ہے کہ اس شرح ترمذی کے تصنیف شدہ حصہ میں سے جزء وتر کی اشاعت ہوئی اور علمائے حرمین شریفین کے ہاتھوں میں پہنچی تو انہیں بہت پسند آئی، انہوں نے پوری شرح شائع کرنے کا تقاضا شروع کر دیا، تقاضا اور اصرار کرنے والوں میں عالم جلیل زاہد عابد، شیخ حسن محمد مشاط المالکی بھی تھے، اس کی اشاعت میں ایک بڑی رکاوٹ مصارف کی تھی، وہ اس طرح دور ہوئی کہ جنوبی افریقہ کے میاں خاندان کے ایک صاحب خیر نے اس کا ذمہ اٹھالیا، اس وقت تک اس شرح کے آغاز کو ۲۶/سال گزر چکے تھے اور ابواب الحج کے ۳۵ ابواب تک شرح ہو پائی تھی، ابواب الحج کی تکمیل میں ۱۷ ابواب باقی تھے، تقاضا اور اصرار سے مجبور ہو کر مولانا نے آگے شرح لکھنے کا ارادہ کیا، مگر اس وقت ان کی عمر ۶۴/سال ہو گئی تھی، قویٰ مضمحل ہو چکے تھے، نشاط باقی نہیں رہا تھا، پاکستانی معاشرہ میں مسائل کا ہجوم تھا جن میں مولانا کا دل چسپی لینا اگزیر تھا، بہر حال کسی طرح مولانا نے ابواب الحج کو مکمل کیا، مگر آگے ان کے لیے کام جاری رکھنا ممکن نہ ہو سکا۔[۱]

اس طرح معارف السنن کے نام سے جامع ترمذی کی یہ نا تمام شرح، جو ابواب الحج تک پہنچی، تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور چھ جلدوں میں المکتبۃ البنوریہ کراچی اور دیگر مکتبات سے شائع ہوئی ہے۔

مولانا نے شرح کے آغاز میں لکھا ہے کہ ان کا ارادہ الگ سے ایک مقدمہ تحریر کرنے کا ہے[۲]، پھر اپنی تحریر ''بغیۃ الأریب فی أدوار التالیف'' میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے یہ مقدمہ تحریر کرلیا ہے جو انتہائی اہم مباحث و فوائد پر مشتمل ہے، اس میں امام ترمذیؒ کی سوانح پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، شریعت میں

سنت واحادیث کے مقام اور دین میں فقہ کے مقام ومرتبہ کو بیان کیا گیا ہے اور دیگر اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۱۸ مگر غالباً یہ مقدمہ زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکا، یا اس کی تالیف کی نوبت ہی نہیں آسکی۔

خصوصیات وامتیازات:

معارف السنن جن خصوصیات وامتیازات کی حامل ہے، ان کا تذکرہ خود مولانا بنوری نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے اس تالیف میں درج ذیل امور ملحوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے:

۱- اس کتاب میں ائمۂ متبوعین کے مسالک کی تفصیل ان کے معتبر مصادر ومراجع سے بیان کی گئی ہے اور امت کے تعامل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں انہوں نے علامہ بدرالدینؒ کی عمدۃ القاری، امام نوویؒ کی المجموع اور علامہ ابن قدامہؒ کی المغنی کو پیش نظر رکھا ہے، انہوں نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ انہیں اس شرح کی تالیف کے دوران ابوبکر ابن المنذرؒ، ابوجعفر الطحاویؒ، ابوجعفر طبریؒ اور ابن نصر المروزیؒ وغیرہ کی کتابیں، جن میں مذاہب فقہا تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، نہیں مل سکی تھیں۔

۲- یہ کتاب ائمہ کے درمیان اختلافات کے سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کے دلائل کا معتبر مرجع ہے۔

۳- یہ کتاب حدیث، فقہ، اصول اور دیگر اہم علمی مسائل کے سلسلے میں مباحث کے استیعاب کے پہلو سے جامع ترمذی کی مکمل ترین شرح ہے۔

۴- اس میں مشکل مسائل اور دقائق وغوامض کو شستہ عبارت اور دل کش اسلوب میں حل کیا گیا ہے۔

۵- یہ جامع ترین کتاب جس میں روایت، درایت، فقہ، حدیث، عربی زبان وادب، بلاغت اور دیگر علوم کی عمدہ بحثوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۶- یہ کتاب جمال تعبیر، حسن ترتیب، متانت بحث، رزانت بیان اور قدماء کے اقوال کے استقصاء

کی جامع ہے۔

۷- یہ کتاب دیدہ زیب اور معیاری طباعت کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے۔

۸- یہ کتاب امام عصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے ارشادات وافادات کا معتبر ترین جامع ہے۔

افادات علامہ کشمیری کا معتبر ترین جامع:

اس شرح میں مولانا بنوری نے تحقیق وتصحیح کی جو غیر معمولی محنت کی ہے اس کی وجہ سے یہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے افادات وامالی اور تالیفات وتحقیقات کا معتبر ترین مرجع بن گئی ہے، اس کے کئی پہلو ہیں:

۱- متعدد کتب حدیث پر علامہ کشمیری کے افادات شائع ہو چکے ہیں، مثلاً فیض الباری علی صحیح البخاری، القول المحمود علی سنن ابی داؤد، العرف الشذی علی جامع الترمذی، ان افادات کو ضبط تحریر میں لانے میں جو غلطیاں در آئی تھیں، معارف السنن میں ان کی تصحیح کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۲- شرح احادیث کے موضوع پر علامہ کشمیری کے کئی رسائل ہیں، مثلاً فصل الخطاب في مسئلة أم الكتاب، نيل الفرقدين في مسئلة رفع اليدين، بسط اليدين لنيل الفرقدين، كشف الستر في مسئلة الوتر، نزل الرفاق في شرح حديث محمد بن اسحاق، خاتمة الخطاب في فاتحة الكتاب، ان کے دقیق مسائل کی تسہیل اور تلخیص کر کے اس شرح میں شامل کر دیا گیا ہے۔

۳- شاہ کشمیری کے اقوال وارشادات، جو شرح احادیث سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں ان کے امالی، تالیفات اور قلمی مذکرات سے اکٹھا کر کے شامل کتاب کر دیا گیا ہے، مثال کے طور پر آثار السنن للنیموی پر ان کی تعلیقات قلمی شکل میں تھیں، ان کے متعدد اقتباسات اس شرح میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

علامہ کی تحریروں میں جہاں جہاں ابہام پایا جاتا ہے یا انہوں نے محض اشارے کیے ہیں، وہاں ابہام دور کر دیا گیا ہے اور اشارہ کھول دیا گیا ہے، اس سلسلے میں حوالوں اور متعلقات کی تخریج کر دی گئی ہے۔

۵- شاہ صاحب نے اپنی تحریروں یا امالی میں جن قدیم مراجع کے حوالے دیئے ہیں، ان کی طرف

براہ راست رجوع کر کے عبارتوں کی تصحیح کا اہتمام کیا گیا ہے، مثال کے طور پر کتاب سیبویہ، الرضی، شرح الکافیہ، دلائل الاعجاز، اسرار البلاغۃ، عروس الافراح، کشف الاسرار لعبد العزیز البخاری، شرح اصول البزدوی للفخر الرازی، فتح الباری، عمدۃ القاری، شرح المھذب، مغنی ابن قدامہ وغیرہ۔

مولانا بنوری نے حوالوں کی تحقیق وتخریج میں کتنی محنت کی ہے اس کا اندازہ دو مثالوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، علامہ کشمیری نے ایک جگہ متعارض روایات پر بحث کرتے ہوئے فرمایا تھا: "إن هذا من قبيل ذكر سالم بذكره الآخر" (یہ اس چیز کی مثال ہے کہ متعارض روایات بیان کرنے والے راویوں میں سے ایک نے وہ بات ذکر کی جس کا تذکرہ دوسرے راوی نے نہیں کیا) پھر مزید فرمایا: "یہ ایک اہم قاعدہ ہے، ارباب المصطلح کو اس پر توجہ دینی چاہیے تھی، مگر انہوں نے عموماً اس سے تغافل برتا ہے، البتہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ایک سے زائد مقامات پر اسے بیان کیا ہے" مولانا بنوری نے فتح الباری کی ورق گردانی کی تو انہیں دس سے زائد مقامات پر اس قاعدہ کا ذکر مل گیا، اسی طرح اختلاف صحابہ کے موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے علامہ کشمیری نے فرمایا تھا: "امام ابوزید الدبوسی نے صحیح لکھا ہے:" كل مسئلة اختلف فيها فقهاء الصحابة يصعب الخروج منها، ويشكل ان ينفصل فيها النزاع" (ہر وہ مسئلہ جس میں فقہائے صحابہ کا اختلاف پایا جاتا ہے، اس میں ان کے اختلاف سے خروج دشوار ہے، اور نزاع بھی دور ہونا مشکل ہے) مولانا بنوری نے امام دبوسی کی کتاب تاسیس النظر پوری پڑھ ڈالی، مگر اس میں یہ بات کہیں نہ ملی، خیال ہوا کہ یہ ان کی کتابوں اسرار الخلاف اور تقویم الادلۃ میں سے کسی ایک میں ضرور ہوگی، لیکن وہ دونوں کتابیں قلمی تھیں اور دست یاب بھی نہیں تھیں، پھر ذہن میں آیا کہ ممکن ہے یہ حوالہ کشف الاسرار للشیخ عبد العزیز البخاری یا شرح التحریر لابن امیر الحاج کے واسطے سے ہو، تلاش بسیار کے بعد ان دونوں کتابوں میں یہ حوالہ مل گیا۔[۱۹]

اس جدوجہد کو دیکھتے ہوئے مولانا بنوری کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔

"والله إن شرح كتاب من أمهات الحديث كان أهون عليّ من تخريج لمثل هذا

الکتاب و شرح لکل باب.

(اللہ کی قسم، امہات کتب حدیث میں سے کسی کتاب کی شرح کرنا میرے لیے اس جیسی کتاب کی تخریج اور اس کے ابواب کی شرح کرنے سے زیادہ آسان تھا)

منہج تالیف:

معارف السنن کا منہج تالیف کیا ہے، اسے چار نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱- مولانا نے زیر بحث مسئلہ میں متعلقہ حوالوں کی تحقیق اور تخریج کے لیے قدیم مصادر و مراجع سے رجوع کیا ہے۔

۲- قدیم شروح حدیث وفقہ کی طویل بحثوں کی مناسب تلخیص کر دی ہے، تاکہ قاری کی سمجھ میں بات بہ آسانی آ سکے اور کم وقت میں وہ گوہر مراد کو پا سکے۔

۳- بحث طویل ہو جانے کی صورت میں آخر میں اس کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

اس طرح اس کتاب کے منہج تالیف کو چار الفاظ میں سمیٹا جاسکتا ہے: جمع، ترتیب، تعبیر، تلخیص۔

شرح میں کیا نہیں ہے؟:

مولانا نے اپنی اس شرح میں دو چیزیں شامل نہیں کی ہیں:

۱- انہوں نے احادیث کی سندوں پر عموماً بحث نہیں کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ رواۃ کی تعدیل و جرح پر قدیم مراجع مثلاً تہذیب التہذیب اور تقریب التہذیب وغیرہ میں جو کچھ مواد ہے وہ کافی ہے، اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں، الا یہ کہ کہیں ضرورت اس کی متقاضی ہو۔

۲- امام ترمذیؒ نے اکثر مقامات پر ایک حدیث ایک صحابی کے حوالے سے ذکر کی ہے، پھر وفی الباب لکھ کر دوسرے صحابہ کا نام ذکر کیا ہے، اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ حدیث دیگر طرق سے ان صحابہ سے بھی مروی ہے، مولانا نے اپنی شرح میں اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے، انہوں نے شرح کے آغاز میں لکھا ہے کہ"میں نے اس سلسلے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام "لب اللباب فی

لتخريج مايقول الترمذي وفي الباب" ہے۔
معلوم نہیں یہ کتاب شائع نہ ہوسکی، یا مولانا کو اس کی تصنیف کا موقع نہ مل سکا۔



حواشی ومراجع:

۱- قاری محمد طیب، دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، طبع دیوبند، ص ۱۸۳
۲- محمد تقی عثمانی، نقوش رفتگاں، طبع دیوبند، ص ۸۶
۳- سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند، ۱۹۷۸ء، طبع اول جلد دوم، ص ۱۶۴
۴- مولانا بنوری سے متعلق سوانحی معلومات کے لیے مذکورہ بالا کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے
۵- مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے ماہ نامہ 'بینات' کے یہ شمارے: شعبان ۱۳۸۶ھ/ دسمبر ۱۹۶۶ء، محرم ۱۳۸۸ھ/اپریل ۱۹۶۸ء
۶- نقوش رفتگاں، ص ۸۷
۷- ملاحظہ کیجئے تعارف نامہ مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق، اکیڈمی اپنے ترجمان مجلۃ مجمع اللغۃ العربیۃ میں بھی وقتاً فوقتاً اپنے ارکان کی فہرست شائع کرتی رہتی ہے۔
۸- مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مضمون بعنوان، مولانا محمد یوسف بنوری، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۸۱
۹- نقوش رفتگاں، ص ۹۲
۱۰- ماہ نامہ معارف، حوالہ سابق، ص ۳۸۱، ۳۸۲
۱۱- حوالہ سابق، ص ۳۸۰
۱۲- دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، ص ۱۸۱

۱۳- نقوش رفتگاں، ص۸۷

۱۴- عبدالرحمٰن کوندو، الانور، ندوۃ المصنفین دہلی، ص۱۸۲، ۱۸۳

۱۵- محمد یوسف بنوری، معارف السنن، المکتبۃ البنوریہ کراچی پاکستان، سن طبع غیر مذکور، ۴۳/۶

۱۶- حوالہ سابق، ۶/۴۳۳، ۴۳۹/۴۴۱

۱۷- حوالہ سابق، ۱۵/۱

۱۸- حوالہ سابق ۴۳۸/۶

۱۹- حوالہ سابق ۴۳۲/۶-۴۳۵

۲۰- حوالہ سابق، ۴۳۲/۶

۲۱- حوالہ سابق، ۶،۲/۱/۴۳۸

۲۲- حوالہ سابق، ۲/۱



حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

اور

علم حدیث

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری

راقم السطور اپنے اس مضمون میں حضرتؒ کی زندگی کے صرف اس گوشہ کو بیان کرنا چاہتا ہے جس کے باعث زبان خلق نے نقارۂ خدا بن کر انھیں "شیخ الحدیث" کا لقب وخطاب عطا کیا، اور پھر یہ لقب ان کے اصل نام کا لازمی جز اور اس کی علامت بن کر رہ گیا، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت کا حقیقی اسم گرامی "شیخ الحدیث" کے لقب کی عمومیت میں گم ہو گیا تھا، ان کا سینہ عشق رسول کی آتش سوزاں کی آماجگاہ تھا اور علم حدیث سے آپ کا والہانہ شغف اور اس کی تحقیق آفرینی میں غیر معمولی انہماک اس عشق رسول کا طبعی نتیجہ تھا، ہزاروں دلوں نے اس حرارت سے اکتساب فیض کیا، آپ نے جو گرانقدر علمی کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کی نظیر کم از کم قرون متاخرہ میں مفقود ہے اور بلاشبہ گنبد افلاک آپ کے گوناگوں وہمہ جہت کارناموں سے رہتی دنیا تک گونجتا رہے گا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

ہندوستان میں علم حدیث حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد:

تاریخی حقائق شاہد عدل ہیں کہ آغاز اسلام کے ساتھ ہی سرزمین ہند قـال اللہ و قـال

الرسول کے سرمدی نغموں سے معمور ہوگئی تھی، ہر عصر و عہد میں محدثین کرام کی ایک جماعت اس ملک میں وارد ہوئی اور بساط درس حدیث آراستہ کی، علم حدیث کی ترویج واشاعت اور تدریس وتصنیف کا جو غلغلہ ہندوستان میں بلند ہوا اس کی نظیر دوسرے بلاد اسلامیہ میں نہیں ملتی، خاص طور پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ) اور ان کے نامور خانوادے نے ہندوستان میں علم حدیث کے منارہ کو رفعت میں رشک فلک بنا دیا تھا، ان ہی کے ذریعہ اس ملک میں صحاح ستہ کی تدریس کا رواج عام ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے درس وتصانیف کے ذریعہ تطبیق الحدیث اور شریعت کے اسرار وحکم کا ایک نیا باب وا کیا، انھوں نے مذاہب فقہاء کی ادلہ احادیث پر گہری نظر ڈالی اور اپنے نور باطن سے فقہاء کا طریقہ پسند کیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں آپ کے فرزند اکبر سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) کے فیضان درس سے اکابر محدثین کی ایک بڑی جماعت تیار ہوکر نکلی جن میں سب سے زیادہ شہرت وامتیاز خود آپ کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق مہاجر مکی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) کو حاصل ہوا، ان کی ذات اپنے عہد میں علم حدیث کا سب سے بڑا مرجع ومرکز تھی، اکناف عالم کے تشنگان علم نے ان کے در پر حاضر ہوکر کسب فیض کیا، نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام میں ان کی نظیر اس عہد میں شاید ہی مل سکے، ان کے ممتاز وسر فہرست تلامذہ میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ (المتوفی ۱۲۹۶ھ) مہاجر مدنی کا نام نمایاں ہے، جن کے درس حدیث سے ہندستان اور حرمین شریفین کے علماء کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی اور ہندوستان کی پوری علمی فضا حدیث کے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے معمور ہوگئی، ان کے سرآمد روزگار تلامذہ میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) اور قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ) کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے اپنے وطن گنگوہ کو تربیت واصلاح اور درس وتدریس وافتاء کا مرکز بنایا، آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یحییٰ (م ۱۳۳۴ھ) ہیں جن کے سبب دنیا نے حضرت کے عہد آخر کے دور حدیث کی بہار دیکھی، حضرت امام ربانی تن تنہا صحاح ستہ

کا درس دیتے تھے اور اس میں ضبط و اتقان اور تحقیقات نادرہ کے موتی بکھیرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ نے حضرت کے درس کے افادات عربی زبان میں قلمبند کئے تھے جو در حقیقت حضرت کے عمیق و وسیع مطالعہ اور طویل عرصہ کے درس کا خلاصہ اور نچوڑ ہیں، یہی حضرت مولانا محمد یحییٰ ہمارے استاذ و مرشد مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کے والد بزرگوار ہیں۔

حضرت شیخ کی تعلیم حدیث کا آغاز:

حضرت شیخ الحدیثؒ سب سے پہلے حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوئے، پھر درسیات کی اکثر متداول کتب سے فراغت کے بعد اپنے والد بزرگوار سے "مشکوٰۃ شریف" پڑھنے کا آغاز کیا، یہی نورانی و روحانی نقطہ آغاز در حقیقت حضرت شیخ کی زندگی کی وہ ساعت ہمایونی تھی جس نے تا حیات انہیں علم حدیث کی تحت آفرینی اور دقیقہ رسی میں منہمک رکھا۔ حضرت شیخ اپنے آغاز مشکوٰۃ کا قصہ خود ہی بیان فرماتے ہیں کہ۔

"۷ر محرم ۱۳۳۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد میری مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، والد صاحب نے خود ہی ظہر کی امامت بھی کی تھی کہ اس زمانہ میں نماز وہی پڑھاتے تھے، نماز کے بعد غسل فرمایا اور دو رکعت نماز نفل پڑھی، پھر میری طرف متوجہ ہو کر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ اور خطبہ مجھ سے پڑھوایا، پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر پندرہ یا بیس منٹ تک بہت دعائیں مانگیں، مجھے نہیں معلوم کہ کیا کیا دعائیں مانگیں لیکن میں ان کی معیت میں اس وقت صرف ایک ہی دعا کرتا رہا کہ یا اللہ حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا ہے اسے مرنے تک میرے ساتھ وابستہ رکھئے، اللہ جل شانہ نے میری ناپاکیوں، گندگیوں اور سیئات کے باوجود اسی قبولیت عطا فرمائی کہ ۱۳۳۲ھ سے ۱۳۹۰ھ تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا جس میں حدیث پاک کا مشغلہ نہ رہا ہو"۔

حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ اس دعا کے وقت میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات کیسے ممکن ہے، اگر میں نے حدیث پڑھ بھی لی پھر مدرس بھی ہو گیا تو درس حدیث تک دس بارہ سال لگ جائیں گے بہت سے ایسے حضرات جو عرصہ سے مدرس ہو چکے تھے اس وقت تک مشکوٰۃ شریف تک نہیں پہونچ

سکے تھے، مگر اللہ تعالیٰ بڑا مسبب الاسباب ہے وہ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو اسباب خود ہی پیدا فرما دیتا ہے۔

دورۂ حدیث:

حضرت شیخ کے دورۂ حدیث کی ابتدا ۱۳۳۳ھ میں ہوئی، اسی سال حضرت سہارنپوریؒ اور حضرت شیخ الہند نوراللہ مرقدہما نے طویل قیام کے ارادے کے حجاز مقدس کے سفر کا قصد فرمایا تھا، حضرت شیخ الحدیث فرماتے تھے کہ میرے ذہن میں یہ تھا کہ نہ مجھے کہیں ملازمت کرنی ہے اور نہ عجلت ہی ہے، ایک سال میں دورۂ حدیث مکمل کرنے پر کوئی پابندی نہیں، ابوداؤد شریف مولانا یحییٰ صاحب کا خاص سبق تھا، اس لئے ان کے درس میں ابوداؤد شریف شروع کردی، ترمذی شریف کو حضرت سہارنپوری کی واپسی پر ملتوی رکھا، لیکن بعض اسباب کی بنا پر ابن ماجہ کے سوا تمام کتابیں اپنے والد مغفور سے نہایت بحث وتحقیق کے ساتھ پڑھیں، اس کے بعد دوبارہ ۱۳۳۴ھ میں ان کتابوں کو حضرت شیخ نے اپنے استاذ ومرشد شیخ العرب والعجم مولانا خلیل احمد سہارنپوری (المتوفی ۱۳۴۶ھ) سے پڑھا، (ابن ماجہ کے ابتدائی حصہ کو پڑھ کر اجازت لی تھی)۔

اس طرح حضرت شیخ اپنے والد بزرگوار اور حضرت اقدس سہارنپوری، دونوں بزرگوں کے علوم وکمالات اور روحانیت کے سچے جانشین تھے، حضرت شیخ کے علمی کارناموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) درس حدیث اور (۲) تالیف وتصنیف۔

۱۔ تدریس حدیث

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ۱۰ ؍محرم الحرام ۱۳۳۵ھ کو مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں مدرس ہوئے اور بہت جلد اپنی خداداد صلاحیتوں اور استعداد کے باعث ترقی کرکے تدریس حدیث تک پہونچ گئے، حضرت مولانا سہارنپوری کو علم حدیث سے ان کی مناسبت اور استعداد کا بخوبی اندازہ تھا۔ چنانچہ حضرت سہارنپوری کی خواہش تھی کہ حضرت شیخ حدیث کی کتابیں بھی پڑھائیں، اس لئے انہوں نے ۱۳۴۱ھ میں بخاری شریف کے تین پارے (از ۱۳ تا ۱۵) کی تدریس حضرت شیخ کے ذمہ فرمادی،

اور ایک سفر پر روانہ ہو گئے ۔ واپسی پر تحقیق فرمائی کی پڑھانے لگے یا نہیں؟ اس پر معلوم ہوا کہ اکابر اساتذہ کی موجودگی میں پڑھانے سے تکلف ہے اور احتراز کر رہے ہیں، اس پر حضرت سہارنپوری ناراض ہوئے، چنانچہ حضرت شیخ الحدیث جو ابھی عمر کی ۲۶ ویں بہار میں تھے اور اس وقت تک مشکوٰۃ شریف بھی نہ پڑھائی تھی عجیب کشمکش اور پریشانی میں مبتلا ہو گئے، اپنے استاذ و شیخ کی ناراضگی سے پریشان ہو کر عرض کیا۔

''حضرت! تو یہ تو یہ مجھے تو یہ خیال ہوا کہ مدرسہ کی بڑی بدنامی ہے، دوسرے مدارس والے کیا کہیں گے کہ ایک نوعمر لڑکے کو جس نے ابھی مشکوٰۃ تو بھی نہیں پڑھائی ہے بخاری دے دی ہے''۔

یہ سن کر حضرت سہارنپوریؒ نے بڑے جوش وجذبہ کے ساتھ ارشاد فرمایا:۔

''نوعمر لڑکے کو میں ہی جانوں، دوسرے لوگ کیا جانیں، اگر کوئی الزام دے گا تو مجھے دے گا تمہیں نہیں دیگا''۔

اس سوال وجواب کے بعد حضرت شیخ نے یہ درس حدیث قبول کر لیا اور پھر'' قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' کا حقیقی مشاہدہ ہوا۔ پورا تعلیمی سال اطمینان سے گزرا اور سب مطمئن رہے۔

اس کے بعد ماہ شوال ۱۳۴۱ھ سے مشکوٰۃ شریف کی تدریس بھی آپ کے سپرد ہوئی، ۱۳۴۵ھ میں مدینہ طیبہ کے دوران قیام میں مدرسہ علوم شرعیہ میں بعض مغربی طلبہ کو ابوداؤد شریف بھی پڑھائی، حجاز مقدس سے واپسی پر ۱۸؍صفر ۱۳۴۶ھ سے ابوداؤد شریف اور نسائی شریف کے اسباق آپ کے ذمہ منتقل ہو کر آئے تھے، اسی کے ساتھ موطا امام محمد اور بخاری شریف کے آخری چار پاروں کی تدریس بھی آپ کے سپرد ہوئی، اس وقت سے ۱۳۷۵ھ تک مسلسل ابوداؤد شریف کا درس حضرت شیخ ہی کے ذمہ رہا، آپ کے درس کی شہرت ابتداء سے ہندوستان کے عربی مدارس میں ہو گئی تھی اور نام کے بجائے ''شیخ الحدیث'' کے لقب سے مشہور عام ہوئے۔ یہ لقب دراصل حضرت سہارنپوری نے آپ کو عطا فرمایا تھا، اپنے انتقال سے پیشتر حضرت سہارنپوری نے جو تحریر مدینہ منورہ سے مدرسہ مظاہر علوم کے نام ارسال کی تھی اس میں خصوصیت کے ساتھ اس بات کا ذکر تھا کہ حضرت شیخ کو حدیث سے جو

مناسبت ہے وہ کسی اور کو نہیں، اس لئے انہیں کو مدرسہ کا شیخ الحدیث مقرر کیا جائے اور اگر کسی کو اس میں تردد ہو تو میں اپنی طرف سے ان کو شیخ الحدیث کا لقب دیتا ہوں۔

تقریباً ۳۵ سال تک سنن أبی داؤد اور بخاری جلد اول کا درس حضرت ہی کے ذمہ رہا، اس کے بعد ۱۳۷۳ھ سے ناظم مدرسہ مولانا عبداللطیف صاحب کے یہاں سے بخاری جلد ثانی بھی حضرت ہی کی طرف منتقل ہوگئی، لیکن ۱۳۷۵ھ سے صرف بخاری شریف ہی آپ کے ذمہ رہ گئی، اس طویل زمانہ تدریس میں حسب ضرورت حدیث کی بعض دوسری کتب مثلاً ترمذی، مسلم اور شمائل ترمذی وغیرہ بھی زیر درس رہیں، افسوس کہ ۱۳۸۸ھ سے آنکھوں میں نزول ماء (موتیابند) کی شکایت کے باعث درس کا سلسلہ منقطع ہوگیا مگر تالیف و تصنیف کا سلسلہ آخر تک قائم و برقرار رہا۔

اسی طرح مسلسلات حدیث کے درس کا بھی حضرت کے یہاں بڑا اہتمام تھا، ابتداء میں تو خصوصی طور پر بعض حضرات اجازت لیتے رہے، لیکن ۱۳۸۸ھ سے باضابطہ اس کا اہتمام ہونے لگا، اور کافی جم غفیر اس کی تحصیل کے لئے اکٹھا ہونے لگا، چنانچہ ۲۲؍رجب ۱۳۹۰ھ کو ہندوستان کے مدارس عربیہ میں یہ خبر گونج اٹھی کہ حضرت شیخ مسلسلات حدیث پڑھائیں گے، اس موقع پر تقریباً ڈیڑھ ہزار کا مجمع ہوگیا جس میں ہندوستان کے بہت سے اساطین و مشاہیر اہل علم بھی شریک ہوئے۔

درس حدیث سے والہانہ شیفتگی:

حضرت شیخ جس انہماک و دلسوزی، نشاط و سرگرمی کے ساتھ حدیث کا درس دیا کرتے تھے اس کی صحیح مرقع کشی سے زبان و قلم قاصر ہیں، حقیقت یہ ہے کہ علم حدیث آپ کے لئے محض ایک علم اور فن کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ ان کا ذوق و حال بن گیا تھا اور ان کے جسم و جان اور رگ و ریشہ میں کچھ اس طرح رچ بس گیا تھا جیسے پھول میں خوشبو اور ستاروں میں روشنی اور ؎

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

ایک بار موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، تمام سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر رہا تھا، ناکارہ راقم سطور مدرسہ قدیم میں کتاب لیے ہوئے منتظر تھا کہ بارش کا زور کم ہو تو سبق میں حاضر ہو، حضرت مولانا

اسعد اللہ صاحب مرحوم ناظم مدرسہ مظاہر علوم اس وقت دفتر نظامت (جو مدرسہ قدیم میں واقع ہے) میں تشریف رکھتے تھے، اس ناچیز نے ان سے دریافت کیا کہ کیا حضرت شیخ الحدیث آج بھی درس میں تشریف لے گئے ہوں گے، انھوں نے فرمایا کہ اس طوفانی بارش میں تو بظاہر مشکل ہی معلوم ہوتا ہے، باہر جا کر معلوم کرلو، چنانچہ میں نے مدرسہ کے دروازے پر آکر سائبان میں بیٹھے ہوئے پھل فروش سے معلوم کیا، بارش کا زور برابر قائم تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت تو دیر ہوئی تشریف لے گئے، جب کہ حضرت کے مکان سے دارالحدیث کا خاصہ فاصلہ ہے، سڑک پر پانی بہہ رہا تھا، بہرکیف ہمت بھی بعجلت تمام دارالحدیث میں حاضر ہوا، وہاں بجلی غائب تھی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر درس شروع ہو چکا تھا، ناچیز راقم سطور چپکے سے بیٹھ گیا کہ مبادا حضرت شیخ کی نظر پڑ جائے مگر آپ نے دیکھ لیا اور فرمایا، جانتے ہو کیسے آیا ہوں، اپنے مکان سے روانہ ہوا تو ایک ہاتھ میں بخاری شریف کا پارہ اور دوسرے ہاتھ میں چھتری تھی، جوتے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا، نصف راستہ تک آیا تو ایک رکشہ والا مل گیا، اس نے باصرار مجھے رکشہ پر سوار کرلیا اور یہاں پہونچانے کے بعد میرے پیروں اور پائجامہ کے نچلے حصہ کو دھو دیا، یہ نا کارہ سن کر پانی پانی ہوگیا۔

حضرت شیخ کا درس گرمی و سردی، صحت و بیماری اور بارش و آندھی تمام حالات میں اسی مستعدی و نشاط اور تازگی و پابندی کے ساتھ جاری رہتا تھا، دارالحدیث میں قدم رکھتے ہی عطر کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہو جاتا تھا، ادب و احترام اور وقار و سکینت کی جو خاص کیفیت اس وقت پیدا ہو جاتی تھی اس کے بیان کے لئے راقم سطور ذخیرۂ الفاظ کو قاصر پاتا ہے، جو بھی تھوڑی دیر کے لئے مجلس میں بیٹھ جاتا یوں محسوس کرتا گویا۔

باد صبا آج بہت مشک بار ہے
شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

حضرت شیخ کا درس اپنے عہد میں اہم ترین خصوصیت کا حامل تھا، اس لئے ان کے درس کی تقریر کو بہت سے علماء و فضلاء قلمبند کرنے کا اہتمام کرتے تھے، اس ناچیز راقم سطور نے بھی درس

بخاری کی تقریر کو بہت اہتمام سے قلم بند کیا ہے، مولانا محمد شاہد صاحب نے حضرت شیخ کی مختلف تقاریر کو مرتب کیا ہے، مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم کی نظر ثانی کے بعد عرصہ ہوا، اس کے دو اجزاء کی طباعت ہو چکی ہے، اس کے شروع میں حضرت شیخ کے ایماء وحکم سے اس ناچیز کے قلم سے ایک مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں حضرتؒ کے درس کی امتیازی خصوصیات کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

حضرت شیخ کے درس کی خصوصیات:

(۱) حضرت شیخ کا درس عشق نبویؐ اور حب رسول کا نمونہ ہوتا تھا، جس کیفیت وسوز وگداز سے آپ پڑھاتے تھے وہ قابل بیان ہے ؎

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لئے

اس کا اثر پورے مجمع پر بہت غیر معمولی ہوتا تھا، کبھی آہ وبکا کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جیسا کہ کسی نے اس طرح تصویر کشی کی ہے ؎

پھر پرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں لیے ہوئے

خصوصاً حضرت شیخ جس وقت آنحضرت ﷺ کے مرض وفات کی حدیث پڑھا کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج ہی یہ عظیم سانحہ پیش آیا ہے، اس وقت حضرت پر بے اختیار گریہ طاری ہو جاتا تھا، عبارت پڑھنی مشکل ہو جاتی، اور طلباء وسامعین پر آہ وبکا کا عالم ہوتا ؎

الٰہی درد وغم کی سر زمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

(۲) حضرت شیخ کے درس میں تمام ائمہ سلف ومجتہدین اور محدثین کرام کے ساتھ نہایت ادب وعظمت کا معاملہ رہتا تھا، شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی سے بہت سے مواقع پر اختلاف

فرماتے تھے...........اوران کے بارے میں یہ بھی فرماتے کہ انھوں نے حنفیہ کونظر انداز کر دیا ہے، حنفیہ کی دلیل سے اس طرح آنکھ بچا کرنکل گئے ہیں گویاانھیں اس کی خبر نہیں، حالانکہ کتاب میں بسا اوقات اسی راوی یا روایت کو اپنے مذہب کی تائید میں دوسری جگہ نقل فرمایا ہے مگر بہ ایں ہمہ حافظ ابن حجر کا ہم حدیث پڑھنے پڑھانے والوں پر جتنا احسان ہے اور کسی کا نہیں، امام بخاری کا جہاں حنفیہ سے اختلاف ہوا ہے وہاں حد اعتدال کو قائم رکھنا بہت سے اہل علم کے لئے دشوار ہو جاتا ہے، مگر حضرت شیخ اس موقع پر عام طور پر امام بخاری کے اعتراض کا مدلل جواب دینے کے بعد ان کے اسم گرامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ فرماتے کہ ان کی عظمت شان اور جلالت قدر میں کسی طرح کمی واقع نہ ہو، خصوصاً کتاب الحیل و کتاب الاکراہ میں حضرت شیخ کے درس کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔

(۳) بعض عربی الفاظ کا ترجمہ دشوار ہے، اس لئے کہ عربی کے مقابلہ میں اردو کا ذخیرۂ الفاظ کوتاہ ہے، اور بسا اوقات ترجمہ میں دشواری ہوتی ہے، مگر حضرت شیخ اس طرح کے الفاظ کا اردو میں ایسا ترجمہ فرماتے کہ اس سے بہتر اردو زبان میں تعبیر ممکن نہیں ہے۔

(۴) نفس حدیث میں اگر کہیں مطلب میں دشواری ہوتی اور دیگر شراح بخاری نے بھی اس کو واضح نہیں فرمایا ہے بلکہ ان کی توجیہ وتشریح میں بھی الجھن باقی ہے تو اس کو خصوصیت کے ساتھ دور فرماتے، اگر اس طرح کی تمام نادر تحقیقات کو جمع کر دیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے، مثال کے طور پر "باب القسامة" بخاری جلد ثانی ص ۱۰۱۸ (طبع ہند) میں " فقرنت یدہ بیدہ " میں ضمیر کے مرجع اور کلام کے مطلب میں تمام شراح بلکہ حافظ ابن حجر تک سے وہم واقع ہوا ہے، حضرت شیخ اپنے درس میں ان اوہام کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے اور ضمیر کا مرجع وعبارت کا مطلب ایسا بیان فرماتے کہ ہر طرح تشفی ہو جاتی، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ (لامع الدراری ج ۳ ص ۳۹۱)

(۵) اگر کتاب میں مؤلف یا کسی راوی سے کوئی وہم واقع ہوا ہے یا کسی راوی پر کسی نوع کا کلام ہے تو اس پر ضرور متنبہ فرماتے اور اس راوی وروایت کی حیثیت کو واضح فرماتے تھے، حافظ ابن حجر کی معرکۃ الآرا کتاب "تہذیب التہذیب" پر حضرت شیخ کا مبسوط ذیل ہے، اگر وہ طبع ہو جاتا تو علمی

دنیا خصوصاً احناف پر احسان عظیم ہوتا۔

(۶) مذاہب ائمہ کی تحقیق اور ان کے دلائل خصوصاً مسلک حنفی کے دلائل کو تفصیل سے بیان فرماتے، اگر کوئی روایت بظاہر حنفیہ کے مسلک کے خلاف نظر آتی تو اس کی توجیہات اس طرح نقل فرماتے کہ مسلک حنفیہ اس حدیث سے اقرب نظر آنے لگتا۔

(۷) اکثر اہم مسائل میں پہلے خلاصہ کے طور پر بیان فرمادیتے کہ اس میں ۵ یا ۷ یا ۱۰ بحثیں ہیں، پھر ان کی قدرے تفصیل وتوضیح فرماتے، ان میں جن مسائل سے امام بخاری نے تعرض کیا ہے ان کی مزید تشریح فرماتے، رفع یدین، آمین بالجہر اور کسوف وغیرہ ابواب میں اسے دیکھا جاسکتا ہے۔

(۸) شروح حدیث اور محدثین کرام کے کلام کو بطور خلاصہ نہایت دل نشیں انداز میں بیان فرماتے، حضرت شیخ کی پوری تقریر مغزی مغز ہوتی تھی، اگر کوئی شخص اصل کتاب سے حضرت کی تقریر ملا کر دیکھے گا تو نمایاں طور پر محسوس کرے گا کہ ایک صفحہ کی بحث ایک سطر میں آگئی، اور بعض مواقع پر تو کوزہ میں دریا بند نظر آتا ہے۔

(۹) درمیان سبق میں خصوصاً سہ ماہی امتحان تک اپنے اکابر کے واقعات موقع ومحل کی مناسبت سے سناتے تھے، بلاشبہ واقعات اصلاح وتربیت کے لئے بہت مؤثر ہوتے ہیں، اس کا مقصد یہ ہوتا کہ طلبا، اپنے مقام کو پہچان کر اس کتاب عظیم کو پڑھیں ؎

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تری مہربانی

(۱۰) درس بخاری میں حضرت شیخ خصوصیت کے ساتھ تراجم ابواب کی شرح اور امام بخاری کے ترجمہ کی غرض کو تفصیل سے بیان فرماتے تھے، بعض تراجم پر تمام شروح بخاری خاموش ہیں مگر شیخ فرمایا کرتے تھے کہ امام موصوف کا کوئی ترجمہ دقت نظر اور باریک بینی سے خالی نہیں ہے، مثلاً امام بخاری نے ایک ترجمۃ الباب قائم کیا ہے۔ "باب الصلوۃ إلی الحربة" یہاں تمام شروح ساکت

ہیں، مگر حضرت شیخ کی نگاہ دوررس نے یہاں بھی بخاری کے شایان شان ایک دقیق نکتہ پیدا کیا اور اس لطیف توجیہ کو حضرت گنگوہی کے حوالے سے نقل فرمایا ہے، جس کی تفصیل وتحقیق "لامع الدراری" اور اس کے حاشیہ میں موجود ہے، وہ یہ کہ چونکہ زمانہ جاہلیت میں بعض قبائل عرب ہتھیاروں اور اوزاروں کی پرستش کیا کرتے تھے اس لئے پیش نظر ترجمہ سے امام بخاری اس مسئلہ میں پیدا ہونے والے وہم کو دفع فرما کر اس کا اظہار فرما رہے ہیں کہ نیزہ کو سترہ بنانا جائز ہے۔

(۱۱) حل تراجم ابواب کے سلسلے میں اگر کوئی مسئلہ ایسا پیش آیا جس میں امام بخاری نے کسی مخصوص امام کے مسلک کو ترجیح دی ہے یا ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی اور امام کی رائے کو پسند فرمایا ہے یا وہ اپنی رائے میں منفرد ہیں تو حضرت شیخ اس کو امام بخاری کے دلائل کے ساتھ بیان فرماتے اور امام موصوف کے اعتراض کا مفصل جواب دیتے تھے۔

(۱۲) بخاری کے بعض تراجم بظاہر مکرر معلوم ہوتے ہیں، اگر چہ اتنی بڑی کتاب میں یہ ممکن ہے مگر امام موصوف کی وقت نظر اس امر کی متقاضی ہے کہ یہ تکرار کسی دقیق اور باریک نکتہ کے پیش نظر ہے، چنانچہ حضرت شیخ اس پر طلباء کو خصوصیت کے ساتھ متنبہ فرماتے تھے اور ایسی شافی وتسلی بخش تقریر فرماتے کہ تکرار کا اشکال رفع ہو جاتا، مثلاً صفحہ ۵۶ جلد اول پر دو باب "باب من لم يتم السجود" و " باب من يبدي ضبعيه و يجافي جنبيه" ہیں، یہی دونوں ترجمے دوبارہ صفحہ ۱۱۳ پر بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ آئے ہیں مگر حضرت شیخ نے ان کی تکرار کو اس طرح فرمایا ہے کہ دونوں مقامات پر تراجم ضروری معلوم ہوتے ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "لامع الدراری"۔

(۱۳) امام بخاری کو حدیث نبویؐ سے غیر معمولی عشق تھا اور عاشق صادق جب محبوب کے جمال پر نظر ڈالتا ہے تو ہر بار اسے ایک نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے، امام موصوف کا بھی یہی حال ہے، بسا اوقات ایک ہی حدیث سے متعدد مسائل کا استنباط فرماتے ہیں، مثلاً حضرت بریرہ کی حدیث کو مختلف مقاصد کے لئے بیس مرتبہ سے زائد اور حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ کو دس مرتبہ سے زائد اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اور ہر مرتبہ اس سے کوئی نئی بات مستنبط فرمائی ہے، اس پر حضرت خصوصیت

سے طلباء کو متوجہ فرماتے۔

(۱۴) حدیث پاک کے بعض الفاظ اور جملے ایسے ہیں کہ ان کے صحیح معنی، لب ولہجہ اور صورت واقعہ کی مثالی صورت بنائے بغیر کچھ سمجھ میں نہیں آسکتے، اس لئے بھی علم حدیث کو کسی ماہر سے پڑھنا ضروری ہے، حضرت شیخ ان الفاظ اور جملوں کو اسی طرح پڑھ کر سناتے اور جہاں مثالی صورت بنانے کی ضرورت پیش آتی وہاں اس کی عملی صورت بھی خود کر کے دکھاتے، مثلاً بخاری جلد اول ص ۲۹ پر "وضع خنصره الأيمن على ظهر كفه اليسرى و شبك بين اصابعه" کا مفہوم بغیر مثالی صورت بنائے ہوئے محض الفاظ سے ذہن نشین نہیں ہوسکتا، اس پر خصوصیت کے ساتھ عمل کر کے طلباء کو دکھاتے تھے۔

(۱۵) تاریخی واقعات کے سلسلہ میں بعض جگہوں پر روایات کے اختلاف واضطراب کی بناء پر تطبیق میں بہت دشواری معلوم ہوتی ہے، حضرت شیخ اس اضطراب واختلاف کو اس طرح دفع فرماتے کہ ہر طرح تشفی ہو جاتی، (ملاحظہ ہو لامع الدراری جلد ثانی ص ۶۸)۔

بذل المجہود کی تالیف میں شرکت:

جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، ۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ نے دورۂ حدیث حضرت سہارن پوری سے دوبارہ پڑھنا شروع کیا، ابھی درس کے آغاز پر دو ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن حضرت سہارن پوریؒ دار الطلباء سے مدرسہ قدیم آرہے تھے اور حسب معمول حضرت شیخ ان کے ہمراہ تھے، راستے میں اچانک ایک جگہ رک کر حضرت سہارن پوریؒ نے ارشاد فرمایا:۔

''ابوداؤد پر ہمیشہ میری کچھ لکھنے کی خواہش رہی، تین بار شروع کر چکا ہوں مگر ہجوم مشاغل نے کچھ نہیں کرنے دیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی حیات میں بار بار شروع کیا اور یہ جی چاہتا رہا کہ کسی طرح لکھ لوں اور اشکالات کو حضرت علیہ الرحمہ سے حل کر لوں گا مگر حضرت کے وصال کے بعد یہ جذبہ سرد پڑ گیا، اس کے بعد پھر یہ خیال ہوا کہ ہمارے مولانا یحییٰ صاحب تو ابھی باحیات ہیں ان سے بحث وتحقیق میں استفادہ کرتا رہوں گا مگر ان کے ارتحال کے بعد اس خیال کو دل سے بالکل نکال دیا، اب

عرصے کے بعد مجھے یہ خیال ہو رہا ہے کہ اگر تم دونوں میری مدد کرو تو شاید میں یہ اہم کام کر لوں"۔

حضرت شیخ نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت ضرور شروع کر دیں اور یہ میری دعا کا اثر ہے دریافت فرمایا، کیسی دعا؟ حضرت شیخ نے اپنے مشکوۃ شروع کرتے وقت والی دعا کا ذکر کیا کہ "یا اللہ حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر سے شروع ہوا ہے یہ مجھ سے چھوٹنے نہ پائے"۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کا ہے، حضرت سہارن پوری نے اسی وقت شروح حدیث کی ایک طویل فہرست بتا دی اور انہیں کتب خانے سے حاصل کرنے کا حکم فرمایا۔

بلاشبہ یہ حضرت شیخ کے عروج و اقبال کا وہ آغاز تھا جس کے درجہ کمال تک آپ پہونچے اور اپنے شیخ و مرشد کی بارگاہ میں آپ کو وہ اہمیت وخصوصیت حاصل ہوئی جو پھر اور کسی کو نہیں ہو سکی، تالیف کا یہ طرز تھا کہ حضرت سہارن پوری شروح حدیث اور مآخذ کی نشان دہی فرماتے، حضرت شیخ ان کا مطالعہ کر کے اور متعلقہ مواد جمع کر کے حضرت سہارن پوری کی خدمت میں پیش کر دیتے وہ اس میں سے حسب ضرورت مواد منتخب و مرتب کر کے مصنفانہ حیثیت سے لکھواتے۔ تسوید وتحریر کا کام حضرت شیخ انجام دیتے، اسی طرح یہ عظیم الشان شرح پانچ ضخیم جلدوں میں تیار ہوئی، اس محنت و کوشش نے آپ کے اندر تصنیف و تالیف کا خاص ذوق اور ملکہ پیدا کر دیا اور فن حدیث پر آپ کی نظر بہت گہری اور وسیع ہوگئی، پھر آپ نے اس کتاب کی طباعت و تصحیح میں بھی سعی بلیغ فرمائی جس کے باعث آپ کو اپنے استاذ و شیخ کی خوشنودی واعتماد حاصل ہوا اور نامور استاذ علیہ الرحمہ نے بذل المجہود کے مقدمہ میں "قرۃ عینی وقلبی" کے القاب سے اپنے شاگرد رشید کو سرفراز کیا، بلکہ حضرت سہارن پوری نے تو اصل مسودہ میں یہاں تک لکھ دیا تھا " هو جدير بان ينسب هذا التعليق اليه - (کہ مناسب یہ ہے کہ اس تعلیق کی نسبت انہی کی طرف کی جائے) مگر حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ ان حوصلہ افزا کلمات کو میں نے ادھا حذف کر دیا۔

بذل المجہود کے عربی ٹائپ پر طباعت کا اہتمام:

بذل المجہود پانچ ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر ہندوستان میں بہت عرصہ قبل مشہور و مقبول ہو چکی

تھی مگر حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ کی دلی تمنا تھی کہ اگر یہ شرح عالم عربی میں بھی پھیل جاتی تو اس کا نفع زیادہ عام ہو جاتا، اس طویل مدت میں حضرت شیخ نے اس پر جا بجا حواشی بھی تحریر فرمائے تھے، جو بہت سے جدید اضافات پر مشتمل ہیں، اس بات کی ضرورت تھی کہ ان تمام قیمتی حواشی کو سلیقے سے مرتب کر کے بذل المجہود کو عربی ٹائپ میں طبع کرایا جائے، اس سلسلہ میں حضرت شیخ اس ناچیز راقم السطور کو اپنے ایک شفقت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

''ایک ضروری مشورہ تم سے کرنا تھا وہ یہ کہ تم نے اپنے سابقہ خط میں بذل المجہود کی طباعت کے سلسلے میں کچھ لکھا تھا، تمہیں معلوم ہے کہ میں خود بیس پچیس سال سے بہت ہی متمنی اور کوشاں ہوں، اب تو علی میاں خدا ان کو بہت ہی جزائے خیر دے اور بلند درجات عطا فرمائے، اس میں معاونت کے لئے تیار ہیں، اس سے پھر ایک امنگ پیدا ہوگئی اور تمہارے خط نے ایک شعلہ سا پھر پیدا کر دیا، تم نے لکھا ہے کہ سال بھر تیرے پاس رہنے کا جی چاہتا ہے، اگر بذل المجہود کی طباعت کا ولولہ اور جذبہ نہ ہوتا تو میں ہرگز آپ کو اس کی اجازت نہ دیتا کہ آپ تدریس حدیث چھوڑ کر یہاں قیام کریں تو بہت نقصان دہ ہے البتہ اگر آپ یہاں کے قیام میں بذل المجہود کے میرے حواشی جو بہت کثرت سے ہیں، آپ کے دیکھے ہوئے ہیں، ان کو انتخاب کر کے اور بذل کی طباعت ایک سال میں کرا دیں تو یقیناً آپ کے لئے بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ بذل المجہود، اوجز المسالک اور دیگر کتب حدیث کی ٹائپ کے ذریعہ ندوہ پریس میں طباعت کا سب سے زیادہ اہتمام مولانا معین اللہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا تھا، اس پر حضرت شیخ نے یہ تحریر فرمایا۔

''میرا خیال یہ ہے کہ اس کو ندوہ میں اپنے حواشی کے ساتھ طبع کراؤں مگر میرا خیال تمہارے خیال پر یہ ہوا کہ اس کو تم جیسا ذی علم یہاں رہ کر اس کی نقل وتصحیح کر کے مکمل کر کے ندوہ بھیجتے رہیں تو طباعت میں زیادہ سہولت ہو، بس اس میں تمہارے مدرسہ اور شغل تدریس کے حرج کا زیادہ خیال ہے، اگر چہ بذل کی تکمیل کے لئے بندہ ناکارہ خود ایک سال کی مدرسے سے چھٹی لے کر مدینہ منورہ جا چکا ہے''۔

اس کے بعد ایک اور خط میں تحریر فرمایا:

''مولانا علی میاں اور مولانا معین اللہ صاحب دونوں کے خطوط اسی مضمون کے آئے کہ مولوی تقی صاحب کا ایک سالہ قیام بہت مناسب ہے، یقیناً بذل کے حاشیہ کی تصحیح ان سے اچھی کوئی نہیں کرسکتا''۔

چنانچہ اس ناچیز نے ۲۵ رشعبان ۱۳۹۱ھ سے ایک سال تک سہارن پور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس قیام کرکے بذل کے حواشی کی ترتیب وتصحیح کا کام مکمل کیا، اور اس عرصہ میں بذل کی چھ جلدیں ندوہ پریس سے طبع ہوئیں، بعد میں اس کی طباعت قاہرہ سے طے ہوئی، اس لئے دوسرے سال ۲۶ رشوال ۱۳۹۲ھ سے ایک سال تک بذل کی طباعت کے سلسلے میں قاہرہ میں قیام رہا اس طرح باقی چودہ جلدیں قاہرہ میں طبع ہوکر پوری کتاب بیس جلدوں میں شائع ہوئی، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس خاتمہ بالخیر پر نہایت غیر معمولی مسرت کا اظہار فرمایا اور اس کی مناسبت سے قاہرہ میں اہل علم کی دعوت کرنے کا حکم دیا، چنانچہ تعمیل حکم میں مولانا عبداللطیف صاحب کی نے قاہرہ میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا جس میں مصر کے مشہور محدث شیخ حافظ تیجانی کے علاوہ وہاں کے متعدد اہل علم نے شرکت فرمائی، مزید برآں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے مدینہ منورہ میں بھی اس پر مسرت تقریب پر دعوت کا اہتمام فرمایا۔

خدا کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ چند سال پہلے ناچیز کی تحقیق وتعلیق سے بذل المجہود جدید معیار پر چودہ جلدوں میں نہایت ہی اعلیٰ طباعت سے آراستہ ہوکر شائع ہوچکی ہے اور اہل علم سے خراج تحسین وصول کرچکی ہے۔

۲۔ تالیف وتصنیف

حضرت شیخ کے علمی کارناموں کی دوسری جولان گاہ تالیف وتصنیف تھی اس میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت کے جاوداں نقوش یادگار چھوڑے ہیں، ان کی تالیفات کو درج ذیل دو مختلف نوعیتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) خالص دعوتی اور اصلاحی

یہ کتابیں نہایت شیریں اور عام فہم اردو زبان میں تحریر کی گئی ہیں، یہ کتابیں اتنی مقبول عام ہوئیں کہ اس کی مثال ماضی قریب کی تاریخ میں مفقود ہے، ان کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہوئے اور دنیا کی بکثرت زندہ زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے، آج شاید ہی کوئی دینی مسلم گھرانہ ایسا ہوگا جہاں حضرت شیخ کی اصلاحی اور فضائل کی کتابیں موجود نہ ہوں۔

(۲) خالص علمی اور تحقیقی

اس نوعیت کی جن کتابوں کا تعلق علم حدیث سے ہے (اور یہی زیادہ ہیں) صرف انہی کا تذکرہ وتعارف پیش نظر مضمون میں ہدیہ خدمت ہے، سطور بالا میں اجمالی ذکر آچکا ہے کہ حضرت شیخ نے اس میدان میں بیحد کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اسلامی کتب خانہ آج حضرت شیخ کی گرانقدر تالیفات سے مالامال ہے۔ اہل علم اور حضرات مدرسین ان درہائے آبدار سے اپنے ذہن ودماغ اور سینہ وسفینہ کو روشن کرتے ہیں حضرت شیخ کی علمی کتابوں سے کچھ تو زیور طبع سے آراستہ ہوکر ذوق شناسان حدیث کے ہاتھوں میں ہیں اور کچھ تا ہنوز منتظر طباعت ہیں۔

مطبوعہ تالیفات:

(۱) أوجز المسالك إلى موطأ الإمام مالك

اس کتاب کی تالیف کے وقت حضرت شیخ کی عمر صرف پچیس سال کی تھی۔

یکم ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو آپ نے مسجد نبوی میں اقدام عالیہ کے قریب اس مبارک کام کا آغاز فرمایا اور اللہ عز وجل شانہ نے اس میں ایسی غیر معمولی برکت عطا فرمائی کہ چند ماہ کے اندر اتنا کام ہوگیا کہ ہندوستان میں کئی سال میں نہ ہوسکا تھا۔ ابواب الصلاۃ تک تحریری کام ہونے کے بعد واپسی عمل میں آئی اور پھر ہندوستان میں طویل وقفوں کے ساتھ یہ اہم علمی کام جاری رہا، تقریباً تیس سال کی دیدہ وری اور عرق ریزی کے بعد ۲۸ رذی الحجہ ۱۳۷۵ھ میں چھ ضخیم مجلدات میں اس کی تکمیل ہوئی، یہ کتاب عرصہ قبل ہندوستان میں طبع ہوکر مشہور عام ہو چکی تھی، شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ میں جب

راقم سطور بذل المجہود کی طباعت کے سلسلے میں قاہرہ پہونچا تو محترم مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی نے اس کی دوبارہ طباعت کا آغاز کردا دیا تھا، اور میرے وہاں قیام کے زمانہ تک ہماری زیر نگرانی دوسری جلد تک طبع ہو چکی تھی، پھر بذل کی اہمیت کے پیش نظر اس کی طباعت کو مؤخر کر دیا گیا۔ بعد میں پندرہ جلدوں میں اس کی طباعت پایۂ اتمام کو پہونچی، اور اب ہماری تحقیق وتعلیق کے ساتھ اٹھارہ جلدوں میں چھپ کر مقبول خاص وعام ہو رہی ہیں۔

یہ کتاب، حدیث وفقہ کے اعتبار سے موطأ کی سب سے زیادہ جامع ومفصل شرح ہے، یہ انسان کو سینکڑوں شروح وحواشی سے بے نیاز کر دیتی ہے بلکہ اگر اسے حدیث وفقہ کی ایک دائرۃ المعارف کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، اس کے شروع میں حضرت شیخ کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے جس میں موطأ اور اس کے نامور مؤلف کے محاسن وکمالات اور سرزمین ہند کے مشائخ واساتذہ اور اکابر محدثین کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، علاوہ ازیں اس میں اصول حدیث اور بہت سی قیمتی معلومات کا خلاصہ بھی آ گیا ہے۔

بلاشبہ یہ عظیم تالیف حضرت شیخ کی وسعت معلومات، رسوخ فی العلم، عمق نظر، وسعت قلب اور صفائی ذہن کی ایک جیتی جاگتی تصویر وروشن دلیل ہے، ائمہ مذاہب اور ان کے دلائل کو نہایت مستند مآخذ سے نقل فرمایا ہے، ہر امام کا مذہب اسی کی معتمد علیہ کتب سے ماخوذ ہے، ہر راوی کی مختصر تحقیق کی گئی ہے۔

علمائے عرب کے نزدیک بھی یہ کتاب ایک اہم مرجع شمار ہوتی ہے، مکہ مکرمہ کے بہت مشہور عالم سید علوی مالکی نے اس نادرۂ عصر تالیف کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ "حقد مین میں بھی اس کی نظیر مفقود ہے" ابوظبی کے قاضی القضاۃ شیخ احمد عبدالعزیز المبارک (جو حضرت شیخ کی کتابوں کے بے حد گرویدہ تھے) اوجز المسالک کے بہت مداح تھے۔

(۲) لامع الدراری علی جامع البخاری:

یہ جلیل القدر کتاب حضرت شیخ المحدثین والفقہاء مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے عظیم افادات

ونادر تحقیقات کا مجموعہ ہے جن کو ان کے تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ نے درس بخاری کے دوران عربی زبان میں قلم بند کیا تھا، حضرت شیخ الحدیثؒ نے ان نادر تحقیقات اور جامع افادات کی شرح فرمائی اور اپنے ذاتی مطالعہ وتحقیق سے جن لطیف معانی ونادر معلومات کا اس سلسلہ میں اللہ جل شانہ نے آپ کے قلب پر فیضان فرمایا تھا ان کا اضافہ کیا ہے، آپ نے اس کتاب کے حواشی وتعلیقات میں جو غیر معمولی محنت فرمائی ہے اس کی حیثیت ایک مستقل کتاب کی ہوگئی ہے اور یہ کتاب حضرت کے نادر معلومات وذاتی تحقیقات کا سب سے بڑا گنجینہ ہے، اس کتاب پر آپ نے ایک مستقل مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جو امام بخاری کے حالات اور ان کی جامع صحیح کے محاسن پر ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے، یہ کتاب پہلے تین ضخیم جلدوں میں ہندوستان میں شائع ہوئی پھر پاکستان سے دس ضخیم جلدوں میں ٹائپ پر شائع ہوئی ہے۔

(۳) الأبواب والتراجم:

یہ کتاب خاص طور سے صرف صحیح بخاری کے ابواب وتراجم کی تفصیلی شرح پر مشتمل ہے، اس کتاب میں ان قواعد واصول پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے جن سے ابواب وتراجم اور ابواب بلاتراجم کی احادیث کو باب سے تطبیق دی جاتی ہے۔

امام بخاری کے تراجم ابواب ہر عصر وعہد میں پیچیدہ ومشکل سمجھے گئے ہیں، علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بخاری کی شرح اس امت پر قرض ہے مگر بقول حافظ سخاوی صاحب الضوء اللامع شیخ الاسلام حافظ ابن حجر نے فتح الباری لکھ کر امت کی طرف سے اس قرض کو ادا کر دیا ہے، لیکن حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے کہ ابھی بخاری کے تراجم ابواب کی شرح کا قرض امت کے ذمہ باقی ہے، چنانچہ حضرتؒ نے تراجم ابواب پر ایک مختصر رسالہ لکھنا شروع فرمایا تھا، مگر افسوس مکمل نہ ہو سکا، اس رسالہ میں حضرت نے پندرہ اصول تراجم بیان فرمائے ہیں اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا بھی اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے، جس میں حضرت شاہ صاحب نے چودہ اصول تراجم بیان فرمائے ہیں، حضرت شیخ الحدیثؒ نے ان دونوں متذکرۃ الصدر رسالوں کو نیز شراح بخاری کی

آراء،اور حضرت گنگوہی کی تراجم کے سلسلے کی تحقیقات سب کو ایک کتاب میں یکجا کر دیا ہے اور غور وفکر کر کے سب کو اپنی ذاتی تحقیق و تنقیح کے بعد ان اصولوں کی تعداد ستر تک بیان فرمائی ہے، پھر ان اصول کی روشنی میں پوری کتاب کے تراجم ابواب کی باہم مناسبت اور ابواب و کتب کے مابین مناسبت کو تفصیل سے واضح کر دیا ہے اور اس طرح حضرت شیخ کی تالیف ''الا بواب والتراجم'' کے ذریعہ صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی شرح کا قرض امت کے ذمہ سے ادا ہو گیا۔

یہ کتاب تین جلدوں میں ہندوستان میں چھپی تھی، اللہ کا شکر ہے کہ ابھی حال میں میرے لڑکے ڈاکٹر ولی الدین ندوی کی تحقیق و تعلیق سے پانچ جلدوں میں نہایت اعلیٰ طباعت کے ساتھ شائع ہو کر مقبول ہو رہی ہے۔

(۴) الکوکب الدری علی جامع الترمذی:

یہ قطب الاقطاب حضرت گنگوہی قدس سرہ کے ترمذی کے امالی ہیں جن کو حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب نے عربی میں قلم بند کیا تھا، اس پر ہمارے شیخ الحدیثؒ نے حواشی تحریر فرما کر اسے نہ صرف ایک مستقل تصنیف بنا دیا بلکہ اس کے ایجاز، اختصار اور مجمل و مبہم و غامض عبارات کی تفصیل کر دی، اور بہت سی تحقیقات کو حدیث کے مراجع و مصادر سے اخذ فرما کر حسب موقع نقل فرما دیا ہے، نیز ائمہ کے اقوال اور مذاہب کی پوری تحقیق ان کتابوں سے کر دی جو حضرت گنگوہی کی حیات میں طبع ہو کر سامنے نہیں آسکی تھیں، اسی کے ساتھ ساتھ موضوع سے متعلق اپنے ذاتی مطالعہ و تحقیق کا اضافہ بھی فرمایا، اپنے مشائخ کے علوم و تحقیقات جن کا تعلق وجدانی اور ذوقی علوم سے ہے ان کو بھی جابجا نقل فرمایا ہے، یہ کتاب اختصار کے باوجود طلباء وعلماء دونوں کے لئے مرجع و مصدر بن گئی ہے، ترمذی کی عبارت غامضہ کو حل کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب اسلامی کتب خانہ میں نہیں ہے، اس کی مناسبت سے حضرت شیخ نے راقم سطور کو ایک قصہ سنایا تھا جس کو حضرت ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں۔

''مجھے مولانا مناظر احسن گیلانی کی زیارت کبھی نہیں ہوئی تھی، مگر ان کا اسم گرامی کثرت سے سنتا رہا، اور ان کے علمی و تصنیفی حالات بھی مجھے معلوم ہوتے رہے، وہ دارالعلوم دیوبند کے ممبر تھے اور

مجلس شوریٰ میں ہمیشہ تشریف لاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب (سابق ناظم مدرسہ مظاہر علوم) کا آدمی میرے پاس پہونچا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی تشریف لائے ہیں وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں، میں ان کا نام سن کر بہت مرعوب ہوا، ملاقات کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا، اس لئے کہ میں بڑے آدمیوں سے ملاقات کرتے ہوئے ہمیشہ گھبراتا رہا، لیکن چونکہ پیام تھا کہ تم سے ملنے آئے ہیں اس لئے فوراً حاضر ہوا، مولانا مرحوم نے بڑے تپاک سے اٹھ کر مصافحہ و معانقہ کیا اور فرمایا کہ آپ سے ملنے کا کئی سال سے بہت ہی اشتیاق تھا، اس لئے کہ میری ملاقات روزانہ ایک گھنٹہ رہتی ہے، جب سے الکوکب الدری طبع ہوئی ہے ترمذی پڑھانے کے لئے ایک گھنٹہ اس کا مطالعہ بہت اہتمام سے کرتا ہوں، گویا آپ کی مجلس میں رہتا ہوں، یہ کتاب طالب علموں سے زیادہ مدرسین کے لئے بہت مفید ہے، ترمذی پڑھانے والوں کے لئے اس کے بغیر چارہ نہیں (انتہی بلفظہ) جہاں تک مجھے یاد ہے ایک دو گھنٹہ بعد چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر ڈیڑھ بجے آئے تھے، ۲ بجے دیوبند تشریف لے گئے۔

حضرت شیخ نے اکابر علماء کے اصرار پر کوکب کے حواشی کا کام شروع کیا اور ماہ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ میں اس کی جلد اول اور ۱۶ رجب ۱۳۵۳ھ کو جلد ثانی مکمل کی، یہ پہلے ہندوستان میں دو جلدوں میں طبع ہوئی تھی، پھر حضرت شیخ نے دوبارہ عربی ٹائپ میں اسے ۴ جلدوں میں شائع کرایا۔

ناچیز راقم سطور نے اس کتاب کو "لجنة التراث و التاريخ أبوظبي" کے سامنے پیش کیا، انہوں نے اس عظیم الشان تالیف کو دیکھ کر یہ طے کردیا کہ یہ سہ بارہ لجنة التراث کی طرف سے جامع ترمذی کے متن کے ساتھ شائع کی جائے، اس کی اطلاع حضرت کے انتقال سے تین ہفتہ قبل فون کے ذریعہ کردی تھی، مولانا محمد عاقل صاحب اور مولانا محمد اسماعیل بدات صاحب نے بتایا کہ حضرت نے اس پر بار بار خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب حضرتؒ کے منشاء کے مطابق جلد از جلد شائع ہوسکے۔

(۵) حجۃ الوداع وعمرات النبیؐ

یہ رسالہ حضرت شیخ نے اپنے مشکوٰۃ کی تدریس کے زمانے میں صرف ایک دن اور ڈیڑھ

رات میں تصنیف فرمایا تھا، اسے محض حضرت شیخ کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے، ورنہ اتنے مختصر وقت میں تو اس رسالہ کی نقل بھی مشکل ہے، پھر اس میں مزید اضافوں اور نظر ثانی کے بعد شعبان ۱۳۹۰ھ میں پہلی مرتبہ لکھنؤ میں اس کی طباعت ہوئی، اس کے بعد ہندوستان اور بیروت سے اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں، کتاب کو اس حیثیت سے نہایت امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ان تمام مباحث کا استیعاب کرلیا گیا ہے جن کا تعلق حجۃ الوداع کے مبارک ونورانی سفر سے ہے، یہاں تک کہ منازل سفر کی تحدید، ان کے نام اور اس سفر میں پیش آنے والے مبارک مقامات کی واضح نشان دہی کردی گئی ہے، اس استقصاء وتفصیل کو دیکھ کر فرط تعجب سے نگاہ کھلی رہ جاتی ہے، بلاشبہ ان تمام محاسن اور مباحث کے باعث یہ رسالہ سفر حجۃ الوداع کا ایک علمی موسوعہ بن گیا ہے، یہ کتاب بھی میرے لڑکے ڈاکٹر ولی الدین ندوی کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ابوظبی سے اعلیٰ طباعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، اس کا اردو میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۶) خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی

شمائل ترمذی حضور اکرم ﷺ کے اخلاق وشمائل پر سب سے جامع حدیث کی کتاب ہے حضرت شیخ نے اس کا اردو میں ترجمہ اور تشریح فرمائی ہے، جس کے باعث ہر خاص وعام کے لئے اس سے استفادہ وانتفاع آسان ہو گیا ہے، اس کتاب کے حاشیہ پر عربی مشکل کلمات اور مفردات کی شرح بھی تحریر کی ہے، یہ کتاب ہندو پاک میں متعدد بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔

بذل اور دیگر عربی تالیفات پر تقدیم کا اہتمام:

یہاں یہ بات یقیناً قابل ذکر ہے کہ حضرت شیخ کی تمام عربی تالیفات اور بذل پر مقدمہ نگاری کا شرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کو حاصل ہوا ہے، حضرت مولانا کا علمی وروحانی مقام معروف عام ہے اور حضرت ان پر بے حد غیر معمولی شفقت اور ان کا نہایت اکرام فرماتے تھے، مگر فن حدیث میں مولانا رحمہ اللہ کے بلند مقام اور اس کے مالہ وماعلیہ پر غیر معمولی عبور سے شاید کم ہی لوگ واقف ہوں گے، اس لئے حضرت شیخ نے ان سے بذل پر مقدمہ تحریر کرنے کی

فرمائش کی تو بعث سے اہل علم کو تعجب ہوا، اسی طرح دیگر عربی مطبوعات کے تقدیمات کے ساتھ بھی ہوا مگر حضرت شیخ کا یہ اصرار بہیم تھا کہ ہر کتاب پر مولانا کا مقدمہ رہنا ضروری ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا نے پوری عالمانہ شان اور ایک نرالے دانو کھے انداز میں شیخ کی ہر کتاب پر مقدمہ تحریر فرمایا ہے، اسے حضرت شیخ کی توجہ وعنایت کی برکت کا نام دیجئے یا رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے نسبی ارتباط و روحانی نسبت کا نتیجہ یا جانبین کے درمیان غیر معمولی الفت ومحبت کا ثمرہ کہ حضرت مولانا کے وہ مقدمات جو انہوں نے حضرت شیخ کی عربی کتابوں پر سپرد قلم فرمائے ہیں، نہ صرف علم وفن کی تاریخ میں بلکہ ادب عربی میں بلند ترین مقام کے حامل ہیں، ان میں فن کی عظمت، کتاب کی اہمیت ومحاسن، اور مصنف علام کی جلالت قدر وعلوشان پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے، حضرت شیخ نے ہر مقدمہ پر نہایت مسرت کا اظہار فرمایا۔

یہاں اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا، راقم سطور کے قاہرہ میں قیام کے دوران میں حضرت شیخ نے خواہش ظاہر کی کہ اگر علمائے مصر میں سے کوئی بذل المجہود پر کچھ لکھ دے تو مناسب رہے گا، چنانچہ میں نے اس وقت کے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم کے سامنے بذل المجہود پیش کی اور ان سے چند کلمات لکھنے کی فرمائش کی، انھوں نے کتاب اور مقدمات پر ایک نظر ڈال کر فرمایا کہ یہ عظیم کتاب کسی مقدمہ کی محتاج نہیں ہے، اور شیخ ابوالحسن کی تقدیم کے بعد پھر کوئی کیسے لکھے گا، اسی سے مماثل شہادت مصر کے مشہور عالم ومحقق شیخ ابوزہرہ نے بھی دی تھی، بعد میں مصر کے معروف عالم حدیث حافظ التیجانی نے بذل پر کچھ لکھا جو کتاب کے آخر میں شامل ہے، حضرت شیخ نے بعد میں حضرت مولانا یوسف بنوری مرحوم سے بھی بذل، اوجز اور حجۃ الوداع پر مقدمات لکھوائے، مولانا بنوری مرحوم کو برصغیر ہند و پاک میں ایک عظیم محقق، ممتاز عالم حدیث اور صاحب اسلوب اہل قلم کی حیثیت سے جو امتیازی مقام حاصل تھا وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے حضرت شیخ کی کتابوں پر مقدمات نہایت اہتمام وکاوش فکر وقلم کے ساتھ تحریر فرمائے ہیں جو ہر کتاب کے ساتھ طبع ہو چکے ہیں۔

حضرت شیخ کی غیر مطبوعہ تالیفات:

حضرت شیخ کی غیر مطبوعہ تالیفات کی تعداد سو سے متجاوز ہے، ان میں سے اکثر کتابوں کا ذکر ''آپ بیتی'' نمبر ۶ میں آچکا ہے، لیکن اس کے علاوہ ان کے پاس اپنے اکابر حضرت گنگوہیؒ، حضرت سہارن پوری اور دوسرے مشائخ کے قیمتی افادات وتحقیقات کا مجموعہ بھی تھا، علاوہ ازیں علامہ انور شاہ کشمیری کی ''تقریر ترمذی'' بھی تھی، جس کی ایک نقل اس ناچیز کے پاس بھی ہے، اسی طرح حضرت گنگوہی کی غیر مطبوعہ تقریرات خاص طور پر مولانا محمد حسن مکی (جو حضرت گنگوہی کے تلامذہ خاص میں ہیں) نے دورانِ درس صحاح ستہ کی جن تقاریر کو قلم بند کیا وہ پورا مجموعہ بھی حضرت کے پاس تھا، اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد یحییٰ کی لکھی ہوئی تقاریر کا مجموعہ بھی تھا، جس میں تقریر ابوداؤد جو بہت مفصل اور طویل ہے اور جس سے بذل اور دیگر کتب میں استفادہ کیا گیا ہے، اس کا فوٹو کرا کے حضرت شیخ نے اس ناکارہ کو تعلیق وحاشیہ کے لئے دیا تھا، مگر افسوس کہ اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے اب تک کچھ نہ کر سکا، جیسا کہ مذکور ہوا حضرتؒ کی تالیفات کی تعداد ۱۵۰ ہے اور ان کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں ہیں جن پر جابجا حضرت کے حواشی ہیں مثلاً مکتوبات امام ربانی، خود قرآن شریف کا نسخہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے، جس میں حضرت کا تلاوت کا معمول تھا، اس پر جابجا کتب تفسیر سے اہم باتوں کو دورانِ تلاوت نوٹ کرتے گئے ہیں، اگر ان نوٹس کو سلیقہ سے یکجا کر دیا جائے تو ایک جامع تفسیر بن سکتی ہے، ذیل میں ان کی علم حدیث سے متعلق بعض مخطوط کتب کا تعارف پیش ہے۔

۱. حواشي الإشاعة في أشراط الساعة:

۲. حواشي وذيل التهذيب: حافظ ابن حجر کی تمام کتابوں پر حواشی تحریر فرمائے لیکن تہذیب التہذیب پر کثرت سے لکھے گئے ہیں، اور ذیل التہذیب کے نام سے مستقل بارہ جلدیں کرا کر تہذیب کے موافق صفحے ڈالے گئے ہیں۔

۳. معجم المسند للإمام أحمد: مسند امام کی روایات کی ترتیب صحابہ پر ہے، جس میں احادیث کی تلاش بہت مشکل کام ہے، پیش نظر رسالہ میں حروف تہجی کے اعتبار سے ان سب صحابہ کرام

کی روایات کی فہرست لکھی گئی ہے جس میں ہر صحابی کی روایت مع جلد وصفحہ درج ہے۔

۴. جزء ملتقى الرواة عن المرقاة : اس میں ان رواۃ حدیث کو جمع کیا گیا ہے جن پر ملا علی قاری نے مرقاۃ میں کلام کیا ہے۔

۵. تقرير نسائی شریف : اس میں حضرت گنگوہی اور دیگر اکابر کی جو تحقیقات مل سکی تھیں ان کو یکجا کر دیا گیا ہے، اس کی نقل بھی اس ناچیز کے پاس ہے، حضرت شیخ کی خواہش تھی کہ اس کو یہ ناچیز مرتب کر دے تا کہ شائع ہو سکے۔

۶. تقرير مشكوة : یہ حضرت نے اپنے تدریس مشکوۃ کے زمانے میں مرقاۃ اور دیگر شروح وحواشی سے ملخص کر کے تحریر فرمائی ہے، بہت سے اہل علم و مدرسین نے اس کی نقلیں لی ہیں، اس ناچیز کے پاس بھی اس کی ایک نقل محفوظ ہے۔

۷. شذرات الحديث : صحاح ستہ، مؤطین، طحاوی اور ہدایہ وغیرہ کتابوں کے سلسلہ میں حضرت شیخ نے الگ الگ کاپیاں بنائی تھیں، شروح حدیث میں اگر کوئی اہم بات اثناء مطالعہ گزرتی تو متعلقہ کاپی پر نوٹ فرما لیتے، حضرت کی بعض مطبوعہ تالیفات میں كذا في الشذر اور البسط في الشذر کے حوالے کہیں کہیں ملتے ہیں، اس سے مراد یہی کتاب ہے۔



فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین مرادآبادی کا

فن حدیث میں مقام اور تدریس بخاری میں امتیاز

از: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

سب واقف جانتے ہیں کہ آخری دور (تیرہویں چودہویں صدی ہجری) سے برصغیر (غیر منقسم ہندوستان) کو فن حدیث اور اس کی خدمات میں سارے عالم پر ایسا امتیاز و تفوق حاصل رہا جس کا ہند و بیرون ہند میں برملا اعتراف کیا گیا، چنانچہ مصر کے ممتاز ترین عالم و محقق علامہ رشید رضا مصری نے "مفتاح کنوز السنۃ" کے مقدمہ میں بایں الفاظ اس حقیقت کا اظہار و اعتراف کیا: لولا عنایۃ إخواننا علماء الهندبعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من أمصار الشرق فقد ضعفت في مصر والشام والعراق والحجاز حتى بلغت منتهى الضعف" (یعنی اگر ہمارے دینی بھائی ہندوستانی علماء علوم حدیث کی اشاعت وغیرہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو یہ علم شریف دنیا سے رخصت ہوگیا ہوتا، کیوں کہ اس علم کے جو اصل مراکز تھے، مصر، شام اور حجاز وغیرہ وہاں یہ ضعف کے آخری درجہ تک پہنچ گیا تھا (یہ کتاب ۱۳۵۲ھ-۱۹۲۴ء کے آخر میں شائع ہوئی) اور یہ امتیاز (بتوفیق اللہ تعالی) بظاہر اسباب حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے عالی مرتبت اخلاف و احفاد نیز ان کی معنوی اولاد، ان کے شاگردوں، اور شاگردوں کے شاگردوں کی بدولت حاصل ہوا، پھر تیرہویں صدی کے ربع آخر (۱۸۶۶ء-۱۲۸۳ھ) میں دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور (دونوں ایک ہی

زمانہ بلکہ ایک ہی سال میں آگے پیچھے قائم ہوئے) کے قیام اور ان کے اندر تدریس حدیث کے خصوصی اہتمام مثلاً موطئین، صحاح ستہ وغیرہ کے شامل نصاب کئے جانے کے بدولت غیر معمولی طور پر اشاعت پذیر ہوا کہ شہر شہر ہی نہیں قریہ قریہ تک پہنچ گیا (فالحمد للہ علی ذلک) یہ عموم جن گرامی قدر حضرات کی بدولت ہوا ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیو بندی نیز حضرت مولانا خلیل احمد اور ان کے تلامذہ سرفہرست ہیں، یہ ایک ایسی عالم آشکارا حقیقت ہے جس کا انکار نصف النہار میں سورج کے انکار کے مترادف ہوگا، شیخ الہندؒ موصوف (قدس سرہ) کے خوان علم کی زلہ ربائی کرنے والے جو اشخاص آسمان علم پر آفتاب و مہتاب کی طرح چمکے ان میں حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، استاذ نا حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (نور اللہ مراقدھم) کے بعد غالباً حضرت استاذی مولانا سید فخر الدین احمدؒ (جو ہمارے مقالہ کی زینت ہیں) کا نام نامی آتا ہے، جو شیخ الہند کے آخری تلامذہ میں سے ہونے کے باوجود علم حدیث بالخصوص تدریس بخاری میں تفوق کے لحاظ سے صف اول کے اندر اہل نظر کے نزدیک شمار کیے گئے (ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء) ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ) یہی وجہ ہے کہ موصوف کو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ العزیز نے اپنی علالت (حیات طیبہ) کے آخری مرحلہ میں (وفات سے تقریباً ۳ ماہ قبل ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء شیخ الہند کی اس عظیم مسند پر بلا کر بٹھا دیا اور اپنی مبارک حیات میں ہی یہ اطمینان کرلیا کہ یہ تقریباً ایک صدی سے آباد مسند سونی نہیں رہے گی، بلکہ حدیث وسنت کے زمزموں سے گونجتی رہے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہے کہ ''حق بحق دار رسید'' کا سچا مصداق ظہور پذیر ہوا، فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کاملۃ وجزاھا اللہ خیر الجزاء۔ راقم الحروف (محمد برہان الدین) اسی سال دورۂ حدیث کا دارالعلوم دیو بند میں طالب علم تھا اس لیے دونوں اساتذہ کبار سے استفادہ کا موقع ملا فالحمد للہ علی ذلک۔

فخر المحدثین کے درس کے امتیازات:

کتب حدیث کے رمز شناس حضرات علماء یہ جانتے ہیں کہ بخاری شریف کے تراجم ابواب

(عنوانات) کی درس میں خاص اہمیت ہے کیوں کہ مشہور ہے" علم البخاری فی تراجمہ" یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کی گہرائی تک رسائی" تراجم" کے حقیقت و مراد پر مطلع ہونے پر موقوف ہے، گویا یہ وہ قفل ہے جس کے کھلنے پر امام کے خزانہ علوم تک پہنچا جا سکتا ہے، چنانچہ شراح بخاری رحمہم اللہ نے بھی عموماً اس کا اہتمام کیا ہے کہ وہ اس قفل کے کھولنے کی سعی بلیغ کریں تا کہ علوم بخاری تک رسائی ہو۔

ترجمۃ الباب کی تشریح:

حضرت مولانا سید فخر الدین علیہ الرحمۃ کے درس میں بھی یہ سعی غایت درجہ اہتمام سے کی جاتی اور بالخصوص جلد اول کی تدریس کے وقت موصوف رموز ونکات بیان کرتے اور تراجم ابواب کی حکمتیں اور مصلحتیں -موشگافیاں نہیں- اس طرح واشگاف فرماتے کہ خیال ہونے لگتا ہے کہ خود مصنف ہی کتاب پڑھا رہے ہیں بلکہ کبھی تو ذہن، غلط یا صحیح، ایسا سوچنے لگتا کہ امام بخاری بھی شاید اس سے بہتر نہ پڑھاتے۔

تراجم ابواب کے سلسلہ میں حضرت الاستاذ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے شروع میں ہی جو بصیرت افروز باتیں فرمائی ہیں، ان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت مولانا اس" قفل" کے کھولنے میں کس درجہ کامیاب ہوئے ہوں گے، امام بخاری کا طریقہ ترجمہ کیا تھا؟ اس کے بارے میں مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے ذیل میں اس کو نقل کیا جا رہا ہے (واضح رہے کہ مولانا کی درسی تقریر بخاری کو ان کے بہت سے شاگردوں نے قلم بند کیا تھا، ان میں راقم الحروف بھی ہے مگر بدقسمتی سے راقم کا وہ قیمتی سرمایہ حال میں حادثاتی طور پر ضائع ہو گیا، مگر اسے مرتب کر کے کتابی پیکر میں بنام "ایضاح البخاری" لانے کی سعادت مولانا کے ایک لائق وہونہار تلمیذ رشید رفیق محترم مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کے حصہ میں آئی[1] (ابھی صرف چار جلدوں کی طبع ہونا راقم کو معلوم ہے،

[1] مولانا ریاست علی صاحب کو حضرت مولانا فخر الدین رحمہ اللہ سے پوری بخاری شریف پڑھنے کا موقع ملا، کیوں کہ موصوف نے مولانا مدنی کی وفات کے غالباً ایک سال بعد پڑھی۔

ان میں کتاب الصلوۃ بھی مکمل نہیں ہوئی ہے، پہلی جلد چھ سو صفحات سے زیادہ کی ہے بقیہ جلدیں بھی تقریباً پانچ پانچ سو صفحات کی ہیں، جو مکتبہ مجلس قاسم المعارف نے شائع کی) اس مقالہ میں اسی کے اقتباسات (مع قید صفحات) دیئے گئے ہیں۔

حضرت مولاناؒ نے پہلے دیگر محدثین کے عام طریق تراجم کا مختصر تذکرہ کیا ہے کہ عام طور پر تراجم کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ترجمۃ الباب کو دعوے کی حیثیت میں رکھتے ہیں، پیش کردہ حدیث کو اس کی دلیل سمجھا جاتا ہے، مگر امام بخاری کے بارے میں فرماتے ہیں: محدثین کرام کی اس عمومی طرز کے امام پابند نہیں ہیں، بلکہ امام نے اپنے تراجم میں بہت سے علوم داخل فرما دیئے ہیں، کسی موقع پر وہ حدیث کی تشریح کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، کسی موقع پر اجمال کی تفصیل کرتے ہیں، کسی موقع پر روایات کے اختلاف اور پھر اختلاف کے رفع کی صورت ظاہر فرماتے ہیں، کہیں اختلاف ائمہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ترجمہ کو خاص شکل میں پیش نہیں فرماتے بلکہ ایک سوال کی صورت میں ترجمہ منعقد فرما کر احادیث لے آتے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس میں گنجائش ہے خواہ اس مسلک کو قبول کرلو یا دوسرے کو اختیار کرلو، کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ترجمہ کی حیثیت دعوے کی نہیں ہوتی بلکہ وہ تنبیہ ہوتی ہے جسے سمجھ دار سمجھ لیتے ہیں، لیکن جو بخاری کے انداز سے واقف نہیں وہ الجھ جاتے ہیں، کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ترجمہ کا ظاہر کچھ اور ہوتا ہے لیکن بخاری کا مقصد ظاہر سے متعلق ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی التزامی معنی کو مراد لے کر اسی کی مناسبت سے احادیث پیش فرما دیتے ہیں جس سے ظاہر دلالت سے ترجمہ کا مقصد متعین کرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے اور جب مطابقت نظر نہیں آتی تو اعتراض پیدا ہو جاتا ہے۔ (ج ۱/ص ۵۸،۵۷)

یہ اقتباس اگرچہ طویل ہو گیا مگر اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ حضرت مولاناؒ کی صحیح بخاری پر کتنی گہری نظر تھی بلکہ وہ اس پر کتنے حاوی تھے کہ اس کا کوئی گوشہ ان کی نظر سے اوجھل نہ تھا (ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء) اور ایسا ہونا محل تعجب نہیں، اولاتو کاملین (شیخ الہند اور علامہ کشمیری) سے بخاری پڑھی تھی، پھر نصف صدی سے زائد عرصہ تک (مدرسہ شاہی مرادآباد میں) پڑھائی اور مطالعہ کا

بے حد شوق تھا کہ شدید ضعف اور کبرسنی کی حالت میں بھی وہ جاری رہا، مزید خداداد ذہانت وصلاحیت اور قوت حفظ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، کبھی کبھی درس کے دوران تحدیثاً للنعمۃ فرمایا کرتے تھے''میرے حافظہ پر حضرت شاہ صاحبؒ (علامہ انور شاہ کشمیری) کو بھی اعتماد تھا'' حضرت مولانا کے درس میں متقدمین علماء کبار سے لے کر ان کے اساتذہ تک کی تحقیقات کا عطر کشید کیا ہوا ملتا تھا اور صرف صحیح بخاری ہی نہیں دوسری معروف اور غیر معروف کتب حدیث اور ان کی متداول و غیر متداول شروح کا خلاصہ بھی مذکور ہوتا جس کا اندازہ ان کی تقریر بخاری (ایضاح البخاری) کے مطبوعہ حصوں سے کیا جاسکتا ہے، گویا مولاناؒ کا درس متقدمین و متاخرین کی تصنیفات متعلقہ بخاری شریف سے بے نیاز کردیتا تھا، مولانا کے درس کی اہم بات یہ بھی تھی کہ وہ تمام ائمہ وعلماء کا نام نہایت ادب اور احترام کے ساتھ لیتے اور اکثر کے ساتھ ترحیم وترضی کا لاحقہ لگاتے۔

اوپر ابھی گذرا کہ ''ترجمۃ الباب'' کی حقیقت اور رموز پر اطلاع اور اس کی گرہ کشائی امام بخاری کے علوم تک رسائی کا اہم وسیلہ ہے، اوپر کے بیان سے مولانا کے اس پر حاوی ہونے کا اندازہ بھی ہوجاتا ہے، اس کا حق تو یہ تھا کہ تراجم بخاری کے مقاصد واغراض کے جن جن پہلوؤں اور گوشوں کا تذکرہ آیا ہے ان میں سے ہر ایک کی کم از کم، ایک ایک مثال تو پیش کی ہی جاتی لیکن ایسا کرنے سے مقالہ کا حجم اس قدر بڑھنے کا خوف تھا کہ سیمینار میں شرکاء کے لیے ناقابل تحمل ہوجاتا اس لیے صرف ایک دو مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ امام نے ایک عنوان (ترجمہ) قائم کیا ہے "باب أمور الإيمان" حضرت اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''امام بخاری باب سابق میں بنیادی چیزیں بیان فرما چکے ہیں، اب فروع بیان کرنا چاہتے ہیں (یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ) اسلام کی کچھ چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ کو فروع کی حیثیت دی گئی ہے، اس باب میں فروع کا بیان مقصود ہے اس لیے ''امور'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے''۔

۲۔ امام بخاریؒ نے ایک طویل ترجمۃ الباب یہ قائم کیا ہے: (باب قول النبي صلى الله عليه وسلم أنا أعلم بالله وإن المعرفة فعل القلب لقوله ولكن يؤاخذكم بما كسبت قلوبكم) یہ ترجمہ ایسا ہے کہ عام طور پر شراح بخاری اس کی مراد تک رسائی میں (شروح بخاری دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے) خاصی پریشانی محسوس کرنے لگتے ہیں مگر دیکھئے ہمارے مولانا نے کس طرح یہ گتھی سلجھائی ہے کہ تمام گرہیں کھلی نظر آتی ہیں، مولاناؒ پہلے ان اشکالوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو بادی النظر میں محسوس ہوتے ہیں یا کیے گئے ہیں پھر ان کے جوابات دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

''اشکال یہ ہے کہ ترجمۃ کتاب الایمان (بکسر الہمزہ) کا ہے، اس لیے ترجمہ میں کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جو ایمان سے متعلق ہو اور چونکہ امام بخاری کا مقصد فرق باطلہ مرجۂ، کرامیہ، معتزلہ کی تردید کرنا ہے اس لیے حسب سابق ترجمہ ''من الایمان'' کے عنوان سے آنا چاہیے تھا، ورنہ ترجمہ بظاہر کتاب العلم کا ہے جو آگے آرہی ہے، اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ علم اور علم برابر نہیں ہوتے، ایک کا علم دوسرے سے کم ہوتا ہے اور زیادہ بھی، اسی طرح ایک انسان کی معرفت باللہ دوسرے انسان کی معرفت باللہ سے کم بھی ہوتی ہے اور زائد بھی اور چوں کہ علم ایمان ہی کی فرع ہے یا عین ہے، اس اعتبار سے کہ ایمان کی حقیقت تصدیق ہے اور جب علم میں کمی زیادتی ہوگی تو چوں کہ تصدیق بھی علم ہے اس لیے اس میں بھی کمی زیادتی کی گنجائش ہوگی، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ علم اختیاری واکتسابی ہو، غیر اختیاری علم ومعرفت بحث سے خارج ہے'' اس کے بعد مولانا نے مذکورہ آیت کے ماقبل سے ربط پر بھی خاصی تفصیلی گفتگو کی ہے، بقصد اختصار اسے یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

اسی ترجمۃ الباب اور اس کے اندر مذکور حدیث کے تحت حضرت مولانا نے عصمتِ انبیاء پر بڑا تفصیلی کلام کیا ہے جو مطبوعہ تقریر کے ۵ صفحات سے زیادہ پر پھیلا ہوا ہے، ایضاح البخاری کے ص ۲۵۶ سے شروع ہو کر ص ۲۹۹ پر ختم ہوا ہے، (بہت مفید اور قابل استفادہ اور عالمانہ بحث فرمائی ہے، تفصیل کے طالب اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں)۔

زبان کی شیرینی اور سلاست، محاوروں پر قدرت، حسن صورت کے ساتھ حسن صوت بھی:

مولانا کی ایک صفت جس میں وہ ہم عصر اکثر علماء سے ممتاز نظر آتے ہیں، زبان کی فصاحت وبلاغت اور شیرینی تھی، کم از کم اس وقت احقر کے لیے طبقۂ علماء کے بارے میں یہ پہلا تجربہ تھا، مولانا جب لب کشا ہوتے تو معلوم ہوتا کہ بچ بچ پھول جھڑ رہے ہیں، ان کے نرم و نازک گلابی ہونٹوں سے نکلتے الفاظ بکھرتے موتی نظر آتے، شگفتہ حسین گلگوں چہرہ اور اس پر نورانی سفید ڈاڑھی (راقم کی نظر سے طبقۂ علماء میں اتنا حسین وجمیل اور کوئی نہیں گذرا) اس منظر کو ایسا دلکش بنا دیتے کہ سبحان اللہ! جب کبھی بخاری پڑھتے تو ایسے مترنم اور پرسوز لہجہ میں روانی کے ساتھ پڑھتے کہ ایسا سماں بندھ جاتا جس میں سامع ہمہ تن گوش ہو کر مستغرق ہو جاتا، کبھی کسی عربی عبارت کے ترجمہ کی ضرورت پیش آتی تو ایسا بامحاورہ کرتے کہ لطف آ جاتا اور چٹخارہ حاصل ہوتا، جس سے مولانا کی عربی، اردو زبانوں سے گہری واقفیت اور ادا شناسی بلکہ مہارت اور عبور کا پتہ چلتا ہے۔

بامحاورہ ترجمہ کی مثالیں:

یہاں اس کی (بامحاورہ ترجمہ) کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک معروف روایت، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے، إنما أنا بشر وإنكم تختصمون إليّ ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض فأقضي له على نحو ما أسمع منه الخ میں مذکور لفظ "الحن" کا ترجمہ "چرب زبان" کیا۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک سفر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے "لقد أرهقنا الصلوة ونحن نتوضأ فجعلنا نمسح على أرجلنا" میں نمسح على أرجلنا کا ترجمہ فرمایا "ہم اپنے پیروں پر پانی چپڑنے لگے"۔

۳۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا (غصہ کے انداز میں) "لو وضعتم الصمصامة على هذه- أشار إلى قفاه" کا ترجمہ کیا ہے "اگر تم شمشیر براں میری گدی پر رکھ دو"۔

اس طرح کی پوری تقریر بخاری سے سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مگر یہاں ان ہی تین پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

مولانا کی تصانیف:

مولانا صاحب درس ہونے کے ساتھ صاحب تصانیف بھی تھے، ان کی متعدد تصانیف ہیں، ان میں چار کتابیں تو معروف ہیں۔

۱. القول الفصيح بنضد أبواب الصحيح.

۲. القول الفصيح.

یہ دونوں کتابیں صحیح بخاری کی شرح وتفصیل بالخصوص تراجم ابواب کی مناسبت بتانے سے متعلق ہیں، ان کے علاوہ (۳) النور الفائض اور (۴) "اربعین" بھی مولانا کے رشحات قلم کا نمونہ ہیں۔

مقدمۃ الذکر کتاب عربی میں ۶۴۳ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی عربی نہایت فصاحت وسلاست اور روانی و بے تکلفی کا نمونہ ہے۔

رحمه الله رحمة واسعة كاملة وأدخله فسيح جناته وأسبغ عليه شآبيب رحمته.



علامہ شبلی نعمانیؒ اور علم حدیث

از: مولانا ضیاء الدین اصلاحی

علامہ شبلی کی اصل تعلیم جون پور، غازی پور اور اعظم گڑھ کے عربی مدارس میں ہوئی تھی، جہاں ان کے خاص استاد مولانا فاروق چریاکوٹی (متوفی ۱۹۰۹ء) تھے جن کو علوم معقول ومنقول، ریاضی وادبیات جملہ علوم پر عبور کامل حاصل تھا، ان کی بارگاہ فضل وکمال میں درسیات کی تکمیل کر چکے تو علامہ شبلی کے علمی ذوق نے ان کو دوسرے خرمنوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا، چنانچہ فقہ، تفسیر وادب کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے تھے ان سے بھی استفادے کا شوق دامن گیر ہوا۔

اس زمانے کا دستور تھا کہ جب طلبہ ہر قسم کے علوم وفنون سے فراغت پالیتے تھے تو علم حدیث پڑھتے تھے، علامہ نے دوسرے علوم کی تحصیل کر لینے کے بعد سہارن پور کا رخ کیا جہاں مولانا احمد علی محدثؒ کی بہ دولت خاتم المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فیض جاری تھا، علامہ شبلیؒ نے جس طرح دوسرے علوم کی تعلیم کے لئے ان ہی اساتذہ کا انتخاب کیا جو ان فنون میں یگانہ تھے اسی طرح فن حدیث کے لئے بھی انہوں نے اس زمانے کے سب سے نامور اور جلیل القدر محدث کا انتخاب کیا۔

مولانا سہارن پوری اپنے زمانے میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے، انہوں نے پہلے ہندوستان میں مولانا شیخ وجیہہ الدین صدیقی سہارن پوری اور مولانا عبدالحی (تلمیذ مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ) سے حدیث پڑھی، پھر ۱۲۶۱ھ میں مکہ معظمہ جا کر حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر سے دوبارہ پڑھی اور سند واجازت حاصل کی۔

اس زمانے میں علمائے احناف میں مولانا احمد علی صاحب سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا، علاوہ درس و تدریس کے ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کر کے چھاپ کر عام کیا، ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شائع کی، علامہ شبلی فرماتے تھے کہ استاذ مرحوم نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں بسر کئے، اس زمانے کے اکثر علمائے احناف ان کے شاگرد تھے، ان کو حضرت شاہ اسحاق دہلوی نے جو سند حدیث مرحمت فرمائی تھی وہ ان کو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اور انھیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے عطا کی تھی، اس سند کو مولانا سید سلیمان ندوی نے اس لئے تبرکاً نقل کیا ہے کہ مولانا شبلی کی سند بھی اپنے استاد سے اسی سلسلے سے ہو سکتی ہے [۱]۔

مولانا شبلی کا قیام جہاں بھی ہوتا تھا، وہاں طلبہ کو درس بھی دیتے تھے، علی گڑھ اور ندوۃ العلماء میں قرآن پاک کے درس [۲] کا اور اعظم گڑھ میں مولانا حمید الدین فراہی [۳] اور مولانا اقبال احمد خاں سہیل [۴] وغیرہ کو عربی زبان و ادب کی کتابیں پڑھانے کا ذکر تو ملتا ہے لیکن احادیث کی کتابیں پڑھانے کی تصریح نہیں ملتی۔

جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء میں معتمد تعلیم کے عہدے سے مستعفی ہوئے اور طلبہ اور دوسرے قدردانوں کے اصرار کے باوجود اپنا استعفا تو واپس نہیں لیا مگر دسمبر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں قیام کے ارادے سے آئے تو آخری سال کے طلبہ نے خواہش کی کہ وہ انہیں صحیح بخاری شریف کا درس دیں، مولانا نے اس کو قبول کیا اور ہر روز مغرب کے بعد درس شروع بھی ہو گیا اور بہت سے طلبہ نے اس میں شرکت کی لیکن منتظمین کی ناپسندیدگی کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔ [۵]

مولانا شبلی نے فن حدیث میں کوئی مستقل کتاب بھی یادگار نہیں چھوڑی کہ اس کا ذکر کیا جائے، لیکن حدیث میں ان کے کمال اور تبحر کے نمونے ہم کو ان کے بعض مقالات و تصانیف میں جابجا ملتے

---

[۱] ملاحظہ ہو حیات شبلی ص ۸۶، ۸۷، طبع چہارم ۱۹۸۳ء مطبع معارف اعظم گڑھ [۲] حیات شبلی، ص ۱۴۹، ۴۳۳

[۳] ایضاً ص ۹۷ [۴] ایضاً ص ۳۵۰ [۵] ایضاً ۶۵۰، ۶۵۲

ہیں جیسے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سیرۃ النبی وغیرہ مگر طوالت سے بچنے کے لئے یہاں ہم صرف سیرۃ النبی کو زیر بحث لائیں گے، کیونکہ اس کی تحریر وتصنیف کے وقت کتب احادیث وسیر مولانا کا اوڑھنا بچھونا ہوگیا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> "۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکار رسالت ﷺ کے آستانہ پر حاضری کے لئے بے تاب ہو رہے تھے ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی وکلامی مباحث سے ہٹ کر صرف ایک مرکز پر مجتمع ہوگئی تھی، ان کے پاس نہ اب ابن رشد، غزالی و رازی و بوعلی سینا کا گزر ہے، نہ تاریخ وکلام وفلسفہ کا نام ہے، شب و روز وہ ہیں اور کتب احادیث وسیرت کا مطالعہ، تعلیمات نبوی کی ترتیب، اخلاق نبوی کی تحریر، سوانح نبوی کی تلاش اور سیرت نبوی کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھتے، کھری چارپائی ہو یا چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا اور ان ہی درباریوں کی ہم نشینی میں ان کا سارا وقت گزر جاتا اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور دربار رسالت کا آستانہ، چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے یہی ایک خیال ان پر چھایا رہتا تھا، یہی ان کی مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لئے خط وکتابت تھی"۔
>
> (حیات شبلی: ص۵۱،۵۰)

مولانا شبلی کا محدثانہ کمال دکھانے کے لئے سیرۃ النبی کا انتخاب اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی تصنیف وترتیب میں جو اصول اختیار کئے ہیں ان میں سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، اس کو سب پر مقدم رکھا ہے، اس کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کردی ہیں، جو واقعات بخاری ومسلم وغیرہ میں مذکور ہیں ان کے مقابلے میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں فرماتے ہیں۔

آگے پھر لکھا ہے کہ:

سیرۃ النبی کے اکثر حصے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھے ہیں ان میں بھی موقع بہ موقع ان

اصولوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور ان کو مد نظر رکھا ہے۔

مولانا شبلی نے سیرۃ النبی میں آں حضرت ﷺ کے حالات و واقعات لکھنے سے پہلے فن سیرت پر مبسوط مقدمہ لکھا ہے جو روایت و حدیث کے متعدد اہم اصولی مباحث پر بھی مشتمل ہے، اس لئے پہلے ہم اسی سے کچھ امور کا ذکر کرتے ہیں۔

فن سیرت فن حدیث الگ ہیں:

مولانا سیرت کو ایک جداگانہ فن مانتے ہیں اور اسے بعینہٖ فن حدیث نہیں مانتے، فن سیرت کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام نہیں کیا جاتا تھا، حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں:

و لیعلم الطالب أن السیرا　　تجمع ما صح و ما قد انکرا

(ایضاً ص ۱۷)

یعنی کتب سیرت صحیح اور منکر حدیثوں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔

اس حقیقت کی مزید توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے ہیں چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو بھی مغازی کہتے ہیں اور سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں، فقہ کی اصطلاح بھی یہی ہے، اس میں جو باب، کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں اس میں سیر کے لفظ سے غزوات و جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں، تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں، البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ بھی سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فن حدیث سے ایک الگ چیز ہے یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے

متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں اور امام بخاریؒ و مسلمؒ ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر قبول نہیں کرتے کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے لیکن محققین کے خیال میں حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے مثلاً:

غزوۂ ذی قرد کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے پہلے ہوا تھا لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے روایت ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے، علامہ قرطبی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اہل سیر بلا اختلاف کہتے ہیں کہ غزوۂ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا، اس لئے سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے وہ کسی راوی کا وہم ہے، حافظ ابن حجر نے قرطبی کے قول پر بحث کر کے لکھا ہے صحیح مسلم میں غزوۂ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے۔

مشہور محدث دمیاطی نے سیرت میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، اس میں اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے، چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے اس لئے نہ کر سکے۔

(۲) غزوۂ ذات الرقاع کے بارے میں بھی اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر سے قبل ہوا، مگر امام بخاریؒ نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد ہوا، اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا اور حدیث کی نسبت غلطی کا دعویٰ کیا ہے اور یہ کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں، حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا بھی رد کیا ہے۔

(سیرۃ النبی: ج ا مقدمہ ص ۶، ۷ (حواشی))

کتب احادیث سے کتب سیرت کم رتبہ ہیں:

کتب سیرت و حدیث میں فرق دکھانے سے مولانا کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ فن سیرت جیسے فن

حدیث نہیں ہے اس لئے اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جوفن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کافن قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ بعینہ قرآن یاحدیث ہے یاان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

(۳) مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں اس کی وجہ سے ارباب سیر کوتنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت ومغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

(۴) جس طرح امام بخاری ومسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسوں کتابیں قدماء سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سیدالناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ کسی میں یہ التزام نہیں۔ (ایضاً ص۸۱(حواشی))

اس بنا پر مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کا ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق وتنقید کے معیار پر جواتر جائے وہ حجت واستناد کے قابل ہے، ان کے خیال میں سیرت کی کتابوں کی کم پائیگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کردی گئی یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جوروایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں ان میں تشدداوراحتیاط کی چنداں حاجت نہیں۔ (سیرۃ النبی: ج۱ص۳۵(حواشی))

فن سیرت میں محدثین کی مسامحت:

آگے بڑھ کر وہ کبار محدثین کے یہاں بھی اس مسامحت کے درآنے کا ذکر کرتے ہیں کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہوگئیں اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا، کتاب التوسل سے علامہ ابن تیمیہ کا یہ اشارہ نقل کرتے ہیں:

''اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے جنہوں نے رات دن کے اعمال

میں کتابیں تصنیف کی ہیں مثلاً ابن السنی اور ابونعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے"۔

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے کہا "اے خدا میں تجھ کو محمد کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے، خدا نے کہا: تم نے محمد کو کیوں کر جانا" حضرت آدمؑ نے کہا "میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے "لاإلـه إلاالله محمد رسول الله" اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہوگا"، خدا نے کہا "آدم تم نے سچ کہا اور محمدؐ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا"، حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں، اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں"۔

امام ابن تیمیہ ایک اور موقع پر ابوالشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں:

"اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں، صحیح ہیں اور حسن ہیں اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خیثمہ بن سلیمان، صحابہؓ کے فضائل میں روایت کرتے ہیں اور وہ حدیثیں جو ابونعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب حلیۃ الاولیاء کے شروع میں خلفاء کے فضائل میں روایت کی ہیں اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابوالفضل اور ابوموسیٰ مدینی اور ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ روایت کرتے ہیں"۔

مولانا شبلی اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث و روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعات ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ قیامت میں خدا آنحضرت ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا، امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازے پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ "خدا کا کوئی ہم نشین نہیں" اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں۔

یہ خاص نکتہ بھی قابل لحاظ بتایا ہے کہ حدیث و روایت میں امام بخاری و مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابونعیم، بزار طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری و مسلم میں ان کا پتا نہیں لگتا بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے، مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت ﷺ عالم وجود میں آئے تو ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا، بیہقی، خرائطی، ابونعیم، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہو گئیں، محدثین نے جو اصول قرار دیئے تھے ان کو سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیئے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل

واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے لیکن آنحضرت ﷺ کے حالات ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں اکثر منقطع ہیں، صحابہ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کی عمر آپ کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکر ہیں وہ آپ سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں ان میں سے اکثر متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دوراز کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابونعیم نے آں حضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے کہ'' جب آپ پیدا ہوئے تو بہت سے پرندآ کر مکان میں بھر گئے، جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا اور آں حضرت ﷺ کو اٹھالے گیا اور ندا آئی کہ اس بچے کو مشرق ومغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں۔

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے لیکن ان کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں، منقطع ہیں، سیرۃ النبی کا مقدمہ اصلاً فن روایت پر ہے جس کے صرف ایک ہی مسئلہ پر گفتگو کی جاسکی ہے یعنی سیرت اور حدیث کا فرق، اس ضمن میں عہد نبوی کے تحریری مجموعہ احادیث، سیرت ومغازی کے تعلق سے آنے والے مباحث یا ان کی امہات کتب کے بارے میں مولانا کے خیالات کو طوالت کے خوف سے نظرانداز کردیا گیا ہے۔

مولانا شبلی کے نزدیک چونکہ اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول فن روایت ہے جس کی بنا پر اسماء الرجال کے فن کی تدوین ہوئی جو مسلمانوں کا نہایت بے نظیر اور حیرت انگیز کارنامہ ہے، اس لئے سیرۃ النبی اور الفاروق دونوں میں روایت ودرایت پر بڑی فاضلانہ اور بیش قیمت بحثیں کی ہیں، مثلاً روایت ودرایت کے اصول قرآن وحدیث میں، درایت کی ابتدا، محدثین کے اصول درایت، روایت کے اصول اور موضوع حدیثوں کی شناخت کے اصول وغیرہ۔

فن سیرت کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی حدیث ودرایت سے متعلق متعدد مسائل پر بڑی دقت نظر سے عالمانہ بحثیں کی ہیں جن کے عنوانات ملاحظہ ہوں، کتب حدیث وسیرت میں فرق مراتب، فن سیرت میں محدثین کی مساعی، تصانیف سیرت میں کتب حدیث کی طرف سے بے اعتنائی، مصنفین

سیرت کی تدلیس، اصول روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا، روایت میں اختلاف مراتب، تمام صحابہ کے عدول ہونے کی بحث، واقعات میں سلسلۂ علت و معلول کو تلاش نہیں کیا گیا، نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا گیا، کم سن راویوں کی روایت، راویوں میں فقاہت کی شرط، روایت میں قیاس کا کس قدر حصہ شامل ہے، فن تاریخ درروایت پر خارجی اسباب کا اثر، قیاس و درایت، صحابہ میں دو گروہ، محدثین اور درایت حدیث، روایت بالمعنی، روایت آحاد۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا کے مذکورہ مباحث کا خلاصہ اور نچوڑ گیارہ دفعات میں دے دیا ہے جو قابل ملاحظہ ہے:

۱۔ سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہئے، اگر نہ ملے تو سیرت کی روایات کی طرف توجہ کی جائے۔

۲۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کی روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

۳۔ سیرت کی روایتیں بہ اعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لئے بصورت اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

۴۔ بصورت اختلاف روایاتِ احادیث، رواۃ ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

۵۔ سیرت کے واقعات میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

۶۔ نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہئے۔

۷۔ روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے اور راوی کی ذاتی رائے و فہم کا کس قدر جزء شامل ہے۔

۸۔ اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

۹۔ جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی۔

۱۰۔ اہم موضوع پر مختلف روایات کی جمع و تطبیق سے اس کی تسلی کر لینی چاہئے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے؟

۱۱۔ روایات آحاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہئے۔

ابھی تک ہم نے سیرۃ النبی کے مقدمہ سے روایت وحدیث کی صحت وقوت اور معیار کے جو اصول ومبادی مولانا نے بیان کئے تھے ان پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش کی تھی، اب ہم نفس سیرۃ النبی سے بعض محدثانہ بحثوں کو نقل کریں گے۔

تنقید احادیث:

سب سے پہلے ہم تنقید احادیث میں مولانا کا انداز وطریقہ کار بیان کر کے دکھائیں گے کہ اس میں ان کا پایہ کیا تھا، اس کے لئے ہم نے سیرت کے بعض واقعات کا انتخاب کیا ہے۔

بحیرا راہب کا واقعہ:

رسول اللہ ﷺ بارہ سال کی عمر میں اپنے شفیق چچا ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر پر گئے، ابوطالب جب بصریٰ پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے، جس کا نام بحیرا تھا، اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر کہا کہ ''یہ سید المرسلین ہیں'' لوگوں نے پوچھا تم نے کیوں کر جانا، اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لئے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں سے بیان کی گئی ہے، مولانا کو حیرت اس پر ہے کہ اس سے عام مسلمانوں سے زیادہ عیسائیوں کو شغف ہے اور وہ اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق واسرار اسی راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے ان ہی پر آپ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح وحواشی ہیں، ڈریپر صاحب معرکہ علم ومذہب میں لکھتے ہیں:

> ''بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد (ﷺ) کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی، آپ کے ناتربیت لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا..... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں کے مذہبی عقائد نے آپ پر

کہاں تک قابو پالیا تھا"۔

سرولیم میور نے بھی نہایت آب ورنگ سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپؐ نے قائم کیا وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے، مولانا کہتے ہیں کہ اگر عیسائی مصنفین اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہئے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیئے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

درایۃً اس روایت پر تنقید کرنے کے بعد روایۃً بھی اس کو نا قابل اعتبار اور اس کے تمام طرق کو مرسل بتاتے ہیں کہ راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہیں تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے مستند طریقہ جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق مندرجہ ذیل قابل لحاظ باتوں کا تذکرہ کیا ہے:

(۱) امام ترمذی فرماتے ہیں یہ روایت حسن اور غریب ہے، ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا اور کسی طریقہ سے نہیں جانتے، مولانا فرماتے ہیں حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

(۲) حدیث کے ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان کو بہت سے لوگوں نے اگر چہ ثقہ کہا ہے لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ منکر حدیثیں بیان کرتا ہے جن میں سب سے بڑھ کر وہ روایت ہے، جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔

(۳) حاکم نے اس حدیث کو بخاری و مسلم کے شرائط کے مطابق بتایا ہے مگر علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں لکھا ہے "میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، کذب اور وضعی خیال کرتا ہوں"۔

(۴) اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعری ہیں وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام

نہیں بتاتے، طبقات ابن سعد میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے وہ مرسل یا معضل ہے، مرسل روایت میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا اور معضل میں راوی اپنے اوپر کے دو راویوں کا جو تابعی اور صحابی ہیں نام نہیں لیتا۔

(۵) حافظ ابن حجر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہتاً غلط ہے، اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے مگر ان کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل استناد ہیں، عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود ان ہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی" ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۲۶ تا ۱۲۸)

یہ تو مولانا شبلی کی تنقیح تھی، مولانا سید سلیمان ندوی نے بحیرا راہب کے قصے کی مکمل تنقید سیرۃ النبی جلد سوم کے باب "مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت" میں بھی کی ہے۔

(سیرۃ النبی جلد سوم ص ۶۵۸ تا ۶۶۰ طبع جدید)

آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہ کی بت پرستی:

مولانا شبلی کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے متعلق بداہتاً ثابت ہے کہ آپ بچپن اور شباب میں بھی مراسم شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے، لیکن نصاریٰ کہتے ہیں کہ آپ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا وہ عہد نبوت سے ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپ کا طرز عمل وہی تھا جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے پہلے صاحبزادے کا نام عبدالعزیٰ رکھا تھا اور اس کی روایت امام بخاریؒ کی تاریخ صغیر میں موجود ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت ﷺ کی نسبت کیوں کر استدلال ہو سکتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بت پرست تھیں انہوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آپ ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لئے تعرض نہ فرمایا ہوگا اور اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی

نفسہ ثابت نہیں، اس کا سب سے زیادہ صحیح تر سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے، اس کا پہلا راوی اسماعیل ہے جس کا پورا نام اسماعیل بن ابی اویس ہے، اگر چہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے۔

وہ اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں، وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے، غیر ثقہ، کذاب اور وضاع ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں "میں اس کو صحیح روایت کے لئے پسند نہیں کرتا، سلمہ بن شبیب کہتے ہیں، مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنالیتا تھا۔ (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۳۵ تا ۱۳۶)

مولانا شبلی کے نزدیک یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کر دی تھی اور جن لوگوں پر آپ کا اعتماد تھا ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے، اس کے برخلاف مارگولیتھ کے ایک حیرت انگیز دعویٰ کا ذکر کیا ہے اور اس کے ثبوت میں دعویٰ سے زیادہ تر حیرت انگیز فریب کاری کی ہے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرلیا کرتے تھے، جس کا نام عزیٰ تھا، اس کی سند میں مسند احمد کی روایت پیش کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

حدثنی جار لخدیجة بنت خویلد انه سمع النبی ﷺ و هو یقول لخدیجة ای خدیجة و الله لا اعبد اللات و العزیٰ و الله لا اعبد ابداً قال فتقول خدیجة خل اللات، خل العزیٰ قال کانت صنمهم التی کانوا یعبدون ثم یضطجعون .	مجھ سے خدیجہ بنت خویلد کے ایک ہمسایہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی ﷺ کو حضرت خدیجہ سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ، بہ خدا میں کبھی لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا، خدیجہ کہتی تھیں لات کو جانے دیجئے، عزیٰ کو جانے دیجئے یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے، اس راوی نے کہا کہ لات و عزیٰ وہ بت تھے جن کی پرستش اہل عرب سونے سے پیشتر کرلیا کرتے تھے۔

مولانا نا ارشاد فرماتے ہیں ایک معمولی عربی داں بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں کـــانوا یعبدون کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہل عرب لات وعزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے، اگر آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہ کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا، اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات وعزیٰ کی پرستش سے آنحضرت ﷺ کا سخت انکار کرنا مذکور ہے۔

(سیرۃ النبی جلد اول (حاشیہ) ص ۱۳۶، ۱۳۷)

تلک الغرانیق العُلیٰ:

جب کم وبیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے حبش گئے تو وہاں یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کرلیا ہے، یہ سن کر اکثر صحابہ نے مکہ کا رخ کیا لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے، یہ روایت طبری اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو لیکن ان کتابوں میں خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے، جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی ومنوۃ الثالثۃ الاخریٰ (نجم ۲۰) تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے تلک الغرانیق العلی و ان شفاعتھن لترتجی یہ بت معظم ومحترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپ کی متابعت کی۔

مولانا فرماتے ہیں یہ قصہ بے ہودہ اور نا قابل ذکر ہے اور اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے لیکن ان کو افسوس ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے، ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابومعشر شہرت عام رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر ان کو تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے، اس روایت کی صحت پر اصرار ہے، ان کا قول مواہب سے نقل کر کے کفار کی اس عادت کا ذکر کرتے ہیں کہ جب آپ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے اور اپنی طرف سے فقرے بھی ملا دیتے قرآن مجید میں ہے لا تسمعوا لھذا القرآن و الغوا فیہ لعلکم تغلبون اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گڑبڑ کرو شاید تم غالب آ ؤ۔ (فصلت ۲۶)

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ فقرے کہتے جاتے:

و اللات و العزیٰ و منوۃ الثالثۃ الأخریٰ — لات وعزیٰ اور تیسرے بت منات کی قسم،

فإنهن الغرانیق العلیٰ و إن شفاعتهن لترتجیٰ. — یہ بلند و بزرگ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔

مولانا اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ نے جب سورۂ نجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان کافر نے یہی فقرے آپ کی آواز میں ملا کر پڑھ دیئے ہوں گے، دور کے لوگوں کو شبہ ہوا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ہی نے وہ الفاظ ادا کئے، اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہوا ہوگا تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ کسی شیطان نے آپ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیئے ہوں گے، اس واقعہ نے روایتوں میں صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کر لی کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے اس لئے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کر لیا''۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے، ثبوت میں مواہب کی عبارت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

''جب آپ اس آیت پر پہنچے و منوۃ الثالثۃ الأخریٰ تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب ان کے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا، اس بنا پر انہوں نے جھٹ سے آنحضرت ﷺ کی تلاوت میں یہ فقرے غلط کر کے پڑھ دیئے جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچاؤ یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے''۔ (سیرۃ النبی جلد اول: ص ۱۷۱ تا ۱۷۳)

خیبر کی جنگ میں اکثر قلعے تو بہ آسانی فتح ہو گئے، لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھیجا لیکن دونوں ناکام واپس آئے، طبری میں روایت ہے

کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی لیکن فوج نے ان کی نسبت خود یہی شکایت کی۔

اس روایت کو طبری نے جس سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے اس کے راوی عوف ہیں، ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے لیکن بندار جب ان کی روایت کرتے تھے تو کہتے تھے کہ "وہ رافضی اور شیطان تھا" یہ لفظ بہت سخت ہے لیکن ان کی شیعیت سب کو تسلیم ہے اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے، شیعہ کی زبان سے اس روایت کا کیا رتبہ رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ ان کی جو روایتیں باپ کے سلسلہ سے منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں، تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہ بھیجے گئے تھے لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں تھا۔ (سیرۃ النبی ج ۲ص ۳۳۵،۳۳۶)

فتح مکہ کے بعد چند اشخاص کے قتل کا حکم:

ایک جگہ ارباب سیر کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گو اہل مکہ کو امن عطا کیا تھا تاہم دس شخصوں کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں، ان میں سے بعض مثلاً عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کئے گئے لیکن متعدد ایسے تھے کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو مکہ میں ستایا کرتے تھے یا آپؐ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے، ان میں سے ایک عورت اس جرم پر قتل کر دی گئی کہ وہ آپؐ کے بارے میں ہجو یہ اشعار گایا کرتی تھی۔

مولانا کے نزدیک محدثانہ تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں ہے، پہلے درایتاً نقد کیا ہے کہ اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، بجز دو چار کے کفار قریش میں سے کون تھا جس نے آپ کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں، بایں ہمہ ان ہی لوگوں کو مژدہ سنایا گیا انتم الطلقاء ،جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے وہ تو نسبتاً کم درجہ کے مجرم تھے، حضرت عائشہؓ کی یہ روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ آپؐ نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، خیبر میں جس عورت نے آپ کو زہر دیا اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے

قتل کا حکم ہوگا؟ارشاد ہوا کہ نہیں، خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہردے کر رحمت عالمؐ کے طفیل سے جانبر ہو سکتی ہے تو حرم میں اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبویؐ سے کیوں کر محروم رہ سکتے ہیں۔

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ ناقابل اعتبار رہ جاتا ہے، صحیح بخاری میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے اور یہ عموماً مسلم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا، مقیس کا قتل شرعی قصاص تھا باقی جن لوگوں کی نسبت حکم قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانے میں آنحضرت ﷺ کو ستایا کرتے تھے وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں یعنی اصول حدیث کی رو سے وہ روایت منقطع ہے جو قابل اعتبار نہیں اور ابن اسحاق کا درجہ کتاب کے دیباچے میں مولانا بتا چکے ہیں کہ مستند ہونے کے باوجود ان کے بہت سے رواۃ ضعیف اور غیر مستند ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو پیش کی جا سکتی ہے وہ ابوداؤد کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ چار شخصوں کو کہیں امن نہیں دیا جا سکتا لیکن انہوں نے یہ حدیث نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند جیسی چاہئے مجھ کو نہیں ملی۔

امام ابوداؤد نے باب قتل الاسیر میں تین روایتیں نقل کی ہیں، پہلی روایت کے ایک راوی احمد بن المفضل کے متعلق مولانا شبلی نے لکھا کہ ازدی نے ان کو منکر الحدیث کہا ہے اور ایک راوی اسباط ابن نصر ہے جس کی نسبت امام نسائی کا قول ہے کہ ''قوی نہیں ہے'' اگر چہ صرف اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لئے کافی نہیں لیکن واقعہ جس درجہ اہم ہے، اس لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لئے کافی ہے۔

بعض غلط اور وضعی واقعات وروایات کی تردید:

اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں اور ان میں بھی محدثانہ بحثیں ملتی ہیں، اختصار کی وجہ سے یہاں چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ریحانہ کا واقعہ:

قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت ریحانہ کو اپنے حرم میں داخل کر لینے کے

واقعہ کی بنا پر رسول اکرم ﷺ کی ذات کو طعن کا نشانہ بنایا گیا ہے لیکن مولانا کے نزدیک یہ واقعہ سرے سے غلط ہے، فرماتے ہیں:

"ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں لیکن واقدی نے یہ تصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا تھا، ابن سعد نے واقدی کی جو روایت نقل کی ہے اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے" پھر آپ نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کر لیا"۔

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے لیکن حافظ ابن مندہ کی طبقات الصحابہ جو تمام محدثین مابعد کا ماخذ ہے اس میں جو الفاظ ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے کہ ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا تھا تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں اور وہیں پردہ نشین ہو کر رہیں۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں، ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر مان لیا جائے کہ وہ حرم نبویؐ میں آئیں تب بھی وہ قطعاً منکوحات میں تھیں، کنیز نہ تھیں۔

حضرت زینب کے نکاح کا معاملہ:

حضرت زینب کا نکاح پہلے حضرت زید سے ہوا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ تھے اور حضرت زینب آپؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، ان کو یہ نسبت ناگوار تھی مگر تعمیل ارشاد میں راضی ہو گئیں، حضرت زید اور ان میں شکر رنجی رہتی تھی اس لئے انہوں نے طلاق دینا چاہا مگر بار بار رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے سے رک جاتے تھے لیکن بالآخر یہ نوبت آ ہی گئی اس لئے آپؐ نے ان کی دل جوئی کے لئے ان سے خود نکاح کر لیا اور اس سے جاہلیت کی وہ قدیم رسم بھی مٹ گئی کہ متبنیٰ

اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے، اس لئے اس کی بیوی سے نکاح نہیں ہوسکتا۔

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتاپا کذب وافترا ہے لیکن مولانا کو تسلیم ہے کہ انہوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے، پھر انہوں نے تاریخ طبری سے وہ بےہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کر کے نقل کی ہے "نقل کفر کفر نہ باشد" جس میں آپ کی جانب ان فقروں کی نسبت دی گئی ہے: سبحان الله العظیم سبحان الله مصرف القلوب۔

اب اس روایت پر ان کی تنقیح وتنقید ملاحظہ ہو:

"طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ نقل کی ہے جو مشہور دروغ گو اور کذاب ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بےہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔ طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس قسم کی بےہودہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن محدثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے، حافظ ابن حجر سخت روایت پرست ہیں تاہم فتح الباری (سورۂ احزاب کی تفسیر) میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں، ترجمہ ملاحظہ ہو:

"اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے ان کو نقل کر دیا ہے، ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہئے"۔

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں، ہم ترجمہ نقل کرتے ہیں:

"ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم اس لئے نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمد نے بھی اس واقعہ کے متعلق حضرت انسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جو غریب ہے، ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا ہے"۔

اس وقت چونکہ منافقوں کا بڑا زور تھا اور اسی سال کا وہ واقعہ بھی ہے جس میں حضرت عائشہ

پر تہمت لگائی گئی تھی، ان سب کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا آخر میں لکھتے ہیں:

''یہی روایتیں ہیں جو بچی کچی غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں لیکن وہ محدثین جن کا معیار تحقیق بلند ہے اور عدالت روایت کے حاکمان مجاز ہیں مثلاً امام بخاری، امام مسلم وغیرہ ان کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا''۔

(سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۱۳ تا ۳۱۶)

جنگ خیبر میں مرحب جیسے پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا، اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں، معالم التنزیل میں ہے کہ''حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا، لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علی کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی، آپ نے قلعہ کا در جو سرتا پا پارۂ سنگ تھا اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا، اس واقعہ کے بعد ابورافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا، یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے ذکر کی ہیں لیکن بازاری قصے ہیں، علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے کہ''سب لغو روایتیں ہیں''۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ''یہ روایت منکر ہے''، ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں جن کو امام بخاری اور ابوداؤد اور دارقطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔

صحیح حدیثوں کی نشان دہی اور ان کی ترجیح:

جس طرح مولانا نے ضعیف اور موضوع روایتوں کی نشان دہی کر کے ان کی مدلل تردید کی ہے اسی طرح کسی مفہوم یا ایک مضمون کی متعدد روایتوں میں صحیح ترین اور مرجح روایت کی تعیین و تصریح بھی کی ہے مثلاً ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا،

مسند احمد بن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے، لیکن صحیح مسلم اور مولانا سید سلیمان ندوی کے اضافے کے مطابق حاکم ج ۳ ص ۳۹ مطبوعہ حیدر آباد میں حضرت علیؓ کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے، مولانا شبلی کے نزدیک یہی اصح الروایات ہے۔

(سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۲۷ و ۳۲۸)

ہجرت کے واقعہ میں ہے کہ جب آپ مدینہ پہنچے تو ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنے گھر میں آپ کو اتارے، آپ نے فرمایا کہ ناقہ کو چھوڑ دو وہ خدا کی طرف سے مامور ہے، وہ حضرت ابوایوب انصاری کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ گئی اس لئے آپ نے ان ہی کے گھر پر قیام فرمایا، مولانا شبلی فرماتے ہیں یہ روایت وفاء الوفا کی ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ جب لوگوں میں میزبانی کے لئے جھگڑا ہوا تو آپ نے کہا میں بنوالنجار کے یہاں اتروں گا جو عبدالمطلب کے ماموں ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے عمداً ایسا کیا تھا، حضرت ابوایوب اسی خاندان کے تھے، امام بخاریؒ نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابوایوب کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا، یہاں اگر چہ مولانا نے صراحۃً کسی روایت کو صحیح تر نہیں قرار دیا ہے لیکن ان کا رجحان دوسری روایت کی طرف معلوم ہوتا ہے جس کی خاص وجہ اس کا صحیح مسلم میں ہونا ہے۔ (ایضاً حاشیہ ص ۲۰۰)

اذان کے مسئلے میں جب رسول اکرم ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو لوگوں نے مختلف رائیں دیں لیکن آپؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے پسند کی اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان دیں، واضح رہے کہ یہ بخاری کی روایت ہے، صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زید نے پیش کی تھی، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب میں توارد ہوا، مولانا شبلی کے خیال میں "صحیح بخاری کی روایت کے مقابلے میں کسی روایت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی"۔ (ایضاً ص ۲۰۳)

بعض حدیثوں کے اختلاف واضطراب کا ذکر:

بدر کی لڑائی کے آغاز کے واقعات اور سردار لشکر عتبہ کی مبارزطلبی وغیرہ کے مواقع کی روایات کے متعلق فرماتے ہیں "ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں اور قریباً سب ہم مرتبہ ہیں، اس لئے جو

روایت اعتبار کی جائے قابل الزام نہیں"۔ (ایضاً حاشیہ ص ۲۳۱)

حضرت صفیہ کی نسبت بعض کتب حدیث وسیر میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے ان کو دحیہ کلبی کو دیا تھا پھر کسی نے ان کے حسن کی تعریف کی تو ان سے مانگ لیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو سات لونڈیاں دیں، مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت صفیہ کا یہ واقعہ حضرت انسؓ سے منقول ہے لیکن خود حضرت انس سے متعدد روایتیں ہیں اور وہ باہم مختلف ہیں، بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعہ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپ کے سامنے حضرت صفیہ بنت حی کے حسن وجمال کی تعریف کی، ان کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا تھا، آں حضرت ﷺ نے ان کو اپنے لئے پسند کرلیا، لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ باب ما یذکر فی الفخذ اور مولانا سید سلیمان ندوی کے اضافے کے بموجب صحیح مسلم" باب فضل عتق الامۃ ثم التزوج بھا" میں خود حضرت انس کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کئے گئے تو حضرت دحیہ کلبی نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو، آپ نے ان کو اختیار دیا کہ خود جا کر لونڈی لے لو، انہوں نے حضرت صفیہ کا انتخاب کیا لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا، ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا اے پیغمبر خدا آپ نے صفیہ کو دحیہ کے حوالے کیا وہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ ہے اور آپ کے سوا کوئی اس کے لائق نہیں، اس کے بعد آپ نے حضرت صفیہ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا، ابوداؤد میں یہ دونوں روایتیں ہیں اور دونوں حضرت انسؓ سے مروی ہیں، ابوداؤد کی شرح میں مازری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت صفیہ کو اس لئے دحیہ سے لے کر ان سے عقد کیا کہ چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیس یہود کی صاحب زادی تھیں، اس لئے ان کا کسی اور کے پاس جانا ان کی توہین تھی، حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے، روایتوں کا یہ اختلاف واضطراب بیان کرنے کے بعد مولانا واقعہ کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلۂ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کئے جا چکے تھے، اس حالت میں ان کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور رفع غم کے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آں حضرت ﷺ ان کو اپنے عقد میں لے لیں، وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں، لیکن آں حضرت ﷺ نے ان کی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا اور اضافہ سلیمانی کے مطابق بلکہ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپ کے نکاح میں آنا قبول کریں، انہوں نے دوسری صورت پسند کی، حسن خلق، رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی، اس قسم کے طرز عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔

مولانا لکھ چکے ہیں کہ غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گذر چکا ہے۔ (سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۴۹ و ۳۵۰)

جمع وتطبیق اور رفع تناقض:

بعض جگہ روایتوں میں تطبیق کر کے تضاد کی تردید کی ہے مثلاً ہجرت کے وقت مدینہ قریب آ گیا تو پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور طلع البدر علینا الخ پڑھنے لگیں، اس کے لئے وفاء الوفا کا حوالہ دیا ہے مگر یہ بھی لکھا ہے کہ بخاری میں بھی یہ اشعار منقول ہیں مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر، پھر فرماتے ہیں: لیکن دونوں روایتوں میں کچھ تناقض نہیں، ممکن ہے دونوں موقعوں پر یہ اشعار پڑھے گئے ہوں۔ (ایضاً مع حاشیہ ص ۱۹۹، ۲۰۰)

صحیح، قوی، متصل، مرسل، منقطع اور ضعیف و منکر حدیثوں کی نشان دہی:

اوپر اس کی متعدد مثالیں تنقید احادیث کے ضمن میں گزر چکی ہیں کہ مولانا شبلی روایات کی قوت وضعف کو واضح کر کے ان کے درجہ و مرتبہ کا تعین کر دیتے ہیں یہاں ہم اس کی صرف ایک

مثال نقل کرتے ہیں۔

پہلی وحی کے نازل ہونے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ایک حدیث کے متعلق حاشیے میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ روایت حضرت عائشہ سے مروی ہے لیکن حضرت عائشہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں لیکن صحابہ کا مرسل ان کے نزدیک قابل حجت ہے کیونکہ متروک راوی بھی صحابہ ہی ہوں گے۔ (سیرۃ النبی جلد اول (حاشیہ) ص۱۴۳)

ایک طرح کی روایات میں کمی وبیشی کا ذکر:

احادیث کے فرق واختلاف کی طرح ان میں کمی بیشی کا ذکر بھی کیا ہے مثلاً ابوطالب کی وفات کے وقت آں حضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ پہلے سے موجود تھے، آپؐ نے فرمایا: مرتے مرتے لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے یہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں، ابوجہل اور ابن امیہ نے کہا: ابوطالب کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے؟ بالآخر ابوطالب نے کہا: میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں، پھر آں حضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا میں وہ کلمہ کہہ دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا، آپ نے فرمایا میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کروں گا جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کر دے۔

متن میں مولانا یہ تفصیل قلم بند کر کے حاشیے میں لکھتے ہیں "ابوطالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں"۔ (ایضاً ص۱۷۶)

محرم ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ غطفان اور یہود کے حملے کی مدافعت کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے، حضرت عامر بن الاکوعؓ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے، اشعار کے متعلق لکھا ہے کہ صحیح مسلم و بخاری میں نقل کئے ہیں، مسند ابن حنبل میں بعض اشعار زیادہ ہیں۔ (ایضاً ص۳۴۳)

سیر کی روایتوں کے متعلق وضاحتیں:

مولانا شبلی نے بعض جگہ سیر کی کتابوں سے جو حصے لی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں بعض زائد تفصیل ہوتی ہے مثلاً صلح حدیبیہ کے معاہدے کے مطابق جب رسول اکرم ﷺ ۷ھ

میں ادائے عمرہ کے لئے صحابہ کرام کے ساتھ تشریف لے گئے تو وہاں سے واپسی کے وقت حضرت حمزہ کی صغیر السن صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آپ کے پاس چچا چچا کہتی دوڑتی آئیں، ان کو لینے کے بہت سے دعوے دار ہو گئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے سب کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو حضرت اسما کی گود میں دیا جو امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے، حاشیے میں یہ وضاحت کرتے ہیں "اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب عمرۃ القضا سے ماخوذ ہے بعض زائد تفصیل زرقانی سے لی گئی ہیں۔ (ایضاً متن مع حاشیہ: ص ۴۵۸)

الفاظ حدیث کی تحقیق:

امام بخاریؒ نے کتاب الاجارہ کے باب رعی الغنم علی قراریط میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا" مولانا شبلی رقم طراز ہیں کہ قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آں حضرت ﷺ اجرت پر لوگوں کی بکریاں چرایا کرتے تھے، اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارہ میں نقل کیا ہے لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے، ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے، علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے، نورالنبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۲۵)

سیرۃ النبی کے جو حصے علامہ شبلی کے خامۂ زرنگار سے ہیں ان میں اور ان کی بعض دوسری تصنیفات میں بھی احادیث سے متعلق امور و مسائل زیر بحث آئے ہیں لیکن ایک مختصر مضمون میں ان کو سمیٹنا دشوار تھا۔



مولانا مناظر احسن گیلانی

اور

علم حدیث

از: مولانا محمد سعود عالم قاسمی

صدر شعبہ دینیات (سنی) اے۔ایم۔یو۔علی گڑھ

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (ولادت ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء وفات ۱۳۷۵ھ ۱۹۵۶ء) بیسویں صدی کے ان اکابر علماء میں تھے جن کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی، جو علوم اسلامیہ پر وسیع اور عمیق نظر رکھتے تھے، جن کو تقریر و تحریر دونوں کا ملکہ اللہ نے عطا کیا تھا اور جنہوں نے قدیم و جدید دونوں طبقوں کو فیضیاب کیا۔

مولانا گیلانی نے دارالعلوم دیوبند سے اکتساب فیض کرنے کے بعد تقریباً تیس سالوں تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے شعبۂ دینیات میں تدریسی فرائض انجام دیئے اور صدر شعبۂ دینیات کی خدمات انجام دے کر ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء میں سبکدوش ہوئے۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات کے بنیادی مضامین مثلاً تفسیر وفقہ کے ساتھ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ حدیث رسول ﷺ کا درس دیا۔ ان کی بصیرت افروز تدریس نے شاگردوں کا ایک معتبر حلقہ بنا دیا۔ جس میں مخدوم محی الدین، غلام محمد مرتب مقالات احسانی اور شہرۂ آفاق محقق

ڈاکٹر محمد حمید اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔حدیث وسیرت پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی تحقیقات سے پورا عالم اسلام واقف ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتب میں مولانا گیلانی کا نہ صرف حوالہ دیا ہے بلکہ عزت واحترام کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ (خطبات بہاولپور ص:۳۰،۱۷،بنئی دہلی ۱۹۹۷ء)

مولانا گیلانی کے موضوعات تحقیق ان کے مضامین تدریس ہی کی طرح متنوع تھے۔

چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا کی شخصیت کا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:

''فاضل گرامی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ دور حاضر کے طبقہ علماء کے خواص میں نہیں اخص الخواص میں تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی وسعت نظر وبحثہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ تھے، مولانا بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، متکلم معقولی وصوفی صافی تھے''۔

(حیات مولانا مناظر احسن گیلانی از مفتی ظفیر الدین مفتاحی ص ۲۳۶ بنارس ۱۹۸۹ء)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

''بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وسعت نظر، وسعت مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے، (والغیب عنداللہ) تصنیف وتالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف ومحقق بنا سکتا ہے۔اس ایک آدمی نے تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(پرانے چراغ ص:۸۶،اول لکھنؤ ۲۰۰۰ء)

مولانا گیلانی کی علمی زندگی میں تین دھارے آکر ملے تھے۔ایک ٹونک کے معقولات کا جس کا اثر مولانا کی زبان وبیان اور طرز استدلال پر تھا، دوسرا علامہ حمید الدین فراہی کے درس قرآن کا

جس کا اثر مولانا گیلانی کے فکر و فہم پر تھا اور تیسرا دار العلوم دیوبند کے درس حدیث کا جس نے مولانا گیلانی کی سیرت وشخصیت کو رنگ و آہنگ اور وقار و اعتبار عطا کیا اور یہی ان کی شناخت بن گئی تھی، بلکہ یہی ان کا سرمایہ تھا:

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

یہی وجہ ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تدریسی خدمات سے سبکدوشی کے بعد بھی وہ اپنا تعارف استاذ حدیث کی حیثیت سے کراتے تھے، چنانچہ تدوین حدیث کا ابتدائیہ فاتحۃ الکتاب کے نام سے انہوں نے لکھا تو آخر میں یہ الفاظ لکھے: ''الفقیر الأمھن الجانی مناظر أحسن گیلانی ، سابق خادم حدیث فی الجامعۃ العثمانیۃ حیدرآباد دکن۔'' (تدوین حدیث، فاتحۃ الکتاب، مکتبہ تھانوی دیوبند ۱۹۸۳ء)

مولانا مناظر احسن گیلانی بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کو دیوبند کے فخر الاماثل اور نابغۂ روزگار محدث علماء سے حدیث کا درس حاصل کرنے کا موقع ملا تھا، بخاری اور ترمذی شریف شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے پڑھی، مسلم شریف محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری نے پڑھائی، ابوداؤد شریف کا درس شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی سے لیا اور نسائی شریف شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے پڑھی جوان کے بخاری کے ہم سبق بھی تھے۔ ان محدثین عظام نے مولانا گیلانی کو احادیث رسول کا درس ہی نہیں دیا بلکہ ایک طرف علم حدیث میں تحقیق و تنقیح کے اصول اور مناہج سے روشناس کرایا اور دوسری طرف سیرت رسولؐ سے شیفتگی اور وارفتگی کی چنگاری بھی سلگا دی۔ ان کی تعلیم و تربیت نے مولانا گیلانی مس خام کو کندن بنا دیا جس کی جلوہ گری ان کی شخصیت اور سیرت میں تا عمر وجہ کشش بنی رہی۔

دار العلوم دیوبند میں اکابر اساتذہ سے حدیث رسول کا درس حاصل کرنے سے پہلے مولانا گیلانی نے ٹونک میں منطق و فلسفہ اور معقولات کی کتابیں پڑھی تھیں۔ ان کتابوں نے مولانا گیلانی کو عقلی الجھنوں کا اسیر بنا دیا تھا، وہ کتابیں قلب و روح پر حجاب بن گئی تھیں اور حدیث کا درس سنتے وقت شکوک و شبہات، اندیشے اور مہلک خیالات کا طوفان بن کر مولانا گیلانی کو ہچکولے کھلاتی تھیں۔ اپنی اس کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا گیلانی نے لکھا ہے:

"جوں ہی حدیث شروع ہوتی اپنے ذہن میں الجھنوں کے طوفان کو پاتا، طرح طرح کے شبہات ہر حدیث میں ہوتے .... بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے، دو گھنٹے تک عموماً ترمذی شریف کا یہ درس ہوتا تھا اور ایک سیاہ سینہ ان دونوں گھنٹوں کے اندر انہی شکوک وشبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا، حدیث میرے لیے گویا کہ بدگمانی وسوءظن کا چقماق بنتی چلی جاتی تھی، دماغ صرف ہرزہ اندیشیوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا"۔

(رسالہ دارالعلوم دیوبند، ربیع الاول ۱۳۷۶ھ)

مولانا گیلانی نے اس ذہنی کش مکش سے اپنے استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن کو آگاہ کیا اور ان کے استفسار پر اپنی پچھلی تعلیم کی تفصیل بھی بیان کی، استاذ نے پوری کیفیت سن کر فرمایا:

"جو کچھ کچا پکا آپ نگلتے چلے گئے ہیں وہی سب کچھ باہر نکل رہے ہیں، پریشان ہونے کی بات نہیں، مولوی صاحب جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہیں ہوگا"۔

(رسالہ دارالعلوم دیوبند، ربیع الاول ۱۳۷۶ھ)

شیخ الہند کی دعاء نے مولانا گیلانی کی کشتی فکر کو گرداب سے نکالا اور ساحل پر لگا دیا، مولانا لکھتے ہیں کہ:

"خاکسار، اس کا دماغ، اس کا دل اس کی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصہ میں بحمد اللہ پھر کسی قرآنی آیت یا کسی نص نبوی میں کسی قسم کا کوئی شبہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا"۔ (ایضاً)

استاذ کی نگاہ نے مولانا گیلانی کو یہ راز سمجھا دیا تھا کہ:

تازہ میرے دماغ میں پھر معرکہ کہن ہوا عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بو لہب

عقل کی بولہبی عشق محمدی کے آگے خاکستر ہو چکی تھی، اس عشق کی تاثیر نے مولانا گیلانی کی زبان وقلم ہی کو پاکیزہ نہیں بنایا، بلکہ ان کی سیرت وکردار کو بھی منور کر دیا۔

بقول علامہ ماہر القادری:

"ذات رسالت مآب سے مولانا گیلانی مرحوم کو جو محبت اور عشق تھا وہی ان کی سیرت

وکردار کا نمایاں باب ہے ۔عشق رسول کی زاد راہ لے کر جس نے سفر آخرت اختیار کیا ہو اس کی سعادت اور خوش نصیبی کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے"۔

(ماہر القادری، یاد رفتگاں: ص ۳۳۵ دوم مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۹۲ء)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وعقیدت کی فراوانی نے مولانا گیلانی کو اس طرح سیراب کر دیا کہ وہ "جب نام تیرا لوں تو اشک بھر آوے" کا مصداق بن چکے تھے۔

علامہ ماہر القادری کی مشہور نعت "سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی " بچے، جوان، بوڑھے سب کو ولولہ تازہ عطا کر دیتی ہے ۔ماہر القادریؒ نے جب یہ نظم مولانا گیلانی کو سنائی تو مولانا کی کیا کیفیت ہوئی اس کا اندازہ خود مولانا ماہر القادری کی زبانی سنیے:

"میں نے اپنی مشہور نظم "ظہور قدسی" کہی تو اسے لیکر مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ ان دنوں عثمانیہ یونیورسٹی کے قریب ایڈیکیٹ میں رہتے تھے، میں نے نظم سنائی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہوگئیں، کاش عشق رسولؐ کے ان موتیوں کو میں چن سکتا تھا۔ میری اس نظم پر مولانا گیلانی نے مقدمہ لکھا اور نظم کی شہرت ومقبولیت کی جو پیش گوئی انہوں نے اس وقت کی تھی وہ بعد میں جا کر حرف بحرف پوری ہوئی۔" (یادرفتگاں: ۳۳۲، دوم)

مولانا گیلانی قادر الکلام شاعر تھے، نعت نبویؐ بڑے ذوق وشوق سے کہتے، جذب وکیفیت کے ساتھ پڑھتے اور سامعین کے دلوں میں عشق محمدی کا چراغ روشن کر دیتے ،دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں سید سلیمان ندوی پر مقالہ پیش کرنے کے لیے تشریف لائے تو احباب نے نعت سنانے کی درخواست کی ،مولانا نے گدگمی زبان میں کہی گئی اپنی مشہور نعت سنائی اور کس عالم جذب میں سنائی مولانا علی میاں کی زبانی سنئے:

"ان نعتوں میں ان کی محبت، سوز ، بارگاہ نبویؐ سے عاشقانہ تعلق بغیر کسی تکلف کے ظاہر ہوگیا ہے، ہندی کے بیٹھے بول، مولانا کا ترنم اور نعت کا موضوع ان سب نے مل کر اس میں عجیب دل کشی اور دل آویزی پیدا کر دی ہے۔مولانا خود بھی اپنی آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکے اور سننے والے بھی

متاثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے"۔ (پرانے چراغ، ص ۷۶)

ذات محمدی سے تعلق اور ان کی سیرت کے اتباع کی جھلک یوں تو مولانا گیلانی کی ہر تصنیف میں نظر آتی ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ ان کی دو کتابیں حضرت رسالت مآب کی سیرت اور سنت کی تابشوں کی ترجمان ہیں۔ ان میں سے ایک مختصر ہے اور دوسری طویل تر۔ ایک اجمال کا نمونہ ہے اور دوسری تفصیل کا۔ ایک کا موضوع سیرت ہے اور دوسری کا سنت۔ ایک قلب و روح کی تطہیر کرتی ہے اور دوسری فکر و ذہن کی تربیت کرتی ہے۔ ایک کا نام النبی الخاتم ہے اور دوسری کا تدوین حدیث۔ یہ دونوں کتابیں اپنے موضوع پر انوکھی اور اچھوتی ہیں۔ اگر مولانا گیلانی کی تصنیف "حضرت ابوذر غفاری" کو بھی شامل کر لیا جائے جس میں صحابی رسول کی حیات و کارناموں کی تفصیل کے ساتھ حدیث کی روایت پر سیر حاصل عالمانہ بحث کی گئی ہے تو گویا یہ تین کتابیں حدیث کی خدمت میں مولانا گیلانی کے گہر بار قلم کا عطیہ ہیں۔

النبی الخاتم:

النبی الخاتم ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ایک مختصر سی کتاب ہے جو تقریباً ساڑھے چار سو عنوانات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، بقول مولانا منظور نعمانی:

"دریا بکوزہ کی مثال بہت مشہور ہے، لیکن شاید دنیا کی کسی اور کتاب پر اس سے بہتر طور پر صادق نہ ہو"۔ (تعارف النبی الخاتم، از مولانا منظور نعمانی، مکتبہ اشرفیہ بمبئی)

یہ کتاب عبدالمجید قریشی صاحب بانی جدید تحریک سیرت و ایڈیٹر اخبار "الایمان" کی دعوت پر مقالہ کی صورت میں لکھی گئی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی اور اس طرح مقبول ہوئی کہ ہند و پاک میں آج تک بار بار شائع ہوتی ہے اور اہل علم سے خراج تحسین وصول کرتی ہے۔

کتاب اساسی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں رسول پاک کی مکی زندگی زیر بحث ہے اور دوسرے حصہ میں مدنی زندگی کی ترجمانی ہے۔

مستشرقین نے حضور پاک کی مکی زندگی کو اختیار کی یا کمی زندگی کو دعوت کی اور مدنی زندگی کو

ریاست اور قیادت کی زندگی سے تعبیر کیا ہے، مگر مولانا گیلانی نے مکی زندگی کو دل کی زندگی اور مدنی زندگی کو دماغ کی زندگی سے تعبیر کیا ہے، مکی زندگی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"نبی مان لینے کے بعد کس کی ہمت تھی کہ اس قدسی سرشت کے امتحان کا اندیشہ بھی کرتا، یہی مصلحت تھی کہ ایک مہینہ نہیں، دو مہینے نہیں، دو سال بھی نہیں، بلکہ تم میں کون نہیں جانتا کہ مکی زندگی کے پورے تیرہ سال اس حال میں اس کو گزارنے پڑے کہ اس کو کوئی نہیں جانے گا، گویا اس کو کوئی نہیں مانے گا"۔ (النبی الخاتم ص: ۳۸)

مدنی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں:

"جن کوتاہ بینوں نے "دل" کا اقرار کیا تھا لیکن "دماغ" پر ان کو اب تک شک تھا اب انہی تنگ نظروں کے لیے دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے، جس میں دل سے زیادہ دماغ ہی کی نمائش ہوگی، تاکہ وہ وہمی شوشہ بھی مٹ جائے جس کے آڑ میں جاننے کے بعد نہ جاننے کے لیے چھپنے والے چھپ رہے ہیں"۔ (ایضاً ص: ۸۶)

کتاب کا اسلوب خطابی ہے، سادگی اور پرکاری کا نمونہ ہے، اعتقاد اور اخلاص دونوں کی آمیزش ہے، نمونہ دیکھیے:

"یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے، (سلام ہو ان پر) بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے لیکن کیا کیجیے کہ ان میں جو بھی آیا جانے ہی کے لیے آیا، پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لیے آیا، وہی جو اگنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور پھر چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی جا رہا ہے"۔ (النبی الخاتم ص: ۳۸)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"بی بی کی عصمت کا پتہ بے چارگی میں نہیں چلتا، چارہ ہو اور عصمت ہو، عصمت اسی کا نام ہے، خاک کے فرش کے سوا جس کے پاس کوئی فرش نہیں، وہ اگر خاک پر سویا تو کیا خاک سویا، جو تخت پر سو سکتا تھا وہ مٹی پر سویا، اسی کا سونا ایک خالص سونا ہے جس میں کھوٹ نہیں ہے"۔ (ایضاً ص: ۳۸)

النبی الخاتم میں نبوت محمدی پر جہاں گزشتہ آسمانی مذاہب کی شہادتوں اور انبیاء سابقین کی پیش گوئیوں سے استدلال ملتا ہے وہاں خود رسول پاک کی زندگی کے تجربات، اخلاق، عادات اور خاندانی اور ملکی حالات کے ہشت گانہ دلائل کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ایک طرف تو حالات و کوائف کی منطقی تشریح کی گئی ہے، دوسری طرف مغربی دانشوروں کی ذہنی الجھنوں کا مداوا کرنے کی سعی کی گئی ہے اور اعتراضات کے جوابات بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اہل دل اور اہل دماغ دونوں کی تسکین و تربیت کا سامان کرتی ہے اور دعوت محمدی کی صداقت کا ثبوت فراہم کرتی چلی جاتی ہے۔

اسی کتاب میں مصنف نے قرآنی آیت میں ذوالکفل کا مصداق ہندوستان کے مہاتما بدھ کو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''قرآن مجید میں انبیاء صالحین کے ذکر میں ایک نام ذوالکفل کا بھی آیا ہے۔ مفسرین کا خیال ہے: وفی تسمیة ذوالکفل اقوال مضطربة لا تصح (روح المعانی ص:۶۷، ج:۱۷) یعنی ذوالکفل کے نام میں مختلف اقوال ہیں اور ان میں کوئی بات صحیح نہیں ہے۔ کیا اس صورت میں اگر کفل کو کپل کا معرب ٹھہرا کر یہ کہا جائے کہ کپل والا ذوالکفل کے معنی ہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو روایتاً اس کے رد کرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟ مذہبی دنیا کا اتنا انقلابی وجود جیسا کہ بدھ تھا قرآن میں اگر اس کا ذکر ہو تو کیا تعجب ہے۔'' (النبی الخاتم ص۹)

پوری کتاب نکات، توجیہات اور صداقت محمدی کی تشریح کا مرقع ہے، چنانچہ اس کتاب کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''ایک گلدستۂ عقیدت ہے جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز و ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کیے ہیں، اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگی بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مؤرخین اور ارباب وجد و حال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں''۔ (معارف اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۵۷ء)

النبی الخاتم کے متعلق مولانا ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

''کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے، صحف سماوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی و وارفتگی، عقل و جذب کی لطیف آمیزش، حسب عادت معمولی معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں اور اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے ۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمۃ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ موثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے یہ صرف علم و انشاپردازی کا کرشمہ نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے''۔ (پرانے چراغ ص ۶۲-۶۱، اول)

تدوین حدیث:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب حدیث کی اشاعت و حفاظت اور اس کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔ مصنف کا استدلال منطقی اور انداز متکلمانہ ہے۔ اس کتاب کا مواد اور منہج اگرچہ قدیم ہے مگر جدید ذہن کے شبہات و اعتراضات، فتنۂ انکار حدیث اور مستشرقین کے اٹھائے گئے سوالات کو سامنے رکھ کر مباحث مرتب کیے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب ایک طرف تو حدیث کی عہد بعہد تاریخ کی تفصیل بیان کرتی ہے اور دوسری طرف حدیث رسولؐ کے متعلق جدید عقلی اشکالات کا مسکت جواب فراہم کرتی ہے۔ مولانا گیلانی کتاب کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' اس زمانہ میں ادھر اُدھر کی چند پراگندہ معلومات کے زیر اثر حدیث کے انکار و اقرار کا ایک نیا قصہ چھیڑ دیا گیا ہے، میرا تو خیال ہے کہ اس کتاب کو پڑھ لینے کے بعد شاید لوگ اسی نتیجے تک پہونچیں گے کہ انکار و اقرار دونوں کے صحیح حدود سے باہر نکل کر لوگ باتیں کر رہے ہیں، ابتدائے اسلام سے اس وقت تک حدیث کا ایک خاص مقام مسلمانوں کی دینی زندگی میں رہا ہے، یہی اس کا طبعی مقام ہے۔'' (فاتحۃ الکتاب تدوین حدیث)

یہ کتاب بڑی تقطیع کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۶۹ھ میں شائع ہوئی تھی، پھر متعدد بار ہندو پاک کے کتبوں نے اسے شائع کیا ہے۔

کتاب کا تعارف کراتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جو دستہ آگے بڑھا اس کے ہراول میں ہمارے دوست مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی (متع اللہ المسلمین بطول بقاءہ) کا نام نامی ہے جن کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے۔

۔۔۔زیر نظر مجموعہ بھی موصوف کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے زمانہ کی ذہنیت اور مذاق کا لحاظ رکھ کر علم حدیث کی تعریف، علم حدیث کی اہمیت، اس کی تاریخ اور اس کے تحریری سرمایہ کے آغاز و انجام اور اس کی تدوین پر محققانہ مباحث لکھے ہیں"۔

(تدوین حدیث، تعارف، از علامہ سید سلیمان ندوی، مکتبہ تھانوی، دیوبند ۱۹۸۳)

مولانا گیلانی کی یہ کتاب حسب ذیل چھ نکات پر مشتمل ہے اور انہی نکات کی تفصیل بیان کرتی ہے:

۱۔ حدیث کی حقیقت کیا ہے۔

۲۔ اس علم کی تدوین کب، کس طریقہ سے، کس زمانہ میں شروع ہوئی اور ان طریقوں کا اس علم کے وثوق واعتماد پر کیا اثر مرتب ہوا یا ہو سکتا ہے۔

۳۔ ابتدا سے اس وقت تک اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگوں نے انجام دیں خود ان کی اور ان کے کارناموں کی تفصیل۔

۴۔ اس فن کے متعلق کن جدید تکمیلی کوششوں کی ضرورت باقی ہے۔

۵۔ حدیث کے بعد فن حدیث کے دوسرے متعلقات یعنی فن اسماء الرجال اور اصول حدیث کی حقیقت، ان کی تاریخ، موجودہ حیثیت، ان میں آئندہ ترقی کے امکانات۔

(تدوین حدیث، تعارف: ص ۳)

حدیث اور اس کی تدوین کو سمجھنے کے لیے مصنف نے حسب ذیل تین مقدمات کو سمجھنے کی دعوت دی ہے:

۶۔ واقعات کا یاد رکھنا اتنا دشوار نہیں جتنا کہ اقوال و ملفوظات کا اور حدیث کا اطلاق ملفوظات رسولؐ پر بھی ہوتا ہے اور واقعات رسول پر بھی، اسی لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو اتنی حدیثیں یاد تھیں، تو اس کا مطلب یہی نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ملفوظات اتنی تعداد میں ان کو یاد تھے بلکہ ملفوظات کے ساتھ بڑا حصہ ان حدیثوں میں افعال و تقریرات کا بھی ہوتا ہے۔

۷۔ صحابہ میں بھی بجز معدودے چند حضرات کے جنہیں مکثرین کہتے ہیں زیادہ تر اسی قسم کے حضرات ہیں جن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد کا سو سے متجاوز ہونا بھی مشکل ہے، صحابہ کے بعد متن کے ساتھ سند اور تعدد طرق کو بھی یاد رکھنے کا رواج ہوا۔

۸۔ حفاظت حدیث سے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان میں ہر ایک کی حالت یہ تھی کہ سن لینے کے بعد حدیثیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں، یہ واقعہ کی قطعاً غلط تصویر ہے، عام محدثین کا دستور یہ تھا کہ ایک مجلس میں چند حدیثیں جن کا اوسط پانچ سے دس تک کی حدیثوں کا تھا اپنے شاگردوں کو سکھاتے تھے۔ (تدوین حدیث ص: ۶، ۱۷، ۱۸۱)

اس کتاب میں جہاں حدیث کی حقیقت، حدیث کی حجیت، حدیث کے رواۃ، محدثین کے حافظوں کی قوت، حدیث کی عہد بعہد تدوین و اشاعت سے بحث کی گئی ہے وہاں ذخیرہ احادیث کا تاریخ نویسی کے اصولوں سے بھی موازنہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تاریخ کی کتابوں کے مقابلہ میں حدیث کا اعتبار و استناد کتنا زیادہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

'' ایک طرف آپ کے سامنے تاریخ کا وہ ذخیرہ ہے جس کے ابتدائی راویوں کا حال اگر معلوم بھی ہو سکتا ہے تو ان کی تعداد دو تین سے آگے بہ مشکل متجاوز ہو سکتی ہے اور بے چاری ایک تاریخ کیا بڑے بڑے مذہبی مستندات جن کے بھروسے آج کروڑ ہا انسان ایمانی زندگی بسر کر رہے ہیں زیادہ

قرآن کا بھی یہی حال ہے، خیال تو کیجیے کہاں ایک لوقا، ایک مرقس یا ایک منجے گاڑی بان کا بیان اور کہاں یہ ایک لاکھ سے اوپر چشم دید گواہوں کی شہادتیں، پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ عام تاریخی واقعات جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، پراگندہ اور منتشر کثرتوں کا مجموعہ ہے اور ان بکھری ہوئی کثرتوں کے سمیٹنے والے صرف ایک وہ ہیں۔ ادھر ایک شخص ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور ان کی تچی اور ہو بہو جیسے کہ وہ تھے، تصویر اتارنے کے لیے اردگرد لاکھوں زندہ آنکھوں کے کیمرے قدرت کی جانب سے کھڑے کیے گئے ہیں: چہ نسبت خاک را با عالم پاک

(تدوین حدیث: ص ۲۵-۳۰)

تدوین حدیث میں ایک بحث'' تدوین حدیث کا ماحول اور مسئلہ غلامی کی حقیقت '' کے عنوان سے ملتی ہے، اس حصہ میں مولانا نے مسئلہ غلامی کے حوالہ سے اسلام پر اٹھائے گئے مغرب کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر بڑی قیمتی بحث کی ہے، مولانا نے مثالوں اور حوالوں کے ساتھ لکھا ہے کہ غلاموں کی ترقی کے لیے اسلام نے کیا کارنامہ انجام دیا اور اسلام میں علم وتمدن اور اخوت ومساوات کا ماحول پاکر غلاموں نے کیا علمی کارنامے انجام دیئے اور اسلامی دنیا نے ان کو کتنی قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ مولانا نے ان محدثین کے کارناموں کی ایک جھلک بھی دکھائی ہے جو ممالیک تھے اور پھر انصاف پسند اہل نظر سے یہ سوال کیا ہے:

جاننے والے جانتے ہیں کہ انسانیت کے اس مظلوم حصہ کو پکڑ پکڑ کر ان بلند ترین زینوں تک اسلام نے خود پہونچایا ہے جن پر آزاد مسلمانوں کی رسائی بھی اپنے عہد اقبال وعروج میں آسان نہ تھی۔ مسلمانوں کی سیاسی اور علمی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے انہی سے پوچھتا ہوں کہ مادی اور سیاسی راہوں میں بادشاہت فرماں روائی تک اور علمی ودینی راہوں میں امامت وپیشوائی تک پہونچنے والے غلاموں کی اسلام میں کیا کوئی کمی ہے؟'' (ایضاً ص ۱۱۷)

اس کتاب میں سب سے اہم بحث حدیث متواتر اور خبر آحاد سے متعلق ہے، خبر متواتر کے نام سے احادیث کے ذخیرہ میں جو روایات ملتی ہیں ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے، علامہ سیوطی نے

"الأزهار المتناثرة في الأحاديث المتواترة" میں ان احادیث کو جمع کر دیا ہے، مگر مولانا گیلانی نے تدوین حدیث میں تواتر علمی اور معنوی کو سامنے رکھ کر حدیث کے بڑے ذخیرہ کو متواتر قرار دیا ہے۔ اصول حدیث کے ضمن میں یہ ایک قیمتی بحث ہے جو مولانا گیلانی نے اٹھائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

'' اسی بنیاد پر کل کے متعلق تو نہیں لیکن تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرہ کے ایک بڑے حصہ کو میں متواتر خیال کرتا ہوں، یعنی بغیر کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسل لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑہا انسانوں کے ذریعہ سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہونچا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک پہونچتا رہے گا، ان کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کے لیے صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ امت اسلامیہ کے تمام فرقے جن مسائل پر متفق ہیں، تقریباً سب کا یہی حال ہے، عقائد و ایمانیات کے سوا طہارت، غسل، وضو، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، معاملات، عقوبات، سیاسیات، مباحات و محظورات وغیرہ وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقے کے مسلمانوں میں طبقۃً بعد طبقۃٍ خلفاً عن سلف تواتر کے ساتھ اس حیثیت سے مسلم ہیں کہ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور طرز عمل تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی''۔ (تدوین حدیث ص: ۳۵)

تواتر معنوی کی یہ بحث مولانا گیلانی کے استاذ علامہ انور شاہ کشمیری کی تحقیق پر مبنی ہے، چنانچہ مولانا گیلانی نے علامہ انور شاہ کشمیری کے درس مسلم شریف کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' اس وقت تک میرا تاثر تھا کہ قرآن کے سوا بجز گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی امر کا انتساب نہیں کیا جاسکتا، گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی اور یقین کی قوت سے محروم ہے، لیکن یہ پہلا دن تھا جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا تواتر طبقہ، تواتر عمل، تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سنا، سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس کے تواتر کا دعویٰ عام کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ صرف اسناد والے تواتر کی حد تک ہے، ورنہ دین کا بہت بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ اور تواتر عمل و تواتر قدر مشترک کی راہ سے منتقل ہو کر مسلمانوں کی

پچھلی نسلوں سے پہونچا ہے اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے جو قوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے۔

یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیادی نظام میرے لیے یقینی قطعی ہوگیا اور جیسے جیسے تمیز اور شعور میں سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہوتا چلا گیا، خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا، مسلمانوں کے دینی اختلافات کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا"۔

(حیات انور، مرتبہ سید محمد از ہر شاہ قیصر ص:۶۰،۵۹، دیو بند ۱۹۷۷ء)

کتاب کی خوبی یہ ہے کہ حدیث کی تاریخ اور تدوین، محدثین کی خدمات اور کارناموں کی جزوی تفصیل کا بھی مختلف مباحث کے ضمن میں احاطہ کیا گیا ہے جس سے قاری کو نہ صرف تدوین حدیث پر وسیع معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ متعلقات حدیث پر بھی گراں قدر معلومات کے موتی وہ چن لیتا ہے، مولانا گیلانی کا اسلوب یہ ہے کہ وہ اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے قدیم وجدید دلائل اور مثالوں کو جمع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور بات سے بات، معلوم سے معلومات کا دریچہ اس طرح کھولتے ہیں کہ ناقد اگر چہ اس پر اطناب کا اطلاق کرسکتا ہے مگر قاری کو تو غیر مترقبہ نعمت ہاتھ آجاتی ہے اور یہ مولانا گیلانی کے وسعت نظر اور کثرت مطالعہ کا حاصل ہے۔

درس مسلم شریف:

تدوین حدیث کے علاوہ مولانا گیلانی نے درس مسلم بھی مرتب کیا تھا، طالب علمی کے ایام میں وہ علامہ انور شاہ کشمیری کا درس مسلم شریف اردو میں سماعت کرتے تھے اور اسے عربی میں لکھ لیا کرتے تھے، علامہ کشمیری کے دروس کا جو مجموعہ مولانا گیلانی نے تیار کیا تھا، ان کے دو ساتھیوں نے اس کی نقل بھی کی تھی، جن میں سے ایک بخارا کے ملا عبدالحکیم تھے اور دوسرے دربھنگہ کے مولانا عبدالرحیم، مولانا گیلانی نے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ دروس کا یہ مجموعہ ضائع ہوگیا۔ وہ لکھتے ہیں:

" الامام الکشمیر ی کے صف فعال میں شریک ہوجانے کا اثر تھا کہ روزانہ تین تین چار چار

ورق بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ برجستہ قلم عربی میں ان کی تقریروں کو لکھ لیا کرتا تھا، اس کا افسوس ہے کہ قلم کرنے والوں نے مجھ پر ظلم کیا اور زندگی کے اس مسودہ کو جو جان سے بھی زیادہ عزیز تھا کسی صاحب نے اس سے مجھے محروم کر دیا، جب اس کا خیال آتا ہے تو بے ساختہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ کا مشہور شعر (یاد آتا ہے)

آنچہ از من گم شدے
ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

میرے پاس زمانہ تک کئی سو صفحات کی تقریر موجود تھی، جلد بند ہوائی گئی تھی، حضر سفر میں ساتھ رہتی تھی، اچانک ایک دن تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی نے اڑا لی"۔ (حیات انور ص: ۶۴ ملخصاً)

راقم کو دیو بند کے ایک فاضل نے بتایا تھا کہ وہ مسودہ غائب نہیں ہوا بلکہ جس وقت علامہ شبیر احمد عثمانی مسلم کی شرح فتح الملہم کے نام سے لکھ رہے تھے اس وقت مولانا گیلانی سے اس مسودہ کو دیکھنے کے لیے طلب کیا تھا، مولانا نے ان کے حوالہ کر دیا، فتح الملہم کی بنیاد علامہ شبیر احمد عثمانی نے علامہ کشمیری کے انہی نکات پر اٹھائی، مولانا گیلانی کو غالباً یاد نہیں رہا کہ وہ بیاض اپنے استاذ کے حوالہ کر چکے ہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ:

اس کتاب میں مصنف نے شیدائے رسول مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبول اسلام، شرف صحابیت، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور وابستگی، حضور کی خصوصی ہدایت، احادیث کی روایت، بعض خاص فکر اور طرز زندگی کے اہم گوشوں کو جذب وکیف اور تاریخی وتحقیقی حوالوں کے ساتھ اس طرح منور کیا ہے کہ یہ کتاب صرف ایک صحابیؓ رسول کی سوانح حیات نہیں بلکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم زہد وقناعت کی ایک مجسم تصویر بن کر ہمارے سامنے آتی ہے اور قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

سیرت نگاروں اور محدثوں نے حضرت ابوذر غفاری کے حوالہ سے ایک اہم مسئلہ مال ودولت کو جمع کرنے والوں پر ان کی شدید تنقید کا اٹھایا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے مابین جو مکالمہ ہوا تھا اس نے شدت اختیار کی اور خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان غنیؓ نے ان کو مقام ربذہ میں قیام کرنے کا مشورہ دیا، مولانا گیلانی نے ازسرنو اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور حافظ ابن حجر، حافظ ابن عبدالبر، قاضی عیاض اور دیگر محدثین کی اس تحقیق سے اختلاف کیا ہے کہ حضرت ابوذر مطلق دولت جمع کرنے کو حرام سمجھتے تھے، ان محدثین کے استشہاد اور آراء کا تتبع کرنے کے بعد مولانا گیلانی نے حضرت غفاریؓ کے موقف کی توضیح اور توجیہ معقول اور مدلل طریقہ سے کی ہے، کتب حدیث میں حضرت ابو ذر غفاریؓ کی سند سے جو احادیث مروی ہیں مولانا گیلانی نے خاص طور سے ان سے استفادہ اور ان کا تجزیہ کیا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ:

'' میرا خیال ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے تھے کہ خصوصیت کے ساتھ نقدی (سونا چاندی) جمع کرنے کی چیز نہیں، علاوہ ان نقدین کے آپ کسی اور چیز کے جمع کرنے کو منع نہیں فرماتے تھے۔ میرے نزدیک حافظ عمر بن عبدالبر کا کہنا کہ'' کل مال مجموع ''مال کا لفظ جو ہر قسم کے مال پر صادق آتا ہے قابل اصلاح ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ'' کل ذھب وفضۃ'' یعنی ہر قسم کا سونا چاندی، پھر نقدی کے بارے میں بھی آپ کا یہ خیال کبھی نہ تھا کہ حاجت سے اگر زیادہ ہو تو خدا کی راہ میں لٹا دیا جائے، بلکہ خود آپ کے قول وعمل سے عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ آپ کی رائے کیا تھی۔

اگر روپے اشرفیاں حاجت سے زیادہ ہیں تو ان کو فوراً کسی مفید چیز کی صورت میں بدل دو تا کہ مفید جائداد ہو جائے یا روزمرہ کی ضرورتوں میں کام آئے، مثلاً اس سے زمین خرید لی جائے، بکریاں مول لے لی جائیں جن کے بچوں سے دودھ کا فائدہ حاصل ہو، گدھے گدھیاں اونٹ وغیرہ لے لیے جائیں تا کہ بار برداری، سواری میں ان سے آرام ملے، یا پیسے بنا لیے جائیں جو ضرورتوں میں کام آتے رہتے ہیں، اگر یہ چیزیں کسی کے پاس زیادہ ہیں تو پھر وہ اخروی تجارت شروع کردے، یعنی ایک اشرفی کی دس اٹھنیاں قطعاً بنا تا چلا جائے''۔ (حضرت ابوذر غفاری ص: ۱۶۳،۱۶۲)

مولانا گیلانی نے اس توجیہ کو خود حضرت ابوذر غفاریؓ کی زندگی کے اثاثے اور رسول کریمؐ سے روایت کردہ ان کی مرویات سے مؤکد اور مبرہن کیا ہے۔

مولانا گیلانی کی یہ توجیہ دل کو لگتی ہے۔

اسی کتاب میں مولانا گیلانی نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو مقام ربذہ چلے جانے کو جو کہا تھا وہ بطور سزا نہیں جیسا کہ سمجھا جاتا ہے بلکہ بطور مناسبت حال تھا، کیوں کہ حضرت غفاریؓ اس جگہ سے مانوس تھے، چنانچہ جب حضرت عثمان غنیؓ نے ان سے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو مدینہ کے کسی کنارے چلے جاؤ تا کہ قریب رہو، اس پر حضرت ابوذر نے فرمایا: آپ اجازت دیجیے کہ میں ربذہ چلا جاؤں۔

اس طرح مولانا گیلانی نے حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت غفاریؓ دونوں اصحاب کی پوزیشن صاف کر دی ہے۔



مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ
اور
علم حدیث

از: مولانا مسعود احمد الاعظمی - مئو

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ (۱۳۱۹ھ-۱۴۱۲ھ) جملہ اسلامی علوم وفنون میں یکتائے زمانہ اور یگانۂ روزگار تھے، ان کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور متنوع تھی کہ ان کو کسی ایک جہت اور فن کا ماہر اور شناور قرار دے کر دوسرے جوانب وجہات سے اعراض اور صرف نظر نہیں کیا جاسکتا؛ ادب ولغت، فقہ وتفسیر، حدیث وتاریخ اور تذکرہ وتراجم ہوں یا منطق وفلسفہ، ہر ایک میں ان کا تفوق، فضل وکمال اور عبقریت مسلَّم تھی، اور وہ ان تمام علوم وفنون میں ممتاز اور بلند ترین مقام پر فائز اور متمکن تھے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے علمی وسعت وتبحر کو دیکھ کر دنیائے علم دم بخود اور حیرت زدہ تھی: خواہ ہندوستان کے علمی حلقے ہوں، ان کے اساتذہ ومعاصرین ہوں، یا بیرونی اہل علم اور عرب محققین، ان کے فضل وکمال، علمی عظمت اور علو مرتبت کے نہ صرف معترف اور مداح تھے، بلکہ ایک بڑی تعداد ان کے علم وتحقیق کی شیفتہ وگرویدہ تھی، ان پر اعتماد کرتی اور ان سے رہنمائی اور روشنی حاصل کرتی تھی۔

علامہ اعظمیؒ کی ہمہ جہت شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کا اصل میدان اور ان کی حذاقت ومہارت کا اصلی مرکز کیا تھا، البتہ ان کی تحریروں اور علمی کاوشوں کا اگر مطالعہ کیا جائے، تو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم وفن کے ہر شعبے میں یگانہ اور یکتا تھے۔ آپ کی کوئی بھی تحریر اٹھالی جائے، وہ فقہی نکات اور حدیث ورجال کے مباحث سے معمور، اور زبان وادب کی شوخی اور دلکشی سے آراستہ ہوتی ہے، چونکہ اس مجلس مذاکرہ کا موضوع حدیث کی خدمات ہیں، اس لیے اس مناسبت سے اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جسارت کی جارہی ہے، حالانکہ نہ میں اس کا اہل ہوں اور نہ علامہ اعظمیؒ کی شخصیت اور بطور خاص علم حدیث کے سلسلے کی ان کی خدمات ایسی ہیں کہ مجھ جیسا بے بضاعت اور کوتاہ نظر ان کے تعارف کا حق ادا کرسکتا ہے، لیکن ان کی ان خدمات پر لکھنے کے لیے قرعۂ فال اس دیوانے کے نام نکلا ہے، اس لیے نااہلی کے باوجود سطور ذیل میں اپنی بساط کے مطابق کچھ معروضات پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کو علم حدیث کے ساتھ تعلق اور شغف اوائل عمری سے رہا ہے، اگر درس وتدریس کے لحاظ سے دیکھا جائے، تو فراغت کے بعد دوسرے ہی سال آپ نے ابوداود شریف کا درس دیا، اور پھر چند برسوں کے بعد بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس شروع کیا، تو بیسیوں سال مسلسل آپ ان دونوں کتابوں کا بیک وقت درس دیتے رہے؛ اور اگر تصنیف وتالیف کی حیثیت سے نگاہ ڈالی جائے، تو ابتدائی دور کی آپ کی کتابوں میں بھی فن حدیث کے اندر مہارت، وقت نظر، بداہت واستحضار اور قوت استدلال کے حیرت انگیز نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں، اس زمانے کے کتب ورسائل یا مضامین ومقالات میں- جن میں سے بیشتر دفاع حنفیت میں سپرد قلم کیے گئے ہیں- نہ صرف محدثانہ بلکہ ناقدانہ رنگ پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے، اور ان تحریروں میں آپ کی شخصیت ایک محدث ہی نہیں بلکہ صاحب بصیرت اور نکتہ رس نقاد کی صورت میں ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

مثلاً: سب سے پہلے آپ کی کتاب "صدر الطشام" کو لیجئے، اس کو فراغت کے ایک سال بعد تصنیف فرمایا تھا، آپ کا سال فراغ ۱۳۲۰ھ ہے، اور اس کا سن تالیف ۱۳۲۱ھ ہے، یہ مولانا عبدالرحمٰن

صاحب مبارک پوریؒ کی مشہور کتاب "تحقیق الکلام" کے جواب میں لکھی گئی ہے، علامہ اعظمیؒ کی یہ کتاب اگرچہ نامکمل ہے، لیکن جتنا حصہ بھی موجود ہے، وہ قابل قدر اور مستحق داد وتحسین ہے، اس کے اندر حنفیہ کے دلائل اور ان کی روایات پر فریق مخالف کے اعتراضات کا جس حسن وخوبی کے ساتھ رد کیا گیا ہے، اور حنفیہ کے دلائل وشواہد کو جس وزن ووقت اور مضبوطی کے ساتھ پیش کر کے روایت ودرایت کے اصول پر جانچ پرکھ کر ان کو ثابت کیا گیا ہے، اس کو دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے عالم کی تحریر ہے، جس نے ابھی ابھی تعلیم سے فراغت حاصل کی ہے۔

اسی طرح آپ نے صرف اننتیس برس کی عمر میں وہ کتاب تصنیف فرمائی، جس کی تحسین و ستائش اپنے وقت کے دو عظیم امام ومحدث اور آپ کے استاذ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور جامع المعقول والمنقول شارح صحیح مسلم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے کی، اور اس کتاب پر اپنی قلبی مسرت اور شادمانی کا اظہار کیا، یہ علامہ اعظمیؒ کی تصنیف "الحاوي لرجال الطحاوي" ہے، جو امام طحاوی کی دو اہم کتابوں "شرح معاني الآثار" اور "شرح مشكل الآثار" کے رجال ورواۃ پر مشتمل ہے۔

اُسی دور میں آپ نے الإتحافات السنية بذكر محدثي الحنفية کے نام سے ایک کتاب لکھنا شروع کیا، یہ کتاب ان اہل علم کے تذکرے کے لیے خاص تھی، جن کو علم حدیث سے تعلق تھا، اور وہ حنفی مسلک پر عمل پیرا تھے، یہ کتاب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی، لیکن جتنا حصہ ضبط تحریر میں آ سکا ہے، وہ فن رجال پر آپ کی گرفت اور وسعت علم کا پتہ دیتا ہے۔

ابتدائی دور کے آپ کے اس سلسلے کے تصنیفی کارناموں میں ایک رسالہ "البضوعة بأسرار البسملة" ہے، اس رسالے میں علامہ اعظمیؒ نے تسمیہ (بسم اللہ) سے متعلق احادیث کو جمع کر کے ایک جزء بنادیا ہے، اور ان روایات کو علم حدیث کے اصول وضوابط پر جانچا اور پرکھا بھی ہے۔

آپ کی اردو تصانیف میں "رکعات تراویح"، "رکعات تراویح مذیل بر انوار مصابیح"، "الأعلام المرفوعة" اور "الأزهار المربوعة" وغیرہ اگرچہ فقہی موضوعات پر تصنیف کی گئی ہیں، لیکن ان کتابوں کے تمام مباحث حدیث اور علم حدیث کے محور پر گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان مسائل

سے متعلق روایات اور ان کے رجال ورواۃ پر علامہ اعظمیؒ نے جس انداز سے بحث وتحیص اور رد وقدح کی ہے، اور ان سے متعلق احادیث وآثار کا سند ومتن کے اعتبار سے جس حذاقت ومہارت کے ساتھ تحلیل وتجزیہ کیا ہے، اردو کے علمی وتحقیقی خزانے میں اس کی مثال شاذ ونادر ملے گی، ان کتابوں کے اندر علامہ اعظمیؒ کی شخصیت نہ صرف بلند پایہ مصنف، بلکہ ایک جلیل القدر وعظیم المرتبت محدث، ماہر نقادفن، اور علم حدیث کے سچے جوہری کی شکل میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہے، ان کتابوں میں موضوع سے متعلق ایک ایک روایت کو لے کر، اس کو روایت ودرایت کے معیار پر جانچ پرکھ کر تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہے، یہ وہ کتابیں ہیں جن کو پڑھ کر قاری علم وفکر کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔

اردو زبان میں آپ کی ایک اہم تصنیف ''تعدیل رجال بخاری'' اگر چہ رد شیعیت میں لکھی گئی ہے، لیکن اس میں رجال ورواۃ پر جو بصیرت آمیز تبصرہ ہے، اور علم جرح وتعدیل کی اصطلاحات پر جس گہرائی اور دقیقہ رسی کے ساتھ بحث وگفتگو کی ہے، وہ فن حدیث کے اندر آپ کی عظمت شان اور علو مرتبت کی واضح اور بین دلیل فراہم کرتی ہے۔

آپ کے کلکِ گہر بار سے اگر یہ کتابیں نہ وجود میں آئی ہوتیں، اور صرف ایک ''نصرۃ الحدیث'' ہی ہوتی، تو حدیث پاک کے ساتھ آپ کی وابستگی وشیفتگی، اور اس علم میں آپ کی قدرت ومہارت کے ثبوت کے لیے کافی ہوتی، جس کے اندر مستشرقین اور بہت سے روشن خیال اور نام نہاد مسلم مصنفین کی طرف سے حدیث کی حجیت اور اس کے درجۂ استناد پر کیے جانے والے اعتراضات کو تارِ عنکبوت کی طرح کم زور اور بالکل بے سرو پا ثابت کر دکھایا ہے، اس کتاب کی مدح وستائش آپ کے شیوخ اور اکابر اہل علم نے کی ہے، اور اس علم میں آپ کے وسعت وتبحر پر داد وتحسین پیش کی ہے۔

''نصرۃ الحدیث'' ہی کا اختصار اور خلاصہ ''مقدمہ معارف الحدیث'' کو سمجھنا چاہئے، اس مبسوط مقدمے میں آپ نے حدیث وسنت کی استنادی حیثیت، اس کی حفاظت وصیانت، اور اس کی حجیت پروانی اور کافی وشافی دلائل پیش کیے ہیں، اور خود قرآن کریم کی آیات بینات سے حدیث شریف

کا حجت اور اسلامی تشریع وقانون سازی کے لیے قرآن کریم کے بعد دوسرا ماخذ ہونا ثابت کیا ہے۔

مستقل کتب ورسائل کے علاوہ، حدیث وعلم حدیث سے متعلق تحریر فرمودہ متعدد مضامین بھی آپ کی یادگار ہیں، اس مختصر وقت میں چونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے صرف ایک مثال پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں، جو اس موقع پر بطور خاص قابل ذکر ہے، اور وہ آپ کا نہایت بیش بہا اور معلومات افزا مضمون ''ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات'' ہے، جو ماہنامہ ''برہان'' کے فروری ۱۹۵۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، یہ مضمون اسی عنوان سے ''برہان'' ہی کے اگست و ستمبر ۱۹۵۳ء کے شماروں میں شائع ہونے والے مولانا ابوسلمہ شفیع احمد کے مضمون پر اضافہ ہے، علامہ اعظمیؒ کے اس مضمون میں علم حدیث پر ہندوستان میں تالیف پانے والی کتابوں کی فہرست ہی نہیں پیش کی گئی ہے، بلکہ اس سے نہایت بیش قیمت معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، اور حدیث کے بہت سے نادر و نایاب مخطوطات کا بھی علم حاصل ہوتا ہے، یہ مضمون علامہ اعظمیؒ کی وسعت معلومات، کثرت مطالعہ، قوت یادداشت اور حیرت انگیز حافظہ کا بہترین نمونہ ہے۔

مذکورہ بالا معروضات بطور تمہید کے حوالۂ قلم کیے گئے ہیں، مقصد تو دراصل حدیث شریف کے ان دواوین اور مجموعوں کا ذکر کرنا ہے، جو مخطوطات کے ذخیروں میں گم ہونے کی وجہ سے ناپید کے حکم میں تھے، اور علامہ اعظمیؒ کی نگاہ التفات اور آپ کی کوشش وکاوش سے اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچے، اور تحقیق وتعلیق سے مزین اور آراستہ ہوکر اشاعت پذیر ہوئے۔

لیکن ان تحقیقی کارناموں کے ذکر سے پہلے ان استدراکات کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے، جو آپ نے کتب حدیث ورجال پر تحریر فرمائے ہیں، اور ان کتابوں پر جابجا بکھرے ہوئے ہیں جو آپ کے زیر مطالعہ رہ چکی ہیں، ان استدراکات کو اگر جمع کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہوسکتی ہے، اس سلسلے میں یہ عرض کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے استدراکات باقاعدہ مرتب کرکے نہیں قلم بند کیے گئے ہیں، بلکہ بیشتر ایسے ہیں کہ دوران مطالعہ جہاں کہیں آپ کو تسامح نظر آیا، آپ نے قلم برداشتہ اور برجستہ ان کو حوالۂ قلم کردیا۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ شہرت کے حامل مسند امام

احمد پر علامہ احمد محمد شاکر کی تحقیق پر آپ کے استدراکات ہیں، جن کو اگر ذکر نہ کیا جائے تو آپ کے علمی وتحقیقی کارناموں کی تفصیل ناقص اور ادھوری رہ جائے گی، آپ کے ان استدراکات کے منظر عام پر آنے کے بعد آپ کی شہرت وناموری اور علم حدیث کے اندر آپ کی ژرف نگاہی کا چرچا عالم عرب اور دنیائے علم کے گوشے گوشے میں پہنچا، اور خود علامہ احمد محمد شاکر ان کو دیکھ کر اس قدر متاثر اور مشکور و مسرور ہوئے کہ ان کے قلم حقیقت رقم پر بے ساختہ أنتم من أعظم العلماء بها في هذا العصر کا جملہ آ گیا، اور ان استدراکات کو نہایت وسعت ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے مسند احمد کی پندرہویں جلد میں شائع کیا۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ آپ نے اپنی توجہات کا مرکز حدیث کے نادر و نایاب مخطوطات کی تحقیق کو بنا دیا، اور اپنی ساری توجہ ان ہی کی نشر و اشاعت پر مرکوز کر دی، آپ نے اس دور میں حدیث پاک کے بہت سے نایاب مجموعوں کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر ان کو سہل الحصول اور قابل استفادہ بنایا، اور جب ان کو اپنے تعلیقات و حواشی کے یاقوت و مرجان سے سجا سنوار اور آراستہ کر کے اہل علم کے سامنے پیش کیا، تو علم حدیث کے اس عظیم الشان اور بیش بہا سرمائے کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، ان کے دل فرط مسرت وانبساط سے لبریز ہو گئے، اور ان کو اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوا۔

انتقاء الترغيب و الترهيب:

علامہ حافظ ابو محمد عبد العظیم بن عبد القوی منذری (متوفی ۶۵۶ھ) کی کتاب "الترغيب والترهيب" اپنے موضوع پر بے نظیر تصنیف ہے، لیکن اس کی ضخامت اور طوالت کی وجہ سے اس سے استفادہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، خواص اور محقق اہل علم ہی اس سے استفادہ اور انتفاع کر سکتے تھے، اس کتاب کی نفع رسانی کو عام کرنے کے لیے امام و محدث حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے اس کا مختصر تیار کیا، جس کے باعث اس سے ان لوگوں کے لیے بھی نفع اٹھانا آسان ہو گیا، جن کے لیے اصل کتاب تک پہنچنا دشوار اور مشکل کام تھا۔

حافظ ابن حجر کی مختصر کے مخطوطات ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے تھے،

علامہ اعظمیؒ کو اس کا ایک مخطوطہ تقریباً ۱۹۳۰ء میں بہرائچ میں مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی کے باقیات میں دریافت ہوا تھا، اسی وقت سے اس کی طباعت کا خیال آپ کے ذہن ودماغ میں جاگزیں ہو گیا، لیکن برسوں اس کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی، پھر حسن اتفاق سے بیس برس کے بعد ۱۹۵۰ء میں اس کا ایک دوسرا نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہوا، اور پھر چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک تیسرے نسخے کا بھی سراغ لگا، جو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں تھا، ان پے درپے دریافتوں نے علامہ اعظمیؒ کی قوت ارادی کو مہمیز لگایا، اور آپ نے اس کتاب کو تصحیح وتحقیق کر کے شائع کرنے کا عزم مصمم کر لیا۔

اپنے ارادے کو روبہ عمل لانے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ دارالعلوم دیوبند کا نسخہ عاریۃً لے کر مالیگاؤں کے ایک صاحب علم وفضل مولانا عبدالحمید نعمانیؒ سے اس کی نقل کرائی، اس نقل کے تیار ہونے کے بعد اپنے شاگرد اور محب صادق ومخلص مولانا عبدالجبار صاحب مئویؒ کو ساتھ لے کر اصل سے اس کا مقابلہ کیا، پھر خود اس نسخے کے شروع اور آخر کے کچھ حصوں کا مقابلہ حافظ منذری کی ترغیب سے کیا، اور باقی حصے کا مقابلہ مولانا عبدالحمید نعمانیؒ اور مالے گاؤں کے ایک دوسرے عالم مولانا محمد عثمان مرحوم سے کرایا۔ اس قدر اہتمام اور جزرسی کے بعد اس کا پہلا اور تصحیح شدہ اڈیشن ۱۳۸۰ھ=۱۹۶۰ء میں علمی پریس مالے گاؤں سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا، ادارہ احیاء المعارف مالے گاؤں کو اس کی نشرواشاعت کا شرف حاصل ہوا۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب پر ایک مختصر اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں کتاب کے موضوع، اس موضوع پر دوسری تصانیف، "الترغیب والترھیب" اور اس کے اس مختصر کی اہمیت، اس کے نسخوں تک رسائی، ان کی حصولیابی اور اس سلسلے میں اپنی جدوجہد پر اجمال کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، پھر اصل کتاب سے پہلے چند سطروں میں حافظ منذری اور ابن حجر عسقلانی کے حالات ارقام فرمائے ہیں۔

اس کتاب میں آپ کی اصل توجہ تصحیح متن پر ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں اپنے تعلیقات

وحواشی میں زیادہ تر نسخوں کے اختلاف کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، اور حواشی کی تطویل وتکثیر سے یکسر گریز کیا ہے، اصل مقصد یہ تھا کہ کتاب کا ایک عمدہ اور صحیح ترین اڈیشن اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔

رسالة "الأوائل":

حدیث کی نشر واشاعت کے سلسلے میں علامہ اعظمیؒ کی ایک اہم خدمت رسالہ "الأوائل" کی طباعت واشاعت ہے، اس کے جامع ومرتب علامہ محدث شیخ سعید بن سنبلؒ ہیں، اس رسالے کو پڑھ کر حدیث کا ذوق رکھنے والے سند واجازت حاصل کرتے ہیں، اس میں حدیث شریف کی ۴۰ سے زائد کتابوں کی ایک ایک حدیث نقل کی گئی، علامہ اعظمیؒ نے اس کی تصحیح کر کے ۱۳۸۲ھ=۱۹۶۲ء میں مطبعۃ ندوۃ العلما لکھنؤ سے طبع کرا کر مکتبۃ الاعظمی مئو سے شائع کیا۔

مسند الحمیدی:

مختصر الترغیب والترہیب کے بعد جو دوسرا تحقیقی کارنامہ منظر عام پر آیا، وہ امام بخاری کے استاذ حافظ حدیث ابوبکر عبداللہ بن زبیر قریشی اسدی حمیدی مکی (متوفی ۲۱۹ھ) کی "المسند" تھی، مسند حمیدی کی اور جو بھی خصوصیات ہوں وہ اپنی جگہ، اس کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ صحاح ستہ سے پہلے کی تصنیف ہے، یہ اور اس جیسی کتابوں کے منظر عام پر آ جانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ منکرین حدیث کا گروہ مصنفین صحاح ستہ پر جو بہتان تراشی کرتا تھا کہ اصحاب صحاح ستہ نے حدیثیں وضع کر کے ذات نبوی (علیہ أفضل التحیات والصلوات والتسلیمات) کی طرف منسوب کر دیا ہے، اور یہ پروپیگنڈا کرتا تھا کہ اس سے پہلے حدیثوں کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا، تو مسند حمیدی جیسی کتاب کی دریافت اور تحقیق واشاعت کے بعد ان دعووں کی حیثیت پر کاہ سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کو اس کتاب کے مخطوطہ کا اولین سراغ دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں ملا، اس کے بعد ہی سے آپ کو اس کے کسی دوسرے نسخے کی تلاش ہوئی، ۱۹۵۸ء کے اواخر میں حیدرآباد کا آپ کا ایک علمی سفر ہوا، وہاں سعیدیہ لائبریری میں اس کا ایک نسخہ آپ کے ہاتھ لگ گیا،

اس دوسرے نسخے کے دستیاب ہوتے ہی اس کتاب کی تحقیق کا ارادہ کرلیا، آپ نے دیو بند اور سعیدیہ کے نسخوں کی مدد سے اس کام کا آغاز کرنا چاہا، اور دیو بندی نسخے کا سعیدیہ کے نسخے سے مقابلے کے لیے حیدر آباد کا ایک اور سفر کیا، اس دفعہ قسمت نے پھر یاوری کی، اور وہاں اس کا ایک تیسرا نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں دریافت ہوا؛ ان تینوں نسخوں کو بنیاد بنا کر آپ نے تحقیقی عمل کا آغاز کردیا، اور شب وروز کی محنت اور عرق ریزی کے بعد مختصری مدت میں اس کی تحقیق وتعلیق کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، پھر جب کتاب طبع ہونے لگی تو اس کا چوتھا نسخہ وصول ہوا، جو مکتبہ ظاہریہ دمشق کا تصویر شدہ نسخہ تھا، آپ نے کام مکمل ہو جانے کی وجہ سے اس کو نظر انداز نہیں کیا، بلکہ تحقیق کی آبرو کو باقی رکھنے اور دیانت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اس نسخے سے بھی حتی الامکان فائدہ اٹھایا، اس سے آپ نے یہ استفادہ کیا کہ جتنا حصہ ابھی طبع نہیں ہوا تھا، اس میں اپنی تعلیقات میں اس کی مدد سے اضافہ کیا، اور جو حصہ طبع ہو چکا تھا، اس کے متعلق کارآمد اور ضروری باتوں کو کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ کے شامل کردیا، اس طرح یہ کتاب اپنی آخری شکل میں چار نسخوں کی مدد سے مکمل ہوئی۔

ان نسخوں کی مدد سے کتاب کی تصحیح ومقابلہ کے علاوہ حدیث شریف کی دیگر مطبوعات کی طرف بھی مراجعت کی، تاکہ مزید تصحیح ہو سکے، اور اگر ان نسخوں میں کوئی نقص یا کمی ہو تو اس کو دور کیا جا سکے، اس کی احادیث کی تخریج کی، اور تخریج کے لیے صحاح ستہ کے حوالوں کا زیادہ اہتمام برتا؛ مزید برآں اگر کسی حدیث میں کوئی اجنبی یا نامانوس لفظ تھا تو اس کی تشریح کی، اور بوقت ضرورت حدیث کے معنی ومفہوم کی بھی توضیح کی۔

ان تصحیحات وتعلیقات کے علاوہ آپ نے اس کی فہرست سازی پر بھی خاص توجہ اور محنت صرف کی، یہ کتاب چونکہ مسانید صحابہؓ پر مشتمل ہے، اس لیے اگر فقہی موضوع کے لحاظ سے اس سے استفادہ کی کوشش کی جائے، تو تلاش کرنے والے کو اس میں مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے، اس مشکل کے حل کے لیے آپ نے ایک فہرست فقہی ابواب کے اعتبار سے مرتب کی، اور مزید سہولت اور آسانی

کے واسطے ایک فہرست اعلام کی بھی تیار کی، علامہ اعظمیؒ نے یہ تمام کاوشیں برداشت کر کے اس کتاب سے استفادہ کو بہت سہل اور آسان کر دیا۔

یہ کتاب دس اجزا اور تقریباً تیرہ سو حدیثوں پر مشتمل ہے، اور حیدرآباد و مالے گاؤں کے مطبعوں سے دو جلدوں میں ۱۳۸۲ھ=۱۹۶۳ء میں چھپ کر مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی ہے۔

کتاب الزهد والرقائق:

یہ کتاب اسلامی لٹریچر کے بیش قیمت قدیم سرمایوں میں سے ایک ہے، اور قدوۃ الانام شیخ الاسلام والمسلمین سرخیل مجاہدین امام عبداللہ بن مبارک مروزی - رحمہ اللہ تعالیٰ - (متوفی ۱۸۱ھ) کی عظیم الشان اور بابرکت یادگار ہے، عبداللہ بن مبارک کی ذات ستودہ صفات، ان کی علو شان اور جلالت قدر و منزلت تعریف و تعارف سے بلند و بالاتر ہے، ان کے بلندیٔ رتبہ کے لیے یہی کافی ہے کہ سفیان بن عیینہؒ جیسے بلند پایہ محدث نے ان کی نسبت فرمایا ہے کہ میں نے صحابۂ کرام اور عبداللہ بن مبارک کے بارے میں غور کیا، تو ان کی فضیلت کے لیے اس کے سوا کوئی اور بات نہیں پائی کہ صحابہ کو آنحضورﷺ کی صحبت نصیب ہوئی اور یہ اس سے محروم رہے، یعنی جہاد، طاعت وعبادت اور علم کی نشر واشاعت وغیرہ جو معمولات صحابہ کرام کے تھے، وہی ابن مبارک کے بھی تھے، البتہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے شرف صحابیت بھی مقدر فرما دیا تھا۔

زہد کے موضوع پر متعدد محدثین نے کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، منجملہ ان کے عبداللہ بن مبارک کی پیش نظر کتاب بھی ہے، اس کتاب کے مخطوط نسخے دنیا کے بعض بعض کتب خانوں میں پائے جاتے تھے، علامہ اعظمیؒ نے نہایت کد و کاوش سے اس کے نسخوں کو فراہم کیا، اس کا پہلا نسخہ قطر سے حاصل ہوا، اس کو سابق حاکم قطر کے والد شیخ علی بن عبداللہ نے ہدیہ کے طور پر عنایت فرمایا تھا، یہ نسخہ قلم کے ذریعہ تیار کیا گیا تھا، اور یہ قلم استنبول کی ایک لائبریری مکتبہ ولی الدین جار اللہ کے نسخے سے تیار کی گئی تھی، ساتویں صدی ہجری سے پہلے یہ قید کتابت میں آیا تھا، اور دس اجزا پر مشتمل تھا، اس کے راوی حسین بن حسن مروزی (متوفی ۲۴۶ھ) ہیں۔

دوسرا نسخہ اسکندریہ کی میونسپل پبلک لائبریری سے حاصل کیا گیا، یہ معہد المخطوطات کی ایک فلم سے تیار کیا گیا تھا، یہ نسخہ نعیم بن حماد کی روایت سے تھا اور حسین مروزی کی روایت والے نسخہ سے بہت مختلف تھا، دونوں نسخوں میں ابواب کی تعداد، ان کے عناوین اور روایات کی تعداد میں بڑا فرق تھا، علامہ اعظمیؒ نے اس اختلاف اور فرق کی وضاحت کا یہ حل نکالا کہ اس نسخے کی ان زائد روایات کو جو حسین مروزی کے نسخے کے ابواب کے تحت آتی تھیں، اپنی تعلیقات میں درج کر دیا، اور جو روایات باقی رہ گئیں، یا جو زائد ابواب تھے، ان کو الگ سے کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ کے شامل کیا، چنانچہ وہ روایات جو نعیم بن حماد کی زیادات سے ہیں ۱۳۲ صفحات میں ۴۳۶ روایات پر مشتمل ہیں۔

یہ نسخہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے، اس کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایسے نسخے سے نقل کیا گیا ہے، جو حافظ ابن عبدالبر کے اصل نسخے سے نقل کیا گیا تھا، اس کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن عبدالبر کے اصل نسخے سے اس کا مقابلہ بھی کیا گیا، جس کے بعد یہ نقل حافظ ابن عبدالبر کی اصل کے مطابق ہوگئی۔

تیسرا نسخہ دمشق کے مکتبہ ظاہریہ سے حاصل کیا گیا، یہ معہد المخطوطات کی ایک فلم سے تیار شدہ ۷۰/اوراق پر مشتمل تھا، اور ۶۰۶ھ کا لکھا ہوا تھا، یہ پوری کتاب الزہد پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک نامکمل اور ناقص نسخہ ہے۔

اس کتاب کی تحقیق وتعلیق کے علاوہ اس سے استفادہ کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اعظمیؒ نے اس کی متعدد فہرستیں تیار کیں، چنانچہ پہلے تو روایتِ مروزی اور زیادات نعیم کی الگ الگ فہرستِ ابواب بنائی، پھر مرفوع احادیث کی ایک فہرست بنائی، اور جس صحابیؓ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، حروف تہجی کی ترتیب پر ان کے نام کے ساتھ جس صفحے پر وہ حدیث آئی ہے اس صفحے کو درج کیا، پھر اسی ترتیب سے ایک فہرست مرسل روایتوں کی بنائی، پھر موقوف اور مقطوع روایات کی ایک ایک فہرست تیار کر کے اس کتاب سے استفادہ کو آسان تر کر دیا۔

ان سب باتوں کے علاوہ اس کتاب کا ایک نہایت اہم اور نمایاں پہلو اس کا مبسوط مقدمہ

ہے، اس میں تقریباً ۱۵ ارصفحات میں زہد کی اہمیت اور اس کی اقسام اور اس موضوع کی تصانیف کا بیان ہے، پھر عبداللہ بن مبارک کی اس کتاب کی قدر و قیمت بیان کرنے کے بعد اس کے راویوں کا تذکرہ ہے، پھر تقریباً ۲۵ صفحات میں امام ابن المبارک کے حالات نہایت جامعیت کے ساتھ اور بڑے ہی پُر مغز انداز میں قلم بند کیے گئے ہیں۔

درحقیقت یہ کتاب تحقیق و تعلیق کا ایک بہترین نمونہ ہے، جو ۱۳۸۵ھ = ۱۹۶۶ء میں علمی پریس مالے گاؤں سے طبع ہو کر مجلس احیاء المعارف مالے گاؤں سے شائع ہوئی۔

السنن لسعید بن منصور:

امام و حافظ ابوعثمان سعید بن منصور بن شعبہ مروزی (متوفی ۲۲۷ھ) کا شمار علم حدیث کے کبار ائمہ و حفاظ میں ہوتا ہے، ان کی عظمت و جلالت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ امام مسلم اور امام ابوداود جیسے اساطین علم حدیث کے شیوخ میں تھے، اور ان لوگوں نے ان سے حدیث سیکھی، پڑھی اور روایت کی، اور بڑے بڑے ناقدین و ماہرین فن نے ان کے حفظ و روایت پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے۔

امام سعید بن منصور صاحب تصنیف محدثین میں تھے، ان کی کتاب "السنن" اہل علم اور محدثین کے طبقے میں مشہور و معروف تھی، اور ان کے لیے ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی تھی، احادیث کی شرح و تخریج کے سلسلے میں جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، ان میں اس کتاب کے بکثرت حوالے آتے ہیں، لیکن اس کے نسخوں کی نایابی کی وجہ سے ایک مدت سے براہ راست اس کی طرف مراجعت کرنا اور اس سے استفادہ کرنا اہل علم کے لیے ممکن نہ تھا، یہاں تک کہ دنیا کے کسی کتب خانے میں اس کے کسی نسخے کی موجودگی کا بھی اب علم نہیں تھا۔

۱۳۸۰ھ میں ترکی کے ایک سفر کے دوران مشہور عالم و محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کو وہاں کے ایک کتب خانے میں اتفاقاً اس کا ایک مخطوطہ ہاتھ آ گیا، ان کو اس کی صرف ایک جلد یعنی جلد ثالث ملی تھی، جو قسم اول و ثانی پر مشتمل تھی، ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مخطوطے کو جوہانسبرگ مولانا محمد میاں سملکی کے پاس بھیجا، مولانا محمد میاں کی نگاہ ایک ہی جگہ پڑی اور انھوں نے علامہ اعظمیؒ کے سامنے اس

کی تحقیق کی تجویز رکھ دی، آپ کا قلب چونکہ خدمت حدیث کے جذبے سے معمور اور سرشار تھا، اس لیے سخت مشغولیت اور عدیم الفرصتی کے باوجود اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا، اس کتاب کی خدمت اس فن میں کمال تبحر اور براعت و امامت کی دلیل ہے، ورنہ کسی ایک مخطوطے کو سامنے رکھ کر اس کی تحقیق اور حاشیہ نگاری کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

یہ کتاب تحقیق وتعلیق کے مراحل سے گزرنے کے بعد ۱۳۸۶ھ = ۱۹۶۷ء اور ۱۳۸۸ھ = ۱۹۶۸ء میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

المصنّف لعبد الرزاق:

علامہ اعظمیؒ کے علمی کارناموں میں سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ امام عبدالرزاق صنعانی کی کتاب "المصنف" کی تحقیق ہے، یہ کتاب اور اس کتاب کی تحقیق دونوں اسلامی تاریخ کا قابل افتخار سرمایہ اور کارنامہ ہیں، مصنف کے نام سے اس سے پہلے اور اس کے بعد متعدد کتابیں مرتب ہوئی ہیں، لیکن اس وقت پائی جانے والی مصنفات میں یہ سب سے قدیم ہے۔

امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی (متوفی ۲۱۱ھ) صاحب تصنیف محدثین وحفاظ میں تھے، ان کی فضیلت اور جلالتِ قدر و منزلت کے لیے یہی کافی ہے کہ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی اور یحییٰ بن معین جیسے محدثین اور ائمہ علم وفن نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے حدیث روایت کی ہے۔

امام عبدالرزاق نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور ومعروف "المصنف" ہے، اس کے اندر احادیث و آثار کا ایک بیش بہا ذخیرہ محفوظ ہے، بلکہ یہ کتاب اپنے مواد، محتویات اور جامعیت کے لحاظ سے اسلام کے عہد زریں کی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے، اور اس دور کے فطری اور سادہ ادب وتمدن کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

مصنف عبدالرزاق کا لوگ محض نام سنتے تھے، یا کتابوں میں اس کا تذکرہ اور حوالہ پڑھتے تھے، یہ کتاب فقہ حنفی کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس میں صحابہؓ وتابعینؒ کے ایسے

اقوال وآثار کا بہت بڑا ذخیرہ سمایا ہوا ہے، جو مسلک امام ابوحنیفہؒ کی تائید وتقویت کرتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دیرینہ خواہش اور تمنا تھی کہ کسی طرح یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ جاتی، بالآخر خداوند قدوس نے ان کے زمرۂ تلامذہ ہی میں سے بعض اہل علم وفکر کو استاذ کی خواہش کی تکمیل کے لیے منتخب فرمالیا، مولانا محمد میاں سملکی مقیم جوہانسبرگ نے اس کے نسخے فراہم کر کے علامہ اعظمیؒ کو اس کی تحقیق وتصحیح کے لیے آمادہ کیا۔

علامہ اعظمیؒ کو مجلس علمی کے واسطے سے اس کا جو نسخہ ملا تھا، وہ ترکی کے مکتبہ مراد ملا سے حاصل کیا گیا تھا، آپ نے اس پر کام کے آغاز سے پہلے اور اس کے بعد جب تک اس کا کام جاری رہا، اس کے نسخوں کے سلسلے میں عالم اسلام کے کتب خانوں سے سلسلہ جنبانی اور خط وکتابت کرتے رہے، یہ کوشش رائگاں نہیں گئی، اور اس کد وکاوش کے نتیجے میں کچھ مزید نسخے بھی آپ کو دستیاب ہو گئے، لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ اس کا کوئی بھی نسخہ کامل نہیں تھا، بعض محض چند جلدوں پر مشتمل تھے، اور بعض صرف چند ابواب اور اوراق پر، ایک مراد ملا کا نسخہ ہی نسبتاً کامل تھا، لیکن یہ بھی نقص سے سالم اور محفوظ نہیں تھا، اس نسخے میں دو مقام پر نقص تھا، ایک تو کتاب کے شروع میں، اور دوسرا مخطوطے کی پانچویں یعنی اصل کی آخری جلد کے شروع میں، جیسا کہ اس نوٹ سے معلوم ہوتا ہے، جو علامہ اعظمیؒ نے کتاب کے شروع میں درج کیا ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مخطوطہ "باب غسل الذراعین" سے شروع ہوتا ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی کتاب جو سنن کے طرز پر تصنیف کی گئی ہو، اس کا آغاز اس قسم کے باب سے نہیں ہوتا ہے۔

دوسرا نقص جو اصل مخطوطے کی پانچویں جلد کے شروع میں ہے، وہ مطبوعہ کتاب کی جلد نمبر ۸ میں واقع ہے، اس کے صفحہ نمبر ۲۹۴ پر حاشیہ نمبر (۲) کے تحت علامہ اعظمیؒ نے تحریر فرمایا ہے: "في هامش الأصل: الجزء الخامس من مصنف عبد الرزاق وبه يتم الكتاب، والنقص من أوله لم يعلم"۔ لیکن اسی صفحے پر اس سے پہلے جو حاشیہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی جلد کے آخر کا بھی کچھ حصہ ساقط

اورگم شدہ ہے، چنانچہ حاشیہ نمبر(۱) کے تحت لکھا ہے: "فقد من الأصل الذي عندنا ورقة او ورقات وكان تمام الحديث المرقم برقم ۵۲۶۳ ا فيما فقد"، یعنی ہمارے پاس جو اصل ہے، اس سے ایک ورق یا چند اوراق غائب ہیں، اور حدیث نمبر ۵۲۶۳ کا باقی حصہ اسی گم شدہ حصے میں تھا۔

اس کتاب کا مخطوطہ پانچ جلدوں میں تھا، علامہ اعظمیؒ کی تحقیق وتعلیق کے بعد پھیل کر گیارہ جلدوں تک پہنچ گیا، یہ کتاب ۲۱ ہزار سے زائد احادیث وآثار پر مشتمل ہے، جس کے قید طباعت میں آ جانے سے احادیث نبویہ اور مصادر شریعت اسلامیہ کا ایک عظیم الشان ذخیرہ دستبرد زمانہ کا شکار ہونے سے محفوظ ہوگیا۔

علامہ اعظمیؒ کو اس کتاب سے بے پناہ دلچسپی تھی، اور اس کی تحقیق وتعلیق میں آپ نے شب و روز ایک کر دیے تھے، برسہا برس کی محنت وجانفشانی اور عرق ریزی کے بعد اس کتاب کو اس قابل بنادیا کہ اہل علم اس سے استفادہ کر سکیں، اور اسی پر بس نہیں، بلکہ اس کے بعد جب یہ کتاب بیروت میں طبع ہونے لگی، تو اس کے پروف پر نظر ثانی اور تصحیح کے لیے بیروت کا دو مرتبہ سفر کیا، اور نہایت صعوبت اور مشقت برداشت کر کے پہلی مرتبہ ۶ رمہینے اور دوسری دفعہ ۲ رمہینے وہاں قیام پذیر رہے، لیکن آٹھ مہینے کی اس غربت کی زندگی کے باوجود طباعت کی رفتار کچھ ایسی رہی کہ آپ بنفس نفیس چند جلدوں سے زائد کے پروف پر نظر ثانی نہ کر سکے۔

اس طرح ۱۳۹۲ھ=۱۹۷۲ء میں اس کا پہلا اڈیشن بیروت سے نہایت عمدہ اور اعلیٰ معیار کے کاغذ پر چھپ کر مجلس علمی سے شائع ہوا۔

اس کتاب کی طباعت کے دوران اور اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ علامہ اعظمیؒ اس کے لیے مقدمہ نہ لکھ سکے، باوجود یکہ مقدمے کا سارا مواد آپ کے ذہن میں موجود تھا، لیکن ان کو صفحۂ قرطاس تک منتقل کرنے کی نوبت نہ آسکی، اس کا قید تحریر میں نہ آنا علمی دنیا کا ایک بہت بڑا خسارہ ہے، کیونکہ آپ کا خیال اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھنے کا تھا۔

المصنف لابن أبي شيبة:

اس کتاب کی تحقیق علامہ اعظمیؒ نے اپنی عمر کے آخر حصے میں کی ہے، لیکن ابھی مصنف عبد الرزاق کا تذکرہ ہوا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مناسبت سے اس کی نسبت بھی کچھ عرض کردیا جائے۔

ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان الواسطی الکوفی کا شمار بھی امام عبدالرزاق، حمیدی اور سعید بن منصور کی طرح بلند رتبہ محدثین وحفاظ اور جامعین حدیث میں ہوتا تھا، یہ امام بخاری، مسلم، ابوداود اور ابن ماجہ وغیرہ کے اساتذہ وشیوخ میں تھے، خصوصاً مسلم اور ابن ماجہ نے ان سے بکثرت حدیثیں روایت کی ہیں، ۲۳۵ھ ابن ابی شیبہ کا سن وفات ہے۔

اس سے اس قدر اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ان کی تصنیف کردہ کتاب بھی صحاح ستہ سے قبل معرض وجود میں آنے والی تصانیف میں ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ ابن ابی شیبہ کی مصنف بھی عبدالرزاق کی مصنف کی طرح قدیم اور ضخیم ہے، بلکہ ضخامت میں مصنف عبدالرزاق سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہ کتاب اگر چہ مطبوع تھی، مگر اس کی تحقیق میں جو توجہ اور کوشش صرف ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں کی گئی تھی، اس ضرورت کے پیش نظر حجاز کے ایک سفر کے دوران مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری مہاجر مکیؒ نے آپ سے مصنف عبدالرزاق کے طرز پر اس کتاب کی تحقیق کی درخواست کی، علامہ اعظمیؒ نے ان کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اپنی پیرانہ سالی، ضعف ومرض اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے لیے خود کو تیار کرلیا۔

اس کتاب کے قلمی نسخے بھی دنیا کے کئی ایک کتب خانوں میں پائے جاتے تھے، آپ نے تلاش وجستجو کر کے اس کے نسخے بہم پہنچائے، ان کے دستیاب ہوجانے کے بعد اس کی تحقیق کا آغاز کیا، اور شب وروز کی محنت کے بعد اس کی تقریباً ۱۲-۱۳ جلدیں اپنی تحقیق سے تیار کردیں، مگر آپ کی حیات میں اس کی چار ہی جلدیں شائع ہوسکیں، باقی جلدیں تشنۂ طبع رہ گئیں۔

المطالب العالیۃ:

مذہب اسلام کی حقانیت اور اسلامی شریعت کے ابدی اور دائمی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ

ہے کہ نہ صرف اس کی کتاب بلکہ اس کے پیغمبر (ﷺ) کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ وکلمات بھی آج چودہ سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اپنی تر وتازہ حالت میں محفوظ ہیں، باوجودیکہ اس طویل مدت میں اس امت پر بہت سارے انقلابات آئے، اسلام اور اس کے نام لیواؤں کو نابود کردینے کی بار بار کوششیں کی گئیں، اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کے تہذیبی ورثے کو خاکستر کردینے اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی، مگر ان تمام کوششوں اور پیہم سازشوں کے باوجود دین اسلام کا علمی وفکری اور تہذیبی وثقافتی سرمایہ پوری تازگی اور تابندگی کے ساتھ زندہ وپائندہ ہے۔

مسلمانوں نے پیغمبر اسلام (ﷺ) کے دہن مبارک سے نکلنے والے الفاظ وکلمات، آپ کی ذات مبارک سے ادا ہونے والے اعمال وافعال، آپ کے ساتھ اور آپ کی حیات مبارکہ میں پیش آنے والے حالات وواقعات کو جس طرح اور جس اہتمام سے محفوظ رکھا ہے، وہ قدرت کا بڑا کرشمہ ہے، اور دنیا کی کوئی بھی قوم اپنے دین وشریعت اور اس کے سرمائے کی حفاظت وصیانت میں اس کا سواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی پیش نہیں کرسکتی، مسلمانوں نے صرف اپنے پیغمبر ہی کے حالات و واقعات اور ان کے اقوال وافعال کی حفاظت نہیں کی، بلکہ پروانہ وار نثار ہونے والے آپ کے صحابہ کرام، اور ان صحابہ کے پیروکاروں اور ان کے بعد کے لوگوں کے اقوال وافعال کو بھی کتابوں کے اوراق وصفحات میں محفوظ کر رکھا ہے۔

علماء اسلام نے رسول اکرم (ﷺ) کی احادیث طیبہ ومبارکہ کی حفاظت کا جس پیمانے پر انتظام وانصرام کیا ہے، دنیا کی دوسری قومیں اس کو دیکھ کر۔خواہ وہ اس کا اظہار کریں یا نہ کریں۔حیرت زدہ اور انگشت بدنداں ہیں، حدیث کے حفاظ وائمہ وعلماء نے اس سرمائے کی حفاظت کے لیے عجیب عجیب اور متنوع طریقے اختیار کیے ہیں، اور اس علم کی اتنی انواع واقسام وضع کی ہیں کہ ان کو حد شمار میں لانا مشکل ہے۔

حفاظت حدیث کے طریقوں میں ایک طریقہ اور منہج زوائد کی تصنیف کا ہے، زوائد سے مراد

وہ کتابیں ہوتی ہیں، جن کے اندران کے مصنفین ان حدیثوں کو جمع کرتے ہیں جو بعض دوسری کتابوں میں نہیں ہوتی ہیں، زوائد پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، یہاں میں ان کتابوں کو ذکر کرنا چاہتا ہوں جو علامہ اعظمیؒ کی تحقیق سے معرض اشاعت میں آئی ہیں۔

ان میں ایک مشہور کتاب المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة ہے، یہ مجموعۂ حدیث حافظ ابن حجر عسقلانی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اس کے اندر حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے آٹھ مسندوں کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے، جو صحاح ستہ اور مسند امام احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، وہ آٹھ مسند جن کی زائد روایتیں لی گئی ہیں یہ ہیں: مسند ابوداود طیالسی، مسند حمیدی، مسند ابن ابی عمر، مسند مسدد بن مسرہد، مسند احمد بن منیع، مسند ابی بکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید اور مسند حارث ابن ابی اسامہ۔ یہ آٹھ کتابیں تو مکمل حافظ ابن حجر کے سامنے تھیں، اس کے علاوہ کچھ خاص روایتیں مسند ابو یعلی کی بھی لیں، اور مسند اسحاق بن راہویہ کے بھی نصف حصے کو سامنے رکھ کر اس سے بھی استفادہ کیا، اور پھر ان تمام احادیث کو فقہی ترتیب پر مرتب کیا۔

یہ کتاب حدیث پاک کا بہت بڑا اور قابل قدر ذخیرہ ہے، اس میں جن کتابوں کی روایتیں لی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر چند سال قبل تک دستیاب نہیں تھیں، اور کئی ایک تو اب بھی ناپید کے درجے میں ہیں، لہٰذا ان کی روایتوں کو انتخاب کر کے جمع کر دینا علم حدیث کی ایک بہت بڑی خدمت اور بہت عظیم الشان علمی و دینی کارنامہ ہے: اور اسی طرح اس کے نسخوں کو فراہم کر کے تصحیح و تعلیق کے بعد اس کو قابل اشاعت بنانا بھی غیر معمولی ہمت و حوصلہ اور فضل و کمال کی بات ہے۔

علامہ اعظمیؒ کو المطالب العالیة کا سب سے پہلا قلمی نسخہ حیدرآباد کے مکتبہ سعیدیہ میں ۱۹۵۸ء کے سفر کے دوران دیکھنے کو ملا، یہ نسخہ کامل نہیں تھا، بلکہ اس کا صرف نصف اول تھا، پھر کئی برس کے بعد علامہ اعظمیؒ کو اتفاقاً اس کے دو نسخے میسر ہو گئے، ان نسخوں کو مدینہ منورہ میں مقیم شیخ سلطان نمنکانی نے ترکی سے تصویر کے ذریعے حاصل کیا تھا، ان میں ایک نسخہ با سند تھا، اور دوسرا نسخہ سند سے عاری تھا، علامہ اعظمیؒ نے اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نسخے کو منتخب کیا جس سے

سند کو حذف کر دیا گیا تھا، مگر اس کا باسند نسخے سے حرفاً حرفاً مقابلہ کیا، اسی طرح ٹھیک اسی نوعیت کی ایک دوسری کتاب امام بوصیری (متوفی ۸۴۰ھ) کی إتحاف السادة المهرة بزوائد المسانيد العشرة سے بھی اس کا مقابلہ کیا، اور اپنی تعلیقات میں ان دونوں کتابوں کی خاص خاص باتوں کو ذکر کر کے المطالب العالیہ کو تین کتابوں کا مجموعہ بنا دیا۔

یہ کتاب کویت کی وزارت اوقاف کی طرف سے ۱۳۹۰ھ = ۱۹۷۰ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

كشف الأستار عن زوائد البزار:

یہ بھی زوائد ہی کے سلسلے کی ایک کتاب ہے، اس کے مصنف حافظ نورالدین علی بن ابی بکر ہیثمی (متوفی ۸۰۷ھ) ہیں، اس میں علامہ ہیثمی نے مسند بزار کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے، جو صحاح ستہ میں مروی نہیں ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کو اس کتاب کا ایک نہایت عمدہ ونفیس وتاریخی نسخہ کسی علمی سفر کے دوران کہیں دستیاب ہو گیا تھا، اس نسخے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ مصنف کی زندگی (۸۰۷ھ) میں لکھا گیا ہے، اس کی نقل سے فارغ ہونے کے بعد مصنف کے سامنے اس کو پڑھا گیا ہے، اس کے بعد یہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے زیر مطالعہ رہا ہے، ان خصوصیات کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ ایک نادرۂ روزگار نسخہ ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس نسخے کو نقل کرایا، پھر اس کی ایک ایک حدیث کو ہیثمی ہی کی ایک دوسری کتاب مجمع الزوائد میں تلاش کروا کر ہیثمی نے اس پر جو کلام کیا ہے، اس کو نقل کرایا۔

اس کی تحقیق وتعلیق سے ۱۳۹۹ھ میں فارغ ہوئے، اور اسی سال جو کہ ۱۹۷۹ء کے مطابق ہے یہ کتاب چار جلدوں میں مؤسسۃ الرسالۃ بیروت سے شائع ہوئی۔

مجمع بحار الأنوار:

ہندوستان کے مشہور محدث اور اکبری دور کے زبردست عالم ملک العلماء محدث وعلامہ محمد

طاہر پٹنی (متوفی ۹۸۶ھ) کی تصنیف "مجمع بحار الأنوار في غرائب التنزيل ولطائف الأخبار" حدیث کے لغات پر ایک شاہکار اور بے نظیر کتاب ہے، یہ کتاب لکھنؤ کے مشہور پریس منشی نول کشور سے چار بار چھپ چکی تھی، حالانکہ ان طباعتوں میں غلطیاں بہت تھیں، اس کے باوجود مطبوع ہونے کی وجہ سے اہل علم کی دسترس میں تھی، پھر آہستہ آہستہ اس کے نسخے ناپید اور نایاب ہوتے گئے، بالآخر علامہ محمد طاہرؒ کے کچھ ہم وطن اور علم دوست حضرات نے- جو حجاز میں مقیم ہیں- اس عظیم علمی سرمائے کے احیاء اور جدید تقاضوں کے مطابق طباعت واشاعت کا خیال ہوا، ان کی خواہش پر علامہ اعظمیؒ نے اپنے تعاون اور رہنمائی سے اس کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرا کے اس کی تصحیح کی، اور اس کو ایڈٹ کر کے از سرنو اشاعت کے قابل بنایا، اسی کے ساتھ اس کے لیے ایک مبسوط مقدمہ بھی سپرد قلم فرمایا، یہ کتاب پانچ جلدوں میں ۱۳۸۷ھ=۱۹۶۷ء سے ۱۳۹۵ھ=۱۹۷۶ء کے دوران مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

فتح المغيث:

ابوالفضل زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی (متوفی ۸۰۶ھ) حدیث کے ایک بڑے امام وحافظ گزرے ہیں، انھوں نے اصول حدیث پر "ألفية" کے نام سے ایک منظوم رسالہ تصنیف فرمایا تھا، اس منظومہ کی شرح نثر میں مشہور محدث حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ لکھی ہے، جو علم حدیث پر بڑی ہی جامع، وقیع اور اہم کتاب خیال کی جاتی ہے، یہ کتاب مطبوعہ اور دستیاب تھی، لیکن کتابت و طباعت کی اغلاط سے پر تھی، علامہ اعظمیؒ کے دل میں اس کا صحیح اور پاکیزہ نسخہ شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور آپ نے اس کے کئی نسخوں کا باہم مقابلہ کر کے ایک صحیح شدہ نسخہ تیار کیا، اور مطبعۃ الاعظمی مئو سے طبع کیا، یہ کتاب تین جلدوں میں تھی، مگر افسوس کہ اس کی ایک ہی جلد آپ کی تصحیح سے زیور طباعت سے آراستہ ہوسکی۔

تلخيص خواتم جامع الأصول:

اس کے مصنف بھی علامہ محمد طاہر پٹنی ہیں، اس کتاب میں اختصار کے ساتھ رواۃ حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، جامع الاصول علامہ ابن الاثیر جزری کی ایک مشہور و معروف کتاب ہے، جس میں انھوں نے صحاح ستہ کی روایات کو جمع کیا ہے، اور اس کے آخر میں ان کتابوں کے راویوں کا تعارف کرایا ہے، علامہ پٹنی نے اس کے اسی حصے کا خلاصہ کیا ہے۔

علامہ اعظمی کو اس کے قلمی نسخے رام پور اور ندوہ کے کتب خانوں میں دریافت ہوئے تھے، پھر آپ نے اس کے ایک دوسرے نسخے کا فوٹو بانکی پور کی لائبریری سے حاصل کر کے اس کو ایڈٹ کیا، ۱۳۹۵ھ میں شیخ عبدالغنی نورولی پٹنی مقیم حجاز کے نفقہ پر مالے گاؤں سے شائع ہوئی۔

کتاب الثقات:

یہ کتاب - جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے - ثقہ راویوں کے تذکرہ و تعارف پر مشتمل ہے، اس کے مصنف ابوحفص عمر بن احمد بن شاہین ہیں، بمبئی کی جامع مسجد کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ حاصل ہوا تھا، آپ نے اس کتاب کو نقل کرا کے اس کو ایڈٹ کر کے قابل اشاعت بنایا، لیکن افسوس کہ اس کی تحقیق پر تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی حلیۂ طباعت سے مزین نہ ہو سکی۔

ان کے علاوہ علم حدیث کے سلسلے میں آپ کی اور بھی بہت سی خدمات ہیں، لیکن اس مختصر وقت میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ان ہی کے تذکرہ و تعارف پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔



مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ

اور

علم حدیث

از: مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

ہندوستان میں علم حدیث:

دین کے مزاج اور اس کے خد وخال کو سمجھنے کیلئے حدیث سب سے بڑا ذریعہ ہے، کتاب الٰہی سے جو بنیادی اصول ہمیں معلوم ہوتے ہیں ان کی تفصیلات اور علمی جزئیات ہمیں حدیث سے ملتی ہیں ،اس لئے یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ماحول کی تشکیل اور اسلامی مزاج سے اس کو ہم آہنگ کرنے میں حدیث کا کردار بنیادی اور اہم ترین ہے۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں جہاں اور جب جب حدیث سے اشتغال رکھا گیا اسلام کی صحیح اور صاف ستھری تصویر دنیا کے سامنے آئی ،اور جن ملکوں میں حدیث سے دوری رہی وہاں بدعات وخرافات کو پنپنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

برصغیر ہندو پاک میں اسلام تو پہلی صدی ہی میں داخل ہو گیا تھا لیکن حدیث سے باقاعدہ اشتغال دسویں صدی ہجری میں گجرات کی سرزمین سے شروع ہوا، جہاں محدث جلیل شیخ علی متقی صاحب کنز العمال[۱]

---

[۱] شیخ علی متقی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علامہ سیوطی کی کتاب "الجامع الکبیر" کو جو حدیث کا بیش

بہا خزانہ ہے از سرنو موضوعاتی ترتیب کے ساتھ "کنز العمال" کے نام سے پیش کیا اس لئے کہنے والے نے خوب کہا کہ علامہ طاہر پٹنی صاحب مجمع بحار الانوار جیسے صاحب فن پیدا ہوئے، شیخ حسام الدین علی متقی نے تو حجاز ہجرت فرمائی اور وہاں افادہ عام فرمایا لیکن ان کے شاگرد علامہ طاہر پٹنی گجرات ہی میں رہے۔ اور اس طرح ہندوستان میں گجرات کو مرکز علم حدیث ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

(تفصیلات کے لئے "الثقافة الاسلامیة فی الہند" میں حدیث کا باب ملاحظہ کیا جائے)

گجرات سے منتقل ہوکر یہ مرکز علمی اس وقت دہلی قرار پایا، جب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے یہاں حدیث کی مسند درس آراستہ کی، اور اس کے ساتھ اس فن میں تصنیف وتالیف کا بیش قیمت سلسلہ شروع کیا، حدیث کی مشہور ومتداول کتاب مشکوٰۃ المصابیح (جسکو صحاح ستہ کا بہترین خلاصہ کہا جا سکتا ہے) کی شیخ نے بڑی خدمت کی، اس کی ایک شرح عربی میں "لمعات التنقیح" کے نام سے لکھی اور فارسی میں "اشعۃ اللمعات" کے نام سے بڑی مفید شرح تحریر فرمائی، پھر مشکوٰۃ پڑھنے والوں کے لئے ضروری مصطلحات حدیث بہت سلیس عربی زبان میں تحریر فرمائے۔

دہلی کو اس وقت پورے ہندوستان ہی نہیں بلکہ باہر کی دنیا میں بھی خاص مقام حاصل ہوا جب شاہان دہلی نے صحاح ستہ کا درس شروع کیا اور ہندوستان میں پہلی مرتبہ اتنے وسیع پیمانہ پر حدیث کی اشاعت کا آغاز ہوا، مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ان کے عالی مرتبت صاحبزادوں بالخصوص حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور ان کے احفاد حضرت شاہ اسحاق صاحب دہلوی، حضرت شاہ یعقوب صاحبؒ کے دروس حدیث کو جو مقبولیت ملی وہ شاید ہی کسی دوسرے کے حصہ میں آئی ہوگی، آج پورے ملک میں جہاں کہیں بھی سلسلہ حدیث قائم ہے وہ ان ہی شاہان دہلی کا فیض ہے۔

مولانا کے خاندان میں حدیث کا ذوق:

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی خاندان قطبی کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو نصیر آباد اور پھر رائے بریلی کے مضافات میں واقع تکیہ کلاں میں مقیم ہے، خاندان قطبی کی یہ شاخ اس اعتبار سے ہمیشہ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) "طلسیوطی منۃ علی العالم ولعلی متقی منۃ علی السیوطی" سیوطی کا ساری دنیا پر احسان ہے اور علی متقی

نے سیوطی پر احسان کیا۔

ممتاز رہی کہ اس میں نامور علماء ومشائخ پیدا ہوتے رہے، فقہ وتصوف سے اشتغال کے باوجود براہ راست کتاب وسنت سے استفادہ اس کا ہمیشہ شعار رہا۔

رائے بریلی میں مقیم خاندان علم اللّٰہی کے متعدد علماء نے اپنے اپنے زمانوں میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خاندان سے کسب فیض کیا، اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت سید شاہ علم اللہ کو بیک واسطہ حضرت مجدد صاحب سے نسبت خلافت تھی، شاہ عبداللہ محدث اکبرآبادیؒ نے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سلسلہ مشائخ میں شامل ہیں حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ سے کسب فیض کیا تھا، اس لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان کو خاندان علم اللّٰہی سے خاص تعلق تھا جس کا اظہار جابجا ان مکاتیب میں ہوا ہے جو اس خاندان کے بزرگوں کے نام لکھے گئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب ممدوح سے سب سے اول استفادہ کرنے والوں میں مولانا محمد واضح محدث، حضرت شاہ ابوسعید صاحبؒ (جد مادری حضرت شہید) اور مولانا محمد نعمان صاحب (عم محترم حضرت شہید) قابل ذکر ہیں، اول الذکر نے خاص طور پر علم حدیث سے اشتغال رکھا، اس لئے محدث ان کے نام کا جزء بن گیا[1] حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے استفادہ کرنے والوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات والا صفات ستاروں میں بدر کامل بن کر چمکی اور ایک عالم کو منور کرگئی لیکن علم حدیث میں جو حضرات نمایاں ہوئے ان میں حضرت شاہ قطب الہدیٰ حسنیؒ کو امتیاز حاصل ہوا، حضرت سید موصوف نے حضرت شاہ صاحب کے افادات حدیث قلمبند فرمائے اور اس کے ساتھ پوری سنن ترمذی، بہت خوشخط تحریر فرمائی، مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اس کو دیکھ کر فرمایا تھا: یہ سنن کا صحیح ترین نسخہ ہے۔

حضرت شاہ قطب الہدیٰ کا کتب خانہ حضرت مولانا سید محمد ظاہر حسنی کو ملا، جو مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی کے نانا ہیں، مولانا محمد ظاہر صاحب کے اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ پورا کتب خانہ مولانا خیالی کے حصہ میں آیا اور انکی وفات کے بعد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کو وراثتاً ملا۔

ا۔ ان حضرات کے حالات اور صفات جاننے کیلئے مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی کتاب "خانوادۂ علم اللہی" دیکھی جائے۔

مولانا کا تاریخی ذوق:

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کے والد مولانا حکیم سید فخرالدین خیالیؒ بڑے مؤرخ وادیب تھے، مولانا کو یہ تاریخی ذوق ورثہ میں ملا تھا، ان کی شاہکار تصنیف "الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام" (۱۔۸) اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے، اس کے علاوہ ہندوستان کی علمی تاریخ کے لئے "الثقافة الإسلامية في الهند" اور جغرافیائی تاریخ کے لئے "الهند في العهد الإسلامي" انہوں نے تصنیف کیں، یہ دونوں کتابیں بھی ان کی تاریخی امانت اور علمی ذکاوت کی کھلی دلیل ہیں، اسلامیان ہند کی تاریخ کا یہ سلسلہ اس باب میں ان کے منفرد مقام کی نشاندہی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ علمی دنیا ان کو ایک تاریخ داں، تاریخ نویس اور تذکرہ نویس کی حیثیت سے جانتی ہے، بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ وہ ایک بلند پایہ اور صاحب ذوق محدث بھی تھے۔

تحصیل علم حدیث:

مولانا نے جس دور میں تعلیم پائی تھی وہ زمانہ معقولات کی چھاپ کا تھا، منطق وفلسفہ، علم کلام، اور دوسرے علوم آلیہ کی خاص اہمیت تھی، براہ راست قرآن مجید کے درس وتدریس کی کوئی گنجائش نہ تھی، البتہ تفسیر جلالین کے چند اجزاء پڑھادئے جاتے تھے، فقہ کی تعلیم اہمیت کے ساتھ دی جاتی تھی، حدیث کی کتابوں کو منتہی درجات کے طلبہ کے لئے خاص کر دیا گیا تھا، اور وہ بھی اس طرح کہ طالب علم اپنے اختیار سے جہاں حدیث پڑھانے والے ملتے وہاں جا کر بعض کتابوں کی سماعت کر لیتا اور اگر خاص ذوق ہوتا تو اس میں درک پیدا کرتا، مولانا کی تعلیم بھی کچھ فرق کے ساتھ اس انداز سے شروع ہوئی، علوم حدیث میں سب سے پہلی کتاب شرح نخبۃ الفکر آپ نے مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے پڑھی، مسلسلات کی اجازت بھی لی اور اجازت کتب حدیث بھی۔

حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ اس وقت مرجع علماء ومشائخ تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے انہوں نے براہ راست استفادہ کیا تھا، اور اجازت حدیث حاصل کی تھی، مولانا

لے تفصیل کیلئے خود مولانا عبدالحی صاحب کی کتاب "ہندوستان میں نصاب درس" ملاحظہ کی جائے۔

عبدالحی حسنیؒ صاحب عنفوان شباب ہی سے حضرت مولانا کے عقیدت مند تھے، اپنے ایک عزیز مولانا حکیم سید اسحاق صاحب کے ہمراہ گنج مرادآباد تشریف لے گئے، مسلسلات کی اجازت لی، اور صحیح بخاری کا ایک حصہ پڑھا، حضرت شاہ صاحب نے مولانا سے بڑی محبت کا برتاؤ کیا اور خلاف معمول خود ہی بیعت بھی فرمالیا، عمومی اجازت حدیث سے سرفراز فرمایا۔

حضرت شاہ فضل رحمن صاحب گنج مرادآبادی کے علاوہ مولانا نے متعدد مشائخ حدیث سے سند حدیث لی، جن میں خاص طور پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قابل ذکر ہیں، مولانا کے یہاں حاضری کی تفصیلات آپ نے اپنے سفرنامہ میں لکھی ہے، جو ارمغان احباب کے نام سے شائع ہوا، اور بعد میں "دہلی اور اس کے اطراف" کے نام سے مقبول ہوا، اسی سفر میں مشہور محدث وفاضل مولانا میاں نذیر صاحبؒ کے درس میں بھی شرکت فرمائی، اور اجازت حدیث لی، میاں صاحب نے سند اجازت پر مزید اعتماد وتوثیق کے لئے یہ کلمات بھی تحریر فرمائے: "فإنه أحق بها وأهلها" کہ اس کے زیادہ حقدار اور اہل ہیں، اسی سفر میں مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی سے بھی اجازت حدیث حاصل ہوئی، موصوف کو مسلسلات کی اجازت براہ راست شاہ اسحاق صاحب سے تھی، ان حضرات کے علاوہ مولانا کو شاہ ابوحسین مار ہروی اور بعض دوسرے مشاہیر علماء ومشائخ سے بھی مسلسلات کی اجازت حاصل ہوئی، لیکن مولانا نے جس ذات سے فن حدیث میں سب سے زیادہ استفادہ کیا وہ شیخ حسین بن محسن انصاری کی ذات والا صفات ہے جو اس وقت ہندوستان کے کبار محدثین کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے اور جن سے سند حدیث لینا بہت باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔

شیخ حسین بن محسن انصاری:

شیخ حسین حضرت سعد بن عبادہؓ کی نسل سے ہیں، ۱۲۲۵ھ میں یمن کے مشہور شہر حدیدہ میں ولادت ہوئی، اپنے زمانے کے کبار علماء سے علم حدیث کی تحصیل کی اور امتیاز حاصل کیا، فراغت

کے بعد حدیدہ کے قریب شہر لحیہ میں منصب قضا تفویض ہوا، چار سال تک اس منصب پر فائز رہے پھر ایک واقعہ کی وجہ سے مستعفی ہو گئے، واقعہ یہ تھا کہ وہاں کے کسی امیر نے بیروں کے تاجروں پر کچھ غلط ٹیکس لگائے اور اس کے جواز کے لئے علماء سے فتویٰ حاصل کرنا چاہا۔ شیخ نے انکار کیا تو ان کو تین دن تک سخت تعذیب میں رکھا گیا لیکن انہوں نے صاف کہا کہ حکم الٰہی کے خلاف میں فیصلہ نہیں دے سکتا خواہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے جائیں، بالآخر انہوں نے استعفیٰ دیا اور وطن کو خیر آباد کہہ کر ہندوستان تشریف لائے، دو سال قیام کے بعد پھر وطن گئے، پانچ سال کے بعد دوبارہ تشریف لائے اور چار سال کے بعد دوبارہ وطن تشریف لے گئے پھر جو آئے تو ہجرت کی نیت سے آئے اور بھوپال میں سکونت اختیار کر لی۔ ؎ بھوپال کے قیام میں شیخ کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، اطراف ہندوستان سے علماء مشائخ آتے اور مستفید ہوتے، حافظہ بڑا قوی تھا، شیخ کے جانشین مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ (شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء) فرماتے تھے کہ فتح الباری تقریباً پوری ان کو حفظ تھی۔

مولانا عبدالحی حسنیؒ نے تعلیم کے سلسلہ میں بھوپال کے دو سفر کئے، پہلا سفر ۱۳۰۱ھ کا ہے اس وقت ان کے والد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ بھوپال میں مقیم تھے اس وقت تک باقاعدہ حدیث کی تعلیم کا آغاز نہیں ہوا تھا، دوسرا سفر ۱۳۰۹ھ کا ہے اس سفر میں مسلسل دو سال آپ نے بھوپال میں قیام کیا۔ اور تحصیل علم حدیث کی تکمیل کی، یہی زمانہ شیخ حسین کی شہرت و مقبولیت کا تھا، مولانا نے شیخ سے پورا فائدہ اٹھایا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

مولانا سید عبدالحی حسنی صاحب نے ان سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، اول سے آخر تک لفظ بلفظ پڑھیں اور خود ان کتابوں کی قرأت کی نیز سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی اور مشکوٰۃ و موطأ کی سماعت کی۔ (حیات عبدالحی: ص ۸۰)

سنن ترمذی کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مولانا کے سامنے سنن کا وہ نسخہ ہوتا تھا جو شاہ قطب الہدیٰ محدث نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے درس کے دوران تحریر فرمایا تھا، اور جس

لے لؤلؤ علام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام، جلد ۸ ص ۱۲۵۔

میں جابجا شیخ کے درسی افادات بھی قلمبند فرمائے تھے۔

شیخ نے اخیر میں آپ کو بڑے اہتمام سے اجازت حدیث دی، حیات عبدالحی میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

اساتذہ اور علماء بھوپال کی ایک خصوصی مجلس میں شیخ صاحب نے آپ کو آخری سبق پڑھایا اور سند فراغت دی، اور تمام علوم میں آپ کو درس و تدریس کی تحریراً وتقریراً اجازت دی، یہ واقعہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء کا ہے[1] شیخ کو اپنے شاگرد سے خصوصی لگاؤ تھا، اگرچہ وہ قلیل التصانیف تھے لیکن مولانا کی فرمائش پر شیخ نے بعض اہم موضوعات پر رسائل تحریر فرمائے، ان رسائل میں ایک رسالہ کے مسجع و مقفی نام میں مولانا کا بھی نام شیخ نے شامل کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رسالہ خاص مولانا کی فرمائش پر تحریر کیا گیا تھا۔

مولانا کی محبت ہی میں شیخ نے لکھنؤ کے کئی سفر کئے اور اپنے محبوب شاگرد کے یہاں ہی قیام فرمایا، خود مولانا نے ''نزھۃ الخواطر'' میں لکھا ہے کہ "یحبنی کحب الآباء للأبناء" وہ مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے جو ایک باپ کو اپنے فرزند سے ہوتی ہے۔

لکھنؤ کے آخری سفر میں مولانا کے فرزند اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ صاحب نے بھی شیخ سے سند لی، اور یہ افادہ و استفادہ کا سلسلہ دونسلوں میں منتقل ہوا، جس کا اختتام شیخ حسین کے حفید سعید شیخ خلیل بن محمد بن حسین پر ہوا، جنہوں نے مولانا عبدالحی حسنی صاحب کے قابل فخر فرزند حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو عربی زبان و ادب کی تعلیم ہی نہ دی بلکہ بقول حضرت مولانا کے عربی زبان گھول کر پلادی۔

مولانا کا حدیث سے اشتغال:

مولانا عبدالحی صاحبؒ کو ایک بلند پایہ مؤرخ اور ادیب کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کی دینی ثقافتی اور جغرافیائی تاریخ لکھ کر

ل ایضاً ص ۱۸ ج الإعلام بمن فی تاریخ الہند من الأعلام ۸/۴۵

ہندوستان کو عالم اسلام میں متعارف کرایا، سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے ایک تقریب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے خود فرمایا کہ "جب میں سفر پر جاتا ہوں تو "نزھۃ الخواطر" ساتھ رکھتا ہوں، جب کوئی ہندوستان میں مسلمانوں کے بارے میں پوچھتا ہے تو اس کو پیش کرتا ہوں" اس کو ہندوستان میں مسلمانوں کی انسائیکلو پیڈیا قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا کو حدیث کا خاص ذوق تھا، اس میں خاندانی اثرات کے علاوہ کبار محدثین سے استفادہ کو دخل تھا بطور خاص شیخ حسین کی صحبت واستفادہ نے اس میں خاص رنگ پیدا کر دیا تھا، شیخ حسین کو "فتح الباری" حفظ تھی، مولانا کو بھی اس کتاب سے بڑا تعلق تھا، اپنی تصنیفات میں انہوں نے اس سے بہت استفادہ کیا، اس کے علاوہ علامہ عینیؒ کی شرح بخاری عمدۃ القاری بھی ان کے مطالعہ میں رہتی تھی، لیکن امام نووی کی شرح مسلم کے بارے میں ان کی رائے بہت بلند تھی، مولانا کی کتابوں میں جابجا اس کے حوالے نظر آتے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کی محبوب کتابوں میں سے ہے۔

مولانا کو تدریس کا موقع بہت کم ملا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض طلبہ نے اپنے طور پر مولانا سے کچھ استفادہ کیا، جن میں علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی ہیں، مولانا کا اصل خاندانی مزاج تصنیف وتالیف کا تھا، تاریخ وادب پر ان کی شاہکار کتابیں ہیں، لیکن حدیث وفقہ پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا اور جو لکھا خوب لکھا، ان تصنیفات سے ان کا توازن فکر، علمی پختگی، گہرائی اور مسلکی اعتدال صاف ظاہر ہوتا ہے، اگر چہ مولانا فقہ حنفی پر عامل تھے لیکن بعض مسائل میں مولانا نے علمی اختلاف بھی کیا، کتاب وسنت سے براہ راست استفادہ مولانا کا طریقہ تھا، حدیث کے موضوع پر مولانا کی تصنیفات سے مولانا کا یہ امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔

فن حدیث پر مولانا کی تصنیفات:

چوں کہ مولانا کا اصل موضوع تاریخ ہے اس لئے فن حدیث پر مولانا کی چندہی تصنیفات

ہیں، لیکن جو ہیں ان سے مولانا کا ذوق حدیث اور علمی پختگی ظاہر ہوتی ہے، بظاہر اسکی وجہ یہ ہے کہ مولانا کو طالب علمی کے زمانے سے اس فن سے خاص مناسبت تھی، یہی مناسبت حدیث انکو کشاں کشاں بھوپال لے گئی اور شیخ حسین کے درس میں پہونچایا، شیخ کو بھی مولانا کے اس شوق کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے خاص توجہ دی، یہیں سے مولانا کے اس ذوق کو جلا ملی لیکن دار العلوم ندوۃ العلماء کی انتظامی مصروفیات، اس کے سالانہ جلسوں کی تیاری، اس کے لئے طویل اسفار اور مطب کی مصروفیت کی وجہ سے ان کو تصنیف وتالیف کا زیادہ موقع نہیں مل سکا، لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ ان ساری مصروفیات کے باوجود انہوں نے اسلامیان ہند کی پوری تاریخ لکھ ڈالی، اور وہ بھی سلیس عربی زبان میں جس کا اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسا نمونہ بھی نہ تھا، تاہم ان ساری مصروفیات کے باوجود مولانا کو خدمت حدیث کا ہمیشہ احساس رہا، اخیر سالوں میں جب کہ ''نزھۃ الخواطر'' کا کام پوری طرح سے مکمل بھی نہیں ہوا تھا مولانا نے حدیث کو موضوع بنایا اور یہ نیت کر لی کہ بقیہ مدت اسی مبارک موضوع کی خدمت میں صرف کریں گے، اس کے لئے مولانا نے اپنے آبائی وطن تکیہ رائے بریلی میں اپنے مکان کے سامنے ایک وسیع کمرہ بھی اسی نیت سے تعمیر کرایا تھا کہ وہ ادارہ مصروفیات سے سبکدوش ہو کر درس حدیث اور اس موضوع پر تصنیف وتالیف کے لئے یکسوئی اختیار فرمائیں گے، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور اس کی نوبت نہ آسکی۔

حدیث کے موضوع پر مولانا کی تصنیفات کے دو دور ہیں، ایک بالکل ابتدائی دور ہے دوسرا بالکل انتہائی دور ہے، کہا جا سکتا ہے کہ آغاز بھی مبارک فن سے ہوا اور اختتام بھی مبارک فن پر ہوا۔

ابتدائی دور کی یادگار وہ حواشی اور تعلیقات ہیں جو مولانا نے شیخ حسین کے درسی افادات کے طور پر تحریر فرمائے، یہ افادات سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد پر مختصر حواشی کی شکل میں ہیں، جلد اول میں کچھ زیادہ ہیں اور جلد دوم میں بہت کم۔

آخری دور میں جو ان کی زندگی کے بھی آخری ایام ثابت ہوئے ان کی سب سے بڑی یادگار احادیث کا وہ انتخاب ہے جو انہوں نے ''تلخیص الاخبار'' کے نام سے کیا، انکی وفات کے بہت بعد یہ

۱؎ عربی زبان وادب کے ماہر علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی اس کی زبان کے معترف تھے۔

کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر وتوجہ سے ''تہذیب الأخلاق'' کے نام سے شائع ہوئی، اور اس کو بہت مقبولیت ملی۔

تہذیب الأخلاق کی خصوصیات:

اس کتاب کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں، پہلی خصوصیت ابواب کی جامعیت اور ان کا حسن ترتیب ہے، مولانا کی کوشش یہ ہے کہ دین کے شعبوں میں سے کوئی ایسا اہم شعبہ نہ رہ جائے، جس کے لئے کوئی باب قائم نہ کیا گیا ہو، یہ کل پینتالیس (۴۵) ابواب ہیں لیکن کوئی اہم شعبہ چھوٹنے نہیں پایا ہے، بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ترتیب میں واقعیت کا لحاظ رکھا گیا ہے، سب سے پہلے عقائد کے ابواب ہیں درمیان میں اخلاق وآداب سے متعلق ابواب قائم کے گئے ہیں اور آخر میں احکامات کے ابواب ہیں۔

دوسری اہم خصوصیت اس کتاب کی حدیث کے انتخاب سے تعلق رکھتی ہے، مولانا نے سہل اور مختصر احادیث کا انتخاب فرمایا تاکہ مبتدی طلبہ، حدیث کو فہم میں زیادہ دشواری نہ ہو اور حدیث سے مناسبت پیدا ہو جائے، کتاب کی مقبولیت کی بات ہے کہ ہندوستان کے علاوہ عالم عربی سے اس کے کئی ایڈیشن نکلے اور کئی جگہ کتاب داخل نصاب کی گئی، حدیث نبوی ﷺ کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی منظر عام پر آیا اور اسکی شروحات بھی لکھی گئیں، ایک مختصر اور جامع شرح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ حدیث مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی صاحب نے روائع الاعلاق کے نام سے لکھی جو ساڑھے آٹھ سو صفحات میں شائع ہوئی، دوسرا کام شیخ عبد القادر وقیع اللہ احمد صاحب نے کیا، احادیث کی تخریج اور ضروری تعلیقات کے ساتھ یہ کتاب عالم عربی سے شائع ہوئی، اس کے علاوہ بھی بعض لوگوں نے اپنے طور پر اس کو تحقیق وتخریج کے ساتھ شائع کیا۔

شرح تہذیب الأخلاق:

لیکن کتاب کا متن تیار کرنے کے بعد خود مصنف کتاب نے بھی اس کی بڑی مفید اور قیمتی شرح لکھی تھی جس کا نام "منتہی الافکار فی شرح تخلیص الاخبار" ہے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ مولانا کی تقریباً تمام تصنیفات مولانا کی وفات کے بعد ہی شائع ہوئیں، اس طرح یہ بھی ان کے ان مسو دات میں دبی رہ گئی، اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہوئی کہ متعدد احادیث کی شرح اس میں نا تمام رہ گئی تھی ، اور کئی جگہ دیمک نے اس کو اس طرح چاٹ لیا تھا کہ پڑھنا مشکل تھا، لیکن حضرت مولانا کی توجہ سے اس کو بھی الحمد للہ اشاعت کے قابل بنا دیا گیا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ جلد ہی یہ کتاب بھی شائع ہو جائے گی۔

اس شرح کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فتح الباری اور شرح مسلم للنووی سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے، اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر اہم مراجع کے حوالوں سے ایسے اہم مضامین آ گئے ہیں جن سے بعض اہم مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

توحید کے موضوع پر مولانا نے خوب لکھا ہے اگر وہ حصہ الگ کر دیا جائے تو وہ مستقل ایک رسالہ ہے، اس کے علاوہ صحابہ اور اہل بیت سے محبت پر بھی بہت فاضلانہ کلام ہے، یہ شرح اساتذہ حدیث کے لئے خاص طور پر بہت مفید ہے، تہذیب الاخلاق کے نام کی مناسبت سے حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ العالی کے مشورہ سے اس کا نام تنویر الآفاق تجویز کیا گیا ہے۔

الغناء فی الاسلام:

تہذیب الاخلاق کی شرح لکھتے ہوئے جب حضرت ربیع کی غناء سے متعلق روایت آئی تو مصنف نے اس کی شرح میں قدرے بسط سے کام لیا، پھر اس کو الگ کر کے مزید تفصیلات شامل کیں، اس طرح وہ اس موضوع پر بڑی فاضلانہ محققانہ اور منصفانہ کتاب بن گئی، اس کتاب سے خاص طور پر مولانا کا ذوق حدیث اور تفقہ سامنے آتا ہے، اس میں مولانا نے آلات مزامیر کا بھی تعارف کرایا ہے، اس طرح بقول حضرت مولانا کے اس موضوع پر جامع ترین کتاب بن گئی ہے، یہ کتاب شائع ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس گنہگار کو اس کی کچھ خدمت کا موقع ملا ہے۔

ربن کے موضوع پر بھی مولانا نے قدرے تفصیل سے کلام کیا تھا مگر وہ صرف چند صفحات ہیں اور وہ بھی ناتمام اس لئے اس کی اشاعت نہ ہوسکی۔

یہ حدیث کے موضوع پر مولانا کی چند تصنیفات ہیں جو زیادہ تر اخیر دور کی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مولانا نے اخیر میں حدیث ہی کو خاص موضوع کے طور پر اختیار کر لیا تھا اور طے فرمایا تھا کہ تمام مصروفیات سے فارغ ہو کر وطن میں درس حدیث کی بنیاد ڈالیں گے اور اس موضوع پر تصنیف وتالیف میں مشغول رہ کر عمر بسر کر دیں گے، لیکن مولانا کی عمر نے وفا نہ کی اس لئے وہ براہ راست تو ارادہ پورا نہ کر سکے لیکن ان کے قابل فخر فرزند حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس جگہ کو جس کو مولانا نے درس حدیث کے لئے خاص کیا تھا، اپنی دعوت وفکر کا مرکز بنایا، اور دسیوں مرتبہ اس کمرہ میں فارغین ندوۃ العلماء سے اوائل حدیث سن کر اجازت حدیث دی، اس طرح اللہ تعالیٰ نے مولانا کی خواہش پوری کی، یقیناً اس سے ان کی روح کو شادمانی حاصل ہوئی ہوگی، بے شک اللہ تعالیٰ مخلصین کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔

إن الله لا يضيع أجر المحسنين .



حضرت مولانا ابوسلمہ شفیع احمدؒ

اور

علم حدیث میں ان کی خدمات

از: مولانا غلام محمد وستانوی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (المتوفی ۱۹۹۹ء) ''فن اسماء الرجال'' تالیف ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کے مقدمہ میں امت مسلمہ کے بے نظیر معجزانہ علمی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

'' حکمت الٰہی کی یہ عجیب کارفرمائی ہے کہ ایک نبی امی کو ایک ایسی امت عطا ہوئی جس نے جدید علوم کی وضع و تدوین کا ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی مثال گذشتہ تاریخ اور سابقہ امتوں میں نہیں مل سکتی، اس نے تصنیف و تالیف کے میدان میں گذشتہ اقوام اور ملتوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور اتنا بڑا علمی ذخیرہ اور اتنا عظیم اور وسیع کتب خانہ اس کی محنتوں سے وجود میں آیا جس کا سرسری جائزہ لینا بھی آسان نہیں، جس نبی کو قرآن مجید میں ''امی'' کے لقب سے کئی بار یاد کیا گیا اور جس کے متعلق یہ صراحت کی گئی، وَمَا كُنتَ تَتْلُو

مِن قَبْلِهٖ مِن كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ (عنکبوت ۴۸) اے نبی! آپ اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔

اسی کو ایسی امت عطا ہونا جو اپنے علمی شغف وانہماک اور علم سے عشق اور اپنی بلند ہمتی اور خدمت علم میں اپنے ایثار وقربانی میں بے نظیر ہو ، محض اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ قدرت الٰہی کا ایک بڑا معجزہ ہے"(۱)

مولانا ابوسلمہ شفیع احمدؒ (المتوفی ۱۹۸۵ء) اسی زرخیز امت کے گل سرسبد ہیں ، جو مومنانہ زبان، عالمانہ شان، مفکرانہ خیال، مجاہدانہ عمل، منکسرانہ مزاج، درویشانہ زندگی ، ہمہ تانہ طور طریق اور دین وشریعت سے گہری وابستگی رکھتے تھے ، صلہ کی تمنا اور مدح وستائش سے بے نیاز رہ کر علم وتحقیق، درس وتدریس اور دعوت واصلاح میں قابل رشک انہماک کے ساتھ پوری زندگی گذار دینے والے مولانا اپنے علمی ودینی خدمت ، نیک نفسی تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف ، ارشاد وتبلیغ اور بے شمار علمی ودینی کارناموں کی وجہ سے مسلمانان کلکتہ کے دل ودماغ بن گئے تھے، آپ ایک متبحر عالم، مفسر ومحدث، داعی ومصلح اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد کلکتہ میں نماز عیدین کے منصب امامت پر فائز تھے۔ مولانا ضیاء الہدیٰ کہتے ہیں:

"آپ جانباز مجاہد تھے، اور اسلامی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، آپ قول وعمل کے تضاد سے نابلد تھے، آپ کا ظاہر وباطن ایک تھا، سلف صالحین کے طریق زندگی کو اپنا لیا تھا، زندگی میں بہت سے مواقع آپ کو ایسے ملے کہ دنیا تعمیر کر سکتے تھے مگر دین کو دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے امام رازی اور غزالی کی طرح دنیا کو خیر آباد کہا"(۲)

تقویٰ وللہیت ، زہد واستغناء اور حق گوئی کے نعمت سے سرفراز تھے، یہی اوصاف تھے کہ وہ

لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے اور ان کی نگاہوں میں رچ بس گئے، مولانا ذبیح الرحمٰن عتیق کہتے ہیں:

''وہ مقبولیت کے جس اعلیٰ منصب پر فائز تھے، اگر نفس کی پیروی کرتے تو بلاشبہ ثروت ان کے قدموں کو چومتی''(۳)

پروفیسر مسعود حسن مرحوم فرماتے ہیں:

''مولانا علم و عمل اور وضع و اخلاق میں علمائے سلف کی یادگار تھے، وہی زہد و تقویٰ، وہی فقر و استغناء، وہی عبادت و ریاضت، وہی جوش عمل، وہی اللہ کی خشیت اور وہی ہر کام میں للہیت جو ان بزرگوں کی خصوصیات تھیں، مولانا کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھیں''(۴)

فروغ ذات سے روشن چراغ علم و عرفاں تھے
ابو سلمہ شفیع احمدؒ وقار دین و ایماں تھے

مولانا کی ولادت دسمبر ۱۹۱۲ء میں بہار کے نالندہ ضلع میں ہوئی، ابتدائی تعلیم بہار شریف کے ''مدرسہ قومیہ'' اور ''مدرسہ عزیزیہ'' میں حاصل کی پھر شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخل ہوئے، ایک سال دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تعلیم کی تکمیل کی، اور وہیں سے ۱۹۳۶ء میں فراغت ہوئی، مولانا کے مشہور اساتذہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی عتیق الرحمٰنؒ اور مولانا ابو عبداللہ سورتی تھے، مدرسہ عزیزیہ میں مولانا کے دوستوں میں مولانا مسعود عالم ندوی تھے جو اسی مدرسہ میں زیر تعلیم تھے اور یہیں سے ان دونوں کے درمیان گہرے تعلقات استوار ہوئے جو اخیر وقت تک قائم رہے۔

آپ کی محبوب شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا ابوالمحاسن سجادؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کا نام نامی آتا ہے۔

مولانا نے اپنی عملی زندگی میں حضرت مجدد الف ثانی کی سیرت و طریقہ کار کو چراغ راہ بنایا تھا،

آپ نے مکتوبات امام ربانی کا بالاستیعاب اور غائر مطالعہ کیا تھا، ان کی تجدید دین اور احیاء اسلام کی مصلحانہ اور مجددانہ جدو جہد کو منظر عام پر لاتے تھے، آپ محسوس کرتے تھے کہ:

''ہندوستان میں کفر و الحاد، زندقہ و ارتداد اور شرک و بدعت کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں کے ہجوم میں اسلامی زندگی کی گم کردہ راہوں کو روشن کرنے میں اور ان پر دینی کامرانی اور ایمانی استقامت کے ساتھ سفر حیات طے کرنے کے لئے حضرت مجدد کی سیرت و تعلیمات کی روشنی کی اشد ضرورت ہے''(۵)

مولانا اپنے وطن کے مدرسہ قومیہ میں ۱۹۴۲ء تک صدر مدرس رہے، ۱۹۴۹ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں شیخ الحدیث والتفسیر کی حیثیت سے تقرر ہوا، یہاں آپ ۱۹۷۲ء تک ایک کامیاب استاد، شفیق مربی، مہربان مدرس، اور لائق و فائق محدث کی حیثیت سے مصروف کار رہے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ۱۹۷۶ء میں آپ نے ادارۂ تالیف و ترجمہ کے نام سے ایک آزاد ادارہ قائم کیا، اس ادارہ نے مولانا کی چند تصنیفات کے علاوہ دوسرے مشاہیر علم کی کتابیں اور مقالات کے مجموعے شائع کئے۔

مولانا خوش بیان اور کہنہ مشق خطیب تھے، قدرت نے آپ کو تقریر دل پذیر، ادبی چاشنی، موسیقانہ دلنوازی، زبان کی طلاقت و سلاست اور اسلوب کی حلاوت و چاشنی اور سادگی عطا کی تھی، مزاج چونکہ داعیانہ اور مصلحانہ تھا اس لئے مسلمانوں کے خفتہ شعور کو بیدار کرتے اور ان کی غیرت کو للکارتے، ان کے شاندار ماضی کو سامنے لاتے اور حال کے اندھیروں کو اسلامی نشأۃ ثانیہ کی روشنی سے کافور کر دینا چاہتے، وہ گردش دوراں میں مسلمانوں کی زندگی کو کتاب وسنت کے محور پر گردش دینا چاہتے تھے، مولانا منت اللہ رحمانی رقمطراز ہیں:

''مولانا ابوسلمہ صاحب اپنے مواعظ اور تحریروں سے دین کی حمایت ونصرت فرماتے رہے، ان کی بے لوث اور سادہ زندگی میں کوئی مصلحت

اندیشی اور مفاد پرستی نہ تھی، معاشرہ کی بے راہ روی، غیر اسلامی طریقوں اور غلط رسوم ورواج کے خلاف اپنی تقریروں میں نہایت بے باکی اور جرأت مندی سے بولتے رہے، شہر کی مختلف مساجد میں پابندی سے قرآن پاک کی تفسیر بیان فرماتے رہے، اسی نسبت سے ''مفسر قرآن'' ان کے نام کا جز بن گیا تھا''۔(۶)

خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ۱۹۶۲ء تا ۱۹۸۵ء نماز عیدین کے امام رہے، کلکتہ میدان میں نماز عیدین کی یہ سب سے بڑی جماعت ہوتی تھی، آپ کا اصل میدان تبلیغ وارشاد تھا، ساری عمر مسلمانوں کی دینی واخلاقی اصلاح کے لئے جدوجہد کرتے رہے، مولانا وسیع النظر عالم دین تھے، آپ کی نگاہ میں فروعات کو ہوا دینے والے اسلام دشمن طاقت کو مضبوط کرتے ہیں، ملت اسلامیہ انتشار کا شکار ہوتی ہے تو کفر کو نفع پہونچتا ہے، مسلمانوں کا خون بہتا ہے تو باطل کے ایوانوں میں چراغاں ہوتا ہے۔

مولانا بستر علالت سے ایک خط مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو لکھتے ہیں، جس کے لفظ لفظ سے قوم کی زبوں حالی پر ان کے کرب واضطراب کا اظہار ہوتا ہے، خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''شفاخانے کی کوٹھری نما کمرے میں محبوس ہو کر رہ گیا ہوں، جملہ مشاغل یک قلم موقوف ہیں، امت مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی بالخصوص مسلم پرسنل لا پر دشمنوں کے رکیک حملے اور ہماری تہی دستی وبے بسی پر دل کڑھتا ہے، مگر مجبور محض ہو کر رہ گیا ہوں، یہ چند سطور جو دراصل اپنی غمخواری اور دلسوزی کا برملا اظہار ہیں، وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہوئے لکھوا رہا ہوں''۔(۷)

مولانا نہایت اعلیٰ علمی ذوق ورجحان کے مالک تھے، اور تقریر کی طرح تحریر میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، ۱۹۷۲ء میں ادارۂ ترجمہ وتالیف کے قیام سے بہت پہلے اپنے وطن بہار میں مکتبۂ علم

وحکمت قائم کیا تھا، ۱۹۵۰ء میں اس مکتبہ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بیس تحقیقی مضامین ومقالات کا مجموعہ شائع کیا تھا، یہ انتخاب مولانا کے علمی مذاق ومعیار کی نشاندہی کرتا ہے، ان کی اردو تصنیفات کی تعداد پانچ ہے، متعدد قیمتی مقالے بالخصوص علم حدیث کے موضوع پر تحریر فرمائے جو رسائل وجرائد کی زینت بنے ہیں، مولانا ضیاء الدین اصلاحی فرماتے ہیں:

''مولانا کی ذات کلکتہ کی علمی، تعلیمی، اصلاحی، دینی، اور قومی سرگرمیوں کا محور بن گئی تھی، وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے ذی علم اور لائق استادوں میں تھے''۔(۸)

مولانا نے شہرت وناموری سے دور رہ کر پوری زندگی دینی، علمی، تعلیمی، اور حدیثی خدمات میں بسر کی، قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے الفاظ میں:

''یوں تو مولانا جملہ اسلامی علوم وفنون کے عالم تھے اور مروجہ علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مگر ان کو علم حدیث سے عشق کی حد تک تعلق تھا، اس میں خاص استناد کا درجہ رکھتے تھے، ان کے علمی اور تصنیفی کاموں میں علم حدیث کو نمایاں حیثیت حاصل ہے''۔(۹)

مولانا کے علوم حدیث سے انہماک کا اندازہ ان کے قلمی مخطوطات سے ہوتا ہے جو انہوں نے خود تیار کی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی فرماتے ہیں:

''کتاب الالزامات اور کتاب التتبع یہ دونوں رسالے امام دارقطنی کے تصنیف کردہ ہیں اور ایک ہی جلد میں شامل ہیں، دارالمصنفین کا نسخہ مولانا ابوسلمہ شفیع احمد صاحب کا نقل کیا ہوا ہے، کتاب معرفۃ السنن والآثار یہ محدث جلیل امام بیہقیؒ کی مشہور کتاب ہے اس کا ایک جز جو طہارت اور نماز کے ابواب پر مشتمل ہے، مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے''(۱۰)

اپنے حج کے آخری سفر میں مکہ مکرمہ کے کسی مکتبہ میں ان کی نظر ابن
درید (المتوفی ۳۲۱ھ) کی کتاب جمهرة اللغة پر پڑی جو مصر سے طبع ہوکر
آئی تھی، مولانا نے محسوس کیا کہ اس کا مقدمہ بیش قیمت اور اہمیت کا حامل
ہے، آپ نے فوراً نقل کرنا شروع کردیا، مکتبہ کے ذمہ دار کی نظر پڑی تو مولانا
کو اس کی نقل فراہم کی، چنانچہ آپ اسے اپنے ہمراہ ہندوستان لے کر
تشریف لائے اور اہل علم کو بھی پڑھنے کے لئے عنایت فرمایا۔

۱۔ امام ابن حزمؒ ظاہری (المتوفی ۴۵۶ھ) کی تصنیف أسماء الصحابة الرواة و ما لكل واحد من العدد کو مولانا نے شائع کیا، خاص بات یہ ہے کہ مولانا نے خود اس کی کتابت کی ہے، چھوٹی سائز میں ابن حزم کی اصل کتاب ۳۳ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں انہوں نے تقریباً ایک ہزار رواۃ صحابہ کرام کے نام درج کردیے ہیں، ابن حزم کی ترتیب کا لحاظ کرتے ہوئے مولانا ابوسلمہ نے از اول تا ۱۱۲ صحابہ کا مختصر تذکرہ و تعارف کرایا ہے۔ پھر ترتیب کی رعایت کئے بغیر مزید ۵۰ صحابہ کا تذکرہ کتاب کا حصہ ہے، یوں ۱۶۱ صحابہ کرام کا تذکرہ و ترجمہ حیات صرف ۶۲ صفحات میں مکمل ہوگیا ہے، شروع کے ۹ صفحات میں صحابی کی تعریف، اصحاب رسول کا مقام و مرتبہ اور قرآن وسنت کے حوالوں سے ان کے فضائل و مناقب بیان کئے ہیں، اس طرح پوری کتاب ۱۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ امام دارقطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) کی تصنیف لطیف کتاب العلل پہ تین قسطوں میں مولانا کا وقیع مضمون ماہنامہ برہان کے شماروں میں شائع ہوا ہے، اپنے اس مضمون میں آپ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں حدیث کی خدمت، اس کی ترتیب اور تدوین پہ ایک جامع علمی تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تیسری صدی حدیث کی ترتیب وتدوین کے لحاظ سے نہایت
> مبارک ومسعود زمانہ رہی ہے، سنت کی خدمت، اس کی تحمیص اور رواۃ کا نقد
> اسی زمانہ میں ہوا، اس سے قبل جتنی کتابیں تالیف ہوئیں وہ سب کی سب

اقوال صحابہ وفتاوی تابعین سے مخلوط وممزوج ہوا کرتی تھیں، لیکن اس دور میں تالیف کا طریقہ ہی بدل گیا اور نئی راہ نکالی گئی اور صرف مسند کو جمع کیا جانے لگا، لیکن صحیح وسقیم، رطب ویابس کا امتیاز نہیں کیا گیا اور ہر صحیح اور ضعیف کو جگہ دے دی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ جوار باب فکر ونظر نہ تھے ان کے لئے سخت دشواری پیش آئی لیکن امام بخاریؒ (المتوفی ۲۵۶ھ) اور امام مسلمؒ (المتوفی ۲۶۱ھ) ودیگر جہابذہ نے اس کوتاہی کو محسوس کرتے ہوئے ایسی کتابیں تدوین کیں جن کی نظیر دنیا کی کسی زبان ومذہب میں نہیں ملتی، چوتھی صدی کے ارباب علم بھی اس نقش قدم پر چلنے لگے اور ان کا کام زیادہ تر اخذ کا رہا''۔(۱۱)

امام دارقطنی کے کمالات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دارقطنی چوتھی صدی ہجری کے ان مشہور محدثین میں سے ہیں، جن کو مورخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا، اور ان کے تذکرے کے بغیر چوتھی صدی کی تاریخ ناممکل ہوگی''(۱۲)

کتاب العلل للدار قطنی کی اہمیت، خصوصیت اور اس کی امتیازی حیثیت پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''علم حدیث کے انواع میں سب سے اجل واشرف اور سخت ومشکل حدیث معلول کا علم ہے، یہ وہ وادیٔ خارزار ہے جس میں ہر شخص قدم نہیں رکھ سکتا، ہاں جن کو قدرت کی فیاضی نے بصیرت تامہ فہم ثاقب، حفظ واسع اور معرفت کاملہ سے نوازا ہے، وہی اس پر کلام کر سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس پر کلام کرنے والوں کی تعداد بہت مختصر ہے، جیسے ابن المدینی، امام احمد، امام بخاریؒ، یعقوب بن ابی شیبہؒ، ابو حاتمؒ، ابو زرعہؒ، دارقطنیؒ وغیرہم، طول مجالست، کثرت مطالعہ، غیر معمولی یادداشت اور مسلسل مذاکرات سے

قدرتی طور پر ایک ملکہ اور نور پیدا ہو جاتا ہے، جس سے سمجھ جاتے ہیں کہ اس حدیث میں علت ہے اور یہ معلول ہے، لیکن وجہ پوچھئے تو کہہ نہیں سکتے، جیسے جوہری کھوٹے سکہ کو پرکھ لیتا ہے مگر وجہ نہیں بیان کر سکتا، بقول ابن مہدیؒ کہ "یہ الہامی علم ہے"، ابوزرعہؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ حدیث کو معلول کس دلیل سے کہہ دیتے ہیں؟ انہوں نے کہا میں دلیل کیا بتاؤں؟ تم ایک حدیث معلول کے متعلق مجھ سے سوال کرو اور میں اس کی علت بیان کروں، پھر ابن دارہ کے پاس جاؤ اور ان سے اسی حدیث کی معلولیت کا جواب معلوم کرو، اس کے بعد ابو حاتم کے پاس جاؤ اور ان سے بھی دریافت کرو، اگر تینوں جواب مختلف نہ ہوں تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ علم نظری نہیں ہے بلکہ فیوض الہامی کا مظہر ہے، سائل نے ایسا ہی کیا اور سب کا جواب ایک ہی پایا، اس کے بعد انہوں نے اعتراف کیا کہ بیشک یہ علم الہامی ہے"۔ (۱۳)

پھر اس فن میں دار قطنی کو جو تفوق و امتیاز حاصل رہا وہ کسی پیش رو کی کتاب کو حاصل نہ ہو سکا، مولانا کا تبصرہ ملاحظہ ہو جو ان کی علمی بصیرت و گہرائی اور وسعت مطالعہ کا بین ثبوت ہے۔

"لیکن العلل یہ دار قطنی کی کتاب جو بمنزلۂ آفتاب ہے، اس کے مقابلہ میں یہ تمام کتابیں ستاروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ دار قطنی کی علل اس فن کی بہترین تصنیف ہے، علامہ بلقینیؒ کا خیال ہے کہ علل میں سب سے اجل کتاب ابن مدینی، ابن ابی حاتم اور حلال کی ہے، مگر ان سب کی جامع، العلل دار قطنی ہے"۔ (۱۴)

دار قطنی کی جلالت شان اور علمی مقام کے اعتراف کے باوجود ان کے مسامحات پر تنقیدی زاویے سے قلم اٹھاتے ہوئے مولانا نے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور زیر نظر مضمون میں معاملہ چونکہ امام اعظم ابو حنیفہ کا تھا اس لئے بھی ان کا قلم زیادہ حساس ہو گیا، فرماتے ہیں:

''مگر ان کی شخصیت مسلم ہونے کے باوجود بہتیرے مقامات میں ان کا
قدم جادۂ حق سے ڈگمگا گیا ہے اور ایسی مسلمہ برگزیدہ ہستیوں کو اپنے ہدف
جرح کا نشانہ بنایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور یہی دل چاہتا ہے کہ کاش آنکھیں
ایسا نہ دیکھتیں، حد یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ (المتوفی ۱۵۰ھ) جیسی ثقہ اور مقدس
ہستی تک پر جرح کرڈالی ہے اور ان کو ضعیف کہہ دیا ہے، العجب فالعجب:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں　　　تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں (۱۵)

مولانا امام صاحب کے دفاع میں متعدد صفحات سیاہ کرتے ہیں، مگر افسوس کہ اس مضمون کی آخری قسط دستیاب نہ ہوسکی۔

۳۔ ''کتاب الام'' پر مولانا ابوسلمہ شفیع احمد صاحب کا ۱۳ صفحات پر مشتمل ایک مضمون ماہنامہ برہان جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا، ایک اعلیٰ درجہ کا پر مغز علمی مقالہ ہے، جس کی سطر سطر امام شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) سے عشق ووارفتگی اور ان کی علمی جلالت شان کے اعتراف سے عبارت ہے، اسی مضمون میں امام شافعی کی کتاب الرسالۃ کی بابت فرماتے ہیں:

''کتاب الرسالۃ میں امام صاحب نے جن مسائل کو چھیڑا ہے اوران
پر کلام فرمایا ہے، مثلاً شرائط صحت حدیث، عدالت رواۃ، خبر مرسل ومنقطع، ناسخ
ومنسوخ، اجتہاد واستحسان وغیرھا، یہ فن کے اعلیٰ، ادق اور اغلیٰ مسائل میں سے
ہیں اور حق یہ ہے کہ حضرت نے جو کلام فرمایا ہے وہ حرف آخر ہے''۔ (۱۶)

۴۔ مسند احمد، ماہنامہ برہان کے دسمبر ۱۹۶۶ء کے شمارے میں مولانا نے مسند احمد کی قدر وقیمت، اس کے امتیازات وخصوصیات اور اس کی تالیف وترتیب میں امام احمد بن حنبل (المتوفی ۲۴۱ھ) کی سعی بلیغ اور بے نظیر محنت وکاوش پر ۱۶ صفحات کا ایک نہایت پر مغز اور قیمتی مقالہ تحریر فرمایا ہے، اس قیمتی مقالہ کے بارے میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی رقم طراز ہیں:

''اس مضمون کو انہوں نے اپنی زیر تالیف کتاب کا ایک حصہ بتایا ہے، جو

حدیث وملحقات حدیث کی کتابوں کے مختصر تعارف میں لکھ رہے تھے، اس
میں مولانا نے مسند احمد کی اہمیت وخصوصیت اور اس کی جمع وترتیب میں امام
احمد کی محنت شاقہ اور سعی بلیغ کا ذکر کیا ہے، امام صاحب کے صاحبزادے
حضرت عبداللہ کی ترتیب وزوائد اور ابوبکر کی زیادات پر بھی بحث وتحیص کی
ہے اور مسانید واحادیث کی تعداد بھی لکھی ہے، مسند کی فضیلت وخوبی کے
متعلق اہل علم کے اقوال نقل کئے ہیں اور اس کی تصریح کی ہے کہ مسند کے نسخ
کہاں کہاں ہیں؟ کن کن لوگوں نے اس کی ترتیب وتہذیب کا کام کیا ہے؟
اور اس کی کون کونسی شرحیں اور مختصرات لکھے گئے ہیں''۔(۱۷)

۵۔ **کتاب معرفۃ السنن والآثار**: محدث جلیل امام بیہقی (التوفی ۴۵۸ھ) کی مشہور ومعروف، نادر ونایاب اور اہم ترین کتاب ہے، مولانا اسے اپنی تصحیح وتعلیق کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے اور اس کا ایک حصہ خود شائع بھی کیا، مگر اشاعت کا خواب پورا نہ ہوسکا، قاضی اطہر مبارکپوری فرماتے ہیں:

''مولانا نے اس کے چند نسخے میرے پاس بمبئی بھی بھیجے تھے، میں
نے اس کا ایک نسخہ مولانا ابوالوفا افغانی رئیس لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ
حیدرآباد کو بھیجا تو مولانا نے حدیث کے اس نادر ونایاب تحفے پر بڑے
والہانہ انداز میں شکریہ ادا فرمایا تھا''۔(۱۸)

۶۔ ''ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات'' اس عنوان کے تحت مولانا کا پُر از معلومات مضمون ماہنامہ برہان کے کئی شماروں میں شائع ہوا ہے، اس مقالہ سے مولانا کی علم حدیث سے شیفتگی، مطالعہ کی گہرائی اور وسعت فکر ونظر کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا کے پیش نظر محض ایک معلوماتی مقالہ تحریر کرنا نہ تھا، بلکہ آپ نے اپنے پیش رووں کے کام میں جو خلا محسوس کیا تھا اسے پُر کرنا چاہا تھا، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی (التوفی ۱۹۵۳ء) کے محققانہ مقالہ'' ہندوستان میں علم حدیث'' کی بابت اپنے اس

مضمون میں فرماتے ہیں :

'' جناب ممدوح نے حضرت ابوحفص سے لے کر موجودہ زمانہ تک کے ہندوستانی محدثین کا تذکرہ وسط کے ساتھ فرمایا ہے، وہ بہت قیمتی ہے، مگر مولانا نے اپنے مضمون میں تصانیف وتالیف کا ذکر نہیں کیا جس سے معلوم ہو سکے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے بھی اپنی بضاعت اور اپنے ماحول کے مطابق حصہ لیا یا نہیں؟(۱۸)

پھر مولانا نے ڈاکٹر زبیر احمد صاحب کے ایک مقالہ ''علوم حدیث پر ہندوستان کی عربی تالیفات''۔ پھر مولوی ابو یحیٰ امام خاں صاحب نوشہروی کے مضمون جو ماہنامہ معارف اکتوبر ونومبر ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر زبیر احمد صاحب کے مقالہ کے تکملہ کے طور پر شائع ہوا ہے، جائزہ لیا اور بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کا مضمون عربی تالیفات یا تصنیفات تک محدود تھا، جن کی تعداد ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ۷۰ تھی اور جن میں ۲۲ خاص طور پر قابل ذکر قرار دی گئی تھیں، جبکہ مولوی ابو یحیٰ صاحب نے اردو اور فارسی تصانیف کو بھی شامل کر کے ۱۴۱ مولفات کا ذکر کیا ہے۔ پھر'' سلسلۂ شاہ ولی اللہؒ کی خدمت حدیث'' از مولانا ظفر احمد عثمانی کے گراں قدر مقالے کا جائزہ لیا ہے، بعد میں مولانا نے اپنے قیمتی مقالے میں ان کتب کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر سابق مقالہ نگاروں کی فہرست میں نہ آ سکا تھا۔

مولانا نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی تصانیف حدیث میں پہلے آٹھ کتب سیرت کا نام لیا ہے، پھر شروح ومتعلقات بخاری میں ۷، شروح ومتعلقات مسلم میں ۳، شروح ترمذی ومتعلقات پر ۱۹، شروح ابوداؤد ومتعلقات پر ۹، اور سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کے شروح ومتعلقات پر ۳، ۳ کتابوں کا ذکر کیا ہے اور بعض شروح کی اہم خوبیاں اور نمایاں خصوصیات بیان کیں ہیں، چنانچہ مولانا ضیاءالدین اصلاحی فرماتے ہیں:

'' ۱۸۵۷ء کے بعد کی بعض حدیثی تصنیفات کا جو خاکہ مولانا نے پیش کیا ہے اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے سنگ میل ہے۔''۔(۱۹)

مولانا نے دائرۃ المعارف حیدرآباد اور احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد اور مجلس علمی ڈابھیل

گجرات کی علمی وحدیثی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور انہیں عالم آشکار کیا ہے، اپنے اسی مضمون میں مستشرقین کے طعن وتشنیع، ان کے ناروا حملوں اور الزام تراشیوں کے جوابات دینے کے بعد علوم اسلامیہ کی خدمات میں ان کی کاوشوں کو سراہا ہے، فرماتے ہیں:

''مستشرقین کی خدمات کو کسی حال میں نہیں بھلایا جاسکتا، انہوں نے زندگی وقف کی، مال ودولت صرف کیا اور فن کی اہم اہم سیکڑوں کتابیں جس کا تصور بھی بعض وقت نہیں کیا جاسکتا تھا غایت صحت واہتمام کے ساتھ شائع کیا اور اہل علم تک پہونچایا، طبقات ابن سعد جیسی قدیم ومفید اور پر از معلومات کتاب ہمارے ہاتھوں یورپ ہی کے ذریعہ اولا پہونچی''(۲۰)

مولانا نے اپنے مقالے میں واضح کردیا تھا کہ'' یہ جامع اور مکمل فہرست نہیں ہے بلکہ ماحضر پیش خدمت ہے'' تاہم مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (المتوفی ۱۴۱۲ھ) صاحب نے اس مقالے کا ایک ضمیمہ لکھا، جو فروری ۱۹۵۴ء کے برہان میں شائع ہوا، اس میں مزید انہوں نے ۱۵ تصانیف کا ذکر کیا اور اپنے مضمون کو اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا:

''برہان اگست، ستمبر ودسمبر ۱۹۵۳ء میں مسطورۂ بالا عنوان کے تحت مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری کا مضمون پڑھ کر خیال ہوا کہ گرچہ مولانا نے تمام تالیفات کے استیعاب کا ارادہ نہیں کیا ہے تاہم اس سلسلہ کی جن تالیفات کا اب تک ذکر نہیں ہوا ہے ان میں سے جن کے نام اس وقت ذہن میں ہیں ان کو بھی پیش کردیا جائے تو خالی از فائدہ نہیں ہے، ذیل کی سطریں اسی خیال کی تکمیل ہیں''۔(۲۱)

۷۔ ضمیمہ''میراسرج'': یہ ضمیمہ مولانا ابوسلمہ شفیع احمد کے قلم سے ہے، جو معارف کے ۵ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے''میراسرج'' کے عنوان سے معارف میں قسط وار مضامین جو مدینہ طیبہ کے آثار ومشاہدات پرمبنی تھے شائع فرمایا تھا، مولانا ابوسلمہ نے ان مضامین پر

اپنے گہرے تأثرات وجذبات کا اظہار کیا، آپ کا ایک جملہ گوش گذار ہو:

''مضمون میں کہیں کہیں دل کی قاشیں بکھیر دی ہیں، جن میں سوز و گداز، ذوق وشوق اور ترغیب وتحریض کا حسین امتزاج ہے، پڑھتے جائیے اور آنکھوں سے قطرات ٹپکتے جائیں گے''۔(۲۲)

۵ صفحات کے اس پورے مضمون میں مولانا نے شاہ صاحب کے مضمون پر جواضافہ کیا ہے وہ مولانا کے مطالعہ کی وسعت ودقت بینی اور علمی فضل وکمال کی دلیل ہے، صرف ایک مثال ملاحظہ ہو:

''والد ماجد حضرت عبد اللہ کی جو قبر بتائی جاتی ہے اسی سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور بڑے صحابی کا مزار ہے، جس کا نام حضرت شاہ صاحب کو یاد نہیں رہا، یہ مزار حضرت مالکؓ بن سنان والد ماجد حضرت ابو سعید خدریؓ (المتوفی ۷۴ھ) کا ہے، اس پر بھی ترکوں کے زمانے کی عمارت ہے، جسے اب بند کر دیا گیا ہے، دروازے کے اوپر ایک قطعہ ہے جو پڑھا نہ جاسکا، (غالباً) ھذہ قبۃ حضرۃ مالک الانصاری رضی اللہ عنہ...''۔(۲۳)

اس طرح سے مولانا ابوسلمہ نے اپنے مضمون میں ۱۵ آثار ومشاہد پر روشنی ڈالی ہے جو شاہ معین الدین احمد ندوی کے مضمون پر اضافہ ہے، یہ سارے آثار واماکن وہ ہیں جن کے ساتھ حضرات صحابہ کی رہائش یا وابستگی ثابت ہے۔(۲۴)

حواشی:

(۱) از مقدمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی فن اسماء الرجال

(۲) حضرت مولانا ابوسلمہ شفیع احمد کی خدمات وکارنامے ص ۷۷

(۳) ایضاً ص ۸۱

(۴) ایضاً ص ۵۱

(۵) ایضاً ص ۷۰

(۶) ایضاً ص ۳۷
(۷) ایضاً ص ۵۲
(۸) ایضاً ص ۴۲
(۹) ایضاً ص ۳۹
(۱۰) ص ۴۳
(۱۱) ماہنامہ برہان ص ۲۸۸ بابت ماہ نومبر ۱۹۵۰ء
(۱۲) ایضاً ۲۷۳
(۱۳) ماہنامہ برہان بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۰ ص ۳۴۲
(۱۴) ایضاً ص ۳۴۴
(۱۵) ایضاً ص ۳۵۵
(۱۶) ماہنامہ برہان بابت ماہ جنوری ۱۹۷۳ ص ۳۵
(۱۷) مولانا ابوسلمہ کی خدمات وکارنامے ص ۳۶
(۱۸) ایضاً ص ۳۹
(۱۹) ایضاً ص ۴۵
(۲۰) ایضاً ص ۴۵
(۲۱) ماہنامہ برہان ستمبر ۱۹۵۳ ص ۱۶۷
(۲۲) مولانا ابوسلمہ کی خدمات اور کارنامے اگست ص ۳۶
(۲۳) ماہنامہ معارف بابت ماہ نومبر ۱۹۶۶ ص ۳۹۲
(۲۴) ایضاً



حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی
کی خدمات حدیث

از: جناب حافظ محمد امتیاز رحمانی

جب بھی کسی فن کی خدمت کا تذکرہ آتا ہے، تو لوگوں کا ذہن تصنیفی اور قلمی خدمات کی طرف جاتا ہے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ خدمت کسی علم وفن کی صرف قلمی نہیں ہوتی، اس کے ذرائع اور بھی ہیں، تقریر بھی، تصنیف بھی، تالیف بھی، تدریس بھی اور اس فن کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کی جد وجہد بھی، اسی طرح معاملہ "خدمت حدیث" کا بھی ہے، حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے اقوال وافعال اور ان کے تصدیق کردہ امور کے مجموعہ کا نام حدیث ہے، یہ مجموعۂ ہدایت اس لئے ہے تاکہ زندگی کو روشنی ملے عمل کی راہیں کھلیں، اور حضور نبی کریم ﷺ نے انسانوں کو جیسا بنانا چاہا تھا ویسا بننے کی کوشش ہوتی رہے، اس لئے پہلے لوگوں نے اس مجموعہ ہدایت، حدیث شریف کو یاد کیا، سمجھا، سیکھا، سکھایا، برتا، پھر اسے محفوظ کرنے کے لئے کتابیں لکھیں، یہ سارے کام خدمت حدیث سے متعلق ہیں اسی تناظر میں ہمارے مقالہ "حضرت امیر شریعت اور خدمت حدیث" کو بھی دیکھا جائے، حضرت امیر شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ صاحب رحمانیؒ نے حدیث کو یاد بھی کیا، سمجھا اور سیکھا بھی، اس پر عمل بھی کیا، دوسروں کو سکھایا بھی، اس پر عمل کرنے کی فضا بھی بنائی اور اس موضوع پر لکھا بھی، یہ سب

گوشے ہیں جہاں حضرت امیر شریعت کی خدمات بہت روشن ہیں۔

خدمت حدیث بذریعہ تحریک:

حدیث شریف پر عمل کی واضح راہ قانون شریعت پر عمل ہے، حضرت امیر شریعت نے قانون شریعت کی حفاظت اور اس پر عمل کی راہ کو مستحکم رکھنے کے لئے مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کیا، لوگوں کی ذہنی آبیاری کی، اور قانون اسلامی پر عمل کا جذبہ بیدار کیا، انھوں نے مسلم پرسنل لا جیسے خشک اور خالص قانونی اصطلاح کو عوام کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا، اور مسلسل ایسی فکری غذا فراہم کرتے رہے اور تحریکی مزاج بناتے رہے کہ مسلم پرسنل لا مسلمانوں کا مسئلہ نمبر ایک بن گیا، اور حدیث شریف کی خدمت تحریکی طور پر جاری ہوگئی، اور اس موضوع پر قرآن وحدیث کی روشنی میں:

☆ اسلامی قانون (متعلق مسلم پرسنل لا)
☆ خاندانی منصوبہ بندی
☆ قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل
☆ مذہب اخلاق اور قانون
☆ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ نئے مرحلہ میں
☆ مسلم پرسنل لا بحث ونظر کے چند گوشے
☆ مسلم پرسنل لا
☆ یونیفارم سول کوڈ

جیسی قیمتی کتابیں لکھ کر اس فن کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھنے کی جدوجہد فرمائی۔

حدیث شریف کی تعلیم کا انتظام:

صوبہ بہار میں حدیث شریف کی تدریس اور دورۂ حدیث تک کی تعلیم کا اہتمام ایک عرصہ سے باقی نہیں رہا تھا، جو ایک بڑا خلا تھا، حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے جامعہ رحمانی مونگیر میں تاریخ ساز پروقار اجلاس منعقد فرمایا اور ملک کے ممتاز علماء اور شیوخ (۱) کو

(۱) حضرت مولانا فخر الحسن شیخ التفسیر وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ، حضرت مولانا بلاکر دورۂ حدیث شریف کا افتتاح کروایا، جس سے طلبہ مسلسل فیض یاب ہورہے ہیں، اور جامعہ رحمانی مونگیر میں یہ سلسلہ تقریباً ۴۲ سالوں سے قائم ہے، اور حضرت امیر شریعتؒ کی اس خدمت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، اس طرح بھی حضرت امیر شریعتؒ نے حدیث شریف کی خدمت انجام دی۔

حدیث شریف کے درس کا اہتمام:

حضرت امیر شریعتؒ نے جامعہ رحمانی کے طلبہ کو دوسری درسیاتی کتابوں کے علاوہ پورے اہتمام کے ساتھ "موطأ امام مالک" کا درس تقریباً ۲۶ سالوں تک دیا، اپنے درس میں حدیث شریف کے پڑھنے پڑھانے کا طریقہ، حدیث شریف کے آداب، حدیث شریف کی فضیلت اور حدیث رسول اللہ ﷺ کی عظمت کی ایسی تعلیم دی کہ آج بھی حضرت امیر شریعتؒ کے شاگردوں کے اندر وہ خوبی ہے اور وہ پورے اہتمام کے ساتھ حدیث شریف کے درس دینے کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور درس حدیث کے ذریعہ حدیث شریف کی خدمت جاری ہے، خاص انداز کے ساتھ حضرت اقدسؒ کے ذریعہ کی گئی خدمت حدیث شریف کا سلسلہ جاری ہے اور جامعہ رحمانی میں منعقد ہونے والے اجلاس ختم بخاری شریف کے اہتمام سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ نے درس و تدریس کے ساتھ خدمت حدیث کا ذریعہ اپنے خطابات کو بنایا ہے، اور اپنے خطابات میں حدیث شریف پر عمل اور اس کی حفاظت کی تعلیم اور ہدایت فرماتے رہے، زہد و تقویٰ، خاکساری اور بردباری، عزم و عزیمت، صبر و توکل، ایمان و یقین ان کے خطابات کے اہم موضوعات تھے۔

خدمت حدیث:

قانون شریعت پر عمل نہیں کرنے کے ارادہ انسان کو منکر حدیث بناتا ہے، اسی لئے مختلف ادوار

(صفحہ ۷۳۷ کا بقیہ حاشیہ) حمید الدین صاحبؒ شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ، حضرت مولانا عمران صاحبؒ بھوپال، حضرت مولانا محمد حسین بہاری، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی

مفتی اعظم دارالعلوم دیو بند، افتتاح ۱۳۵۸ھ۔

میں انکار حدیث کا فتنہ اٹھا اور مختلف عنوان سے لوگوں نے حدیث کی دینی، شرعی اور علمی حیثیت کو چیلنج کیا، پچھلی صدی میں بھی جب انکار حدیث کی تحریک اٹھی تو ایک صاحب نے متأثر ہو کر حضرت امیر شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ جب حدیث کی کتابت حضور ﷺ کے عرصہ کے بعد ہوئی تو پھر ان سنی سنائی باتوں پر عمل کیسے کیا جائے اور انھیں دین کی تشریح و تفصیل میں بنیادی حیثیت کس طرح دی جائے، حضرت امیر شریعتؒ نے اس سوال کا مفصل اور مدلل جواب دیا، اور بتایا کہ متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے ہیں جو نبی کریم ﷺ سے سن سن کر احادیث لکھا کرتے تھے، بعض صحابہ نے احادیث کا مجموعہ تیار کر لیا تھا اور اس کا نام بھی رکھا، تابعین اور تبع تابعین بھی احادیث کو جمع کرنے اور قلمبند کرنے میں بڑی جانفشانی سے کام لیتے تھے اس لئے حدیث کو سنی سنائی باتوں کا مجموعہ اور غیر مستند ذخیرہ قرار دینا غیر حقیقی اور غیر علمی بات ہے۔

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جواب کتابی شکل میں بھی شائع ہوا، جس کا نام کتابت حدیث ہے، یہ کتاب مختصر ہے اور اسی (۸۰) صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بڑی محققانہ گفتگو کی گئی ہے، کتاب کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ خالص علمی بحث و تحقیق کو اتنی آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے کہ عام انسان بھی اس سے آسانی کے ساتھ استفادہ کر سکتا ہے، کتاب پڑھ جائیے، تو اندازہ ہوگا کہ ان کی نظر حدیث اور تاریخ حدیث پر کتنی گہری تھی، یہ تحریر ۱۹۵۰ء کی ہے، اس زمانہ میں اس موضوع پر بہت کم کتابیں تھیں، انھوں نے اصل مآخذ کے ہزاروں صفحات کے مطالعہ اور تحقیق کے بعد ۸۰ صفحات میں خلاصہ لکھ دیا ہے، اور منکرین حدیث کا بہت واضح اور مدلل جواب عالمانہ انداز میں دیا ہے، منکرین حدیث کی بڑی اہم دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حدیث لکھنے سے روکا تھا، روایت ہے:

"عن ابی سعید الخدریؓ قال کنا قعوداً نکتب ما نسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فخرج علینا فقال: ما ھذا تکتبون؟ فقلنا: ما نسمع منک فقال: أکتاب مع کتاب اللہ امحضوا کتاب اللہ واخلصوہ قال: فجمعنا ما کتبناہ فی صعید واحد ثم احرقناہ"۔ (مجمع الزوائد ص ۱۵۹ ج ۱)

ترجمہ" حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، اسے بیٹھ کر لکھ رہے تھے کہ رسول خدا ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ تم لوگ کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ جو کچھ بھی آپ سے سنا تھا، آپ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب لکھی جارہی ہے، اللہ کی کتاب کو علیحدہ کرو اور خالص کرو، پس ہم نے جو کچھ بھی لکھا تھا جمع کر کے جلادیا"۔

حضور ﷺ کا خود حدیث شریف کا لکھوانا، صحابہ کا لکھنا، مجموعے تیار کرنا نقل کرنا بڑی مضبوط حقیقت ہے، دوسری طرف یہ روایت ہے، بظاہر دونوں میں ٹکراؤ نظر آتا ہے، حضرت امیر شریعتؒ نے مختلف روایتوں میں بڑی عمدہ اور واضح تطبیق کی، اور پھر منکرین حدیث جو اس روایت کو بنیاد بنا کر پورے ذخیرہ حدیث کو ناقابل اعتبار قرار دے رہے تھے، اس کا بڑے لطیف پیرایہ میں یہ جواب تحریر فرمایا: وہ فرماتے ہیں" اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی صاف طریقہ پر سوچنے کی ہے وہ یہ کہ منکرین حدیث منع کتابت والی حدیث کا مطلب غلط بیان کر کے حدیث کے بیش بہا اور مستند ذخیرہ کو ناقابل اعتبار کہتے ہیں لیکن آخر یہ منع کتابت والی حدیث ان کو ملی کہاں سے؟ یہ حدیث بھی تو انہیں کتابوں میں ہے، جسے وہ غیر مستند بتا رہے ہیں، تو پھر تحقیق کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ ایک ہی کتاب کی ایک حدیث کو قابل اعتبار قرار دے کر بقیہ پوری کتاب کو رد کر دیا جائے، اور اس کتاب میں جو روایت اپنے خیال کی تائید کرتی ہو، اس کو تو صحیح کہا جائے اور بقیہ تمام روایتیں غیر مستند ٹھہرائی جائیں، اگر منکرین حدیث کے خیال میں واقعی پورا ذخیرہ حدیث ناقابل اعتبار ہے، تو منع کتابت والی حدیث کو بطور استدلال پیش کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں"۔ (کتابت حدیث ص ۶۰)

یہ پُر زور تردید ان کے گہرے غور وفکر، استنتاج کی صلاحیت اور استدلال کی قوت کا پتہ دیتی ہے، اپنی اس خداداد صلاحیت کا حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے بھرپور استعمال کیا، اور تحریر، تقریر، تحریک، تدریس اور زبان وقلم کے ذریعہ نہ صرف حدیث شریف کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی بلکہ دین کے مختلف شعبوں کی بھرپور خدمت کی، اللہ تعالی ان کی خدمات قبول فرمائے اور درجات بلند کرے۔ (آمین)



حضرت مولانا حکیم سید محمد ایوب مظاہریؒ

کی حدیثی خدمات

از: مولانا معاذ احمد ندوی کاندھلوی

استاذ ادب جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

برصغیر کی اہم ترین دینی درسگاہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ تابندہ تاریخ میں عالم اسلامی کو وہ مایۂ ناز علماء و مفسرین، نابغۂ روزگار فقہاء و محدثین، اور مخلص دعاۃ دین فراہم کئے، جنہوں نے علم و فضل اور دعوت و ارشاد کے میدان میں انمٹ نقوش ثبت کئے، مظاہر علوم کی جبین ناز پر جہاں احمد علی محدث سہارنپوری، مظہر نانوتوی، خلیل احمد سہارنپوری، زکریا، الیاس، یوسف رحمہم اللہ جیسے بہت سے مبارک نام جلی حروف میں رقم ہیں وہیں اس کی کلاہ افتخار میں ایک درنایاب محمد ایوب کے نام سے دمک رہا ہے، جنہوں نے فن حدیث میں وہ کارنامہ انجام دیا کہ پورا عالم اسلامی آج ان کا زیر بار احسان ہے۔

خاندان، پیدائش:

حضرت مولانا حکیم سید محمد ایوب صاحب مظاہری سہارنپور کے اس مشہور خانوادۂ سادات میں ۱۳۱۸ھ میں پیدا ہوئے، جو دور شاہجہانی میں بخارا سے وارد ہندوستان ہوا اور سہارنپور میں بود و باش اختیار کی، حکیم صاحب دو سال کے تھے کہ جدامجد حضرت سید حکیم احمد حسین رحمۃ اللہ علیہ وصال

فرما گئے، موصوف حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ومجاز تھے، حضرت حکیم ایوب صاحبؒ کم سن ہی تھے کہ جدامجد حضرت سید احمد حسین صاحب نے فرمایا اس بچہ کو علم دین سے وافر حصہ ملے گا، پانچ سال کی عمر تھی کہ والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

تعلیم:

ابتدائی تعلیم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں حاصل کی ان کے والد حکیم سید محمد یعقوب صاحبؒ ایک روپیہ ماہانہ بطور فیس مدرسہ میں جمع کرتے رہے، پھر حضرت مولانا یحیٰ صاحب کاندھلوی (والد ماجد حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ) کی تربیت ونگرانی میں آگئے، حضرت کا طرز تعلیم بالکل جداگانہ اور مختلف تھا چنانچہ ان کے تجویز کردہ نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کی، ۱۳۳۴ھ میں جب مولانا یحیٰ صاحب وصال فرما گئے تو آپ نے حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی اور حضرت شیخؒ سے رشتۂ تلمذ استوار کیا، ۱۳۳۶ھ سے ۱۳۳۸ھ تک فن طب اور ادب کی مختلف کتابیں پڑھ کر ۱۳۳۹ھ میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی، ۱۳۴۰ھ میں مختلف فنون کی کتابیں زیر درس رہیں، ۱۳۴۲ھ میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں داخلہ لے کر طب کی تکمیل اور فن سرجری کی عملی مشق کی۔

۱۳۴۵ھ سہارنپور میں اس مشہور شفاخانہ کی داغ بیل ڈالی جو آج بھی دار الشفاء یعقوبی کے نام سے جانا جاتا ہے جہاں انہوں نے فن طب میں بہت سے نئے تجربات وجدید اکتشافات کئے۔

بیعت واصلاح:

سفر لکھنؤ سے پہلے ۱۳۴۲ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کر کے سلوک کے مراحل طے کئے، حضرت سہارنپوری کے وصال کے بعد حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ کی طرف رجوع کیا، ۱۳۹۶ھ میں حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحبؒ نے سلسلہ اشرفیہ میں اجازت وخلافت سے نوازا۔

مدرسہ کی سرپرستی:

مادرِ علمی مدرسہ مظاہر علوم کے ۱۳۷۱ھ میں سرپرست بنائے گئے پھر خالصۃ لوجہ اللہ مدرسہ کی ہر خدمت میں پیش پیش رہے، اکابر وقت ان کی متنوع خدمات کا اعترافات کرتے نظر آتے ہیں اور دار الطلبہ جدید کی خوشنما تعمیر آج بھی حضرت حکیم صاحب کے عزم وحوصلہ کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے، متواتر ۳۵ سال سرپرستی فرمانے کے بعد ۱۴۰۵ھ میں مستعفی ہو گئے۔

سفرِ حج:

حضرت حکیم صاحب سفر کے عادی نہ تھے، یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتے، ۱۳۸۳ھ میں سفر حج کی سعادت نصیب ہوئی۔

نکاح واولاد:

۲۵ر ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ میں اپنے ہی خاندان میں مسماۃ رابعہ خاتون سے نکاح ہوا، اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت والی اولاد عطاء فرمائی، ۶ر بیٹے وہ بھی علماء وفضلاء اور حفاظ قرآن پھران بیٹوں کی تمام اولاد واحفاد آج بھی بحمد اللہ حفاظ وعلماء اور دعاۃ دین کی حیثیت سے متعارف ہیں۔

وفات:

زندگی کے تین اہم شعبوں، تصنیف وتالیف، حکمت وطبابت اور مدرسہ کی سرپرستی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، اب جب کہ تمام تصانیف مکمل ہو چکی تھیں، حکمت وطبابت صاحبزادگان کے سپرد کر دی تھی اور مدرسہ کی ذمہ داریوں سے استعفیٰ دے کر سبکدوشی اختیار فرمالی تھی اور ہمہ وقت عبادت خداوندی میں مصروف تھے کہ ۲۷ر ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا، إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

تصنیفات وتالیفات:

"تراجم الأحبار من رجال شرح معاني الآثار"

حضرت امام طحاوی احمد بن محمد بن سلامۃ متوفی ۳۲۱ھ کی معروف ومتداول کتاب "شرح معانی الآثار" کی استنادی حیثیت اور فقہ حنفی کے ماخذ ومستدلات میں اس کا صحیح مقام متعین کرنے کے

لئے ضروری تھا کہ حدیث کی روایات اور رجال سند کا مفصل جائزہ لیا جائے اور جرح و تعدیل کے متعلق ائمہ کی آراء معلوم ہوں، ان کے اساتذہ و تلامذہ کی تفصیل نظر میں ہو، معانی الآثار کی روایات کا صحیح مقام متعین ہو، اس مقصد کی تکمیل کے لئے حضرت حکیم سید محمد ایوب صاحبؒ نے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی ترغیب پر ۱۳۸۱ھ میں شرح معانی الآثار اور اس کے رجال پر وسیع تحقیقی کام "تراجم الأحبار من رجال شرح معانی الآثار" کے نام سے شروع فرمایا اور تیس سال کی جد وجہد کے بعد ۱۴۱۳ھ میں یہ تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس تحقیقی کام میں جن امور کی رعایت کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

☆ ہر راوی کا ترجمہ تقریب التہذیب سے لیتے ہیں پھر "تہذیب التہذیب" سے اس راوی کے اساتذہ اور تلامذہ کا ذکر کرتے ہیں نیز دیگر کتب رجال و حدیث میں جن اساتذہ و تلامذہ کا ذکر موجود ہے ان کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔

☆ ائمہ جرح و تعدیل کی راوی کے بارے میں جو آراء ہیں ان کو تفصیل سے درج کرتے ہیں، سن پیدائش و وفات سے متعلق مؤرخین کے اقوال نقل کرتے ہیں، ابن ابی حاتم کی "الجرح والتعدیل" امام بخاری کی "التاریخ الکبیر"، علامہ ذہبی کی "کاشف" اور "تذکرۃ الحفاظ" اور خزرجی کی "خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال" سے پورا پورا استفادہ فرماتے ہیں، اسی طرح اسانید طحاوی کے جن رجال کا تذکرہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تہذیب میں نہیں کیا تحقیق وجستجو کے بعد ان کا اضافہ لفظ "قلت" کے ساتھ کرتے ہیں۔

ہر راوی کے ترجمے کے ابتداء میں نشاندہی کر دیتے ہیں کہ اس راوی کی روایات کتب صحاح اور دیگر کتب حدیث میں کہاں کہاں ہیں۔

راوی کا ترجمہ نقل کرتے ہوئے یہ نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ امام طحاوی نے اس راوی کی کتنی روایات وآثار کو شرح معانی الآثار میں نقل فرمایا ہے، راوی کا ذکر کرتے ہوئے شرح معانی الآثار کے اس باب اور صفحہ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جہاں یہ نام آیا ہے۔

معانی الآثار جلد اول کے رجال کا تذکرہ پہلے اور جلد ثانی کے رجال کا تذکرہ بعد میں کرتے ہیں، بطور فرق و امتیاز جو راوی جلد ثانی میں ہیں ان کے نام کے ساتھ دائرے میں (ن) بنادیتے ہیں، جو ثانی کا مخفف ہے، نیز حدیث کی دیگر کتابوں میں طحاوی کے الفاظ سے مختلف الفاظ ملے، تو ان کو بھی نقل کر دیتے ہیں۔

یہ کتاب ۳/ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے، جلد اول پہلی بار ۱۳۹۱ھ میں شائع ہوئی، یہ کتاب ۲۰×۲۶=۸ سائز کے چار سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل ہے جلد اول کے آخر میں بائیس صفحات پر مشتمل اسماء کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے پیش کی گئی ہے، یہ کل نو سو اکتیس اسماء ہیں، مکمل کتاب کے مجموعی صفحات دو ہزار تین سو بیس (۲۳۲۰) ہیں۔

اس کتاب میں مجموعی طور پر چار ہزار سات سو نانوے رواۃ کا تذکرہ اور حالات ہیں، اور ہر جلد کے آخر میں فہرست رواۃ حروف تہجی کے اعتبار سے دے دی گئی ہے، یہ کتاب محترم ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب لیکچرر ڈھاکہ یونیورسٹی کی تحقیق کا موضوع بھی بنی، ڈاکٹر صاحب موصوف علماء کی ایک کمیٹی کے ساتھ مل کر اس کتاب کی تلخیص بھی کر رہے تھے۔

تصحيح الأغلاط الكتابية الواقعة في النسخ الطحاوية:

علامہ طحاویؒ کی مذکورہ کتاب کی اہمیت سے اہل علم حضرات بخوبی واقف ہیں مگر یہ اہم ترین کتاب ناشرین کی غفلت کا شکار ہو کر اغلاط کا مجموعہ بن گئی، خصوصاً سند کے رجال و رواۃ کی تعیین میں کافی تصحیفات واقع ہوگئی تھیں، جس کی بناء پر کتاب کی ذاتی خوبیوں اور اہمیت کے باوجود اس پر اعتماد مشکل ہو گیا تھا، تراجم الاحبار کی تصنیف کے وقت حضرت مصنف علیہ الرحمۃ کے سامنے اسماء الرجال اور حدیث کی متعدد کتابیں اور معانی الآثار کے متعدد قدیم وجدید نسخے تھے، اثنائے تحقیق مصنف کو ان اغلاط واوہام کا علم ہوتا تھا، بعض اغلاط تمام نسخوں میں مشترک تھیں، بعض کسی نسخے کے ساتھ خاص تھیں، چنانچہ ان اغلاط کی تصحیح ضروری تھی تاکہ اصل کتاب سے استفادہ آسان ہو سکے، حضرت حکیم ایوب صاحبؒ نے اس طرف توجہ کی اور اس کتاب کی تصحیح پر حتی المقدور وقت صرف فرما کر تصحیح الاغلاط کے نام

سے یہ کتاب مرتب فرمائی اور معانی الآثار میں واقع تقریباً دو ہزار اغلاط کی تصحیح کی۔

علامہ عینیؒ کی کتاب "كشف الأستار عن رجال شرح معاني الآثار" میں رجال طحاوی کی تحقیق و تعیین میں جو سہو ہوئے ہیں، ان کو بھی اس کتاب میں دلائل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، کتاب کے آخر میں مشائخ الطحاوی کا عنوان قائم کر کے حضرت امام طحاوی کے ان چھیاسی مشائخ کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے امام طحاوی براہ راست روایت کرتے ہیں۔

علامہ عینیؒ کی ایک دوسری کتاب "نخب الأفكار" شرح شرح معانی الآثار کے مخطوطہ کا عکس مصر سے مدرسہ مظاہر علوم میں آیا تو اس سے بھی حضرت مصنفؒ نے بھرپور استفادہ کیا اور کتاب پر نظر ثانی فرمائی۔

اس کتاب کے ہر صفحے پر پانچ خانوں کا ایک جدول بنایا گیا ہے، اول خانے میں باب، دوسرے میں شرح معانی الآثار کے صفحہ وسطر، اور تیسرے میں غلطی کی نشاندہی، چوتھے خانے میں اس کی تصحیح اور پانچویں خانے میں اس تصحیح پر دلائل وشواہد پیش کئے گئے ہیں یہ کتاب ۲۶×۲۰=۴ سائز پر دو جلدوں میں شائع ہوئی، دونوں جلدوں کے مجموعی صفحات ۱۶۸ ہیں۔

برصغیر کے علماء و مشائخ حدیث نے اس کتاب کی بھرپور پذیرائی کی اور مصنف کتاب کی تحقیق و جستجو کی داد دی، مختلف اخبارات و رسائل نے اس کی نافعیت پر تبصرے شائع کئے اور کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔

الحواشي لشرح معاني الآثار:

اگر ایک طرف "تراجم الأحبار" کے ذریعہ معانی الآثار کی سند اور رجال کی تحقیق و تعیین ممکن ہوئی، تو دوسری طرف تصحیح الأغلاط کے ذریعہ اس کی تحریفات و تصحیفات کی تصحیح ہوئی، اب ضرورت تھی کہ ان تمام تحقیقات کی روشنی میں معانی الآثار کا ایک نیا اور صحیح نسخہ مرتب ہو کر امت کے ہاتھ میں آئے، مشیت الٰہی نے اس عظیم تحقیقی کام کے لئے بھی حضرت حکیم سید محمد ایوب صاحب ہی کو منتخب کیا، حضرت حکیم صاحب نے اس نسخے میں تحقیق و تصحیح کے ساتھ ساتھ روایات کی تخریج کا بھی اہتمام فرمایا اور علامہ

طحاوی کی اصطلاح ''وقال قوم آخرون'' کے مصداق کی تعیین کے ساتھ ساتھ دیگر متعلقات کتاب کی بھی گرہ کشائی کی کامیاب کوشش کی، رجال طحاوی سے شغف رکھنے والوں کے لیے یہ ایک قیمتی دستاویز ہے، یہ حاشیہ اصل متن معانی الآثار کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۳۰۱ھ میں پاکستان سے شائع ہوا، اس علمی وتحقیقی حاشیے کی علماء حدیث کے یہاں بے حد پذیرائی ہوئی، آج برصغیر کے مطابع اسی حاشیہ کو شائع کر رہے ہیں۔

الفتح السماوی فی تحقیق مولد الطحاوی:

حضرت امام طحاویؒ کی ولادت کے سلسلے میں ۲۲۹ھ کی روایت زیادہ معروف ہے، لیکن حضرت حکیم صاحبؒ نے اس کتاب میں متقدمین ومتأخرین کی تصانیف کے حوالوں سے حضرت امام طحاوی کی ولادت ۲۳۹ھ میں ثابت کیا ہے، یہ مقالہ کتابی شکل میں تو شائع نہیں ہوسکا البتہ اس کی عربی تلخیص معانی الآثار کے شروع میں طبع ہوگئی ہے۔

تصویب التقلیب الواقع فی تهذیب التهذیب:

حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب تہذیب التہذیب حکیم صاحبؒ کے مطالعہ میں نصف صدی تک رہی، مطالعہ کے دوران جن اغلاط وتصحیفات کا علم ہوتا رہا آپ اس رسالے میں جمع فرماتے رہے، کتاب کی ترتیب کچھ اس طرح قائم کی گئی ہے کہ ہر صفحے پر چار خانوں کا جدول ہے، پہلے خانے میں تہذیب کا صفحہ وسطر، دوسرے میں غلطی، تیسرے میں اس کی تصحیح اور چوتھے خانے میں اس تصحیح کی تحقیق اور دلائل سپرد قلم کئے ہیں، یہ کتاب ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے اور ۲۶×۲۰=۸ سائز پر سہارنپور سے شائع ہوچکی ہے۔

"تصحیح اغلاط تقریب التهذیب" و "خلاصة تذهیب تهذیب الکمال":

حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی کی دوسری معروف کتاب تقریب التہذیب میں بعض تصحیفات واقع ہوگئی ہیں، حضرت حکیم صاحبؒ نے ان کی تصحیح وتحقیق پر بھی توجہ مبذول کی اور علامہ خزرجی کی ''خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال'' پر بھی استدراک وحواشی تحریر کئے لیکن حضرت حکیم صاحب

کا یہ کارنامہ اب تک منظر عام پر نہ آ سکا۔

ترجمہ "الحزب الأعظم":

ادعیہ ماثورہ کی مقبول ترین کتاب الحزب الأعظم کا ترجمہ بھی حضرت حکیم صاحبؒ نے کیا اور قدیم وجدید نسخوں کے متن میں جو اختلاف پایا گیا اس کو حاشیے پر علامت نسخہ (ن) لکھ کر واضح فرما دیا ہے لیکن یہ بھی ہنوز پردۂ خفا میں ہے۔

مراجع:

۱۔ علماء مظاہر علوم اور ان کی علمی وتصنیفی خدمات، مرتبہ مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری

۲۔ تذکرہ دانشوران سہارنپور

۳۔ تراجم الاحبار من رجال معانی الآثار

۴۔ تصحیح الأغلاط الکتابیة الواقعة فی النسخ الطحاویة.



مشاہیر علمائے کرام
کے تاثرات

عشق نے آباد کر ڈالے ہیں ویرانے تمام

جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ کے دوروزہ سمینار (ہندوستان اور علم حدیث) میں شرکت کے لیے پہلی بار حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، بڑی آرزو تھی جو پایۂ تکمیل کو پہنچی، صرف اس لیے ہی نہیں کہ ایک علمی وتربیتی دانشگاہ کی زیارت سے خوشی وشادمانی ملی بلکہ اس لیے بھی کہ یہ ایک ایسی شخصیت کے اخلاص، محبت، لگن اور جدوجہد کا عظیم وعالیشان کارنامہ ہے جو نہ صرف سرمایۂ حدیث کا پاسبان ہے بلکہ ہندوستان میں حدیث نبوی کے تسلسل کو اعلیٰ معیار و بلند پایہ سطح سے تحقیق وتالیف کے عمل کو سرگرم وروان دواں رکھے ہوئے ہے، یہ لائق صد آفریں شخصیت جامعہ اسلامیہ کے عالی قدر بانی ومرپرست حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری دامت برکاتہم کی ہے، جو بجا طور پر اس کی مستحق ہے۔ ؎

عشق نے آباد کر ڈالے ہیں ویرانے تمام

ایسی گرانمایہ شخصیت کے فیض سے ہی یہ سمینار (ہندوستان اور علم حدیث) کا انعقاد ہوا ہے جو اپنی شاندار کامیابی کے ساتھ ہمیشہ مشعل راہ اور منارۂ نور بنا رہے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

(جناب مولانا ڈاکٹر) محمد اجتبا ندوی

جامعہ نگر، دہلی



لق ودق صحرا میں حسین ودلکش باغ

جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ میں ایک مرتبہ اس سے قبل حضرت شیخ الحدیث پر ہونے والے سمینار میں حاضری ہوئی تھی، اس وقت بھی جامعہ ہذا کے بارے میں بہت اچھے تاثرات کے نقوش قلب پر مرتسم ہوئے تھے، اس مرتبہ قند مکرر کی طرح اس حسن ظن میں مزید اضافہ ہوا، اس کی حسین اور سلیقہ سے تعمیر شدہ عظیم الشان عمارتیں، جس میں مسجد کا مقام سب سے اونچا ہے، منتظمین کی مستعدی،

سعی بلیغ، بیدار مغزی، مہمانوں کی خدمت میں ہمہ وقت انہماک جیسی چیزیں نمایاں ہیں، عمارات دیکھ کر تاج محل کا گمان ہوتا ہے یا لق ودق صحرا میں حسین ودلکش باغ کا، کہ حسین نوع بنوع کے حسین پھولوں کے گلدستے اور شیریں پھلوں کے انبار لگے ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس چمن کو آباد اور پھلتا پھولتا رکھے اور ہر قسم کے شرور وفتن اور نظر بد سے بچائے۔

(مولانا) محمد برہان الدین سنبھلی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ



علوم اسلامیہ کا تاج محل

''جنگل میں منگل'' کا محاورہ سنا تھا، لیکن مظفر پور کے گاؤں میں شہر اعظم گڑھ سے دور جامعہ اسلامیہ کی عالیشان عمارتوں کا کمپلکس اور چمن دیکھ کر حیران رہ گیا اور مذکورہ محاورہ نگاہوں میں مجسم ہو گیا ۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

مرکز ابی الحسن الندوی کی عمارت شاندار، مخطوطات کا ذخیرہ بیش قیمت، لائبریری جس میں ۶۰-۷۰ ہزار کتابیں ہیں دیکھنے کے لائق ہے، رسائل اور مجلدات ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں، کتابیں خوبصورت شلف میں ہیں، اور موضوعات کی ترتیب کے ساتھ ہیں، مسجد اور دار الاقامہ اور درسگاہ کی عمارتیں حسن اور نفاست کی آئینہ دار ہیں، طلبہ مہذب اور باصلاحیت، یہ سب دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ تاج محل دیکھ کر بھی اتنی خوشی نہیں ہوتی ہے، سنگ مرمر کا تاج محل شاہ جہاں نے بنوایا تھا، علوم اسلامیہ کے تاج محل کی تعمیر کا سہرا مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کے ذوق علم و دانش کے سر ہے، اللہ تعالیٰ اسے نظر بد سے محفوظ رکھے۔ ومن شر حاسد إذا حسد

(جناب مولانا پروفیسر) محسن عثمانی ندوی

ایک نیادارالمصنفین

جامعہ اسلامیہ کی پُر رونق اور پُر بہار فضا بانی جامعہ محدث جلیل شیخ تقی الدین ندوی دامت برکاتہم کے خلوص اور ذوق جمال کی آئینہ دار ہے، اس پُر کیف ماحول میں "ہندوستان اور علم حدیث" کے موضوع پر یہ بین الاقوامی مذاکرہ علمی ہندوستان کے علم حدیث کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بھی ہے۔

مرکز شیخ ابوالحسن علی ندوی لائبریری میں منتخب کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ اتنی قلیل مدت میں معرض وجود میں آنا بانی مرکز کے علمی ذوق کا ثبوت ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل میں یہ مرکز نہ صرف اتر پردیش بلکہ ملک اور بیرون ملک تشنگان علم ودانش کی بحث وتحقیق کا جولانگاہ ہوگا اور ایک نئے دارالمصنفین کی ضرورت پوری کرے گا اور خاص طور سے علم حدیث کی خدمات میں اہم اور انمٹ نقوش ثبت کرے گا واللہ ولی التوفیق، اس سمینار کے منتظمین، اساتذہ، طلبہ اور خاص طور سے میر کارواں ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی صاحب حسن نظم وانتظام کے لیے قابل صد مبارکباد ہیں، اللہ اس چمن کو سدا بہار رکھے۔ آمین

(مولانا ڈاکٹر) شفیع احمد ہاشم ندوی

حیدرآباد



مقالہ نگار حضرات نے بڑی محنت اور دلچسپی سے مقالات تیار کیے ہیں

الحمدللہ جامعہ اسلامیہ مظفر پور کے زیر انتظام دوروزہ بین الاقوامی مذاکرہ علمی بعنوان "ہندوستان اور علم حدیث" میں شریک ہوا، مقالہ نگار حضرات کے مقالات کو سننے کا اتفاق ہوا، مقالہ نگار حضرات نے بڑی محنت اور دلچسپی کے ساتھ مقالات کو تیار کیا ہے، ان سارے کاموں میں دخل

محترم مولانا تقی الدین صاحب مدظلہ العالی کا ہے، اللہ تعالی ان کی عمر دراز اور بابرکت بنائیں، ایک کمی یہ رہ جاتی ہے کہ اس خالص علمی اور دینی مذاکرہ میں تصویرکشی کا سلسلہ جاری رہتا ہے جو بالکل غیر مناسب ہے۔

(جناب مولانا) محفوظ الرحمٰن
جامعہ عربیہ مفتاح العلوم مئو



ایک اہم رائے

مذکراہ علمی میں جامعہ کی طرف سے جاری دعوت نامہ پر آج الحمدللہ بفضلہٖ تعالی حاضر ہوا، پروگراموں میں شریک ہوا، مقالہ پیش کرنے کی جرأت تو نہ ہوئی، پر لوگوں کے مقالات سنے، بڑی مسرت ہوئی، موجودہ حالات میں ہندوستان جیسے ملک میں اس طرح کے مذاکرے ایک خوش آئند علامت ہیں اور قابل مبارک باد ہیں محترم جناب حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب جنہوں نے اس پروگرام کا انعقاد کیا ہے، اللہ تعالی حضرت موصوف کے سایہ کو تا دیر قائم رکھیں، اور بار بار اس طرح کے پروگرام کی ان کو توفیق عطا فرمائیں۔

رائے: حضرت سے مؤدبانہ گذارش ہے، خدمت میں ایک ناقص رائے ہے، یہ کہ الحمدللہ اللہ تعالی حضرت سے دینی وملی بڑی خدمات لے رہا ہے، وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، کہ مدارس کے طلباء کی فراغت کے بعد ان کے لیے ایک ایسے سنٹر کی ضرورت ہے جس میں ان کو عصری تقاضہ کے تحت بہترین تعلیم کا انتظام ہو، اور ان ہی طلباء کا داخلہ شرط کے ساتھ لیا جائے کہ وہ عالم ہوں یا دینی علوم کی ایک حد مقرر ہو کہ ایسی تعلیمی معیار شرط ہو اور پھر ان کو ڈاکٹریٹ انجیرنگ، اور بی۔ کام۔ ایم۔ کام۔ وغیرہ وغیرہ کی تعلیم دی جائے، اسی طرح پالی ٹکنک کا انتظام کیا جائے (M.BB.S) کا انتظام کیا جائے، تاکہ ہمارا یہ عالم جس شعبہ میں رہے وہاں پر عملی تبلیغ کر سکے

اور اپنے دینی علوم کی روشنی میں بہترین خدمات انجام دے کر اسلام و مسلمانوں کے لیے ایک بہترین تاثر دے سکے، کام مشکل ضرور ہے مگر آپ جیسے حضرات کے لیے ممکن ہے۔

(جناب) عدیل احمد صاحب

مدرسہ عربیہ عین العلوم، ٹانڈہ



اگر اس مجلس میں شرکت نہ ہوتی تو بڑی سعادت سے محرومی ہوجاتی

دوروزہ بین الاقوامی مذاکرۂ علمی بعنوان ''ہندوستان اور علم حدیث'' میں مندوب خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی سعادت ملی۔

حاضر اجلاس ہوکر احساس ہوا کہ اگر اس مبارک مجلس میں شرکت نہ ہوتی تو یقیناً بڑی سعادت سے محرومی ہوجاتی، مدرسہ کے انتظام وانصرام نیز یہاں کی صفائی سے دل بڑا متاثر ہوا، بالخصوص حضرت مولانا تقی الدین صاحب مظاہری ندوی کی دلی محبت وشفقت نے انمٹ نقوش دل پر ثبت کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مدظلہ العالی کی خدمات کو قبول فرمائے اور مدرسہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

(جناب مولانا) عبدالباری ندوی بھٹکلی

مہتمم جامعہ اسلامیہ بھٹکل



ایسے جلسے بار بار ہوا کریں

ماشاء اللہ بہت مفید ہے، ایسے جلسے مزید ہوا کریں، اس سے صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں اور علمی ذوق بیدار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ادارہ کو مزید ترقیات سے نوازے اور حضرت مولانا کی عمر میں برکتیں

عطا فرمائے اور نظر بد سے بچائے۔آمین

(جناب مولانا) حبیب احمد باندوی
جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ



مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی نے علوم حدیث کے احیاء کا بیڑہ اٹھایا ہے

اس طرح کے پروگرام میں یہ میری پہلی شرکت ہے، حدیث کے عنوان نے اس پروگرام کی نورانیت اور رونق میں اضافہ کیا، اس پروگرام میں شرکت کے بعد میرا تاثر تھا:

۱۔ آئندہ بھی اس طرح کے پروگراموں کے انعقاد کی ضرورت ہے کہ اس سے علوم کا احیاء، اور موضوع سے انسیت بڑھتی ہے۔

۲۔ اس طرح کے وسیع جہتی پروگراموں کے لیے دو یوم ناکافی ہے اس میں اضافہ ہونا چاہیے۔

۳۔ اگر نقاش بھی ممکن ہو تو بہتر ہوگا۔

۴۔ ہندوستان میں حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی دامت برکاتہم نے علوم حدیث کے احیاء کا بیڑا اٹھایا ہے اس کے لیے ایک ٹیم تیار کی جائے تاکہ آئندہ بھی یہ کام جاری رہ سکے، اس لیے کہ ہر شخصیت کی فکر کو اخلاف میں زندہ رکھنے کے دو ہی طریقے ہیں، تلامذہ یا تصانیف۔

(مولانا) سلمان نسیم ندوی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ



یہ سمینار ایک سنگ میل ثابت ہوگا

یہ سمینار اپنی ظاہری خوبیوں اور حسن انتظام کے ساتھ اپنے قیمتی علمی موضوع اور اس پر پیش کیے جانے والے تحقیقی مقالات کی وجہ سے ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا، علماء واہل تحقیق کی ایک کہکشاں یہاں جمع ہوگئی ہے جس کی علمی ضوفشانیوں سے پورا جامعہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے، اس کا سہرا بانی جامعہ ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی مدظلہ اور ان کے رفقاء واساتذۂ مدرسہ کے سر بندھتا ہے، دعا ہے کہ یہ چشمۂ فیض اسی طرح جاری وساری رہے اور تشنہ کامان علم شادکام ہوتے رہیں۔

(مولانا) ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد



یہاں کی ہر چیز اعلیٰ درجہ کی

میں نے یہاں دوروزہ سمینار میں شرکت کی غرض سے ڈھائی روز قیام کیا، مقالہ بھی پڑھا، یہاں کا حسن انتظام، ضیافت اور اخلاق ومحبت، سب کچھ اعلیٰ درجہ کا پایا، یہاں کے طلباء، اساتذہ اور منتظمین قابل تعریف ہیں جنھوں نے قدم قدم پر ہماری مدد فرمائی، خاص طور پر حضرت مولانا تقی الدین ندوی مظاہری قابل صد احترام ہیں جنھوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی اور پوری طرح خیال رکھا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمام حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ادارے کو مزید ترقی سے نوازے، آمین۔

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن

خدا بخش لائبریری پٹنہ



یہ مشک تو اب پورے عالم کو معطر کیے ہوئے ہے

علمائے ہند کی حدیثی خدمات کو نمایاں اور موجودہ علمی نسل کو ان سے روشناس کرانے کی ایک کامیاب کوشش ''ہندوستان اور علم حدیث تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں'' کے عنوان پر اس سیمینار کا انعقاد ہے، مولانا ڈاکٹر تقی الدین مظاہری ندوی دامت برکاتہم کا شغف علم حدیث کے ساتھ محتاج تعارف نہیں، یہ مشک تو اب پورے عالم کو معطر کیے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ ان کے جذبہ خدمت علوم نبویہ کو اور جواں کریں، اور ان کی اس خدمات کو عالم میں مقبولیت اور آخرت میں نجات وسعادت کا ذریعہ بنائیں۔

عام مہمانوں کے اکرام اور ان کی ضیافت کا پر تکلف اہتمام، مولانا کے جذبہ اخلاص، جود وسخا اور وسعت ظرفی کا ایک ادنیٰ عکس ہے، مندوبین کے لیے جائزہ (تحفہ) اکرام ضیوف کی عملی دعوت ہے، فجزاھم اللہ أحسن الجزاء.

جامعہ کے اساتذہ کرام، طلبہ اور ان کے معاملہ حسنہ، پُر جوش استقبال، گویا مہمانوں کی ضیافت وخدمت میں اپنی پلکیں بچھا رکھی ہیں، یہ ان اساتذہ کی طبعی سعادت اور بانی جامعہ کی تربیت حسنہ کی غماز ہیں، بانیٔ جامعہ کے اشاروں کو عملی جامہ پہنانا اور اسے کامیابی تک پہنچانے کا سہرا ان اساتذہ کے ہی سر ہے جو بانی جامعہ کی ایک اور بڑی کامیابی ہے، آپ کے شکر وامتنان میں زبانیں رطب اللسان ہیں۔

(مولانا) خورشید احمد اعظمی
جامعہ عربیہ تعلیم الدین، مئو



یہ دورافتادہ مقام اہل علم کا مرکز توجہ ہے

علم سے جس چیز کو تعلق ہو جاتا ہے وہ چیز پستی سے بلندی، تاریکی سے روشنی اور گمنامی سے شہرت و ناموری میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہی حال مظفر پور کی اس چھوٹی بستی کا ہوا ہے، حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب مظاہری ندوی دامت برکاتہم کی توجہ و عنایت اور کوشش و کاوش سے یہ دورافتادہ مقام اہل علم کا مرکز توجہ ہوگیا ہے، یہ حقیر اس سے پہلے بھی کئی بار یہاں اپنی علمی و تحقیقی ضرورت کے لیے حاضر ہو چکا ہے، اور خاص طور پر یہاں کے کتب خانے اور اس میں کتابوں کے ذخیرے سے کافی متاثر ہوا ہے، آج علم حدیث پر دوروزہ عالمی مجلس مذاکرہ میں شرکت کی غرض سے حاضری ہوئی، یہ مولانا دامت برکاتہم کا مبارک اور مستحسن اقدام ہے اور امید ہے کہ اس سے حدیث شریف کے علم کی طرف لوگوں کی توجہ بڑھے گی اور اس کے اچھے اثرات وثمرات رونما ہوں گے۔

(مولانا) مسعود احمد اعظمی

استاذ جامعہ مرقاۃ العلوم مئو



مذاکرۂ علمی اپنے مقاصد میں کامیاب رہا

۱۔ الحمد للہ! مذاکرۂ علمی، اپنے مقاصد میں کامیاب رہا۔

۲۔ مقالات بھی اچھے و تحقیقی زیادہ تر سامنے آئے۔

۳۔ انتظامات بھی قابل اطمینان تھے۔

۴۔ اس طرح کے پروگرام ہوتے رہنا چاہیے۔

۵۔ پروگرام کے بعد مستقل اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔

۶۔ جو بعض گوشے تشنہ رہ گئے ہیں ان پر مزید کام کروایا جائے۔

(مولانا) سید مشتاق علی ندوی مدنی

نائب قاضی دارالقضاء، بھوپال



ہندوستان کے گوشے گوشے سے علماء کی نمائندگی رہی

الحمدللہ! بہت معیاری سمینار رہا، ہندوستان کے گوشے گوشے سے علماء کی نمائندگی رہی، انتظامات ماشاء اللہ بہت معیاری رہے، طلبہ واساتذہ نے بہت سلیقہ مندی کا مظاہرہ کیا، مدرسہ، عمومی ماحول، تعمیرات، پارک، صفائی اور بجلی وپانی کا نظم سب چیزیں بہت پسند آئیں، باقی مدارس کو ان کی تقلید کرنی چاہیے۔

بچوں کا پروگرام خصوصاً عربی مکالمہ بہت پسند آیا، بچوں کا لب ولہجہ، طرز گفتگو، طرز استدلال اور مواد کا انتخاب معیاری تھا، مقالہ نگاران کی کثرت سے مذاکرہ میں رواروی کا ماحول رہا، سوالات وتبادلۂ خیالات کا موقع بھی ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔

وقت کے اہم موضوع پر ایسا معیاری مذاکرہ منعقد کرنے پر ارباب انتظام مبارکباد کے مستحق ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین

(مولانا) اشہد جمال ندوی

استاذ سینئر سیکنڈری اسکول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



فردِ واحد (مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی) کی چالیس سالہ محنت نے صحرا کو گلستاں کر دیا

الحمدللہ! کہ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ میں دوسری مرتبہ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور دلی مسرت کا احساس ہوا۔

فردِ واحد - استاذ گرامی مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ کی چالیس سالہ محنت لگن اور مسلسل جد وجہد نے صحرا کو گلستاں بنا کر کتنے ہی پودوں کو اپنے ہاتھ سے لگا کر ثمر بار کیا، صدقۂ جاریہ کا سامان فراہم کیا اور ہمیشہ کے لیے منارۂ ہدایت نصب کیا، بارگاہ رب العزت والجلال میں دعا ہے کہ انہیں دنیا وآخرت کی مزید سعادتیں میسر ہوں۔

علاوہ ازیں، اساتذہ کرام کی لگن، محنت اور اخلاص واخلاق اور طلبہ کی سلیقہ مندی میزبانی اور ادب نے خصوصیت سے متاثر ومسرور کیا، اللہ انہیں مزید توفیق عطا فرمائیں۔

(مولانا) ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی

صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی



درحقیقت نور سے معمور یہ محفل ہے آج

(تاثر بسلسلہ دوروزہ بین الاقوامی مذاکرۂ علمی بمقام جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ)

ابتدا کرتے ہیں اس کے نام سے جو ہے رحیم — مہرباں بندوں پہ ہے اپنے، جو ہے بے حد کریم

بعد اس کے لب پہ جاری ہو ثنا، شاہِ دیں — جن کا مخلوقات میں ہمسر نہیں ثانی نہیں

آنا تھا اکیس کو پر آنے سے قاصر ہوا — پنجشنبہ مارچ کی بائیس کو میں حاضر ہوا

صاحبو جلسے کا منظر دید کے قابل ہے آج — در حقیقت نور سے معمور یہ محفل ہے آج
حامل علم رسالت یہ مظفرپور ہے — سچ تو یہ ہے آج بستی غرق بحر نور ہے
صاحبو جس نے بھی دیکھا جلسے کا منظر یہاں — جامعہ اسلامیہ آیا نظر رشک جناں
دامن صحن چمن میں یہ گلوں کی انجمن — غنچہ و گل کا دکھانا مسکرا کر بانکپن
ہر عمارت ، دلربا و دلفریب و دلفگار — ایسی ہیں آراستہ جیسے عروس نوبہار
سامنے بیت خدا چاروں طرف بیت رسول — جلوہ گر ہوتے ہیں جس میں دوستو جنت کے پھول
گنبد ومینار کرتے ہیں فلک سے گفتگو — روز وشب اک دوسرے کے ہورہے ہیں روبرو
کیسے کیسے عالم دیں ہیں یہاں جلوہ فگن — اجتماع ماہ و اختر سے ہے روشن انجمن
حضرت مولانا رابع جانشین بوالحسن — آج اپنے درمیاں محفل میں ہیں جلوہ فگن
اور بھی تشریف فرماہیں یہاں علماء دیں — جن کی تقریریں یہاں پر ہوچکی ہیں دلنشیں
حضرت شیخ زکریا رہبر راہ صفا — اہل دل اہل نظر اور صاحب فہم و ذکا
یادگار فضل رحمٰن شاہ احمد متقی — حضرت صدیق احمد باندوی کامل ولی
دور حاضر کا مفکر یعنی سید بوالحسن — آج ان سب کی دعاؤں سے بنا صحرا چمن
عمر مولانا تقی الدیں کی یارب ہو طویل — جان ودل سے ہے دعا تجھ سے یہ اے رب جلیل
مخزن علم رسالت کردیا قائم یہاں — کردیا چاروں طرف اک فیض کا دریا رواں
کیسے آیا ہند میں علم حدیث مصطفےٰ — آپ سب حضرات نے علمائے دیں سے سن لیا
صاحبو جو کچھ سنا اس پر کریں پیہم عمل — تاکہ راضی ہم سے ہو کامل خدائے لم یزل

یاالٰہی! یہ ادارہ حشر تک قائم رہے
اور اسکا فیض کامل ہے دعا دائم رہے

انصاراحمد کامل چاپلی

مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی کی طرف سے شائع شدہ چند کتابیں:

۱۔ التعليق الممجد شرح موطا الإمام محمد للعلامة عبدالحي اللكنوي، تحقیق وتعلیق: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری۔

۲۔ الإمام مالک ومکانۃ کتابہ الموطا: از حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری۔

۳۔ اوجز المسالک إلی موطا مالک ۱۸ جلدیں، تحقیق وتعلیق: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری۔

۴۔ بذل المجهود في حل سنن أبي داؤد ۱۴ جلدیں، تحقیق وتعلیق: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری۔

۵۔ الجامع الصحيح للبخاري بحاشية المحدث السهارنفوري ۱۵ جلدیں، تحقیق وتعلیق: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری۔

۶۔ الأبواب والتراجم لصحيح البخاري، ۵ جلدیں، تحقیق وتعلیق: مولانا ڈاکٹر ولی الدین ندوی۔

۷۔ ظفر الأماني في مختصر الجرجاني، تحقیق وتعلیق: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری۔

۸۔ ذکر زکریا (حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے عنوان پر منعقد ہونے والے بین الاقوامی مذاکرہ علمی کے مقالات کا مجموعہ، مرتب: مولانا فیروز اختر ندوی)

۹۔ أعلام المحدثين ومآثرهم العظيمة (حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کی تصنیف "محدثین عظام اوران کے علمی کارنامے" کا عربی ترجمہ، تعریب: مولانا سید جاوید احمد ندوی)

۱۰۔ امام مالک اوران کی کتاب موطا کا مقام (حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کی تصنیف "الإمام مالک ومکانۃ کتابہ الموطا" کا اردو ترجمہ بقلم: مولانا فیروز اختر ندوی)۔

۱۱۔ علامہ عبدالحی فرنگی محلیؒ، حیات وخدمات (مولانا ڈاکٹر ولی الدین ندوی (ناظم جامعہ اسلامیہ) کی عربی تصنیف کا اردو ترجمہ بقلم: مولانا محمد رافع ندوی)۔

۱۲۔ الدر الثمين بأسانيد الشيخ تقي الدين: (علم حدیث کے رمز آشنا عالم حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری مدظلہ کی اسانید کا مجموعہ)۔

۱۳۔ الشيخ محمد يوسف الكاندهلوي حياته ومنهجه في الدعوة۔ تعریب: مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی

۱۴۔ الإمام المحدث الشيخ محمد زكريا الكاندهلوي ومآثره العلمية۔ تعریب: مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی

مرکز کی طرف سے جلد ہی منظر عام پر آنے والی کتابیں:

۱۔ إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء چار جلدیں: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی یہ عظیم الشان کتاب ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی جنرل سکریٹری رابطۂ عالم اسلامی اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہے۔

۲۔ داستاں میری: یہ کتاب حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری مدظلہ کے حالات زندگی کا عمدہ اور دل آویز مرقع ہے۔

